مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ماہنامہ سہیل گیا

بھاگل پور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر

سنہ ۱۹۶۹ء

نگراں :- کلام حیدری

ایڈیٹر :- ادریس سنسہاروی

ترتیب

لطف الرحمٰن

معاونین :-

ڈاکٹر محمد یونس

نشاط الایمان

قیمت :- ۲۵ روپے

رجسٹرڈ ۵۴۴۲

PHONE NO 561

فون نمبر ۵۶۱

کوڑھ کی فقیری دوا

جڑی بوٹیوں کا قدرتی کرشمہ
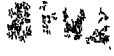
۳۶۹۳

کون کہتا ہے کہ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے امراض مثلاً کوڑھ، سنبہری، جذام اور اکزیما کا مرض لاعلاج ہے۔ اس فقیری دوا کو چالیس دن استعمال کریں اور قدرت کا تماشہ دیکھیں یہ اکسیر دوا عرصہ ۲۰ سال سے موضع چھوٹہرا ڈاکخانہ نگواں ضلع گیا سے نکل کر عوام کو فیض پہونچا رہی ہے اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ لاکھوں مریض اس موذی مرض سے فائدہ اٹھا کر خاکسار کو دعائیں دے رہے ہیں۔ یہ سفوف اعلیٰ درجہ کا مصفی خون بھی ہے جس سے ہر قسم کا جلدی مرض چند ماہ کے مسلسل استعمال سے جڑ سے ختم ہو جاتا ہے۔

پرہیز ● بوا (بھتوا) بواری مچھلی، بھیڑی کا گوشت، شراب، بھانگ گانجہ ●

نوٹ :۔ ان نقالوں سے خوب ہوشیار رہیں جنھوں نے ہمارے نام پر مختلف شہروں میں نقلی دواخانے کھول رکھے ہیں۔
لہٰذا ہماری دوائیں صرف مندرجہ ذیل پتوں ہی پر ملیں گی (دوا بذریعہ وی پی پارسل سے بھی روانہ کی جاتی ہے)

ہیڈ آفس:۔ حاجی حکیم انواری اینڈ سنس، بنیا پوکھر، نزد ریلوے سینما، گیا (بہار)

(برانچ)

دھنباد　　آسنسول　　کلکتہ

ماہنامہ سہیل گیا

جنوری ۱۹۶۹ء | ۳۰ واں سال

محمد ادریس پرنٹر و پبلشر نے تاج پریس دھامی ٹولہ (باری روڈ) گیا سے چھپوا کر
دفتر "سہیل" باری روڈ گیا سے شائع کیا۔

عظیم تاریخ گو حضرت بسمل سنسہارویؒ کی عظیم تصنیف

مجموعۂ قطعات تواریخ

۱۹۶۱ء

المُوسُوم بہ

● حضرت بسملؒ کی ۶۵ سالہ تاریخ گوئی کا شاہکار ● تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے نادر تحفہ ● مبتدی اور ناواقف فن تاریخ گو حضرات کے لئے منزل سا رہنما ● نکات فن سے بھرپور مقدمہ ● تصنیفات، تعمیرات، تقاریب مسرت کی دلنشین تاریخیں ● علماء، مشائخ، صوفیا، لیڈر، قومی و ملی رہنما، شاعر و ادیب، ڈاکٹر، فلسفی، قانون داں، محقق، غرض ہر باکمال کی بلا امتیاز ملت و وطن برجستہ و برمحل تاریخیں۔

جناب
بسمل سنسہاروی کی تاریخ گوئی کا کمال
یہی ہے کہ وہ موضوع سے ہٹ کر کوئی بات نہیں
کہتے اور ان کے تاریخی مصرعے حد درجہ
برمحل ہوتے ہیں۔
نیاز فتح پوری
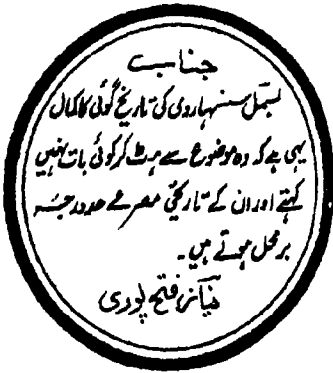
.... نوائے سروش نظر سے گزرا۔ یہ تاریخی قطعات کے
گلہائے رنگارنگ کا ایسا شاداب و دلکش چمن زار ہے کہ
باید و شاید، ہر قطعہ اس قدر بیساختہ اور برمحل نظم ہوا ہے کہ
آمد کے سوا آورد کا گمان نہیں ہوتا۔ لاریب بسمل گیاوی ایک
باکمال تاریخ گو ہیں۔ آثر لکھنوی

۲۰ × ۱۷ کے پونے دو سو صفحات، اعلیٰ کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دبیز کارڈ بورڈ
جس سے یہ کتاب بلا جلد کے بھی مجلد ہے۔ قیمت صرف ۳ روپے

ملنے کا پتہ: تاج پریس باری روڈ گیا ◉ دفتر رسالہ سہیل باری روڈ گیا
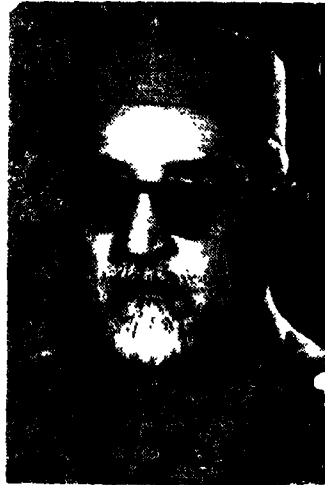
انتساب

محترم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے نام

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

[illegible]

انتساب

از:۔ شد آگل قادری

امیر قافلہ اہل علم و اہل ہنر
ریاض بخشش و فیضاں بیاض لطف و کرم

وہ صدر مملکت ہند ذاکر ذی شان
کہ جس کی مدح میں سرشار ہیں زبان و قلم

وہ نکتہ سنج کہ جس کا نہیں کوئی بھی سہیم
ہے جس کے سامنے گردن کمال و فضل کی خم

ریاض علم میں ایسا کھلا ہے گل شاداب
بہار ہو کہ خزاں وہ شگفتہ ہے دائم

بلند ذات گرامی سے ہو گیا جس کی
وطن کے قصر سیاست پہ سیکولر پرچم

قصیدہ فہم کا پڑھتے ہیں جس کے دانشور
وہ تخت و بخت حکومت کا مستقبل و محترم

نہ دیکھا ذاکر ذی جاہ سا کوئی آہنگ
خلوص و مہر کا پیکر ز فرق تا بہ قدم

زمانہ جس کو قلندر شعار کہتا ہے
سخنوروں کا وہ محبوب و مونس و ہمدم

ضیا سے مطلع انوار جس کی ذہن ادیب
جہان فکر و نظر کا وہ نیر اعظم

وہ جس کے جود و سخا کا جہاں میں شہرہ ہے
وہ جسکے فیض کے ممنون سارے اہل قلم

اسی کے نام معنون یہ خاص نمبر ہے
لبوں میں جسکی ہے امرت نگاہ میں مرہم

عجب نہیں کہ وہ ذرہ کو آفتاب کرے
گدائے میکدہ کو بخش دے کلاہ جم

ملا ہے قادری ذاکر سا تجھ کو قدر شناس
تو اپنے بخت پہ نازاں ہو جس قدر بھی ہے کم

اداریہ

سہیل کو جمیل مظہری نمبر نکال کر تم نے مردہ پرستی کی روایت کو ختم کیا ہے اور اب تو زندہ شخصیتوں پر بے شمار نمبر نکالے جا رہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم پھر کوئی نئی روایت قائم کرو۔

میں نے کہا، محترم! اگر کوئی نئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو فرمائیے میں اس کے لئے تیار ہوں۔

سہیل گیا سے شائع ہوتا ہے اس لئے گیا والوں کے کچھ حقوق بھی اس پر ہیں۔ تم گیا کا ایک ادبی ماحول نمبر شائع کرو جس میں گیا کے ماضی و حال کے سارے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہو۔

میں نے اپنے سر پر اس پہاڑ کو گرتا محسوس کرتے ہوئے کہا، محترم! یہ بہت مشکل کام ہے۔ سبھوں کے حالاتِ زندگی اور پھر ضخامت کے لحاظ سے اخراجات کی کفالت اپنے بس کا روگ نہیں۔ اگر آپ اسے اتنا ہی آسان سمجھتے ہیں تو بسم اللہ اس کام کا بیڑہ آپ ہی اٹھا ڈالئے۔

افسوس یہ ہے کہ میں گیا میں نہیں ورنہ تمہاری ضرور مدد کرتا۔

اگر آپ گیا میں نہیں ہیں تو نہ سہی، بھاگلپور میں تو ہیں وہیں کا ادبی ماحول نمبر نکال ڈالئے سہیل آپ کی مدد کے لئے تیار ہے۔

تو بسم اللہ تم اعلان کر دو اور خاکہ بنا کر میرے حوالہ کرو۔ پھر دیکھو کہ میں کیا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے دوست کلام حیدری صاحب سے اس گفتگو کا ذکر کیا اور خاکہ تیار کرلیا گیا۔

دوسرے دن ہمارے محترم دوست بھاگل پور کے لئے روانہ ہو گئے۔

دو چار ہی دنوں کے بعد رکن ادارہ جناب ڈاکٹر یونس صاحب کا خط آیا کہ سہیل کی اسکیم اہلِ بھاگل پور کے سامنے آگئی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا بڑا کام کیسے ہو سکے گا۔ ہمارے محترم دوست کا خط آیا کہ کام شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں خطوط میرے سامنے تھے۔ فیصلہ دشوار تھا کہ بھاگل پور نمبر کے سلسلے میں وہاں کیا ہو سکتا ہے لیکن ایک ہفتہ کے بعد ہی بھاگل پور سے مبارکباد کے خطوط آنے لگے ہمارے محترم دوست اور ڈاکٹر یونس صاحب میدان میں اتر چکے تھے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن صاحب نے ترتیب کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ حضرت کریم اسدی کی پیرانہ سالی بھی جد و جہد میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ جناب حاجی محی الدین غنی، جناب نسیم آروی، جناب حکیم عبدالباقی حکیم وغیرہ مسودات کی فراہمی میں لگ گئے اور ہمارے محترم ڈاکٹر غیاث اثر اور کلونت سنگھ جانی وغیرہ نے محکمۂ مالیات کی ذمہ داری سنبھال لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کارواں رواں دواں ہو گیا۔ کاموں کی رپورٹیں آنے لگیں۔ ہمارے محترم دوست کی محنت ٹھکانے لگنے کے آثار نظر آنے لگے۔ اور آج خدا کا شکر ہے کہ یہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ ہمارے محترم دوست جناب شاغل قادری ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ محنت ہماری ہے یا ہمارے محترم دوست جناب شاغل قادری کی۔

اس نمبر میں اگر کچھ خامیاں ہیں تو یہ محض میری کوتاہیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اس سلسلے میں بھاگل پور کے ادباء و شعراء نے میری ہر طرح کی معاونت کی ہے۔ میں اہلِ بھاگل پور کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اتنے بڑے کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ادریس سنہاروی

ابتدائیہ ـــــــــ

اُردُو زبان وادب کے ارتقاء میں دبستانِ بہار کو کیا اہمیت حاصل ہے، اس سے ذی علم طبقہ بخوبی واقف ہے، اس نے بارہا بہار کی خدمات کا کھل کر اعتراف بھی کیا ہے اور پوری دیانت کے ساتھ اس کی قدر بھی کی ہے. جب بھی بہار میں اردو زبان وادب کے ارتقا کی تاریخ سامنے آئی ہے، گیا کو بڑا نمایاں اور ممتاز مقام ملتا ہے۔

ماہنامہ سہیل گیا کی اس تاریخ میں ایک منفرد ممتاز اور تاریخ ساز اہمیت حاصل رہی ہے. شمسی پریس بسمل سنسہاروی، تاج پریس، زین العابدین سنسہاروی، عارف سنسہاروی، ادریس سنسہاروی ـــــ سہیل ـــــ یہ سب ایسے نام ہیں جن کے بغیر بہار کی ادبی تاریخ نامکمل ہے۔

جب کہ ادیبوں کے انتقال کے بعد اُن کی خدمات کا اعتراف" نمبر" نکال کر کئے جانے کی روایت تھی۔ ادریس سنسہاروی نے سہیل کا "جمیل مظہری نمبر" شائع کرکے ایک نئی اور جاندار روایت کی بنا ڈالی اور ناقدین، مبصرین کو جمیل مظہری کے فن سے بے توجہی برتنے پر ٹوکا ـــــ اس لئے جب ادریس سنسہاروی میرے پاس "بھاگلپور کا ادبی ماحول نمبر" کا مژدہ لے کر آئے تو مجھے مسرت تو ہوئی مگر تعجب نہ ہوا۔ میں اس سوچ میں ضرور پڑ گیا کہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل یہ نمبر نکالنے کا ارادہ کر کے ان پر کیا بیتے گی ـــــــ

سوانِ پر جو بیتی اُس کی داستان بڑی لمبی ہے اور اسے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ نمبر ایک اسکیم کی کڑی ہے ـــــ اگر یہ سلسلہ پورا ہو گیا (اور مجنوں لوگوں سے کیا بعید ہے) تو یہ کام اس وقت تک یاد رکھا جائے گا جب تک اس دنیا میں اردو زبان باقی ہے۔

ٹیبل پر بیٹھ کر خاکہ تیار کرنا، مواد اکٹھا کرنا، تلاش کرنا، ڈھونڈھنا، ترتیب دینا لکھنا ـــــ یہ سب کام قابلِ قدر ہیں، بے انتہا محنت اور دماغ سوزی کے کام ہیں ـــــ اس کے مظاہرے اس نمبر کے سیکڑوں صفحات کی ہزاروں سطروں میں نظر آئیں گے۔

مگر ادریس کی جاں سوزی کی داد کون دے گا؟

ـــــــــــ کلام حیدری

اب

اس کے بعد ـــــ

ادارہ "سہیل"

گیا کا ادبی و تاریخی ارتقاء

ایک عظیم خاص نمبر کی شکل میں

پیش کرنے کی سعادت

حاصل کرے گا

منیجر ماہنامہ سہیل، باری روڈ۔ گیا

بانی سہیل
حضرت مولوی حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسہاروی علیہ رحمتہ

ادریس سنسہاروی

کلام حیدری

ڈاکٹر محمد یونس
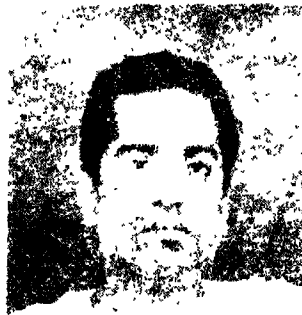
نشاط الایمان
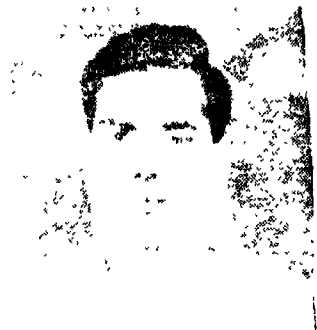
لطف الرحمن

گردوارہ
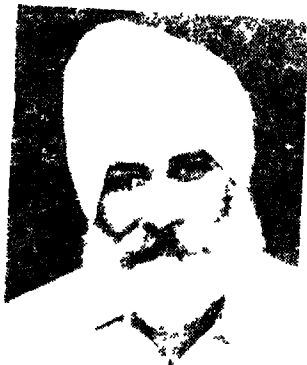
سردار دلوارہ سنگھ
صدر گردوارہ

تاتارپور بازار کا
ایک منظر

تاتار پور بازار کا ایک منظر

تاتار پور بازار کا
ایک منظر

بوڑھا ناتھ مندر

مرکز ادب میکدہ
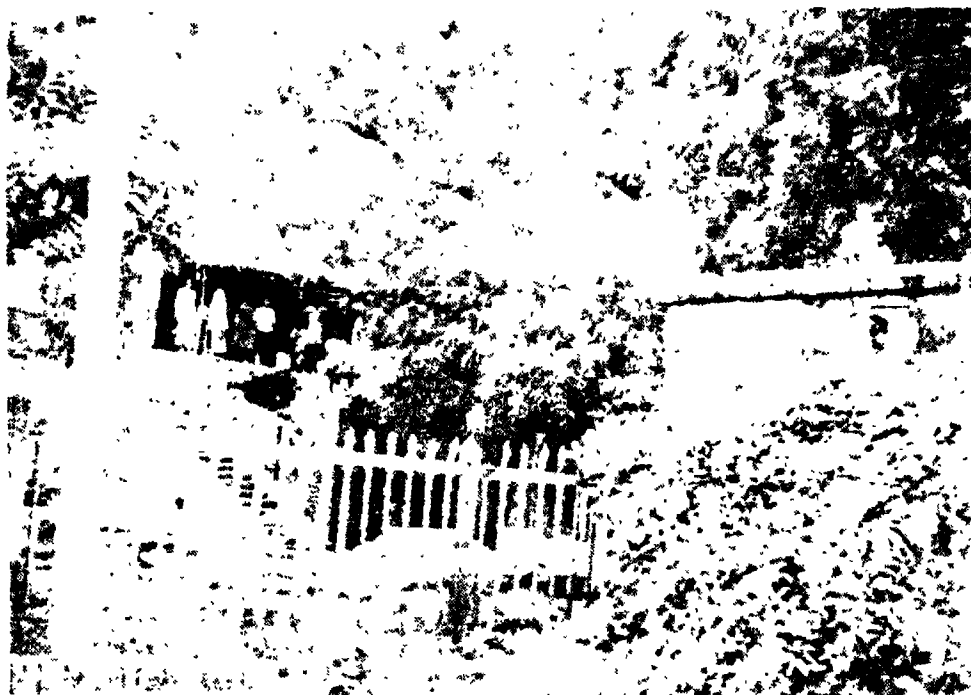
دائیں سے بائیں :—دوجندر جی - اوما شنکر ورما - بیرسٹر ابوالحسن مرحوم
پگ‌دت چودھری - بوبو پیول

بابو پنجاب رائے
سنگھ

سید مقبول احمد
سابق وزیر
بہار

کھڑے ہوئے :— نسیم آروی - شعور بھاگلپوری - جمال پھلواروی -
ساغل قادری - ڈاکٹرغیاث اثر - واجدعلی قمر - صمد حمیدی
کرسی پر :— عبدالرحیم نظر - کلونت سنگھ جانی - لطف الرحمن -
سید شاہ منظر عالم - حکیم عبدالباقی -
فرش پر :— عادل غازیپوری - ششر کمار لعل - باری رضا -
غلام حسین راہی - منیر مجید - مشتاق احمد - نشاط حضر -

کھڑے :— حسن رہبر - تصدیق اشہر - اکرام انجم
کرسی پر :—اختر ناصح نصیب - تقی شاعر باقری -
کریم اسدی - مسرور آروی -
خلف عبدالسلیم ایڈوکیٹ - عرفان شاغل -

دائیں سے :— هری جی (چترشاله) بدری‌ناراٸن (ایس پی) ڈاکٹر بشن کشور جها بیچن

بنکم چندر بنرجی پرنسپل کلا کیندر

شفیع مشهدی

آنند موهن سهاۓ

قوس مرحوم

نواب ارشاد
حسین زیدی

کریم اسدی

وصی احمد
مرحوم

محی الدین
غنی

تقی شاعر
باقری

شاغل قادری

ڈاکٹر غیاث اثر

صمد حمیلی

آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویر خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما

عبد الجبار نسیم آروی (بی۔اے آنرس)

جمال پھلواروی

مسرور آروی　　مشتاق علی شاہد　　اکرام انجم

حکیم عبدالباقی　　عبدالرحیم نظر　　واجد علی قمر

ششو کمار لعل　　تصدیق اشہر
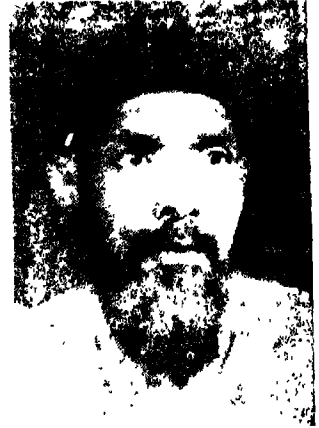
شعور بہاولپوری

عادل غازیپوری

کلونت سنگھ حامی

مجروح عظیم آبادی

اختر ناصح نصیب

یونس احمر

ذکی انجم

غلام حسین راہی

قمرالتوحید

هری نندن پرشاد

شمبھو داس لہری

حسن رہبر

نعیم الدین

چندر حسن

محمد اسحق
حیات

باری رضا

گوپال سنگھ نیپالی

منیر واحدی

سید غنی حیدر

یاسین یاس

بشیر مجید

علی حسن شاہدی

شبیر حسن
صابری

محمد عثمان
فوٹوگرافر

معین خاں رسمی
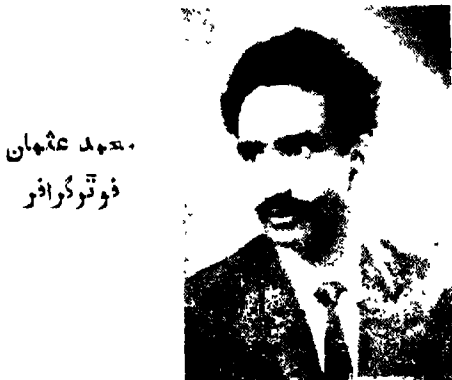
منصور خاں ایڈوکیٹ

علی عمر خاں ایڈوکیٹ

سعید احمد خاں ایڈوکیٹ

ہدایت حسین ایڈوکیٹ

قاسم حسین ایڈوکیٹ

محمد سلیم
ایڈوکیٹ

محمد نعمان خاں

سردار بلونت اهلو والیہ

محمد مجیب ایڈوکیٹ

فرحت القادری

ڈاکٹر احمد حسین

ڈاکٹر سید محمد یونس

ڈاکٹر عبدالرحیم مرحوم

آتما رام شرما

ڈاکٹر منصور

ریاست علی خاں ایڈوکیٹ

رائے بہادر کملیشوری سہائے

امرت سنگھ گاندہی

مہندر سنگھ گاندہی

کلدیپ سنگھ چھابڑہ جوشی

سردار گرومکھ سنگھ

محمد بشیر

محمد وحید

مولانا سراج الحسن

سردار سنتوکھ سنگھ مروا

سردار جوگندر سنگھ

آر کے سنہا

شرف الدین خاں

سردار [illegible] سنگھ منگت [illegible]

محمد
اسرائیل احمد

حکیم منیر
مرحوم

حکیم سید محمد یوسف

حمید وسمی

سعید انصاری

مشیر احمد

شاهد جیلانی

اگر تم اللہ کی مدد
کروگے تو وہ تمہاری مدد
کریگا اور تمہارے قدموں
کو جما دیگا (قرآن)
(قرآن)
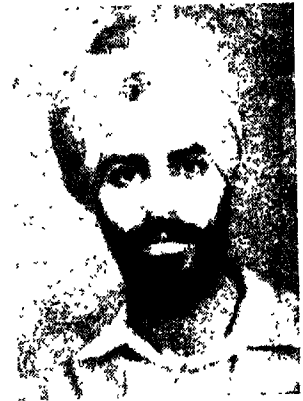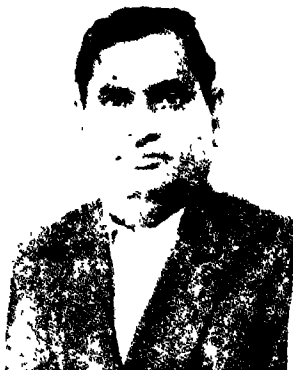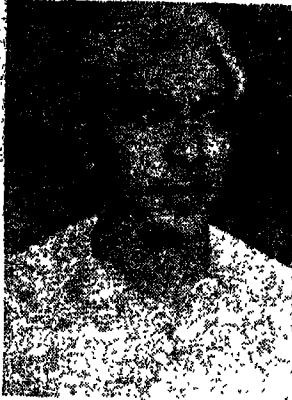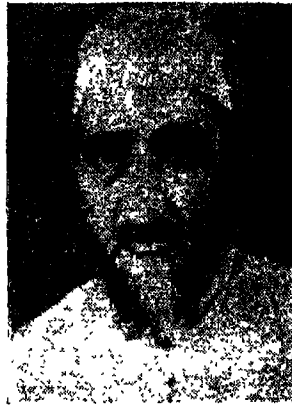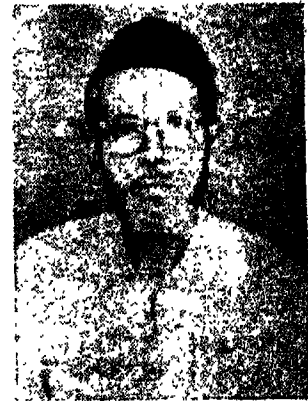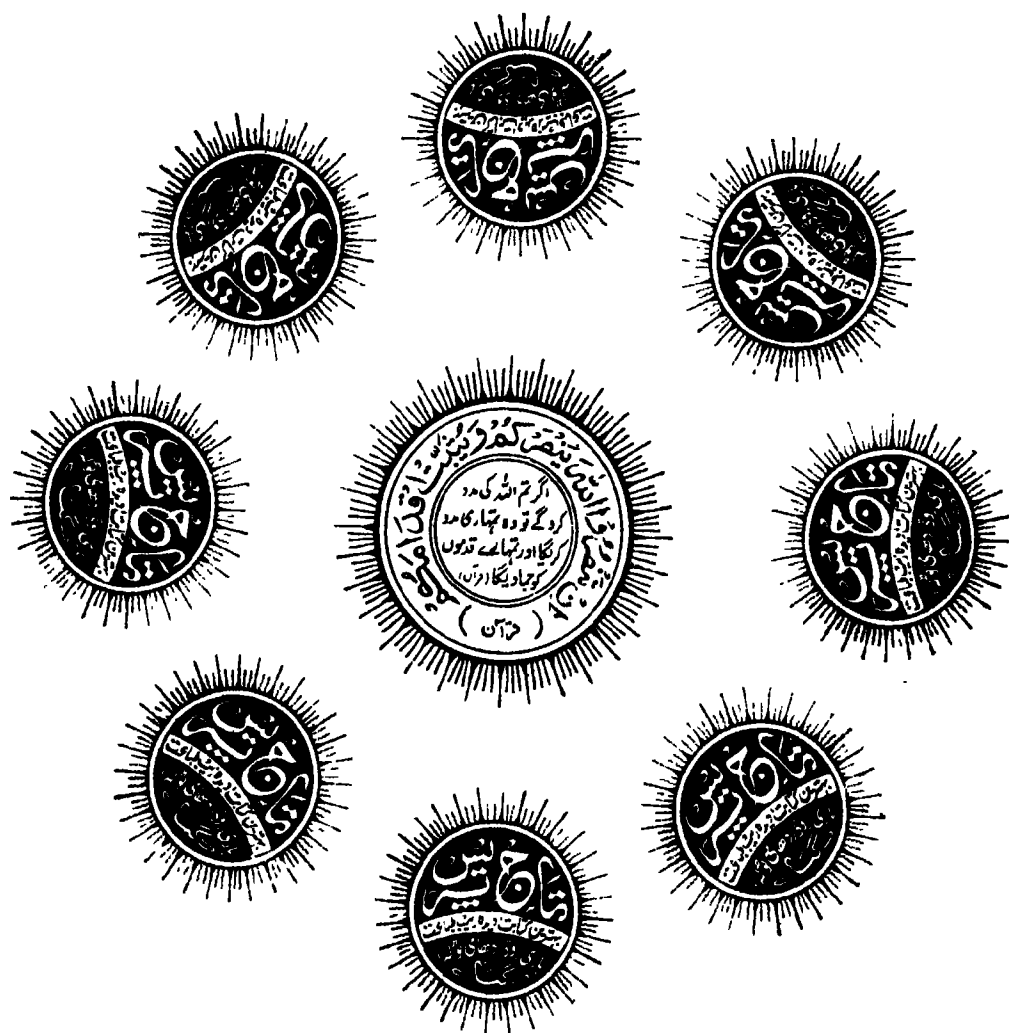
ڈھوڑھا مکسچر
ملیریا کی
ایسی اکسیر دوا ہے
جو
جادو کی طرح
اثر دکھاتی ہے
ملنے کا پتہ
سنٹرل میڈیکل ہال گیا
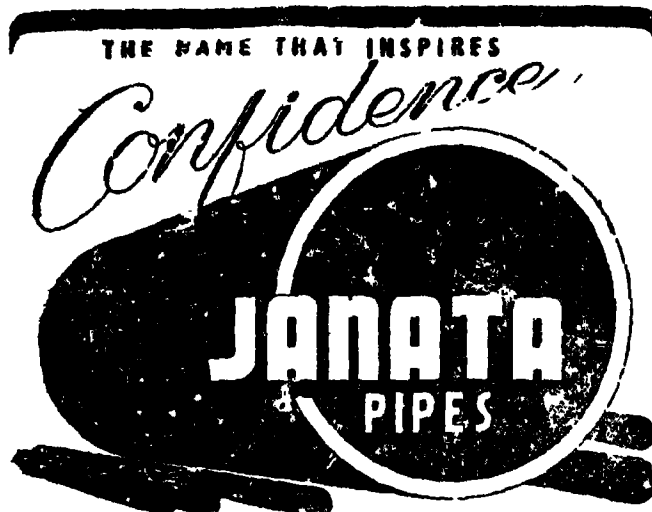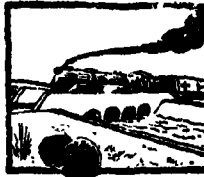
راشٹرپتی بھون نئی دہلی
مورخہ ۲۹ ؍اگست ۶۸ء

مکرم بندہ! تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ!

ماہنامہ "سہیل" گیا کے خصوصی نمبر "بھاگل پور کا موجودہ ادبی ماحول" کے لئے جو ستمبر میں شائع ہو رہا ہے میری نیک خواہشات اور دُعائیں قبول فرمائیے۔

مخلص
ذاکر حسین

انجمن ترقی اُردو (ہند)

علیگڑھ
۲۷ راگست ۶۸ء

پیام

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "سہیل" گیا کا ایک خصوصی نمبر شائع ہو رہا ہے جسمیں بھاگلپور کے موجودہ ادبی ماحول کے نقش و نگار کو واضح کیا جائیگا ہمعصر شاعروں اور ادیبوں کے تخلیقی کارناموں کو تنقید و تبصرے کے ذریعہ اُجاگر کیا جائیگا اور انکی شخصیت پر مقالے لکھ کر انکی ادبی خدمات کو سراہا جائے گا۔

یہ ایک مستحسن اقدام ہے اس سے نہ صرف موجودہ ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ پڑھنے والوں میں بھی شعر و ادب سے دلچسپی اور لگاؤ بڑھے گا جسکے نتیجے میں ایک ایسی فضا بن جائیگی کہ ادب کا ذوق رکھنے والی نئی پود کی نشو و نما کیلئے سازگار ہو۔

میری دعا ہے کہ یہ نمبر جس مقصد کے پیش نظر نکالا جا رہا ہے اسمیں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو۔

آل احمد سرور

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اُردو ہند

بھاگلپور کی ادبی تاریخ کا پس منظر

لطف الرحمٰن

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

بھاگل پور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ اگر ایک طبقہ سے راجین کال کے راجہ بھگون سے منسوب کرتا ہے تو دوسرا طبقہ چمپا نالہ کی آبجوئے تنک مایہ کا معتقد ہے۔ اس گروہ کے حسن خیال میں، بھاگ اور قسمت کا ستارہ اسی آبجوئے تنک مایہ میں چمکا۔ جو مدتوں تجارت کی راہ کشائی کرتی رہی۔ بخت خفتہ بیدار ہونے کو ہو گیا۔ طالع بیدار کو دولت فراواں نصیب ہونے کو ہو گئی، ہن برسنے کو برس گیا، مگر بھاگ کی پیشانی پر "پور" کا لاحقہ ایک بے لکا سا داغ بن کر خلش پیدا کرتا ہے اور یوں بھی بغیر مانگ کر سرخ ٹیکہ کا میل نہیں کھاتا۔

تیسرے گروہ کا قیاس یہ ہے کہ باشندگان بھاگل پور کا پائے استقلال ڈگمگاتا رہا جو قرون وسطیٰ میں استحکام حکومت کے لئے بسائے گئے اور اسی دورِ متاخرین میں مرہٹوں کی شورشوں سے خوف کھا کر بھگدڑ مچاتے رہے سیر المتاخرین کا مصنف بھی اسی نہج پر مشکوک ہے انیسویں صدی کے مشہور و معروف سیاح لرکانن فرانسس کا سفر نامہ بھی اس تشکیک سے مبرا نہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ حکومت بہار کی حالیہ ترین تالیف میں "آثار قدیمہ بہار" کا مرتب حسن عسکری بھی شہر بھاگلپور کو بھاگ[۲] اور بھگیڑیوں[۳] کا شہر لکھ کر فرار ہو گئی۔

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر مرہٹوں کی یورشوں سے پیشتر ہی آتش خاں دکنی ترقی پا کر فوجداری بھاگل پور کے لئے نامزد ہو چکا تھا۔ شاہجہانی عہد کے سنہ ۱۰۴۹ھ کے غرۂ ذیقعدہ میں :-

"آتش خاں[۴] دکنی را بعنایت خلعت و اسپ و انعام دو ہزار روپیہ و خدمت فوجداری بھاگل پور ساختند"۔ آئین اکبری اور اکبر نامہ کے پیش نظر یہ امر مسلم ہے کہ اکبر اعظم جلال الدین محمد اکبر کے زریں دور میں بھاگلپور اسی نام ذات کے ساتھ دائم اور قائم تھا جس کی جمع مشخصہ ایک لاکھ ستر ہزار چار سو تین روپیہ مقرر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فتح بنگال ۱۵۷۵ء سنہ ۹۸۳ھ میں اکبری لشکر راجہ مان سنگھ کی ماتحتی میں یہاں مقیم تھا اور روایت ہے کہ شاہ جنگ کی مسجد اور اس کا کنواں اسی دور کے نشانات ہیں۔ جلال الدین محمد اکبر کے دور میں تسمیہ بھاگل پور کی تصدیق حضرت مولانا شہباز محمد قدس سرہٗ کے خود نوشتہ مرقومات سے بلا تردید منکشف ہو جاتی ہے۔ ۱۵۷۴ء سنہ ۹۸۲ھ میں ملا عبدالرحمٰن جامی کی تصنیف آپ نے نقل فرمائی جس کے اختتام میں آپ کے دست خاص کی لکھی ہوئی یہ تحریر کسی بھی توضیح کی منت کش نہیں

فی شہر المبارک شہر ربیع الاول مولد
النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سنہ اثنین
وثمانین وتسعمائۃ حصل الفراغ من کتابتہ
ثم ھذہ الحاشیہ یوم الجمعہ وقت الظہر
فی شعبان مورخہ ۱۷ مقام بھاگل پور
من الہجرۃ سنہ ۹۸۲   بخط عبدالحی وشہباز

[۱، ۲، ۳] ص ۱۹ The Antiquarian Remains in Bihar "City of Luck or city of refugees"
[۴] پادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۲۰۱

کتابت کی تاریخ نو سو بر اسی ہجری ہے جس کا مقام تحریر مذکور نہیں اور ممکن ہے کہ عبارات بالا کے جزء اول کا تعلق بھاگلپور سے نہ ہو لیکن حاشیہ کی تاریخ ایک ہزار آٹھ ہجری ہے جس کا مقام تحریر بلا تردید بھاگلپور ہے

اسی طرح بوستان فقیہہ ابو اللیث سمرقندی کے اختتام کی مرقومہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

مالکہ شاہ باز محمد بن شیخ حطاب البہاری ثم بھاگلپوری عفی اللہ عنہ وعنہم

یہ اور بات ہے کہ حسن عسکری کے خیال میں بھاگلپور کا قدیم نام " بہرہ " ہے ۔ مورخ جواز ؒ مولانا سید فخر عالم صاحب قبلہ کی قدیم سند پیش کرتا ہے ۔ سند ولایت خاں فدوی محمد شاہ غازی " کی مہر شدہ ہے اور بست دو دوم شہر ذی الحجہ سنہ جلوس کا محررہ ہے ۔ سند کے دو ٹکڑے مکرر شامل کے متقاضی ہیں ۔ ایک " پرگنہ بھاگلپور دکہلگام " دوسرا " پرگنہ بہرہ عرف بھاگلپور " ۔ اول الذکر ناموں کے ساتھ عرف کی تعلیق نہیں ، مگر دوسرے یعنی بہرہ کی عرفیت منقول ہے ۔ بہرہ کے آس پاس کی چند بستیاں بھی بھاگلپور کے محلوں کے نام سے مشہور و معروف ہیں اس طرح " بہرہ عرف بھاگلپور " کی عبارت میں کوئی دقت نہیں ۔ اسناد و فرامین کی زبان ہندستان فارسی ہے اور جگہ جگہ سے ڈھیلی ہے ۔ اسی لسانی افراتفری میں بہرہ المعروف بھاگلپور اور بھاگلپور المعروف بہرہ کا امتیاز مورخ کے ہاتھوں سے جاتا رہا اور نتیجہ کے طور پر مورخ بہرہ کے عرف کی پگڑی بھاگلپور کے سر تھوپ گیا ۔ بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں مگر اکبر اعظم سے پہلے اس نام پر کیا گذری شاید اب تک پردہ خفا میں ہے ۔

کتبوں کے حالات بھی جگر خراش ہیں کچھ تو زمانہ کی تراش خراش سے خرد برد ہو گئے ۔ کچھ تعویذ کے حلقۂ دام فریب میں آ کر دل کی تشنگی بجھانے میں کام آ گئے ۔ کچھ ماہ و شما کے در و دیوار میں روپوش ہو گئے اور کچھ حویلیوں کی سل بن کر پس گئے ۔ باقیات صالحات میں جو بچ گئے وہ بھی عقدہ کشائی کے محتاج رہے ۔

فی الحال قدامت کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدیم ماحصل ہے وہ آٹھویں صدی کے دوسرے نصف میں چمپا کی سنگلاخ زمین کے اوپر سب سے پہلا خانۂ خدا تعمیر ہوا ، مسجد کے محراب سے پہلی اذان گونجی اور عربی فارسی کا پہلا قدم سات سو اٹھترویں ہجری میں پتھر کے سینہ پر ہمیشہ کیلئے نقش ہو گیا

گاہے گاہے باز خواں این دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

تاخر کے اعتبار سے موخر ترین کتابے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے وابستہ ہیں ۔ ایک کی تاریخ سترہ سو ترانوے ہے اور دوسرے کی اٹھارہ سو تینتالیس عیسوی ، دونوں کتبے نوعیت کے اعتبار سے تہذیب کی ترقی اور زبان و ادب کے ارتقا میں ایک نمایاں وقار رکھتے ہیں ۔ سترہ سو پینسٹھ عیسوی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم ثانی کے دربار سے دیوانی حاصل کی ۔ کمپنی کی عملداری کا آغاز ہوا ۔ انگریز کلکٹروں کی تقرری ہوئی جن میں اوگسٹس کلیولینڈ ، ضیاء الملک جیمس گرانٹ اور ایڈورڈ لاٹور کی شخصیتیں تاریخی عظمت کی علمبردار ہیں ۔ سنہ ۱۷۹۳ء میں ضیاء الملک جیمس گرانٹ نے مٹھ اور تالاب بنوائے ۔ مٹھ امتداد زمانہ کی تاب نہ لا سکا اور مٹی ہو گیا ۔ تالاب زندہ ہے جو ٹیلہ کوٹھی اور کمپنی باغ کی آغوش میں زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے ۔ ضیاء الملک چلے گئے مٹھ چلا گیا ، تالاب چل چلاؤ کے راستہ پر ہے ۔ مگر ضیاء الملک جیمس گرانٹ کی نیک نامیوں کا نام لیوا حجر خاموش پونے دو سو برسوں سے خاموش کھڑا نشان راہ بن کر فارسی زبان اور ماضی کی تاریخ کی شہادت دے رہا ہے :-

HINDOO MUT, TANK

BY

JAMES GRANT ESQ

COLLECTOR OF THE DISTRICT.

از ضیاء الملک این تالاب خوش تعمیر یافت
بر لبش این دیر ہم از سعی او تعمیر یافت
خواستم تاریخ بہر عیسوی سازم بیاں
تا بود بر لوح سنگ از سال تعمیرش نشاں
ناگہاں ہاتف ز روی شادمانی لفظ بود
بعد لفظ دیدہ اند مصرع ہشتم فزود

آنجہاں ز دکوش خاطر روز روشن بس عجیب
دیدہ کم اندر جہاں آدم چنیں جلوۂ عجیب

نوعیت کے اعتبار سے یہ دفتر پارینہ جیسیں گرانٹ اور محمڈ اور فارسی تاریخ کا سنگم ہی نہیں بلکہ تہذیبی ارتقا کی ایک ناقابلِ فراموش تربینی ہے اور ہندو مسلمان اور عیسائیوں کے اتحاد و اتفاق کا مستحکم سنگ میل۔

باقیات صالحات میں سے وہ کتابہ جو الیسٹ انڈیا کمپنی کو آخری سلام کہہ گیا۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں نصب ہوا۔ اس کی تاریخ اٹھارہ سو تینتالیس ہے۔ یہ کتبہ شاہ جنگی تالاب کے گھاٹ کے اوپر چسپاں ہے۔ ایڈورڈ لاٹور کلکٹر تھا۔ تالاب مرورِ ایام کی شکست و ریخت سے خستہ ہو چکا تھا اور ازسرِ نو اصلاح و زیبائش کا متائل تھا۔ دستِ سوال خالی نہ گیا۔ گیسوئے پریشاں سنوارے گئے تالاب ازسرِ نو آراستہ ہوا۔ مذہب و ملت کے افتراق کی دیواریں بیٹھ گئیں اور ہندو مسلمان اور عیسائیوں کی یک جہتی اور اتفاق کا نقش ابھرا اور پتھر کے سینہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مرتسم ہوگیا۔

۱۸۴۳ء مطابق سنہ ۱۲۵۰ م فصلی میں یہ
تالاب شاہ جنگی کہ کار رفتہ ہوگیا تھا واسطے
فوائد مخلوقات کے جناب مسٹر ایڈوارڈ لاٹور
صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع بھاگلپور دام اقبالہٗ
نے سرِ نو سے کندیدہ و آراستہ اور گھاٹ
سب تالاب کی پختہ تیار فرمایا۔ اور پختہ ہونے
میں گھاٹ کے جو اشخاص نے مدد خرچ دیا نام
انہوں کا سرائے یادگار معہ تعداد روپیہ اس
سنگ کے حاشیئے میں ثبت ہوا۔

A . D . 1843

سہولت کے لئے روپیوں کی تعداد حذف کی جاتی ہے حاشیہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مہاراجہ رودر سنگھ بہادر راجہ ترہت۔ راجہ بیدانند سنگھ بہادر زمیندار۔ بابو شیب سہائے سنگھ زمیندار۔ رانی جانکی کماری زمیندار۔ مہاراجہ رحمت علی خاں بہادر زمیندار۔ مولوی محمد ماجد خاں بہادر صدر امین اعلیٰ۔ کنور رودر ناتھ سنگھ زمیندار۔ ٹھاکر گرو نرائن دیو زمیندار۔ مہاشر ادما ناتھ گھوش زمیندار۔ راجہ ٹیک نرائن سنگھ زمیندار۔ ٹھاکر مدن موہن سرما وکیل۔ بابو بہاری سنگھ زمیندار بابو جہتاب سنگھ زمیندار۔ بابو چنتامن سنگھ زمیندار۔ بابو ہورل سنگھ زمیندار۔ لچھمی نرائن زمیندار۔ مسٹر ایڈورڈ لاٹور صاحب مجسٹریٹ بہادر، نیچو رام چودھری زمیندار، کشن سنگھ زمیندار۔ بھولا ناتھ جی مختار کار بابو سمرن سنگھ زمیندار، ہرش چندر بانجہ وغیرہ۔ بدھو لعل داس وغیرہ۔ بابو ہیم نرائن سنگھ زمیندار۔ بابو برج نرائن سنگھ زمیندار۔ ھالو سنگھ زمیندار۔ لالہ رام سہائے مختار کار۔ مولوی محمد مجاہد مفتی عدالت۔ عبداللہ خاں وکیل۔ منشی زکی الدین احمد وکیل سرکار۔ منشی گوبند سہائے وکیل۔ لالہ سکھوری لال وکیل۔ مولوی امداد علی۔ میر عابد علی وکیل۔ رانی بھولن متی زمیندار۔ رانی بیلا بتی زمیندار مولوی محمد مجاہد۔ منشی دیگمبر سرکار سررشتہ دار دیوانی۔ منشی پریم لعل سررشتہ دار فوجداری۔ بابو روپ نرائن سنگھ وغیرہ زمیندار۔ سید احمد علی زمیندار۔ مسٹر چارلس بارنس صاحب۔ مسٹر ازیٹ صاحب سید عشرت علی وکیل۔ گوبند چرن گھوش زمیندار۔ کاشی ناتھ مصر مختار کار۔ بابو موتی سنگھ زمیندار وغیرہ۔ بابو مہاراج سنگھ زمیندار مسماۃ منجورن متی وغیرہ زمیندار۔ تیلوک چند ساہو مہاجن۔ منشی ناظم علی۔ منشی شیبو سہائے سررشتہ دار کلکٹری۔ بابو گلاب سنگھ زمیندار بابو دھرم سنگھ نرائن زمیندار۔ بابو گوبند سنگھ وغیرہ زمیندار۔ بابو دینا ناتھ ساہو مہاجن، سید رضا حسن وکیل۔ لٹا ناتھ چودھری زمیندار بابو شیو نرائن زمیندار۔ ٹھیکو سنگھ زمیندار، ہولاس رائے زمیندار بھول سنگھ زمیندار۔ بابو امراؤ سنگھ زمیندار۔ بابو ست نرائن سنگھ زمیندار۔ بابو تیج نرائن سنگھ زمیندار۔ مسماۃ کھوانی متی زمیندار، رجب علی گماشتہ گنیش منڈر وغیرہ۔ مولوی محمد حاذق وکیل۔ سید الطاف حسین وکیل۔ شیخ معونت الحق امین۔

کنور دان سنگھ زمیندار ۔ مٹھو سنگھ زمیندار ۔ نند وساہو مہاجن ۔ بال
ناتھ ساہو زمیندار ۔ بی بی رشیدہ ۔ شہاب الدین ۔

پتھر مستطیل ہے ۔ پتھر کے وسط میں عبارت ہے ۔ اور
گرد کے حاشیوں میں ۱۸۴۳ء کے ان مخیروں کے نام کندہ ہیں
جن کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے ۔ انیسویں صدی کے نصف اول کا یہ
شمارہ بھاگل پور کے شخصی، خاندانی، تہذیبی اور ثقافتی آثار
کا آئینہ دار ہے ۔ ظالو رسنگھ غروب ہو چکا ۔ ظالم سنگھ وقت کے
ظلم کا شکار ہو گیا ۔ یہ نامدار تالاب کے گھاٹ سے شمشان گھاٹ
چلے گئے مگر تہذیب کی نشاندہی کے لئے نام چھوڑ گئے ۔

فارسی کا زور ختم ہو چکا تھا ۔ زبان اردو تخت نشینی کے
رموز سیکھ رہی تھی ۔ لسانی اعتبار سے کتبہ کی عبارت اسی عبوری
دور کی مظہر ہے ۔ جب اردو شمالی ہند کے مختلف طبقوں میں راج
سنگھاسن کے لئے مستقل مقام تلاش کر رہی تھی ۔ تالاب سے ملحق
شاہ جنگی کا ٹیلہ ہے ۔ جس کی چوٹی کے اوپر شاہ جنگی آرام فرما ہیں ۔
عوام کی اصطلاح میں "تالاب" "بھیا کول" کے نام سے مشہور ہے
"کول" فارسی میں پانی کے ذخیرہ اور آبگیرہ کے لئے مستعمل ہے
شاہ جنگی کا ایک حصہ "رسالہ باغ" ہے ۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ رسالہ
کب اترا اور ہاتھیوں کا تالاب کس دور میں سیراب ہوا ۔ صاحب تالاب
کی تواریخ بھی صفحۂ راز میں ہے ۔

اس عبوری دور کی ایک دوسری مثالی عبارت بھی ملاحظہ
فرمائیے جو ۱۸۳۹ء کی تیسویں اکتوبر کو سررشتۂ بھاگل پور میں
نقل ہو کر نافذ ہوئی ۔ لسانی اعتبار سے یہ عبارت نوزائیدگی کے
اضطراب اور زچگی کے اضطرار کی بازگشت ہے جو ہندی و فارسی
کے باہمی اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ۔

منکہ محمد خالق قالضدار اراضی صالف بیگہ موضع
اسلام پور کچہری دیوی کلکٹری معرفت حسن پیلہ
اسا رگ دیدہ مضمونش بد یانت ہی آید کہ عرصہ
دو چہار روز کچہری مذکور میں اصالتاً یا مختاراً تا
واسطے سوال وجواب مقدمہ مذکور کے حاضر ہو سکے
بنا برایں چند کلمہ بطریق رسید نوشتہ دادہ شد
کہ عند الحاجت بکار آید ۔
بتاریخ ۱۷ ر کاتک ۱۲۴۲ فصلی

العبد
محمد خالق قالضدار اراضی مذکور
بقلم
محبعلی مختار کار

ایسٹ انڈیا کمپنی کے آخری کتبے اور الیاس شاہی
دور کے اول ترین کتبے کے درمیانی آغاز میں شہر بھاگل پور
بنگال کے مشرقی بادشاہوں کے زیر اثر رہا ۔ اس درمیانی آغاز
میں عربی کتبوں کے نقش و نگار جا بجا گلگاریاں دکھلاتے
رہے ۔ (زمانہ کے دست برد سے) جو محفوظ رہے وہ اپنے
مرکزوں سے منتقل ہو کر بعد کی مسجدوں میں زیب دستار بن گئے ۔
ملاچک کی مسجد شہبازیہ میں جو کتبہ نصب ہے وہ بھی اسی قبیل کا ہے

من بنی هذا المسجد الجامع فی عهد السلطان
علاء الدنیا والدین ابو المظفر حسین شاہ
السلطان خلد الله ملکہ وسلطنتہ

مسجد شہبازیہ کی بات آگئی تو اس تواریخی مسجد، اور
آستانہ کے علاوہ اس تواریخی مدرسہ کا اجمالی تذکرہ بھی سن لیجئے
جو W. W. HUNTER. کے مرتبہ بنگال منسکرپٹ ریکارڈ
کے صفحہ ۳۰ پر منقول ہے ۔ ۱۸۴۳ء میں سر جون شور کی صدارت
میں فورٹ ولیم کو جن قدیمی مدرسوں کا اجمالی خاکہ فراہم ہو سکا انہیں
مدرسوں میں بھاگل پور مدرسہ شہبازیہ بھی درس و تدریس کا
ایک بڑا مرکز تھا ۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی حاجی سید انصار الحسین
ایڈوکیٹ کے توسل سے حاصل ہوئی ۔ جس کی تواریخی شعاعیں
مورخین کی راہ کشا ہیں : ۔

" حقیقت مدرسہ حضرت مولانا شہباز محمد قدس سرہٗ

واقعہ در پرگنہ بھاگلپور از یست : ـ

کہ حضرت مولانا مغفور در عہد ہمایوں بادشاہ بمقام اوساس دیورہ ضلع بہار متولد شدند، دو دپنجاہ سال علوم ظاہری و باطنی حاصل ساختہ در عہد جہانگیر بادشاہ در بھاگلپور رسیدہ معہ عیال و اطفال متوطن شدند و تا چہل و پنجاہ بہ تدریس علوم ظاہری و باطنی و ارشاد و تلقین مریدان و معتقدان مشغول بودہ، و مدرسہ و مسجد و دیگر مکان ہائے کاہی بنا فرمودہ در سنہ ۱۰۵۰ھ در عہد شاہ جہاں بادشاہ رحلت فرمودند۔ و خرچ طلبا و فقرا از نذورات واز پیداوار مواضع پانصد و نود بیگہ زمین لاخراج مخدوم پور گورادچاندپور اودیسی و ملاحک کہ از عہد آنحضرت مقرر بود و پیداوار سالیانہ آں تخمیناً یصد روپیہ می شود مقرر شدہ می آید۔ و بعد وفات آنحضرت نشان شاہزادہ شاہ شجاع[1] ہم مطابق آں بابت اراضی مذکورہ حاصل گردید۔ چنانچہ پیداوار اراضی مذکورہ تا بلاتہ ایں قدر مدرسہ و تدریس طلبا باقی است۔

.... (مٹ گیا ہے) ...... و مکانات از مدد و معاونت معتقدین تعمیر یافتہ چنانچہ مقبرہ معہ چہار برج و دالان را مرزا محمد مقیم منصب دار بادشاہی تعمیر ساختہ بعد ازاں مسجد عام مرزا شجاع و پس ازاں دالان و حوض را مرزا ابراہیم حسین خاں کہ عامل وقت بودند برائے نشست گاہ سجادہ نشین و تدریس بنا نمودند۔ بعدہٗ مدرسہ را مرزا غلام حسین خاں عامل وقت بر سلک اباے خود تعمیر کردند۔ پس ازاں راجہ بہر مندر راجہ کھڑک پور[2] سقف خانقاہ را بے تسقف تیار نمودہ فوت کردند۔ الحال مہاراجہ راجہ کشب رام لکھنوی سقف آں را بہ انجام رسانیدند و قطعہ جلوخانہ معہ گھڑی خانہ و دالان و حجرہ و چہار دیواری را نواب دلیل خاں بحکم بادشاہ فرخ سیر تعمیر ساختہ، الحال شکست و ریخت گشتہ۔ الحال طلبائے بیرونی کہ در مدرسہ سکونت می دارند تفصیل انہا در ذیل مندرج است ،،

مسجد اور آستانۂ شہبازیہ کے ذیل میں بنگال کے ہادی الشہر مؤتمن الملک علاؤ الدولہ جعفر خاں نصیری برہمن زادہ مرشد پرست نواب مرشد قلی خاں بانئ مرشد آباد کے نام کو سہو کر جانا تو ادیخی دروغ کا مرتکب ہونا ہے۔ یہ وہی برہمن زادہ نواب مرشد قلی خاں ہے جس نے

" مصاحف مجلد بخط خود نوشتہ بہ حرمین شریفین و عتبات عالیات ارسال داشتہ ...... بعد ازاں قرار دادہ بہر مصحفے مجلد کہ نوشتہ شود سہ قاری دا مصحفے مجزا الاو قاری موظف کردہ بحضور خود شب و روز بتلاوت مواظبت نمودہ بعد ہر ختم فاتحہ و اخلاص خواندہ ثواب انرا بروح مطہر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمایند ...... بعد ازاں حق سبحانہٗ تعالیٰ بدل القا کرد ہر قرآنی کہ بنویسند بر وصفات اولیائے مشاہیر فرستادہ وقف کردہ بہ تلاوت دارند ،،

یہ وہی برہمن زادہ ہے جس کے دست خاص کے لکھے ہوئے مصاحف مجلد مجزا حرمین شریفین کے علاوہ خواجہ غریب نواز، حضرت بختیار کاکی، حضرت محبوب الٰہی، حضرت نصیر الدین چراغ، حضرت مخدوم میر سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت جلال الدین قدس سرہٗ

---

[1] شاہ شجاع اور بھاگلپور کی باہمی تذلیل مستقل مقالہ کی مقتضی ہے [2] راجہ بہر مندر راجہ کھڑک پور کی تفصیل کے لیے آئندہ شمارہ ملاحظہ ہو۔

حضرت مخدوم اخی سراج الدین قدس سرہٗ، حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری وغیرہم کے عتبات عالیہ کے لئے، اجمیر، دلی، روح آباد، کچھوچھہ شریف، بہار شریف، قنوج، سلہٹ، جنت آباد، سعد اللہ پور کے طاقوں میں چراغ افروز نبے۔ یہ وہی برہمن زادہ ہے جس کے دست خاص کا جزو نوزدہم سنہ ۱۱۳۲ھ میں بھاگلپور کی مسجد اور آستانۂ شہبازیہ کے لئے وقف ہوا۔

"الحمد للہ جزو نوزدہم قرآن مجید .... بخط
ہادی الشہیر مومن الملک علاؤ الدولہ جعفر خاں
نیشاپوری وقف نمودہ جہت آں کہ ..... بمزار
حضرت زبدۃ الواصلین مولوی شہباز در بھاگلپور
بہ تولیت صاحب سجادہ مدام در تلاوت باشد"

حضرت مولانا شہباز قدس سرہٗ کے عم و خویش حضرت مولانا ابو البرکات صادق پوریؒ کے ملفوظات کے بموجب جو آپ کے (مولانا ابو البرکات صادق پوری) مرید خاص مولانا سید غلام محمد کا مرتبہ ہے۔

"در عہد دولت جہانگیر بادشاہ میرزا رستم قندھاری کہ ناظم مہمات صوبہ بہار بودہ، موفق شد بدیدن سلطان العارفین محی الدین ماحی البدعت .... میرزا مذکور مرتکب بہ بدعات بودہ و بدر مدرسہ میرک رسیدہ۔

حضرت مولانا شہبازؒ نے فرمایا ——— "آمدن و بد وضع نکنند .... " میرزائے مذکور التماس نمودہ نگاہ برمن کنید و حرفے از من نیز گوشید"

آپ نے فرمایا ——— "سعادت شما بہ وقوع خواہد آمد"
امرائے وقت آتے رہے اور فیض پاتے رہے نور جہاں کے خوف سے شہزادہ خرم کا فرار ہو کر سرزمین بنگالہ کی خاک چھاننا اور بھاگلپور کے قرب و جوار میں (جو دروازۂ بنگالہ کے مترادف تھے) اس کی سراسیمگی اور ناخرمی ایک تاریخی صداقت ہے۔ خانقاہ شہبازیہ کے نسخوں کے بموجب اس ناخرم شہزادہ خرم کے "لکھن"[۱] نے آستانۂ شہبازیہ کی قدم بوسیوں سے فیض پاکر فروغ پایا۔ اور "حد شریعت" کی تلقین پاکر جلوس شاہی کے بعد اس شاہزادہ شادکام کا پہلا فرمان جو کشور ہند کے تحت شاہی سے نافذ ہوا وہ یہ تھا کہ سرکار دو عالمؐ کے اخلاف اور سادات کو سجدۂ شاہی کی بدعت سے بریت بخشی جائے۔ بہ ظاہر یہ ایک فرمان تھا، مگر اس کی تہ میں حکومت ہند کے سینے پر بھاگلپور کا نقش اجاگر ہے۔

معاف کیجئے گا بات پر بات نکل آئی۔ شاہان شرقیہ کے قدیم کتبوں میں مسجد شہبازیہ کے قبیل کا ایک دوسرا کتبہ مجاہد پور کی مسجد میں ہے یہ بھی سرقہ سے مبرا نہیں اور بظاہر ایک اڑایا ہوا پتھر ہے جو مرکز سے اڑ کر مسجد کے خزانہ میں آیا اور گنج بادآورد فراہم کر گیا۔ نقش و جمال اور خد و خال کے اعتبار سے دونوں ہی کتبے ایک دوسرے کے متوازی ہیں۔ اس ضمن میں آثار قدیمہ کی وہ مسجد بھی یاد آجاتی ہے جس کا ذکر سنہ ۱۸۷۰ء کے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی پروسیڈنگ کے صفحہ ۲۹۰ پر ثبت ہے اور جسے بنگال کے شاہان شرقیہ میں سے حسین شاہ نے بھاگلپور سے ہٹ کر ببہرہ کے مقام پر بنوائی تھی اسی علاقہ میں وہ آبگیرے بھی تھے جو خشک ہو کر "خرد کول" اور "بزرگ کول" کی بستیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ بکانن فرانسس کے سفر نامہ میں بھی "ببہرہ" اور "تخت ببہرہ" مذکور ہے۔ "تخت ببہرہ" "تخت طاؤس" کی یاد دلاتا ہے۔ اور کیا عجب کہ "ببہرہ" "تخت ببہرہ"

---

[۱] صحیفہ مجلد بخط مرشد قلی خاں خانقاہ شہبازیہ۔

[۲] شاہجہاں ایام شہزادگی میں مولانا شہبازؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کا طالب ہوا۔ اس وقت شاہزادے کا لباس، ستر شریعت کے خلاف تھا۔ مولانا موصوف نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور حد شریعت میں رہنے کی تلقین کی۔ اور جب شاہزادے نے مستقبل میں اپنی بادشاہت کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ "لکھن" تو ہیں۔

کی تخفیف ہو۔ لگے ہاتھوں خردکول اور بزرگ کول کے آس پاس کی
بستیوں کے نام بھی سن لیجیے۔ بادشاہ گنج، سلطان پور، فتح پور، سلیم پور
خنجر پور، مجاہد پور، مغلانی چک، غلام پور، غریب پور، بھیکن پور، نور
پور، خردکول، بزرگ کول اور تخت بہرہ کے یہ تتمّے بہرحال معنی خیز ہیں
شاہان شرقیہ کے ایک تیسرے کتبہ کا ذکر بھی سن لیجیے جو فی الحال
ٹی، این، بی کالج کے احاطہ میں مرکز سے منتقل ہو کر اپنی قسمت کو رو رہا
ہے۔ آج سے بیسوں برس پہلے طلبا نے اساتذہ کو شکایت پہونچائی کہ
جس پتھر کے اوپر کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ مرقوم ہے۔ وہ بے حرمتی
کا شکار ہو رہا ہے۔ اساتذہ نے جب اس لوح سنگ کی چھان بین کی
جو عرض و طول میں ۳۶ اور ۲۰ انچ ہے تو پایا گیا کہ اگرچہ نقش جبیں سر پیٹ
پیٹ کر تقریباً محو ہو چکا ہے مگر "سلطان مظفر" کی فتح و ظفر کا نشان دائم
اور قائم ہے۔ مندر روضہ یا مدار روضہ کا سنہ ۵ھ قیاس آرائیوں تک
محدود ہے اس لئے خارج از بحث ہے۔ عہد مغلیہ کے دو کتابے اپنے
مرکزوں پر ڈٹے رہے ہیں۔ ایک خلیفہ باغ کی مسجد میں نصب ہے۔ اور
دوسرا چمپانگر کے روضہ میں۔ چمپانگر کی نستعلیق حسن کی سادگی،
صفائی اور شستگی کی آئینہ دار ہے۔ عبارت فارسی میں ہے اور
سنہ تاریخ ۱۰۳۲ھ۔ شاہزادۂ عالمیان شاہزادہ پرویز
جہانگیر کے زیر فرمان اضعف عباد اللہ احمد سمرقندی فوجدار سرکار
منگیر نے

توفیق بنائے ایں روضہ منورہ یافت

صاحب مزار نظروں سے مستور پردۂ خفا میں ہے۔ یہ بھی
ٹھیک۔ بھاگل پور کے اکثر و بیشتر عارفان کامل تشہیر سے گریزاں
رہ کر عنقا صفت پرواز کر گئے۔ حضرت مولانا شاہ باز محمد قدس
سرہٗ نام و نمود کے خوف سے شاہ جہانی دور میں ترک وطن کی سوچنے
لگے۔ حضرت نیک نام شاہ کا شکستہ حال مگر عظیم الشان روضہ
مرجع خلائق اور نیک نامی کا شاہد ہے۔ مگر یہ نام نیک کسی بھی تاریخی
نام و نمود کا شرمندۂ احسان نہیں۔ حضرت پیرن شاہ نبدگی کی
بندگی، نام و نمود کی بلندیوں سے بالاتر رہی۔ چمپانگر کے روضہ کو

آج ساڑھے تین سو برسوں سے اوپر گذر چکے۔ جہانگیری عہد کا یہ کتبہ
استداد زمانہ کے خرد برد سے محفوظ رہا۔ مگر صاحب مزار آج بھی ذہن
انسانی کے لئے ایک سیمرغ ہے۔ آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے ۱۸۷۲ء
میں یہ کتبہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے صفحات پر (صفحہ
۳۰۰) جلوۂ شہود میں آیا اور Epigraphica
Indo - Moslemica ایپی گرافیکا انڈو
مسلمیکا میں اشاعت پائی۔ ایک عرصہ گذر چکا۔ مگر صاحب مزار ذہن
رسا کے لئے آج بھی عنقا ہے۔

خرم دل آں کسے کہ معروف نشد
در جبہ و دراعہ و در صوف نشد
سیمرغ صفت بہ عرش پروانے کرد
در کنج خرابۂ جہاں بوف نشد

ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ روضہ منورہ۔ Bihar Through The Ages کے ایک مرتب سید حسن عسکری
کی نگاہ میں عسکری کا مزار ہے۔ مرتب "اضعف عباد اللہ" کی عبارت
"توفیق بنائے ایں روضہ منورہ یافت" کے تقدس کو نہ پا سکا۔ بات
یہیں پر ختم نہیں ہوتی" آثار قدیمہ بہار" کے مؤلف کو دور کی سوجھی
اور اس سیمرغ کو براری کی نامسا عد سرنگوں یا گپھاؤں میں اس طرح
اسیر کر گیا۔ جیسے ماتی بدعت حضرت شہباز قدس سرہ کو بہار تھرودی
ایجز کے انڈکس میں۔ گود کہ ناتھ کی بدعت تسمیہ کا دیکھ خود شکار
ہو گیا ہے

پاپوش میں لگادی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

کتبہ کی پوری عبارت یہ ہے۔

چوں اضعف عباد اللہ خواجہ احمد سمرقندی
حکم الحکم نواب قدسی القاب شاہزادہ عالیان
شاہ پرویز جہانگیر بخدمت فوجداری سرکار
منگیر آمدہ بود بہ بنائے عمارت ایں روضہ منورہ

کو نیق یافت۔ سنہ ۱۰۳۲ ہزار سی ودو۔

عہد مغلیہ کا دوسرا کتبہ جو اپنے پیدائشی مقام سے وفاداری کرتا رہا ہے۔ وہ خلیفہ باغ کی بلند وسیع اور عظیم الشان مسجد کا حسین و جمیل اور شاندار عربی کتبہ ہے۔ جس کی تولیت کا فخر مولانا سید شاہ فخر عالم صاحب دمڑیائی مدظلہ کو حاصل ہے۔ مسجد کی پیشانی قرآن مجید کی مقدس آیت کے نور سے منور اور صحن کا فرش آئینہ کی صورت پاکیزہ اور مصفا ہے۔ سنہ ۱۰۶۲ء میں مسجد خانقاہ، حجرہ اور مدرسہ کی تعمیر اور تصرف کے لئے خلیفہ باغ کی جاگیر دی گئی۔ سنہ ۱۰۷۹ء میں ان عمارتوں کی تکمیل پر شاہی فرمان کی تصدیقی مہر ثبت ہوئی۔ اور اس طرح حافظ قرآن اورنگ زیب محمد عالمگیر کے عہد میں حسب الامر جلیل القدر عظیم الشان موازی چہل بیگہ زمین باغ خلیفہ وغیرہ در مدرسہ خانقاہ و مسجد و حجرہ"۔ سیادت مآب میر سید علی احمد" کے تصرف میں آئی یہ باغ خلیفہ، خلیفہ جمال الدین کے ساتھ منسوب تھا جسے باغ خلیفہ کی ترکیب معکوس ہو کر خلیفہ باغ میں تبدیل ہو گئی۔ کتبہ کی آیت یہ ہے۔

انما یعمر مساجد اللّٰہ من امن با
اللّٰہ والیوم الآخرہ واقام الصلوٰۃ
واتی الزکوٰۃ" ولم یخش الا اللّٰہ
فعسیٰ اولٰئک ان یکونوا من المھتدین

" لم یخش الا اللّٰہ"۔ مولانائے موصوف کے بیان مطابق تعمیر مسجد کی ہجری تاریخ ہے۔ مسجد کے احاطہ اور پہلو میں ایک دوسری مسجد " تنائی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اور مولانائے موصوف کے بیان کے مطابق" لبندادی" اس کا سنہ تاریخ ہے۔

انگ دیش کا یہ قدیمی شہر فی الحال کمشنری کا ہیڈ کوارٹر اور ہندوؤں، مسلمانوں، بنگالیوں، مارواڑیوں، پنجابیوں، سندھیوں اور سکھوں سے گنگا کے جنوبی ساحل پر آباد اور تہذیب و ثقافت کا ایک معتبر جنکشن ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے جا بجا پھپھولوں کی طرح ابھرے نظر آتے ہیں۔ تاڑ کے پیڑوں کی چوٹیوں کی پر افشانی تخیلات کے پر پرواز کو جنبش دیتی ہے۔ مٹی کا رنگ قدرے سرخ یا گیروا ہے۔ اس سرخ مٹی کے تربوزے صورت میں ہندوانہ مگر سیرت میں خون شہدا کی طرح سرخ ہیں۔ سڑکیں تواریخی نشیب و فراز کی طرح بلندی و پستی کی راہ کشا ہیں۔ کنویں اسلاف کے تصر گنا ہی کی طرح عمیق اور گہرے ہیں۔ شہر کی صنعت سلک کے ساتھ منسلک ہے کپڑوں میں" بافتہ" لسانی پیداوار ہے۔ اور پھلوں میں" گلاب خاص کو" لسانی عمومیت حاصل ہے۔ آم کے باغوں سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ عربی فارسی اور اردو کے ابتدائی مدرسوں کے علاوہ معروف ترین کالجوں میں سبور کا زراعتی کالج، ازقاف تا قاف شہرہ آفاق ہے۔ انجینیرنگ اور ٹریننگ کالجوں کو حکومت کی نگرانی کا اختصاص حاصل ہے۔ ٹی، این، بی کالج کا تقدم سنہ ۱۸۸۶ء انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے صفحات میں ثبت ہے۔ مسلم ہائی اسکول شہر کی قومی و ملی زندگی کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ہے۔ قدیم ترین زنانہ مقصودہ اسکول بنگالیوں کی تہذیب و تربیت کی صد سالہ درس گاہ اور درگا چرن ہائی اسکول بنگالیوں کے علم و تمدن کا پرانا مرکز ہے۔ نئی پرانی عمارتوں میں جینیوں کا پیڈوکا مندر جینی بیٹیوا کا نقش پا ہے۔ چمپا نگر جینی مندر مرمری حسن و جمال کا آئینہ دار ہے۔ بوڑھا ناتھ کا مندر ہندوؤں کی زیارت گاہ ہے جنجر پور کا مقبرہ جو ابراہیم بیگ کے ساتھ منسوب ہے۔ لیکائین فرانس کی نگاہ میں مشرقی ہندوستان کے فن کی تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے روایت کے مطابق شجاع گنج کی تین کھٹیا کے مزارات شاہ شجاع کے خانوادہ سے متعلق ہیں۔ سکھوں کا حالیہ گردوارہ عظمت کا عظیم الشان دروازہ ہے۔ جگسر کی بڑی سنگت حضرت فریدالدین گنج شکر کے معتقد بابا گرو نانک کے مختصر دوران قیام کی صحبت یافتہ، اور "چھوٹی سنگت" گرو تیغ بہادر صاحب کی سنگت یافتہ ہے قدیم مسجدوں میں خلیفہ باغ، ملاچک اور مجاہد پور کی مسجدیں عظمت و تقدس کی علم بردار ہیں۔ سمتیا کول مچھلیوں کی رقص گاہ ہے۔ کلاک ٹاور ایڈورڈ ہشتم کے دفت کی نشان دہی کرتا ہے۔ کلیو لینڈ مونومنٹ اوگسٹس کلیولینڈ کی جوان مرگی کا مرثیہ خواں ہے سندینہ کا پارک نیچر کی صنعت گری کا عکاس اور علی گنج کی نشر گاہ

موج ورآغوش اور ہوا بردوش ہے۔

چند محلّوں کو چھوڑ کر شہر ایسے محلوں پر مشتمل ہے جن کا شمار دعوت نظر کے علاوہ دعوتِ فکر بخشتا ہے۔ قلعہ، سرائے، پرانی سرائے، منصور گنج، آدم پور، مشائخ چک، خنجر پور، نور پور، مصطفےٰ پور، نبی پور معروف بلاری، فتح پور، لودی پور، تتار پور، معروف بہ بھیرہ، سبکتگین پور، خلیفہ باغ، شجاع گنج، ملا چک، قاضی ولی چک، کھرمن چک (خرمن چک) مندروضہ (مدار روضہ) صاحب گنج، کمپنی باغ، رکاب گنج، اردو بازار، جبار چک، تاتار پور، بجلی چک (بجلی شاہ چک) کبیر پور، محی الدین چک، صدر الدین چک، مغل چک، حبیب پور، شاہ جنگی، غنی چک، چنبیلی چک، ملا چک، حسین پور، داؤد واردہ، میر جان ہاٹ، مغل گنج، مغل پورہ، حسین آباد، قاضی چک، قطب گنج، بابر گنج، سکندر پور، مجاہد پور، حسن آباد، قصبہ، نرگہ، سردار پور، اسحاق چک، نصرت خانی یہ تمام تر اسمائے با مسمّیٰ کسی بھی لسانی تشریح کے محتاج و دست نگر نہیں۔ اور ان کی ترکیب و تشکیل میں جن اثرات کا نفوذ ہے اظہر من الشمس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چک و چکوک، باغ و آباد، گنج و خرمن اور پورہ و پور ظرف و مکان کے یہ کلمات لاحقہ جس ٹکسال میں ڈھلے اور جس دارالضرب میں کلمہ گوئی سیکھی متنازع فیہ ہو تو ہو مگر یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ ان اجزائے ترکیبی کو جو عمومیت قرون وسطیٰ میں حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے دور میں نہیں اور یہ بھی ایک لسانی حقیقت ہے کہ قرون وسطیٰ کی چھاپ بہار، مگدھ، ٹیکشیلا، وکرم شیلا، مالوہ، اجین، میواڑ، اور ازیں قبیل کی معرانہ چھاپوں سے صورتاً معنوتاً اور ترکیباً مختلف رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے کے مسلسل نرغوں سے نرغہ، تباہ ہو کر "نرگہ" میں تبدیل ہو گیا اور جہاں طبل و دہل کے شادیانے سنے گئے اب اس نرغہ سے "کرگر" کی آوازیں سنی جاتی ہیں۔ زمانے کی مسلسل خوشہ چینیوں سے، خرمن چک کا خرمن بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اور شکست و ریخت کے خرخشوں سے یہ بھی "کھرمن چک" کے کھنڈروں کی خاک میں روپوش ہو گیا۔ ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں!

خنجر پور زندہ ہے۔ مگر خنجر بیگ کی خنجر آزمائی قبر میں سو گئی۔ قطب گنج آباد ہے۔ مگر غوث خاں کے نامدار بیٹے قطب خاں کی عسکریت قطب گنج کی شکستہ حال قبروں میں دفن ہو گئی۔ غوث خاں سنٹرل جیل کے زیر سایہ میٹھی نیند سو رہا ہے۔ صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ جب سرزمین بھاگلپور میں برگیوں نے بالاجی باجی راؤ کی سرکردگی میں زور پکڑا تو بہادر عورتوں نے غوث خاں کی بیوہ کے زیر پرچم برگیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ چوڑیوں نے توپوں کے دم خم پاش پاش کر دئے۔ بالاجی باجی راؤ کی پیشوائی کا سر جھک گیا بہادر بیوہ کے حضور میں آکر ادب کے ساتھ سلام بجا لایا اور نسوانی شجاعت کا نقش لے کر وطن کو لوٹ گیا۔ جن بزرگوں اور صاحبان سیف نے اس سرزمین کی سرخ مٹی کو صدیوں تک اپنے خون سے سینچ سینچ کر اپنا خاص آب و رنگ بخشا وہ اب کہاں رہے۔ فرانسس بکانن کی وہ جنگل تری ہوا ہو گئی۔ جس کی فضاؤں میں آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو برس پہلے قدوۃ العارفین و زبدۃ العاشقین حضرت مخدوم شاہ علاؤالدین حرم پوشؒ نے چلہ کشی فرمائی اور اس محضر نامہ کے بموجب جس کو تقریباً ڈھائی سو برس گذر چکے اور جو مہر شدہ اور قاضی شرع کا مصدقہ اور مولانا محمد سہول مرحوم سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ کا شائع کردہ ہے۔ "حضرت مخدومی قدس سرہٗ درویش مجرد و سیاح از طرف ہندوستان در نواحی قصبہ بھاگلپور مذبوبسر کا رمونگیر مضاف بصوبہ بہار رسیدہ در بیابان کہ الحال آبادانی آں بہ موضع پورینی موسوم است اقامت نمودہ جنگل بریدہ و بہ کسب دریا صنعت مشغول شدند و از بعضیا آوردند و بعد از چند گاہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانب حضرت پنڈوہ بہ طریق سیر رفتہ۔

جنگل تری کی بات آگئی ہے تو ان جنگلات کے ناگ اور ناگنوں کی ایک لطیف داستان بھی سن لیجئے۔ جن افراد نے "ناگ پنچمی" فلم دیکھی ہے وہ "بہولا، اور بالا" کے نام سے ناواقف نہیں بہولا چمپا نگر کے ایک خوش طینت اور خوش حال سوداگر کی نیک نہاد بیٹی ہے۔ جو حسن سیرت کے علاوہ حسن صورت میں بھی ایک بلاخیز طوفان ہے

بالا اس طوفان حسن کا منگیتر ہے۔ جس کی شہرت کا ڈنکا گھر گھر بج رہا ہے
بالا نے ایک انوکھی شرط باندھ رکھی ہے کہ میں لوہے کے چنے اور لوہے کی مچھلیاں
کھاؤں گا۔ اور ایسی دلہن کو بیاہ لاؤں گا جس کے دست حنائی میں یہ تاثیر
ہو کہ لوہے کی سلاخوں کو گلا کر لذیذ اور خستہ بنا ڈالے۔ پتی ورتا کی آزمائش
جو سیتا اور ساوتری کی سرزمین میں ایثار و خود شکنی کی ایک معمولی سی کسوٹی ہے
بہ سروچشم منظور ہو جاتی ہے۔ لوہے کے چنے اور لوہے کی مچھلیاں شعلۂ حسن
کی تاب نہ لا سکے۔ اور کباب سوختہ کا مزہ دے گئے۔ بات پختہ ہو گئی لیکن
سوداگر کی بہن سدِّ راہ ہے۔ ابلیسیت میں فرد۔ شیطنت میں یکتائے
روزگار، جس کی سرشت میں اہرمن کے دستِ خاص نے کوٹ کوٹ کر خباثت
اور عفونت بھر دی ہے۔ یہ وہی تسلیم شدہ ساحرہ ہے جو بھائی کے فروغ
سے جلتی اور شب و روز انتقام گیری اور بہانہ سازی کی سوچا کرتی ہے
بہانہ تراشی توجیہہ کی متقضی نہیں ہوتی۔ ڈھونڈنے والے کو ہزاروں
بہانے مل جاتے ہیں۔ بیہولا نہا رہی ہے۔ پانی کا ایک خفیف سا قطرہ
اچٹ کر سوداگر کی بہن کو چھو جاتا ہے۔ بلا کی قیامت ٹوٹ پڑتی
ہے۔ اور معصوم بیہولا کی آنے والی شب عروسی تخویف و تہدید کے
زد میں آگئی۔ نتیجی خائف ہو جاتی ہے اور بھائی سراسیمہ ہو کر بہن کے
ساحرانہ عملوں سے بچنے کے لئے حتی الوسع ہر ممکن طریقہ اختیار کرتا
ہے۔ یہاں تک کہ سہاگ رات کے لئے جو حجلۂ عروسی تعمیر ہوتا ہے
وہ بھی سنگ و خشت کے بجائے ایسے مضبوط ترین لوہے سے اس
قدر محفوظ اور مستحکم بنایا جاتا ہے کہ چیونٹیوں کا جسم خفیف تو کیا ہواؤں
کا بھی مطلق گذر نہ ہو سکے۔ پھر بھی شبہات رہ جاتے ہیں ان شبہات
کے شائبہ کو مٹانے کے لئے دود سیاہ کے مرغولوں سے بند کمرے کی آزمائش
بھی ہوتی ہے اور یہ مرغولے جب کمرے کی قید و بند سے خلاؤں میں
پرواز نہیں کر پاتے تو حجلۂ عروسی کے تحفظ و تکمیل پر مہر تصدیق ثبت
ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ؎

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

سوداگر کی بہن بھی غافل نہیں رہتی۔ وہ مزدوروں کو ساز باز میں
لاتی ہے۔ پختہ دیوار کے مستور سے گوشہ میں مکھیوں کی جسامت کے مطابق
خفیف سی گنجائش رکھوا چھوڑتی ہے۔ جس کی نگاہوں کو الیڑوں کی
نگاہ تیز بھی نہیں پا سکتی۔ پھر کوڑیاں اڑتی ہیں۔ جادو کی مکھی ظہور
میں آتی ہے اور دیوار کے شگاف پر چسپاں ہو کر مرغولوں کیلئے سدِّ
راہ بن جاتی ہے۔ شگاف کو سوداگر کی نظروں سے اس طرح مستور
رہنا تھا جیسے دل کا شگاف ہو جو مندمل ہونا نہیں جانتا۔ سہاگ
کی رات آئی اور شادیانے بج اٹھے۔ خوابگاہ کے دروازے بند ہو گئے
حسن و عشق کے متوالوں کا شباب سو گیا۔ سحر سامری جاگ اٹھا۔
کوڑیاں چھٹنے لگیں۔ دود سیاہ کی طرح اینٹھتی ہوئی ناگن لہرائی
تڑپی اور شگاف سے گذرتی ہوئی اس خوابگاہ میں داخل ہو گئی۔
جہاں حسن و عشق کے متوالے پھولوں کے سیج پر خواب ناز میں اسطرح
غرق تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ لوہے کے قفس میں آدھی رات
ادھر، آدھی رات ادھر، سناٹے کا عالم، مرگھٹ کا سکوت
قدرت کا تماشا دیکھئے کہ جن زلفوں کی گھٹاؤں نے بالا کو آب حیات
بخشا، آج اسی زلف گرہ گیر کے پیچ و خم بالا کی موت کا زینہ بن گئے
کوڑیوں نے دستک دی، ناگن لہرائی اور بالا کو ڈس کر ایک معصوم
سہاگن کے سیندور کا خون کر گئی۔ قیامت کی صبح نمودار ہوئی
بیہولا کے بردگ کا طوفان عرش معلیٰ سے ٹکراتا ہے۔ عرش کے پائے
ہل جاتے ہیں۔ جس دست حنائی نے لوہے کی سلاخوں کو سونٹھ کی
تاثیر بخشی آج اسی دست دعا کی تاثیر دیکھئے کہ دیوتاؤں کے دل
بھی موم کی طرح پگھل گئے ہیں۔ عشق صادق ہو تو محبوب مرتا نہیں
بیہولا کے جذبۂ عشق نے اہرمن کے جذبۂ انتقام کو شکست دی۔ بازی
ہار کر جیت گئی۔ بالا کی آتما بیہولا کی روح میں ضم ہو کر یک جان
دو قالب بن جاتی ہے ؎

تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

ناگ اور ناگنوں کی یہ لطیف داستان بھاگلپور کے
اساطیر کا ایک رنگین جزو ہے اور حق تو یہ ہے کہ فرانسس بکانن

Jungle Terry.

کی اس جنگل تری کے سفید و سیاہ میں مور سفید اور مار سیاہ کو جو دخل رہا ہے وہ تعارف کا محتاج نہیں۔ کیسے کیسے کتب خانے اس مور سفید کے جسم نحیف میں تحلیل ہو کر رہ گئے۔ اور دیمکوں نے چاٹ چاٹ کر کیسے کیسے علمی ذخیروں کا صفایا کر دیا۔ اگر ان سفید چونیٹوں کی شکم دری کی ممکن ہو تو عجب نہیں کہ بھاگلپور کے ان "جید علماء" کے شکم مبارک سے کتب خانوں کے سیکڑوں آثار قدیمہ نمودار ہوں۔ مور و مار کی اس سرزمین میں جہاں مور سفید کی فراوانی ہے وہاں مار سیاہ کی بھی قلت نہیں

قدرت کا نظم دیکھئے۔ اگر چمپا نگر کو ناگ نگر کی جائے پیدائش کا فخر حاصل ہے تو اسی شہر کے دوسرے گوشہ میں آستانۂ شہبازیہ کو عراق کی بزرگی اور تریاق کا فیض نصیب ہے بلکہ یہی وہ مراق ہے جہاں سے مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر مارگزیدوں کو تریاق کی سبیل ملتی ہے اور فرقہ وارانہ عصبیت شفا پاتی ہے۔

بھاگل پور کی ادبی تاریخ کا ارتقائی جائزہ

مذکورہ بالا پس منظر میں بھاگل پور کے ادبی ارتقاء کا سائنٹفک جائزہ لینے کے لئے یہاں کی ادبی تاریخ کو چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔

پہلا دور ...... ابتداء سے سنہ ۱۸۵۷ء تک متقدمین۔

دوسرا دور ..... سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک متاخرین

تیسرا دور ..... سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک معاصرین طبقہ اول

چوتھا دور ..... سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد تا حال معاصرین طبقہ دوم

پہلا دور: ۔ ابتدا سے سنہ ۱۸۵۷ء تک (متقدمین)

اس دور کو سہولت کے پیش نظر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں شعر و ادب کے دو خانوادے اہم رہے ہیں۔ چنانچہ حروف تہجی کے اعتبار سے پہلے دمڑیائی خاندان کے شعراء کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں شہبازیہ خاندان کے فنکاروں کا ذکر ہو گا۔

پہلا دور (حصۂ اول) دمڑیائی خاندان کے موجودہ بزرگوں (خصوصاً مولانا سید شاہ فخر عالم صاحب مدظلہٗ) سے جو اطلاعات فراہم ہوئیں۔ ان کے مطابق اس خاندان کے مورث اعلیٰ واسطہ عراق کے سادات زیدی میں تھے۔ وہیں کے ایک بزرگ سید ظہیرالدین ابو نجیب مختار کو شہنشاہ فیروز تغلق کے والد نے اپنا خاص آدمی بھیج کر طلب کیا تھا۔ بعدہٗ یہ شہنشاہ فیروز تغلق کے اتالیق اور میر منشی رہے۔ آپ دلی میں درس بھی دیا کرتے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں سید یحییٰ اور صدرالدین دو مشہور بزرگ گذرے ہیں آپ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اجازت یافتہ خلیفہ بھی تھے واسطہ سے دلی تک آنے کا ذکر "ملفوظات میری" میں ملتا ہے۔

آپ کی اولاد میں سے کچھ لوگ میرٹھ میں قیام پذیر ہوئے انہیں میں سے ایک بزرگ سید حسن دانشمندؒ تیموری حملہ کے زمانے میں میرٹھ سے حسن پورہ عشری تشریف لائے۔ چوسا کے مقام پر سنہ ۱۵۴۰ء میں جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر فرار ہوا تو ایک رات آپ کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ وہیں رخصت کے وقت قریب سحر سریر آرائی حکومت ہند کی استقامت کی دعا دی گئی۔ جب شیر شاہ کو یہ خبر ملی تو اس نے ہمایوں کا پتہ پوچھا لیکن آپ نے عدم واقفیت کا اظہار فرمایا۔ تب شیر شاہ نے یہ فرمائش کی کہ میری مملکت کی استقامت کی دعا کیجئے۔ مگر آپ نے فرمایا" شیر کچھار سے نکل چکا "اسی سال حضرت دانشمندؒ

کا انتقال ہوا۔ بعد ازاں ان کے صاحبزادگان سید مبارک، سید احمد دمڑیا اول اور سید حسین قدس سرہٗ العزیز کو تکلیفیں دی جانے لگیں۔ چنانچہ یہ تینوں حضرات وہاں سے ہجرت فرما گئے۔

مخدوم سید احمد پیر دمڑیا اول میناپور، حاجی پور میں قیام پذیر ہوئے۔ مخدوم سید حسین صاحب موضع سلطان پور پرگنہ بھاگل پور میں اور مخدوم سید مبارک صاحب شیر شاہ کی وفات کے بعد دوبارہ حسن پورہ عشری کو لوٹ گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

مخدوم سید شاہ حسین کے صاحبزادے سید شاہ شرف الدین عرف سید شاہ علی محمد المعروف: پیر دمڑیا ثالث بہرہ سے بھاگل پور آگئے اور احتراماً اپنے والد بزرگوار کے نام پر ایک محلہ حسین پور آباد کر کے قیام پذیر ہوئے۔

تلاش و تحقیق کے بعد جو حقائق سامنے آئے ہیں ان سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ بھاگل پور میں وسط سترہویں صدی عیسوی سے ادب و فن کی محافل و مجالس کا استقرار ہوتا رہا ہے۔ مگر اس عہد میں ادبی و فنی ذوق جمہوری و عوامی ذوق نہ بن سکا تھا۔ لیکن اس عہد کے صوفیا و عرفا بہت ہی تقیف و متمدن ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کا ذریعۂ اظہار عربی و فارسی زبانیں تھیں۔ کبھی کبھی مقامی زبانوں کے کچھ بول بھی ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔ مگر فارسی زبان اظہار خیال کے طور پر رائج تھی۔ اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ فارسی زبان درباری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے جو اصحاب بھاگل پور تشریف لائے تھے۔ وہ فارسی بولنے والے علاقوں سے آئے تھے اور اس وقت تک ان کی زبان پر مقامی بولیوں کا اثر نہ پڑ سکا تھا اس کے علاوہ اردو زبان اس وقت اپنے تشکیلی دور میں تھی۔ اور کوئی قطعی صورت اختیار نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ اس عہد میں فارسی ہی شعر و سخن کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔

لسانی اعتبار سے شیر شاہ کی فرمائش کے جواب میں حضرت سید حسین دانش مندؒ کا یہ فرمانا " شیر کچھار سے نکل چکا " اردو کی ابتدائی تشکیل و تجسیم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اردو بول یا نمونہ ہنوز دستیاب نہ ہو سکا۔

قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ اس دور کے بزرگوں نے فارسی زبان میں اپنے جذبات و احساسات اور فکریات و نظریات کا اظہار کیا۔ اس سلسلہ میں جو نام سب سے پہلے ہمارے سامنے آیا ہے وہ سید شمس الدین عرف سید میر کلوں کا ہے۔

سید شمس الدین عرف سید میر کلاں :

آپ سید شرف الدین عرف علی محمد پیر دمڑیا بن مخدوم شاہ حسین بن مخدوم سید حسن دانش مندؒ کے صاحبزادے ہیں۔ تاریخ پیدائش دستیاب نہ ہو سکی۔ سنہ وفات ۱۶۴۵ء ہے اپنے عہد کے صاحب کمال اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ کئی قلمی تصنیفیں دستیاب ہیں " بیان طریقت " اور " مدعائے سلوک " یہ دو تصنیفیں عربی و فارسی میں ہیں۔ فارسی میں ایک قلمی بیاض بھی موجود ہے۔ جس میں مختلف اور ادو وظائف ہیں۔ گرچہ شعری تخلیقات دستیاب نہیں۔ مگر موصوف کی مذکورہ تصنیفیں بھاگل پور میں اولیت و تقدم کی حامل ہیں۔ مزار مجاہد پور ریلوے برج سے پورب احاطۂ پیر دمڑیا بابا میں واقع ہے۔

سید بہاء الدین عرف سید حسن جیو

حضرت شمس الدین عرف میر کلاں کے صاحبزادے تھے۔ سن پیدائش ۱۵۹۱ء مطابق سنہ ۱۰۰۰ھ ہے۔ اور سنہ وفات ۱۶۷۳ء ہے۔ ایک بیاض فارسی میں ملتی ہے جو مختلف اوراد و وظائف پر مشتمل ہے۔ اس میں عربی و فارسی کے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں۔ تیقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ وہ اشعار خود ان کے ہیں یا کسی دوسرے شاعر کے۔ آپ بھی آستانۂ پیر دمڑیا بابا کے احاطہ میں مدفون ہیں۔

سید حمید الدین عرف سید حبیب اللہ دمڑیاوی

خاندان دمڑیائی حبیب پور کے بانی سید نظام الدین

عرف سید حبیب الدین پیر دمڑیا ثالث کی اولاد میں اور حضرت شاہ علی محمد پیر دمڑیا کی چوتھی پشت میں گذرے ہیں۔ سنہ پیدائش و سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ اور نہ حالات زندگی کی خبر ملتی ہے۔ سنہ ۱۰۶۳ھ میں موجود تھے۔ جس کا پتہ ان کے ایک مفقود خانہ رسالے سے ملتا ہے۔ رسالہ حنیفیہ مرتبہ شاہ محمد میر کے مطابق حبیب اللہ صاحب کی صاحبزادی بی بی آمنہ کی شادی سید شاہ میرزادہ پیر ابن ملا علی احمد پیر دمڑیا خلیفہ باغ کے ساتھ ہوئی۔ انھوں نے بزرگوں کی کتابیں بھی نقل کی ہیں۔

تصانیف میں صرف ایک رسالہ تصوف موجود ہے جس کے آخر کی یہ سطریں تاریخی اعتبار سے اہم ہیں۔

"این رسالہ تمت تمام شد۔ بوقت اول عصر بتاریخ (۲۶) بست و ششم شہر محرم الحرام سنہ ۱۰۶۳ھ مقام مانگر موڑ روز اول ہفتہ وقت برگشتہ آمدن از ہم تمدھا دبہمراہ شہنشاہ خلافت پناہ سلطان محمد شاہ شجاع بہادر خلد اللہ تعالیٰ ملکتہ وقد عمرہٗ حاضر الوقت .... راقم این حروف فقیر حبیب اللہ بن یعقوب مصطفےٰ حسین"

یہ رسالہ مہر شدہ ہے۔ لیکن عبارت دھندلی پڑ گئی ہے یعنی عبارت پڑھنی مشکل ہے۔

نصرت اللہ خاں درویش المتخلص بہ نور

حضرت سید شاہ میراں میر سید میر کلاں ابن سید شاہ علی محمد پیر دمڑیا کے مرید تھے۔ سن پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ قیاس ہے کہ سنہ ۹۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ وفات سنہ ۱۰۰۰ھ میں ہوئی۔ حالات زندگی بھی پردۂ تاریکی میں ہیں۔ اپنے فارسی دیوان میں ایک جگہ اپنے وطن کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنگالہ کے رہنے والے تھے ؎

مورد بنگالہ وطن دارد چو تر کان لا خطا
مرز مشکیں دلبر آں تو بشکن ہر یک بہ ناز

اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

سر بنہ در کوئے جاناں می شوی تا سر فراز
لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا اشنو براز

قلمی دیوان کے آخری صفحہ پر حاشیہ میں یہ لکھا ہوا ہے

"بوقت دو گھڑی روز چہار شنبہ بست و ششم رمضان سنہ ۱۱۵۱ھ تمام شد"

اس سے صرف اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کی کتابت ۲۶ رمضان سنہ ۱۱۵۱ھ کو ختم ہوئی۔ لیکن یہ کس کا مکتوب ہے یہ کہیں درج نہیں۔ آخری صفحہ پر کچھ عبارت مٹ گئی۔ مگر دیوان میاں نصرت تمام شد" دائم قائم ہے۔ دیوان کے آخری صفحہ کے سامنے یہ دھندلی سی عبارت ملتی ہے۔

لہ .... ولد میر سید میر بن ملا علی محمد حسینی کسے کہ دعویٰ کند .... ؎ گردد

اس کی ملکیت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ دیوان ۱۱۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ صفحہ ۶۵ پر بزرگان خاندان پیر دمڑیا کے ذکر میں بھی ایک طویل نظم ہے۔

دیوان کے پہلے صفحہ پر ایک حمد ہے جو فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بے حد کامیاب اور اثر آفریں ہے۔ مذکورہ نظم یہاں نقل کی جاتی ہے تاکہ ان کے انداز شاعری کا پتہ چل سکے

بود او بنود ہیچ شئی یکسر آئینہ
کرد از پئے جمال خود او بردر آئینہ
ذات جلال اوست کہ ہمتا پذیر نیست
حسن و جمال خویش نمودہ در آئینہ

لہ ؎ عبارت صاف نہیں۔

در ظلمت عدم شدہ آئینہ پدید
بہ نمود رخ بتار شدہ انور آئینہ

از علم خود محیط ہوا خواہ خلق شد
کرد از صلائے کن ہمہ در منظر آئینہ

شد امر و خلق زاں دم چوں لمح بالبصر
شد نور و نار ہر دو بیک جوہر آئینہ

شد عقل کل و نفس کل و جوہر ہبا
افعال و اسم و مشتق از مصدر آئینہ

شد لوح خامہ عرش و کرسی و نباتات
ہم برجہا منازل و ہم اختر آئینہ

از نور عرش آمد در عنصر آں ظہور
شد نور عکس حسن ز عکس خور آئینہ

از عکس پوچ می شد در جرم مہ ضیاء
از ماہتاب انجم را شد زیور آئینہ

شد باد سبز آئینہ از حکمت حکیم
از قدرت اوست آتش را احمر آئینہ

از صنعت حق آمد اسفید لونِ آب
از خواست حق بیافت تراب اصفر آئینہ

مولود شد ثلاثہ بداں پرتوِ جمال
ہر ذرہ شد خزینہ ز خاکستر آئینہ

از نورِ آدم اند ہم جن و ہم ملک
انساں ز نورِ ذات شدہ بنگر آئینہ

اشیائے ز ماہیت بہ عدم بود بے شعور
اعیان ثابتہ شدہ در مشعر آئینہ

مرات مومن است ز مومن یقین بداں
ممکن و واجب آمد یک دیگر آئینہ

ممکن چوں روئے خویش دراں ذات بنگرد
بیند سوادِ وجہ دراں دفتر آئینہ

واجب صفات نور بہ ممکن چوں ملتفت
گردد بیاض وجہ بہ زیب و فر آئینہ

از بہر حسن روئے تو در دیدہ مردمک
می شد سواد چشم چو از عنبر آئینہ

شد نور دیدہ عکس تو چوں آئینہ است چشم
مرئی و رائی است دراں منظر آئینہ

آئینہ شد چو عشق و معشوق عکس او
عاشق چو ظاہر است دراں مظہر آئینہ

عشق است درد دل تو در و دانش است نور
چوں آتشی کہ باشد در مجمر آئینہ

دل آئینہ است صاف ترین تن غلاف او
بنگر جمال ہست ترا در بر آئینہ

در اصبعین او دل تو خون درون دل
چوں در کفت سنجل و عکست در آئینہ

تا شد تجلیہم ز کیبو نہ عیاں!
گہ آئینہ است عاشق و گہ دلبر آئینہ

زاں وادی کہ طائر عنقا بدیدہ اند
سیمرغ شد بدیدہ سی طائر آئینہ

آں رومیاں کہ نقش نگار ید در سرا
صیقل ز چینیاں پس آں چادر آئینہ

از پادشاہ ششش کہ بماند ند شش نشاں
کے درس کام یافت ازاں افسر آئینہ

آئینہ چوں بدید فریدوں بہ تخت خویش
جمشید دید گوہر در خنجر آئینہ

شد مہر خاتمی کہ سلیماں بدست داشت
کیخسروی بدید دراں ساغر آئینہ

رستاح ساخت آئینہ چوں از حدید تیر
می دید حال عالم اسکندر آئینہ

می کرد حسن او چو تجلی بگونہ گوں
نمود زاں نمائش متمائہ آئینہ
(می کرد حسن او چو تجلی بہ طور ہا)

گہ در جلال گہ بجمالش نمود رخ
شد مختلف بگونہ و بنگر آئینہ

تاب جمال جوشش بہر ذرہ وانمود
زاں گشت ذرہ ہا ہم روشن ہر آئینہ

از غایت ظہور کہ شد ہر کجا محیط
بیند چناں معائنہ در پیکر آئینہ

ادراک کے تواند کردن نظر در آں
نزدیک تر چو باشد در مبصر آئینہ

مقدار تاختن حسن او بہ ہر وجود زانکہ
حسنش تمام ناید در جنبر آئینہ

نورش یکے است بہر آئینہ کہ تافت
رنگش ہماں چو سبز شد از اخضر آئینہ

کس آئینہ نہ داند خود کیست عکس او
ہر کس اگرچہ بیند ہر کشور آئینہ

چوں آئینہ یکے است تجلی یکی نگر
در ہر عدد تو جلوہ را بشمر آئینہ

نے می او بدو سنجل جلوہ یکے کند
جلوہ چو دیگر آید در دیگر آئینہ

چوں آئینہ بدست بیضا دہر کسے
بنید روی مومن و ہم کافر آئینہ

چینی چو دید روئے شود شاد باقرت
زنگی بروئے خویش شود کیفر آئینہ

از صیقل ریاضت دل را تو صاف دار
بہتر چو صد ہزار ز خری از زر آئینہ

روشن شود چو ماہ درخشاں تمام بدر
پہ تو ز روئے یار بیاید گر آئینہ

از صیقل فروغ بباید دل تجسم
گئے روئے روشن نماید از مرمر آئینہ

ہر دم زدائے قلب ز انفاس پاس دار
صیقل شود چو بیش شود خوشتر آئینہ

آئینہ ساختند بسے شاعراں عجب
ہر چند صاف یک بہ دگر بہتر آئینہ

انصاف را نگر تو درین آئینہ بسے
شد گنجہا جو ابر در گوہر آئینہ

از قصر قلب خویش چو گنجے کشید سوز
جوہر بسے نہادہ درین محضر آئینہ

نظم فکری، معنوی، جمالیاتی اور فنی اعتبار سے فارسی شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے "آئینہ" کو شاعر موصوف نے جن مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے وہ انداز امیر خسرو اور بیدل کی یاد دلاتا ہے۔ خصوصاً بیدل نے بھی آئینہ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس سے بڑے گہرے معنی و مطالب اخذ کئے ہیں۔ لیکن یہ نظم اپنی جگہ پر ایک مکمل اور منفرد اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جہاں اس نظم کی عظمت و معنویت کا احساس ہوتا ہے وہیں شاعر کے وسیع مطالعے، تخیل کی بلند پروازی اور احساس کی نزاکت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اسلوب بیان کی انفرادیت شاعر کی عظمت و وقار کا زندہ ثبوت ہے۔ دیوان سے ایک غزل اور پیش کی جاتی ہے تاکہ ان کے رجحان و میلان کی خصوصیت اور ان کی فنی و جمالیاتی وسعت و نیرنگی سامنے آجائے ؂

خوش باشد آں خطائے کز کفر سود دارد
یار ہر دان شب را در شرک نور دارد

باشد کہ زاں خطائے عزمے کند بالا
کز کفر در مؤمنت علمش سرور دارد

درو ادی مقدس می آید و اوچو جویاں

چوں باز ماند آنکس کو رہ بطور دارد
گر خود بنا شد او را درخواہش چو موسیٰ

کے لن ترانی آید کے راہ دور دارد

باشد چوں او خلیلی کے باک نار آید
آں ہمہ آتش گلستاں آتش بجور دارد

گر در یقین تو کل عشقش چل رو نماید

نے جیم او ہراسد نے دل نفور دارد
خود جائے ظلمت او چوں نور اصل دارد

در عرف خود عرو جش برز مرور دارد
گر در تجل وصالش باشد چو محو مطلق

در قول من زانی خوش خوش ظہور دارد
اے سوز جائے خواہی ما و اے دار ہا کن

نماں جملہ چوں گذشتی اینک حضور دارد

مذکورہ نظم و غزل صوفیانہ رجحان و میلان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پورا دیوان متصوفانہ، جذبات و خیالات کا ترجمان و عکاس ہے۔ شاعر نے بہت سی والہانہ فنادگی و ربودگی کے ساتھ اپنے جذبۂ و احساس کا اظہار کیا ہے۔ یہاں دیوان کا تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں۔ اس لئے کہ کلام کا انداز جداگانہ مضمون کا متقاضی ہے۔ ضرورت ہے کہ دیوان کو مرتب کر کے شائع کر دیا جائے تاکہ ادبی دنیا مکمل طور پر واقف ہو سکے۔

حضرت مولانا سید علی احمد جیو دمڑیائی

حضرت سید بہار الدین عرف سید حسین جیو کے صاحبزادے تھے۔ سن پیدائش ۱۶۴۰ء اور سن وفات ۱۶۹۰ء ہے خلیفہ باغ کی مسجد آپ ہی کے عہد میں ۱۰۷۸ھ میں تعمیر ہوئی آپ نے ایک عربی مدرسہ بھی قائم کیا۔ اپنے عہد کے بڑے زبردست عالم اور ملنے ہوئے بزرگ تھے۔ اورنگ زیب اور شجاع نے اپنے اپنے زمانے میں "مولوی معنوی" کے لقب سے یاد کیا ہے وہ فرامین آج بھی موجود ہیں۔ خلیفہ باغ میں مدفون ہیں۔ ایک قلمی مجموعہ عربی زبان میں دستیاب ہے۔ جس کی تفسیر فارسی زبان میں پیش کی گئی ہے۔

سید محی الدین عرف سید میر خورد المعروف بہ میر زندہ پیر

پیدائش سنہ ۱۶۶۱ء مطابق سنہ ۱۰۷۲ھ اور وفات سنہ ۱۷۲۸ء مطابق سنہ ۱۱۴۱ھ ہوئی۔ فارسی میں اردو کی لف پر مشتمل ایک بیاض کے علاوہ متعدد قلمی تصانیف خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ان میں ایک "تفسیر قرآن فارسی" میں اور دوسری تفسیر حروف مقطعات کلام پاک ہے۔ ایک رسالہ عربی علم تجوید میں اور ایک تصوف میں "چراغ معرفت" کے نام سے ہے۔ یہ سب قلمی ہیں۔

"چراغ معرفت" کا موضوع درراہ سلوک و ذکر و شغل ہے اس میں اوراد و وظائف بھی ہیں۔ اس کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔

" الحمد اللہ رب العلمین والصلوٰۃ علی نبیہ محمد و آلہ اجمعین۔

لہ بنام آنکہ

آنکہ جاں را فکر دادہ۔ چراغ معرفت در دل
نہادہ لہ بنام خداوند رب الرحیم۔ بیان کردہ
معنی ز لفظ این حکیم)

دوسرا شعر حاشیہ پر لکھا ہوا ہے۔

اما بعد! بندہ اضعف العباد ہمیں سید علی احمد می گوید کہ چند سطر کہ ارباب معانی و سخن سنجان یقینی درراہ سلوک و ذکر و شغل فرمودہ بہ فقیر معلوم گشتہ در حیز تحریر آوردہ

درراہ سلوک سالکاں می باش
درراہ شہود شاہداں می باش

روز جمعہ سنہ ۱۱۳۶ھ بتاریخ ہفتم شہر ربیع الثانی در عمل بادشاہ جہاں پناہ محمد شاہ غازی خلد اللہ ملکہ، دا علی عمرہٗ وشانہٗ ترصد از اخلاق بزرگان ایں انداز دکہ اگر خطائے رفتہ باشد عفو فرمایند وقلم موضح تصحیح نمایند۔ باللہ التوفیق۔

تفسیر قرآن کے پہلے صفحہ پر یہ تحریر ملتی ہے۔ ایں تفسیر بتاریخ لبیت چہارم شہر شوال سنہ ۱۱۳۳ھ گفتہ شد سنہ ۳ جلوس ابوالفتح ناصر الدین بادشاہ محمد شاہ غازی مدظلہٗ وطول عمرہٗ۔

کتاب کا دیباچہ یہ ہے: ـ

الحمد اللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد و آلہ اجمعین۔ اما بعد: ـ می گوید فقیر میر سید علی احمد حسینی قدس سرہٗ چوں بعضے عزیزاں و دوستان التماس نمودند و ملتمس گشتند کہ بعضے آیات کریمہ را کہ اکثر مفسران طول پرداختہ زود۔ بفہم نمی درآید۔ اگر مختصر نمایند بہتر باشد، لہٰذا از تفسیر بعضے مفسرانِ معتبر برآوردہ نوشتہ شدہ۔ امید از الطاف صاحب کرم اندازد کہ اگر خطائے رفتہ باشد۔ عفو فرمایند وقلم بتصحیح نمایند۔ ھو اللہ الموفق والمعین والتوفیق بالیصین۔

اس کے بعد تفسیر شروع ہوتی ہے۔ اس کا انداز ملاحظہ ہو۔

اول اعوذ را نوشتم کہ اللہ تعالیٰ فرمودہ ......[1]

ما مستعد باللہ اعوذ باللہ من الشیطانِ الرجیم پناہ می جویم من بخدائے عز و جل از شیطان رجیم ایں اے سخت نافرماں بردار و سخت بدبخت۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدا آغاز می کنم بنام پاک اللہ تعالیٰ کہ اسم ذات است الرحمان صفت کہ بخشندہ و پیدا کنندہ خلقت عالم و آدم است۔ و دہ آں زندہ روح۔ و رحیم الرحم صفت دیگر کہ بخشندہ جرم و قبول کنندہٗ توبہ کہ جرم می بیند از بندہ دیگرم

خود می بخشد و کاری سازد کہ کارساز حقیقی اوست۔ اس کے بعد سورہ فاتحہ اور سورہ بقر یعنی ربع پارہ الم کی چند آیات کا مختصر ترجمہ و تفسیر لکھی ہے۔ یہ حصہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے بعد ازاں آٹھ صفحات پر رسالہ تفسیر حروف مقطعات کلام پاک ہے جس کا دیباچہ یہ ہے۔

الحمد اللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین۔ اما بعد می گوید بندہ ضعیف فقیر میر کہ حروف مقطعات قرآن مجید کہ معنی آں بعضے مفسراں نوشتہ چوں عزیزاں بایں ملتمس گشتند کہ معنی ایں حروف ہا را شما مختصر کردہ بنویسید بنا براں از تفسیر معتبر متداولہ برآوردہ نوشتہ شد۔ بہ جا داسق از بزرگاں آں است اگر خطائی رفتہ باشد قلم تصحیح فرمایند۔

اللہ المفق والمعین بسنہ یک ہزار و یک صد ۱۱۳۴ھ سی و چہار ہجری و سنہ ۴ چہار جلوس شہنشاہ ابن الخاقان ابن الخاقان ابن الخاقان ابوالفتح معین محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و عمرہٗ وشانہٗ۔

یہ دونوں رسالے بے حد خوش خط صاف ہیں اور اعلیٰ درجے کی خطاطی کا نمونہ ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں خطاطی فن کی حیثیت سے بھاگلپور میں رائج تھی۔ قیاس یہ ہے کہ یہ رسائل و تصانیف خود میر زندہ پیر کے نوشتہ ہیں۔ کیونکہ آخر میں کاتب کا نام نہیں ہے۔

شیخ عطاء اللہ بخاری نے ان کا ایک نوحہ لکھا ہے جس میں ان کے خوارق و عادات بیان کئے ہیں جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا

شیخ عطاء اللہ

حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد بس اتنا پتہ چل سکا کہ سید میر زندہ پیر کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سید میر زندہ

[1] حروف مٹے ہوئے ہیں۔

پیر کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سید میر زندہ پیر کی وفات پر ایک نوحہ لکھا۔ جس کا نام یہ ہے۔ " نسخہ تواریخ سید میران ملا علی احمد حسینی " ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ تحریر نظر آتی ہے۔

" نسخہ تواریخ میر سید میران ملا علی احمد حسینی تصنیف شیخ عطار اللہ حق ملکیت فقیر محمد حسن ولد میر سید میران ملا علی احمد حسینی کسے کہ دعوی کند باد گردد۔

مثنوی کے آغاز میں شاعر کا ایک خود نوشت مختصر دیباچہ موجود ہے ملاحظہ ہو۔

بحمد اللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام سید المرسلین وعلی آلہ الطاہرین واہل بیت الطیبین واصحاب المکرمین اما چنین گوید خاک پائے اہل اللہ سید عطار اللہ عباسی قادری کہ بینے چند در خوارق حالات عارف معارف اسرار کاشف مکاشف اشارہ تہرین نتیجہ سید الابرار، دوحہ گزین حیدر کرار، بندگی حضرت سید میر و بعضے احوال سید السادات پدر بزرگوار شی رضوان اللہ علیہم ......[1] و مناقب فرزندان نام دارش ابقاہم اللہ الی یوم الدین کہ ہر یکے شہسوار مضمار ہدایت و رہبری و نیز ذو الاقتدار برج ولایت و مہتری اند بدستاری توفیق واشمار درارشاد آں دانائے تدقیق بتاریخ ہفتم شہر جمادی الاول سن یک ہزار و یک صد وچہل و یک من الہجرت در رشتہ نظم کشیدم۔ چشم داشت از مردمان این دلالی آب دار کہ از بحر ذخار طبع نامستقیم و ذہن سقیم این ہیچ نشناس بر آمدہ آنست ہر جائے کہ از ربط نامربوط مالیرہ اصلاح آرا اند۔ وز لور خلاح درلیغ ندارند والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔

نظم کا عنوان یہ بیان کیا گیا ہے ؎

بیا ساقی بیا از کام دل ہا
ز فیضت یک چمن گل فام دل ہا

فغان و شور لبس شب گیر دارم
کہ در دل سوگ سید میر دارم

یہ نظم چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ۲۳۱ اشعار ہیں۔ جن میں درج بالا دو شعر بھی شامل ہیں۔ مرثیہ کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

بیا اے دل دمے در سوگ و غم باش
درون پر خون شدہ از دیدہ نم باش

برآوردی اگر لبس سوز و لبس غم
بہ سوگ میر شو دمساز یک دم

بہ سازِ غم دگر نوحہ برآور
بہ آب بے غمان زن یک دم آذر

چکان خونِ سیہ از نوک خامہ
ز خونِ دل مطرز سازنامہ

ان کے کرامات و کمالات کا ذکر سنیئے:۔

کرامات و کمالاتش چہ ... گویم
چو کلک خود مگر از سر بپویم

اگر عمری بوصفش بگذرانم
قلم گوید کہ من قاصر لسانم

ز شادی و ز غم آزاد می زلیست
درین غم خانہ ہر دم شادی زلیست

بہ بھاگلپور چون او کس نبودہ
بہر اوصاف در خلقے ستودہ

ز فقدش دیدہ ہا گر دیدہ پرنم
کہ بارہ بخش یک افزاید لعبد غم

---

[1] تحریر دھندلی ہے اس لئے پڑھی نہیں جاتی۔

بمائے فہم اھل روزگار است
ہزار دیکصد و چل یک شمار است

در میان میں بڑی عقیدت کے ساتھ ان کے
مرید ہونے کا فخریہ ذکر کیا ہے ؎
تو اے ناداں کجی دانی کیم من
برائے چیستم بہر چیسم من
اگر گوئی مریدی گفتہ باشد
بہ مدح پیر دری سفتہ باشد
زخود اندر جہاں پیداست ایں راز
کہ داند ہر کسے ز انجام و آغاز

پیر سے گہری عقیدت رکھتے تھے ؎
یکایک گفتہ ام از حالت خویش
دریں نامہ تصور کن میندیش
ز توفیق خدا وز حکم احمد
ہم از ارشاد آں دانائے سرمد
زامر مرتضیٰ ز ایمائی آں میر
چنیں نظمی در آوردم بہ تحریر
ز فضل او ہمیں امید دارم
کہ بخشاید بہ حشر او کردگارم
اگرچہ پیش مردم بس حقیرم
تو نگر دل شدم مداح میرم
بمدح میر را ندم حرف بسیار
اگر ز ر نیست گو ہر کن ز ایثار
ز فیضش یافتم در دہر بس کام
بماندم ہم بہ دہر کہنہ اش نام
الٰہی سایۂ آں سہ جواں بخت
کہ با بخشد وہم حشمت وہم رخت
بہ فرق طالبانش باد جاوید
رخ ایشاں منور تر ز خورشید
رخ شان قبلہ اہل صفا باد
نگہ دارش علیؓ و مصطفےٰ باد
درود و ہم دعا و ہم سلام
بر او بر آں و اصحابش تمام

ان اشعار سے ان کی تخلیقی صلاحیت کا بخوبی اندازہ
ہو جاتا ہے۔

سیّد شاہ اسد اللہ عرف سید نھقو دمڑیائی

سنہ پیدائش ۱۶۸۳ء اور سنہ وفات
۱۷۳۸ء ہے۔ فارسی زبان میں ایک قلمی رسالہ
"رسالہ در سعد و نحس" ملتا ہے۔
سید شاہ اسد اللہ عرف سید نھنو سید میر زندہ
پیر کے صاحبزادہ تھے۔ سن پیدائش و وفات کا علم نہ
ہو سکا۔ ایک قلمی رسالہ "رسالہ نجوم حصہ سوم" فارسی
میں دستیاب ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دو رسالے
حصہ اول اور حصہ دوم بھی رہے ہوں گے۔ جواب ناپید
ہیں۔ ان کے علاوہ "اوراد فتیحر" اور "رسالہ تخلیات"
بھی قلمی دستیاب ہیں۔

شاہ سید میر عرف شاہ میرن سیّد شاہ

اسد اللہ کے صاحبزادے تھے۔ سنہ پیدائش ۱۷۰۶ء
اور سنہ وفات ۱۸۰۳ء ہے۔ اپنے عہد کے صاحب
دل صوفی گذرے ہیں۔ فارسی میں ان کے انتالیس رقعات
کا ایک منتخب قلمی مجموعہ ملتا ہے۔ "رسالہ حسینی" میں

انہوں نے خاندان دمڑیا بہار کا نسب نامہ تحریر کیا ہے۔ یہ بھی قلمی ہے ایک تصنیف " سفینہ " بھی ملتی ہے ۔

شاہ اسداللہ ثانی عرف شاہ چاماں

سنہ پیدائش ۱۷۶۳ء اور سنہ وفات ۱۸۳۳ء ہے ۔ تین بیاضیں اور ادو وظائف میں ملتی ہیں جن کی زبان عربی و فارسی ہے۔ " بحر الغرائب " بھی ایک تصنیف ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دوہے بھی لکھے تھے لیکن نمونۂ کلام نہیں ملتا ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں اردو اور دوسری مقامی بولیوں کو ادبی طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا ۔

شاہ عنایت حسین عنایت

حضرت شاہ اسداللہ ثانی عرف شاہ چاماں کے فرزند ارجمند تھے۔ پیدائش ۱۷۸۶ء اور وفات ۳۱ مئی ۱۸۷۳ء کو ہوئی ۔ بہت سی تصنیفیں ، اور رسائل ملتے ہیں ۔ ایک رسالہ " نحس و سعد مطابق ہندو دھرم " اردو زبان میں ملتا ہے ۔ " شگون " دوہے کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ " جواہر الحروف " اور " سراج الفوائد " دو تصنیفیں ملتی ہیں ۔ ایک رسالہ اردو " جواز تعزیہ داری " پر ہے ۔ بڑے بے مثل شاعر تھے ۔ دوہے ، غزلیں ، قطعات ، رباعیات کی صنفوں میں ان کی بے شمار تخلیقیں ملتی ہیں ۔ سب کی سب قلمی صورت میں ہیں ۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار اور دوہے پیش کئے جاتے ہیں ۔

غیروں پر کرنا کرم ہم پر ستم واہ واہ
بوجھ لیا آپ نے صنم واہ واہ

آپ میرے روبرو کرتے ہیں کیا گفتگو
جھوٹ نہ کہنا کبھو تم کو قسم واہ واہ

تیری عنایت کا دم بھرتا ہوں میں اے صنم
ہووے نہ کچھ بخشش و کم تیرا کرم واہ واہ

ہے یہ غلام اسد شاہ عنایت حسین
کیوں نہ ہو اس پر کرم شاہ امم واہ واہ

جھلک جب تک نہ دیکھیں آفتاب لایزالیکا
بھلا کیونکر چھوٹے گا پوجنا در گاہ کالیکا

ارے او بے خبر ٹک دیکھ لے واحد کو کثرت میں
ہر اک کم فہم کیا سمجھے مزا نازک خیالیکا

ظہور حق برنگ مختلف ظاہر ہے ہر شے میں
دیکھنا صانع قدرت کو ہے ہر دم خیالیکا

حسینا ہے جو اسداللہ تیرا مرشد کامل
دیکھا جس نے تجھکو سید ھا رستہ لازوالیکا

عجب وقت قاصد روانہ ہوا ہے
کہ اشک اوسکی خاطر بہانا ہوا ہے

جو جانا ہوا پھر نہ آنا ہوا ہے
اوسی فکر میں دل دیوانا ہوا ہے

لگی دیر کیوں اس کے آنے میں یارو
کہ ہر وقت دل کا دکھانا ہوا ہے

حسینا ملادے خدا تجھ کو ان سے
کہ جن کے ملے کو زمانہ ہوا ہے

نوحہ

بین کرتی ہیں زینب بچاری
ہائے کیسی ہے قسمت ہماری

کیا کیا مجھکو فلک نیں ستایا
شہر بانو کو بیوہ بنایا

ہر طرح کی اذیت چکھایا
ہائے اللہ میں تجھ پر واری

رور و کرتی تھیں یہ بین زینب

ہائے اللہ میں تجھ پر واری

شاہ عنایت حسین صاحب کی بے شمار غزلیں، دوہے اور رباعیات وغیرہ خلیفہ باغ کی لائبریری میں قلمی شکل میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے کلام کا ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کر کے اسے شائع کر دیا جائے۔ خاندان دمڑیا کا فرض ہے کہ وہ ان کے کلام کو ضائع ہونے سے بچائے۔ اور اشاعت کا اہتمام کرے ورنہ اردو ادب کا ایک قرض ان پر رہے گا۔

ان کی ایک تصنیف کرامت خاندان شاہ دمڑیا ہے یہ خود نوشت ہے۔ اس کے آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں فی الحال اس کے بائیس صفحات موجود ہیں۔ موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ کتاب کی ابتدا فارسی سے ہوئی ہے۔ لیکن بعد میں اردو کی تحریر ملتی ہے۔

صفحہ ۱۴ کی یہ عبارت محتاج توجہ ہے۔

"...... نقل است کہ حضرت سید راجو محال درویش کامل بودند و قرابت برادری با حضرت میر ملک فتح اللہ می داشتند و ہموارہ در سیاح مشاغلت می داشتند بعد از مدت تشریف آوردند و از حضرت سید حسن بدین زبان فرمودند کہ ——— یا ——— سید حسن تم اپنے بڑھا سب کو بلاؤ کہ ہم اپنی آنکھ سے ان سب کو دیکھیں چنانچہ کسی خدمت گار کو سید حسن نے واسطے بلالانے لڑکوں کو بھیجا۔ حسب اتفاق پہلے حضرت سید احمد بڑے بیٹے آئے "

اس اقتباس سے اس عہد کی اردو نثر کا نمونہ سامنے آجاتا ہے۔ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بھاگلپور میں اس عہد کے ادیبوں اور شاعروں نے اردو نثر کو باضابطہ اپنا ذریعۂ اظہار (Medium) بنا لیا تھا۔ حالانکہ جدید اردو نثر کا سراغ میر امن کی قصہ چہار درویش کے بعد پھر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ اردو کی تاسیس بیک وقت سارے ہندوستان میں ہوئی۔ کسی خاص علاقے یا خطے کو اردو کی تاسیس کا بنیادی مرکز نہیں قرار دیا جاسکتا اس ضمن میں شاہ جنگی تالاب کے اس کتبے کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس کا ذکر اگلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

پہلا دور

(حصہ دوم)

حروف تہجی کے اعتبار سے اس شہر کا دوسرا اہم خاندان مولانا شاہ باز محمد (شہباز) رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو بھاگلپور میں دسویں صدی ہجری کے اواخر سے آباد ہے مولانا صفی العالم صاحب مدظلہ سجادہ نشین خانقاہ شہبازیہ بھاگلپور کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق اس خاندان کی اجمالی تاریخ یہ ہے کہ حضرت موصوف کے اجداد کرام عراق کے تخت شاہی کو چھوڑ کر شاہان تغلق کے زمانے میں بنارس تشریف لائے۔ راجہ بنارس سے ایک جنگ میں اس خاندان کے سولہ افراد شہید ہوئے۔ بنارس میں وہ خاص جگہ گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس خاندان کے تین افراد مع متعلقین بہار آئے۔ پٹنہ میں اس وقت ملک ابراہیم بہار صوبے کے گورنر تھے۔ انہوں نے بڑی عزت و احترام

کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اسی زمانے میں گیا کا وسیع علاقہ بغاوت کا شکار رہا۔ اندرا اور پرکاش نام کے دو اشخاص باغیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ بادشاہ اور صوبے کا گورنر اس بغاوت سے عاجز آچکے تھے۔ اسی زمانہ میں خزانۂ شاہی کے لٹ جانے کا ایک سنگین واقعہ پیش آیا۔ ملک ابراہیم بیا کی بڑی سختی سے سرزنش کی گئی۔ ان تینوں حضرات نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھایا اور فوج و سپاہ کے ساتھ اس علاقے میں پہونچے بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ باغیوں میں اندرو مارا گیا۔ اور پرکاش گرفتار ہوا۔ اس حملے میں گیا کا وہ تمام علاقہ ان حضرات کی نذر کر دیا گیا۔ جواب" اساس دیورا کے نام سے مشہور ہے گیا کے ان علاقوں میں ان ہی حضرات کے ذریعے علم دین کی روشنی پہونچی۔ وہ لوگ سادات عباسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

عہد ہمایوں میں بھی مذکورہ خاندان ہر اعتبار سے عروج و ترقی پر گیا۔ اس کے افراد میں بڑے بڑے علماء اور فضلا ہوئے۔ اسی خاندان میں سنہ ۹۵۵ھ میں حضرت مولانا شہباز محمد رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سنہ ۹۵۶ھ ان کی تاریخ پیدائش تحریر کی ہے۔ البتہ سنہ وفات کے متعلق تذکرہ نگاروں کی اکثریت متفق ہے کہ سنہ ۱۰۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ والد بزرگوار کا نام حضرت محمد عمر الخطاب اور دادا کا نام حاجی نیر الدین بخاری رحمتہ اللہ علیہ تھا۔

حضرت مولانا شہباز علوم ظاہری و باطنی سے کما حقہٗ متصف تھے۔ بھاگل پور میں ان کی آمد کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ جب یہ حج بیت اللہ شریف کو تشریف لے گئے تو وہاں بشارت ہوئی کہ بھاگل پور کی سرزمین پر تبلیغ دین کی خدمت انجام دیں۔ حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد جب دیورا تشریف لائے تو اپنے والد بزرگوار اور خاندان کے تمام افراد کے ہمراہ بھاگل پور کے لئے روانہ ہوئے راستے میں آپ کا قیام مونگیر میں ہوا وہاں نو سال تک ٹھہرے وہیں حضرت مولانا شاہ یٰسین سامانی الدہلوی کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی۔ مولانا شاہ یٰسین احمد کا تعلق سادات سامانہ سے تھا۔ ان کے بزرگوں نے بعد میں شیراز میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس لئے ان کا تعلق سادات شیراز سے بھی ہو گیا۔ سادات سلامیہ کے نام سے بھی وہ خاندان کو یاد کیا جاتا ہے مولانا عبدالحق محدث دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین صفوی آپ کے چچیرے بھائی تھے۔ ان کے تذکرے میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ملا بدایونی نے بھی منتخب التواریخ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

مونگیر میں نو سال قیام فرمانے کے بعد حضرت مولانا شہباز محمدؒ سنہ ۹۸۵ھ میں بھاگل پور تشریف لائے۔ اس وقت بھاگل پور قصبۂ بھاگل پور تھا۔ یہاں سب سے پہلے مصطفیٰ پور میں قیام فرمایا۔ یہ جگہ بھاگل پور سے تقریباً چھ میل کی دوری پہ ہے۔ جو اب جمگاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ جمگاؤں پورینی سے متصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں مکاشفہ ہوا کہ یہ جگہ آپ کے رہنے کی نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں سے ملا چک قصبہ بھاگل پور تشریف لائے۔ اور وہیں اقامت پذیر ہوئے۔ اسی جگہ حضور کا آستانۂ عالیہ اور مرقد انور ابھی بھی زیارت گہ خاص و عام ہے۔

جس وقت بھاگل پور تشریف لائے تھے آپ کے ہمراہ دو سو حضرات تھے۔ جن میں خلفایان، صاحبزادگان اور شاگردان وغیرہ تھے۔ بھاگل پور آنے کے بعد بھی اساس دیورا سے لوگوں کی آمد یہاں جاری رہی۔ چنانچہ قاضی شاہ محمد صاحب ایک بزرگ جو آپ سے قرابت قریبہ بھی رکھتے تھے اساس دیورا سے بھاگل پور تشریف لائے۔ موصوف اپنے

عہد کے بڑے صاحب فضل و کمال گذرے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر بھاگلپور کے قاضی القضات کی ذمہ داری سپرد کی۔ اور سکونت کے لئے ایک جگہ عنایت کی جس کا نام محلہ قاضی چک ہے۔ وہاں آج بھی آپ کا مزار موجود ہے۔ آپ کے صاحبزادہ ملا احسن اللہ صاحب احسن اپنے عہد کے بڑے ہی صاحب طینت بزرگ اور عالم فاضل گذرے ہیں۔

ملا احسن اللہ صاحب حضرت مخدومنا مولانا شہبازؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت مخدومنا مولانا عبدالسلامؒ کے صاحبزادے مولانا صالح صاحبؒ کے داماد تھے۔ اور حضرت مولانا عبدالسلامؒ کے شاگرد خاص مولانا عبدالسلامؒ کے زیر درس آپ نے علوم و معرفت کی منزلیں طے کیں۔

ملا احسن اللہ صاحب ہی سے اس خاندان میں شعر و شاعری کا سلسلہ ملتا ہے۔ ان کے قبل جو بزرگ گزرے ہیں ان کی کوئی شعری تخلیقات دستیاب نہیں۔ اس لئے انکے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا غیر مناسب ہے ملا صاحب موصوف کو شعر و سخن سے بڑا گہرا شغف تھا۔ عربی زبان میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے۔ اس میں چھ بیس بند ہیں مطلع یہ ہے ۔

یا امیر المومنین اولی الولی
یا دلیلی فی الخضایتہ والجلی
انت یا بب الصلم رب العلی
فضلتہٗ من فضلک لی تمتلی
یا علیؑ یا علی یا علی

اس قصیدہ کا آخری بند درج ذیل ہے جس میں احسن اللہ صاحب کا تخلص بھی آیا ہے۔

احسن اللہ الذی یب جوعلیک
یا ابا حسنین احسن من الدیک
جملۃ الحسنۃ جادت من الدیک
اعصا ھی لیس قطا الا المیک
یا علیؑ یا علیؑ یا علیؑ

اس قصیدہ کے علاوہ ان کی کوئی اور تخلیق ہم دست نہیں۔ لیکن قرینہ اغلب یہ ہے کہ عربی و فارسی میں اور بہت ساری تخلیقات ان کی رہی ہوں گی۔ جو زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ یا جن کے حصول کے لئے خانقاہ ملا چک کی نجی لائبریری کی با ضابطہ خاک چھاننے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ بڑی تلاش کے بعد فارسی میں ان کا ایک شعر دستیاب ہوا جو درج ذیل ہے۔

احسن اللہ ہر دو جا دارد امید از لطف تو
فضل فضلش بر سرش چوں سایۂ عرش خدا

مولانا احسن اللہ صاحب کے عربی قصیدے کی فارسی شرح حضرت مولانا عاصلؒ صاحب نے کی ہے عاصل صاحب ابن مولانا محمد عاقل صاحب ابن مولانا محمد عاصم صاحب ابن مولانا محمد صوفی صاحب ابن مولانا شہبازؒ اپنے عہد کے بڑے پایہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ عربی و فارسی علوم پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ ان کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔

سید رضی الدین رضی

بھاگلپور کے مشہور خاندان، خانوادہ شہبازیہ کے تربیت یافتہ تھے۔ حالات زندگی پردۂ تاریکی میں ہیں مآثر الامراء اور مآثر عالمگیری میں ان کے مختصر حالات ملتے ہیں۔ یہ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں سے تھے مآثر

عالمگیری میں صفحہ ۶۷ (مترجمہ محمد فدا علی طالب) ان کے متعلق یہ لکھا ہے " کوکلا جاٹ جو گینہ کے مفسدوں کا سرگروہ اور بے حد سنگدل قزاق تھا۔ جس کے ناپاک وجود کی وجہ سے عبدالنبی نے شہادت پائی تھی اور نیز جس کافر نے سعد آباد کو تباہ و برباد کیا تھا حسن علی خاں کی کوشش سے گرفتار ہوا۔ اس بدبخت کے گرفتار کرنے میں رضی الدین نے بھی بے انتہا کوشش کی ......

شیخ رضی الدین بھاگلپور، بہار کے شرفاء میں تھے یہ فاضل مؤلفین فتاویٰ عالمگیری میں شامل تھے اور تین روپیہ یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ شیخ رضی الدین علاوہ ایک فاضل ہونے کے فن سپاہ گری میں کامل تھے۔ اور عملداری وغیرہ کمالات میں بھی ان کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔

حضور پر نور کے محتسب قاضی محمد حسین و مقرب درگاہ مسمیٰ بختاور خاں نے ان کے کمالات وجوہر قابلیت سے قبلہ عالم کو آگاہ کیا۔ بادشاہ ہنر پرور نے ان کو ایک صدی منصب دار مقرر فرمایا۔ رفتہ رفتہ حسین علی خاں کو اعانت و امداد اور اپنی سلیقہ شعاری سے مرتبہ امارت و خانی پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے "۔ فتویٰ عالمگیری کے مؤلفین ہندوستان کے منتخب فضلاء تھے۔ شیخ رضی الدین کی اس گروہ میں شمولیت ان کے کمال علوم و افضال کی فی نفسہ ایک روشن دلیل ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ان کے حالات و کمالات زندگی محفوظ نہ رہ سکے۔ بہرکیف یہ طرۂ امتیاز بھاگلپور کی خاک کو حاصل رہا کہ اورنگ زیب کی نگاہ انتخاب بھی بھاگلپور کی معترف رہی۔

مولانا رشید صاحب رح

حضرت مخدومنا مولانا شہباز رح کے اخلاف میں تھے۔ ان کا سلسلہ اس طرح ہے۔ ابن مولانا مرشد صاحب رح ابن مولانا عابد صاحب رح ابن مولانا عاصم صاحب رح ابن مولانا صوفی صاحب رح سیالکوٹی ابن حضرت مولانا شہباز رح پیدائش ۱۱۶۰ھ اور وفات ۱۱۸۶ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا عابد صاحب رح سے حاصل کی۔ ان کے علاوہ اپنے چچا ہادی صاحب رح اور دوسرے بزرگوں کے زیر تربیت بھی رہے۔ بڑے ہی تقویٰ شعار اور عابد شب زندہ دار تھے۔ اور اپنے عہد کے ایک زبردست عالم۔ مزار ملاچک میں ہی زیر آستانۂ عالیہ ہے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے ؎

چہ خوش وقتے کہ یارم در کنار است
ز فکر دو جہاں دل بر کنار است
بہ امید یکہ گر دیدم بہ عالم
بجاں عاصل ہمیدم در دیار است
چہ منت ہاکہ مارا پیش خود خواند
کہ مثلم در پئے او صد ہزار است

حضرت مولانا عاصل صاحب

حضرت مولانا عاصل صاحب ابن حضرت مولانا محمد عاقل ابن مولانا محمد عاصم ابن مولانا محمد صفی سیالکوٹی رح ابن مولوی المعنوی حضرت مولانا شہباز رح۔ عاصل صاحب کا سنہ پیدائش ۱۱۱۰ھ اور سنہ وفات ۱۲۱۶ھ ہے ان کا شمار خاندان شہبازی کے بزرگ و متبحر علماء میں ہوتا ہے ان کی ذات مخزن علم و فضل اور مصدر رشد و ہدایت تھی کئی نادر الوجود تصانیف تھیں جو اب تقریباً نایاب ہیں۔ ان نسخوں میں ایک نسخہ مولانا احسن اللہ صاحب کے عربی قصیدہ کی فارسی تشریح کا ہے۔ جس کا ذکر درج بالا سطور میں کیا جا چکا ہے۔ اس شرح کے خاتمہ پر ان کے کچھ فارسی اشعار ملتے ہیں جو یہاں پیش کئے جاتے ہیں ؎

یا علی ما سر بسر غرقیم بدریائے گناہ
دستگیریت واولادت بود مارا پناہ

نفس آمادہ مرا در این جہاں کردہ تباہ
نامۂ اعمال من از معصیت گشتہ سیاہ

حضرت مولوی ناطق صاحب

سنہ پیدائش ۱۲۲۳ھ اور وفات ۱۲۹۶ھ ہے۔ یہ سنہ ۱۲۸۸ھ میں مدھیپورہ ضلع بھاگلپور میں عہدہ منصفی پر فائز تھے۔ خاندان شہبازی کے لائق فرد تھے مدھیپورہ کے بعد سیوان منصف درجہ اول کی حیثیت سے تشریف لے گئے۔ وہاں دوران قیام میں اپنے صرف خاص سے ایک مسجد خاص کورٹ کمپاؤنڈ میں تعمیر کرائی اور اس کے انتظام و انصرام کے لئے اپنی ذاتی جائدادیں وقف کر دیں۔ مسجد آج بھی لفضلہ قائم ہے۔ آپ جب اپنے شہر بھاگلپور تبادلہ پر آئے تو مکان سے متصل ایک دوسری مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی موجود لفضلہ آباد ہے۔ چونکہ طبیعت میں سادگی تھی اور روش فقیرانہ اس لئے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد بقیہ عمر گوشہ گیری میں بسر کی۔ اور علم و فضل کے طلب گاروں کو فیض پہونچاتے رہے۔

شعر و ادب کا ذوق تھا "حدیقۂ شہبازی" کے خاتمہ پر آپ کا موزوں کردہ قطعہ تاریخ سال طبع ملاحظہ ہو ؎

کرد شہرت چوں رقم تذکرۂ مولانا
بہ چنیں مختصر از کلک چمن پردازی
سال تصنیف چہ خوش گفت محمد ناطق
حرز جن و لبشر این معجزۂ شہبازی

۱۲ ھ ۸۸

ان کے کلام کے نمونے حاصل نہ ہو سکے۔ مدھیپورہ کے دوران قیام میں محمد شاہ شہرت عظیم آبادی سر رشتہ دار کی حیثیت سے تھے۔ بڑے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور مولوی محمد ناطق صاحب سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ شہرت نے آپ کی شان میں مسدس لکھی ہے۔ نمونے کے اشعار درج ذیل ہیں ؎

سید مستند رفیع الشان
عالم با عمل فصیح زبان
منصب عادل و گل فائق
مولوی محمد ناطق

دل سے پابند شرع دین رسول
کیوں نہ عالم میں وہ ہیں مقبول
سرفرازوں میں کیوں نہ ہوں ممتاز
ہے گل باغ گلشن شہباز

صابر و شاکر و حلیم و کریم
خصلتیں ان میں چاروں ہیں قدیم
سائل اس در سے کب پھرا محروم
دیدیا جس کے جو کہ تھا مقسوم

داد بخشی میں وہ قصور معاف
معجزے سے نہیں ہے کم انصاف
صرف دور مان عالی کا
بے بہا ہے وہ اک دریکتا

از حدیقۂ شہبازی

حدیقۂ شہبازی ایک تذکرہ ہے جس کے متعلق خود شہرت یوں رقم طراز ہیں۔

" سنہ ۱۲۸۶ھ میں حسب ایمائے ظل اللہ نصفت پناہ مقید صوم پابند صلوٰۃ عابد و زاہد خجستہ صفات، سخاوت شعار، عابد شب زندہ دار شہرۂ آفاق جناب شاہ محمد الحق ڈپٹی کلکٹر بہار ضلع بھاگلپور کے نسبت خصوصیت معتقدانہ و عقیدت با خلوص شاگردانہ

اس خاندان عالی سے رکھتے ہیں، زبان فارسی میں کچھ مختصر حالات والا دودمان عارف رموز یزدانی مقبول بارگاہ سبحانی سرکردہ اولیاء اللہ مقتدائے کاملین حق آگاہ جناب مولانا شہباز محمد قدس سرہٗ العزیز بہت تھوڑا بلکہ تھوڑے سے بھی تھوڑا زیب قرطاس ہوا تھا۔ بالفعل یہ منظور خاطر ہوا کہ فارسی سے اگر زبان سلیس اردو میں قلم بند ہو جاوے تو نہایت خوب خاص و عام کے مرغوب ہو .... بہ خیال اس کے کہ ذکر بزرگان با صدق و صفا سررشتہ نجات آخرت ہے سطریں چند مسمیٰ بہ حدیقۂ شہبازی کے نام تاریخی اس کا " ذکر شہباز احمد " ہے۔ صفحۂ قرطاس پر منضبط کرتا ہے۔

(حدیقۂ شہبازی مطبع مفید عام پریس)

حدیقۂ شہبازی اردو تذکروں میں تقدم کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے یہ تذکرہ اس دور میں لکھا گیا ہے جب کہ عام طور پر اردو میں باضابطہ تصنیفوں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ تذکرہ مذکور کی ادبی حیثیت " آب حیات " وغیرہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اردو نثر کے اولین نمونوں میں اس کا بڑا اہم مقام ہے۔ اور جدید اردو نثر کے ارتقاء میں اس تذکرہ کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

خان بہادر راحق صاحب احقر

سنہ ۱۲۳۵ھ و سنہ ۱۲۳۷ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ سنہ وفات سنہ ۱۳۱۳ھ ہے۔ عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ اور بھاگلپور کی سماجی زندگی میں سدھار پیدا کرنے کے لئے تعمیری اقدامات عمل میں لاتے رہے۔ سرسیدؒ کے طرز پر اپنے صرف خاص سے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ اور انگریزی تعلیم رائج کی۔ تقسیم اسناد کے جلسہ میں بہار کا انگریز گورنر شریک تھا۔ احقر کو شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ مگر افسوس کہ کلام نایاب ہے۔ چند اشعار ملے ہیں جو پیش کئے جاتے ہیں

کیا محفل میلاد ہے عالی درجات
ہر سمت سے ہوتا ہے نزول برکات
حضار کا اس بزم کے رتبہ اولیٰ
بے خوف وہ جاتا ہے میان عرصات

اس محفل اقدس کی تجلی دیکھو
ہر برگ و شجر ہو گا معلی دیکھو
صف باندھے ہوئے یاں پہ ملائک ہیں کھڑے
پلڑے پہ محمدؐ ہیں یہ پلّہ دیکھو

ہوتا ہے جہاں مولائے عالی کا بیاں
آتی ہے ندا درود کی ہر سمت سے واں
ہے رتبۂ عرش اس مکاں کو حاصل
جس گھر میں کہ اس بزم کا ہووے عنواں

ہے عشق محمدؐ سے خدا کو واللہ
وحدت سے جو کثرت ہوا اللہ اللہ
کیونکر نہ ہو اس نام کے صدقے احقر
ہے ورد زباں صبح و مسا صلی اللہ

ان کی ذات پر دور اول کے حصۂ دوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے:

دوسرا دور

۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۰ء

۱۸۵۷ء کے بعد بھاگلپور کی ادبی تاریخ کا دوسرا دور متعین کیا گیا ہے۔ اس دور میں بھاگلپور کی سماجی، تہذیبی، علمی و ادبی فضا کم و بیش انہیں حالات سے متاثر رہی جن سے اس دور کا ہندستان متاثر تھا۔ چونکہ بہار کے علاقے میں انگریزوں کی تجارتی کمپنیاں خصوصاً نیل کی تجارت انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی اور سلسلہ بہار و بنگال میں ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے انگریزوں کے گہرے اثرات یہاں کے رہنے والوں میں اذہان و قلوب پر پڑے۔ چنانچہ اس دور کے تمام کشمکشوں کا اظہار دبے دبے لہجوں میں اس عہد کی تخلیقات میں ہوا ہے۔ چونکہ اس عہد تک ادب جمہوری و عوامی مزاج کی آئینہ داری کی طرف متوجہ نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے اس عہد کے حالات کا مکمل اور بھرپور اظہار نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے حضرات عموماً صوفیا اور عرفا تھے۔ وہ یوں بھی گوشہ نشینی کو بہتر طریقۂ حیات سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے یہاں زندگی کی آلائشوں سے گریز کو افضل و برتر خیال کیا جاتا تھا۔

سید شاہ اسداللہ

اس عہد میں جن شعرا کے دم سے بھاگلپور کی ادبی فضا رونق افروز تھی ان میں سید شاہ اسداللہ عرف عبداللہ کا نام سرفہرست ہے۔ یہ حضرت سید شاہ عنایت حسین کے فرزند ارجمند تھے۔ پیدائش ۱۸۳۵ء میں اور وفات ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ یہ

(متاخرین)

صاحب تصنیف گذرے ہیں۔ فارسی میں تین تالیفیں ملتی ہیں۔ ۱۔ اوراد برائے ہلاکی دشمن "۲۔ اوراد و وظائف" ۳۔ گلشن احیار گلزار تکثیر" یہ تینوں فارسی زبان میں ہیں۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

رباعی

افضال خدا سے یک بندہ ہوں میں
ناچیز ایسا ہوں کہ سب سے گندہ ہوں میں
سامنے خاص اس بندے کے اسد
خادم میں ہوں، خدمت کنندہ ہوں میں

سید لطافت حسین دمڑیائی

نواب سید معونت حسین کے بڑے بھائی اور نواب ارشاد حسین زیدی معروف بہ نواب رحمٰن خلیفہ باغ کے چچا بزرگوار تھے۔ ان کے حالات زندگی تاریکی میں ہیں۔ خود نواب رحمٰن صاحب انکے حالات زندگی پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ ۱۸۸۹ء کی ایک شعری کاوش ملتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز دستیاب نہ ہو سکی مرنے سے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

می رود در روز وصلت بے حساب اندر بہشت
گو خطا دارد ولے لطف عطا دارد حسینؔ

شاہی کتب خانے میں کئی قلمی نوحے مرثیے اور دوسری چیزیں ایسی ملتی ہیں جن کے نیچے راقم کا دستخط سید لطافت حسین درج ہے۔

لیکن مقطعوں میں مہدی تخلص ملتا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ یہ تخلص خود نظام حسین صاحب کا ہے یا کسی دوسرے شاعر کی تخلیقوں کو موصوف نے رقم فرمایا تھا۔

شاہ بے نظیر عالم دمڑیائی

پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی لیکن قیاس یہ ہے کہ ۱۸۶۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ سنہ وفات ۱۹۳۵ء ہے اس طرح تیسرا دور بھی انہوں نے دیکھا ہے لیکن ادبی سرگرمیاں دوسرے دور تک محدود رہیں اس جہت سے یہ دوسرے دور کے شعرا کی صف میں آتے ہیں۔ ایک اردو مرثیہ بہت مشہور ہوا تھا۔ جو اب دستیاب نہیں۔

شاہ نور قطب الدین سید شاہ فتح عالم

سنہ پیدائش ۱۸۵۰ء اور تاریخ وفات ۷ مئی ۱۹۲۹ء ہے درج ذیل تالیفات قلمی صورت میں موجود ہیں۔

۱۔ مجموعہ حدیث ۲۔ روداد مجلس میلاد ۳۔ بیاض۔ ان تینوں تالیفات کے علاوہ شاعری کے بھی گراں بہا نمونے ملتے ہیں۔ جن میں ہندی انداز نمایاں ہے۔ ہندی بحروں میں گیت، دادرا ٹھمری اور بھجن وغیرہ لکھا ہے۔ جن میں متصوفانہ رنگ نمایاں ہے۔ رجحانات و میلانات شعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسیقی سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

بھجن !!

تو ہی داتا، تو ہی کرتارا

تیری مہما کو کون جانے تو ہی سب کا پالن ہارا !!

فتح دے عالم ہر شاہ فتح کو حسینؑ و علیؑ و نبیؐ کے دوارا

ٹھمری

کیسا چھیلا تورے موہے نیناں سے نیناں لگائے لئے جائے

بارہ برس کی موری عمریا ڈولیا کو مورے پھنسائے لئے جائے

سکھی سہیلی موری روت میں سگری موری بیری کو مجھ سے چھڑائے لئے جائے

کیا کروں کوئی بس نہ چلت ہے مورا لہورا دلورا پھنسائے لئے جائے

شاہ فتح میں سہاگن پیا کی جن ماتا پتا سے چھڑائے لئے جائے

دادرا

گونا تو ہاری موری سندریا اب ہوگی گونا تو ہاری رنے

میا باپ کی بڑی دلاری رے بھیا کی ہے تو پیاری رے

گون ترے سسرے سنگ جیئیں سونچ ذرا تو اناری رے

برکی سند موری سسرے سدھاری آج ہوا دن بھاری رے

اوٹھ رے سندریا سنبھل کیوں نہ بیٹھے اب کے تو ہے توری باری رے

سنگ کی سہیلی تورے مانگ سنواریں ڈولیا دروا جے پہ ٹھاری رے

شاہ فتح کیا اپنا پرایا کیسا انگنیا دواری رے

گھر گھر دیکھا تو یہی ہے لیکھا دیکھو آنکھ انکھیاری رے

غزلیں دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ انہوں نے ہندی بحروں اور اصناف کو ہی اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے مختص کر لیا ہو۔ پھر بھی تحقیق و تلاش کی جائے تو غزلوں کی دستیابی کے امکانات ہیں۔ شاہی کتب خانوں میں قلمی دستاویزات و مخطوطات اتنی بوسیدہ حالت میں ہیں کہ ان کو مکمل طور پر دیکھنے اور پرکھنے کے لئے یکسوئی فرصت و فراغت اور جرأت و ہمت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کہہ کر آگے گذر رہا ہوں کہ "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

سیدہ بہت النساء

نواب رحمن صاحب کی نواسی مرحومہ تھیں ادب و شاعری کا بیحد ثقیف متمدن اور رچا ہوا مذاق رکھتی تھیں۔ محلہ سرائے میں حضرت علیؓ کی مشہور درگاہ انہیں کی بنوائی ہوئی ہے۔ افسوس کہ ان کا کلام بھی حالات و حادثات زمانہ کی نذر ہو گیا بقول شاہ فخر عالم صاحب ان کا ادبی رجحان و میلان مذہبی اور متصوفانہ تھا۔ اس کے ساتھ ادبی روایات کا احترام بھی ان کے یہاں ایک خاص انفرادیت اور وقار رکھتا تھا۔

حکیم مولوی ابراہیم

شیخ پورہ کے رہنے والے تھے حضرت مولانا محمد علی صاحب رحمانی

مونگیر کے مرید اور سید شاہ فخر عالم صاحب کے اتالیق اور استاد تھے۔
بھاگلپور طبابت کی غرض سے آئے۔ اور مقیم ہو گئے۔ یہیں انتقال ہوا۔ مزار
مسجد خلیفہ باغ کے صحن میں ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی
کرتے تھے۔ فارسی غزل کا نمونہ دستیاب نہیں۔ مثنوی "زہر عشق" کا فارسی
ترجمہ "درد عشق" کے نام سے کیا تھا۔ جو دستیاب ہے۔ مثنوی کا پہلا شعر
یہ ہے ؎

می نگارم حکایت زیبا
داستانِ غریب خوش پیرا

اور کوئی دوسری تخلیق دستیاب نہ ہو سکی۔ مثنوی کے انداز و
آہنگ سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گرچہ رجحان
متصوفانہ تھا لیکن شعر و سخن میں مجازی عشق کی روداد کی عکاسی بھی کرتے
ہیں۔ اسلوب بیان تراشیدہ و خراشیدہ اور سلیس و رواں ہے۔

منشی کرامت علی

منشی کرامت علی ساکن معین الدین چک مرید حضرت سید شاہ
فخر عالم صاحب قدس سرہٗ اردو میں نعتیہ کلام ملتے ہیں چند اشعار نمونہ
کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں ؎

اب میں چلتا ہوں مدینے کو سفر اچھا ہوا
ہند میں اب ٹکتا نہیں دردِ جگر اچھا ہوا
یوں جہاں میں سنگ زنگار رنگ ہیں آئی دل والے
سنگ اسود سے نہ کوئی بھی حجر اچھا ہوا
جب ہوا داخل مدینے میں تو حضرت نے کہا
اے کرامت شاد ہو تیرا گذر اچھا ہوا
مژدہ باد اے دل تیرا ہے وہ پیغمبر دیکھنا
بعد حق کے نہ ہے کوئی جس کا ہمسر دیکھنا
ہم گنہگار امتی کا رب سے یہ عرض ہے
شافع روز جزا ہو روز محشر دیکھنا
اے کرامت اس غزل کو حشر میں پڑھیو ضرور۔
ہو گئے تم حضرت کے وارد مدنظر تو دیکھنا

سید معونت حسین زیدی قیصر

نواب ارشاد حسین زیدی تم نواب رحمٰن صاحب کے والد بزرگوار
..... تھے۔ انتقال سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ
..... رکھتے تھے۔ بہت سارا کلام ضائع ہو گیا۔ انقلاب زمانہ کے
ہاتھوں ان کی تخلیق کا دفینہ بچ گئیں ہیں۔ ان میں سے کچھ مثالیں پیش
کی جاتی ہیں ؎ سلام

رحمت خالق سے حکم بوتراب آنے کو ہے
خلد کا مژدہ تمہیں قیصر شتاب آنے کو ہے
اے زمین قبر رک جا چھوڑ مجھے دینا فشار
میرا آقا، میرا مولا بوتراب آنے کو ہے
تم کے مجھ سے آئے فرشتو! قبر میں کرنا سوال
یاں نصیری کا خدا بہر جواب آنے کو ہے

قصیدہ در مدح حضرت علیؑ

فضل حق سے چمن میں آئی بہار
شوق میں جھومتے ہیں سب اشجار
سب شجر ہیں چمن کے آج نہال
بلبلیں ان کے گلے کا بن گئیں ہار
باغباں شوق میں یہ کہتا ہے
شکر خالق چمن میں آئی بہار!

نزع میں بھی رہے گا ورد یہی
میرے مولا ہیں حیدر کرارؑ
دشمنوں میں گھرا ہوں اے آقا
بہر امداد آئیے سرکار
کیجئے اب کرم برائے خدا
رنج دیتا ہے چرخ کج رفتار

اس عہد کے دو ممتاز نثر نگاروں کا ذکر ناگزیر ہے۔ پہلے بزرگ تو حسن علی مرحوم تھے۔ یہ اپنے عہد کے مروجہ علوم و ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کو ناول نگاری سے بڑا شغف تھا۔ دوسرے بزرگ شائق احمد عثمانی تھے۔ یہ اپنے عہد کے مشہور صحافی رہ چکے ہیں لیکن ادب و سخن سے ان کی دلچسپی فطری ہے۔ شاعر بھی ہیں ناول نگار بھی۔ انہوں نے کئی ناول لکھے ہیں۔ ان دونوں کے فن اور شخصیت پر اسی نمبر میں پروفیسر آصف واسع کا تفصیلی مضمون شامل ہے۔ اس لئے یہاں مزید تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

مولانا اشرف العالم

تاریخ پیدائش ۱۲۸۱ھ اور سال وفات ۲۱-۱۳۲۰ھ کے قریب ہے۔ سلسلہ نسب درج ذیل ہے :-

مولانا اشرف العالم صاحب ابن مولانا شاہ عابد نوری[۲] صاحب ابن مولانا شفقی ثانی[رح] ابن مولانا موحد[رح] ابن مولانا عابد اوّل ابن مولانا عاصم[رح] ابن مولانا صفی سیالکوٹی[رح] ابن مولانا شہباز محمد قدس سرہٗ العزیز اپنے عہد کے صاحب عزت و مرتبہ بزرگ گذرے ہیں۔ صدہا طالبان علم نے آپ کی ذات سے فیض حاصل کیا۔ حضرت مولانا عابد نوری[رح] نے اپنی زندگی ہی میں ان کو صاحب سجادہ مقرر فرما دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر چوبیس[۲۴] سال کی تھی۔ نہایت تقویٰ شعار اور پاکیزہ اطوار تھے۔ کئی تصانیف ہیں جن میں سے کچھ مطبوعہ تصانیف کا ذکر درج ذیل ہے۔

۱۔ مجمع الآداب مطبوعہ ۱۲۹۶ھ ۲۔ آداب القرآن مطبوعہ ۱۳۰۱ھ ۳۔ ضبط الایمان فی مناقب النعمان مطبوعہ ۱۳۱۲ھ ۴۔ ذریعۂ نجات مطبوعہ ۱۳۱۲ھ ۵۔ اشرف الانکار در نعت سید ابرار ۱۳۲۵ھ ـ ۱۳۲۶ھ ۶۔ رسالۂ خیر الکلام مطبوعہ ۱۳۵۳ھ۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے :-

اے شافع روزِ جزا گاہے نظر بر من فگن
دے مالک ہر دوسرا گاہے نظر بر من فگن
بارگنہ آوردہ ام ، روئے سیہ آوردہ ام

اے معدن جود و سخا گاہے نظر بر من فگن
گر تو نہ بودی در جہاں پیدا نہ گشتی انس و جاں
بہر تو شد ارض و سما گاہے نظر بر من فگن
امید از احسان تو وز لطف بے پایان تو
دارم ہمیں صبح و مسا گاہے نظر بر من فگن
اے مظہر ذات احد اے نخل گلزارِ صمد
اے شمع ایوانِ ہدیٰ گاہے نظر بر من فگن
در جسم من جانی توئی ہم دین و ایمانم توئی !!
دارم ز یک تو التجا گاہے نظر بر من فگن
بخشد خدائے دو جہاں جرم و خطائے مومناں
بہر تو در روزِ جزا گاہے نظر بر من فگن
تو جانی و جانانی و در دو جہاں سلطان آں
بنگر بہ حال ایں گدا گاہے نظر بر من فگن
اے تاجدار مرسلاں اے باعثِ امن و اماں
خواہم ز تو عفوِ خطا گاہے نظر بر من فگن
رفتی چو در خلد بریں از حکم رب العالمین
رضواں بہ گفتا مرحبا گاہے نظر بر من فگن
سوئے گناہِ من بہ بیں اے رحمۃ اللعالمین
از جیتم الطاف و عطا گاہے نظر بر من فگن
از جملہ مخلوق خدا وز انبیاء و اولیا
اشرف توئی یا مصطفےٰ گاہے نظر بر من فگن

اردو نمونہ کلام :-

الفتِ شاہ عرب دل میں جمانا چاہیئے
آپ کو یاد نبیؐ میں بس مٹانا چاہیئے
گر رضائے خالقِ اکبر تجھے منظور ہے
آل و یاران نبیؐ سے دل لگانا چاہیئے
ہیں تیرے حبیب حامیاں یاد ر شفیع المذنبین
فکر عقبیٰ کی نہیں کچھ دل میں لانا چاہیئے

گر تجھے اشرف نجاتِ آخرت مطلوب ہے
اس شہ دیں کو نہیں دل سے بھلانا چاہیے

پیدا ہوا اس جہاں میں وہ خیر البشر ہوئے
دنیا میں آپ دافع رنج و ضرر ہوئے
سارے نبی سے آپ کا رتبہ بڑا ہوا
روشن انہیں کے نور سے شمس و قمر ہوئے
جو تابع جناب رسول خدا ہوئے
عقبیٰ کے ہر عذاب سے وہ بے خطر ہوئے
اشرف تجھے کیا خوف ہے جب روز حشر میں
حامی وہ تیرے صاحب شق القمر ہوئے

ان کی بیشتر تخلیق حمد و نعت میں ہیں۔ متغزلانہ رنگ کہیں نہیں لیکن ان ہی تخلیقات سے انکی قادر الکلامی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولوی شعور صاحب شہباز رح

یہ حضرت مخدوم شہباز رح کی آٹھویں پشت میں ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا صحیح علم نہ ہوسکا۔ مولانا اشرف العالم صاحب کے ہمعصر تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش و وفات کا سنہ بھی کم و بیش مولانا اشرف العالم صاحب کی تاریخ پیدائش و وفات کے قریب ہوگا۔ پورا نام مولوی محمد صفی عرف مولوی محمد شعور تخلص بہ شہباز ہے۔ صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ ایک رسالہ فارسی زبان میں "بہارستان شعور" کے نام سے ۱۲۹۵ھ میں مطبع مجمع العلوم لکھنؤ سے شائع ہوا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ہے

مستمند کوئے احمد را ارم درکار نیست
عاصیاں را در قیامت جز نبی کس یار نیست
بر غلامانت نہ کرد و شدت و تکلیف موت
نزد تو آسانی این مشکلم دشوار نیست
راست می گویم کہ در دنیا و ہم در آخرت
پیشوا و حامیم جز احمد مختار نیست
من چہ باشم چوں فصیحانِ جہاں را مطلقا
در بیان نعت پاک طاقت گفتار نیست

اردو نمونہ کلام ہے

پرتو نورِ الٰہی ہے جمالِ نبوی ﷺ
چشم دل کھول کے دیکھو تو کمالِ نبوی ﷺ
ظلمت کفر و ضلالت سے ہوا پاک جہاں
جبکہ طالع ہوا بطحا میں ہلال نبوی ﷺ
حکم موسیٰ کو ہوا طور پہ فخلا نعلیک
عرش ممتاز ہوا زیر نعال نبوی ﷺ
کام آئیگی مجھے دل سے یقیں ہے واللہ
حشر میں حبِ نبی الفت آلِ نبوی!

ان کے نعتیہ کلام میں بڑا سوز و گداز ملتا ہے جو ان کے خلوص و صداقت کا زندہ ثبوت ہے۔

مولانا شریف العالم

یہ مولانا اشرف العالم صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ سنہ ولادت ۱۲۹۶ھ اور سنہ وفات ۱۳۲۶ھ ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد بزرگوار کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ بعد ازاں درس و تدریس کی تکمیل اپنے بڑے بھائی جناب اشرف العالم صاحب سے کی۔ اور ان کے نائب سجادہ نشین بھی رہے۔ اعزازی مجسٹریٹ کی حیثیت سے بھی سماجی خدمات انجام دی ہیں شعر و شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ عاشق رسول ﷺ تھے۔ اس لئے نعت گوئی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ نمونہ کلام ہے

اے شہ سرور دوسرا اس عاشق دلگیر کو!!!
دیجئے دکھلا خدا را روئے پر تنویر کو!!!
خاتمہ کل نعتوں کا آپ پر حق نے کیا
جو رہا درجہ شہادت کا دیا شبیر رض کو

اشتیاق دید سرور ہے فزوں پر کیا کروں
نارسا ہے بخت کچھ یارا نہیں تدبیر کو

جب ہو یوم ینفخ فی الصور کا بازار گرم
سایۂ دامن میں لینا اپنے دامن گیر کو

عارض و گیسوئے حضرت اسکو یاد آئے شریف
جس نے دیکھا والضحیٰ واللیل کی تفسیر کو

رجحان شعر و سخن متصوفانہ تھا۔ کلام دل برشتگی و دلبودگی کے اثرات ملتے ہیں۔ ملاحظ ہوں یہ اشعار ؎

گرچہ لکھتا ہوں میں نعت شہ دیں تھوڑی سی
پیش حق ہے یہی محبوب ترین تھوڑی سی

طور و معراج کے قصہ سے ہوا یہ ظاہر
آپ کی شان ہے موسیٰ میں کہیں تھوڑی سی

فیض ایماں سے وہ ممتاز و مشرف ہوتا!
جس پہ پڑ لی نظر مظہر دیں تھوڑی سی

بہرور ہووے مدینہ کی زیارت سے شریف
یاد فرمائیں اگر خسرو دیں تھوڑی سی

سیّد محمد شاہ عالم

سیّد محمد شاہ عالم شہبازیؒ کا سنہ ولادت تقریباً ۱۲۶۸ھ ہے اور سنہ وصال ۱۳۳۲ھ۔ حضرت مولانا شریف العالم صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ اپنے بھائی مولانا شریف العالم کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ سن ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا جس کا نام "اشتیاق نعت" ہے۔ یہ ایک سو چالیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی پہلی نعت عربی زبان میں ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف اردو کے علاوہ فارسی و عربی زبان و ادب پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ اس مجموعہ کی زیادہ تر نعتیں غزلیہ انداز میں کہی گئی ہیں۔ فارسی میں بھی کئی نعتیں اس میں موجود ہیں۔ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے غزلیہ دیوان پر کی گئی ہے۔ غزلیہ انداز کے علاوہ صنف قصیدہ، مخمس، مسدس، ترجیع بند وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ نعتیہ کلام کے علاوہ بزرگوں کی شان میں بھی قصائد کہے گئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار بلا تخصیص پیش کئے جاتے ہیں ؎

ذکر عالی سے تو دل کا رتبہ اعلا ہو گیا
نعت گوئی سے زباں کا بول بالا ہو گیا

داغ سودائے نبی اس دل کو حاصل ہو گیا
سنگ اسود دیکھئے کعبہ میں داخل ہو گیا

شب بھر ہے مدح زلف کی دن بھر وصف رخ
کرتا ہوں صرف میں نہیں بیکار روز و شب

ہند میں رہ کر بسر اوقات کرتے ہیں عبث
بیش قیمت عمر کے دن یاں گذرتے ہیں عبث

طالع خوابیدہ ہو بیدار آج ۞ آپ کا ہو جائے گر دیدار آج

ہے وصف آپ کے لب شیریں میں کیا لذیذ
جس کو زباں نے قند سے بڑھ کر کہا لذیذ

اس مجموعے میں صفحہ (۸۰) کے بعد ان کے شاگردوں کی تخلیقات شامل اشاعت کی گئی ہیں۔ یہ ساری تخلیقات کم و بیش وہی رنگ و آہنگ اور انداز اسلوب رکھتی ہیں۔ جو خود موصوف کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس مجموعے میں موصوف کے علاوہ جن اصحاب کی تخلیقات شامل ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:-

(۱) مولوی محمد رئیس العالم صاحب (۲) مولوی محمد فائق صاحب (۳) مولوی محمد ریاض الحسن صاحب (۴) مولوی محمد انعام صاحب

(۵) مولوی محمد رفیق العالم صاحب (۶) حکیم مولوی شاہد الحق (۷) اور مولوی محمد حسن ۔ وغیرہم ۔

مجموعہ کے صفحہ (۸۹) سے عشقیہ شاعری شروع ہوتی ہے جسکو "مذاق عاشقی" کے نام سے موسوم کیا ہے ۔ غزلیں تقریباً ہر ردیف میں موجود ہیں ۔ چند اشعار نمونے کیلئے پیش کئے جاتے ہیں ۔

بھلا محتاج کیا ہو زخم دل اے یار نشتر کا
یہاں کرتا ہے مژگاں کا تصور کام نشتر کا

دھوپ ڈھلا، وزر ہے کیا نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
ملمع ہے یہ دنیا کا نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا

رخِ روشن کو دیکھ کر تیرے ——— آ گیا چشم آفتاب میں تاب

داغ پوشیدہ عیاں دل کا ہوا میرے بعد
قبر پر پھول ہے لالے کا کھلا میرے بعد

عالم غزل سنا کسی مضمون شناس کو
ظاہر ہنر جو کیجئے صاحب ہنر کے پاس

دیکھ پھر کر ذرا مدفن سے گذرنے والے
خاکساری پہ آ پڑے ہیں تیرے مرنے والے

ساتھ اپنے غیر کو اے یار رکھنے دیجئے
کب جدا ہوتے ہیں گل سے خار رہنے دیجئے

دوسرا مجموعہ "گلدستۂ نعت رسول" ہے جو ۱۳۲۳ھ میں اشاعت پذیر ہوا ۔ سولہ صفحات پر مشتمل ہے ۔ غزلوں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ کلاسکی انداز شاعری کا گہرا اثر ہے ۔ غزل گوئی کے اعتبار سے موصوف ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں ۔

عبداللہ جنون

تفصیلی حالاتِ زندگی نادستیاب ہیں ۔ "تذکرۂ روز روشن" میں ان کے متعلق صرف اتنا ملتا ہے : ۔

"عبداللہ جنون پسر سرفراز علی بھاگلپوری مفتی عدالت" ایسٹ انڈیا کمپنی میں مفتی عدالت کے عہدہ پر فائز تھے ۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کے سارے حالات تاریکی میں ہیں ۔ نمونۂ کلام بھی دستیاب نہیں ۔

حضرت مولانا ولی العالم

سال ولادت ۱۳۲۴ھ اور سال وفات ۱۳۶۸ھ ہے ۔ اپنے چھوٹے دادا حضرت مولانا رئیس العالم صاحب کے انتقال کے بعد آپ چودہ سال کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے ۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا ۔ اپنے حقیقی ماموں مولوی سید شاہ فائق صاحب کی تربیت میں پرورش پاتے رہے ۔ بچپن ہی سے نہایت سلیم الطبع اور ذہین و فطین تھے ۔ جن دنوں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔ تحریک ترک موالات شروع ہوئی اس تحریک سے متاثر ہو کر سلسلہ تعلیم ترک کر دیا لیکن گھر پر تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی بزرگوں سے ورثہ میں ملا تھا ۔ اکثر میلاد پاک کی مجلسیں منعقد کراتے تھے ۔ اور بڑے والہانہ انداز میں نعت شریف پڑھا کرتے تھے ۔ عین عالم جوانی میں آپ کا وصال ہو گیا ۔ نمونۂ کلام پیش خدمت ہے ۔

ہمارا محمد

سبھوں سے ہے اعلیٰ ہمارا محمدؐ	ہے عرش معلیٰ کا تارا محمدؐ
مجھے درد فرقت نے مارا محمدؐ	نہیں ضبط کا مجھ میں یارا محمدؐ
دکھا دے رو کے دل آرا محمدؐ	نہیں ہے اب فرقت گوارا محمدؐ

حقیقت میں ہو دید حق اسکو حاصل — جو نظارہ کرلے تمہارا محمدؐ

محمد کا رب ہے محمد ہیں اس کے — محمد کے ہم ہیں ہمارا محمدؐ

دو عالم کی تکوین ہوئی جسکی خاطر — وہ ہے کون؟ کہدو ہمارا محمدؐ

یہ دو میم ہیں اس میں قند مکرر — ہے کیا نام شیریں تمہارا محمدؐ

ولی پر بھی محشر میں ہو چشم رحمت
کہ ہے نام لیوا تمہارا محمدؐ

نعت گوئی میں مسلک آبا پر قائم رہے اور خلوص و صداقت کے ساتھ پر سوز انداز میں عشق رسولؐ کا اظہار کرتے رہے۔ بعض تخلیقیں اثر آفریں ہیں ـ

مولانا رئیس العالم

یہ مولانا شاہ عالم صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ سن پیدائش ۱۲۷۰ھ اور سنہ وفات ۱۳۴۱ھ ہے۔ بڑے بھائی مولانا اشرف العالم کے وصال پانے کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ بے حد تقویٰ شعار اور پاک طینت بزرگ تھے۔ طبیعت میں سادگی اور بے تکلفی تھی۔ نعتیہ کلام میں ایک مجموعہ "وسیلۂ نجات در نعت سرور کائناتؐ" ۱۳۲۷ھ میں مطبع رحمانیہ مونگیر سے شائع ہوا۔

جو کہ شیدائے جمال شہ والا ہوگا
کیوں نہ رتبے میں کہیں سب سے وہ اعلیٰ ہوگا

جو یثرب کی ہوئی جس کو بھی زیارت حاصل
اس کا عالم میں نہ کیوں بخت احبالا ہوگا

جو صفت آپکی کرتا ہے برابر دل سے
جرم و عصیاں کا نہ کیوں اسکے ازالہ ہوگا

آل و اصحاب نبی کی جسے الفت ہوگی
بالیقیں اس کا خدا چاہنے والا ہوگا

اتنا جو کہ ہے حضرت کو بیاں دل سے رئیس
اس کا اللہ بھی واں ماننے والا ہوگا

مولانا رئیس العالم صاحب پر اس دور کا تکملہ ہوتا ہے !!!

تیسرا دور

۱۹۲۰ء ـــــــ ۱۹۴۷ء

معاصرین طبقہ اوّل ـــــ

پہلی جنگ آزادی اور روس کے انقلاب کے بعد ہندستان ذہنی اور فکری حیات میں مختلف تغیرات سے دوچار ہوا۔ بیسویں صدی میں فرائیڈ آئنسٹائن اور مارکسی نظریات اور افکار نے ہندوستانیوں کے ذہن کو نئے آفاق وحیات سے روشناس کیا۔ آزادی کی تحریکیں پر زور طور پر شروع ہوئیں۔ یہ تحریکیں مختلف النوع تھیں۔ کچھ سماجی انقلاب کی داعی تھیں کچھ سیاسی اغراض ومقاصد رکھتی تھیں۔ اور کچھ مذہبی ودینی افکار ونظریات کی حامل تھی۔ ان تحریکوں نے جمہوری طور پر ہندوستانی شعور کو بیدار کیا۔ سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کے انداز میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن کے اثرات اس عہد کے ادب پر بڑے گھمبیر انداز میں پڑے مگر بھاگلپور کے ادبی ماحول نے ان انقلابات وتغیرات کے اثرات بہت کم قبول کئے بس اتنا ہوا کہ شعر وشاعری کا چرچا خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام کے درمیان آگیا۔ اور عوامی طور پر بزم آرائیاں شروع ہوئیں۔ اسی دور میں بھاگلپور میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی۔ اس انجمن کے قیام نے لوگوں میں ایک نیا جوش وخروش پیدا کیا انجمن ترقی اردو کا قیام یہاں ۲۶ جنوری ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ اس کا افتتاحیہ جلسہ زیر صدارت جناب مولوی حکیم مرزا نعیم الدین حیدر واصف جونپوری بہ بدولت کدہ سید وارث الحق صاحب واقع محلہ راجپوت منعقد ہوا۔ اس کے صدر انجمن سید ابوالحسن بار ایٹ لا منتخب ہوئے اور سکریٹری عبدالسوف صاحب ایڈوکیٹ۔ اس انجمن نے اردو زبان وادب کے فروغ میں بڑی عظیم خدمات انجام دیں۔ جن لوگوں نے انجمن کے افتتاحیہ جلسہ میں شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

حکیم سید زین العابدین صاحب، مولانا سید فائق صاحب فائق، مولوی شاہ محمد عرب صاحب، مولوی جمیل الدین صاحب جمیل، سید محمد وارث الحق صاحب، سید محمد نعیم صاحب، چھوٹے خاں صاحب سوداگر کلاہ، رضی حیدر صاحب رضی، سید خمید العالم یاس بھاگلپوری اور جناب سرفراز علی صاحب۔

اس عہد میں مندرجہ ذیل شعراء ادب وفن سے فطری اور والہانہ دلچسپی رکھتے تھے۔

شرف الدین شرف۔ جمیل الدین تمیل۔ عبدالرحیم رحیم۔ رضی حیدر صاحب رضی۔ وارث حسین وارث، رام پرشاد ھوسلہ ناشاد، واصف جونپوری۔ عبدالحمید ظریف بھاگلپوری، نصیر الدین صاحب نصیر محسن صاحب محسن، سعید صاحب سعید، معین صاحب معین۔ مجید عالم یاس بھاگلپوری۔ عبدالوحید عاجز۔ عبدالمجیب بسمل، شاہ فخر عالم صاحب فخر، سید شاہ ولی العالم، سید محمد بارق صاحب۔ عبدالستار عاشق، عبدالغفور صاحب۔ سخاوت حسین سخا، ابوسعید بمسر، سعید الدین جعفری سعید۔ عبدالرؤف محمد امجد علی اختر، عظمت صاحب۔ عبدالجلیل صاحب رسا۔ اولاد حسین اولاد۔ جناب مذاق صاحب۔ امداد علی صاحب قطب ہادی دربھنگوی۔ ظہیر احمد خاں ظہیر سہسرامی۔ محمد حسن بجود۔ سلطان احمد سلطان۔ منظر حسین عاشق، واجد علی قمر، عزیز احمد خاں عزیز سہسرامی، معین الدین اختر۔ مولوی شفاعت حسین ناشاد،

ڈاکٹر محمد ناصر علی ناصر، آل حسن عاقل، وجیہہ الدین تشنہ، احمد حسین جوشی، فضل علی صاحب افضل، نواب جمشید مرزا، نواب تقی زیدی نشتر عرف نواب لڈن، ضیاء الدین ضیا انصاری، قوس بھاگلپوری، منیر خاں اقبال، عبدالشکور صاحب حافظ، خلیل الرحمان ناشاد، عبدالرشید رشید، سجاد حسین صبا شجاع، علاؤالدین صاحب طبیب، عبدالمجید قیس، محمود احمد محمود، حافظ محمد عبدالکریم آزاد، احمد حسین بیڈھب، عبرت حسین عبرت، ساجد اللہ حشر، عاشق حسین عاشق، ظہیر حسن سرشار عظیم آبادی، اشرف دہلوی، احمد حسین دانش، مقبول حسین منطق، سید علی رضوی کامل، سید محمد سلطان، ۔

مذکورہ بالا شعرا ہی کے دم سے اس عہد کی بزم سخن پر رونق اور آباد تھی۔ یہ حضرات طرحی اور غیر طرحی مشاعرے منعقد کرتے تھے اور یہاں کی ادبی زندگی اور سرگرمیوں کے روح رواں تھے مگر ان سب فنکاروں کے تفصیلی حالات ذکر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ان میں سے کچھ فنکار ایسے ہیں جنکے حالات دستیاب ہیں تو کلام نہیں اور کلام ملتا ہے تو حالات نہیں ملتے ہیں۔ اس عہد کے بزرگوں میں سے کچھ ہی لوگ زندہ رہ گئے ہیں جن میں ڈاکٹر ناصر علی ناصر صاحب ہی ایسے بزرگ ہیں جن سے اس عہد کے شعرا کے کچھ حالات و کلام مل سکتے ہیں، چنانچہ یہاں شعرا کا ذکر اسی انداز میں کیا جاتا ہے۔ جن کے حالات مل سکے ہیں ان کے حالات اور جن کے کلام مل سکے ہیں ان کا نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ اور جن کے حالات اور کلام نہ مل سکے ان کے محض اسمائے گرامی لکھ دیئے گئے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے متعلق انفرادی مضامین اس نمبر میں شامل ہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ابو سعید ساحر: ــــ

۸۶ سال کی عمر ہے۔ پیشہ مختاری۔ مثنوی، قصیدہ، نظم و غزل چاروں صنفوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے ــــ

اسی صورت سے دل کو بہلائیں
روز خون جگر سے نہلائیں!

ٹیس مضطر کرے تو ضبط کریں::
اشک خوں ہو رواں تو پی جائیں

آہ سوزاں جو دل کرے چھلنی
تھام کر کے کلیجہ رہ جائیں

دل کی وحشت کا نہ جب ہو چارہ
دست پرخار میں نکل جائیں

معین الدین اختر: ــــ

ان کی زندگی کے حالات ہم دست نہیں۔ دو شعر پیش کئے جاتے ہیں ــــ

کسی نے مار ڈالا ہائے وقت جاں کنی کہہ کے
ذرا ٹھہرو کہ میری بھی تمنائے ستم نکلے

بُت بدمست کی آنکھوں میں جو مئے ہے ہلاہل ہے
کہ اس کے مست جب نکلے سوئے ملک عدم نکلے

بندو خاں کرم: ــــ

یہ موسیقی کے اچھے فنکار تھے۔ شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتے تھے

نہ مشتاق اجل پر رحم آجائے اسے یارب
نہیں معلوم کیوں تھرا رہا ہے ہاتھ قاتل کا

تمہاری جستجو میں ہم اُمید زیست کھو بیٹھے
مگر افسوس ہے ارمان دل ہی میں رہا دل کا

جمیل الدین جمیل: ــــ

میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ریلوے میں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تھے۔ بھاگلپور میں مشاعرہ کی بنیاد انہوں نے ڈالی۔ بلکہ بھاگلپور کے مذاق سخن کی تربیت و پرورش کا اولین سہرا انہیں کے سر ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں ــــ

بہار آئی نظر آیا ہے حلقہ سلاسل کا
بجائے شاخ گل مسکن قفس ٹھہرا عنادل کا

ہوا پہلو سے دل کیا اور چلی تیغ نظر کس کی

پتہ چلتا ہے کچھ مقتول کا یارب نہ قاتل کا

بہار ماہ و انجم فلک پر دیکھتے کیا ہو
یہ ایک بگڑا ہوا خاکہ ہے میرے گلشن دل کا

چراغ گل ہو کے اب داغ دل کے مرقد میں
بہار آئی چمن میں میرے خزاں ہو کر
گلے کو کاٹ کے کیوں رک گیا رگ جاں پر
غضب کیا تیرے خنجر نے مہرباں ہو کر

سخاوت حسین :-

مقامی ٹی۔ این۔ بی کالجیٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ کہیں باہر کے رہنے والے تھے۔ بڑی شگفتہ طبیعت پائی تھی۔ نعتیہ کلام بھی کہتے تھے لیکن تغزل کے روایتی اسلوب کو زیادہ پسند کرتے تھے ؎

—— فراق یار میں پھرتا ہوں شکل ہجر شدت سے
نشاں اب تک نہ پایا اس قمر طلعت کی منزل کا
یہ دھبہ خون ناحق کا ہے مٹ سکتا نہیں ہرگز
قیامت تک نہ ہوگا صاف دامن میرے قاتل کا

سید رضی الدین رضی :-

حالات زندگی دستیاب نہیں ہو سکے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر درج کیا جاتا ہے ؎

رضیؔ ڈر ہے کہ بل آئے نہ شان کج ادائی پر
تڑپتا پھر کے دیکھے ایک نظر قاتل جو بسمل کا

ظہیر احمد ظہیر سہسرامی

آبائی وطن سہسرام تھا۔ بھاگلپور کے محلہ مجاہد پور میں بسلسلہ تجارت مقیم تھے۔ والد بزرگوار کا نام حاجی کبیر احمد ہے۔ فی الحال سہسرام کے ایک محلہ چوکھنڈی بازار میں قیام ہے۔ شعر گوئی سے فطری دلچسپی رکھتے ہیں ؎

ازل سے ہم قتیل تیغ ابروئے صنم نکلے
ہمارے دل کے ارماں سب تہہ تیغ دو دم نکلے
مٹا دیں سب تمنائیں شب فرقت کے صدموں نے
ہزاروں حسرتوں کی ایک حسرت ہے کہ دم نکلے

عزیز احمد عزیز سہسرامی :-

ظہیر احمد ظہیر کے عم زاد بھائی ہیں۔ حاجی نذیر احمد والد کا نام ہے۔ بھاگلپوری سلک کی تجارت کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں مقیم تھے۔ انتقال ہو چکا ہے۔ دو شعر نمونتاً درج ہے ؎

نظر اس شوخ کی چھپنے لگی شرم و ندامت سے
سر محشر جو خوں آلودہ دامن لے کے ہم نکلے
نتیجہ ہے بزرگوں کی دعاؤں کا سراسر یہ
عزیز احمد جو ہم اس عمر میں اہل قلم نکلے

سید محمد سلطان احمد سلطان

پٹنہ ضلع کے رہنے والے اور مقامی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ بے حد ظریفانہ طبیعت پائی تھی۔ اشعار اچھے نکالتے تھے۔ مولوی خلیل الرحمن خلیلؔ کے شاگرد تھے ؎

ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں دریائے گوشوارہ
ہرگز نہیں ہیں قطرے شبنم کے یہ چمن میں
کیونکر مثال موسیٰ مدہوش ہم نہ ہوتے
ہے ناز برق آکے اپنی اس شوخ سیم تن میں

محسن صاحب محسن

محلہ حبیب پور کے رہنے والے تھے۔ چونکہ بچپن ہی سے نابینا تھے۔ اس لئے تعلیم کی تکمیل نہ کر سکے۔ کہل گاؤں کے قریب ان کی زمینداری تھی۔ فطری شاعر تھے۔ بہت ہی پر گو۔ کلام اچھا

ہوتا تھا ــــ

ہوا ہوں شیفتہ جب سے میں اس زہرہ شمائل کا
نہ پوچھو حالِ دل یارو عجب احوال ہے دل کا

گلستاں میں تو وہ ایک گل کو بھی رہنے دے کہ گلچیں
کہ آخر ہجر گل میں حشر کیا ہوگا عنادل کا

عجب کیا ہے جو فرطِ غم سے ہو جاؤں میں دیوانہ
رہا اگر اور بھی کچھ دن یہی عالم میرے دل کا

سید مجید العالم یاس بھاگلپوری

خانقاہ شہبازیہ کے قابل فخر بزرگ گذرے ہیں جناب تمنا عمادی بھاگلپوری اور آخر میں استاد جلیل مانکپوری سے اصلاحیں لیں۔ فن شعر اور قواعد و عروض پر مہارت رکھتے تھے۔ بہت ہی پرگو شاعر تھے۔ ڈاکٹر ناصر علی ناصر نے آپ سے اصلاح لی ہے۔ ان کی ایک متصوفانہ نظم "سولہ سنگار" بہت مشہور ہوئی جو ۱۹۳۳ء میں رحمانیہ پریس مونگیر سے شائع ہوئی ہے

نگاہ شوق بولی کے لو بسم تیغ قاتل کا
میں قرباں کس ادا سے آکے کرنے فیصلہ دل کا

یہ کہکر عقل رخصت ہو گئی وادی الفت میں
یہ ہے وہ راہ جس میں لٹ گیا ہے قافلہ دل کا

اتر کر ہو گئے سیراب پیاسے گھاٹ پر اس کے
ہوا کیا فیض جاری آب جوئے تیغ قاتل کا

جناب یاس بھی ہیں اب طلبگاروں میں اس بت کے
یہ ان کی دیکھئے صورت، یہ انکا حوصلہ دل کا

بتہ پرستی میں بھی کرتا دل کی تسکین کے لئے
کھینچنے والا اگر ملتا تیری تصویر کا

سید محمد بارق برق

ملا چک کے رہنے والے تھے اور خاندان شہبازیہ سے متعلق تھے

پیشہ ملازمت تھا ــــ

وہی ہے کون و مکاں میں نہاں عیاں ہو کر
وہی مکیں ہے میرے دل میں لامکاں ہو کر

شرف الدین شرف :-

حبیب پور کے رہنے والے ہیں۔ پیشہ وکالت تھا۔ اب نابینا ہو گئے ہیں۔ اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر ناصر علی بھی ان سے اصلاح لے چکے ہیں۔ بڑی شگفتہ طبیعت پائی ہے۔ چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں ــــ

کبھی صبر آزما ٹھہرے کبھی سنگ ستم نکلے
شکست و نسبت میں یکساں تیرے قول و قسم نکلے

سکون یاس کی لذت بھی اب حاصل نہیں مجھکو
بہت نامہرباں ظالم کے انداز کرم نکلے

ستم سہنا وفا کرنا یوں ہی ناکام مرجانا
شرف کی زندگی کے کارنامے بھی اہم نکلے

عبدالرحیم رحیم

ہیڈ کلرک مجسٹریٹ آفس میں محافظ خانے، چمپیلی چک کے رہنے والے تھے طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سنجیدہ و مزاحیہ دونوں طرح کے اشعار کہتے تھے ــــ

تیرا ہی رنگ و بو ہے ہر گل کے پیرہن میں
بیلے میں، موتیا میں، نرگس میں نسترن میں

تو مار دے، جلا دے، باتوں سے سب ہے ممکن
اعجاز تیرے لب میں، جادو تیرے دہن میں

غربت میں مر گیا ہے شاید رحیم خستہ
مدت سے لوٹ کر وہ آیا نہیں وطن میں

رضی حیدر رضی

محلہ گولگھاٹ کے رہنے والے تھے۔ اثنائے عشری میں عقیدہ رکھتے تھے۔ اچھے خاصے زمیندار تھے۔ نمونۂ کلام ہے

ہماری زلیست کا قصہ تمام کر جاؤ
مٹا کے اہم کو زمانے میں نام کر جاؤ
کمند فکر سے وحشت ہے آہوئے دل کو
مزہ ہو جب اُسے آکر کے رام کر جاؤ
خودی کو اپنے مٹا کر ملو خدا سے رضیؔ
تم اپنے عشق کی حجت تمام کر جاؤ

واصف جونپوری : ـ

جونپور کے رہنے والے تھے۔ پرنس جانی مرزا کے رشتہ داروں میں تھے۔ بھاگلپور میں بہت دنوں تک اقامت پذیر رہے بے حد پُرگو شاعر تھے۔ مشاعرے کی ایک طرح پر دو سو ڈھائی سو اشعار کہتے تھے۔ آخر وقت میں جونپور لوٹ گئے۔ نمونۂ کلام ہے

انگلی سے کچھ زمین پر لکھا اور مٹا دیا !!!
بے چین دل ہے خاک میں کسکو ملا دیا !!

وارث حسین [illegible]

ملاچک کے رہنے والے تھے۔ خاندان شہبازیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہاں سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ پیشہ طبابت تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

[illegible] تر کش ہے نگاہِ ناز قاتل کا
[illegible] ہے ہر ایک مدعا دل کا
بلا سے جو گذرتی ہے نہ پوچھو حال اس دل کا
گلہ کیوں کر کروں اپنی زباں سے اپنے قاتل کا
[illegible] نکلنا طائر [illegible] کا !!!
[illegible] ہے، تو دا[illegible] کا

عبدالحمید ظریف بھاگلپوری

محلہ قاضی ولی چک کے رہنے والے تھے۔ ریلوے میں ملازم تھے مزاحیہ و طنزیہ کلام کہتے تھے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

مکان دل رُبا میں ڈھیر ہے عشاق کے دل کا
مری آہٹ وہ پاکر شور کر دیتے ہیں بل بل کا
رقیبوں کے شکم میں
چکایا دام میں نے عشق کے ہوٹل میں جب دل کا

ڈاکٹر نصیر الدین نصیر

محلہ صدرالدین چک کے رہنے والے تھے۔ والد بزرگوار کا نام ڈاکٹر وحید الرحمٰن بخش تھا۔ خود ایم۔ بی۔ بی ایس ڈاکٹر تھے۔ کچھ دنوں تک ملازمت کی۔ بعد ازاں مونگیر میں آزادانہ پریکٹس کرنے لگے۔ پھر بھوپال چلے گئے اور وہاں پریکٹس کرنے لگے۔ بھوپال ہی میں دوسری شادی کی۔ تقسیم ہند کے وقت کراچی چلے گئے۔ وہیں فوت ہوئے۔ شعر گوئی کا اچھا مذاق رکھتے تھے مگر کم کہتے تھے۔ نثر نگاری سے کم دلچسپی نہیں تھی ہے

انہیں کیونکر بتاؤں میں غرورِ حسن بیجا ہے
کہ بڑھ کر گھٹ بھی جاتا ہے ضرور ی ماہِ کامل کا
ترا ہلکا تبسم مدعی ہوش و خرد کا ہے
ترا ادنیٰ کرشمہ نبد ہے میرے سلاسل کا

معین الدین معینؔ

[illegible] بورڈ میں ملازم تھے۔ [illegible] مونگیر کے علاقے کے رہنے [illegible] اچھے عالم و فاضل شخص تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن لوٹ گئے۔ طبیعت شگفتہ پائی تھی۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو

خفا صیاد، گل آزردہ، گلچیں دشمنِ جاں ہے
اب آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا قصہ عنادل کا

عبدالوحید عاجز

یہ محلہ اساننگپور کے رہنے والے تھے طبیعت میں بے حد ظرافت تھی۔

مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے جس کے یہاں مشاعرہ ہوتا تھا اس کی مدح میں اشعار ضرور لکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر پیش خدمت ہے ؎

گلہ مجھ کو نہ خنجر کا نہ شکوہ تیغ قاتل کا
گلہ ترچھی نگاہوں نے کیا فیصلہ دل کا

خون کے چھینٹے سے دامن تو بچا لے اپنا
دیکھ قاتل یہ دم مرگ تو احسان رہے

ابوسفیان عاجز

ان کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ جذب دل کی کشش ہے کہ ناتواں ہو کر
چلا میں بادِ صبا تیرا ہم عناں ہو کر

جو قافلے سے چھٹا زار و ناتواں عاجز
تو پیچھے پیچھے چلا گرد کارواں ہو کر!!!

منظر حسین عاشق

محلہ حافظ جی کی سرائے کے رہنے والے تھے۔ ایک شعر نمونتاً پیش کیا جاتا ہے ؎

جناب حضرت عاشق کا مذہب کچھ نرالا ہے
کبھی یہ برہمن نکلے کبھی شیخ حرم نکلے

محمود حسن بیخود بھاگلپوری

قاضی ولی چک کے رہنے والے تھے، پیشہ ملازمت تھا۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انتقال ہو چکا ہے ؎

شکایت ہائے وصلت پر وہ یہ جھنجھلا کے کہتے ہیں
کوئی اہل وفا ڈھونڈو اگر بے مہر ہم نکلے

تمنا ہے یہی بے خود کی ہر دم بزم عالم میں
دم آخر ترا ہی نام منھ سے دم بہ دم نکلے

واجد علی قمر

واجد علی قمر مجاہد پور کے رہنے والے ہیں مجید العالم یاس کے شاگردوں میں ہیں۔ شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

ساز کا چھیڑنے والا نہیں کوئی افسوس
کیا کہا تم نے کہ نغمہ کوئی بے تاب نہیں

میں ہوں وفا پسند، وہ بت ہے جفا پسند
میری جدا پسند ہے، اسکی جدا پسند

موجود اس میں خون شہیداں کا رنگ ہے
ہو کیوں نہ اس کو شوخیٔ رنگ حنا پسند

جناب یاس نے ایسی پلا دی ہے قمر مجھ کو
کہ جو مضمون ہاتھ آتا ہے مستانہ ہوتا ہے

میری گردش کا عالم اے قمر کیا پوچھتے ہو تم
زمیں زیر پا کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

احمد حسین جوش لکھنوی

آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ یہاں ہیڈ پوسٹ آفس میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ زبان بڑی صاف اور شستہ تھی۔ بے حد شوخ اور نخلی طبیعت پائی تھی۔ مشاعروں میں پڑھنے کا خاص اور منفرد انداز تھا۔ ہمیشہ میر شاعر کی حیثیت یہاں حاصل رہی۔ واصف جونپوری کے ہم عصروں میں تھے۔ حضرت واصف صاحب بحیثیت شاعر ان سے برتر تھے مگر اپنے مخصوص ترنم اور پڑھنے کے انداز سے جوش ہمیشہ واصف جونپوری پر سبقت لے گئے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

تم چوڑیاں ہاتھوں کی بڑھا کیوں نہیں دیتے
لاکھا جو لبوں پہ ہے مٹا کیوں نہیں دیتے

زلفوں کو بھی تا دوش گرا کیوں نہیں دیتے
کچھ سوگ کا عالم ہی دکھا کیوں نہیں دیتے

مولوی سید محمد فائق صاحب

مولوی سید محمد فائق صاحب ۱۸۸۲ء کے لگ بھگ پیدا

ہوئے اور تقریباً بہتر تہتر سال کی عمر پا کر ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ ڈپٹی سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے آبائی مکان ملا چک میں مستقل قیام پزیر ہو گئے شعر و شاعری سے فطری ذوق و شوق رکھتے تھے۔ ہمعصروں میں رلی الدین دانا اور تمنا عمادی پھلواروی کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے آپ کے گہرے روابط رہے ہیں۔ نعتیہ کلام اور غزلیں مختلف کتب و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اپنا مجموعۂ کلام مرتب کیا تھا۔ جو ہنوز اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔ ہر صنف سخن پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہر طرف اہل نظر دیکھ لیں صورت تیری
جلوہ گر عالم کثرت میں ہے وحدت تیری
چشم بینا سے جو دیکھو تو یہ لگتا ہے پتہ
پتہ پتہ سے نمودار ہے صنعت تیری
چھوڑ دی جس نے خودی اسکو خدا ہاتھ آیا
دور دوری ہوئی حاصل ہوئی قربت تیری
پیکر خاک کو ملنے کی بھلا کیا طاقت
کام کرتی ہے مگر اس میں بھی قوت تیری

سید محمد حاذق ضیا کیف حسابی :-

مولوی محمد فائق صاحب کے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ سنہ ولادت ۱۹۱۹ء اور سنہ وفات ۱۹۶۴ء ہے۔ ۱۹۴۹ء میں آنرز کے ساتھ آپ نے بی۔ اے پاس کیا۔ بہار یونیورسٹی میں اول آئے۔ ۱۹۴۲ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد بحیثیت راشننگ آفیسر بعد ازاں مختلف جگہوں میں بحیثیت مجسٹریٹ فائز رہے۔ جام تاڑا سنتھال پرگنہ میں آپ نے وصال فرمایا۔ بہت ہی علم دوست اور با اخلاق تھے۔ رچا ہوا ادبی مذاق رکھتے تھے۔ ان کا کلام ملاحظہ ہو ؎

جسے سب درد کہتے ہیں اسے درماں سمجھتے ہیں
ہم اپنے گھر میں اپنے آپکو مہماں سمجھتے ہیں
تری تنویر کے آگے بھلا کیوں کر نظر ٹھہرے
ہم اپنے آپ کو آئینۂ حیراں سمجھتے ہیں

فضل علی افضل

محلہ اسانندپور میں مقیم ہیں۔ آبائی وطن شیخ پورہ ہے۔ افضل صاحب شاد عظیم آبادی کے شاگردوں میں ہیں۔ لفظوں کے انتخاب اور دوسرے فنی اصناف سے مکمل آگہی انہوں نے حضرت شاد ہی کے زیر تربیت حاصل کی ہے۔ کلام کا تیور اور مزاج کی انفرادیت اور فکر و خیال کی جدت انہیں بھاگلپور کے دوسرے شعرا ہی نہیں بلکہ ہمعصر تمام دوسرے فنکاروں میں ممتاز اور منفرد تھے۔ کوئی مجموعہ اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ اس میں کچھ ان کی گوتم بدھیت اور کچھ دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے اس لئے اشعار کی ترویج و اشاعت نہ ہو سکی۔ آج وہ گمنام شاعر کی حیثیت سے زندہ ہیں۔ اگر کوئی مجموعہ منظر عام پر آتا تو ادبی دنیا میں ان کی فنی حیثیت کی تقدیر و تعیین عظمت و وقار کے ساتھ ہوتی۔ اس لئے کے کلام زندہ اور جاوداں خصوصیات کے حامل ہیں۔ نمونۂ کلام ؎

تیرے پردے کی بھی حد ہو گئی اے جلوۂ ناز
میرے معصوم تصور سے بھی پنہاں ہونا

بت کافر نے خدا جانے یہ کیوں ہنسکے کہا
آپ سمجھے تھے کہ آساں ہے مسلماں ہونا

اگر بہار کی رنگینیاں نہیں نہ سہی
یہ کم نہیں ہے کہ گلدستۂ خزاں ہم ہیں

بہار آ نہیں سکتی وہاں جہاں ہم ہیں !!
خزاں نے گم کیا ایسا کہ بے نشاں ہم ہیں

ہے کوئی بار امانت کا اٹھانے والا !
خیریت سب کیلئے تھی مرا انساں ہونا

جبین عشق کے سجدوں کو کر رہا ہے حقیر
امید یہ تو نہ تھی سنگ آستاں سے مجھے

ڈاکٹر محمد ناصر علی ناصر

محلہ چنبیلی چک کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں انجمن ترقی اردو شاخ بھاگلپور کے سکریٹری تھے لیکن مشق سخن کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا ۱۹۲۵ء ـــ ۱۹۲۶ء میں بھاگلپور کی ادبی محفلوں میں انہوں نے ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔ اصناف شاعری میں غزل سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ غزلوں میں انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ ان کی شاعری محض زبانی شاعری نہیں ہے بلکہ ان میں آفاق کی جلوہ گری ملتی ہے۔ شروع ہی سے رجحان تصوف کی طرف رہا ہے اور اب صنف غزل کو نعتیہ کلام کے لئے مختص کر دیا ہے۔ یاسؔ بھاگلپوری کے شاگردوں میں ہیں۔ تصوف سے فطری لگاؤ رکھنے کی بنا پر قناعت پسندی ان کے مزاج کی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے کلام کی نشر و اشاعت سے ہمیشہ گریز کیا۔ اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اور معیاری چیزیں کہتے ہیں۔ نمونہ کلام ؎

میری حیرانی کا مسحور نظر ہو جانا
ان کے جلوہ کا پس پردۂ در ہو جانا

یاد ہے رات کا اسی طرح بسر ہو جانا
رخ سے گھونگھٹ کا سرکنا کہ سحر ہو جانا

قطعہ

قلم نے پہلے پہل جب کہ کی تھی بسم اللہ
بنا کے نقش کسی کا کہا کہ صل اللہ

بنا سکا نہ جب اس نقش کا کوئی ثانی
تو بول اٹھا وہیں لا الہ الا اللہ

دیکھے نظر اٹھا کے کوئی یہ مجال ہے
لائیگا تاب دید یہ کس کی مجال ہے

تنویر شمع نور کو کیا اس کے پا سکے
پروانہ جس کے حسن کا خود ذوالجلال ہے

حضرت مولانا سید شاہ فخر عالم

آستانہ پیر دمڑیا کے سجادہ نشین ہیں۔ علم و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ خاندان میں شروع ہی سے علم تصوف اور شعر و سخن کا چرچا رہا ہے۔ پہلے دور کے فنکاروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہیں کے اسلاف تھے۔ موصوف عربی و فارسی علم و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ فرنگی محل لکھنؤ سے فضیلت کی سند پائی ہے۔ متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔ سیرت رسول اللہ ؐ پر ایک تصنیف "شفیقہ نجات" مطبوعہ ہے۔ دوسری اہم تصنیف جو ابھی تک شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکی ہے ـــــــــــ "مشاہیر بہار" ہے۔ یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد بہار کے صوفیائے کرام کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں امرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسری میں شعرائے بہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھی مصنفین کے ذکر پر مشتمل ہے۔ "تذکرۂ مولانا آزاد" بھی تصنیف شدہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری تصنیفیں ہیں۔ علمی و ادبی مضامین ۱۹۳۵ء سے بہت سارے موقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ "ندیم" گیا، "نگار" لکھنؤ، "معارف" اعظم گڈھ اور "بہارستان" پٹنہ وغیرہ میں شروع ہی سے مختلف النوع مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ نثر نگاری کا خاص اسلوب انداز اور سلیقہ رکھتے ہیں۔ شعر و سخن سے کوئی خاص شغف نہیں رکھتے محض تفنن طبع کے طور پر شعر کہتے ہیں۔ ماضی میں ادبی محافل و مجالس سے گہری وابستگی رہی ہے۔

نواب تقی زیدی نشتر عرف نواب لڈن

نواب ارشاد حسین زیدی عرف نواب رنجؔ کے بڑے بھائی تھے۔ ایک اچھے فن کار کی حیثیت سے آسمان ادب پر جلوہ گر ہوئے لیکن ـــ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود ـــ جواں مرگی نے ان کے فن کو مکمل و منظم طور پر اہل نظر کے سامنے نہیں آنے دیا۔ جو کچھ کہا اس کی تشہیر سے گریزاں رہے اس لئے ادبی دنیا میں ہمیشہ گمنام رہے۔ کلام دستیاب نہیں۔ بڑی مشکل سے پرانی ڈائری میں کچھ نمونہ کلام مل سکا۔ جس میں نظمیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ موصوف نظم غزل اور نوحہ و سلام کے علاوہ بھی دوسری صنفوں میں بھی اظہار خیالات کرتے تھے۔ "گنگا"

" نالۂ یتیم "، " مے خانہ "، " خیالات پریشاں "، اور " نوائے دل " وغیرہ خوبصورت اور کامیاب نظمیں ہیں ... غ کے رنگ سے زیادہ قریب تھے۔ پھر بھی حالات حا ... مناسب کی عکاسی انکی غزلوں میں ہوتی ہے۔ مزاح گوئی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ مشاعروں میں بالعموم سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں انداز کی چیزیں کہتے ہیں۔ سن وفات ۱۹۴۳ء ہے۔ ایک غزل جو ماہنامہ " شمع بہار " بھاگلپور کے دوسرے شمارے ۲۹ اگست میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

بزم احباب میں ہے درد کا چرچا کرنا
تطلم کے پردے میں ہے شیون و نالہ کرنا

دفن اپنے ہی کلیجے میں تمنا کرنا
ان سے کچھ مانگ کے الفت کو نہ رسوا کرنا

تھک گئی فکر رسا ڈھونڈ کے تمثیل میری
... تیری شرح سراپا کرنا

... آتے ہیں
... را ہے میرے ان کے یہ سودا کرنا

ابراہیم زکریا

ان کا خاندان کشمیر سے مالدہ آیا۔ اور وہاں سے بھاگلپور۔ شادی راج محل میں ہوئی تھی۔ مولانا آزاد کے پاس چند برس رہے کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ متعدد اخبارات کے ایڈیٹر رہے۔ آخر عمر میں مقصود اگر لز ہائی اسکول کے ٹیچر بھی رہے۔ اپنے عہد کے مانے ہوئے صحافی تھے۔ ایک عرصے تک مومن گزٹ کانپور سے نکالتے رہے۔ ان کے پاس نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ " الہلال " و " البلاغ "، کی ساری جلدیں اپنی ساری کتابیں خانقاہ رحمانیہ مونگیر کی لائبریری کی نذر کر دیں۔ کافی طویل عمر پائی۔ آخر عمر بے حد پریشانیوں میں بسر ہوئی حال ہی میں وفات ہوئی ـــــ

تمیز الدین احمد ایڈووکیٹ

محلہ مجاہد پور کے رہنے والے تھے۔ علم و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے پاس نادر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ اور بڑے صاحب خیم اللسان تھے۔ اولاد پور مونگیر میں بود و باش اختیار کرلی ہے۔ جس کے نتیجے میں ساری کتابیں ضائع ہوگئیں۔ عہد شباب میں بڑے فعال اور متحرک انسان تھے اور تحریک خلافت کے سرگرم کارکن۔ تصوف پر ایک کتاب لکھی تھی جو ناسا عد حالات کی بنا پر طبع نہ ہوسکی۔ اب گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی ہے۔

مرزا امتیاز حسین ہنر

ان کا خاندان دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ میں اقامت پذیر ہوا لکھنؤ کی تباہی کے بعد ان کے والد مرزا یوسف حسین ماہر عظیم آباد آگئے۔ پھر نواب مرشد آباد کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں قیام پذیر رہے۔ مرزا امتیاز حسین ہنر کو بھاگلپور سے ابدی تعلق ہے۔ یعنی اپریل ۱۹۴۲ء میں پچپن سال کی عمر پاکر انہوں نے بھاگلپور میں انتقال فرمایا۔ ان کا باضابطہ قیام تو یہاں نہیں تھا لیکن وہ اپنے منجھلے صاحبزادے سے ملنے آتے تھے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا ضمیر ان کو یہاں کھینچ لاتا تھا۔ چند مثالیں یہ ہیں ـــــ

زمیں پر شوق سے اے ہنر پڑ رہیئے جو نیند آئے
فقیر اللہ کے ہیں قدر بستر آپ کیا جانیں

تمہارے ہجر میں رویا ہے اس قدر عاشق
ہوئی ہیں پتلیاں جل کر کباب آنکھوں میں

مرزا امتیاز حسین ہنر پر تیسرے دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء

معاصرین طبقۂ دوم

میں یہاں ان لوگوں کی شخصیت و فن کے متعلق اپنی رائے دینے سے دانستہ گریز کر رہا ہوں جن کی شخصیت و فن پر مختلف مضامین اس نمبر میں شریک اشاعت ہیں۔ اس لئے میں انہیں لوگوں کا ترتیب وار ذکر یہاں کروں گا جن کی شخصیت و فن پر مضامین ماحول نمبر میں شامل نہیں ہیں

منظر بھاگلپوری

سیّد شاہ اختر رضا تخلص منظر موضع پورینی ضلع بھاگلپور کے برگزیدہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ایک پختہ کار مشہور و معروف ناولسٹ اور افسانہ نگار ہیں۔ تعلیم کلکتے میں ہوئی۔ آج بھی وہیں قیام ہے۔ روزنامہ "غازی" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے کئی تاریخی ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں "معرکہ طرابلس" اور "ترکی مجاہد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شعر گوئی کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ کلام میں سوز و گداز اور درد و غم کا عنصر غالب ہے۔ چونکہ ذاتی زندگی میں پریشانیوں کا شکار رہے۔ اس لئے کلام میں ذاتی زندگی کے دکھ درد کی گہری جھلکیں ملتی ہیں ؎

شب وصل میں بھی مجھ کو نہ سکون دل ملا ہے
کہ ہمیشہ چھیڑ گئی ہے غم و درد کی کہانی

میں خوشی سے ہر مصیبت کو سہوں گا زندگی میں
میرے عشق نے دیا ہے مجھے درد غیر فانی

مضراب غم سے ساز رگ دل کو چھیڑیئے
منظر اسی میں زیست کا راز نہاں ہے اب

شفق بھاگلپوری

خورشید حسین متخلص بہ شفق محلہ مغلپورہ، بھاگلپور کے رہنے والے ہیں۔ شعر و سخن کا ذوق ایام طالب علمی سے ہے شروع میں اپنے اسکول کے استاد ضیاء الدین انصاری سے اصلاح لی۔ ۱۹۴۹ء میں ابرار حسن سے رجوع کیا۔ ۱۹۵۲ء میں سرور تمنا عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ بعد از آں مفضل لکھنوی سے قصیدے، سلام، اور مرثیوں پر اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۵۵ء کے بعد مشورۂ سخن کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ نہایت شگفتہ اور موزوں طبیعت پائی ہے۔ مکالمہ بھی دلچسپ و عریض۔ علم العروض پر کافی دسترس ہے۔ قوت تخیل میں نزاکت احساس کی فراوانی ان کے کلام میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ مجموعی طور پر کلام میں حسن، سادگی، تنوع و وقار اور متانت ہیں۔ بزم حسینی بھاگلپور کے روح رواں ہیں۔

مہدی علی مہدی

محلہ اساتذ پور میں مکان ہے۔ آپ کے والد بزرگوار جناب افضل علی افضل اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کا ذکر معاصرین کے طبقۂ اوّل میں آچکا ہے۔ مہدی صاحب کو شعر گوئی کا ذوق ورثتاً ملا ہے۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ آر۔ ڈی اینڈ ڈی جے کالج مونگیر میں ایک عرصے سے انگریزی کے استاد ہیں۔ انگریزی علم و ادب پر بھی اچھا عبور رکھتے ہیں۔ اس طرح مہدی صاحب مغربی

ومشرق ادب وفن کے تقاضوں کو اصل طریقے پر پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنے کلام میں مذکورہ دونوں ادب وفن کی قدروں کا حسین وجمیل سنگم پیش کرتے ہیں۔ نظم وغزل ہر دو صنف میں ان کے یہاں تراش وخراش، حسن آفرینی، دلکشی اور اثر وتاثر کی کیفیت ملتی ہے۔ جدید ادبی تقاضوں کو بھی اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آفاقیت وعظمت ہوتی ہے۔

شرف عالم ندوی

حضرت سید شاہ فخر عالم صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل، قیام مستقل بھاگلپور میں رہتا ہے شخصی اور ذاتی اعتبار سے شرافت ونجابت میں فرد۔ میں نے اتنا سیدھا سادا اور نیک نفس انسان کم دیکھا ہے۔ ان کی حد سے زیادہ سادگی، پاکیزگی، معصومیت اور خاکساری وعاجزی مجھے کلیم عاجز کی یاد دلاتی ہے۔ پٹنہ کے دوران قیام میں کلیم عاجز کی شخصیت کے جن عناصر نے مجھے ان کا گرویدہ بنادیا تھا کچھ ایسے عناصر شرف عالم صاحب میں ہیں۔ غالباً اسی لئے میں شرف عالم صاحب کی شخصیت کو قابل احترام سمجھتا ہوں خصوصاً اس لئے بھی کہ بھاگلپور کی قومی زندگی میں صرف ان کی ذات واحد نسبتاً غیر متنازعہ فیہ ہے۔ چنانچہ وہ تمام ادبی، سیاسی، ملی، سماجی اور قومی تحریکوں میں بہت ہی کھل کر حصہ لیتے ہیں اور مخلصانہ اور رضاکارانہ طور پر خدمت کرنے کے جذبے سے سرشار ہیں، اور اس کے لئے وہ دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی ذات اس دور میں غنیمت ہے۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر بھی اچھی کرلیتے ہیں۔ انکی خطابت میں ایک وقار، عظمت، بلند آہنگی، اثر انگیزی، اور سحر سامری کی کیفیت ہے۔ سامعین انکی تقریر سے گہرے طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر آصفہ واسع

پروفیسر عبدالواسع (شعبۂ سیاسیات، مارواڑی کالج) کی رفیقۂ حیات ہیں۔ خود بھی مقامی سندروتی مہیلا کالج میں شعبۂ اردو میں لکچرر ہیں۔ نثر نگاری کا اچھا ذوق ہے۔ اردو ناول نگاری پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرچکی ہیں۔ مذکورہ مقالہ تحقیق وتنقید کی دنیا میں ایک اہم اضافہ ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ اب تک اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ محترمہ آصفہ صاحبہ بے انتہا مصروفیتوں میں گھرے رہنے کے باوجود ادبی ذوق وتقاضے کو نظر انداز نہیں کرتیں اور مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ ان کے مضامین ملک کے اچھے جرائد میں شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب کا انہوں نے تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ اب بھی اپنا وقت مطالعے میں صرف کرتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

بھاگلپور کے رہنے والے ہیں۔ فی الحال ٹی۔ این۔ بی کالج کے شعبۂ فارسی کے لکچرر ہیں۔ سنجیدگی اور متانت اور خلوص ومحبت کا پیکر ہیں۔ اور بے حد وضع دار انسان ہیں۔ حال ہی میں تہران یونیورسٹی سے ڈپلوما حاصل کرکے واپس آئے ہیں۔ کلاسیکی اور جدید دونوں ادب کے مطالعے کا ذوق رکھتے ہیں۔ اردو ادب سے بھی رغبت ودلچسپی ہے۔ گاہے گاہے ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ مگر کم بہت ہی کم۔
تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوچکے ہیں۔ حال ہی میں پٹنہ یونیورسٹی سے "والہ داغستانی" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے نثری مضامین میں دلکشی ودلنشینی اور تازگی سے زیادہ سنجیدگی اور متانت ہوتی ہے مگر مضامین معلوماتی اور افادی ہوتے ہیں۔

غلام مجتبیٰ انصاری

مظفرپور ضلع کے رہنے والے ہیں۔ ٹی۔ این۔ بی کالج میں یہ فارسی کے لکچرر ہیں۔ یہ تو نہ بسیار آمیز ہیں نہ کم آمیز بلکہ دونوں کے درمیان ہیں۔ ویسے آدمی دل کے صاف اور نیک ہیں۔ ان دنوں فارسی میں درویش حسین والہ ہروی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ شعرگوئی کا ذوق فطرت سے لے کر آئے ہیں۔ غزل، قطعہ اور مثنوی کے صنفوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ غزلیں زیادہ کہتے ہیں اور اپنا مخصوص رنگ وآہنگ رکھتے ہیں۔ ایک طویل مثنوی لکھ رہے ہیں جس کے کچھ اشعار انہوں

نے مجھے سنائے تھے جن سے اندازہ ہوا کہ یہ مثنوی کے فن سے آگہی رکھتے ہیں اور اس صنف میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ادبی محفلوں میں شرکت کم ہی کرتے ہیں۔

شمس الزماں

آبائی مکان تاتار پور بھاگلپور میں ہے۔ فی الحال کلکتہ میں ہیں اور صحافت سے وابستہ ہیں۔ کسی زمانہ میں بھاگلپور کے ادبی محفلوں کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بھی لگاؤ ہے لیکن کم۔ شمسؔ تخلص کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا فنکاروں پر یہ باب ختم ہوتا ہے۔

مصنف :- ڈاکٹر تپن
مترجم :- نسیم آروی

بھاگلپور کا ہندی ادب

بھارت کے موجودہ ادب اور یہاں کے فنکاروں پر کچھ لکھنے سے قبل اس کی قدیم روایات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ "بھاگلپور کی ادبی دین" کی امتیازی تاریخ رہی ہے جس کا ثبوت بھاگلپور اور اس کے مضافات میں منتشر کھنڈرات بہم پہنچاتے ہیں۔ بکرم شیلا یونیورسٹی کے کھنڈرات جو کہلگاؤں اسٹیشن کے قریب لب گنگا ایک پہاڑی پر واقع ہیں، عظمتِ ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ بہت سے مورخوں کا خیال ہے کہ بکرم شیلا اس ضلع کے سلطان گنج اسٹیشن کے قریب ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اس میں ایک بڑا نادر کتب خانہ بھی تھا جس کی تعریف حملہ آور یونانیوں نے بھی کی ہے۔ السنگ بھی اس کتب خانہ میں آیا تھا اور اس نے اپنے سفر نامہ میں اس کی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو سو قلمی نسخے بھی لے گیا تھا ۱۲۰۳ء میں بختیار خلجی کے حملوں نے اسے تاراج کر ڈالا۔ پروفیسر کا میشور شرما نے اپنی تصنیف "ہندی ادب کی بہار کی دین" میں بکرم شیلا کی ادبی دین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "نہ صرف بہار بلکہ پورے ہندی ادب کی تاریخ کا پہلا باب اس وقت لکھا جاتا ہے جب کہ ادھر مشرقی حصہ میں بکرم شیلا یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے اور ادھر مغربی حصہ میں مسلمانوں کے قدم آتے ہیں۔ جب کہ بودھ دھرم بجر یان کی شکل میں تبدیل ہو کر اس قدر زوال پذیر ہو جاتا ہے کہ معمولی دھکا بھی اسے ملک سے باہر ڈھکیل دے۔ اور شاید ہندی ادب کا پہلا باب بہار ہی میں لکھا جاتا ہے۔ اور اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب نالندہ اور بکرم شیلا کی یونیورسٹیاں شعلوں کا کفن پہنتی ہیں، جس وقت بودھ دھرم سرزمین ہند پر آخری ہچکیاں لیتا ہے اور محمد بن قاسم کی عربی تلوار ارض ہند کے دل و جگر چیرتی ہوئی اراکان کی پہاڑیوں سے ٹکرا جاتی ہے۔ ہندی ادب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سبھی سدھوں کی کسی نہ کسی جہت سے بکرم شیلا سے وابستگی رہی ہے۔

مشہور سدھ شعراء سرہپا وغیرہ بکرم شیلا یونیورسٹی میں ہی رہا کرتے تھے۔ اس لئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سدھ ادب کی ابتداء بکرم شیلا سے ہی ہوئی ہوگی۔ ہندی ادب کے قدیم دور میں اس ادب کی تلاش و جستجو کی جائے تو اس پر اور بھی روشنی ڈالنے کی گنجائش ہے۔ دور قدیم میں مشہور سدھ شاعروں کی تصنیفات حاصل ہوئی ہیں جس کے کچھ حصوں کو ترتیب و تالیف کے ساتھ مہا پنڈت راہل سانکرتاین نے اپنی تصنیف "ہندی کاویہ دھارا" میں پیش کیا ہے۔ بکرم شیلا کے ان سدھ شاعروں میں شب رپا خاص تھے جو ۷۸۰ء میں بکرم شیلا سے وابستہ تھے۔ اس وقت گوڈیشور راجہ دھرم پال کا راج تھا جس کا دور حکومت ۷۶۹ء تا ۸۰۹ء مانا جاتا ہے۔ راہل جی نے شب رپا کو شکتری اور سدھ خاندان کا مانتے ہوئے اس کی تصنیفات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کی ایک نظم کا اقتباس اپنی تصنیف میں دیتے ہوئے اسے "رہسیہ بادی" MYSTIC تخلیق مانا جاتا ہے۔

شب ؔ ر پا کی اس تخلیق میں " راگ بلاڈو " کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے
کہ وہ ایک اچھا موسیقار بھی تھا۔ شب ؔ رپا کی تخلیقات پرانی ہندی، دیشی
اور اپبھرنش زبان میں ہیں۔ اپبھرنش اسے اس لئے کہتے ہیں کہ سنسکرت
الفاظ کی ہئیت صرف بھرشٹ ہی نہیں، اپبھرشٹ یعنی بہت ہی بھرشٹ
ہے۔ رائل جی نے شب اپا اور دیگر سدھوں کی تخلیقات کو " سا دھنا کے

پد

کے جلد نمبر ۳۰

XXX اور ۲۸ XXVIII سے ماخوذ کیا ہے۔ شب ؔ رپا (پانچویں
سدھ، چوراسی سدھوں میں ایک) سرہپا کے خاص شاگرد تھے۔ یہ
چوراسی سدھ نالندہ اور مکرم شیلا سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ایسی توقع
کی جاتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں ان بودھ سدھوں کی تخلیقات کا بیشتر حصہ
بھاگلپوری میں لکھا گیا ہوگا کیوں کہ ان کی زبان اس علاقہ میں رائج زبان سے
بہت مشابہ ہے۔

بھاگلپور ضلع میں رائج بولی کی اپنی خوبی ہے۔ ہندوستانی
ادبیات کے ماہر ڈاکٹر دھریندر ورما نے اسے انگ جن پد کی بولی مانا ہے
اس لئے کچھ علماء اس علاقہ کی بولی کو " انگیکا " انگ بھاشا وغیرہ بھی
کہتے ہیں۔ حالاں کہ ادبی صفات سے ابھی یہ زبان متصف نہیں ہے۔ اس
لئے اسے صرف بولی ہی مانا جا سکتا ہے۔ اس بولی کی تحریر دیوناگری
ہی ہے۔ لیکن اس کا تحریری ادب اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔
جنوبی بھاگلپور کے کچھ قدیم کتبوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ
کی ادبی زبان کے روپ میں متھیلی ہی رائج تھی۔

شہرۂ آفاق ماہر ادبیات و لسانیات ڈاکٹر گریرسن نے
اپنی تخلیق " ہندوستان کا لسانی سروے " میں اس علاقہ کی بولی کا
نام " چھیکا چھیکی " دیا ہے۔ جس میں " چھی " کی بھرمار رہتی ہے۔ ڈاکٹر
گریرسن غالباً چھیکا چھیکی مان کر بھی اسے متھیلی سے الگ نہیں مانتے۔
علماء کا خیال ہے کہ اس علاقہ کی بولی متھیلی کا ہی ایک روپ ہے مطالعے
سے پتہ چلتا ہے کہ اس بولی پر بنگلہ، متھیلی، مگہی، بھوجپوری
اور سنتھالی وغیرہ زبانوں کا بھی اثر پڑا ہے۔ اس لئے اس
بولی میں وہ لوچ اور نرمی نہیں ہے جو متھیلی میں ہے۔ ڈاکٹر
دھریندر ورما نے اس علاقے کو ہندی علاقے کے ساتھ رکھا
ہے۔ مغرب میں جیلمیر سے لیکر مشرق میں بھاگلپوری وہ سرحد
ہے جہاں آکر ہندی علاقہ ختم ہو جاتا ہے سرحدی علاقہ
کی بولی ہونے سے بھی اس بولی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

شب رپا کے بارے میں رائل جی کا خیال ہے کہ "معلوم
ہوتا ہے" شب ردں یا کول بھیلوں کی مانند رہن سہن رکھنے
کے سبب انھیں 'شبر پاد' کہا جانے لگا۔ یہ اکثر شری پربت
پر رہا کرتے تھے"۔ بکرم شیلا (کہلگاؤں اور سلطان گنج) کے
ارد گرد کے کھنڈرات سے یہ معلومات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی
ہے۔ بکرم شیلا کے دیگر شعراء میں جیانند، دھاپیہ،
شانتیپہ، دیپ کر شری گیان، کنجن داس وغیرہ کا نام قابل ذکر
ہے۔ ان شعراء کا دور نویں صدی عیسوی سے بتایا جاتا
ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تین صدیوں کی تخلیقات کافی
ترقی یافتہ رہی ہوں گی۔ بکرم شیلا کا سدھ پیٹھ ہونے کے سبب
ان تخلیقات کا ذخیرہ بھی یہاں کافی رہا ہوگا۔ شاید یہی تخلیقات
بختیار خلجی کے حملہ کے وقت کئی دنوں تک جلتی رہیں۔ ان تاریخی
شہادتوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ان تخلیقات کے مصنفین
بڑی تعداد میں اس علاقہ کے طول و عرض میں پھیلے رہے ہوں گے
جن کی پوری تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔

شہر کے ارد گرد جینوں اور بودھوں کے بڑے بڑے
ادارے اور منادر ہیں۔ جن کے ساتھ بڑے بڑے جین عالموں
کا نام وابستہ ہے (چمپاپوری، جین تیرتھنکر واسوپوجیہ جی کی
سرزمین نجات ہے) اور یہاں اس دور کے کچھ قلمی نسخے بھی موجود

ہیں۔ دور جین کی چمپا پوری میں (جو اب چمپا نگر کے نام سے مشہور ہے) اب تک ہر برس بہولا، ورشہری کا میلہ لگا کرتا ہے اور بہولا بشہری کے عوامی گیت گائے جاتے ہیں جو یہاں کے لوک گیتوں میں مشہور و معروف ہیں۔ شہر سے تیس میل جنوب میں مندار پربت ہے۔ پربت کے پاس ہی کچھ ادارے اور علماء تھے ایسا لوگوں کا خیال ہے۔

بھگتی دور کا کوئی خاص ادبی کارنامہ ہمیں دستیاب نہیں۔ ریتی کال کے اواخر میں کچھ ادب نواز درباروں کی پشت پناہی میں شاعروں نے کامیاب تخلیقات پیش کیں۔ جو آج بھی قلمی نسخوں کی شکل میں ضلع کے مختلف مضافات میں موجود ہیں۔

شہر بھاگلپور کے قدیم ادبی ادارہ بھگوان لائبریری میں اس قسم کے تقریباً دو سو قلمی نسخے موجود ہیں یہ بھاٹ شاعروں کی تخلیقات ہیں۔ بہار راشٹر بھاشا پریشد کے محکمۂ ریسرچ اسکالر شری رام نرائن شاستری جی نے ان تخلیقات کے متعلق اپنی ریسرچ رپورٹ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان بھاٹ شاعروں میں سب سے بڑے شاعر پنڈت شری شیام سندر ہو گئے ہیں۔ جو بھوج راج کبی شور کے قریبی اور بھاگلپور شہر کے شمال میں گنگا کے اس پار بیہپور میں واقع ملکی گاؤں کے باشندہ تھے۔ ان کا تعلق ملکی کے چوبے دربار سے تھا۔ چوبے خاندان اس علاقہ کا ایک مشہور زمیندار خاندان مانا جاتا تھا اسی خاندان کے ایک علم دوست پنڈت بھگوان پرشاد چوبے جی نے ۱۹۱۳ء میں بھاگلپور شہر میں بھگوان لائبریری قائم کی اور ان شعراء کی تخلیقات کو اس لائبریری میں ترتیب دیگر رکھوایا اور محفوظ کرایا۔ شری رام شاستری نے ان کی ایک تخلیق "گنگا لہری" (جس کی تصنیف سمت ۱۹۲۲ء بکرم اور قلمبند کرنے کی تاریخ سمت ۱۹۹۵ء بکرم مانتے ہیں) کو ہندی کی اوریجنل تخلیق کہا ہے۔ جناب شیام سندر کی ہی ایک مشہور تخلیق "چترکا بیم" کا تذکرہ کرتے ہوئے شاستری جی نے لکھا ہے" اس جلد میں بہت سے دوسرے شاعروں کی تخلیقات بھی شامل ہیں جو بھاگلپور کے شاعر رہے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہیں"۔ ان بھاٹ شاعروں کا قدیم وطن یوپی اور پنجاب تھا۔ جہاں سے آکر یہ لوگ ملکی دربار کے سایہ میں آکر آباد ہوئے۔ شیام سندر کوی کی دیگر دو تخلیقات مادھوین ریرکاشں" اور فتح نامہ" کے متعلق شاستری جی کا خیال ہے کہ یہ کتابیں شاعر نے اپنے محسن اور پناہ دہندہ راجہ مادھو سندر کے حالات زندگی سے متعلق لکھی ہیں کتاب کے آخر میں ایک تصویر بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اپنی ان تخلیقات کا کاتب اس کا مصنف ہی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا شعراء کے متعلق اب تک ہندی ادب کے کسی بھی مؤرخ نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر بچن (مضمون نگار) ان دنوں کوی شیام سندر کی تخلیقات کی تلاش و جستجو کر رہے ہیں۔ ان کے اس طرح کے کئی ریسرچ مضامین مختلف رسالوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ اور "گنگا لہری" کو انھوں نے شائع بھی کرایا ہے۔

موجودہ دور میں بھاگلپور کی تمام ادبی کارگذاریوں کا مرکز 'بھگوان لائبریری' ہی رہی ہے۔ اس شہر میں اس کے توسط سے بیسویں صدی کا پورا ہندی ادب ظہور پذیر ہوا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت شری منشی رام جی نے کی تھی جو بعد میں سوامی شردھانند کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس جلسہ میں مہاتما گاندھی جی نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس دور کے بھاگلپور کے اہل قلم حضرات میں پنڈت رام لوچن پنڈت، شری گوکلانند ورما، مشہور سوہیا گیت کے مصنف آنجہانی رگھو بیر نارائن، جیوانند شرما، افسانہ و ناول نگار شری جگدیش جھا "ومل" اور شری پرنیشور

وغیرہ خاص ہیں۔ نیز ہندی کے مشہور صحافی بابوراؤ وشنوراؤ
پراڑکر، مشہور ایڈیٹر جناب امبیکا درت "بیاس" جھا یا داد کی
مشہور شاعرہ شریمتی مہا دیوی ورما وغیرہ کا ابتدائی میدان تخلیق
بھاگلپور ہی رہا ہے۔ بھگوان لائبریری کے زیر اہتمام اسی وقت ہندی
سبھا قائم ہوئی۔ (اس زمانہ میں کئی ہفت روزہ، ماہنامے اور پندرہ
روزہ پرچے (ان میں سے کچھ قلمی بھی تھے) نکلنے شروع ہوئے۔
شری کملا، نام کے ماہانہ پرچے کی ادارت شری جیوانند شرما کر رہے
تھے۔ شری اشرفی مشر جی نے "شانتی" نام کے ہفت روزہ پرچے
کو اپنی ادارت میں جاری کیا۔ مارواڑی پاٹھ شالا کے اس وقت کے
ہیڈ ماسٹر "شور بھی" نام کا ماہانہ پرچہ شائع کر رہے تھے۔

اسی وقت شری لامیشور جھا "دوتجندر" ایک قلمی پرچہ
"کو ندی" کی ادارت کر رہے تھے۔ اس وقت کے نوجوان ادیبوں میں
پنڈت رامیشور جھا "دوتجندر" شری کرپا ناتھ مشر، شری ستیش چندر
مشر "دوبیج" اور ڈاکٹر جنارون مشر خاص تھے ۱۹۳۳ء میں
بہار پرادیشک ہندی ساہتیہ سمیلن کا تیرھواں اجلاس مشہور مورخ
شری کاشی پرشاد جیسوال کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں ملک کے
نامور فنکاروں نے حصہ لیا۔ تقریباً ۱۹۳۵ء میں ابھرتے ہوئے فنکاروں
کی ایک خاصی جماعت مصروف تخلیق تھی جس میں شری ہریندر دیو نارائن،
ہنس کمار تیواری، ڈاکٹر مہیش، نارکیشور پرشاد، اور سنندر نارائن اگروال
وغیرہ خاص ہیں۔ شری نارکیشور پرشاد، ڈاکٹر مہیش، اور شری سنندر
نارائن "بیسویں صدی" نام کے ماہانہ جریدہ کی اشاعت کر رہے تھے۔
بھاگلپور میں دوبارہ ایسے اونچے درجہ کی اشاعت نہیں ہو پائی۔ مشہور
ناول نگار شری انوپ لعل منڈل اپنی لوگوں کا نترا شانتی ادارہ کے توسط
سے اپنی اشاعتوں کو بام عروج پر پہنچا چکے تھے۔ اسی ادارہ کے ذریعہ شرت
جی کی مشہور زمان تخلیقات کی اشاعت بھی عمل میں آئی تھی۔ سلطان گنج
کے خاندان راج بنیلی کے راجکمار شری کرشنا نند سنگھ جی نے "گنگا" کی اشاعت

کرائی جس کی ادارت میں راہل سانکرتاین جیسی ملک کی مقتدر
ہستیوں نے تعاون فرمایا۔ سارے ملک کی صحافتی تاریخ میں
یہ جریدہ اپنا اہم مقام رکھتا ہے۔

اسی خاندان کے ایک جواں عمر ادیب پروفیسر کمار اندرا
نند سنگھ ہیں جن کی تفصیلی تخلیقات قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں
بہار پردیشک کوی سمیلن منعقد کیا گیا جس کی صدارت مشہور
ڈرامہ نگار شری لکشمی نارائن مشر نے کی۔ ۱۹۴۶ء میں دوتجندر جی
اور کیرو جی کی مستحسن کوششوں سے بونسی میں بہار پرادیشک
ہندی ساہتیہ سمیلن کا انیسواں اجلاس ہوا۔

۱۹۵۱ء میں بھاگلپور ضلع ہندی ساہتیہ سمیلن کا
انعقاد کیند وار کے ساہتیہ سمیلن میں کیا گیا جس کا دوسرا
اجلاس ۱۹۵۳ء میں مشہور شاعر جناردن پرشاد جھا "دویج"
کی صدارت میں ٹریننگ اسکول بھاگلپور میں منعقد ہوا۔ ساہتیہ
سمیلن کے خصوصی اراکین میں دوتجندر جی، نارکیشور پرشاد،
آنجہانی ادما شنکر ورما، اننت شاستری، آشوتوش جھا،
شری بنکم چندر بنرجی، کیدار ناتھ گپت، جین کمار جین، کو
راج وردیا نارائن شاستری، اوپیندر نارائن چودھری، نیج
رائے، وشنو کشور بچن، پروفیسر کانتا پرشاد داس، پروف
گوری شنکر مشر "دوتجندر" رام اوتار جھن جھن والا،
نندن مشر، شیو دلائے مشر "وامد" پریم کمار جیسو
وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سلسلہ وار ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۸ء
اس کا تیسرا اور چوتھا اجلاس منعقد ہوا۔

مشہور شاعر رامیشور جھا دوتجندر کے ا
ان کے نام پر دوتجندر گوشٹھی قائم کی گئی۔ جس کے صد
کیدار رام گپت اور سکریٹری بشنو کشور بچن تھے۔ اس ا
نے گوشٹھی کی دس زبانوں کی تخلیقات کا مجموعہ

کے نام سے شائع کیا۔ اسی وقت انجمن ترقی پسند مصنفین بھی قائم کی گئی۔ انجمن کے زیر اہتمام پروفیسر بچن کی ادارت میں "دو نئی پرتیبھائیں" کے نام سے شعری مجموعہ کی تالیف عمل میں آئی۔ جس میں اوپیندر، مدھوسودن، کلاس، کھگیندر، مہندر، رنجیت، بچن، دیویا لنشو اور رام پرکاش جیسے شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت ۱۹۵۶ء میں عمل میں آئی۔ گذشتہ اپریل میں دویجیندر جی کی موت سے بھاگلپور کے ادب کو بڑا دھکا لگا ہے۔ اور ہندی ادب کو ایک ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ دویجیندر جی ہندی اور اردو میں ایک ساتھ لکھتے تھے۔

بنگلہ کے مشہور فنکار بنو پھول نے بھاگلپور میں ہی اپنے فن پارے تخلیق کئے۔ گذشتہ چار برسوں میں انھوں نے بھاگلپور کے ہندی ادب اور اس کے ادیبوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کی کافی تخلیقات (کہانیاں اور ناول) ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ شری ہری لعل گنج نے ان کے کافی ترجمے کئے ہیں۔

ان دنوں "سنسکرت سنگم" بنیادی تخلیقات کے واحد ادارہ کی شکل میں کام کر رہا ہے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ہر ہفتہ تخلیقی نشست کی جاتی ہے جس میں فنکاروں اور ان کی تخلیقات پر تنقید و تبصرہ بھی [illegible] ہیں۔

شری گورانگ سنگھ کرتن، کے زیر اہتمام، میرا جینتی، اور "تلسی جینتی" کا متاثر کن اجلاس کیا جاتا ہے جو سارے ملک میں اپنی نوعیت کا واحد اجلاس ہے۔

ہندی ادب کے ساتھ ہی ساتھ اردو ادب نے بھی بھاگلپور میں کافی ترقی کی یہاں برابر ہندی اور اردو شاعروں کی نشستیں ایک ساتھ ہوتی رہی ہیں۔ اور ہندی اردو کے فنکار مل کر بہت سے ادبی کام سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اسی طور پر ۱۹۶۷ء میں شری محمد یوسف صاحب نے کوشش کی اور بھاگلپور کے مشہور شاعر سید اسحٰق نبی شعور کے دیوان "یہ کیا ہو رہا ہے" کو دیوناگری تحریر میں شائع کیا۔ شعور گذشتہ بیس برسوں سے شاعری کرتے آ رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں شعور کی پہلی تصنیف "کلام شعور" کے نام سے چھپی تھی۔ شعور کی شاعری سے بھاگلپور کا ادب مائل بہ عروج ہوا ہے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے" ان کی ایک رزمیہ تخلیق ہے۔

سید مجیب العالم "یاس" جناب قوس اور فاروقی وغیرہ کا نام مقامی اردو فنکاروں میں مشہور ہے۔ مقامی پروفیسر آصف واسع نے بھی اردو کے افسانہ اور ناول نگاروں پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔

اس ضلع کے ادیبوں کی مشہور تخلیقات میں "آدھی سکا" اور "پاپ کی ہنیا" (مارکنڈیشور پرشاد) یہ "شول پھول"۔ کرات کنیا، (دویجیندر) "انسان کی تلاش"۔ "ادھین کے وچار" (بچن) پستکالیہ۔ کیوں اور کیسے؟ گرامین پستکالیہ اندولن، ورگی کرن، سوچی کرن، ڈگمگاتے قدم، (انج شاستری) لانچھن، (تلک دھاری سنگھ) انسان کی زندگی، (شیامل کشور جھا) سہاگ کی رات، اور یگ پائی (تہیش) منشاط، (آشوتوش جھا) نیلابھ، اور برسات (بارد) تیاگی (بیرکھ) آ بھرانت، (جین کمار جین) دیا بھار کی کہانیاں (ر[illegible]) یگ وید، (رام گوبند ترویدی) گاندھی گیتا، (داموردر شاستری) آخری منزل (راجیندر تیواری) ماں سمرچھنا (رام سیوک چترویدی)۔ مدار پہ پیچھے، اور سلطان گنج کی سنسکرتی (آبھے کانت چودھری)، راجیہ پرکھچیت، ساوتری، ملیا، (گوری شنکر مشر) کھڑی کا کھ ہتسک، (کمار اندرانند سنگھ) ایکہ، (انوربجن پرشاد سنگھ) بھاگلپور درپن، (جھار کھنڈی جھا) ویمل جی کے ناول اور افسانوں کا مجموعہ، آدھونک ہندی کتھا ساہتیہ اور چتر وکاس، چین کے مورچہ پر، (ڈاکٹر بچن) یہ کیا ہو رہا ہے،

(شعور بھاگلپوری) "بن گلاب مہمان" (آنند شنکر مادھون) وغیرہ
قابل ذکر ہیں۔ دیگر فنکاروں پر مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔
یہاں سے شائع ہونے والے مشہور جریدوں میں
"بیسویں صدی"، "زمان"، "سندھان"، "آنند"، "بھاگلپور سماچار"، "لوک
سماچار" (ایڈیٹر تارکیشور پرشاد) "گنگا" (سلطان گنج) "گاندھی
سندیش"، "ساہتیہ سیوک" (ایڈیٹر سکا تا پرشاد داس)، "بھارتی"
(ایڈیٹر بچن) "انگ بانی" (ایڈیٹر بنکم چندر بنرجی) "پراچیہ بھارتی"
(ایڈیٹر مادھون) "دیش دوت" (تارکیشور پرشاد) "اندیورن" (بچن)
وغیرہ خاص ہیں۔ ضلع کے مشہور اشاعتی اداروں میں "بھارتی پرکاشن"
"رشمی پرکاشن"، "مہیش پرکاشن"، "آنند پرکاشن"، "شاردا پرکاشن"، "ادیہ پرگتی
شیل"، "تمیلی پرکاشن"، خاص ہیں۔
کچھ برس قبل یہاں کے مشہور عالم پروفیسر مہیشوری سنگھ
مہیش نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر
بچن نے سب سے پہلے بھاگلپور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری
لی۔ مقامی فنکاروں میں ڈاکٹر بچن، ڈاکٹر مہیش انج شاستری
دویجیندر پرواسی، تارکیشور پرشاد، بیوگ، اوپیندر
وکل ستیندر نارائن، شری پریم کمار جیسوال وغیرہ کی
تخلیقات آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے کئی بار نشر ہوتیں۔ یونیورسٹی
میں پروفیسر گوری شنکر راج ہنس، پروفیسر سورج نارائن
ٹھاکر، پروفیسر شیوا نندن پرشاد، پروفیسر رادھا کرشن
سہائے، پروفیسر سجان بھاچم، پروفیسر چندر نارائن شر، ڈاکٹر
شاردا دیوی بیدالنکار، ڈاکٹر وریندر سریواستو، پروفیسر
کھگیندر پرشاد ٹھاکر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مدراس کے
شری آنند شنکر مادھون نے بھاگلپور کو اپنا ادبی میدانِ
عمل بنایا ہے۔ یہاں سے ان کی کئی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔
ممکن ہے اس مختصر مقالہ (روپ ریکھا) میں واقعات
کے الٹ پلٹ کے علاوہ کچھ مفکروں اور فنکاروں کا نام اندراج
چھوٹ بھی گیا ہو۔ اس لئے میں اس قسم کی تمام فروگذاشتوں کے
لئے معذرت خواہ ہوں۔

ایک ملک،
ایک قوم

"ایک ہی مملکت میں رہتے، ایک ...ن
جھنڈے کا احترام کرنے اور اس سے مکمل
وفاداری رکھنے والے لوگوں میں کتنی
ساری باتیں مشترک ہیں.... کہ ان
لوگوں کے لئے جو بھارت کو ایک ملک
تسلیم کرتے ہیں، اقلیت یا اکثریت کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کو
مساوی حقوق حاصل ہیں۔
وہ ایک سی مراعات اور ایک سے
برتاؤ کے مستحق ہیں....
ہمارے نظریے کے مطابق مملکت
سیکولر اور جمہوری ہونی چاہیئے، اور اس کی
مختلف اکائیوں میں مکمل
آہنگ لازمی ہے..."

مہاتما گاندھی

بنگلہ ادب کی سرگرمیوں میں بھاگل پور کا مقام

از: بنکم چندر بنرجی (پرنسپل کلا کیندر بھاگلپور)
ترجمہ:- نسیم آروی

بنگلہ ادب کی ترویج واشاعت میں شہر بھاگل پور نے اہم رول ادا کیا ہے۔ بھاگلپور کے فن کاروں کی کاوشوں سے سارے بنگلہ ادب نے ترقی کے کتنے اہم مدارج طے کئے ہیں۔ اس شہر میں آب رود گنگا کے کنارے کنارے مانک سرکار (بنگلہ ٹولہ) سے لیکر خنجرپور تک پھیلی ہوئی اس باسلیقہ اور گھنی آبادی والے علاقے میں خصوصی طور پر جن دو خاندانوں کا بنگلہ ادب کی تخلیق میں جو نمایاں حصہ رہا ہے وہ ہیں بہار کے گانگولی اور موزمدار (مجمدار) خاندان۔ ان میں آنجہانی شرد گانگولی اور شرد مجمدار نے بنگلہ ادب کی ترویج واشاعت کے سلسلہ میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ آنجہانی شری اوپیندر گانگولی کو بھی بنگلہ کے ادیبوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسی گانگولی خاندان سے شہرۂ آفاق افسانہ وناول نگار شری شرد چندر چٹرجی بھی ہوئے جن کے فن کی دھوم سارے عالم میں مچی۔

شرد بابو نے اسکول اور کالج کی تعلیم یہیں حاصل کی اور اسی گانگولی خاندان میں (جہاں انکی نانیہال ہے) قیام پزیر رہے۔ "بیندور چھیلے" کہانی (جو بھاگلپور میں بوڑھا ناتھ مندر کے سامنے گنگا کی گھاٹ پر لکھی گئی ہے) سے ہی شرد بابو کا تعارف بنگلہ زبان کے ادیب کی حیثیت سے دنیائے ادب میں ہوا اور اسی وقت ملک کے مقتدر ادیبوں نے ان کی تخلیق کی عظمت کی پیشگوئی کی۔ ان کے ناول "شری کانت" کے پلاٹ میں ٹیلا کوٹھی سے لیکر خنجرپور سے براری تک گنگا کے دلکش کناروں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جس کا تعلق گنگا کے اس پار کی سرزمین سے بھی ہے۔ مقامی بنگلہ ادیبوں کی کوششوں سے ہی سنہ ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا بنگلہ ساہتیہ سمیلن کا انعقاد یہاں ممکن ہو سکا۔

جو کافی مقبول اور کامیاب ہوا۔ اس کا افتتاح خود رابندر ناتھ ٹیگور نے فرمایا تھا۔ اس شہر میں بنگلہ ادب کی ترقی واشاعت کے سبب ہی موجودہ بنگلہ ادب کے مشہور ومعروف ادیب وشاعر، ناول نگار اور کہانی کار شری ڈاکٹر بلائی چند مکھرجی "بن پھول" نے ڈاکٹری تعلیم کے بعد اپنی جنم بھومی (منی ہاری پورنیہ) کی جگہ بھاگلپور ہی کو ادبی خدمات کے لئے میدان عمل چنا اور مسلسل چالیس برس تک یہیں رہکر باغ ادب کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کرتے رہے۔

مرد فنکاروں کے علاوہ صنف نازک کے طبقہ سے بھی بھاگلپور کی دو شخصیتوں نے بنگلہ ادب میں ملک گیر پیمانہ پر اہم مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ہیں شریمتی نیروپما دیوی اور شریمتی آشا پورن دیوی۔ شرد بابو کی تخلیق ادب کا کام جس وقت بھاگلپور میں چل رہا تھا اس وقت سارے مقامی فنکاروں کی نشست روزانہ ہوا کرتی تھی۔ کبھی "گوہا ویلا" میں اور کبھی نوارن چندر بنرجی اور کبھی اوپیندر گانگولی کے دولت کدے پر سب لوگ اپنی تخلیقات پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ نیروپما دیوی اس انجمن کی اہم رکن تھیں۔ شرد بابو کہا کرتے تھے کہ "نیروپما خود پریس ہے" یعنی پریس کی تحریر سے کم خوبصورت اور دلکش تحریر نیروپما کی نہیں ہوتی ہے۔ اور شریمتی آشا پورن دیوی مقامی گوشائی گھاٹ روڈ پر مقیم سرکار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور موجودہ بنگلہ ادب میں کہانی کار کی حیثیت سے اہم مقام رکھتی ہیں۔

بھاگلپور میں بنگلہ ادب کے ارتقار کے سلسلہ میں برہمو سماج

کی بھی قابل ذکر خدمات ہیں جیب۔ آنجہانی شری نوارن چندر گھوش بھاگلپور ضلع اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور برہمو سماج کے روح رواں، تو ان کا "برہمو تتو گرنتھ" برہمو سماج کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت سے سامنے آیا جس کی دوبارہ اشاعت ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ محلہ مشائخ چک میں واقع "گرما ویلا" میں شری ببھوتی بھوٹ کی دیکھ ریکھ میں اکثر ادبی نشست ہوا کرتی تھی جس میں مشہور فنکار شرد بابو بھی اکثر و بیشتر شامل ہوا کرتے تھے۔ مشہور ڈرامہ نگار شری جی۔ ایل۔ رائے اکثر و بیشتر اپنے رشتہ داروں کے یہاں آکر بھاگلپور میں ٹھہرا کرتے تھے اور ان تمام فنکاروں کے ساتھ مل کر تخلیق ادب میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔

بھاگلپور کے جن فنکاروں نے بنگلہ ادب کی تخلیق میں نمایاں حصہ لیا ہے ان میں شری متی میرا نگتی سین۔ اوپندر ناتھ گانگولی۔ گرین گانگولی۔ انوروپا دیوی۔ ستیندر مجمدار۔ پریم سندر بسو۔ بینئے بھوشن سرکار۔ جوگیش چندر مجمدار۔ کلیانی رائے۔ نرتیش بسو۔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بنگلہ برہمو سنگیت کی ترویج و اشاعت میں سری سندر بسو (Basu) شری گنیش چندر اوپادھیائے۔ پربودھ چندر سنیال وغیرہ خاص ہیں۔ شری پربودھ سنیال کا مجموعۂ کلام "سیس درشن" کا قلمی مسودہ چند مجبوریوں کے سبب ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔

مندرجہ بالا فنکاروں کے ساتھ ہی ساتھ شری امولیہ رائے نے بھی بنگلہ ادب میں کافی اضافہ کیا ہے۔ ان کی "شنی و اہیر جھیٹی" میں مقالہ کا انداز تحریر اور ربط و تنظیم اعلیٰ درجہ کی فنکاروں کا مظہر ہے۔

مطلع ادب پر نو درخشندہ ستاروں میں شری نیلو گھوش، سبھاش گھوش اور دیویندر پالت کی کاوشیں کافی تعریف و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ شری سبھاش گھوش کی ناول "الیسیٹ بالکیں۔ وڈ" شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنا نام چندر گپت موریہ رکھا ہے۔ اس کی تعریف بنگلہ کے مقتدر جریدوں نے کھلے دل سے کی ہے۔ شری دیویندر پالت کی کہانیاں بنگلہ کے مشہور جریدوں میں مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔

شریمتی بیلا لاہری بھی نہایت فنکارانہ طور پر تخلیق ادب میں مصروف رہی ہیں۔

محلہ آدم پور میں ایک سرگرم بنگلہ ساہتیہ پریشد ہے جس کا اپنا دفتر اور احاطہ ہے۔ اس انجمن کا مقصد بنگلہ ادب کی ہمہ جہتی ترویج و اشاعت ہے۔ اس میں اہم اور نادر کتابوں پر مشتمل ایک کتب خانہ اور مطالعہ گاہ بھی ہے۔ شری بن پھول "عرف گیہو ر کھیوڑ" نے تک اس انجمن کے صدر رہے ہیں۔ اس انجمن کے زیر اہتمام شاندار سالانہ اجلاس منعقد کیا جاتا ہے جس میں ہر سال ملک کے بڑے بڑے ادیبوں اور فنکاروں کو مدعو کر کے لایا جاتا ہے اور ان کے فن پاروں سے اس شہر کی مقامی آبادی میں صحتمند ادبی رجحانات کی احیا کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سارے مقامی کالجوں میں بنگلہ ساہتیہ پریشد میں قائم ہیں جن کے ذریعہ طلباء میں ادب کا خاصہ ذوق پیدا کیا جاتا ہے۔

"مکشودا گرلس ہائی اسکول" اور "درگا چرن ہائی اسکول" (جو راجہ شیو چندر بنرجی کی والدہ اور والد کے نام پر قائم ہوئے ہیں) میں بنگلہ زبان کے توسط سے طلباء اور طالبات کو ہر مضمون پر تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ بنگلہ زبان کے مختلف جرائد (Periodicals) کی ادارت جناب انیل کمار دت بڑی کامیابی کے ساتھ کرتے آرہے ہیں۔

بنگلہ ادب اور ثقافت کے میدان میں شری ستیش چندر مکھرجی کا مقام موجودہ لوگوں میں سب سے بلند ہے۔ تقریباً سبھی ادبی اور ثقافتی اداروں میں شری مکھرجی سرگرم تعاون فرماتے رہے ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے ادب سے ہندی داں طبقہ کو روشناس کرانے کے سلسلہ میں کلاکیندر بھاگلپور کے بانی اور پرنسپل کی حیثیت سے راقم الحروف کو بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ بڑی کوششوں سے کلا کیندر میں "رابندر رنگ منچ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے اور ہر سال (رابندر جینتی سماروہ) یوم ٹیگور بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ راقم الحروف نے ہندی میں "رابندر ناتھ" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب اور "رابندر پرتبھا" کے نام سے ٹیگور کے نام سے اس کے مشہور گیتوں کو یکجا کر کے دیوناگری [illegible] شائع کرایا ہے جس سے ہندی دنیا کے لئے ٹیگور کو براہ راست [illegible] اور سمجھنا ممکن ہو سکا۔

محلہ چمپانگر کے بھاشتے خاندان نے بنگلہ ڈراموں میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ کلکتہ کا رنگمنچ [illegible] بھاشے۔ منمتا گھوش عرف شیام بابو کی کوششوں ہی کا ثمرہ ہے۔ انہیں کے صاحبزادے بھاشتے رابندر ناتھ گھوش ان دنوں بنگلہ کی مشہور کہانیوں کا ہندی ترجمہ کرکے اسٹیج پر سنایا کرتے ہیں۔

بنگلہ فلموں کو بھی یہاں کے فنکاروں اور اداکاروں نے بام عروج پر پہنچایا ہے۔ شری ارہنیندر مکھرجی کا نام کامیاب ہدایت کاروں میں مشہور خاص و عام ہو چکا ہے۔ شری دلیپ مکھرجی کی اداکاری نے بنگلہ فلموں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ شری پنیاکی مکھرجی۔ شری دیپک مکھرجی۔ شریمتی چھایا دیوی اور شریمتی شومترا دیوی کو فلمی اداکاروں میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شری تپن سنگھ بھاگلپور ہی کے ہیں جنہوں نے اسٹیج پر سلسلہ لمعہ افگنی (stage light) کی ابتدا کی اور اس غیر معمولی باریک تحقیق کو عملی تجربوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ آج کل ان کا نام کامیاب ہدایت کار کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت حاصل کر رہا ہے۔

فلمی دنیا میں عظیم شہرت کے مالک شری اشوک کمار اور ان کے بھائی انوپ کمار اور کشور کمار کا بچپن بھاگلپور ہی میں بیتا ہے۔ محلہ آدم پور کے رئیس راجہ سرشیو چندر ناتھ بنرجی کے یہ لوگ رشتہ مند ہیں۔ ناٹک میں اداکاری ان لوگوں نے یہیں شروع کی۔ راجہ شیو چندر بنرجی خود بڑی اہم شخصیت کے مالک تھے۔ موجودہ درگا چرن ہائی اسکول بشمولہ ہائی اسکول گرلس اور برہمو سماج مندر کے لئے انہوں نے ہی زمین دی تھی۔ بھاگلپور میں تعلیم نسواں کے سلسلہ میں شری لواری چندر مکھرجی اور ڈاکٹر ٹی۔ ڈی گھوش (شری اروند گھوش کے والد محترم) کی انتھک محنت اور جانفشانی سے گرلس اسکول مذکور قائم ہو سکا جس کی صد سالہ برسی نہایت شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ۶ر اپریل ۱۹۶۷ء کو منائی گئی۔

ہندوستانی موسیقی کے میدان میں بھی بھاگلپور نے خاص شہرت حاصل کی ہے۔ اس سلسلہ میں باگچی خاندان اور نیوگی خاندان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ موجودہ کلاسیکی موسیقاروں میں شری مالوبکا کانن کے والد محترم جناب روبی لال رائے کا گھر بھاگلپور ہی ہے۔ وہ خود ایک بہت موسیقار ہیں۔ اور ان دنوں آل انڈیا ریڈیو دلی میں ہی پروگرام ایگزیکیٹو کے ممبر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی آنجہانی ہیمنت رائے ایک اعلیٰ درجے کے موسیقار تھے۔ وہ کچھ دنوں تک وشو بھارتی شانتی نیکیتن میں سنگیت بھون کے پرنسپل بھی تھے۔ اور انہیں اس عہدے پر خود رابندر ناتھ ٹیگور نے فائز کیا تھا۔

کلچرل میدان میں اس شہر کے بنگلہ بولنے والے ڈرامہ اسٹیج کرنے اور یاترا ناٹک کھیلنے میں خاص شہرت حاصل ہوئے ہیں۔ بھاگلپور میں بنگلہ یاترا ڈرامہ (یاترا) بھی نئے اور بڑے معیاری انداز میں اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ چمپانگر کے آنجہانی شارد اچاریہ اور شری گوپال آچاریہ نے بنگلہ یاترا کو ہندی میں منتقل کرکے ہندی زبان و ادب کو ایک نیا موڑ دیا ہے جس کی شہرت اور ترویج و اشاعت ساری ہندی دنیا میں ہوتی ہے۔

میکسیٹون
ہر عمر والوں کیلئے ہر موسم میں کام آنیوالا ایک جنرل ٹانک!
MAXITON
میکسیٹون غذا کو جزو بدن بنا کر گوشت و پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے، خون کے سرخ
ذرات میں تیزی کے ساتھ اضافہ کرتا ہے۔ اور دماغ و اعصاب کو پوری قوت قائم رکھتا ہے!
National
DAWAKHANA
POST BOX No. 318, CAL

قطعہ تاریخ تنظیم نو بزم سخن بھاگلپور ۱۹۵۰ء

از دل عاجز احقر العباد سید بدر الدین احمد صبر مخدوم آبادی؟

۶۸ ۶۱۹

ہو چکے جب بزم کو قائم ہوئے اکیس سال!
آگیا فضل خدا سے اور بھی اس پر نکھار

از سر نو بزم میں ایک زندگی پیدا ہوئی
گلشن بزم سخن میں آگئی تازہ بہار!

نوجوان جتنے تھے سب آکر جگہ لینے لگے
بزم سے اٹھے جو پی پی کر پرانے بادہ خوار

خدمت اُردو کا دل میں ولولہ پیدا ہوا
ڈالدی بنیاد نو بزم سخن کی ایک بار

واہ کے لب سے ملی تحسین بھری تاریخ یہ
چھا گئی بزم سخن پر صبر ایک تازہ بہار

قطعہ تاریخ سلسلہ نشر و اشاعت بھاگلپور ۱۹۶۱ء

سلسلہ نشر و اشاعت کا بھی ایک جاری ہوا
ہوگیا دوچند جس سے اور بھی اس کا وقار

آج شاہد اس کے ہیں ارباب ماہانہ سہیل
مکتبہ سے جن کے نکلی ایک کتاب شاندار

آئی جب بازار میں "منظارۂ بزم خیال"
میگساران ادب کا کرلیا سب نے شمار!

جتنے شاعر آج ہیں موجود بھاگلپور میں
شائع تصنیفیں بھی سب کی ہو رہی ہیں باربار

سامنے اپنے یہ شاغل کی "متاع شوق" ہو
کاروان رنگ و بو کا ہے یہ کوئی شاہکار

یا نسیم آروی کا ہے "کلام آتشیں"!
یا تپش دل کی کسی کے ہے ورق پر شعلہ بار

یا "نگار فکر" نے دکھلائی اپنی آب وتاب
یا کریم نوش بیاں کی ہے یہ فکر زر نگار!

"عنبریں" بھی ہے معین الدین غنیؔ کی زیر طبع
جلد ہی بازار میں ہو جائے گی وہ مشکبار

یوں تو دنیائے ادب میں کتنے گذرے باکمال
مل گئی مٹی میں محنت جا بسے زیر مزار

شکر ہے سامان اس کا آج پیدا ہوگیا ہر سخن ور کی یہاں کے اب رہے گی یادگار

ہے لب ہاتف سے کیا ہی خوب یہ تاریخ صبر
واہ کیا نشر و اشاعت کا ہے عمدہ کاروبار
۶۱ ۶۱۹

قطعہ تاریخ ماحول نمبر معہ فہرست معاونین بزم سخن و ادارہ نشر و اشاعت

بھاگل پور ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۸ء !!!

خاص نمبر یہ گیا کا ایک رسالہ ہے سہیل!
کہکشانِ علم و دانش کو لئے آغوش میں!
یہ ادب کا روح پرور دیکھ کر ماحول آج
یا ہوں شاغل قادری یا ہوں محی الدین غنی
ہوں نسیم آروی یا ہوں شمشیر یا ہوں صمد
ہوں مسیح وقت باقی یا ہوں عادل یا جمال
لطف رحمن ساتھ ہے بیدل بھی ہیں مسرور بھی
کوششوں سے سب کی ہے باغ سخن کی یہ بہار
قابل تحسین سب ہیں مرحبا صد مرحبا

صفحۂ قرطاس پر یا معدنِ لعل و گہر
نیّرِ برجِ صحافت ہے زینِ جلوہ گر
کچھ رسالہ پر منظر ہے گاہ بھاگل پور پر
ہوں کریم۔ اکرام۔ انجم یا غیاث احمد اثر
ڈاکٹر یونس ہوں یا تصدیق اشہر یا قمر
یا نگاہِ شوق میں سب کی سما جائیں نظر
ڈاکٹر احمد حسن پر، ناز ہے اقبال پر
سب کے دم سے آج ہے نخل تمنا بارور
ہوتی اس گلدل کی تاریخ بھی ایک مختصر

صبر لکھ دو = دیدنی ہے بزم کی باغ و بہار
۶۱۳ ۸۸

پے سر اندیشہ یہ ہے سالِ ہجری خوب تر

زمزمہ سبحان بھاگلپور کی فہرست بھی
۶۸ ۶۱۹

عیسوی تاریخ ہے "تصنیف بھی" لے لیں اگر۔

بھاگلپور کی ادبی محفلیں

ڈاکٹر احمد حسن ڈبل ایم اے
پی، ایچ، ڈی

بھاگلپور کے علمی اور ادبی اداروں کی تاریخ خاصی پرانی ہے مذاق بدلتا رہا اور دلچسپیاں رفتار زمانہ سے متاثر ہوتی رہیں۔ جب مذہبی میلان تھا تو شرعی مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا، تصوف کے نکات بیان کئے جاتے تھے۔ فتاوے تحریر کئے جاتے تھے۔ اور رونق محفل قائم رہتی تھی، شہر اور اسکے قرب و جوار میں آج بھی کئی ایسے ادارے ہیں جو انفرادی حیثیت سے کچھ نہ کچھ کام کرتے رہتے ہیں چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے۔ معتقدین اور مؤیدین کی ٹولیاں بنتی رہتی ہیں روایت اور درایت کی تحقیق چل نکلتی ہے اور کبھی کبھی انجام کے غیر ادبی ہونے کا اندیشہ ہونے لگتا ہے یہاں کے شعر و ادب کی محفلوں میں بھی یہی اسپرٹ کام کرتی رہتی ہے، نوجوانوں کی محفل الگ ہے، بزرگوں کی محفل الگ نوجوانوں کی محفل میں نظم کی ہیئت اور اشاریت پر نئے تجربے ہو رہے ہیں افسانے پڑھے جا رہے ہیں، مسلسل غزلوں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے، کوئی صاحب انشائیہ کی طرح ڈال رہے ہیں، جب نگارشات پیش کی جا چکیں تو تنقید و تبصرہ کا سلسلہ شروع ہوا، کسی نے تعریف کی اور کسی نے ماخذ کا سراغ لگانے کی کوشش کی، محفل کی سنجیدگی معرض خطر میں دیکھ کر جناب صدر کھڑے ہوئے، اختلافات کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرمایا، نوخیز فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی اور محفل برخاست ہوئی، اس طرح کی ادبی محفلیں اب سے کئی برس پہلے بڑی باقاعدگی اور سرگرمی کے ساتھ مولوی عبدالرؤف صاحب وکیل تاتارپوری کے دولت کدہ پر "یوتھ ایسوسی ایشن" کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتی تھیں اس سلسلے کی وہ مجلس مجھے اب بھی یاد ہیں جو جگر مراد آبادی کے رحلت کے بعد انکی تعزیت کے لیے منعقد ہوئی تھی، ایسوسی ایشن کے قریباً سارے اراکین شریک تھے اور جگر کی یاد میں اپنی عقیدت کے پھول چڑھا رہے تھے۔ تعزیتی تجویز تحریر ہوئی اور جلسے کا اختتام جگر ہی کی غزل پر کیا گیا شمس الزماں نے جب اپنی سریلی اور درد بھری آواز میں یہ غزل شروع کی سے

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

تو کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نم نہ ہو گئی ہو۔ ہو گئی۔ ہر خاموشی میں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا در و دیوار کا ہر ذرہ اور گرد و پیش کی ساری فضا شمس الزماں سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ غزل کے ساتھ ہی سکوت بھی ٹوٹا۔ اپنی اپنی جگہ سے سب اٹھے اور بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں ہر چہرہ پر موت کی سفاکی کا ملال دیکھتے ہوئے دبے پاؤں چلے گئے۔ اسے غم روزگار کہئے یا زندگی کی ارتقائی منزل میں نے اس محفل کو بکھیر دیا۔ لیکن اس میں سے اکثر و بیشتر نے شعر و ادب کا دامن نہیں چھوڑا اس محفل کے نوجوان اراکین میں بعض ایسے

بھی ہیں جو ادبی دنیا میں اپنا قدم بناتے چلے جارہے ہیں، شاہین غازی پوری، کا شعری مجموعہ ابھی چند ماہ ہوئے ،، رگ ساز،، کے عنوان سے شایع ہوا ہے، محمود واجد علی خزاں کے پھول بہار کے دن،، کے افسانوں کا پہلا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے شمس الزماں عرصہ سے بسلسلۂ صحافت کلکتہ میں مقیم ہیں، صمد حمیدی کے اکثر افسانے اور جمال پھلواری کی غزلیں مختلف رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں اور کئی اور نوخیز فنکار جن کی نگارشات ادبی دنیا میں بنظر قبول دیکھی جاتی ہیں -

بھاگلپور ادبی انجمنوں میں بزم سخن کو مخصوص مقام حاصل ہے، یہ ان فنکاروں پر مشتمل ہے جو یہاں کی ادبی روایات کے سرمایہ دار ہیں اسے یہاں،، ام المجالس،، کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا - یہی یہاں کی ذوق شعری کی امین رہی ہے - اسی کی گود میں متعدد انجمنیں پلیں، بڑھیں اور اپنے پیچھے تلخ و شیریں یادگاریں چھوڑ گئیں - اس کی تاریخ گذشتہ نصف صدی کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے اور اس پر عروج و زوال کے مختلف دور گذرے ہیں جن کی حکایتیں کبھی کبھی ڈاکٹر ناصر علی ناصر ..... صاحب اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں، وہ خود بھی کبھی اس بزم کے سکریٹری تھے، شعر کہتے تھے اور شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے، اب ان ساری دلچسپیوں سے کنارہ کش ہوکر سجادہ و مصلیٰ اور ارادت و عقیدت سے شغل رکھتے ہیں، عرصہ تک اس بزم کے صدر بیرسٹر ابوالحسن صاحب مرحوم تھے صحت اور بینائی سے مجبور ہونے کے باوجود شعر و سخن سے شغف کا یہ عالم تھا کہ ہر باذوق ملاقاتی کو اپنے تازہ افکار سے مستفیذ کئے بغیر جانے نہیں دیتے تھے، نہ معلوم انکی بیاض کس کی ملکیت میں ہے اور کس حال میں ہے بھاگلپور میں اس تہذیبی رکھ رکھاؤ اور شاعرانہ مذاق کے صرف ایک ہی بزرگ رہ گئے ہیں اور وہ مولوی سید فضل علی خاں صاحب ہیں یہ شاد عظیم آبادی کے قرابت مندوں میں ہیں اور انہیں سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے، پروفیسر جمیل مظہری کی رائے ہے کہ شاد سے فیض یافتہ باقیات الصالحات میں فضل علی صاحب ہی تنہا رہ گئے ہیں - جن کے یہاں شاد کا رنگ شاعری پایا جاتا ہے - تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور اس کبر سنی میں بھی یادداشت کا یہ عالم ہے کہ تازہ غزل کے ہر شعر کا صرف پہلا لفظ کاغذ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھا ہوا ہے اسے دیکھتے جاتے ہیں اور شعر پڑھتے جاتے ہیں، ملنے والوں سے اس طرح ملتے ہیں جیسے وہ کوئی تاریخی شخصیت ہوں جس میں گذری ہوئی تہذیب کے بہترین اقدار سمٹ آئے ہیں انکے کلام کا کوئی مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - مدت ہوئی کہ مشاعروں سے کنارہ کر لیا -

بھاگلپور کی ادبی تاریخ میں بعض شخصیت ایسی بھی گذری ہے جو ہر بزم کی دستگیری سے بے نیاز بطور خود ایک بزم تھی، ایک ادارہ تھی، ایک انجمن تھی، قوس بھاگلپوری کا شمار ایسی ہی بزم طراز شخصیتوں میں ہے، مرنجاں مرنج آدمی تھے، تعلیم واجبی تھی لیکن اسے فطرت کی دین کہئے کہ چھوٹی بحروں میں اکثر ایسے شگفتہ شعر نکال لیتے تھے کہ بے ساختہ تحسین کے کلمات زبان پر آجاتے تھے، ان کی زندگی خدمت ادب کی نذر رہی لیکن خدمت ادب نے انہیں راس نہ آسکی، حسب معمول شخصیتوں سے کچھ علاحدہ خصوصیات کے مالک شعور بھاگلپوری بھی ہیں ان میں خدا رکھے بلا کی ذوق توانائی ہے اپنے کلام کا مجموعہ ،، کلام شعور ،، کے عنوان سے شائع کرا چکے ہیں :

،، قدیم بزم سخن،، کا عروج و زوال رشک انگیز بھی ہے - اور عبرت خیز بھی - کبھی اس پر عرصۂ حیات اس حد تک

تنگ ہوا کہ اس کے دم توڑ دینے میں کوئی کسر نہ رہی، اسکا نام ہی اسکا تاریخی نشان ہے "بزم سخن" کے ساتھ قدیم کا سابقہ ایک ایسے ہی سانحہ کی یادگار ہے۔ اور کبھی اس بزم پر ایسے عناصر نے غلبہ پالیا کہ سنجیدہ مذاق لوگوں کو شرکت سے بھی احتراز کرنا پڑا۔ اس نوعیت کا ایک واقعہ بزم سخن کے لئے ایک تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جو اسکے لئے فال نیک ثابت ہوا اور بزم نے رفتہ رفتہ اتنی یکجہتی اور توانائی حاصل کرلی کہ ہر ادبی ادارہ کو اس پر رشک آجائے۔ اسکا موجودہ دور انہیں عروجوں میں سے ایک ہے جسے ہم اس بزم کا نشاط الثانیہ کہہ سکتے ہیں "نظارۂ تخیل" کی اشاعت سے بعض مختصر سی مدت میں اس نے اپنے اراکین کے تین شعری مجموعے شائع کردئے۔ شاغل قادری کا "متاع شوق" نسیم آروی کا "آئینہ"، کریم اسدی کا "نگار فکر" اور چوتھا عبیر جو محی الدین غنی کے کلام کا مجموعہ زیر ترتیب ہے، بزم عنقریب بھاگلپور کے اہل قلم حضرات کا ایک تفصیلی ریکارڈ شائع کرنے کا عملی اقدام کر رہی ہے۔

ادبی انجمنوں کے سلسلہ میں بعض ادارے بڑی خاموشی کیساتھ قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں خانوادۂ شہبازیہ اور منتوسلین سجادہ شاہ دمڑیا اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں، خانقاہ شہبازیہ کے سجادہ نشین مولوی حاجی صفی العالم صاحب کے نعتیہ کلام کا ایک مختصر مجموعہ شایع ہو چکا ہے ان کے بزرگوں میں بھی مذاق شعری کا بڑا برگزیدہ احساس تھا خصوصیت کے ساتھ نعتیہ کلام سے دلچسپی ہمیشہ رہی، خانوادۂ شاہ ڈمریا کے موجودہ سجادہ نشین مولانا شاہ فخر عالم صاحب بھی شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں انکے اسلاف میں بھی اکثر ایسے بزرگ گذرے ہیں جنھوں نے شعر و ادب کا چراغ جلایا تھا۔ اور آج بھی یہ ذوق و شوق جاری ہے۔ اس سلسلہ میں نواب ارشاد حسین زیدی کی قدر دانیاں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں انکے بڑے بھائی ——— خود بھی شاعر تھے۔ اور شعرا کی سرپرستی فرماتے تھے۔ اپنی خاندانی روایات کو زیدی صاحب نے بھی قائم رکھا ہے اور آج کل انہیں کے دولت کدہ پر ادبی نشستیں ہوا کرتی ہیں۔

شہر بھاگل پور

از: —— نسیم آروی

پہلوئے گنگ میں پُر کیف نظاروں کا شہر
مسکراتی ہوئی نوخیز بہاروں کا شہر
رات آتی ہے تو دھرتی پہ گگن جاگتا ہے
پھول انگڑائیاں لیتے ہیں چمن جاگتا ہے

خُم و ساغر کا نگر، بادہ گساروں کا شہر
لالہ و گل کی زمیں، چاند ستاروں کا شہر
آنکھ کھلتی ہے صنوبر کی، سمن جاگتا ہے
ذرہ ذرہ لئے ماتھے پہ کرن جاگتا ہے

رنگ اڑتا ہے فضا میں کہ دھنک ٹوٹتی ہے
قہقہے ہیں کہ ستاروں سے کرن پھوٹتی ہے

دیدنی ہے کہیں مرتاض [illegible] تفصیل
اس چمن میں ہے کہیں لعل یمن کی محفل
اہل صنعت کے لئے صنعت و [illegible] کا شہر
مہ جمالوں کے لئے رنگ و سقافت کا شہر

کہیں سجتی ہے گل و سرو و سمن کی محفل
کہیں دل کھینچتی ہے شعر و سخن کی محفل
یاران جواں طبع محبت کا شہر
شکوہ و شکر کی جا، حرف و حکایت کا شہر

اے مرے شہر جنوں، میری تمنا کے وطن
اپنے خوں سے ترے ہاتھوں کو حنا دی میں نے
رفعت دار سے بھی تجھ کو صدا دی میں نے
حرم و دیر و کلیسا بھی ہیں دامن میں ترے
پھول خنداں ہیں بہت رنگ کے گلشن میں ترے

مرہم زخم دل و چارہ گر درد کہن
چوٹ سو بار بھی کھائی تو دعا دی میں نے
کہکشاں راہ گزر تیری بنا دی میں نے
کتنے مہتاب درخشندہ ہیں آنگن میں ترے
یوں تو ہیں کتنے ذخیرے ابھی خرمن میں ترے

لیکن اک میکدہ دیوانوں کا جو شہر میں ہے
گوہر نادر و یکتا ہے جو اس بحر میں ہے

گرچہ تخریب کا راہوں میں نشاں باقی ہے
فصل گل میں اثر دور خزاں باقی ہے
جان و دل سے یہ دعا دیتے ہیں میخوار ترے
لالہ و گل کے نگہبان رہیں خار ترے

کتنے چہروں پہ تفکر کا دھواں باقی ہے
کتنی آنکھوں میں ابھی خواب گراں باقی ہے
کہکشاں بن کے سجیں کوچہ و بازار ترے
غم حالات کا مرہم بنیں آزار ترے

قہقہے گونجیں مدھر ساز کا آہنگ لئے
ہر ادا ہو کشش جلوۂ صد رنگ لئے
زلفیں لہرائیں تری راہوں میں ناگن کی طرح!
روز مسرت کی گھٹائیں اٹھیں ساون کی طرح

قدیم بزم سخن

از:۔ عبدالرحیم نظر

انقلاب ۱۹۴۷ء نے زندگی کی قدروں کو یکسر بدل دیا تھا۔ کوئی ادارہ ایسا نہ تھا جو شکست وریخت سے دوچار نہ ہو۔ اس سے پہلے بھاگل پور میں ادبی انجمنوں کی خدمات کا سلسلہ رہا ہوگا۔ جسے ہم اپنا شاندار ماضی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ۱۹۴۸-۱۹۴۷ء میں اس شہر میں کوئی متحرک ادبی انجمن نہ تھی۔ جناب واجد علی قمر بھاگل پوری اپنے پرخلوص احباب کے سہارے بزم ادب کا نام ضرور زندہ کئے ہوئے تھے۔ جس کے بارے میں خود ان کا اپنا بیان ہے کہ یہ انجمن ۱۹۲۹ء سے قائم تھی اس کے صدر بیرسٹر ابوالحسن صاحب اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد ناصر تھے۔ خود قمر صاحب بزم ادب کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

بزم ادب کے زیر اہتمام ۱۹۴۸ء میں ایک مشاعرہ مغربی مجاہد پور میں مسعود صاحب کے مکان پر بیرسٹر ابوالحسن صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں دس بارہ سامعین اور آٹھ دس شعراء نے شرکت کی تھی اس کے بعد کوئی مشاعرہ شہر کے کسی محلہ میں ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء سے پہلے منعقد نہیں ہوا۔ بزم ادب ٹی، این، بی کالج کا ایک مشاعرہ ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں مقامی شعراء میں بیرسٹر ابوالحسن سروش عظیم آبادی، فضل علی خاں افضل، ذرفی پانی پتی، کریم اسدی، اور شاغل قادری نے شرکت کی تھی، اسی ٹی، این، بی کالج کی بزم ادب کا دوسرا مشاعرہ ۱۹۵۰ء میں وائس چانسلر رائے بہادر شری شیام نندن سہائے کی صدارت میں ہوا تھا۔

ان مشاعروں سے پہلے بھی ہر سال نہایت آب و تاب کے ساتھ کالج کی بزم ادب کا مشاعرہ، مباحثہ، اور مذاکرہ ہوا کرتا تھا۔ اور طلباء کی انعامات سے ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ مگر ایک ایسا بھی وقت آیا جب پروفیسر عبدالاحد صاحب صدر شعبۂ اردو بے دست و پا ہو گئے۔ نگارستانِ عجم کے عروج نے بزم ادب کو ایسا نقصان پہونچایا کہ جس کی تلافی آج تک نہ ہوسکی۔ یہ سماں دیکھ کر شہر کے ادیب، شاعر اور ادب نوازوں کو فکر ہوئی کہ نئی نسل کی ادبی تربیت کے لئے کوئی تنظیم ہونی چاہیے ایسے موقعہ کی فکر میں اہل شہر تھے ہی کہ تربہ رحمان پور کے حافظ عبدالشکور صاحب نے شاغل قادری کے تعاون سے ایک مشاعرہ اپنے دولت کدہ پر منعقد کرنا چاہا جس کو بڑی خوشی سے شاغل قادری نے قبول کیا۔ اور جناب کریم اسدی، اور ڈاکٹر محمد یونس سے مشورہ کے بعد مشاعرہ کی تاریخ اور مصرع طرح کا اعلان کر دیا گیا۔ مشاعرہ سے دو تین دن پہلے جناب کریم اسدی، شاغل قادری، واجد علی قمر اور ناچیز نے آپس میں مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ اسی مشاعرہ میں بزم سخن کے قیام کا اعلان کر دیا جائے ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو یہ مشاعرہ نہایت آب و تاب کے ساتھ منعقد ہوا۔ مشاعرہ کے بعد بھاگلپور کے کل شعراء سے بزم سخن

کے قیام کے سلسلے میں مشورہ کیا تھا۔ اور دہیں انتخاب عمل میں آیا۔ مندرجہ ذیل عہدہ دار منتخب ہوئے۔

صدر :۔ محمد سلیم وکیل مجاہد پور بھاگل پور

نائب صدر :۔ حضرت قوسؔ مرحوم بھاگلپور۔

نائب صدر :۔ حضرت مولانا ساجد اللہ حسرتؔ

جنرل سکریٹری :۔ مولوی قاسم ثروتی پانی پتی۔

جوائنٹ سکریٹری :۔ واجد علی اثرؔ

جوائنٹ سکریٹری :۔ شاغل قادری۔

ان عہدہ داروں کے علاوہ شہر کے تمام شاعروں کو بزم کا رکن تسلیم کرلیا گیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سے کسی شاعر کے پاس مشاعرہ کا کوئی دعوت نامہ لکھ کر نہیں دیا جائے گا صرف مصرع طرح اور جگہ کا تعین کر دیا جائے گا۔

دوسرا مشاعرہ جناب مفید ٹھیکیدار صاحب مرحوم کے صاحبزادہ محمد علی نے مجاہد پور روپ ٹولہ میں اپنے مکان پر منعقد کیا۔ تیسرا مشاعرہ ڈاکٹر محمد یونس نے اپنے دولت کدہ دافع البیٹ کوتوالی بھاگل پور میں سجایا۔ اس مشاعرہ کے بعد بزم سخن پورے شہر میں مشہور ہوگئی۔ اور ہر محلے سے دعوتیں ملنے لگیں۔ طریقہ یہ تھا کہ داعی مشاعرہ اخراجات کی کفالت کرتا تھا اور بزم سخن کے ذمہ انتظامات کا بار رہتا تھا۔ اس طرح مشاعرہ تاتار پور، بھیکن پور، خنجر پور، عابد پور، حسین پور، حبیب پور، رجار چک، قاضی ولی چک۔ اور تقریباً شہر کے ہر محلہ میں جمنے لگا۔ مشاعرہ ہر مہینہ ہوتا تھا اس لئے سال میں بارہ ہی مجلسیں منعقد ہو سکتی تھیں۔ مگر دعوتوں کا سلسلہ کچھ اس قدر دراز تھا کہ بزم سخن کو انجام کار ایک رجسٹر کھولنا پڑا جس میں دعوت ناموں کا اندراج کیا جاتا تھا۔ اور تاریخ اندراج کے حساب سے دعوتیں منظور کی جاتی تھیں۔ بزم سخن نے جب یہ دیکھا کہ طرحی شاعروں سے شعراء کی ذہنی تربیت تو ہو جاتی ہے لیکن ادیبوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے تو خصوصاً اسکول اور کالج کے طالبعلموں کے لئے انعامی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع کیا۔ تین انعام ہائی اسکول کے طلبا کے لئے اور تین کالج کے طلباء کے لئے ہر ماہ بزم نے مختص کر دئے۔ مصرعہ طرح کے ساتھ مضامین کے عنوان کا اشتہار بھی ہوتا تھا۔ طلباء یہ مضامین جنرل سکریٹری کے پتہ پر روانہ کرتے تھے۔ اور ہر ماہ کے مشاعرہ میں اول اور دوئم اور سوئم ہونے والوں کو پہلے انعامات دیئے جاتے تھے اور آئندہ کے عنوان بتائے جاتے تھے۔ پھر مشاعرہ شروع ہوتا تھا۔

اس وقت طلباء نے نہایت سرگرمی کے ساتھ ان ادبی مقابلوں میں حصہ لیا جن میں قابل ذکر محمود والحسن ہیں جن کے بارے میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ بزم سخن کے انعامی مقابلے کے صدقے میں وہ ایک کامیاب ادیب ثابت ہوئے ۔۔۔۔ بزم کے طرحی مشاعروں میں ہندی کے مقامی شعراء بھی رفتہ رفتہ دلچسپی لینے لگے۔ جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے پندرہ تک پہونچ گئی تھی۔ آنجہانی دوجندر جی جو ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے وہ بھی اردو میں شاذ کے نام سے شاعری کرنے لگے تھے۔ پورے شہر میں ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا منظر اگر کہیں کسی کو دیکھنا ہوتا تو وہ بزم سخن کے مشاعرے تھے۔ جہاں بلاتخصیص مذہب و ملت ہر شخص شریک ہوتا تھا۔ یہ سرگرمی ۱۹۵۳ء تک اپنے عروج پر رہی جس کے بعد بزم سخن کا نیا انتخاب عمل میں آیا۔ شہر کے ایک نوجوان وکیل صدر منتخب ہوئے۔ شاغل قادری کا صاحب گنج تبادلہ ہو گیا جن کی جگہ پر عبدالحمید صاحب جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر غیاث آثر صاحب، حمید رہبیؔ، اور البیع وکیل نے انجمن فلاح المسلمین کی بنیاد ڈالی جس سے بہت جلد البیع صاحب علیحدہ ہو گئے اور غیاث اثر صاحب بزم سخن کے نئے جو بھی تعاون کرتے تھے

اسے الیسع صاحب شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے جس کا رد عمل یہ ہوا کہ ڈاکٹر غیاث آثر نے انجمن فلاح المسلمین کا ایک شعبہ (اسلامی) قائم کرلیا۔ جس کا جنرل سکریٹری شاغل قادری کو موصوف نے منتخب کرایا جو صاحب گنج خود جا چکے تھے۔ اب شعبۂ ادب اور بزم سخن کے شاعر سے الگ الگ ہونے لگے۔ دو چار شعراء کے علاوہ بقیہ لوگ دونوں مجالس میں شرکت کرتے تھے شعبۂ ادب نے یوم غالب کے بعد یوم شاد منایا۔ جس دن یوم شاد سید وکیل صاحب کے دولت کدہ پر منایا جا رہا تھا اسی دن یوم یاس بزم سخن والوں نے عبدالمجید صاحب کے مکان پر منانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ منظر دیدنی تھا جب تاتار پور مارکٹ کے شمال اور جنوب دونوں طرف بزمیں سجی ہوئی تھیں۔ اور شعراء یہاں سے پڑھکر وہاں اور وہاں سے پڑھ کر یہاں آجا رہے تھے۔

اسی وقت کا شاغل قادری کا یادگار یہ شعر ہے ؎

دو رنگی میں یک رنگ اہل ہوا س
کہیں بزم شاد اور کہیں بزم یاس

سنجیدہ اصحاب فکر نے جنہیں اتحاد بہت عزیز تھا شاغل قادری اور غیاث آثر کا مشورہ قبول کرتے ہوئے بیرسٹر ابو الحسن (مرحوم) کی ہر دل عزیزی سے استفادہ کرنا چاہا اور یہ فیصلہ کیا کہ یوم سلامتی ابو الحسن نواب ارشاد حسین زیدی کے دولت کدہ پر منایا جائے۔ یہ فیصلہ اس لقین کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی اور اتحاد کا ہونا لازمی تھا۔ انجام کار ہوا بھی ایسا ہی۔ یوم سلامتی ابو الحسن کے دن جس میں دنیائے ادب کے مشہور شاعر و ادیب حضرت انجم مان پوری مرحوم بھی شریک تھے۔ بھاگلپور کی دونوں بزموں کے ذمہ دار شریک ہوئے۔ اور اس طرح اختلاف کا سد باب ہوا مگر کچھ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ جنہیں انتشار میں تنظیم کا نقشہ نظر آتا ہے اس عمل سے چراغ پا ہو گئے اور ان لوگوں نے بزم سخن کے اہم ستون جناب کریم آسدی، واجد علی قمر، عبدالرحیم نظر، اور قاسم پانی پتی سے الگ ہوکر نئی بزم کی بنیاد ڈال دی۔ کریم صاحب اور ان کے رفقاء نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لے کر بزم سخن کو از سر نو سجایا۔ سید مقبول احمد صاحب نئے صدر منتخب ہوئے۔ اور پورے شہر کے صاحب الرائے نے سرپرستی کا تحریری وعدہ فرمایا جس کی ایک طویل فہرست اس وقت شائع کردی گئی تھی لیکن چونکہ انتشار پسندوں نے بھی اپنی بزم کا نام بزم سخن ہی رکھا تھا اسلئے سہولت کے پیش نظر اصلی بزم سخن کا نام قدیم بزم سخن رکھ دیا گیا۔ ہزار کوششیں کی گئیں مگر شیشہ میں بال آجانے کے بعد وہ خوبی باقی نہ رہی جو پہلے تھی۔ عوام صرف ایک بات ہی کہتے ہوئے سنے جاتے تھے وہ جملہ تھا شاعر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اس لئے مشاعروں وغیرہ میں شریک ہونا اچھا نہیں ہے۔ مگر زبان و ادب کے کارواں کو آگے بڑھنا تھا، تعمیری کام کو انجام دینا تھا اس بدلے ہوئے ماحول کے پیش نظر ایک نیا طریقۂ کار ترتیب دیا گیا اور وہ تھا خصوصی نشستوں کا پروگرام۔

خصوصی نشستوں میں شعراء اور وہ اصحاب ذوق جنہیں زبان و ادب سے دلچسپی تھی شریک ہونے لگے۔ پہلے کی طرح کوئی اشتہار یا کسی قسم کے پروپگنڈہ کا ذریعہ استعمال نہیں کیا گیا خوشی سے خاص خاص لوگوں کو وقت اور جگہ کی اطلاع دی جانے لگی اس خصوصی نشست کے ساتھ ساتھ نئے ابھرنے والے شعراء کی رہنمائی کا مسئلہ بھی تھا جس کے لئے مجلس مشاورت مہینہ میں ایک بار منعقد ہونے لگی اس کام میں دلچسپی سے حصہ لینے والوں میں کریم اسدی، قمر اور نظر کے ساتھ محی الدین غنی، عادل غازی پوری، سرور آزادی، تصدیق اشہر اور مجروح عظیم آبادی

بھی شریک ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں جناب نسیم آروی سرکل انسپکٹر ہو کر بھاگلپور تشریف لائے اور صاحب گنج سے شاغل قادری کا تبادلہ بھی یہیں ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اکرام انجم، اختر ناصح نصیب، جمال پھلواروی اور صمد حمیدی بھی ادب کے اس کارواں سے آ ملے۔ اس طرح سب لوگوں کی متحدہ کوششوں سے قدیم بزم سخن رفتہ رفتہ پھر عروج پر آنے لگی۔ لیکن ہر قدم محتاط اٹھتا تھا۔ اس لئے پہلے دور کی طرح عوامی ہنگامہ آرائی سے کنارہ کش رہنا ہی مناسب سمجھا گیا! اسی زمانہ میں علی گڑھ میں ایک ادارہ "معیار سخن" قائم ہوا جس نے پورے ملک میں ایسے شعراء سے تعلقات استوار کئے جو اس بزم کے پروگرام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ہر ماہ اس کا طرحی گلدستہ تیار ہوتا تھا اور مختلف سالوں میں شائع کیا جاتا تھا۔ بھاگلپور کے شعراء بھی قدیم بزم سخن کی تحریک پر اس گلدستہ سازی میں حصہ لینے لگے۔

ایک سال کے بعد علی گڑھ کی بزم کا ارادہ ہوا کہ ایک تذکرہ شائع کیا جائے مگر وہاں کے لوگ یہ کام انجام نہ دے سکے اسی درمیان اختر ناصح نصیب نے ان تمام شعراء بہار کا تذکرہ مرتب کیا جو علی گڑھ کے ادارہ سے وابستہ تھے مگر خاص طور پر دو ایک کو چھوڑ کر تمام شعراء بھاگلپور ہی کے تھے۔ ناصح نصیب کی اس کتاب "نظارہ خیال" کو مکتبۂ "سہیل" نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا اس کے بعد ماہنامہ سہیل میں ایک طرحی گلدستہ قدیم بزم سخن بھاگلپور کا مرتب کردہ ہر ماہ شائع ہونے لگا۔ جس کی غزل اول آتی اس کے نام ایک سال کے لئے ماہنامہ سہیل جاری کر دیا جاتا تھا۔

ماہنامہ سہیل، گیا کے اس انعامی سلسلہ کے ادارتی بورڈ میں قدیم بزم سخن کے ہی پانچوں ارکان تھے جن کے نام یہ ہیں، شاغل قادری نسیم آروی، کریم اسدی، قاسم ژرفی پانی پتی، مسرور آروی، اور بعد میں محمد اکرام انجم۔ اس میں ملک کے مختلف شہروں کے شعراء شریک ہونے لگے۔ خط و کتابت کا سلسلہ مختلف نومشقوں سے بھی شروع ہو گیا جنہیں رہنمائی کی ضرورت تھی اس طرح مجلس مشورت کا کام بہت زیادہ بڑھ گیا۔ حضرت قوس بھاگلپوری آخری عمر میں بہت معذور ہو گئے تھے ان کی مالی امداد بزم سخن نے کرنا شروع کی تھی باہر سے اصلاح کے لئے جو غزلیں نظمیں آنے لگیں تو اس کی بہتات کو دیکھتے ہوئے نومشقوں کے ذوق و شوق کو آزمانے کے پیش نظر ایک معمولی سی فیس اصلاح کے لئے مقرر کر دی گئی۔ اس طرح جو روپے حاصل ہوتے وہ قوس مرحوم کے امدادی فنڈ میں جمع ہوتے رہے۔ اور آج بھی ان کے خاندان کے افراد کی امداد وقتاً فوقتاً اسی فنڈ سے کی جاتی ہے۔ یہاں پر واضح کر دینا ضروری ہے کہ حضرت قوس کو مجلس مشورت یا کسی شاعر کے کلام پر اصلاح وغیرہ دینے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ بزم سخن کی پوری کارروائی سے یہ بے تعلق تھے۔ ان کی مالی امداد اخلاقی فرض کے طور پر کی جاتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد آخری رسوم کی کفالت بھی اسی قدیم بزم سخن ہی نے کی۔

قدیم بزم سخن نے شہر کے علاوہ مضافات میں بھی زبان و ادب کا چراغ روشن کیا اور مصطفیٰ پور، پورینی، جمگاؤں، بدلوچک کہلگاؤں اور دوسرے بے شمار قصبات میں اپنا پیغام پہنچایا اسی طرح پورینی سے جناب حکیم عبدالباقی حکیم، منظر بھاگلپوری، ترنم پورینوی (مرحوم) اور مصطفیٰ پور سے نعیم الدین تاباں، اور بدلوچک کے مولانا علاؤالدین طیب مرحوم وغیرہ بھی بزم سے دلچسپی لینے لگے۔ ان قصبات میں بھی کئی مشاعرے ہوئے۔ پورینی میں ۱۹۳۵ء سے کوئی مڈل اسکول نہ تھا جس دن قدیم مڈل اسکول کے کھنڈر میں مشاعرہ کیا گیا اور حکیم عبدالباقی صاحب نے اسکول کے قیام کا احساس اپنے مضمون میں دلایا اس کے دوسرے ہی دن سے اسکول کو از سر نو قائم کرنے کی جدوجہد شروع ہو گئی، اور اب اس کی عمارت تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔

"نظارہ درخیال" کی اشاعت کے بعد ارباب قدیم بزم سخن نے باضابطہ مجلس اشاعت بھی قائم کرلی۔ اس طرح اشاعتی پروگرام کے تحت جناب شاغل قادری کی "متاع شوق"، "سیم ...ی کی "آتشیں" اور کریم اسدی کی "نگار فکر" اسی مجلس نے شائع کی۔ محی الدین غنی کا مجموعۂ کلام بنام "عنبریں" زیر ترتیب ہے۔

قدیم بزم سخن نے جو ادبی خدمات کا نقشہ بنایا تھا اس کی رنگ آمیزی میں جہاں اس بزم کے اراکین نے حصہ لیا وہاں ڈاکٹر سید احمد حسن صدر شعبۂ اردو ٹی۔ این۔ بی کالج، ڈاکٹر غیاث اثر ڈاکٹر محمد یونس، سید شاہ شرف عالم وغیرہم نے بھی دل سے حصہ لیا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ادبی شعبہ حلقۂ ادب کی شاخ جب بھاگلپور میں قائم ہوئی تو قدیم بزم سخن والوں نے نہایت خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا اور حال یہ ہے کہ قدیم بزم سخن کے ہی تمام اراکین حلقۂ ادب میں بھی نظر آتے ہیں اس طرح اتحاد و اتفاق کو پیدا کرنے کی جو کوشش افتراق کے سراٹھا . کے فوراً بعد کی گئی تھی بار آور نظر آ رہی ہے اب شہر میں کوئی ایسا شاعر یا ادیب نہیں ہے جسے کسی قسم کا قدیم بزم سخن یا حلقۂ ادب سے کوئی اختلاف ہو ہر شخص تعمیر کی دھن میں ایک ہی سمت قدم سے قدم ملا کر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ اتحاد و اتفاق کا منظر ہم کی نگاہ بد سے محفوظ رہے۔ آمین!

اب تک صرف بزم سخن کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی چھوٹی بڑی کئی انجمنیں شہر میں کام کرتی رہی ہیں مگر سب کے کام میں ایک بات مشترک رہی ہے اور وہ یہ کہ ہر انجمن کے ساتھ قدیم بزم سخن نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا ہے بزم یوتھ ایسوسی ایشن کوشۂ ادب بزم فروغ ادب کے علاوہ حسین آباد و ناتھ نگر کی لائبریریوں کے اراکین نے جب مشاعرے یا دیگر ادبی پروگرام مرتب کیے تو بزم سخن نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ انجمن ترقی اردو شاخ بھاگلپور کو بزم نے ہمیشہ ایک ایسا ادارہ تصور کیا جس کے پرچم کے نیچے سب کا یکجا ہو جانا لازمی ہے۔ انفرادی طور پر بھی نوجوانوں نے ادبی خدمات کے سلسلہ میں بہت کچھ کیا ہے۔ برہ پورہ اور بھیکن پور میں کئی مشاعرے ہوتے رہے ہیں۔ مشرقی مجاہد پور میں غلام حسین ماہی کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر اہتمام "آزاد ملیہ ایسوسی ایشن" جناب احمد محمد فد سابق وزیر کی صدارت میں ۱۹۶۲ء میں منعقد ہوا تھا جس کا افتتاح اس وقت کے وزیر جیل اور صحت عامہ جناب قیوم انصاری نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں مرحوم حکیم ... صاحب نے دلچسپی لی تھی۔ اسی طرح ایک اور آل انڈیا مشاعرہ قمر ناصر الدین نے اپنے احباب کے تعاون سے مسلم ہائی اسکول میں ۱۹۶۳ء میں منعقد کیا تھا جس کی صدارت مدیر پرچم ہند بیرسٹری انیس الرحمٰن نے کی تھی۔ اور افتتاح رائٹ آنریبل جسٹس کملا سہائے نے فرمایا تھا (بشری انیس الرحمٰن کو دعوت ان کے رشتہ داروں نے دی تھی) بزم حسینی بھاگلپور کے زیر اہتمام یادگار آل انڈیا قصیدہ اس شہر میں منعقد ہوئے جن سے زبان و ادب کے ارتقاء کو بڑا سہارا ملا۔ ان مقاصدوں میں لکھنؤ کے معروف شعراء شریک ہوا کرتے تھے۔ سرورش عظیم آبادی کے قصائد سے متاثر ہو کر موصوف کو شاعر بزم حسینی کا لقب دیا گیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر قصیدہ گو ہندوستان میں معدودے چند ہی ہوں گے۔ بزم سخن سے الگ اشاعتی کام بھی ہوا ہے۔ مثلاً جناب شعور بھاگلپوری نے اپنا کلام بنام "کلام شعور" اردو میں اور "یہ کیا ہو رہا ہے" ہندی میں شائع کرایا اور مولوی قاسم پانی پتی تدری نے بھی ایک نثری مجموعہ اردو غزل تنقید پر ایک نظر انفرادی طور پر شائع کرایا ——— سبورہائی اسکول کے ہیڈ مولوی مختار احمد صاحب جعفری بھی قابل مبارکباد ہیں جو اپنے اسکول میں ہر سال طرحی مشاعرہ کا نظم کرکے بچوں کی ادبی تربیت کا عملی مظاہرہ

پابندی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ کاش کہ موصوف کی پیروی دوسرے ہائی اسکول کے اساتذہ بھی ضروری سمجھتے۔ اس طرح بھاگل پور میں زبان و ادب کی ترقی اور بقا کا کام مختلف انداز سے ہو رہا ہے۔

یہاں شاعر و ادیب کا ایک ایسا باعظمت کارواں تیار ہو گیا ہے جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اس پر بیسلائے اردو کو فخر ہونا چاہئے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر پرچوں میں یہاں کے بہت سارے شاعر و ادیب کی تخلیقات کی اشاعت اور آل انڈیا ریڈیو سے ان کے کلام کا نشر ہونا بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو تعمیر و ترقی کا کام انجام دیا جا رہا ہے اس میں بہت حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نمایاں بات یہ ہے کہ یہاں کے شاعر و ادیب روایتی طور پر بے عمل واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ہر اس تعمیری کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں جس سے زبان و ادب کا فروغ ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً درس گاہوں کا قیام لائبریریوں کی تاسیس، شبینہ مکتب قائم کرنا اور اس میں سن رسیدہ لوگوں کو پڑھانا مختلف اخبار و رسائل کی ترویج کرنا اور خود خرید کر پڑھنا پھر اپنے گھروں میں نجی لائبریری قائم کرنا اور دوسروں کو اس کی طرف راغب کرنا ایسے کام ہیں جو یہاں کے شاعر و ادیب نہایت دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق کی انتہا یہ ہے کہ بے جھجک ایک دوسرے کی تخلیقات پر خاص نشستوں میں تنقید یں کی جاتی ہیں اور جس پر تنقید ہوتی ہے وہ خندہ پیشانی سے ناقد کی باتوں کو سنتا ہے۔ الحمد للہ یہ اد اکرتا ہے۔ دوسرے شہروں سے آنے والے ادنیٰ اور اعلیٰ شاعروں ادیبوں کے اعزاز میں یکساں طور پر مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ وہ یہاں سے مطمئن جائیں۔

بھاگل پور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر، مدیر ماہنامہ سہیل۔ گیا کی پیش کش پر اراکین قدیم بزم سخن بھاگلپور نے نومبر ۱۹۶۷ء میں غور و فکر کرنے کے بعد اپنے ذیلی ادارہ مجلس اشاعت کو مشورہ دیا کہ ماحول نمبر کی ترتیب کا کام شروع کر دے۔ مجلس اشاعت نے ڈاکٹر سید احمد حسن صدر شعبۂ اردو ٹی، این، بی، کالج اور ڈاکٹر غیاث آثر سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا اور مجلس کے اراکین اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس اہم کام کے لئے جواں سال پروفیسر لطف الرحمٰن کی خدمات حاصل کی جائیں۔ موصوف نے نہایت خندہ پیشانی سے مرتب کا بار گراں اپنے دوش توانا پر لینے کا عہد کیا اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا گیا۔ شاعر و ادیب کی تخلیقات حاصل کرنا اور پھر ملک کے اہل قلم حضرات سے ان پر مضامین لکھوانا ایک سخت مرحلہ تھا۔ مقام شکر ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر دہ کل حضرات نے ہماری آواز پر لبیک کہا۔ جنہیں ہم نے اپنی توجہ کا مرکز بنانا چاہا اس سے بھی دشوار کام تھا۔ بھاگل پور کی ادبی تاریخ کی چھان بین، لطف الرحمٰن نے بڑی محنت سے اس کام کو تکمیل تک پہونچایا۔ موصوف کے اس عظیم کام میں جناب نسیم آروی، صمد حمیدی، اکرام انجم، اختر ناصح اور سید شاہ منظر عالم صاحبان نے بھرپور اعانت کی۔ اور قدرے رہنمائی پروفیسر صدرالدین صاحب صدر شعبۂ فارسی ٹی، این، بی کالج نے بھی فرمائی۔ اگر ان تمام اہل علم حضرات کا تعاون ہمارے مرتب کو حاصل نہ ہوتا تو شاید جو گراں قدر مضمون وہ لکھ پائے ہیں وہ نہ لکھ سکتے۔

مرتب کا مضمون بھاگل پور کی ادبی تاریخ کا آئینہ ہے۔

یہ تو نہیں دعویٰ کیا جا سکتا کہ ماضی کے تمام دکمال گوشے اس سے روشن ہو گئے ہیں مگر بہت حد تک یہ مقصد ضرور حاصل ہوا ہے۔

آج اس شہر میں شاعر و ادیب کا جو کارواں موجود ہے اس کے ایک ایک فرد کو زیر نظر خاص نمبر میں شامل کرنے کی سعی کرتے ہوئے اراکین مجلس اشاعت شکر ہے تنگ نظری کا شکار نہیں

ہوئے ہیں۔ کچھ قابلِ ذکر ہستیاں اگر چھوٹ گئی ہوں تو یہ کوتاہی دوسری طرف سے ہی سمجھی جانی چاہئے۔ ورنہ مجلس نے شاعر و ادیب کا تعاون حاصل کرنے کی جد و جہد میں جس وسعتِ قلبی کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ یہاں تک کہ بھاگل پوری اور غیر بھاگل پوری کی تخصیص بھی روا نہیں رکھی گئی ہے۔ اور ان تمام فنکاروں کو ساتھ لیا گیا ہے جو اس شہر میں کسی نہ کسی جہت سے آج مقیم ہیں۔ تاکہ موجودہ ماحول کی صحیح عکاسی ہو سکے۔

شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ ادب نوازوں کا تعارف بھی آخری صفحات پر آپ کو ملے گا۔ مجلس اشاعت نے ادب نواز کی اصطلاح کے دائرہ میں ان تمام بزرگوں اور دوستوں کو رکھا ہے جو قدیم بزمِ سخن کے دیرینہ معاونین ہیں اور شہر کی ادبی تحریکات سے بہر صورت دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس میں اعلیٰ، ادنیٰ، غریب، امیر اور فرقہ کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ صرف یہ دیکھا گیا ہے کہ زبان و ادب کے سچے خادم چھوٹنے نہ پائیں۔ اس باب میں ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو اردو زبان سے ناواقف ہیں مگر ہماری جد و جہد کا یہ خوش گوار پہلو ہے کہ ایسے لوگ بھی ہمارے معاونین کی فہرست میں ہیں۔ تعمیری کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک ایسا درس ہے جسے ہمیں کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔

مجلس نے صرف اردو ادب کا جائزہ لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بھاگل پور کے ہندی اور بنگلہ ادب کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر بچن اور پرنسپل نکم چندر بنرجی صاحب کے دلی تعاون کو مجلس بہ نظرِ استحسان دیکھتی ہے۔

مضامین کی ترتیب کا جہاں تک تعلق ہے مجلس کا خیال تھا کہ فنکاروں کے نام یا تخلص کے لحاظ سے بہ اعتبارِ حروفِ ابجد مضامین کی ترتیب ہو مگر مرتب نے اپنا یہ حق محفوظ رکھا اور مجلس نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔ آخر میں اشاریے کے عنوان سے شہر کے دارالمطالعہ تصانیف اور فنکاروں کی فہرست بہ اعتبارِ حروفِ ابجد آپ کو ملے گی جس میں آج کے تقریباً کل شاعر و ادیب کا نام اور پتہ مل جائے گا۔ مرحوم فنکاروں کی بھی ایک علیحدہ فہرست دے دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں موجودہ شاعر و ادیب میں سے کچھ نہ کچھ ایسے ضرور ملیں گے جنہوں نے دیکھا تھا۔

تصاویر ـــــــ شاعروں، ادیبوں اور ادب نوازوں کی تصویروں کے علاوہ کچھ تاریخی عمارات کی تصویریں ایسی ہیں جن سے بھاگل پور کے ماضی و حال کا جلال و جمال آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا جن میں سے بیشتر کا حوالہ مرتب کے مضمون میں بھی ملے گا۔ شاعروں کی تصاویر میں آپ کو حضرت مولانا سید شاہ محمد صفی العالم مدظلہ سجادہ جانشین آستانہ شہبازؒ کی تصویر بھی ملے گی۔ یہ تصویر خانقاہ سے نہیں ملی ہے بلکہ جناب اسمٰعیل صاحب آسیؔ نے حج کے موقعہ پر پاسپورٹ کے لئے حضرت کی تصویر کھینچی تھی۔ اس کے نگیٹو (NIGATIVE) سے کئی ارادت مندوں نے استفادہ کیا تھا ایسے ہی ایک ارادت مند سے یہ تصویر ملی ہے۔

مدیر "سہیل" ہماری بزم کے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ "نظارہ و خیال" سے موجودہ ادبی ماحول نمبر تک کی طویل تاریخ موصوف کے تعاون کا ثبوت ہے۔ ہم نے اردو سے شائع ہونے والے تقریباً کل ادبی پرچوں کے مدیران کرام سے تعاون کیا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ کرتے رہیں گے۔ لیکن تمام مدیروں میں ادریسؔ صاحب نے جو اپنا دستِ تعاون ہماری طرف بڑھایا ہے وہ بے مثال ہے۔ موصوف نے ادبی ماحول کی پیش کش کر کے ہمیں جس آزمائش میں ڈالا تھا وہ صبر آزما تھا۔ مقامِ شکر ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ہم اس میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں حالانکہ فیصلہ کرنا قارئین کا منصب ہے۔

میکدہ کے نام

از ——— محمد اکرام انجم

چند ارباب وفا کیش تری چھاؤں میں
مدحِ زلف و لب و رخسار بھی کر لیتے ہیں

وقت اٹھاتا ہے جو تسلیم دل و جاں کا سوال
بڑھ کے سیرِ رسن و دار بھی کر لیتے ہیں

تیرگیٔ غم و آلام بہر گام سہی !
اپنے سینوں میں لئے آتے ہیں انوارِ سحر

ظلم اور جبر کے ہر چند ہیں محکم قانون
آج تک قید ہوئے ان کے نہ افکار و نظر

رات جب آتی ہے زلفوں کی سیاہی لے کر
اور مہتاب کہیں دُور چھپا ہوتا ہے

آسماں کر کے ستاروں کو نچھاور تجھ پہ
تیرہ راتوں میں چراغاں سا کئے دیتا ہے

کتنی شامیں ترے سائے میں ہوئیں رشکِ سحر
کتنی جاں بخش تری انجمن آرائی ہے !

خیمہ زن قافلۂ شوق ہوئے ہیں کیا کیا!
کتنے بچھڑے ہوئے احباب کی یاد آئی ہے

شدتِ غم میں گذارے ہوئے لمحات کبھی
چشمِ احباب کو اشکوں کے گہر بخشتے ہیں

اور کبھی وصل کے پر کیف و طرب زا نغمے
دل کو تابندگیٔ نورِ سحر بخشتے ہیں

دو گھڑی بیٹھ کے آغوشِ محبت میں تری
مشعلِ دل ترے میخوار جلا لیتے ہیں

چاہے اپنا کوئی غم ہو کہ زمانے کا ستم
مسکراتے ہوئے سینے سے لگا لیتے ہیں

کتنے برسوں کی مدارات ترے نام کیساتھ
رسمِ شوریدہ سری سلسلۂ جام کے ساتھ

کتنی یادوں کا تسلسل سحر و شام کے ساتھ
کتنے آویزاں ہیں دل تیرے در و بام کے ساتھ

تو سلامت ہے تو ہے لطفِ جنوں رنگِ بہار
تیرے ہی دم سے ہے تخیئل کے پھولوں پہ نکھار

تجھ سے روشن ہے شبستانِ رہ و رسمِ وفا
جان و دل کیوں نہ کریں تجھ پہ ترے رند نثار

کتنے برسوں کی مدارات ترے نام کے ساتھ
رسمِ شوریدہ سری سلسلۂ جام کے ساتھ

میکدہ

از :- پروفیسر امان اللہ ناز کی بالوی ایم اے اردو فارسی گھوشی کالج
(کھگڑیا)

مملکت بہار کی یہ عجیب بے نصیبی رہی ہے کہ اس نے اپنے فنکاروں کو کم جانا ہے اور ان کے جوہروں کو اور کم پہچانا ہے۔ علاوہ ازیں اردو ادب کی تحقیقی کتابیں متداول ہیں ان میں بھی دبستانِ بہار کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ بعض مصنفین نے اگر بہت رواداری برتی ہے تو شاد عظیم آبادی کا تذکرہ کر کے تاریخ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ پروفیسر معین الدین دردائی کی کتاب "بہار میں اردو" غالبًا پہلی کتاب ہے جس میں اہل بہار کی گراں قدر خدمات ادب کو منصۂ شہود پر لایا گیا ہے قاضی عبدالودود، پروفیسر حسن عسکری اور کلیم الدین احمد کے تحقیقی مضامین بھی اس سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اپنی تحریر و تقریر نیز علمی و عملی کارگزاریوں کی بدولت دبستانِ بہار کی ایک نئی عمارت یقینی قائم کی ہے لیکن اس کی بنیادیں ہنوز انہیں کے شانوں پر کھڑی ہیں اور زمین میں نہیں گڑی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کا قائم کردہ ریڈیائی سلسلہ بھی جو مضافات بہار کے اہل فن کی یاد تازہ کرتا ہے داد ستائش کا مستحق ہے۔ "ساغر نو" پٹنہ کا اختر نمبر اور "سہیل" گیا کا جمیل نمبر بھی دو عظیم ادیبوں کی یادگار ہونے کے سبب قابل ستائش ہیں۔

بہار میں اردو ادب کی تبلیغ و اشاعت میں "سہیل" گیا نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو اس مضمون میں ممکن نہیں، لیکن اتنا عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس قدیم ادبی رسالہ نے بڑے بڑے قلم کاروں کو گوشۂ گمنامی سے نکالا اور انہیں مشق و مجاولت کے ساتھ حصول شہرت کا موقع بھی بہم پہونچایا۔ بہار کے موجودہ چوٹی کے ادیبوں میں کم و بیش سب کا "سہیل" سے گہرا ربط رہا ہے اس نے اکابر ادبا اور شعرا کی زندگی نیز ان کے کارناموں سے متعلق خصوصی نمبر بھی شائع کئے۔ "بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر" بھی سہیل گیا کی ادبی حق نگاری کی ایک اور بین مثال قائم کر رہا ہے۔

ابھی چند سال پہلے مجھے بھاگلپور کے شعراء سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ تقریب یوں ہوئی کہ میری بعض گراں قدر اشیاء کھو گئیں، میں ان کی بازیافت کی خاطر حصول دعا کے لئے حضرت شہباز علیہ الرحمتہ کے مزار اقدس پر حاضری دینے گیا۔ اتفاق یہ کہ میرے ایک ہم وطن عزیز عبدالجبار نسیم آروی بسلسلہ ملازمت وہاں مقیم تھے (اور اب بھی ہیں)، نسیم صاحب خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں اور جہاں کہیں جاتے ہیں وہاں کے شعراء سے مل کر ایک بزم سجا لیتے ہیں۔ لہٰذا بھاگلپور کے ادبی حلقوں میں بھی وہ شیر و شکر

ہو گئے تھے چنانچہ مجھے بھی اپنے ساتھ بھاگلپور کی انجمن ادب "میکدہ" کی نشستوں میں لے گئے۔ شہر کے اس پل کے مشرقی شمالی بازو کے دامن پر جو اپنے سروں کو سمیٹتا ایک دلفریب ملاقات کے ساتھ اپنی راستوں کو پامال کرتا شہر کے جنوبی حصے سے اتصال قائم کرتا ہے۔ الحاج محی الدین غنی صاحب کا وہ ہوٹل واقع ہے جسے اہل میکدہ شبستان طرب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہوٹل کے سامنے ایک نشیبی ٹیلے پر کسی بزرگ کا روضہ ہے۔ جس کے احاطہ میں متعدد مزارات ہیں۔ رات کے وقت جب پل کے بازو بجلی کی روشنی میں جگمگا اٹھتے ہیں، سواریوں کی ریل پیل شروع ہو جاتی ہے اور اسٹیشن جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے، ریلوں سے انجن کی گھن گرج اگالدان کی گڑگڑاہٹ اور کبھی سائیں سائیں کی آوازیں فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔ سامنے مقبروں پر چراغاں ہوتا ہے —— اس روحانی اور رومانی فضا میں اہل میکدہ ہوٹل کے جھونپڑے میں ایک چوبی میز کے گرد بنچوں پر کبھی لالٹین، کبھی موم بتی، کی روشنی میں براجمان ہوتے ہیں۔ گاہ گاہ بجلی کی روشنی بھی ان کو دستیاب ہو جاتی ہے جھونپڑے کے ایک حصے میں ہوٹل کا کام بھی جاری رہتا ہے۔ اکے دکے گاہک بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور شعرائے کرام ابوالکلام آزاد کے نسخے کے مطابق چائے بنا کر پیتے رہتے ہیں (اگرچہ چائے بھاگلپور کے بازاروں ہی سے آتی ہے۔) نسخہ آزاد میں یہ لوگ کبھی لیمو، کبھی نمک کا اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔

اس مجلس کی تکریم اگر کریم اسدی ہیں تو تعظیم مسرور آروی! مجلس کا نظم و ضبط اور تحریک و التزام اگر شاغل قادری فرماتے ہیں تو مشعل برداری جناب قمر انجام انجام دیتے ہیں، اس کے پیر مغاں اگر جناب حکیم عبدالباقی صاحب ہیں تو ساقی خندہ لب اکرام انجم! اس بزم کا سوز و گداز اگر محی الدین غنی صاحب ہیں تو اس کا ساز و آہنگ تشنہ کا رعل! اس کی سادگی اگر جمال پھلواروی کا خلوص ہے تو اس کی پرکاری اختر ناصح نصیب علیگ کا پرجمال شکوہ! عادل صاحب کی تعدیل سخن اور اشہر صاحب کی تشہیر فن بھی باعث رونق انجمن ہے۔ عبدالجبار نسیم آروی کی حیثیت اس بزم میں وہی ہے جو شعرائے لکھنؤ میں سردار جعفری کی تھی۔

ایک نوجوان شاعر غلام حسین راہی بھی کبھی کبھی شرکائے بزم میں نظر آتے ہیں۔ مولانا شرونی پانی پتی، جناب ہری پرشاد بیدل، عبدالرحیم نظر، جناب صمد حمیدی، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر مظفر اقبال اور جناب تقی شاعر بھی اکثر و بیشتر رونق افروز انجمن ہوا کرتے ہیں۔

ہر شام مندرجہ بالا شعرائے کرام، شہزادہ گلفام بنے، اپنی اپنی نیلم پریوں کو جلوہ بائے دماغ میں لئے اس ہوٹل میں آنے لگتے ہیں۔ جسے دیکھ کر اکثر مجھے سہیل عظیم آبادی کا "مزدوروں کا ہوٹل" یاد آ جاتا ہے —— خیر سے یہ شعرائے کرام بھی قلم کے مزدور ہی تو ہیں۔ ان کا اندر اس ان کی اپنی محفل ہے۔ وہ کسی "اندر" کے درباردار نہیں۔ یہ ہوٹل کی بنچوں پر اس طرح بیٹھتے ہیں جیسے نوشیرواں تخت کیکاؤس پر یا شاہ جہاں تخت طاؤس پر بیٹھا کرتا تھا۔ سامعین کی تلاش یہاں بے سود ہے۔ اکثر "ہم خیر بہ و ہم ثواب" ہی پر عمل درآمد ہوتا ہے باہر سے آئے ہوئے فنکار مہمانوں کی ضیافت طبع بھی یہ مجلس انتہائی اخلاص سے کرتی ہے۔ رات ڈھلتی رہتی ہے اور یہاں گوہر شب چراغ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

مجھے اس بزم میں شریک ہونے کا شرف بارہا حاصل ہوا۔ بھاگلپور کے شعراء سے بالمشافہ ملاقات اسی بزم کی دین ہے بعد ازاں اختر ناصح نصیب علیگ کا ترتیب دیا ہوا بھاگلپور کے شعراء کا ایک تذکرہ "نظارہ و خیال" نسیم آروی کی معرفت دستیاب ہوا اور غائبانہ طور پر ان شعراء سے بھی متعارف ہونے

کا موقع فراہم ہوئے جو میری موجودگی میں سیکدہ کی نشستوں میں شریک نہ ہو سکے تھے۔

میکدہ یہ کی مجلسوں میں بھی اور "نظارۂ دخیال" کے اوراق میں بھی سرزمین بھاگلپور کی یہ اعلیٰ ظرفی اور رواداری دیکھنے میں آئی کہ علاوہ ان شعراء کے جو یہاں کے متوطن ہیں' ان فنکاروں کو بھی بھاگلپوری کی حیثیت دی گئی ہے جو گرچہ بیرونی ہیں لیکن بغرض اشتغال روزگار یہاں مقیم ہیں اہل سیکدہ کی یہ دل نوازی اور انجمن سازی قابل مبارکباد ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ بعض ارکان صاحب کتاب بھی ہیں چنانچہ شاغل قادری صاحب کی "متاع شوق" ، نسیم آروی کی "آتشیں"، کریم اسدی کی "نگار فکر" ادبی دنیا میں کافی مقبول و معروف ہو چکی ہیں۔

جناب الحاج محی الدین غنی کا مجموعۂ کلام "عنبریں" اور جناب جمال پھلواروی کا "جمال فکر" زیر ترتیب ہیں علم و ادب کی یہ "ٹھوس علمی اور تخلیقی خدمت" بجا طور پر اہل علم و فن کی مرکز توجہ بنی ہوئی ہے۔

میکدہ! جو فنکاران بھاگلپور کا دشت نجد بھی ہے (جہاں دامن دل و جگر کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں) اور پایۂ تخت اقلیم سخن بھی ـــــــ سیکدہ جو قبلۂ شعر و نغمہ بھی ہے اور جولانگاہ رہوار فکر و نظر بھی جس کی نظیر شاذ و نادر ہی کسی دیگر شہر میں نظر آئے گی۔

خدا اسے قائم و دائم رکھے!

مفتوں کوٹوی!

نظارہ وخیال!

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے (فیض)

میں اپنے اس مضمون کا آغاز، ایک مضمون کے چند اقتباسات سے کرتا ہوں جو رسالہ رہنمائے تعلیم دہلی ماہ جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے۔ " ذوق وشوق شاعرانہ، رجحان ووجدان عاشقانہ، فکر وفہم ناقدانہ، یہ سب قدرت کے عطیات ہیں وہ جسے چاہے عطا کرے، جسے چاہے نہ عطا کرے، نہ کسی خاص سرزمین سے انھیں نسبت ہے نہ کسی خاص قوم وملک سے۔ مقامی، ملکی وقومی حد تک کچھ شعائر خاص ضرور ہوا کرتے ہیں اور بیرونی ماحول وخارجی حالات کی اثر اندازیاں بھی مسلم ہیں۔ لیکن جہاں تک باطنی واندرونی خصائص انسانی کا تعلق ہے فطرت اس سلسلہ میں بڑی فیاض واقع ہوئی ہے اور اس کا یہ کرم مکان وزمان کی قیود میں کبھی مخصوص نہیں رہا ــــ جس طرح دیگر خصائل وخصائص انسانی کو جو محض باطنی سیرت وصفات سے متعلق ہیں، بیرونی اثرات وعوامل اور ان پر رنگ چڑھاتے ہیں، اسی طرح خارجی سہولتیں اور بیرونی سازگاریاں فطری صلاحیتوں کو روبکار لانے میں بڑی معاون ہوتی ہیں، اردو شعر وادب کے ساتھ یہی سب کچھ ہوا۔ اسے جہاں ماحول سازگار مل گیا یہ زبان خوب چمکی، دکنی، غریبوں کے جھونپڑوں میں بھی اور بادشاہوں کے محلوں میں بھی، جہاں مشکلات وموانعات اس کی ضیا پاشیوں میں خارج وحائل ہوئے اس کی جلوہ افروزیاں محدود ومخصوص ہوکر رہ گئیں حتیٰ کہ ایسے ناسازگار ماحول کے اردو پرستاروں اور خدمت گذاروں کے حالات سے بھی تاریخ اردو واقف نہ ہوسکی۔

اردو کے پرستار اور خدمت گذار رہے ہیں، حالات کی موافقت، اسباب کی سازگاری اور ذرائع کی بہم رسی کے باعث ان میں سے کئی منصۂ شہود پر آگئے کئی وسائل کے فقدان اور ماحول کی عدم مساعدت کی وجہ سے قعر گمنامی میں پڑے رہ گئے عدم شہرت کی دبیز تہیں ان کی حالات پر چھاتی چلی گئیں ــــ ــــ ضرورت ہے کہ ہمارے محققین ومؤرخین تلاش وتجسس میں لگے رہیں"......... اس ضمن میں ایک پہلو اور توجہ طلب ہے۔ ان محدود نظریات پر بھی افسوس کیا جانا چاہئے جن کی بدولت قلم کی جولان گاہیں مخصوص علاقوں مخصوص شخصیتوں اور مخصوص دائروں سے آگے نہیں بڑھ پاتیں، نظریں کشادہ، قلب فراخ، اور دماغ وسیع رکھنے کی ضرورت ہے، اردو ہر جگہ پہنچی ہے اور ہر گوشہ میں اس کے خدمت گذار موجود رہے ہیں۔ ارباب قلم اپنے اپنے حلقۂ معلومات اور دائرۂ واقفیت میں تحقیق وتجسس کریں۔ اور اپنے ماحول کے گمنام اردو خدمت گذاروں اور ان کی تخلیقات ونگارشات کو منظر عام پر لائیں، مشین کی پیداوار تخلیقات میں ہر پرزہ کی محنت وخدمت شامل ہے، تاج محل کی اینٹیں ڈھونے والا بھی اس کی رونق افزائی میں شامل ہے۔ اور وہ بھی جس نے اپنی سنگ تراشی سے پتھر پر گل باری کی ہے، فرق درجہ اور منصب کا ضرور ہوسکتا ہے لیکن ان میں کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!

یہ خشک جھاڑیاں جو پریشاں ہیں جا بجا

پھولوں کے خاندان سے ہیں دیکھتا ہے کیا ہم

نظارۂ و خیال ایک الہامی شعری مجموعہ ہے جو دعویداران اردو کے ممتاز مقامات، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، اور لاہور سے دور بھاگلپور (بہار) کے شعراء کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بقول جناب طیب عثمانی۔ بہار کی سرزمین یوں تو ہمیشہ سے شعر و سخن کا مرکز رہی ہے۔ اور آج بھی بہار کے آسمانِ شاعری پر کتنے ستارے روشن ہیں، کتنے ڈوب چکے، اور کتنے ہویدا ہو رہے ہیں ۔۔۔۔۔ اس کتاب میں صرف ان ستاروں کا تعارف ہے جو افق بھاگلپور پر کہکشاں کی طرح ابھرے ہو گئے ہیں ان میں بعض بڑے روشن اور تابناک ہیں بعض کی روشنی ابھی مدھم ہے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ مستقبل میں شہاب ثاقب کی طرح روشن نظر آئیں گے ۔۔۔۔

اس شعری مجموعہ میں پچیس شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے درج ہیں، جناب اختر ناصح نعیب نے اس شعری مجموعہ کو بڑے خلوص، اور بڑی لیاقت و استعداد سے مرتب کیا ہے۔ حالات کے سلسلہ میں، فن اور فنکار پر جو ناقدانہ رائے دی ہے وہ بڑی جچی تلی ہے۔ متانت و تہذیب کی آئینہ دار ہے، اور خود ان کے فنی شعور اور ادبی ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔ مشتملین میں کہنہ مشق اور پرانے کہنے والے بھی ہیں اور نو مشق و جدید رنگ کے علمبردار بھی نظمیں کم ہیں، بیشتر غزلیں ہیں ساتھ ہی شعراء کے منتخب و نمائندہ متفرق اشعار درج کر کے ان کے رنگ سخن سے متعارف کرایا گیا ہے غزلوں اور غزلوں کے اشعار میں روایات اور علامات غزل کی پوری پوری پاسداری ہے، ساتھ ہی ساتھ عصری تقاضوں اور وقتی میلانات سے بھی چشم پوشی نہیں کی گئی ہے۔ جناب طیب عثمانی نے اپنی تقریظ میں اس شعری مجموعہ پر یہ بڑی قابل قدر رائے دی ہے کہ ان میں کا ہر شاعر اپنے اندر زندگی کا ایک نیا احساس ایک حقیقت شناسی اور ایک انداز فکر رکھتا ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ احساسات کہیں مدھم اور کہیں اونچے سروں میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں مقدم و مؤخر اور پہلے پیچھے کی ترتیب کا بڑا جھگڑا ہے مشاعروں اور تذکروں میں اس سلسلہ کی ذراسی لغزش، اساتذہ و احباب کی سخت برہمی کا سبب بنتی ہیں اور اس دشوار مقام سے وہی لوگ کچھ زیادہ آشنا ہیں جن پر یہ بپتا پڑ چکی ہے۔ موجودہ دور کے کئی تذکروں میں اس مشکل کا حل اس طرح نکالا گیا ہے کہ حروف تہجی سے شعراء کی ترتیب دی جاتی ہے اس شعری مجموعہ کے مرتب نے بھی شعراء کے تخلص کے حروف تہجی سے اسے مرتب کیا ہے، انتساب ان فنکاروں کے نام ہیں جو پرورش لوح و قلم کرتے رہنے کے باوجود اس پروپیگنڈائی دور میں گمنام ہیں ۔۔۔۔۔ یہ بڑی قابل قدر جذبہ ہے جس کا ذکر اس مضمون کے ابتدائی اقتباسات میں آ چکا ہے۔

وسائل کے فقدان ۔۔۔ [illegible] پایہ تکمیل طور پر ضیاع ۔۔۔ [illegible] لوگوں نے ایسے ذرائع استعمال کرنے مناسب نہ سمجھے جو ان کی عزت نفس کے خلاف بھی تھے؛ دوران کے قیام و منصب کے لحاظ سے ناپسندیدہ بھی، بہر حال اس شعری مجموعہ کی تخلیقات نے ہمیں آج کے شعراء بھاگلپور سے روشناس ہونے کا موقع دیا۔ یہ سلسلہ شہر بہ شہر اسی انداز کا ہو تو بہت اچھا ہے، لیکن صوبائی وسعت لئے ہوئے ہو تو بھی غنیمت ہے۔ یقیناً دیگر مقامات اور دیگر صوبہ جات کے لئے یہ ایک خوشگوار مثال ہے۔ اگرچہ پہلی مثال نہیں، لیکن اولیت و فضیلت کے یقیناً وہی حقدار ہوں گے جو اس سلسلہ میں پہلے بیدار و باعمل ہو چکے ہیں۔

اس شعری مجموعہ کے بہت سے شعراء ادبی لحاظ

سے جانے پہچانے ہیں، اکثر رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، ان کی شہرت اپنے شہر اور صوبہ سے بڑھ کر ملک گیر ہو گئی ہے۔ گمنام شعرا اس مجموعہ سے روشناس ہو جائیں گے، بیشک مکتبۂ سہیل گیا اس سلسلہ میں لائق صد تحسین ہے کہ اس شعری مجموعہ کی اشاعت کر کے اسے اردو کی تاریخ شعر و سخن میں زریں اضافہ کیا، ایسے باحوصلہ ناشر اگر اردو قلم کاروں اور فنکاروں کو میسر آ جائیں تو اردو کی قسمت میں وہ ماتم

نہ رہے جس کی بدولت اپنے بھی اب اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اسے پردیسی زبان سمجھا جا رہا ہے آج یہ اپنے وطن میں غریب الوطن ہے، یہیں کی زبان ہوتے ہوئے ہندوستان کے کسی علاقہ کی زبان نہیں، کہیں کہیں سرکاری طور پر اس کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے لیکن اسے وہ آب و تاب کہاں میسر آئی جو اس کا حق ہے ــــــــ

مجموعہ میں خالص تغزل کے اشعار، اکثر و بیشتر ہیں، بڑے کیف و سرور کے حامل بڑے وجدان و رومان کے علمبردار۔

لغزشیں ایسی عطا کر کہ ہو منزل آساں
تیری آنکھوں سے چھلکتا ہے خمستاں اے دوست ۔ صفحہ ۲۸

کس کو معلوم کہ وہ ایک غضب ہے تیرا
لوگ سمجھے ہیں جسے تلخیٔ دوراں اے دوست ۔ جمال احمد جمال

لاکھ اچھالی گئی ساقی تیری محفل میں شراب
تیری آنکھوں ہی کو تکتا ہوا مے نوش رہا ۔ حکیم عبدالباقی ۔ صفحہ ۳۵ حکیم

گلی میں آپ کی آئے تو یہ ہوا معلوم
زمیں بھی رنگ بدلتی ہے آسماں کی طرح ۔ نواب ناصر رضا ۔ صفحہ ۳۹

لگا کے دل ہوئی تکلیف انتہا کی مجھے
کہ دیکھنا پڑیں نظریں ہمیشہ کا کی مجھے
کسی کے سامنے یہ محویت ارے توبہ
خبر ہے اپنی نہ دل کی نہ مدعا کی مجھے ۔ [illegible]

آشنا تو ساعت محشر سے ہو جائیں گے ہم

اے ستم پیشہ نظر یونہی تری برہم رہے
اٹھنے کو تو اٹھ جاؤں تری بزم سے لیکن
جاؤں تو کہاں جاؤں یہی سوچ رہا ہوں ۔ کریم اسعد ۔ صفحہ ۲

غزل کی چند رعایات و روایات مختلف عنوانات کے تحت کیوں نہ بیان کر دی جائیں ملاحظہ فرمائیے۔

ذوق و شوق۔ پھر چاہتا ہے جی کہ انھیں داستان شوق
عنوان بدل بدل کے سنائیں تمام رات ۔ زرنی پانی پتی

میرا گذر محال تھا حریم ناز تک مگر
وفور شوق میں انھیں پکارتا چلا گیا ۔ شاغل قادری

انتظار۔ بیٹھے ہیں انتظار میں اے دوست اہل درد
مژگاں پہ چاند تاروں کی اک انجمن لئے ۔ عادل

شب فراق۔ سو شوقیا متیں ہیں نہاں کچھ نہ پوچھئے
اس شب فراق کی اک اک پہر کے ساتھ ۔ تصدیق شہر

ابہام و خمدار۔ ذہن شاعر نے سنوارے تو بہت نوک پلک
پھر بھی مبہم ہی رہی پر پیچ خمدار کی بات ۔ اکرام انجم

عکس جمال۔ شیشۂ دل پہ جلا دیتا گیا عکس جمال
زندگی آئینہ آئینہ گر ہوتی گئی ۔ محی الدین غنی

نگاہ ناز۔ اسے حاصل نہیں ہوتا نشاط مے کشی ہرگز
جو ساقی کی نگاہ ناز کا محرم نہیں ہوتا ۔ فرحت القادری

دیدۂ بینا۔ عشق نے بخش دیا دیدۂ بینا مجھ کو
اب ترا جلوہ مستور بھی مستور نہیں

چشم فسوں گر۔ عجب اس شوخ کی چشم فسوں گر کا اشارا ہے
جسے دیکھا ہے لوٹا ہے جسے تاکا ہے مارا ہے ۔ بشر اسعد

چشم نم۔ ہر جور و ظلم و جبر کی جھک جاتی ہے نگاہ
کرتے ہیں اتنے فخر سے ہم چشم نم کی بات ۔ نسیم آردی

ان کی بھی چشم ناز سے آنسو نکل پڑے

کیوں چھیڑ دی کسی نے مری چشم نم کی بات۔ نصیب صدیقی

وعلیٰ ۔ ابھی ہے آسرا وعدے کا ان کے

ابھی تاروں میں کچھ کچھ روشنی ہے۔ قربان علی قوس

شب وعلیٰ ۔ حکیم وہ شب وعدہ ضرور آئیں گے

وفور شوق پہ تم اپنے اعتبار کرو۔ حکیم عبدالباقی حکیم

چراغ عزم ۔ بجھا دے اس کو طوفان حوادث یہ نہیں ممکن

چراغ عزم اپنا ایسے ہی طوفاں میں جلتا ہے۔ امیرالدین مجروح

زلف ورخ ۔ دن رات زلف و رخ کا تصور ہے اور ہم

بس مبتلا ہیں گردش لیل و نہار میں۔ نظر بھاگلپوری

ھم گنا تمھاں ۔ میں زباں سے کیا بتاؤں ملا کیا سکون دل کو

تری کیوں نہ لوں بلائیں مری گم ناگہانی ۔ واجد علی قمر

غزل میں جہاں جدید رنگ سمویا گیا ہے، وہاں بیان کی شگفتگی اور خیال کی تازگی کے ساتھ اسلوب و ادا کی ندرت، تشبیہ و استعارہ کی جدت، جذبات کی حرارت، تاثرات کی لطافت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے آفاقی و کائناتی مسائل کی جلوہ گری عام ہوتی ہے، غم جاناں ہی نہیں غم دوراں کا بھی اظہار ہوتا ہے اور پھر سماجی ملکی و قومی معاملات و حالات کو دخل کا موقع زیادہ دیا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو قبل آزادی شعر و ادب میں اپنا مقام حاصل کر چکے تھے اور انھوں نے یقیناً جد و جہد آزادی میں اپنے کلام و بیان اور نظم و نثر سے حصہ لیا ہوگا لیکن بعد آزادی ایسے اشعار و منظومات کی ضرورت کوئی خاص نہیں رہ جاتی، اس لئے غزل کے انتخابی اشعار میں ایسے شہ پارے ہی شامل مجموعہ ہیں جن سے ملکی آزادی، حب الوطنی، اور معاشرہ کے تعمیری جذبات کا پتہ چلتا ہے، آزادی وطن کے بعد ملک میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور آزادی کی تعمیر و تزئین کس انداز سے کی جا رہی ہے یہ اظہر من الشمس ہے۔

ان مسائل سے ہم سب کا کم و بیش واسطہ پڑتا رہتا ہے شعراء نے بھی اپنے اپنے انداز سے محسوس کیا ہے اور اشعار میں انھیں ظاہر بھی کیا ہے یہ مجموعہ آزادی کے ایسے مختلف محل و مقامات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اس بیس سالہ مدت آزادی کے متعدد پہلوؤں سے آپ بھی اپنے آپ کو روشناس کر لیجئے۔

آج ساقی کا ہمارے کرم عام تو ہے

دست میخوار میں خالی ہی سہی جام تو ہے

ساری روش ہی اہل چمن کی بدل گئی

ہر پھول گلستاں کا ہی بیگانہ بن گئے — [illegible]

وہ راہبر جو تھے مخصوص رہبری کے لئے

بھٹک رہے ہیں وہی آج روشنی کے لئے

دل کے گوشے ہیں کہ تاریک ہوئے جاتے ہیں

عقل انساں ہے کہ بیدار ہوئی جاتی ہے — [illegible]

سیاست انجمن کے صدقے مآل اہل وفا بھی دیکھا

کہ اب تو تاریخ عاشقی میں بھی ذکر دار و رسن نہیں ہے۔ جمال

رو رہی ہے کلی کلی حافظ

گل کھلایا ہے وہ بہاراں نے۔ حافظ اسرائیل حافظ

ہر پھول بن رہا ہے شرارہ چمن میں آج

خطرہ فزوں ہے اہل چمن جاگتے رہیں۔ حکیم عبدالباقی حکیم

جب سے آزاد گلستاں یہ ہوا ہے عادل

باغبانوں سے بھی دستور ہے یہ کیا گیا۔ عادل غازیپوری

گھپ اندھیرا ہے تو کیا؟ دل تو بہل جائیگا

آمد صبح درخشاں کی نذر بات کرو۔ شاغل قادری

بلا سے ٹوٹے فلک اس پہ یا گرے بجلی

اسی چمن میں بنانا ہے آشیاں مجھ کو۔ مجروح عظیم آبادی

چھڑکا ہے خون ہم نے ہر پھول ہر کلی پر

ہم کو ہے ناز ہمدم اپنی چمن گری پر۔ نسیم آروی

گلشن دہر میں جس پھول سے الفت ہوگی

اس کے کانٹوں سے بھی دامن کو محبت ہوگی ۔ نند کشور نند

غزل ہی میں یہ وسعت گیرائی اور گہرائی ہے کہ اس کی علامات اور روایات کی برقراری کے ساتھ اس میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کیا جا سکتا ہے ۔ سب کچھ کہہ جا سکتے لیکن اس کے لب و لہجہ میں اوپر کی مثالیں اس کی واضح مثالیں ہیں، مجموعہ میں کئی قطعات شامل ہیں جن میں بشری جذبات ملکی حالات اور وطنی معاملات موجود ہیں ۔

لوگ طوفان اٹھا کر ہی رہیں گے اے دوست

اور ہم شمع جلا کر ہی رہیں گے اے دوست

جگمگا دیں گے ہر اک گوشۂ بزم ہستی

تیرگی غم کی مٹا کر ہی رہیں گے اے دوست ۔ [illegible]

تشنگی مئے کے پاس جاتی ہے

تشنگی مئے اداس جاتی ہے

دوستو آنسو تو پی رہا ہوں مگر

اس سے کس کی پیاس جاتی ہے ۔ [illegible]

ہر ایک جام میں صہبائے زیست ڈھل کے رہی

نظام کہنہ بدلنا تھا اور بدل کے رہا

بڑھا بجھانے کو طوفان حادثات مگر

نئے چراغ کو جلنا تھا اور جل کے رہا ۔ [illegible]

عشق کیا راز ہے خدا جانے

کون سا ساز ہے خدا جانے

گونجتی ہے جو سارے عالم میں

کس کی آواز ہے خدا جانے ۔ [illegible]

وطنی محبت اور وقتی للکار کی جھنکار اس غزل میں ہے جو مختلف شعراء نے بھاگلپور کے ایک ایک شعر سے مرتب ہوتی ہے، چینی جارحیت کے وقت ان جذبات کا اظہار کیا گیا تھا ۱۴ اشعار پر مشتمل ہے میں صرف پانچ شعر بطور نمونہ درج کروں گا۔

شکست چین کو دے کر جہاں میں نام کریں

وطن کی لاج رہے جس سے اب وہ کام کریں ۔ مجروح

قلم کو اہل قلم تیغ بے نیام کریں

دفاع دامن کی خاطر کچھ آج کام کریں ۔ شاغل قادری

جہاں میں پھیل نہ جائے یہ جنگ چنگیزی

برائے امن و اماں تیغ بے نیام کریں ۔ کریم اسدی

یہ وقت ہے کہ دکھا دیں ہم اپنا عزم بلند

وطن کی راہ میں تقلید بو الکلام کریں ۔ غنی

لہو شہید وطن کا یہ کہہ رہا ہے قمر

کٹھن یہ وقت ہے مل جل کے آج کام کریں ۔ قمر

رباعیات شامل مجموعہ نہیں ہیں ۔ نہ نظمیں زیادہ شامل ہیں، یہ کہنا یقیناً بد دیانتی ہوگا کہ شعرائے بھاگلپور اس طرف ملتفت نہیں کئی کہنہ مشق اس میں شامل ہیں کئی شعراء کے حالات میں ان کی نظم گوئی پر روشنی ڈالی گئی ہے ایسے شعراء شامل مجموعہ ہیں جو عروض و فن اور زبان و بیان پر کافی دسترس رکھتے ہیں ہر صنف سخن پر یقیناً انھوں نے طبع آزمائی کی ہوگی، نظمیں بالعموم طویل ہوتی ہیں اور اس مجموعہ کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی تاہم غیاث آزر کا "احساس" اچھی شگفتہ نظم ہے ۔ شاہین غازی کی ریشم کے کیڑے، اور باتوں کا دیس، قابل قدر کوششیں ہیں ۔

تذکرہ و تاریخ سے زندگی و زمانہ کی مختلف شاہراہوں، پیچیدگیوں، سارہ بانیوں، ناکامیوں اور کامرانیوں کا اندازہ ہوتا ہے پچیس شعراء کے حالات زندگی کے مختلف پیچ و خم اور انقلابات کے متعدد موڑ تو نظروں سے گذرتے ہیں، ہر شخص کی زندگی ایک مستقل تاریخ ہے اور اس تاریخ کا ہر صفحہ اپنے

مجلسِ اشاعت بھاگلپور کی مطبوعات پر ایک نظر

اس ______ مظفر اقبال

" مجلسِ اشاعت " شہر بھاگلپور کے ایک قدیم اور معروف ادبی حلقہ " قدیم بزم سخن " کا اشاعتی ادارہ ہے جس نے اب تک مندرجہ ذیل تین شعری مجموعے شائع کئے ہیں۔

۱۔ متاعِ شوق ۲۔ آتشیں ۳۔ نگارِ فکر

• متاع شوق " شاغل قادری صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ جو تاج پریس باری روڈ گیا میں طبع ہو کر اگست ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ اس کے مندرجات کی ترتیب روشِ قدیم کے مطابق کی گئی ہے یعنی شروع میں تقریباً ۱۲ صفحات میں انتساب، تعارف، تقریظ اور تاثرات درج ہیں۔ اس کے بعد کلام کا متن ہے جو ۱۸۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اور آخر کے صفحات کتاب کی تاریخ طباعت سے متعلق مختلف شعراء کے قطعات کے لئے مخصوص کر دیے گئے ہیں اس طرح پوری کتاب لوح سے تمت تک تقریباً ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

شاغل قادری صاحب ایک پختہ کار اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے مختلف اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، نعت، سلام، ہجو وغیرہ سب ہی کے نمونے متاع شوق میں موجود ہیں۔ سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں اسالیب سخن پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ یہ راز اب فاش ہو چکا ہے کہ تلخ زمانی کے نام سے جو طنزیہ اور ظریفانہ کلام ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے وہ دراصل شاغل قادری صاحب ہی کا نتیجۂ فکر ہے۔ چنانچہ متاع شوق میں " تلخیات " کے عنوان سے اس کا ایک خوبصورت انتخاب بھی درج ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ گوئی سے بھی شاغل صاحب کو دلچسپی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے چند قطعات تاریخ کو بھی اس کتاب میں جگہ دی ہے۔ شاغل صاحب کے اسی وصف سے متاثر ہو کر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اپنی تقریظ میں رقم طراز ہیں :۔

" شاغل قادری صاحب کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ انہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت ہے اور کمال یہ ہے کہ مزاح اور ظرافت میں بھی ان کا رہوارِ خیال اسی تیزی اور سبک خرامی سے چلتا ہے جو ان کی

سنجیدہ غزلوں، قومی یا اصلاحی نظموں میں نظر آتی ہے یہ اس
بات کی دلیل ہے کہ موزوں طبعی کے ساتھ شوخئ خیال اور جدتِ
فکر ان کی فطرت ہے۔" (متاعِ شوق صـ۳)

یہ بات صحیح ہے کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک ماہر
دینیات ہیں اور شعر و سخن کے متعلق ان کے خیالات کو سند اور معیار
قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن مندرجہ بالا بیان صداقت پر مبنی ہے
اور جس نے بھی "متاعِ شوق" کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا ہے
وہ مولانا کی رائے کی تصدیق کرے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ شاغل صاحب فن شاعری کے
اسرار و رموز سے آگاہ ہیں، انہوں نے اس فن کو سیکھنے میں ایک
عمر صرف کی ہے اور نہ صرف یہ کہ پروفیسر اختر قادری، مولانا
سروش عظیم آبادی اور بسمل سنسہاردی مرحوم جیسے اساتذہ
فن سے فیض حاصل کیا ہے بلکہ وہ اپنے احباب سے بھی
مشورۂ سخن کرتے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے
جاننے والے جانتے ہیں کہ اب بھی ان کے اندر فن کو جاننے اور
سیکھنے کی طالب علمانہ تڑپ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تنقید و
تبصرہ کو بہت اہمیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ تخلیق کی
تہذیب و آرائش کے لئے تنقید ضروری ہے ؎

ممنون قادری ہوں اس نکتہ چیں کا دل سے
تنقید جس کی صیقل ہے میری شاعری پر

شاغل قادری صاحب ریاست بہار کے
ایک ایسے تعلیم یافتہ اور متدین خاندان کے چشم و
چراغ ہیں۔ جو اس صوبہ میں صدیوں سے دین و اخلاق
اور علم و ادب کی شمع روشن کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت
پر اپنے ماحول کا بہت ہی گہرا اثر پڑا ہے اس کے علاوہ شاغل
صاحب کو اپنے بزرگوں کی طرح ملکی سیاست سے بھی گہری
دلچسپی رہی ہے۔ اور اس سلسلہ میں وہ ایک دبستانِ فکر سے
وابستہ ہیں یعنی فکری اعتبار سے ان کا تعلق جمعیۃ العلماء ہند
ہے۔ چنانچہ جمعیت کے رہنماؤں کے دینی و سیاسی افکار سے
وہ شدید طور پر متاثر ہوئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ
انہوں نے اپنے مجموعہ کلام کو مولانا آزاد کے نام سے معنون
کیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کا اعلان بھی کیا ہے کہ ان کے
فکر و فن پر مولانا کی نثر کا گہرا اثر پڑا ہے۔ لکھتے ہیں :۔

" امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام جن
کی نثر نے میرے فکر و فن کو جلا بخشی "۔

(متاعِ شوق صـ۵)

شاغل صاحب کی اس تحریر کو پڑھکر مجھے علامہ
اقبال[7] کا وہ خط یاد آتا ہے جو انہوں نے غبارِ خاطر کی
پہلی اشاعت کے معاً بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم[7]
کے نام لکھا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ "غبارِ خاطر" کی ترتیب
و تدوین کا کام مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری اجمل خان
صاحب نے کیا تھا۔ اور کتاب کے شروع میں انہوں نے ایک
مقدمہ بھی تحریر کیا تھا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ
مارا کہ اقبال کی شاعری مولانا آزاد کی تحریروں کی بازگشت
ہے۔ اس پر علامہ اقبال سخت برہم ہوئے اور سید صاحب
کے نام اس خط میں اجمل صاحب کے خیال کی پر زور تردید
کی۔ علامہ اقبال کی برہمی اپنی جگہ پر صحیح ہے اس لئے کہ وہ
خود ہی ایک عظیم مفکر تھے۔ اور ساتھ ہی مولانا کے سیاسی
افکار کے شدید مخالف تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا آزاد کے طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان
سے اردو کے بیشتر شاعر اور ادیب بہت ہی گہرے طور
پر متاثر ہوئے ہیں۔ اور لوگوں کو جانے دیجئے اپنے عہد کے

امام المتغزلین حسرت موہانی نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

(کلیات حسرت صفحہ ۱۵۲، مطبوعہ مکتبہ اشاعت اردو، اردو بازار، دہلی)

خیر! یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ شاغل صاحب کے فکر و فن پر مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے مسلم رہنماؤں کے افکار کا نہایت ہی گہرا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں اور غزلوں میں یہ نشانات بہت ہی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں جو غیر معمولی جوشِ خطابت ہے وہ بھی شاغل صاحب کے کلام میں موجود ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ان کی مندرجہ ذیل نظمیں :

"جرس"، "حکمتِ آزادی"، "گردِ پیش"، "پیام"، "دورِ فتن"، "تجزیہ"، "ہمیں گلا ہے"، "ذرا جاگ جائیں"، "ماحول"، "جوانوں سے"، "شرارِ بولہبی" اور "کاش" وغیرہ

شاغل صاحب نے پتہ نہیں کس موڈ میں اپنی شاعری کے متعلق یہ بات کہی ہے کہ ؎

تری شاعری ابھی تا دری ہے اسیر کہنہ رواج کی
وہی حسن و عشق کی داستاں وہی ذکر بادہ و انگبیں

لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ شاغل صاحب حسن و عشق کے رموز اور بادہ و انگبیں کی لذت سے ناآشنا ہیں اس لئے کہ انہوں نے "حسنِ نظر" اور "سحرِ حلال" جیسی کامیاب اور رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اور ان کی غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار بھی اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کے دل کی وادیاں بھی کبھی سرسبز و شاداب رہ چکی ہیں۔ ؎

کیسی کیسی ہوئیں ارمانوں کی شمعیں روشن
داغ دل کے مرے پُرنور رہے ہیں کیا کیا

یوں لگے کب کسی کی یاد آئی
ہے ملا دل سے سلسلہ دل کا

اف درد انتظار و غم ہجر و بےکسی
کیا کیا نہ ہیں دل پہ بلائیں تمام رات

رات بھر تھا نہ یا دن کا رہا دل میں مقیم
کان میں آتی رہی اس کفِ پا کی آہٹ

شب کو آواز نہ پاؤ گے تو ڈھونڈھو گے مجھے
آہ و زاری کی سنو گے نہ صدا میرے بعد

شمع کا حال تو ظاہر ہے گھلی جاتی ہے
پوچھتا کون ہے جلتے ہوئے پروانے کو

کہاں دیکھا تھا کب دیکھا تھا اتنا ہوش ہے کس کو
مگر اب تک وہ صورت دلنشیں معلوم ہوتی ہے

جنوں کی ہیں یہ باتیں ان کو اہلِ ہوش کیا جانیں
کہ جو سمجھا نہیں جاتا وہ سمجھایا نہیں جاتا

یہ نگاہ جھک گئی کیا، یہ عرق عرق جبیں کیوں
ترے لب پہ بے خیالی میں جو آیا نام میرا

شب فراق بھی گزری عجب تصور میں
کہ جیسے پاس مرے آپ آئے جاتے ہیں

لیکن یہ رنگ شاغل صاحب کی شاعری کا خاص رنگ نہیں ہے ان کا محبوب موضوع دین وسیاست ہے اور غالباً اسی لئے انہیں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں عزیز ہے۔ غم جاناں سے وہ اپنا رشتہ محض اس لئے قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے باعث غم دوراں سے کبھی کبھی انہیں رہائی نصیب ہوتی ہے ؎

بخشی ہے رہائی غم دوراں سے اسی نے
ہم تو غم جاناں کا ادا نہ کریں گے

چنانچہ شاغل صاحب کا جام شاعری غم دوراں کے ذکر سے لبریز نظر آتا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں اسی موضوع سے متعلق ہیں اور غزلوں میں بھی یہی رنگ غالب نظر آتا ہے، یوں وہ کہتے تو ہیں کہ ؎

غزل میں قادری یہ زندگی کی ترجمانی کیا
یہ وہ صنف سخن ہے جس کی حد ذکر بتاں تک ہے

لیکن وہ غزل کو ذکر بتاں تک محدود نہیں رکھتے اس دائرہ سے باہر نکال کر اسے حوادث زمانہ کی ترجمانی کا وسیلہ بناتے ہیں اور اس کام میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی دو غزلیں درج ذیل کی جاتی ہیں ؎

آسماں کا چلن نہیں بدلا
آہ دور کہن نہیں بدلا
باغباں تو بدل گئے ہمدم
پھر بھی رنگ چمن نہیں بدلا
آشیاں خاک ہو گیا لیکن
بجلیوں کا چلن نہیں بدلا
وہی ہر بات میں ریاکاری
زاہد پر فتن نہیں بدلا
قادری خاک ہے یہ آزادی
طرز اہل وطن نہیں بدلا

چمن پر آگ برسائیں گی آخر بجلیاں کب تک
اٹھے گا اس طرح شاخ نشیمن سے دھواں کب تک
رہیں گی محنت برباد کی مجبوریاں کب تک
نظر کے سامنے جلتا رہے گا آشیاں کب تک
مری دل دوز فریادیں کبھی تو با اثر ہوں گی
رہے گی مصلحت بینوں کی آخر چپ زباں کب تک
پھر اس نقش قدم کو راہبر اپنا بنا لیں گے
کوئی منزل ہے یا رو اب تلاش کارواں کب تک
کبھی تو قادری یہ جبہ سائی کام آئے گی
جبین شوق پائے گی نہ اس کا آستاں کب تک

ہندوستان کی آزادی کے بعد محبان وطن کی توقعات کا جس طرح خون ہوا اور صرف بیس اکیس برسوں کے اندر یہ ملک فساد، انتشار، بدامنی اور افلاس کا شکار ہو کر رہ گیا اقلیتوں کے حقوق پامال کئے گئے۔ اور ان پر ہر قسم کا ظلم و جور روا رکھا گیا اس کی ترجمانی ان غزلوں میں بہت ہی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے

اور کمال یہ ہے کہ فنی اعتبار سے بھی یہ غزلیں خاصی کامیاب ہیں جو کہ ان کے اندر ایک مرکزی نقطۂ خیال موجود ہے اس لئے ان کے اشعار میں معنوی ربط اور ہم آہنگی ہے اور خیالات میں تسلسل اور ارتقاء کی کیفیت موجود ہے۔ میں نے کہا ہے کہ غم دوراں شاغل صاحب کا محبوب موضوع ہے اور وہ اپنے کلام میں اس کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔ مثال کے طور یہاں کی غزل کے مزید چند اشعار پیش کئے ہیں :۔

آج صیاد کو بھی اپنے گرفتاروں کی
جانے کیوں کوشش پرواز پہ رونا آیا

جس کے لہو نے رنگ بھرا ہے بہار میں
کیف بہار سے وہی اب آشنا نہیں

چھوڑ کر صحن چمن جانا ہے ویرانے کو
کیا ہوا موسم گل آتے ہی دیوانے کو

قفس میں خواب بن کر شکل گل یوں بار بار آئی
اسیران کہن سمجھے ہیں چیخ اٹھے بہار آئی

مذہب سے گہری وابستگی کی وجہ سے شاغل صاحب کی طبیعت پر رجائیت غالب ہے۔ مایوسی ان کے نزدیک کفر کے برابر ہے۔ اس لئے قنوطیت کو اپنے قریب بھی آنے نہیں دیتے۔ یہ نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی یہ کلمۂ کفران کی زبان سے بھی نکل جاتا ہے ؎

نہ ان مایوسیوں کی چھا چکی ہے گلشن دل پر
بہاریں لاکھ آئیں پر کہیں آباد ہوتا ہے

لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے سینے کو امید و یقین سے آباد رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایک نہ ایک روز حالات درست ہوں گے البتہ اس کے لئے کوشش شرط ہے۔

کبھی تو قادری یہ جبہ سائی کام آئے گی
جبین شوق پائے گی نہ اس کا آستاں کب تک

ان کا ایمان ہے کہ ایک وقت آئے گا جب یہاں خوشیوں کا آفتاب نمودار ہوگا اور رنج و غم کی تاریکی چھٹے گی، ملاحظہ ہو ان کی نظم "صبح نو"، جو فنی اعتبار سے بھی کامیاب ہے۔

صبح نو

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے
آرزو کا چراغ مدھم ہے
ہر طرف ہے بلا کی تاریکی
دور منزل ہے راہ پر خم ہے
نئے عنواں کی ہے مسیحائی
جو دوا درد دل کی ہے سم ہے
موت ماحول پر ہوئی طاری
سرنگوں زندگی کا پرچم ہے
چشم حق بیں مگر نہیں مایوس
روشنی گر نہیں تو کیا غم ہے
دل میں شمع یقیں تو ہے روشن
ہوا اگر تیرگی کا عالم ہے
ہلکے ہلکے نسیم کے جھونکے
کہہ رہے ہیں کہ رات اب کم ہے
پھر چمن میں بہار آئے گی
کھلنے والی سحر کا پرچم ہے

یہ نظم ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ افسوس کہ متاع شوق میں

اس طرح کی کوئی دوسری نظم نہیں ملتی ؟

شاغل قادری صاحب نے چند مدحیہ نظمیں بھی کہی ہیں اور بلاشبہ ان میں ممدوح کے اوصاف کو بہت ہی سلیقے سے واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں کامیاب قصیدہ کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اور تقریباً یہی حال ان کی تعزیتی نظموں اور قطعات کا بھی ہے۔ جن میں متوفی کی سیرت کے محاسن بہت ہی خوبصورت انداز میں اجاگر کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو جو پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر کہا گیا ہے ؎

تاریخ ہند کا جو سنہرا تھا ایک باب
نہرو کی زندگی کی ہوئی ختم وہ کتاب
نہرو وہ جس نے کشتِ وطن کو بصد امنگ
سیراب خونِ دل سے کیا اپنے بے حساب
اصلاح ملک و قوم میں جس نے گنوائی عمر
قربان زلگارِ ہند پہ جس نے کیا شباب
اپنے وطن سے عشق تھا جسے والہانہ تھا
اہلِ وطن کو جس سے محبت تھی بے حساب
ہر بات جس کی رمز سیاست کا آئینہ
ہر جہد جس کی اپنے مقاصد میں کامیاب
تھا پیچھے پیچھے امن پسندوں کا قافلہ
کیا دیدنی تھی دہر میں نہرو کی آب و تاب
افسوس روٹھ کر وہ گیا ایسے وقت میں
بھارت کو جبکہ اس کی ضرورت تھی بے حساب

۶۴ ۶ ۱۹

جمہوریت بھی سر کو جھکا کر یہ بول اٹھی
بھارت کا زیرِ خاک ہوا آج آفتاب

۶۴ ۶ ۱۹

شاغل صاحب کی ہجویہ نظمیں بھی لطف سے خالی نہیں ہیں وہ اپنے اندر وافر سامانِ فرحت و انبساط رکھتی ہیں خصوصاً حسنِ فن اور "شاعرہ" بہت ہی دلکش اور جاذبِ توجہ نظمیں ہیں۔

"متاعِ شوق" کے مطالعہ کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ شاغل قادری صاحب کی فکر میں جدت اور تازگی ہے۔ اور فن پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں تک فن کا تعلق ہے وہ واقعی اردو شاعری کی کہنہ روایات کے پابند ہیں۔ یہاں تک کہ اقبال کے عہد میں اور اس کے بعد اردو شاعری کی ہیئت میں جو اصلاحیں کی گئیں اور جو نئے تجربے ہوئے ان کی طرف بھی انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ ان کی بیشتر غزلوں کے اشعار میں معنوی ربط و تسلسل کی شدید کمی ہے۔ بلکہ ان کی نظمیں بھی استثناء چند تو ترتیب و تنظیم، ارتقائے خیال اور حسنِ تعمیر سے خالی نظر آتی ہیں اور بعض کا تو یہ حال ہے کہ اگر عنوان کو حذف کر دیا جائے تو انہیں "نظم" کہا ہی نہیں جاسکتا مثلاً قرب و بعد، شاعر کی تمنا، جائزہ، پیام، دو دشمن، متاعِ آدمیت، حدیثِ دل، زندگی، تنہائی، ہوگا! "صدائے محبت اور وقت آیا وغیرہ کو برائے نام ہی نظم کہنا چاہیے ورنہ حقیقتاً یہ غزلِ مسلسل ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل نظم ملاحظہ ہو ؎

وقت آیا

بشر کے وقفِ تسلیم و رضا ہونے کا وقت آیا
کہ پھر دار و رسن سے آشنا ہونے کا وقت آیا
جہاں سے زعم باطل کے فنا ہونے کا وقت آیا

بنی آدم کے پھر حق آشنا ہونے کا وقت آیا

جنوں ناکامیوں سے اب بھلا دوچار کیا ہوگا
کہ بزم ہوش کے وحشت سرا ہونے کا وقت آیا

سدھاری ظلمتِ شب، پَو پھٹی، انسانیت جاگی
کہ گمراہوں کے منزل آشنا ہونے کا وقت آیا

نسیم صبح گاہی پھر پیامِ فصلِ گل لائی
چمن کی ہر روش کے پرفضا ہونے کا وقت آیا

نہ ہوں گی گوش زد اب ساحروں کی فتنہ گر باتیں
اب انساں کے توہم سے رہا ہونے کا وقت آیا

شرارِ آتشِ نمرود کو گلزار ہونا ہے
خلیلی شان کے جلوہ نما ہونے کا وقت آیا

ہے ناممکن کوئی انساں بنے انساں پہ حاکم
تمرد کی غلامی سے رہا ہونے کا وقت آیا

ہوا مضبوط اب خیر امم کا رشتۂ ملت
جہاں سے قاذری شر کے فنا ہونے کا وقت آیا

ظاہر ہے کہ ردیف کو عنوان قرار دینے اور مضمون میں تسلسل پیدا کرنے کی کوشش سے "نظم" وجود میں نہیں آتی۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاغل قادری صاحب ایک پرگو، متانی اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کی مختلف وادیوں کی سیر کی ہے۔ اور ہر وادی میں اپنا نقشِ قدم چھوڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نقوش ابھی دھندلے ہیں اور ان میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ لیکن ان کا سفر ابھی جاری ہے۔ اور اس لئے توقع ہے کہ مستقبل میں یہ نقوش زیادہ واضح، منفرد اور پرکشش ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

"آتشیں" نسیم آروی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے۔ شروع کے صفحات میں انتساب، عرضِ حال، مقدمہ، تقریظ اور تاثرات درج ہیں۔ درمیان میں کلام کا متن اور آخر میں قطعاتِ تاریخِ طباعت، پوری کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

"آتشیں" کی ترتیب و تدوین بھی کم و بیش "متاعِ شوق" ہی کے انداز پر ہوئی ہے۔ لیکن بقول مصنف اس میں کچھ فرق بھی ہے "عرض حال" میں ذکر کرتے ہیں:-

"میں نے نظموں کی ترتیب میں بھی تسلسل کو مدِ نظر رکھا ہے جس سے ایک نظم پڑھنے کے بعد دوسری نظم اس سے مزاجاً مشابہ ہو، مثلاً "خوش آمدید" (جس میں کسی کی آمد کی منظر کشی کی گئی ہے) کے بعد "مرحمتِ ناز" (جس میں عنایتوں کا ذکر ہے) اور اس کے بعد دوبارہ ان سے ملنے پر انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا گیا ہے۔ "یاد دہانی" میں اس پر ان کا ہنس کے ٹال دینا" ادھر کوئی مسکرا رہا ہے" میں دکھایا گیا ہے اور اس کے بعد نظم "تضاد" پیش کی گئی ہے وغیرہ۔

حقہٗ نظم اور غزل کو "تسلسل" سے جوڑا ہے جو دونوں حصوں کے درمیان حدِ فاصل بھی ہے، اور نقطۂ ارتباط بھی۔ کیونکہ یہ نظم صوتی اعتبار سے غزل مسلسل ہے جس کی ردیف کا آخری حرف "الف" ہے۔ اس لئے غزلوں کی فصل میں اسے سب سے پہلے رکھا گیا ہے۔ اور باعتبار معنوی یہ ایک غزل نما نظم ہے۔ جسے نظم کی فصل کے اخیر میں رکھا گیا ہے اس طرح دونوں حصوں کے درمیان کی کھائی میرے خیال میں پٹ گئی ہے (آتشیں، ص ۹)

اور:-

غزلوں کی ترتیب اگرچہ باعتبار حروفِ تہجی کی گئی ہے

لیکن تاریخ تصنیف بھی درج ہے" (آتشیں صفحہ ۷)

مجھے نہیں معلوم کہ نسیم صاحب نے نظموں کی ترتیب کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کا حاصل کیا ہے؟ اسی طرح غزلوں کی ترتیب میں بھی تدوین کے قدیم اور جدید طریقہ کار کی جو آمیزش کی گئی ہے اس کا بھی کوئی مقصد واضح نہیں ہوتا؟ ہاں اگر پورے کلام کو جدید طرز تدوین و ترتیب کے مطابق تاریخ وار مرتب کیا جاتا تو اس سے یقیناً صاحب کتاب کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی لیکن جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بہت ہی عجیب ہے اور اس سے شاعر کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں دقت اور الجھن ہوتی ہے۔

آتشیں نسیم آروی صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو تاج پریس بارکا روڈ میں طبع ہو کر اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام قلمی نسخہ کی شکل میں جین پور ہائی اسکول کی لائبریری میں محفوظ ہے اور ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ کلام کو یکجا کرنے میں میں نے ان ابتدائی کاوشوں کو شامل نہیں کیا ہے جنہیں ۱۹۵۲ء میں جین پور ہائی اسکول کی لائبریری میں قلمی نسخہ کی شکل میں محفوظ کر دیا گیا تھا آتشیں میں ۱۹۵۲ء کے بعد ہی کی تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے۔" (آتشیں صفحہ ۷)

گویا آتشیں میں اس زمانہ کا کلام شامل نہیں کیا گیا ہے جو نسیم صاحب کی مشق و مہارت کا زمانہ تھا بلکہ اس وقت سے اب تک کا کلام درج ہے جب نسیم صاحب کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہوئی اور انھیں اپنے فن پر اعتماد حاصل ہوا۔

نسیم آروی صاحب ایک بامقصد شاعر ہیں، حیات و کائنات کے متعلق ان کا ایک زاویۂ نظر ہے جس کی طرف عرض حال میں انھوں نے کچھ اشارے کئے ہیں، لکھتے ہیں:۔

"میں نے نقوش ماضی سے "آتشیں" کی ابتدا کی ہے تاکہ میری زندگی با ہمہ نشیب و فراز بے نقاب ہو جائے میں کن کن بحرانی ادوار سے گذرا ہوں؟ والد محترم کے انتقال کے بعد مصائب کے کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹے ہیں؟ مورد ثی جائداد نہایت ناکافی ہونے کے سبب طالب علمی کے دور میں کس طرح مجھے فاقہ کشی کی منزلوں سے گذرنا پڑا ہے؟ ۱۹۵۰ء میں جب کہ میں بی۔ اے آنرس کے فائنل درجہ میں تھا کس طرح اپنی پہلی اولاد کو میں نے مرجانے دیا اور علاج تک نہ کر سکا؟ یہ ساری باتیں "نقوش ماضی" میں واضح ہو جاتی ہیں۔

یہ راز صرف ہمارا نہیں سبھی کا ہے
ہم آؤ سارے زمانے کو راز داں کر لیں

"مزدوروں" "جواب خط" "شریک حیات" سے اور "عید ہے آج" وغیرہ نظمیں اپنا پس منظر خود اجاگر کرتی ہیں، اس دور کی (۱۹۵۰ء تک کی) اور بائی نظموں میں مشترکہ طریقہ تعلیم (COEDNATION.) کی جھلکیاں ملیں گی جو خود اپنے ماحول کی آئینہ دار ہیں اس کے بعد کی نظموں میں بھی کم و بیش وہی زندگی کی تلخیاں اور تابناک مستقبل کی حسرتیں کارفرما نظر آئیں گی جس کے لئے مجبور ہوں رع

دیں گے وہی جو پائیں گے اس زندگی سے ہم

(آتشیں صفحہ ۸)

اس کے علاوہ "آتشیں" کے مقدمہ نگار اور نسیم صاحب کے ہمدم دیرینہ پروفیسر امان اللہ غازی نے بھی اپنی تحریر میں نسیم صاحب کے معتقدات کے متعلق کچھ اشارے کئے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"ترقی پسند شاعروں سے وہ عام طور پر متاثر

ہیں" (آتشیں صفحہ ۴۲) اور اب "نسیم کی شاعری ان کے ترقی
پسندانہ ذہن و ذوق اور تخلیقی جدت و ندرت کے لحاظ سے فیض کی
شاعری سے یگانگت کی حد تک مشابہت رکھتی ہے" (آتشیں صفحہ ۴۲)
ان اشاروں سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نسیم
صاحب زندگی کے متعلق مادی نقطۂ نظر کو صحیح سمجھتے ہیں، وہ مارکس
کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہیں اور نتیجہ کے طور پر خود کو اردو ادب
کی ترقی پسند تحریک سے قریب پاتے ہیں، روحانیت پر ان کا ایمان
نہیں ہے چنانچہ اپنی نظم "تقدیر کا لکھا" میں بہت ہی واضح طور
پر اپنے مسلک کا اظہار کرتے ہیں ؎

انھیں سمجھائیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں
صرف دستورِ زمانہ کا چلن ہے اے دوست
اسی بندھن میں ہے جکڑی ہوئی صدیوں سے حیات
یہی دستور تو زنجیرِ کہن ہے اے دوست

اسی دستور نے لکھا ہے کہ عزت بک جائے
اسی دستور نے لکھا ہے کہ محنت بک جائے
اسی دستور نے لکھا ہے شرافت بک جائے
اسی دستور نے لکھا ہے محبت بک جائے
اسی دستور نے لکھا ہے کہ غیرت بک جائے
اسی دستور نے لکھا ہے کہ عصمت بک جائے

دوستو اپنے دل و جاں کی لگا کر بازی
اسی تقدیر کے لکھے کو بدلنا ہے ہمیں
پنجۂ جبر سے ہستی کو چھڑانے کے لئے
اسی دستور کو پاؤں سے کچلنا ہے ہمیں

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز بہت ہی پر
آشوب حالات میں ہوا تھا، ملک کے اندر برطانوی حکومت کی مخالفتیں
اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور نتیجہ کے طور پر پورے ملک میں عوامی انقلاب
کی تیاریاں ہو رہی تھیں، ظاہر ہے کہ یہ حالات ترقی پسند
نظریات کے فروغ کے لئے نہایت سازگار تھے چنانچہ
۱۹۳۶ء میں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی تو
اس وقت نہ صرف یہ کہ اردو کے جواں سال ادیبوں میں تمام
قابل ذکر حضرات اس سے وابستہ ہو گئے بلکہ حسرت، اقبال
اور پریم چند جیسے کہنہ مشق اور مسلم الثبوت ادیبوں نے بھی
اس تحریک کی تائید و حمایت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ
تک اس تحریک کو بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی لیکن
حصول آزادی اور تقسیم ملک کے چند سال بعد سے یہ تحریک
آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور اب تو اس کا جادو بالکل سرد
ہو چکا ہے یوں ابھی بھی کچھ لوگ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے
کی کوشش کرتے رہتے ہیں چنانچہ ادیبوں کا ایک طبقہ اب تک
اس سے وابستہ ہے، نسیم صاحب اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں

ترقی پسند شعراء میں مخدوم، مجاز، سردار اور فیض
کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی، یوں جاں نثار اختر، ساحر
لدھیانوی، جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، جذبی، مجروح سلطانپوری
شکیل بدایونی، اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے بھی کم شہرت
حاصل نہیں کی لیکن ترقی پسند ادب جن شعراء کو معیار قرار
دیتے ہیں وہ وہی چہار یار ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا اور
ان چار میں بھی فیض کو سب سے بڑا تسلیم کیا جاتا ہے۔
چنانچہ حال ہی میں انھیں روس نے لینن انعام (Lenin
Peace Prize) سے بھی نوازا ہے۔

فیض کی مقبولیت صرف ترقی پسندوں تک محدود نہیں
ہر مکتبۂ فکر کے لوگ انھیں اس وقت اردو کا ایک عظیم شاعر
سمجھتے ہیں اس لئے کہ دوسرے ترقی پسند شعراء کے برعکس
انھوں نے شاعری کو اپنے نظریات و معتقدات کے اظہار

کا محض ایک وسیلہ قرار نہیں دیا ہے بلکہ ان کے وہاں فن کا رکھ رکھاؤ بھی ملتا ہے' انھوں نے مقصد پر فن کو قربان نہیں کیا ہے' انھیں فن شاعری کی نزاکتوں کا پورا پورا احساس ہے اور وہ ان کا بھرپور احترام کرتے ہیں۔

اردو کے جدید شعراء خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا جدیت پسند فیض سے شدید طور پر متاثر اور مرعوب نظر آتے ہیں۔ نسیم آروی صاحب کے کلام پر بھی فیض کی شاعری کا اثر بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے' یہاں تک کہ انھوں نے فیض ہی کی طرح اب تک صرف تین اصناف سخن : نظم' غزل اور قطعہ کو اپنے افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور ان میں بھی زیادہ تر ان کی توجہ نظم کی طرف ہے' غزلوں میں بھی فیض ہی کی طرح اشعار کے معنوی ربط و تسلسل اور خیال کی تنظیم و ترتیب کو ضروری سمجھتے ہیں' کہتے ہیں :-

" ہاں اتنی بات عرض کردوں کہ زیادہ تر غزلیں غزل مسلسل کی صورت میں ہیں اس میں اس ناچیز کے مزاج کو دخل ہے' مجھے غیر مربوط غزل نہ جانے کیوں پسند نہیں"۔ (آتشیں صفحہ ۸)

یہاں پر نسیم صاحب نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے' انھیں غیر مربوط غزل اسلئے' ناپسند ہے کہ ان کے "پیر طریقت" فیض کو بھی یہ پسند نہیں ہے اور اکثر مربوط غزل ہی کہتے ہیں' اس کے علاوہ دور حاضر میں غزل کی بے ربطی پر ناقدین نے شدید اعتراضات کئے ہیں اور اسکے اسی نقص کی بنا پر اسے "نیم وحشی صنف سخن" قرار دیا ہے اور نسیم صاحب کو اس امر کا باقاعدہ درس دیا گیا ہے۔ انھوں نے ریاست بہار کے کا لجوں میں تعلیم حاصل کی ہے جہاں کلیم الدین احمد صاحب کی کتابیں داخل درس ہیں' اور کلیم صاحب ہی وہ پہلے ناقد ہیں جنہوں نے غزل کے اس عیب کو بہت ہی نمایاں کرکے پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نسیم صاحب ان باتوں سے متاثر ہوئے ہیں اور اسی لئے انھیں غیر مربوط غزل ناپسند ہے۔

بہرکیف! حقیقت یہ ہے کہ نسیم صاحب ہر اعتبار سے فیض کے مقلد اور پیروکار ہیں چنانچہ فکر اور فن دونوں ہی میں ان کی پیروی کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس حد تک غلو برتتے ہیں کہ کہیں کہیں ان کے کلام پر فیض کے کلام کا دھوکہ ہونے لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعوری طور پر "فیض ثانی" بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے فیض کی مندرجۂ ذیل نظمیں پڑھئے :-

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے' ~~چند روز اور مری جان~~'

چند روز اور مری جان

اے دل بے تاب ٹھہر

یاد' پیام' تجدید اور مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اور اس بعد نسیم صاحب کی مندرجۂ ذیل نظموں کا مطالعہ کیجئے :-

ہم سفر سے !' جواب خط' ~~تو نہیں تیری محبت کی حسین~~

تو نہیں تیری محبت کی حسین یاد تو ہے'

تجدید وفا ! کس کو فرصت کہ تم سے پیار کرے !

آپ کو ان نظموں میں عنوانات کے علاوہ فکر و فن دونوں ہی اعتبار سے مماثلت' حیرت انگیز مماثلت نظر آئیگی۔

فیض کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں کی حکایت پہلو بہ پہلو ملے گی اور نسیم صاحب کے یہاں بھی یہ بات موجود ہے یہ اور بات ہے کہ فیض کی طرح ان کے ہاں غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج نظر نہیں آتا اس لئے کہ رومانی نظمیں خالص رومانی ہیں اور ان کے عہد شباب کی یادگار ہیں اور وہ نظمیں جن میں تلخئ زمانہ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں عریاں حقیقت نگاری اور سیاسی نعرہ بازی ملتی ہیں۔

یہ بات اب طے ہو چکی ہے کہ فیض عہد جدید کا ایک بڑا شاعر ہے اس لئے جواں سال شعراء کا اس سے متاثر

ہونا ایک فطری امر ہے اور اگر وہ اس سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو یہ
بھی ایک مستحسن فعل ہے لیکن بغیر شرط پیروی اور نری نقالی سے پرہیز
کرنا چاہئے، اگر نسیم صاحب اس نکتہ کو ذہن نشین کرلیں تو وہ خود
بھی ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہوسکتے ہیں اس لئے کہ شعر گوئی کی فطری
صلاحیت ان کے اندر موجود ہے اور ان کا ذوق شعری بھی بالیدہ ہے
ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال
سے لیکر فیض تک تمام بڑے شعراء کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے بہت
ہی سلیقہ سے استفادہ کیا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے نسیم صاحب کی نظموں کو دو حصوں
میں منقسم کیا جاسکتا ہے: رومانی اور مسائلی، ان کی رومانی نظمیں
خالص رومانی ہیں مثلاً: خوش آمدید، مرحمتِ ناز، یاددہانی، ادھر
کوئی مکرا رہا ہے، ویران محل، مرادوں کی سحر اور عشرت کی رات وغیرہ
ان نظموں پر فیض کے علاوہ اختر شیرانی اور مجاز کی رومانی
نظموں کا اثر بہت ہی صاف نظر آتا ہے۔

مسائلی نظموں میں زندگی کے مختلف مسائل مثلاً سرمایہ
دارانہ نظام کی لعنتیں، طبقاتی کشمکش، امن اور جنگ اور معاشی
استحصال وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے اور ان پر ترقی پسند
نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل نظموں میں ان ہی
موضوعات کو پیش کیا گیا ہے:۔

کس کو فرصت کہ تم سے پیار کرے، جاگتے رہنا، عہد ہے آج،
پردیس کی عید، عید کا چاند، شریک حیات سے، مزدوران، جواب
خط، کائنات کا راز، تجلی، تقدیر کا لکھا، شکستِ غمِ دوراں، تحفظ
امن کے لئے اعلانِ جنگ وغیرہ۔

ان نظموں پر فیض کے علاوہ جوش اور علی سردار جعفری
کے اثرات نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ نظمیں ہنگامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں مثلاً جارحیت
کے خلاف، یوم آزادی، چین کے ایٹمی تجربے، معذرت،
فلسفۂ شادی، رخصت اے شہرِ طرب، داغ مفارقت،
نذرِ حریت، جواہر لعل وغیرہ۔

نسیم صاحب کی نظموں کے مطالعہ سے یہ حقیقت
واضح ہوجاتی ہے کہ نسیم صاحب کو نظم نگاری کا سلیقہ
معلوم ہے یہ اور بات ہے کہ اب تک ان کا اپنا کوئی
اسلوب نہیں بنا ہے اور ان کی مختلف نظموں پر فیض کے علاوہ
اردو کے دوسرے بڑے شعراء کے اسالیب کی گہری
چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ نسیم صاحب
نے نظم کہنے کا انداز سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں
میں ارتقائے خیال اور حسن تعمیر موجود ہے۔ نظم کے
مختلف حصوں، ابتدا، وسط اور انتہا میں ایک ناگزیر
ربط ہے، مرکزی خیال اور نقطۂ عروج میں گہرا تعلق
ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ کلام میں شعریت ہے،
زبان و بیان میں لطافت اور صلاحیت ہے اور بلیغ استعاروں
و کنایوں، خوبصورت تشبیہوں اور مستحسن اشاروں
و کنایوں کا برمحل استعمال ہے اور یہ باتیں نظم کو کامیاب
بنانے کے لئے کافی ہیں، مثال کے طور پر ذیل کی نظم ملاحظہ
ہو:۔

ویران محل

یہ کس کا خط ہے دھڑک اٹھا دل
یہ چونک اٹھا دل، پھڑک اٹھا دل
وہ خط کہ تمہیں لکھا ہوا ہے
مجھے وہاں تو بلا رہی ہے
کہ تو کہیں دور جا رہی ہے
محل رہا ہے دل شکستہ

بہ چشم گریاں بہ حال خستہ
یہاں جو آیا تو میں نے دیکھا
کہیں یہاں سے تو جا چکی ہے
اور اپنی دنیا بسا چکی ہے
اٹھیں وہ دلدادہ وار آنکھیں
وہ پر الم اشک بار آنکھیں
ہر ایک شئے سے یہی تقاضا
کوئی بتا دے نشاں کسی کا
کہاں گیا کاروان کسی کا
یہ سائباں میں لٹکتی شاخیں
وفورِ گل سے مہکتی شاخیں
مچل مچل کے یہ کہہ رہی ہیں
یہاں کوئی مسکرا چکی ہے
شباب کے گیت گا چکی ہے
یہ سائباں سے ذرا ہٹ کر
کچھ اور روپ کچھ اور اثر
یہ غسل خانہ ہے کل گئے ہیں
جہاں کبھی تو نہا چکی ہے
اور اپنی زلفیں سکھا چکی ہے
سنگار خانہ یہی ہے تیرا
یہ آئینہ والا چھوٹا کمرا
جو عین مرکز ہے اس محل کا
جہاں ترے پیر ہاتھ کے نشاں ہیں
مرے تخیل کے گلستاں ہیں
اداس دن میں اداس راتیں
گذر گئیں وہ سہانی باتیں
چہل پہل ساری سو گئی ہے
یہ بام و در رو رہے ہیں سارے
تڑپ رہے ہیں تیرے غم کے مارے
ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے
اور آتشِ غم میں تپ رہا ہے
یہ ایک ویراں یہ ایک بیاباں
فقط ہیں اب خارزار اس میں
نہ آئے گی اب بہار اس میں

اس نظم کے ساتھ نسیم صاحب نے یہ نوٹ بھی دیا ہے:-

" اپنی کلاس فیلو کے خالی کوارٹر پر، جو اپنے والدِ محترم کے ساتھ ان کے تبادلے کے بعد کہیں دور جا چکی تھیں "

اب اس پس منظر میں نظم پڑھیے اور یہ دیکھیے کہ شاعر کے دل پر جو بیتا ہے، جو لگتا ہے اس کی کتنی کامیاب ترجمانی یہ نظم کر رہی ہے، لڑکپن کی معصوم محبت، محبوب کا دفعتاً جدا ہو جانا، جدائی کے درد میں اس کے خالی مکان کی ہر اس چیز کا ذکر جس سے اس کی وابستگی رہی ہے اور گزرے ہوئے حسین لمحات کو یاد کر کے ملول و افسردہ ہونا، ان تمام باتوں کو بہت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے، مکان کی تصویرکشی کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ سارا منظر نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے اور قاری شاعر کے غم میں برابر کا شریک ہو جاتا ہے اس کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی یہ نظم مکمل ہے، خیال میں ارتقائی کیفیت موجود ہے، ابتدا، وسط اور انتہا کی منزلوں میں ایک ناگزیر ربط ہے اور اپنے عروج پر پہنچ کر نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے تمام

اشعار ہی نہیں بلکہ مصرعے بھی ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور
ان میں تنظیم و ترتیب بھی موجود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نسیم صاحب کے مزاج میں ربط و تنظیم
کی کیفیت موجود ہے اور اسی لئے نظم گوئی کی طرف ان کی طبیعت زیادہ
مائل نظر آتی ہے لیکن ان کی بعض نظموں میں تنظیم و ترتیب اور تعمیر کی نمایاں
کمی نظر آتی ہے اور اپنی ہئیت کے اعتبار سے وہ غزل مسلسل
معلوم ہوتی ہیں مثلاً تضاد، راکھی سے دوست کا خط پا کر، عشرت
کی رات، وسیع النظری، وتسلسل کو ہم غزل نما نظمیں کہہ سکتے
ہیں، خود نسیم صاحب کو بھی غالباً اس کا احساس ہے چنانچہ
"تسلسل" کو انھوں نے بھی غزل نما نظم ہی قرار دیا ہے۔ اس
طرح ان کی غزلوں کے اشعار میں ربط و تسلسل تو موجود ہے اس لئے
کہ انھیں "غیر مربوط غزلیں" ناپسند ہیں لیکن یہ ربط و تسلسل محض ظاہری
ہے، ان کے یہاں بھی "بیت" اور "شعر مفرد" کو ہی اہمیت حاصل
ہے۔ مثال کے طور پر ان کی درج ذیل غزل کو دیکھئے:—

نہ سہی وصل نیا وعدۂ فردا تو ہوا
اسی امید پہ جینے کا سہارا تو ہوا

سچ کہا آپ نے اپنا وہ مجھے کیا کہتے
کم سے کم ان کی زباں سے میرا چرچا ہوا

ہر بن مو نے سنایا تو سہی حال تباہ
خامشی پر میری تقریر کا دھوکا تو ہوا

یوں بھی جاتی، میری اک جان کی قیمت کیا تھی
حوصلہ ان کا میرے قتل سے پورا تو ہوا

کھل کے اب دادِ ستم دیتے ہیں دینے والے
آخرش چاک رخِ ناز کا پردا تو ہوا

میں نے مانا کہ ابھی غم کی گھٹا چھائی ہے
لاکھ دھندلا ہو شبِ غم کا سویرا تو ہوا

حال بیمار کا پوچھا تو سہی اس نے نسیم
عارضی ہی سہی کچھ غم کا مداوا تو ہوا

کون کہہ سکتا ہے کہ اس غزل کے اشعار میں ناگزیر
ربط و تسلسل اور ہمواری ہے، جو بات درج ہے وہ اشعار میں
ہے وہ دوسرے اشعار میں نہیں۔

یوں بھی جاتی میری جان کی قیمت کیا تھی
حوصلہ ان کا میرے قتل سے پورا تو ہوا

میں نے مانا کہ ابھی غم کی گھٹا چھائی ہے
لاکھ دھندلا ہو شبِ غم کا سویرا تو ہوا

اس بات سے قطع نظر نسیم صاحب غزل کے آداب
سے واقف ہیں اور ان کی غزلوں کے اشعار میں تغزل
کی بھرپور کیفیت موجود ہے اس لئے کہ اس عزم کے باوجود
کہ —

ان کے گیسو تو بہر حال سنور جائیں گے
پہلے ہم گیسوئے گیتی کی گرہ تو کھولیں

اور —

اے سنگدل پڑا ہے ابھی نسخۂ اجل
اک عشق ہی علاج غم زندگی نہیں

وہ اپنے کو گیسوئے جاناں کے حلقہ سے آزاد نہیں
کر پاتے اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ —

غم ہائے روزگار کی یورش کے باوجود
دل پر رہا ہے نقش اسی سیم تن کا نام

پھر تلخیٔ حیات ہے غرقِ شراب و شہد
آیا ہے لب پہ پھر کسی شیریں دہن کا نام

جانے کیوں دل ہے کہ کھنچ جاتا ہے اس سمت نسیم

یوں تو کہتا ہوں کہ میں اس کا پرستار نہیں

اور ـــ

غم ہائے روزگار نے چارہ گری بھی کی
لیکن ہوا نہ غم کا مداوا تیرے بغیر

چنانچہ اسی "شیریں دہن" سے وابستگی کے باعث ان کی غزلوں میں قند و نبات کی شیرینی و حلاوت ملتی ہے اور ان کے وہاں ایسے کامیاب اشعار کی کمی نہیں جن میں رمز و ایما کی زبان میں باتیں کی گئی ہیں، حسین استعاروں اور خوبصورت تشبیہوں سے کام لیا گیا ہے اور لب و لہجہ میں سوز و گداز، نرمی اور مٹھاس ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں : ـــ

یہ حسنِ ظن وہ اب آئے کھلی رہیں آنکھیں
بہ وقت نزع بھی ٹوٹا نہ آسرا دل کا

یوں بھی جاتی میری اک جان کی قیمت کیا تھی
حوصلہ ان کا میرے قتل سے پورا تو ہوا

ممکن ہو تو یا رب مجھے دل اور دے جان اور
وہ اپنی جفاؤں کا صلہ مانگ رہے ہیں

اے چارہ ساز چھیڑ کے تو نے یہ کیا کیا
بہلا لیا تھا میں نے دلِ بے قرار کو

کون مرتا ہے بے سبب اے دوست
حسن میں تیرے کوئی بات تو ہے

کتنے عنوان سے کہہ رہا ہوں نسیم
یہ دلِ زار ہی کی بات تو ہے

آئی میرے حصے میں اور آئی تو یوں آئی
میں نے شبِ غم ہی کی مانگی ہو دعا جیسے

مری نگاہ میں غم ہائے روزگار ہیں کیا
بڑھا دیا ہے تیرے غم نے حوصلہ دل کا

صحرا میں حیا کی جو ہم وحشیوں کے ساتھ
چھالے گلے لگاتے ہیں ہنس ہنس کے خار کو

یہ بام پر نہیں کوئی ڈالے ہوئے نقاب
"بجلی چمک رہی ہے فلک پر سحاب میں"

یوں یاد رہ گئے ہیں مسرت کے رات دن
دیکھا ہو جیسے میں نے کبھی اک خواب میں

اک بیابان میں پھول کا کھلنا
میرے گھر تیری جلوہ فرمائی

حصول آزادی اور تقسیم ملک کے بعد اہل ملک اور خصوصاً اس طبقہ کی جو حالت ہوئی ہے جس سے نسیم صاحب کا تہذیبی تعلق ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نسیم صاحب شاعر ہیں اور اپنے پہلو میں ایک حساس اور دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں چنانچہ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں اور بلا شبہ انھوں نے اپنے تاثرات کو غزل کے اشعار میں بہت ہی فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے، ملاحظہ ہوں یہ اشعار ـــ

قید جب تھے تو فقط قیدِ قفس کا غم تھا
جب چھٹے تو پرِ پرواز پہ رونا آیا

سارے گلشن کے ہے نذر یہی ہو جائے گا خوف
ورنہ کیا تھی میرے دو تنکوں کے جل جانے کی بات

شاخ در شاخ خیابان بہ خیابان یہ لہو
کچھ عجب رنگ کا اب کے ہے تماشائے بہار

ہوا ہے خونِ جگر صرف اسے بنانے میں
لگا نہ باغباں تو آگ آشیانے میں

وہاں جئیں تو ہم کہ جہاں ذکرِ آشیاں ہے گناہ
ہماری طرح کوئی خانماں خراب نہ ہو

اُڑ جائے یہ کہیں نہ قفس کو لئے ہوئے
صیاد یوں نہ چھیڑ کر اس سخت پر کے ساتھ

نسیم کیسی بہار آئی ہے دم بخود ہیں طیور سارے
گلوں کی رنگت اڑی ہوئی ہے یہاں کوئی سرپھرا تو نہیں ہے

نسیم صاحب نے قطعات بھی کہے ہیں اور ان کے چند قطعات بہت اچھے ہیں، نمونے کے طور پر دو قطعات درج کئے جاتے ہیں ۔

یہ شام وصل نہیں شام انتظار تو ہے
فریب وعدۂ فردا پہ اعتبار تو ہے
میں آج بھی نہیں مایوس ہو کے چمن میں نسیم
اگر بہار نہیں مژدہ بہار تو ہے

درد کافی ہے مجھے تیری محبت کی قسم
تو پریشاں نہ ہو اس درد کے درماں کیلئے
مجھ کو یہ دھن ہے کہ ہو عام محبت کا چلن
میں تڑپتا نہیں کچھ چارۂ درماں کیلئے

یہ قطعات فن اور فکر دونوں ہی اعتبار سے کامیاب ہیں۔

بعض قطعات میں اساتذہ کے کلام سے استفادہ بھی کیا گیا ہے، مثلاً ذیل کا قطعہ ملاحظہ فرمائیے ؎

میرے اشکوں پہ فقط ہنسنے والے ہی تو نہیں
کتنے چہرے ہیں کہ جو غم میں مرے زرد بھی ہیں
اب میں اس شہر پرآشوب میں تنہا بھی نہیں
میرے مونس بھی یہاں ہیں مرے ہمدرد بھی ہیں

اسے پڑھ کر اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

گئے وہ دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اسی طرح یہ قطعہ پڑھئے ؎

میں نے رنگین خیالات کی دنیا چھوڑی
مدحت گیسو و چشم و رخ زیبا چھوڑی
دیکھ ایثار کہ پتھر کا کیا دل میں نے
تجھ سینے سے لگانے کی تمنا چھوڑی

اور اس کے بعد حالی کی یہ رباعی دیکھئے ؎

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

طرز بیان اور مضمون کی مماثلت ظاہر ہے

میں نے کہا ہے کہ نسیم صاحب کے اندر شعر کہنے کی فطری صلاحیت موجود ہے، وہ اپنے پہلو میں ایک دلِ درد مند رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہے، ان کے مشاہدہ میں تیزی اور احساس میں شدت ہے، فن کی نزاکتوں سے بھی وہ آشنا ہیں اور غالباً اسی لئے وہ خود کو فیض سے بہت قریب پاتے ہیں اور ان کی تقلید بھی کرتے ہیں اور یہ کوئی بری بات نہیں لیکن اب انھیں تقلید کے دائرہ سے نکلنا چاہئے اور اپنے اسلوب کی تعمیر خود کرنی چاہئے اگر انھوں نے اس مشورہ پر عمل کرتے ہوئے مشق سخن جاری رکھی تو ان سے بہت کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

نگارِ فکر کریم اسدی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے جو تاج پریس پاری روڈ گیا سے طبع ہو کر مارچ ۱۹۶۷ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے ۔ اس کی ترتیب و تدوین میں بھی مناع شوق اور آتشیں کا انداز کار فرما ہے لیکن متنِ

کلام کی ترتیب میں تھوڑی سی یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ غزلوں کو نظموں اور قطعات سے پہلے رکھا گیا ہے یوں ان کی تدوین بھی متاعِ شوق اور آتشیں ہی کی غزلوں کی طرح ردیف وار کی گئی ہے۔

کریم اسدی صاحب قدیم بزمِ سخن کے اراکین میں غالباً سب سے زیادہ معمر ہیں اور ان کی شاعری کی عمر بھی طویل ہے اس لئے کہ انھیں بچپن سے ہی شعر گوئی سے دلچسپی رہی ہے فرماتے ہیں:۔

”حضرت خال محترم جناب تمیز الدین صاحب کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ مجھ میں بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق ابھر آیا۔“

(نگارِ فکر صفحہ ۹)

مجھے نہیں معلوم کہ آیا کریم صاحب نے اپنے اس ذوقِ خدا داد کی تربیت کے لئے باقاعدہ طور پر کبھی کسی کی طرف رجوع بھی کیا ہے یا نہیں؟ لیکن انھوں نے اپنے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابتدا میں تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کے ذوقِ سخن سنجی کی پرورش میں بھی ان کے خالِ محترم جناب تمیز الدین صاحب کا ہاتھ رہا ہے چنانچہ کریم صاحب، موصوف کے نام اپنا مجموعۂ کلام معنون کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

”اپنے بزرگ اور استاد محترم تمیز الدین احمد صاحب پلیڈر و کیٹ کے نام جن کی محبت، شفقت اور تربیت نے میری زندگی کو بنایا سنوارا اور نکھارا ہے اور مجھے اس لائق بنا دیا کہ اپنا یہ حقیر مجموعہ ارباب نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔“

(نگارِ فکر صفحہ ۵)

اور بعد میں، انھوں نے جناب سرورش عظیم آبادی کی صحبت کا فیض بھی اٹھایا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

”کم سنی کا عالم ہی تھا کہ میں حضرت والد مرحوم کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے موضع لوکچھیا میں رہنے لگا جو بھاگلپور سے قریب ہی گنگا کے اس پار واقع ہے، وہاں کوئی علمی اور ادبی سوسائٹی نہ تھی جہاں گھڑی دو گھڑی کے لئے کاروباری مشغلہ سے الگ ہو کر کھلی فضا میں سانس لے سکتا اس لئے جو کچھ وقت میسر آتا تھا کتب بینی اور شعر گوئی میں صرف کر کے خود کو مطمئن کر لیتا تھا .... وہاں حسن اتفاق سے جناب مرزا اختر حسین سرورش عظیم آبادی مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی ہو کر تشریف لائے تو قیس جنگل میں اکیلا نہ رہ گیا بلکہ جب ایک دیوانہ دوسرے سے ملا تو خوب گذرنے لگی۔“ (نگارِ فکر صفحہ ۹،۱۰)

میں نہیں کہہ سکتا کہ کریم صاحب کے خالِ محترم کا مذاقِ سخن کیا تھا لیکن سرورش عظیم آبادی صاحب کے متعلق اس قدر اطلاع ضرور رکھتا ہوں کہ انھیں کلاسیکی اندازِ سخن سے دلچسپی ہے اور اسی لئے اردو شاعری کی روایات اور آداب سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ کریم صاحب کو ایک صاحب ذوق بزرگ کی آغوشِ تربیت ملی اور ایک باکمال نکتہ داں اور فن شناس شاعر کی صحبت میسر آئی اور اس پر مستزاد ان کا ذوقِ سلیم چنانچہ ان کے کلام میں بہت جلد پختگی اور بالیدگی پیدا ہو گئی اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ نے اس پر مزید جلا بخشی۔

کریم صاحب کے دینی و سیاسی معتقدات قریب قریب وہی ہیں جو ان کے خواجہ تاش شاغل قادری صاحب کے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند اور اس کے اکابر سے انھیں بھی گہری عقیدت ہے اور شاغل صاحب ہی کی طرح وہ بھی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے شدید طور پر متاثر ہیں لیکن سیاسی اور دینی نظریات ہی کی حد تک اس لئے کہ ان کی شاعری پر مولانا کے طرزِ تحریر کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔

نگارِ فکر کریم صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں انھوں نے اپنے سرمایۂ کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ اس میں ۱۰۱ غزلیں، ۸ نظمیں اور ۱۸ قطعات کے علاوہ ۲۶ ابیات بھی درج ہیں۔ ترتیب کلام میں غزلوں کو مقدم رکھا گیا ہے جس میں کریم صاحب کے رجحان طبع کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کریم صاحب کی طبیعت کو غزل سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں :-

"احباب کا خیال ہے کہ میں غزل گو شاعر ہوں، میں احباب کے اس خیال سے خوش ہوں لیکن اس ترمیم کے ساتھ کہ میں اپنی زندگی کے تمام تجربات اپنے احساسات، جذبات اور ان حوادثات (کذا) کو جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں کہاں تک اس میں کامیاب ہوں اس کا فیصلہ تو میں نہیں کر سکتا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ میرا کلام روائتی رنگ و آہنگ سے جدا گانہ ہے، اشارے، کنائے، تشبیہات پرانے ضرور ہیں لیکن ان کے معنی دورِ حاضر کے رجحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے بدلے ہوئے ہیں۔"

(نگارِ فکر صفحہ ۱۱)

کریم صاحب نے اپنے بیان میں خود شناسی اور خود تنقیدی کا بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی غزل گوئی کا اسلوب و انداز تو روائتی ضرور ہے لیکن ساز و سامان نئے ہیں اور انھوں نے اپنے کلام کو صرف سرِّ دلبراں اور حدیثِ غم جاناں کے بیان و اظہار تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس میں گردش ایام اور غم دوراں کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اسی لئے ان کے کلام میں داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے چنانچہ کریم صاحب کے کلام کے انہی اوصاف سے متاثر ہو کر استاد محترم جناب جمیل مظہری صاحب نے اپنے مضمون میں بہت ہی صحیح فرمایا ہے کہ :- "کریم اسد کا صاحب کے موجودہ مجموعۂ کلام کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس میں دبستان دہلی کی سوز آفرینی اور دبستانِ لکھنؤ کی تخیل پسندی کے علاوہ عاشقانہ معاملہ بندیوں کے بیان میں دبستانِ عظیم آباد کا اخلاقی رجحان بھی جا بجا نمایاں ہے۔ تخیل پسندی اگر چہ اعتدال میں ہو تو ناشخیت بھی برداشت کی جا سکتی ہے۔ الحمد للہ کہ کریم صاحب کے یہاں جہاں کہیں بھی لکھنویت یا ناشخیت ہے حدِ اعتدال میں ہے۔"

(نگارِ فکر صفحہ ۱۵)

اردو شاعری کے اسالیب اور مضامین میں آزاد اور حالی کے عہد سے تغیرات رونما ہونے شروع ہوئے، نظم کو غزل پر فوقیت دی جانے لگی اور غزل کو گل و بلبل کی رام کہانی اور بلبل کی ہم زبانی سے آزاد کرانے کی کوشش شروع کی یہاں تک کہ اقبال نے اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی اور عہد اقبال اور ما بعد کے شعراء ایک نئی دنیا کی تعمیر میں لگے رہے جو حقیقتاً نظم کی دنیا تھی یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری کے اس دور میں اردو غزل کے روائتی انداز و اسلوب میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ ہو چکا تھا اور شعراء اس کی طرف بھی توجہ دینے لگے تھے لیکن نظم کے مقابلے میں غزل کچھ دب سی گئی تھی لیکن پہلے شاد اور پھر حسرت نے اسے اس کا کھویا ہوا مقام دلانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں چنانچہ شاد، حسرت، اصغر، فانی، جگر اور پھر فراق نے اردو غزل کو نئی توانائی عطا کی یہاں تک کہ ترقی پسند شعراء بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں مجاز، جذبی، مجروح، شکیل اور

فیض نے اس کی طرف خاص طور پر توجہ دی اور بلاشبہ اس کے سرمایہ میں اضافہ کیا ـــ چنانچہ غزل آج اردو شاعری کی ایک اہم صنف کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ ترقی کے منازل طے کر رہی ہے، اس کے مضامین کے دائرہ میں بے کراں وسعت پیدا ہو چکی ہے اور ہیئت میں بھی بہت کچھ اصلاح و ترقی ہوئی ہے۔

کریم صاحب کے متعلق یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انھیں غزل سے عشق کی حد تک دلچسپی ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں غزل کے فنی تقاضوں کا عرفان حاصل ہے چنانچہ انھوں نے غزل پر ایک نظم بھی لکھی ہے، ملاحظہ ہو :-

غزل

طرح طرح کی ہے وسعت غزل کے دامن میں
ہے رنگ رنگ کی دولت غزل کے دامن میں

کہیں ہے رنگِ محبت غزل کے دامن میں
کہیں ہے عکس سیاست غزل کے دامن میں

غم زمانہ کی روداد ذکرِ وصل و فراق
نہاں ہے دل کی حکایت غزل کے دامن میں

ہیں شمع لسترن و یاسمین کہ بوئے گلاب
ہر ایک گل کی ہے نکہت غزل کے دامن میں

متاعِ خندۂ گل سوز گریۂ شبنم
عیاں ہے رازِ حقیقت غزل کے دامن میں

دل اہل دیر و حرم کا نثار ہے اس پہ
بہار پہ ہے محبت غزل کے دامن میں

نگاہ اہل تمنا کی دیکھ لیتی ہے
شبیہہ حسن و محبت غزل کے دامن میں

کبھی اشارہ ہے پنہاں وفا پہ مٹنے کا
کبھی ہے زیست کی دعوت غزل کے دامن میں

یہ اور بات ہے پائیں اسے نہ اہل ہوس
نہاں ہے حکمت و ندرت غزل کے دامن میں

کریم پائیں گے اہلِ وطن سدا دائم
پیامِ امن و اخوت غزل کے دامن میں

اس نظم کو پڑھنے کے بعد اس امر میں کلام کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ کریم صاحب غزل کے ادا شناس نہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ غزل کے اشعار میں معنوی ربط و تسلسل، فکری ہم آہنگی اور ارتقائے خیال کے قائل نہیں ہیں اور زیادہ تر شعرِ مفرد ہی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حالی سے کلیم الدین تک اردو کے بڑے ناقدین نے اردو شعراء کو غزل کی صنفی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان سے وہ کس حد تک واقف ہیں اور اگر واقف ہیں تو انھیں کیوں لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے؟ لیکن یہ بات طے ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں کے اشعار معنوی ربط و تسلسل اور تنظیم و ترتیب سے خالی نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے غزل مسلسل کی طرف بھی شعوری کوشش نہیں کی ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ ان کی بعض غزلوں میں یہ کیفیت موجود ہے مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل غزل ملاحظہ کیجئے :-

رہیں گی پاؤں میں جور و ستم کی بیڑیاں کب تک
کوئی لے گا مرے ضبط جنوں کا امتحاں کب تک

زمیں کب تک پیے گی خون ناحق نامرادوں کا
تماشا یہ بھلا دیکھا کرے گا آسماں کب تک

مجھے گم گشتگی کا غم نہیں اے رہنما لیکن
رہے گا یوں بھٹکتا زندگی کا کارواں کب تک

ماہِ گل کو لٹتے تاکیے دیکھیں خموشی سے
گلستاں میں رہیں یوں ہی کہ ہم اپنی زباں کب تک
دورِ روزِ زندگی کا بھی گذرنا کوئی مشکل ہے
کریم زار پہ ٹوٹا کریں گی سختیاں کب تک

اس غزل کے اشعار میں معنوی ربط و تسلسل موجود ہے لیکن
س قماش کی غزلیں کریم صاحب کے یہاں بہت کم ہیں اس لئے کہ
ریم صاحب اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے لیکن جہاں تک
عرِ مفرد کا تعلق ہے کریم صاحب کی غزلوں کے بے شمار اشعار کو
ساتذہ کے اچھے اشعار کی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ چند اشعار
طور نمونہ درج کئے جاتے ہیں :۔

ہوں یہ کیسے محبت کا کچھ صلا نہ ملا
کسی کی یاد ہی کیا کم ہے مجھ کو کیا نہ ملا

بشکستہ جام یہ خالی سبو یہ قحط نئے
وہ بھی کیا دن تھے کہ جب گلزار یہ میخانہ تھا

بے خود بنا بھی دیں مجھے جامِ نظر سے آپ
بیگانہ کردیں گردشِ شام و سحر سے آپ

ردشِ دہر پہ لیے پاؤں پلٹ جاتی ہے
ملتے ہی ساقیٔ مستانہ ادا کی آہٹ

سکرا اٹھتے ہیں صحرائے جنوں کے کانٹے
جب بھی مل جاتی ہے مجھ آبلہ پا کی آہٹ

دکا ہر لمحہ تصور سے یہی کیا کم ہے
کون کہتا ہے کہ ہے حسرتِ دیدار عبث

اروان کو لوٹ بھی لے اور خبر نہ ہو
اس رہنما کو دیجئے کیا راہزن کا نام

نے کو تو اٹھ جاؤں تیری بزم سے لیکن
جاؤں تو کہاں جاؤں یہی سوچ رہا ہوں

نہیں کہ آپ کے وعدے کا اعتبار نہیں
یہ اور بات ہے اب تابِ انتظار نہیں

چلی جائے یوں ہی اک چھیڑ پیہم برق و طوفاں سے
چمن میں پھر کریم اپنا نشیمن ہم بناتے ہیں

باغباں کی نگاہ میں کھٹکے
اتنا دلکش بھی آشیاں تو نہ ہو

ذکر و شکوۂ بے مہریٔ محبوب کریم
اس میں اپنی بھی محبت کی بھی رسوائی ہے

کتر دیتا ہے پر کچھ اور بھی صیاد جھلا کر
لبوں پر میرے جب بھی آشیاں کا نام آتا ہے

قدم پیرِ مغاں تک پہونچی
مری لغزش بھی کہاں تک پہونچی

مانتا ہوں کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
بلبلِ زار کوئی زمزمہ پرواز بھی ہے

مرا مقصد تو ہے تشہیر تمہاری
نہیں مدِ نظر شکوے تمہارے

قفس میں داستاں اور گلستاں کی
اسیرو چھیڑ دی تم نے کہاں کی

نہ لگ جائے خیالوں پر بھی بندش
ابھی تو بات آئی ہے زباں کی

سمجھ بیٹھا ہے جادہ ہی کو منزل
عجب ہے سادہ لوحی کارواں کی

اڑے جاتے ہیں قفس لیکے اسیرانِ قفس
رائگاں بندشِ صیاد ہوئی جاتی ہے

رنگ کہتا ہے خزاں کا یہ گلستاں میں کریم
گل کھلیں گے ابھی کچھ اور بہار آنے تک

یہ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ کریم صاحب
کی غزلوں میں اس طرح کی آبدار اشعار کی کمی نہیں ہے، یہ اشعار موضوع
کے اعتبار سے متنوع ہیں۔ ان میں غم جاناں کی حکایت اور غم دوراں
کی شکایت دونوں ہی موجود ہیں لیکن غزل کی روایت کے احترام کے
ساتھ! باتیں بلیغ اشاروں اور لطیف کنایوں میں پیش کی گئی ہیں اس
کے علاوہ شاعر کے ذاتی تجربات اور احساسات نے شعر کا
جامہ اختیار کیا ہے چنانچہ ان اشعار میں خلوص اور صداقت ہے
اور اسی لئے قاری کے ذہن کو شدید طور پر متاثر کرتے ہیں۔

نگار فکر میں نظموں کی تعداد بہت ہی مختصر ہے۔ ان میں
ناخدائے کشتی دوراں، نوید عیسیٰ مریم اور مئے عرفاں میں نعت و منقبت
کے مضامین ہیں، امام الہند، اقبال اور یاد جگر میں ان بزرگوں سے
اپنی عقیدت اور ان کی بلند و بالا شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، کشمیر،
جنگ آزادی، جشن آزادی، چینی جارحیت پر، شہید وطن، للکار،
اور کون کہتا ہے، میں وطن سے اپنی پرخلوص محبت اور اس کے تحفظ اور
ترقی کی فکر کو موضوع سخن بنایا گیا ہے اور غزل، عید کا دن، جشن کا
دن، یہ کیا دیکھ رہا ہوں وغیرہ میں متفرق مضامین ملتے ہیں۔

ان نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کریم صاحب
نے نظم نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے، ممکن ہے اس
میں ان کے مزاج کو بھی دخل ہو جس کی دیرینہ آشنائی غزل سے ہے۔
اور اب عمر کی اس منزل میں اس سے کسی طرح بھی ترک تعلق کرنا نہیں چاہتے
چنانچہ ان کی نظموں پر بھی غزل کے اثرات بہت ہی واضح نظر آتے ہیں،
مثال کے طور پر ذیل کی نظم ملاحظہ ہو جو حقیقتاً غزل مسلسل ہے:۔

یہ کیا دیکھ رہا ہوں

ہوں پیکر حیرت کہ یہ کیا دیکھ رہا ہوں
انساں کو خدائی کا خدا دیکھ رہا ہوں

پوچھے نہ کوئی زیست کی محفل کا فسانہ
ہر ایک طرف رقص قضا دیکھ رہا ہوں

احساس بلندی ہے نہ پستی پہ نظر ہے
جینے کی عجب طرز ادا دیکھ رہا ہوں

اے دوستو جس سمت بھی اٹھتی ہیں نگاہیں
صد چاک سر اک گل کی قبا دیکھ رہا ہوں

ہے یہ بھی عجب دور مساوات و محبت
انساں کو انساں سے جدا دیکھ رہا ہوں

اس تیرہ شبی میں بھی کریم اپنے چمن میں
امید کی کرنوں کی ضیا دیکھ رہا ہوں

غزل گو شعراء نے ہمیشہ قطعہ نگاری کی طرف توجہ
کی ہے، چنانچہ میر و غالب سے فیض تک سبھوں نے قطعات
لکھے ہیں، مختصر بھی اور طویل بھی، کریم صاحب نے بھی
قطعہ نگاری کی ہے لیکن نگار فکر میں نظموں کی طرح قطعات
کی تعداد بھی مختصر ہے اور ایک بھی طویل قطعہ نہیں ہے۔
تمام قطعے چار مصرعوں پر مشتمل ہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ ان
میں بعض بہت ہی دلکش اور کامیاب ہیں۔ نمونے کے طور
پر صرف دو قطعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔۔

شورش بحر سے نپٹنے دو، تیرگی کو بھی اور چھٹنے دو
خود ہی ساحل نہیں پکارے گا، رخ ہوا کا ذرا پلٹنے دو

تیرا تصور رنگین بہار کا عنوان
تیرے خیال کی لذت حیات کا ساماں
تیری شکن بہ شکن زلف عنبریں کی یاد
ہجوم غم میں دل بے قرار کا درماں

کریم صاحب اگلے وقتوں کی شرافت کا نمونہ ہیں،

آپ کریم النفس اور شریف الطبع انسان ہیں، نہایت متواضع، مخلص اور منکسر المزاج، مذہب، ادب اور سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں، ذریعۂ معاش تجارت ہے اس لئے کاروبار میں بے حد مصروف رہنے کے باوجود کتب بینی اور شعر گوئی کے لئے وقت نکالتے ہیں، ادبی محفلوں میں شریک ہو کر سخن فہمی اور سخن کی داد دیتے ہیں، باغ فکر و فن کو خود بھی خون جگر میں سینچتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرتے ہیں، وہ اپنی ذات کے خول میں بند نہیں بلکہ ان کے اندر بہت ہی پاکیزہ اجتماعی شعور ہے اور اسی لئے ان کی داستان سب کا فسانہ اور سب کہانی ان کی ذاتی حکایت بن گئی ہے ؎

الٰہی ماجرا کیا ہے ہماری داستاں سن کر
لے اپنا ہی سب سمجھا ہوا افسانہ کہتے ہیں

وہ خدا پرست ہیں اس لئے اشتراکیت پسند یا کیت پرست نہیں، ان کا حوصلہ بلند ہے اور ہمت جواں، ان کا دل امید و یقین کا قرینہ ہے اور اسی لئے ان کے اشعار میں رجائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ؎

اہتمام نشیمن کئے جائیں گے
برق بے تاب شعلہ فگن ہی سہی

واقف ہیں گو مزاج برق شعلہ فشاں سے
باز آئیں گے نہ پھر بھی تعمیر آشیاں سے

زمانہ زد میں ہے تاریکیوں کے سائے کی
چراغ فکر جلاتا ہوں روشنی کے لئے

بھائیں راہیں کانٹے جنہیں بچھاتا ہو
ہمیں تو پھول ہر اک گام پر کھلانا ہے

شورش بحر سے نپٹنے دو
تیرگی کو بکھر اور چھٹنے دو
خود ہی ساحل تمہیں پکاریگا
رخ ہوا کا ذرا پلٹنے دو

چمن میں لا کے رہیں گے بہار ہم اک دن
دکھائے گی کو رہینگے نکھار ہم اک دن
یہ عزم ہے کہ خود اپنے لہو کی چھینٹوں سے
کریں گے خار کو بھی لالہ زار ہم اک دن

ان اشعار کے مطالعہ سے دل و دماغ کو غیر معمولی تقویت ملتی ہے، ذہن مایوسی اور ناامیدی کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے اور دلوں میں امید و یقین کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ بہت صحیح کہا ہے شاعر مشرق نے ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

ریاست بہار نے اردو شعر و ادب کی ترویج و ترقی میں روز اول سے حصہ لیا ہے لیکن یہاں کے شعرا و ادبا ہمیشہ گمنامی اور گوشہ نشینی کو پسند کرتے رہے ہیں، انھوں نے اپنی نگارگذاریوں کی اشاعت کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں کی چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بیش قیمت کارنامے دست برد زمانہ کے شکار ہو گئے اور آج ان کے متعلق صرف افسانے اور قصے سننے میں آتے ہیں۔

ـــــ مجلس اشاعت، بھاگلپور قابل مبارکباد ہے کہ

فنکار فکر پر ایک نظر

علامہ جمیل مظہری

تجدد پسندی کے اس طوفان بے تمیزی میں جبکہ فن عروض کی پابندیوں سے بھی زمانہ بے نیاز ہوچلا ہے کسی ایسے فنکار کا سراغ جو فن کے جملہ تقاضوں کا احترام کرتا ہو یا غنیمت ہے۔ اس لئے میں کریم صاحب کے مجموعہ کی اشاعت کا کھلے دل سے استقبال کرتا ہوں۔

کریم صاحب کی شاعری عالم شعور کی ہے۔ انہوں نے اپنے ذوق شعری کو تحت شعور کی بھول بھلیوں میں گم ہونے نہیں دیا ہے۔ شاعری بلاشبہ نام ہے نیم شعوری جذبات کو تحت شعور سے بالائے شعور لانے کا۔ لیکن اگر شعوری اور تحت شعوری کیفیات میں معنوی توازن باقی نہ رہے تو غزل ہو یا نظم، مجذوب کی بڑ ہوجاتی ہے۔ میں مبارکباد دیتا ہوں اسدی صاحب کو کہ انہوں نے مضامین نو کی تلاش کے سلسلے میں غاروں اور بھول بھلیوں میں اترنے سے احتراز کیا اور فن کی اس روایتی شاہراہ پر گامزن رہے جس پر جابجا بزرگوں کے نقش قدم کی مہریں ہیں۔ اس روش میں سطحیت کا پیدا ہوجانا لازمی ہے لیکن یہ سطحیت اس گہرائی سے کہیں بہتر ہے جو شاعر اور شاعری دونوں کو اپنے اندر ڈبوکر ابھرنے کی فرصت نہ دے۔ ایسا نہیں ہے کہ کریم صاحب گہرائی میں اترتے ہوئے ڈرتے ہوں، اترتے وہ بھی ہیں چنانچہ ان کے یہ اشعار ان کے ڈوبنے اور ڈوب کر ابھرنے کی ناطق دلیلیں ہیں۔

قدم پیر مغاں تک پہنچی
میری لغزش بھی کہاں تک پہنچی

ــــــــ

وہ کم نصیب جسے راہ میکدہ نہ ملی
یہ جان لو اسے منزل کا راستہ نہ ملا

ــــــــ

بیخود بنا بھی دیں مجھے جام نظر سے آپ
بیگانہ کردیں گردش شام و سحر سے آپ

ــــــــ

اک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں اہل خرد
پوچھتے ہیں تری منزل ترے دیوانے سے

ــــــــ

نقش پائے جنوں سے آج خرد
پوچھتی ہے نشان منزل کا

کریم اسدی صاحب کے موجودہ مجموعہ کلام کے بعد مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس میں دبستان دہلی

کی سوز آفرینی اور دبستان لکھنؤ کی تخیل پسندی کے علاوہ عاشقانہ معاملہ بندیوں کے بیان میں دبستانِ عظیم آباد کا اخلاقی رجحان بھی جا بجا نمایاں ہے۔ تخیل پسندی اگر اعتدال میں ہو تو ناسخیت بھی برداشت کی جا سکتی ہے۔ الحمدللہ کہ کریم صاحب کے یہاں جہاں کہیں بھی لکھنویت یا ناسخیت ہے اعتدال میں ہے چنانچہ ان کا یہ شعر ؎

چمن کے پتے پتے کی زباں پر اک حکایت ہے
فروغِ آتشِ گل سے جلا ہے آشیاں میرا

اگرچہ اس شعر میں کھلی ہوئی خارجیت ہے لیکن اس خارجیت کے سینے میں داخلیت کا شعلہ بھی ہے اور زندگی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت کی عارفانہ نہ سہی شاعرانہ ترجمانی بہرحال ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہی نیم عارفانہ اور نیم شاعرانہ رجحان ان کے تغزل کی خصوصیت ہے جس کی مثالیں اس مختصر سی مجموعہ میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔

اے مرصرِ حوادث اتنا لحاظ کرنا
ہونے نہ پائے مدھم لو شمع آرزو کی

نگاہِ یار تری اس ادا کا کیا کہنا
ہے التفات میں انداز بے رخی کب تک

رہِ تلاش میں کام آئی چاک دامانی
مرا جنوں نہیں منت پذیر بخیہ گری

کس طرح چھوٹیں اسیرانِ حیات
سارا عالم قید خانہ ہو گیا

عجیب رسم ہے بازیٔ عشق کی ہمدم
کہ جیتے جیت نہیں اس کی ہار بار نہیں

مندرجہ بالا اشعار میں جو متغزلانہ کیفیت ہے اس کے باوجود کریم صاحب کا یہ ادعا بھی قابلِ غور ہے ؎

غمِ زمانے کا زمانے کو سناتے ہیں کریم
ہم غمِ دل کو بناتے نہیں موضوعِ سخن

مبارکباد کا مستحق ہے وہ شاعر جو زندگی کے اس بحرانی اور طوفانی دور میں اپنے غمِ دل کو نظر انداز کر کے غمِ زمانہ کو پیشِ نظر رکھے۔ اگرچہ اس کی مثالیں کریم صاحب کے یہاں کم ہیں لیکن جب انہوں نے اعلان کیا ہے تو ہم کیوں نہ یقین کریں کہ مستقبل میں ان کا یہ وعدہ عملی طور پر پورا ہو گا۔

نگارِ فکر میری نظر میں

از مولانا عبدالعلیم

نگارِ فکر کریم اسعدی کا مجموعہ کلام ہے۔ یوں تو یہ مجموعہ غزلیات، منظومات اور قطعات پر مشتمل ہے لیکن فنکارانہ حسن و رعنائی، سوز و گداز، رنگینیٔ فکر اور حسن و عشق کی حسین داستان سرائی کی کوششیں غزلیات ہی میں نکھرتی اور ابھرتی نظر آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کریم اسدی ایک کہنہ مشق اور پختہ کار غزل گو شاعر ہیں۔ لیکن محض روایتی غزل گو نہیں کہ صرف ہجر و وصال، آہ و شیون، معشوق کی بے اعتنائی، زمانہ کی شکوہ سنجی تک اپنے کو محدود رکھیں۔ بلکہ زمانہ کے تقاضے، نئے رجحانات، بدلتے ہوئے ماحول سے بھی متاثر ہیں اور ان رجحانات کو اپنے فن میں سحرکارانہ انداز سے سمو لینے کی کوشش بھی ہے خود ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

طرح طرح کی ہے وسعت غزل کے دامن میں
کہیں ہے عکس سیاست غزل کے دامن میں

یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تنوع بھی ہے اور ہمہ گیری بھی۔ اہلِ وطن کی دلسوزی بھی ہے اور مداوا بھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ذہنی کشمکش، اضطراب اور بے اطمینانی کی جو لہر پھیلی اس نے اخلاقی اقدار ذہنی آسودگی پر ایسی ضرب لگائی کہ آج ہر فرد خود غرضی اور مادہ پرستی کا محتاج ہے، ایثار و محبت، اخلاق و وفا جیسی پاکیزہ قدروں کی روشنی ماند پڑ چکی ہے۔ ذاتی منفعت کے حصول کے لئے دوسروں کے جائز حقوق کے لئے استحصال بھی انکے لوں کا طریق زندگی ہے۔

ایسے ناساعد حالات سے کریم اسعدی ناواقف نہیں۔ طرزِ حیات کی اس بے راہ روی سے ٹکر لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ زندگی کی شائستگی کا بلند حوصلہ ہے برقِ بلا کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں۔ تعمیرِ آشیاں کی تمنا ہے۔ پرخطر راہ طے کرنے کی ہمت ہے۔ موجِ طوفاں سے ٹکرانے کا عزم ہے۔

جھوم اٹھا فرطِ مسرت سے سفینہ دل کا
جب بھی محسوس ہوئی برقِ بلا کی آہٹ
آشیانے کے لئے تنکے سجاتے ہی گئے
گرچہ سنتے ہی رہے برقِ بلا کی آہٹ

واقف ہیں ہم مزاجِ برق شرر فشاں سے
باز آئیں گے نہ پھر بھی تعمیرِ آشیاں سے

ہمیں منزل پہ پہنچا ہے نہ رو کو ہم کو
پرخطر ہے جو اگر راہگذر رہنے دو

کل نہ ٹکراتا جو موجِ بحرِ طوفاں خیز سے
عشرتِ ساحل سے میں آج آشنا ہوتا نہیں

اہلِ سیاست کی بے راہ روی، سیاست کی بازی گری اور خدمتِ خلق سے زیادہ اقتدار پرستی کی ہوس نے وہ رنگ کھلائے کہ آج معاشرہ میں بے اطمینانی، عدمِ استحکام کی علامتیں واضح طور پر نمایاں ہیں، سکون رخصت ہے، عیش و طرب کی محفلیں درہم برہم ہیں۔ چہروں پر اداسی چھائی ہے۔

نہ وہ شگفتگی ہے نہ تازگی نہ وہ دلکشی ہے نہ دلبری
یہ بہار کوئی بہار ہے کسی گل کے لب پہ ہنسی نہیں

بہار آئی ہے اک دھوم ہے کریمؔ مگر
ترس رہی ہے نمو کو کلی کلی اب تک

مانتا ہوں کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
بلبلِ زار کوئی زمزمہ پرواز بھی ہے

مگر کریم اسدی ان میر کارواں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کو آمادہ نہیں۔ اپنی بصیرت و عرفان سے ان پر ضربیں لگاتے ہیں جو خود مفہومِ زندگی سے ناآشنا رہتے ہوئے رہنمائی کے بلند بانگ کا ادعا کرتے ہیں۔

سکھا رہے ہیں قرینہ وہ زندگانی کا
سمجھ سکے نہ جو مفہومِ زندگی اب تک

جو خود گم کردہ راہ ہیں وہ دوسروں کی خضر راہی کہاں تک کر سکتے ہیں۔

منزل کدھر ہے ان کی کس سمت جا رہے ہیں
اے کاش کوئی پوچھے یہ اہلِ کارواں سے

متاعِ حیات کو لٹتے دیکھ کر شاعر کو خاموش رہنا بھی گوارا نہیں۔

بہارِ گل کو لٹتے تا بکے دیکھیں خموشی سے
گلستاں میں رہیں یوں سی کے ہم اپنی زباں کب تک

نگارشکے کے مطالعہ سے کریم اسدی کے اندر جذبۂ انسانیت، دوستی، طریقِ وفا شعاری، شیوۂ ایثار و اخلاص کی واضح علامتیں ملتی ہیں۔ ساتھ ساتھ رنج و ستم، جور و جفا کو انگیز کرنے کی صلاحیت کے اشارات بھی نمایاں ہیں بادِ مخالف کے طوفان میں وفا کا چراغ جلانا پچھ ان ہی کا عزم ہے۔

ہے شعار اپنا جلائیں گے سدا شمعِ وفا
لاکھ طوفانِ جفا کا زور لے ہمدم رہے

راہِ وفا میں آج بھی بیٹھا ہوں میں کریمؔ
طوفاں کی زد میں شمع فروزاں کئے ہوئے

ناسازگار فضا میں صرف شمع فروزاں کرنے کی تمنا ہی نہیں بلکہ دار و رسن پر بھی مسکراتے ہوئے وفا و محبت کا چلن سکھانے کی آرزو ہے۔

بچھائیں راہ میں کانٹے جنہیں بچھانا ہے
ہمیں تو پھول ہر اک گام پر کھلانا ہے
فرازِ دار پہ لے دوست مسکرانا ہے
چلن وفا کا جہاں کو ہمیں سکھانا ہے

اس جائزہ سے میرا یہ مقصد نہیں کہ کریم اسدی نے

شاہراہ تغزل سے ہٹ کر غم جاناں نہیں غم دوراں ہی کو
اپنا مطمح نظر بنایا ہے۔ ایسی بات نہیں انہیں گردش دوراں
کے تقاضوں کا بھی احساس ہے اور تغزل کی روایات کا بھی
خیال ہے۔ آرائش جمال بھی ہے اور حسن کے تغافل نگاہی
کا گلہ بھی۔ اس میدان میں بھی بڑے عمدہ عمدہ اور حسین اشعار
نکالے ہیں۔ ان میں سوز و گداز کے نقاشے بھی ہیں اور
واردات قلبی کی نفیس روئیداد بھی، حسن کی کرشمہ سازیاں
ہیں اور عشق کی تلخ کامیاں بھی۔ تغزل کی شان پوری توانائی
کے ساتھ ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔

ان کی معصوم نگاہی کا نہ پوچھو عالم
اب تو وہ مائل بیداد ہوئی جاتی ہے

جلانے آئے ہیں باچشم نم وہ شمع تربت پر
ملا کر خاک میں کرتے ہیں احساں دیکھتے جاؤ

ہے کرم ان کی نگاہِ ناز کا
لذت درد جگر ہے اور ہم

جرم ہے لب بھی ہلانا اے دلِ مضطر وہاں
ہوش میں آ، ان کی محفل اور راز مانوں کی بات

یہی چشم پرنم نہ ہو رو کر اک دن
اٹھائے گی طوفاں نہ سوچا نہ سمجھا

مٹ گیا نقش ہر اک اس کے تصور کے سوا
دست رنگیں سے جو ساقی نے پلائی تلچھٹ

نہ پوچھو درد فرقت میں کبھی ہوتا ہے ایسا بھی
وفور ضبط غم کو بھی فغاں کہنا ہی پڑتا ہے

گری ہے یہ کس کے نشیمن پہ بجلی
چمن سے جو رہ رہ کے آگ اٹھ رہی ہے

ناتوانی ہی ناتوانی ہے
آہ بھی اب تو کی نہیں جاتی

کریم اسدی کی ایک خاص خصوصیت کی طرف اشارا
کرنا نامناسب نہیں ہوگا وہ یہ کہ ان کی غزلوں کے اشعار
میں ناہمواری نہیں ہے۔ ناہمواری سے میری مراد یہ
ہے کہ غزل کے بعض اشعار تو بہت بلند اور اعلیٰ پایہ کے
ہوں اور بعض اشعار بہت سطحی اور سوقیانہ انداز کے ہوں
اس عیب سے اساتذہ اور بلند پایہ شعرا بھی خالی نہیں
حتیٰ کہ میر کی غزلوں میں بھی یہ نقص جا بجا نظر آتا ہے لیکن
کریم اسدی کے کلام میں یہ ناہمواری گویا نہیں ہے
اگرچہ یہ ایک منفی صفت ہے لیکن پھر بھی یہ ایک
اچھی علامت ہے اس سے ان کی طبیعت کی نفاست
اور پاکیزگی کا پتہ چلتا ہے

میں نے کریم اسدی کو بہت قریب سے دیکھا ہے
وہ فطرتاً بہت مخلص، انسانیت دوست اور حلیم الطبع
واقع ہوئے ہیں۔ قدیم تہذیب و روایات جن کے نقوش
اب دھندلے پڑتے جا رہے ہیں ان میں پوری شدت
کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کی یہی افتاد طبع ان کی شاعری
میں پوری توانائی کے ساتھ نمایاں ہے۔

متاعِ شوق

شاہدہ حیدری ایم اے

بہار صوبہ ہمیشہ سے اردو ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ جہاں کی سرزمین نے ہر زمانے میں اردو کے معماروں اور علم برداروں کو جنم دیا ہے۔ بالکل ابتدا میں بھی جب کہ اردو زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی اور تمام ملک میں اس کے خدوخال اُبھر رہے تھے۔ بہار کی حیثیت ایک سرگرم کارکن کی رہی۔ اور آج بھی جب کہ اردو اپنی تمام شاندار روایتوں کے باوجود ایک پرآشوب زمانے سے گزر رہی ہے بہار اپنی خدمات پیش کرنے میں کسی طرح کم تر نہیں ہے۔ اردو زبان و ادب سے اس صوبے کی بے پناہ محبت اور ذوق و شوق ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی ادبی سرگرمیوں کو دبستانِ بہار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج ہر طرف سے اردو کو مٹانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اسے "کم حیثیت" اور "کم قامت" ثابت کرنے کے لئے کوئی بھی کسر نہیں اُٹھائی جاتی۔ لیکن وہ زبان جو ایک زمانے سے عوام کا دل جیت چکی ہو وہ کسی کے مٹائے کیسے مٹ سکتی ہے۔ اردو کو کم تر ثابت کرنے سے پہلے تو اس "شاندار ادبی ورثے" سے منکر ہونا پڑے گا جسے میر و غالب، راسخ و شاد اور فراق و فیض جیسے ستونوں کا سہارا ملا ہوا ہے۔ ایسی کوششیں مضحکہ خیز بھی ہیں اور لاحاصل بھی کیونکہ ان سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعروں ادیبوں اور اردو دوستوں کا حلقہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور دراصل یہی حلقہ ایسا ہے جس کے دم سے کسی بھی زبان کا ادب قائم ہے اور آج اسی حلقے کی بدولت اردو اس عالم میں بھی زندہ و پائندہ ہے۔ !
بہار کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ایسے حلقوں کا مرکز رہا ہے اور جب بھی اردو پر برا وقت آیا ہے اس کے ہر خطے سے اُردو دوستوں نے آواز اٹھائی ہے اور اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ عظیم آباد کو تو اس کے لئے مرکز کی حیثیت حاصل ہی ہے مگر یہ کہنا شاید کچھ غلط نہ ہوگا کہ بہار کا تقریبًا ہر شہر اب اُردو کے سلسلے میں اپنا کوئی نہ کوئی مقام رکھتا ہے۔

شاغل صاحب کا تعلق بھی بہار کے ایک خطے بھاگلپور سے ہے جہاں اردو کے پرستاروں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو شاعری کو شاغل صاحب کے حسنِ ذوق نے جو کچھ دیا ہے وہ یقینًا بھاگلپور اور اس کے ساتھ ساتھ بہار کے لئے باعثِ امتیاز ہے۔

شاغل ان شاعروں میں ہیں جنھیں روایتی قدروں سے محبت ہوتی ہے اور جو اسی ڈگر پر چلنا پسند کرتے ہیں جس پر پچھلوں نے نقش قدم چھوڑے ہیں۔ اپنے اکثر و بیشتر اشعار میں انھوں نے اپنے اس نظریے کا اظہار بھی کیا ہے اور اس کو عملی طور پر کامیابی کے ساتھ نبھایا بھی ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی زبان کی عظمت اور Richness بہت کچھ ان بیش بہا گوہروں پر ہی منحصر ہوتی ہے جو اس کے خزانۂ ادب کو اپنے نور سے جگمگا دیا کرتے ہیں۔ اور جب تک ان کی دی ہوئی روشنی کو مشعل راہ نہ بنایا جائے یہ دشوار ہے کہ کوئی منزل کا صحیح راستہ پہچان سکے ——— تو روایت سے یہ محبت شاغل صاحب کے یہاں موجود ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس روایت پسندی نے انھیں یہاں تک لا کھڑا کیا ہے جہاں سے ادبی دنیا انھیں نظرانداز نہیں کر سکتی۔

"متاعِ شوق" ان کے کلام کا ایک مجموعہ ہے اور اس کے

علاوہ بھی اب تک انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے ان کی شعری صلاحیتوں کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔

شعری خوبیوں کے اعتبار سے ان کی غزلیں زیادہ تاثیر رکھتی ہیں۔ حالانکہ انھوں نے غزلوں کے ساتھ نظموں پر بھی پوری توجہ دی ہے لیکن غزلوں میں جو جذبے کی صداقت اور حرارت ہے وہ نظموں میں کم نظر آتی ہے۔ غزلوں میں ان کی کثرت روایت پسندی کی بنا پر موضوع کا نیا پن تو کہیں کہیں نہیں ملتا پھر بھی جس انداز میں انھوں نے الفاظ وخیالات کی انجمن سجائی ہے وہ اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے اور اکثر اشعار جانے بوجھے موضوع کے باوجود ایک نیا پن ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً ؎

ان کی پرسش پہ جو دیکھا متبسم مجھ کو
رازداں کو مرے انداز پہ رونا آیا

درد کی تصویر حقیقی ہے اور طنز بھی گہرا ہے۔ اسی طرح ؎

ہائے وہ تیر نیم کش شاغل
زخم تازہ ہے آج تک دل کا

شب فراق گزاری عجب تصور میں
کہ جیسے پاس مرے آپ آئے جاتے ہیں

بعض موقع پر خیالات کچھ بدلا ہوا رخ بھی اختیار کر لیتے ہیں مثلاً ؎

کیسے انسان ہو یہ اشک ندامت کب تک
قادری جرأت عصیاں کی ذرا بات کرو

اے دل یہ تیرے سوز دروں کا اثر نہ ہو
ان کی بھی چشم نم ہے مری چشم تر کے ساتھ

اس قسم کے اشعار میں اکثر انسانی فطرت اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کے ساتھ نظر آجاتی ہے۔ "اشک ندامت" کی جگہ " جرأت عصیاں کی بات " کرنا اور ان کی چشم نم کا بھی "تر ہوجانا" ایسی ہی مجبوریاں ہیں۔ اسی نمونے کا یہ شعر بھی ہے جسے عام فطرت انسانی پر چسپاں کیا جا سکتا ہے ؎

آپ گر جائے گا معیار وفا میرے بعد
خود بدل دیں گے وہ انداز وفا میرے بعد

یہ تو عام مشاہدہ ہے کہ ناز کرنے والا ناز اٹھانے والے کو دیکھ کر ہی ناز کیا کرتا ہے۔ اگر سچا جاں نثار ہی نہ رہے تو پھر جفا کس پر ہوگی اور اسے سہے گا کون۔ اسی وقت جفا کرنے والے کو وفاؤں کی قدر معلوم ہوسکے گی۔ یہ تو سچ ہے کہ اگر ظلم کرنے والے کو ظلم سہنے والے نہیں ملیں تو وہ مجبوراً راہ راست پر آ ہی جاتا ہے۔ یہ اشعار کہے گئے ہیں بالکل ہلکے پھلکے انداز میں مگر پڑھنے والے کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور غزل گوئی کے اختصار کے باوجود ایک تفصیلی تصویر وفاؤں اور جفاؤں کی پیش کرتے ہیں۔

بعض اشعار میں شوخی بھی ہے ؎

یوں بن پئے سرور تو اک راز ہے مگر
ٹکرائی تھی نظر مری ان کی نظر کے ساتھ

اور بعض جگہ پر سنجیدہ اور فلسفیانہ گفتگو بھی ؎

ظلمت میں شب کی نور سحر ڈھونڈتی ہے آنکھ
پیدا ہوا ہے خیر کا پہلو بھی شر کے ساتھ

شاغل صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ وہ غزلوں میں ذکر بتاں کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہتے لیکن اس پر بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے اکثر ذکر بتاں کے پردے میں ہی سہی زندگی کی حقیقتوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ اوپر کے شعر سے بھی یہ بات واضح ہے اور بھی اکثر وبیشتر اشعار ایسے ہیں جن کا تعلق حقائق زمانہ سے ہے۔ مثلاً ؎

جس میں ہنسنے کی سزا دار جسارت آئی
ان کے قدموں میں زمانے کی قیادت آئی
رنگ لایا ہے مرا خون و فا گلشن میں
گل تو گل خار میں بھی جوئے محبت آئی

حوصلہ، قربانی اور تپاک سے ہمیشہ سرخروئی حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے جس کے لئے تاریخیں گواہ ہیں۔ ایسے اشعار میں غزل گوئی باوجود بادۂ انگبیں میں اسیر رہنے کے حقیقتوں سے منہ نہیں موڑ سکی ہے۔

ان کے یہاں زیادہ تر غزلوں میں مسلسل خیالات کا اظہار ہے۔ بعض تو ایسی ہیں جنھیں اگر عنوان دے دیا جائے تو نظم کی صورت اختیار کر سکتی ہیں۔ ایک مثال ہے

اس شوخ کی ہے مجھ پہ عنایت کی نظر آج
وہ جانِ تمنا ہوا مہمان مرے گھر آج
آلام سے آزاد ہوں میں دور ہوں غم سے
ہے قرب سے اک ولولۂ تازہ مگر آج
جاری رگ و پے میں ہے مری کیف مسرت
میرے ہی لئے وقف ہے ساقی کی نظر آج
یاد آئے تو کیوں مجھ کو شبِ غم کا فسانہ
آئی ہے یہ شب لے کے مسرت کا اثر آج
کل تک تو غمِ دوست میں تھی اشک کی برسات
دامن میں درخشاں ہیں مسرت کے گہر آج
گل عیش و طرب کے ہیں کھلے دیکھئے جس سمت
منظر مری ہستی کا ہے فردوس نظر آج
یہ عیش یہ عشرت یہ ترنگیں یہ امنگیں
اے جذبِ دروں دیکھ لیا تیرا اثر آج
معراج محبت ہے یہی قادری اپنی
سجدوں کے لئے میرے جو وقف ان کا ہے در آج

اس غزل میں سلسلہ کے ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ حسرتوں اور ناکامیوں کے ذکر کی بجائے یہاں مسرتوں اور آلام سے آزاد ہونے کا بیان ہے۔ اگرچہ یہ مسرت کی گھڑی عارضی سی ہے۔ اس طرح کی رجائیت شاغل صاحب کی اکثر غزلوں میں ملتی ہے جو کہ بھلی لگتی ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ غزلوں کے بارے میں شاغل صاحب کا خیال ہے کہ

غزل میں قادری یہ زندگی کی ترجمانی کیا
یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کی حد ذکرِ بتاں تک ہے

اسی لئے انھوں نے زندگی کے ذکر کے لئے نظموں کا دامن تھاما ہے۔ آئے دن کے واقعات شاعر کے دل پر جو تاثرات چھوڑ جاتے ہیں ان میں کچھ ذاتی ہیں اور کچھ سماجی و سیاسی۔ ان کی نظموں میں ان تمام تاثرات کی کامیاب ترجمانی ملتی ہے۔ ان کی ایک نظم "ایک ہم سفر حسینہ" ایسی نظم ہے جس میں ایک چھوٹے سے ذاتی تجربات سے زیادہ وہ سماج میں ہونے والی ہر تبدیلی سے چاہے وہ تعمیری ہو یا تخریبی متاثر ہوتے ہیں۔ چینی حملہ کے زمانے میں انھوں نے اس سلسلے کی کئی نظمیں کہیں مثلاً "اے مرد مجاہد" "؟" اس کے علاوہ بھی کئی قومی نظمیں ہیں جن میں حوصلہ اور جوش کے ساتھ حب وطن کا جذبہ بدرجہ موجود ہے۔ جیسے "جرس نو بہار" "ماحول" "انقلاب" وغیرہ۔

قوم کے نامور افراد کی یادگار یا عظیم ہستیوں کی موت کے ماتم میں بھی انھوں نے پر اثر نظمیں کہی ہیں جن میں اکثر و بیشتر قطعۂ تاریخ کے ساتھ ہیں۔

اس قسم کی نظموں کے علاوہ انھوں نے "تلخیات" کے عنوان سے جو نظمیں کہی ہیں وہ بھی کافی حد تک دلچسپ ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اتنی سنجیدہ شاعری کرنے والا شاعر طنز یہ

نظمیں لکھنے کی طرف کیوں متوجہ ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جس سماج میں ہم رہتے ہیں وہ روز بروز اتنا کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے کہ کسی بھی ذی فہم اور حساس انسان کے لئے اس میں گزر کرنا مشکل ہے۔ اور ناممکن ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں احتجاج نہ کرے۔

ہر طرف خرابی کا سماں ہے [illegible] اگر کوئی آواز اُٹھائی جائے تو کوئی سننے والا نہیں ہے۔ کیونکہ سچی بات سبھوں کو کڑوی لگتی ہے۔ لیکن اگر طنزیہ و تمسخرانہ انداز میں کوئی تلخ بات بھی کہی جائے تو وہ گوارا ہو جاتی ہے۔ اور دلچسپ ہونے کی وجہ کر اپنی طرف لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اس لئے ادب میں طنز کی بھی اہمیت ہے اور سماج کو اس کی ضرورت ہے۔

اردو میں طنز نگاروں کی تعداد گنی چنی ہے۔ ایسے میں شاغل صاحب کی وہ نظمیں جو انھوں نے طنز کے نشتر کے ساتھ لکھی ہیں اہمیت رکھتی ہیں۔ ایسی نظموں میں مشاعرہ، تعارف، بلیک آؤٹ، شہیر وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ لیڈروں کی بے ایمانیاں اور افسروں کی نادر شاہیاں یہ سب ایسی لعنتیں ہیں جن میں پڑ کر ہم برباد ہو رہے ہیں۔ CORR UPTION کی اس گرم بازاری میں عوام کتنے بدحال ہیں اسے جاننے اور دیکھنے کی فرصت ہی کسی کو نہیں۔ عملی طور پر اس کا علاج تو اس صورت حال میں ممکن نہیں لیکن طنز نگار کے قلم سے شاید اس کا کچھ مداوا ہو سکے۔

شاغل صاحب ایک پرگو شاعر ہیں۔ مگر اس کے باوجود اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں اس اعتدال کی وجہ سے ایک سنبھلا ہوا انداز قائم ہے اور وہ ایک کامیاب شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی فنی صلاحیتوں اور اعلیٰ شعری ذوق سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ اردو ادب میں آئندہ ان کے قلم سے اور بھی کامیاب اور بہتر اضافے ہوتے رہیں گے۔ ـــ ••

شاغل قادری

کی "متاع شوق"

از:- طیب عثمانی

اردو کے آسمان شاعری پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو ولی دکنی سے میر تک اور میر تقی میر سے غالب تک شاعروں کی کہکشاں نظر آئے گی۔ غالب کے بعد ستاروں کے اس جھرمٹ سے اقبال کا نیر تاباں طلوع ہوا جو اردو شاعری کی بھری محفل میں تنہا نظر آتا ہے پھر چراغ سے چراغ جلے اور اس دور جدید تک تو افق شاعری پر کتنے کہکشاں نئے نئے دائروں میں نمایاں ہوتے رہے ہیں جن کی مدھم اور تیز روشنی سے اردو شاعری کی دنیا منور ہے۔ اور اس لحاظ سے اردو شاعری کا دامن اردو کے دوسرے اصناف ادب کے مقابلہ میں زیادہ مالا مال ہے۔

شاغل قادری کی "متاع شوق" اسی جدید اردو شاعری کا ایک حصہ ہے۔ اور جدید شاعری کے افق پر سیکڑوں ستارے جھلملا رہے ہیں۔ ان میں "متاع شوق" اتنا روشن ضرور ہے کہ ہماری نگاہیں تھوڑی دیر کے لئے ہی اس پر ضرور رک جاتی ہے۔ حقیقتاً ایک ایسی متاع ہے جس میں شوق کی فراوانی، محبت کی گرمی اور فکر کی روشنی موجود ہے۔

شاغل قادری، ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ان کے یہاں شاعری کی قدیم روایات بھی ہیں اور جدید رجحانات بھی،

"متاع شوق" ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جس کے اندر شاعر کے تمام شعری رجحانات کا عکس پایا جاتا ہے۔ اس میں مدحیات سے لے کر نظمیات اور غزلیات تک عشقیہ اور اخلاقی و سیاسی سبھی قسم کے کلام شامل ہیں اور آخر میں تلخیات کے عنوان سے طنزیہ شاعری کا نمونہ بھی ملتا ہے جس سے ان کی تمام صنف شاعری پر ندرت کا پتہ چلتا ہے۔

کسی شاعر کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کے تمام اصناف سخن پر یکساں رائے قایم کی جائے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شاعر کے مجموعہ کلام کا کوئی ایک حصہ ہی ہمارے لئے لطف و مسرت اور فکر و بصیرت کا سامان بن جاتا ہے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو شاغل قادری بنیادی طور پر ایک اچھے نظم نگار ہیں۔ ویسے اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جسے غزل کی چاٹ نہ ہو اس لئے کہ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ ساغر کہے بغیر

اور مشاہدہ حق کی گفتگو، کے لئے تو غزل کا پیمانہ ہی معیار بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے شاغل قادری کی غزلوں کا حصہ بھی کافی جاندار، زبان و بیان کے بلند معیار اور غزل کی روایات کا آئینہ دار ہے۔ "متاع شوق" کے دونوں ہی حصے نظم و غزل ہمارے لئے وجہ مسرت و بصیرت ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شاغل قادری بنیادی

تو ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن فطرتاً وہ ایک اچھے نظم گو شاعر ہیں ان کی نظموں کا آہنگ جدید ہونے کے باوجود ان کے یہاں زبان و بیان کی عام ناہمواری یا جدید شاعروں کی بے راہ روی نہیں پائی جاتی۔ زبان و بیان اور شعری اسلوب کے فنی پہلو کے ساتھ ساتھ، خیال، جذبہ، تاثر اور تجربے کی صداقت بھی نظم کی فنی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس حیثیت سے شاغلؔ کی نظمیں فکر و فن کا حسین سنگم ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظمیں کہی ہیں اور زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے پرکھنے کی کامیاب کوشش ان کی نظموں میں ملتی ہے۔ وہ نظم کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی نظمیں عصری میلانات، خارجی اثرات اور داخلی احساسات کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ کسی شاعر کے کلام کا جائزہ لینے سے پہلے اس کے ذہنی پس منظر اور فکری سرچشمہ کا جان لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس کے کلام کی روح کو ہم اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک ہم شاعر کے فکری پس منظر سے واقف نہ ہوں۔ اس لحاظ سے جب ہم شاغلؔ قادری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ وہ موجودہ بے خدا تہذیب اور مادہ پرستانہ ماحول سے سخت بیزار ہیں۔ ان کا فکر اسلامی، اور نقطۂ نظر روحانی، و اخلاقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تعمیری افکار اور اخلاقی اقدار کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں ان کا جذبہ ان کا خلوص اور ان کا عشق نمایاں ہے اور اس لحاظ سے انہوں نے اقبالؔ کی روایات کو اپنے فکر و شعور میں جذب کر کے ایک انفرادی شان پیدا کی ہے یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری کے رخ روشن پر کچھ داغ، دھبے اور چھائیاں بھی نظر آتی ہیں جس سے ان کے ذہنی اضطراب کا پتہ چلتا ہے لیکن بڑا حصہ اس اضطراب سے محفوظ اور ایک واضح نقطۂ نظر کا عکاس ہے

یہاں پر شاغلؔ قادری کی شاعری کے تفصیلی جائزہ کا موقع نہیں، ہاں ان کی چند نظموں کا تعارف ضرور مقصود ہے۔ جو بلا شبہ ہمارے لئے بھی "متاعِ شوق" ہیں۔ "صبح نو"، "ماحول"، "جرس"، "شایع آدمیت"، "کاش"، "نور خودی"، اور "مرحلۂ دار و رسن"، شاغلؔ کی کامیاب نظمیں ہیں۔

"صبح نو"، ایک چھوٹی سی مختصر بحر کی نظم ہے جس میں سادگی و پرکاری اور دلکشی و دلآویزی دونوں ہی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ظلمت شب اور مایوسی کی تاریکی میں امید و عمل کے جگنو نظر آتے ہیں ؎

دھندلا دھندلا سا دل کا عالم ہے
آرزو کا چراغ مدھم ہے
ہر طرف ہے بلا کی تاریکی
دور منزل ہے راہ پر خم ہے
نئے عنواں کی ہے مسیحائی
جو دوا دردِ دل کی ہے سم ہے
موت ماحول پہ ہوئی طاری
سرنگوں زندگی کا پرچم ہے
چشم حق بیں مگر نہیں مایوس
روشنی گر نہیں تو کیا غم ہے
دل میں شمع یقیں تو ہے روشن
ہو! اگر تیرگی کا عالم ہے
ہلکے ہلکے نسیم کے جھونکے!
کہہ رہے ہیں کہ رات اب کم ہے
پھر چمن میں بہار آئے گی
کھلنے والا سحر کا پرچم ہے

اس طرح شاغلؔ قادری کی نظم "ماحول" ان کی شعری و فکری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ نظم کی جدید تکنیک "موجودہ بے خدا، اور مادہ پرست ماحول کی حقیقی عکاسی اور اس اندھیرے میں یقین کی قندیل ہے۔" صبح جمیل۔ کی پیشین گوئی شاعر کا ایک

ایسا فکری و فنی کارنامہ ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مطلع زیست پہ ہر سمت ہے مسموم سحاب
آج ماحول کے ساغر میں بھرا ہے زہراب
آج پژمردہ ہیں دیرینہ تمنا کے گلاب
آج خاموش ہیں حسن اور محبت کے رباب

روشنی مہر جہاں تاب ہوئی بے بنیاد
زلف بکھرائے ہے ناگن سی تمدن کی پری
سرنگوں در پہ ہوئی شب کے عروس سحری
خندہ زن شعلۂ طوفاں پہ ہوئی کم نظری

اسی طرح دو بند میں مزید ماحول کی تاریکی اور بے بسی وافسردگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور آخری بند شاعر کے عزم و عمل کا اظہار ہے جس میں وہ یقیں کے پرچم لہراتے نظر آتے ہیں۔

اس اندھیرے میں بھی بینا ہے مگر چشم خلیل
زد میں طوفاں کی ہے روشن وہ یقیں کی قندیل
روشنی جس کی ہوئی جادۂ منزل کی دلیل
کون کہتا ہے نہ آئے گی نظر صبح جمیل

لاکھ سر مارتے رہ جائیں گے ارباب ستم
سرنگوں کر نہیں سکتے وہ یقیں کا پرچم

"جرس" بھی شاغل کی بڑی پیاری نظم ہے جو کاروانِ ملت کے لئے ایک "پیام" ہے۔ جس میں شاعر کا یہ عزم کہ پیام رحمت کونین عام کرنا ہے" بڑے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

اٹھو اٹھو کہ بہت کم کو کام کرنا ہے
نئی حیات کا قایم نظام کرنا ہے
مئے ثبات کا تقسیم جام کرنا ہے
اٹھو کہ فکر بقائے دوام کرنا ہے

زمیں کو زیر، فلک کو غلام کرنا ہے
پیام رحمت کونین عام کرنا ہے

ہوس کے بندے ہیں خیر و صلاح کے دشمن
قدم قدم پہ چھپے ہیں ہزار راہزن
شرار وہم نے پھونکا یقین کا خرمن
خزاں رسیدہ ہے اے وائے صدق کا گلشن

اٹھو کہ نظم بہار دوام کرنا ہے
پیام رحمت کونین عام کرنا ہے

شاغل قادری کی مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ ان کی نظمیں "متاع آدمیت"، "کاش"، اور "دور فتن" بڑی پیاری دلکش اور فکر انگیز ہیں۔ ان کے پڑھنے سے یقیناً ہمارے سرمایہ مسرت و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

"متاع آدمیت"

جو ہیں قیدی مکانی جو ہیں سہل زمانی
کبھی کھل سکیں گے ان پر تو نہ زیست کے معانی
جو زمیں کی رفعتوں سے کبھی ہو سکے نہ واقف
انہیں کس طرح میسر ہو فرازِ آسمانی
نہ عمل کا جن کو یارا، نہ یقین کا سہارا
وہ پہنچ سکیں تو کیوں کر سرِ اوجِ زندگانی
چلے کاش کوئی دم بھی جو یہاں نسیم الفت
ملے کاش قلب انساں کو وہ سوزِ زندگانی
یہی سوزِ زندگی ہے وہ متاعِ آدمیت
کیا جس نے ابنِ آدم کو حریفِ آسمانی
مجھے قادری جہاں کو اسی اوج پہ ہے لانا
مری نظم کر رہی ہے مرے دل کی ترجمانی

"کاش"

اف یہ اخلاقی گراوٹ یہ شقاوت یہ عناد
بغض و کینہ کے مفاسد کی یہ پیکار کہن
فتنۂ و جور کے بدکیش شیاطین کے چلن

اف یہ بے رحمی کا طوفاں یہ عداوت یہ فساد
جو مسائح تھے انہیں خود ہے مسیحا کی تلاش
مصلح وقت ہی اصلاح سے محروم ہیں آج
رہبری جن کا تھا شیوہ وہی معدوم ہیں آج
یہ ضلالت یہ ہلاکت ہے اسی کی پاداش
پھول بن سکتے ہیں یہ ظلم و ستم کے انگار
کاش! اولاد براہیم ہو اب بھی بیدار

"دور فتن"

رنگین فضائیں ہیں بہاروں پہ چمن ہے
شاداب گل و لالہ و نسرین و سمن ہے
ہر شاخ گل تر پہ عنادل ہیں غزلخواں
گل گشت میں مصروف کوئی غنچہ دہن ہے
خوش فہمی ارباب چمن خوب ہے لیکن
شاعر کی نظر میں یہ فقط خواب کہن ہے
دیکھا تھا خزاں میں جو بہاروں کا کبھی خواب
چھایا ہوا ذہنوں پہ اسی خواب کا ظن ہے
مرجھائے ہوئے پھول کو شاداب نہ کہئے
روتا ہے جو بلبل تو نہ کہئے کہ مگن ہے
کب تک رہیں اے دوست حقیقت سے گریزاں
خطرے میں نشیمن ہے مصیبت میں چمن ہے
بلبل کے لئے چین کی صورت نہیں اب بھی
صیاد سے ملتا ہوا مالی کا چلن ہے
جس دل میں محبت نہیں ہر اہل وطن کی
وہ دل نہیں اے دوست ناسور کہن ہے
ہم جور و ستم پر تو نہ خاموش رہیں گے
مانا کہ کٹھن مرحلۂ دار و رسن ہے
ہر غنچۂ خوابیدہ کو بیدار کریں گے
ہشیار رہو قادری یہ دور فتن ہے

شاغل قادری نے اپنی شاعری میں جہاں گل و لالہ کے پھول کھلائے ہیں اور عشق و یقین کے چراغ جلائے ہیں وہاں ساتھ ہی مرحلۂ دار و رسن کے لئے آواز بھی دی ہے۔ وطن عزیز پر سرخ سامراج کی للچائی ہوئی نگاہ اور ناپاک عزائم نے جب نیفا و لداخ کی وادیوں میں قدم رکھا تو اردو کے عظیم شاعروں نے "آواز دو ہم ایک ہیں" کا صرف نعرہ ہی نہیں دیا بلکہ بندوق کی، سنگین کی، تلوار کی بات کے ساتھ مرحلۂ دار و رسن کی منزل طے کی، اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ان کی جانب سے بصد شوق سلام آیا ہے
آج پھر جشن بہاراں کا پیام آیا ہے
زلف و ابرو و لب و رخسار کی باتیں نہ کرو
ابھی پازیب کی جھنکار کی باتیں نہ کرو
دوستو ترک کرو بادۂ گلنار کی بات
کرو بندوق کی سنگین کی تلوار کی بات
سازِ عشرت پہ نہ چھیڑو ابھی موہن کی غزل
ہاتھ میں لے کے بڑھو دوستو! شمشیر عمل
آج طے کرنا ہے پھر مرحلۂ دار و رسن
وقت کہتا ہے چلیں باندھ کے اب سر سے کفن

شاغل قادری کی یہ نظم چینی حملہ کے درمیان لکھی گئی۔

نظموں میں ایک کامیاب نظم ہے۔ شاغل قادری کی نظموں کے اس سرسری جائزہ کے بعد اب آئیے ان کی غزلوں پہ بھی ہم ایک نگاہ ڈال لیں۔ نظم کی اہمیت و افادیت کے باوجود ہم اس بات کے قایل ہیں کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید اردو شاعری میں اگر اقبال کا وجود نہ ہوا ہوتا اور حسرت، اصغر، فانی اور جگر جدید اردو غزل میں روشن ستاروں کے مانند افق شاعری پر نہ ابھرے ہوتے تو شاید ہم بھی غزل کو مریضانہ شاعری کی عکاس سمجھتے۔ لیکن پانچ عناصر ایسے ہیں جن سے جدید اردو غزل مرکب ہے جنہوں نے جدید اردو غزل کو ایک نئی زندگی توانائی اور دل آویزی بخشی ہے زندگی اور ادب کے صالح تقاضوں کو غزل کے رنگ و آہنگ میں سمونے کی جاندار اور صحت مند کوشش کی ہے۔ خصوصاً اقبال نے تو غزل کی پچھلی روایاتی مریضانہ کیفیت کو یکسر بدل دیا اور غزل کے لئے ایک ایسا صحت مند اور پاکیزہ قالب عطا کیا۔ جس نے اس صنف شاعری کو پھر سے زندہ جاوید بنا دیا اور اسی گل و لالہ زلف و گیسو اور جام و مینا پر اپنی آتش نفسی سے ایک نئی جان ڈال دی اس طرح الفاظ کے معنی بدل گئے بے جان لفظوں کو جاندار بنا دیا۔ جو الفاظ عیش کوشی اور تن آسانی کی علامت تھے وہی الفاظ حرکت و عمل کے حدی خواں ثابت ہوئے۔

شاغل قادری نے بھی اردو غزل میں نئے تجربے کئے ہیں، ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد ہے، غزل کی کلاسیکی روایات کا وہ نہ صرف یہ کہ احترام کرتے ہیں بلکہ غزل کی ایمائی کیفیت، نازک خیالی، جذبات کی گرمی کا ایک معیار ان کے یہاں ملتا ہے۔ اقبال کے فکری ہم آہنگی اور معنوی نسبت نے ان کی غزلوں میں قوت و تازگی، حسن ادا، اور حسن تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اور ساتھ ہی انفرادی شعری تجربے اور ذاتی احساسات کی وجہ سے ان کی غزلوں میں مختلف مسائل اور موضوعات کی وہ بوقلمونی نظر آتی ہے۔ جو غزل کو رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ بنا دیتی ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھکر ہمیں مسرت کا احساس بھی ہوتا ہے اور فکر کو تازگی بھی ملتی ہے۔

شاغل قادری کی شاعری کے اصل رنگ کو دیکھنے، سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ان کی غزلوں کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وفور شوق ہے یا بیخودی خدا جانے
کہ سوئے دار و رسن بڑھ رہے ہیں دیوانے

الجھ الجھ کے رہے ہیں جو زلف جاناں میں
وہ زلف مادر گیتی چلے ہیں سلجھانے

حکایت غم جاناں پہ سر جو دھنتے ہیں
وہ کیا سنیں گے غم زندگی کے افسانے

شراب ہوش و خرد سے جو مست رہتا ہے
جنوں کا راز بھلا قادری وہ کیا جانے

حقیقت جیسے جیسے کھل رہی ہے زندگانی کی
نظر میں ہیچ یہ دنیائے فانی ہوتی جاتی ہے

ہم تو عشق کے بندے ٹھہرے | کوئی ناحق کیوں دشمن ہے
عشق کی منزل سہل نہیں ہے | ہر اک گام پہ دار و رسن ہے

دل میں تصویر بتاں لب پہ سلام اور درود
زیست مجموعۂ اضداد ہوئی جاتی ہے

ہم بے خودی میں منزل جاناں تک آ گئے
اک کاروان شوق فرادان لئے ہوئے

گذر رہا تھا حریم ناز تک مگر
دل و نظر میں ہم اسے اتارتے چلے گئے

چمن میں ہنسنے کی سر دار جسارت آئی
ان کے قدموں میں زمانے کی سیادت آئی

رنگ لایا ہے ہوا خونِ وفا گلشن میں
گل تو گل خار میں بھی بوئے محبت آئی

دکھ میں آفت میں مصیبت میں بسر ہونے دو
ہجر کی شب ہے کسی طرح سحر ہونے دو
خود ہی کھل جائے گا غیروں کی محبت کا بھرم
میری بے لوث محبت کا اثر ہونے دو

ابھی تو جذب محبت کی آزمائش ہے
فروغ عشق کی دار و رسن کی بات کرو

کیا ہونگے عشق کی منزل سے آشنا
کشتہ ہر اک قدم پہ جو سود و زیاں کے ہیں

اندھیر کچھ نہ پوچھئے بزم خیال کا
ہم کیوں نہ شمع یاس جلائیں تمام رات

باغباں تو بدل گئے ہمدم
پھر بھی رنگِ چمن نہیں بدلا

ہزار بار نشیمن جلا کے دیکھ لیا
مجھے تو برق نے بھی آزما کے دیکھ لیا

ہوا ہے سود و زیاں کی فکر کیوں
جس نے تیرے عشق کا سودا کیا

ہائے وہ تیر نیم کش شاغل
زخم تازہ ہے آج تک دل کا

رہائی پاتے ہی سو الجھنوں نے ڈال دی بیڑی
فضائے گلستاں میرے لئے کب سازگار آئی

رعنائی حیات کا باعث کبھی نہیں
وہ دردِ عشق جس کی خلش دائمی نہیں

راہ وفا میں کوئی دیتا ہے ساتھ کس کا
غم کیوں منائیں ناحق ہم اپنا بے کسی پر

شاغل قادری کی شاعری یہی ہے جس میں خلوص ہے۔ جذبہ ہے۔ اور فکر کی روشنی ہے۔ شاغل نے شاعری کی صالح روایات کو جذب کرکے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے۔ جو بہر حال ایک عرصہ تک اردو شاعری کو تب و تاب دیتے رہیں گے۔

آتشیں ـــــ ایک مطالعہ

از :- طلحہ رضوی برق

اردو شاعری کے کسی دور میں بھی شعری مجموعے
اس تیزی کے ساتھ نہ چھپے ہوں گے جس رفتار سے آج منظرِ عام
پر آرہے ہیں۔ یہ اردو زبان کے لئے باعثِ فخر بھی ہے اور
سبب ندامت بھی۔ کیونکہ ان میں بیشتر مجموعے ایسے ہی نظر آتے
ہیں جو " کاتا اور لے دوڑے " کی مثال ہیں۔ واہی نے
اپنی نظم " خدام ادب " میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ اردو وہ
خوش نصیب زبان ہے جس کے ہر پانچ پڑھے لکھے اشخاص میں
چار ادیب اور شاعر ہیں۔ اب اسے اردو کی خوش قسمتی
سمجھئے یا بدنصیبی، حالت کچھ ایسی ہی ہے۔

آج جدت پسندی اور قدامت پرستی کے نام پر
جو بھی شاعری ہو رہی ہے۔ اگر چھان پھٹک کر دیکھا جائے
تو کام کی چیز بہت کم ہی نکلیں گی۔ اچھی شاعری وہی ہے جو
شاعر کے بعد بھی باقی رہے اور پڑھی جائے۔ ہر عہد میں اچھی
شاعری ہوئی ہے۔ اور ہوتی رہے گی۔ دل اور دماغ اللہ
کی دی ہوئی بہترین نعمتیں ہیں۔ احساس جذبہ اور فکر و تخیل کی
آماجگاہ یہی ہیں۔

شاعری انہیں سے عبارت ہے۔ اگر دل اور دماغ
صالح اور صحت مند ہیں تو یہ صلاحیتیں جو فطرت نے ودیعت
کی ہیں خاطر خواہ طور پر کام آئیں گی۔ زمانے کی نیرنگیاں ان
پر اثر انداز ہوتی ہیں اور معنی وقت بدلتا ہے اس سے ہزار نغمے
پیدا کرتا ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ساز کی سلامتی اور درستگی ہے۔
اگرچہ رباب شکستہ میں نغمہ حرارت سے نوحہ کناں ہوتا ہے مگر
اس کی صدائے لطیف سننے والے ہی سماعت درکار ہے۔

شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے بڑی فنکاری
اور چابکدستی سے ... تک منتقل کرتا ہے۔ اپنے
پیغام کی تبلیغ کرتا ہے۔ شاعری کو شاید اسی لئے جزو پیغمبری
کہا گیا ہے۔ لہٰذا شاعری میں ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ بھی بڑی
اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شعر اس وصف سے عاری
ہو تو اسے مبہم بلکہ مہمل کہیں گے۔

نئی رمز شاعری میں ابہام کو ہی اولیت دی جا
رہی ہے۔ اس ابہام پسندی کے پیچھے ایٹمی رفتار سے پیدا
ہونے والے شعراء کی ایک خاص غرض و غایت پوشیدہ
ہے۔ وہ ابہام کو اپنی ڈھال اور اس سے اپنے مقام کو محفوظ
سمجھتے ہیں۔ بلراج کومل نے ان کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

" افتخار جالب اور دیگر ابہام پسند شعراء خود بھی
نہیں جانتے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور ابہام کے ساتھ
ان کی مریضانہ وابستگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ڈرتے
ہیں کہ جب وہ سادہ الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کریں گے تو

وہ پکڑے جائیں گے اور معمولی شاعر بھی تسلیم نہیں کئے جائیں گے۔"

جدیدیت دراصل رسمی ابہام پسندی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس روایت پسندوں نے فن کا احترام کیا اور وہ شاعری کو فن سمجھتے ہوئے برت رہے ہیں۔ اجمال و اشکال اور ابہام سے دامن بچاتے ہوئے تخلیق ادب میں مصروف ہیں۔

شعری مجموعوں کی اس کھیپ میں جو ادھر دو چار سال کے اندر اندر سامنے آئی ہے اپنی میانہ روی و اعتدال پسندی کے سبب جاذب توجہ ہیں۔ ایسی ہی شعری تصانیف میں ایک تصنیف میرے پیش نظر ہے جس کا میں جائزہ لینے جا رہا ہوں اور وہ ہے "آتشیں" ——— جناب عبدالجبار نسیم آروی کی اب تک کی شعری تخلیقات کا مجموعہ۔

عبدالجبار نسیم صوبہ بہار کی مشہور و معروف ادبی سرزمین آرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی نسبت سے خود کو آروی لکھتے ہیں۔ پروفیسر امان اللہ غازی کا ایک طویل تر مضمون پیش لفظ کے طور پر کتاب میں شامل ہے۔ جس میں آرہ اور اس ضلع کی ادبی خدمات کا بڑا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

نسیم آروی ایک نوجوان اور دردمند شاعر ہیں نسیم نے اردو کی روایتی شاعری کا مطالعہ کیا ہے مسلمات سے آگاہی حاصل کی ہے۔ اور سادگی و صفائی کے ساتھ شعر کہنے کا گر سیکھا ہے۔ شاعری سراسر واردات قلب کی ترجمانی ہے۔ نسیم نے شاعری کرنے سے پہلے اس میں شک نہیں کہ "دل گداختہ" پیدا کر لیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں "از دل خیزد بر دل ریزد" والی بات پائی جاتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے غزل، نظم، سہرا، قطعہ اور ترجیع بند بھی لکھے ہیں۔ لیکن دراصل وہ شاعر غزل کے ہیں۔ نظم نگاری میں چونکہ انہوں نے بڑی وسیع المشربی سے کام لیا ہے۔ اور دوست کا خط پا کر" "پہلی گھٹا" "جواہر لعل" "ایٹمی تجربہ" "اعلان جنگ" اور "پنچ شیل" وغیرہ پر بے تحاشہ نظمیں لکھی ہیں۔ اس لئے کہیں کہیں ان میں جذب کا فقدان، فکر کی کمی اور پھسپھسی سطحیت نظر آتی ہے ملاحظہ ہوں چند اشعار ؎

جو تخت و تاج فرنگی کو روند آیا ہو
وہ چین و پاک کی بھبکی سے ڈر نہیں سکتا

———

وطن اپنا، زمیں اپنی، جواہر لعل اپنے ہیں
کرالا، کاشمیر، پنجاب اور بنگال اپنے ہیں

———

اس کے برعکس نسیم کی بعض نظمیں جو خوبصورت و پر اثر ہیں۔ ان میں تشبیہات کی تازگی، استعاروں کی ندرت اور زبان کی صفائی بھی ملے گی۔ مثلاً "کس کو فرصت ہے کہ تم سے پیار کرے" "مزدورن" "عہد" سے متعلق نظمیں سوز و گداز کی حامل ہیں۔

نسیم جا بجا جوش اور فیض سے بھی متاثر نظر آتے ہیں نظم "کس کو فرصت کہ تم سے پیار کرے" کا محرک یقیناً فیض کا یہ مصرع رہا ہوگا۔

" اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

"مزدورن" میں جوش کی شاعری کا انداز بہت نمایاں ہے نظموں کی نسبت اگر نسیم کی غزلیں پڑھئے تو محسوس ہوگا کہ نسیم نے اکثر نظمیں لکھ کر بہت ساری اچھی غزلوں کا خون کیا ہے۔ غزلوں میں نسیم کا اپنا انداز نظر آتا ہے۔ ان کی

تقریباً ہر غزل تغزل بداماں ہے۔ حسن و عشق کی حسین مگر غمناک فضا میں قدم قدم پر جان و دل کی بازی نظر آتی ہے ؎

اپنا غم، ان کا ستم، سارے زمانے کا الم
دل میں رستے ہوئے ناسور رہے ہیں کیا کیا

ورق ورق پہ چھڑکتا ہوں خونِ دل کہ نسیمؔ
حسین کچھ اور محبت کی سرخیاں ہو جائیں

نسیمؔ اف نہ غمِ دل عنوان بدل بدل کر کہتے ہیں اور ایک نئے لطف کے ساتھ ؎

کتنے عنواں سے کہہ رہا ہوں نسیمؔ
یہ دلِ زار ہی کی بات تو ہے

نسیمؔ زندگی کی کتنی ہی کٹھن منزلوں سے گذرے ہیں مصائب و آلام سے ٹکرائے ہیں وہ کہتے ہیں ؎

نہ جانے کتنے دن تک خانماں برباد بھٹکا ہوں
نہ جانے بجلیاں کتنی گری ہیں میرے مسکن پر
نہ جانے کتنے دن گذرے ہیں شغلِ خونفشانی میں
نہ جانے کتنے موتی ٹوٹ کر بکھرے ہیں دامن پر

مگر پھر بھی عزم و عمل کا دامن نہ چھوڑا اور بالآخر اپنی منزلِ پرسکوں تک پہونچ ہی گئے ؎

میں تیرگیٔ شب سے ہراساں نہیں نسیمؔ
دل آج بھی ہے عزم و عمل کی کرن لئے

غمِ دل کی قیمت کسی شاعر سے پوچھئے، گدازِ قلب ہی تو شاعر کا سرمایۂ حیات ہے۔ نسیمؔ کہتے ہیں ؎

جو لوگ غمِ دل کے نگہبان رہے ہیں
اے گردشِ دوراں وہی ذیشان رہے ہیں
غم کے دیئے، زخموں کے کنول، ہنسی کی کرنیں
دل پر ترے سو طرح کے احسان رہے ہیں

نسیمؔ کو زندگی سے پیار ہے، عروسِ حیات کی شائستگی کے لئے وہ بڑا حوصلہ اور عزم رکھتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

ہر بار کچھ سنورتا گیا گیسوئے حیات
آیا ہر انقلاب نیا بانکپن لئے
پھر جستجو حیات کو ہے جوئے شیر کی
پھر ہم اٹھے ہیں حوصلۂ کوہکن لئے

نسیمؔ کی غزلیں بڑی شاداب و شگفتہ اور تغزل کی کیف سامانیوں سے بھرپور ہیں۔ روایتی مسلّماتِ شاعری کو اتنی سادگی اور پرکاری کے ساتھ استعمال کرنا کہ ان میں نیا لطف اور نئی بات پیدا ہو نسیمؔ کا کمال ہے

صبحِ عیش و طرب کی بات تو ہے
دھندلی کچھ آج غم کی رات تو ہے
کون مرتا ہے بے سبب اے دوست
حسن میں تیرے کوئی بات تو ہے
قلتِ انگبیں سہی اے دل
زہرِ غم، تلخیٔ حیات تو ہے

زلف و رخسارِ یار دیکھ چکے
رنگِ لیل و نہار دیکھ چکے

گل کو سینۂ نگار دیکھ چکے
جوشِ فیضِ بہار دیکھ چکے

آئی مرے حصہ میں اور آئی تو یوں آئی
میں نے شبِ غم کی ہی مانگی ہو دعا جیسے

ہم ڈھونڈھتے پھرتے ہیں ہر در پہ نسیم اسکو
مل جائے گی ڈھونڈھے سے یاں جنسِ وفا جیسے

پہلے تو معنبر تھی اب ظالم و قاتل ہے
چھوکر تری زلفوں کو آئی ہو ہوا جیسے

قوسؔ بھاگلپوری

ڈاکٹر احمد حسن ۔ پی ایچ ڈی

قوسؔ کی شام وفات کی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ ان کی شخصیت بیسیوں افسانوں کا عنوان بن گئی۔ وہ شاعر تھے شاعر گر تھے ۔ غزلیں بیچ کر معاش اور معیشت کا سامان کرتے تھے ۔ مشاعروں میں اپنے حلقۂ تلامذہ کی آبرو رکھنے کے لئے غزل در غزل لکھ کر مال اُسے عام دیتے تھے، وغیرہ وغیرہ ۔ شاید یہ سب تھے اور سب کچھ کرتے تھے لیکن اس سب کچھ کی تہہ میں بنیادی صداقت ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ قوس شاعر تھے ۔

قوس اپنی ساری عمر جن اسباب و حالات کے رہین منت رہے وہ کسی عظیم شاعر کی تخلیق کے لئے ہرگز سازگار نہیں ہوتے اس لئے ان کی شاعری میں شخصی عظمت، جذبی اعتدال، فکری بلندی، در فنی اہتمام کی جستجو آگے بڑھ نہیں پاتی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شاعر کا یہ فکری جوہر اگر عظمت و بلندی سے محروم رہ گیا تو قوسؔ کی کوتاہی نہ تھی بلکہ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

تم قوس کی حالت کو سننے سے نہ گھبراؤ

وہ اور تھا افسانہ یہ اور تھا افسانہ

ان کی غزلیں تہذیبی میلان کے اعتبار سے کلاسیکل روایات کی پابند تھیں ۔ حیات و کائنات کا وہی تصور جس کی آبیاری ایک طرف تصوف اور دوسری طرف عیش کوشی کے نظریات نے کی ہے ۔ قوس کی شاعری کا عام پس منظر ہیں لیکن ان نظریوں میں دلی مکتبۂ شاعری کا سوز و گداز اور لکھنوی شاعری کی رنگینیاں سمی طور پر اس طرح سموئی ہوئی ہیں کہ ان کا مجموعی اثر انفرادیت کو ابھرنے نہیں دیتا ۔

درد جگر ہے ۔ لذت گرہ گیر کا جواب

اور ہے خدنگ آہ ترے تیر کا جواب

کندن بنا ہوں جل کے محبت میں یار کی

رکھتے ہیں اس کو دیکھئے اکسیر کا جواب

دشمن کی کیا مجال جو سینہ سپر کرے

ہاں دل ہمارا دے گا ترے تیر کا جواب

چٹکی بجا کے چاہے تو لے دل پلٹ دے دو

ہے دست یار میں میری تقدیر کا جواب

مرغ سحر کہ مرغ چمن دیکھیں قوسؔ اب

دیتا ہے کون نالۂ شبگیر کا جواب

رنج و غم میں جب خیال لطف میخانہ ہوا

میرے ہی خوں سے مرا لبریز پیمانہ ہوا

اضطراب دل کی شدت آنکھ سے ثابت ہوئی

اپنے ہر آنسو کا قطرہ غم کا افسانہ ہوا
دل پریشانی سے چھوٹا اور اسیری بچ گئی
الجھے الجھے گیسوؤں میں جب ترے شانہ ہوا
آج یہ کس شمع رو نے رخ سے الٹی ہے نقاب
گویا بزمِ ناز کا ہر ذرہ پروانہ ہوا
میکدے میں فیض ہے کس کی نگاہ مست کا
دور میں جام آ گیا گردش میں پیمانہ ہوا
بن گیا کوزہ، وضو کا جام، ہنگام نماز
میکشو اب صحن مسجد صحن میخانہ ہوا
اس پری چہرہ کا جس دن سے ہوا مجھ کو خیال
قوس اس دن سے یہ دل رشک پری خانہ ہوا

لیکن قوس کا فطری جوہر اس وقت کھلتا ہے ـــــــ جب وہ چھوٹی بحروں میں غزلیں کہتے ہیں۔ یہ ان کے محدود افقِ شاعری کے درخشاں ستارے ہیں جو ان کی گھٹی ہوئی انفرادیت کے دھندلکے میں حقیقی افتادِ طبع یا لاشعور تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ یہی چھوٹی بحریں اکثر وہ معیار بن جاتی ہیں جن پر کسی شاعر کا ذوق صحیح پرکھا جا سکتا ہے۔ بڑی بحروں کے لفظی تکلفات میں جہاں ہمارے احساسات الجھ کر رہ جاتے ہیں وہاں چھوٹی بحروں کی بے تکلفی اور برجستگی اپنی جذباتی شدت اور احساسی گہرائی کے اعتبار سے تیر و نشتر بن جاتی ہیں اور شاعر کے ضمیر تک پہنچنے میں فنی کاوشیں حائل نہیں ہوتیں۔

صدا نغمے کی دل سے آ رہی ہے
ابھی سرگرم سازِ زندگی ہے
چراغِ حسن ہے کس کا فروزاں
نظر کی انتہا تک روشنی ہے
اجل کی جستجو ہے منزلِ شوق
بساطِ دہر راہِ زندگی ہے
ہوا تن نے دی دامن کی ایسی
شہید ناز کو نیند آ گئی ہے
چلا دیوانہ خود ہی سوئے زنداں
جنونِ شوق کی حد ہو گئی ہے
ابھی ہے آسرا وعدے کا ان کے
ابھی تاروں میں کچھ کچھ روشنی ہے
جسے اے قوس تو نے درد سمجھا
اسی کا نام شاید زندگی ہے

گفتگو کچھ ہے اور نظر کچھ ہے
دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے
نعرہ نعرہ رلانے والا ہے
نغمہ مانا کہ مختصر کچھ ہے
طول شب یہ بھی تو بتا آخر
آمد صبح کی خبر کچھ ہے
جس سے بیمار کو قرار آئے
ایسی تدبیر چارہ گر کچھ ہے
غیر سے پوچھو بے رخی اپنی
میری باتوں پہ شک اگر کچھ ہے
نامہ بر ہے تری زبانی کچھ
خط میں لکھا ہوا مگر کچھ ہے
کس کا شکوہ کریں گے غربت میں
خطِ قسمت پہ جب نظر کچھ ہے
خط یہ خط روز ان کا آتا ہے

توسّس آہوں میں اب اثر کچھ ہے

زلف کھولے جو وہ مسکرائے
برق چمکے گھٹا گھر کے آئے
جب جوانی امنگوں پہ آئے
حسن کیوں کر نظر کو نہ بھائے
ساقیا لطف پینے کا آئے
جب قدم نشہ میں ڈگمگائے
وقتِ آخر جو تم پاس آؤ
کیوں نہ پھر زندگی مسکرائے
دید کی آرزو جب نہ نکلی
اس کے کوچے سے ناکام آئے
چاندنی سے کوئی کیوں نہ کھیلے
چاند دنیا کو جب جگمگائے
تم بھلاتے ہو مجھ کو بھلاؤ
دل تمہیں کس طرح بھول جائے
چھیڑ مضرابِ غم سازِ دل کو
حسن نغمہ اگر کوئی گائے

قوسؔ کی اکثر غزلیں مشاعروں کی رہینِ منت ہیں۔ ان میں اصحابِ ذوق کی دست برد سے جو بچ گئیں وہ آثارِ قوس بن گئیں۔ ذیل کے چند اشعار اسی سلسلے کی بعض کڑیاں ہیں:

پا اٹھ کے جائے گا کہاں جلوۂ گہہ ناز سے یہ
شمع کی ضو، حدِ پرواز ہے پروانے کی

جس کو سمجھا ہے سرورِ زندگی اے بادہ خوار
دست ساقی میں کہیں وہ موت کا ساغر نہ ہو

نہ دستِ گل سے ملا مرہمِ شفا اب تک
جگر کے زخم کو گلشن بنا کے دیکھ لیا

تم کو معلوم ہے رودادِ محبت میری
تم جو چاہو تو بدل دو مرے افسانے کو

ایک وہ ہے کہ مئے لطف سے سرشار رہا
ایک ہم ہیں کہ ترستے رہے پیمانے کو

در در کے بھٹکنے سے حاصل نہیں ہوتا کچھ
ملنے کو جو ہوتا ہے مل جاتا ہے گھر بیٹھے

اے قوسؔ تمہیں ہنسنا ہی پڑا ہم کو (معیت)
کچھ اور ہی کرنا تھا کچھ اور ہی کر بیٹھے

روز لاتا ہوں تصور میں نئی شامِ فراق
روز ہوتی ہے ضرورت اک نئی تصویر کی

دیوانگیٔ دل کچھ تو بتا اس وقت کا عالم کیا ہوگا
جس وقت جنوں لے کر مجھ کو پھر دار و رسن تک پہنچے گا

یہ کیسا انقلاب آیا جہاں میں
کہ اب ہر آشنا ناآشنا ہے

ظاہر ہے کہ یہ چند نمونے قوس کا کوئی غیر معمولی مقام

باقی صفحہ ۱۷۹ پر

ضرت قوس بھاگلپوری کے
یڑھے میڑھے نقوش

از : ——— محی الدین غنی

اردو زبان کی ابتدا ہی سے اس کی زلفوں کو بنانے
وارنے اور اس کے رنگ و روپ کو نکھارنے میں زیادہ تر
د کا حصہ رہا ہے۔ آج بھی ادیبوں کی نسبت شاعروں ہی
سے حسن، سادگی اور سلاست و روانی عطا کی ہے۔ میں یہ
کہتا کہ ادیبوں نے اس زبان کو نکھارنے بنانے اور سنوارنے
لئے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ میں بڑے خلوص کے ساتھ یہ کہنا چاہوں
ن کی (شاعروں کی) محنتوں، کاوشوں اور تلاش و جستجو کو
ر عام پر لانے اور صحیح مقام عطا کرنے میں ادیبوں کا
حصہ رہا ہے۔ شاعروں ادیبوں میر و غالب سے
ظفر، داغ، اقبال، شاد، فراق، جوش، جگر، وحشت
وی، جمیل مظہری، زار عظیم آبادی، ابر احسنی، فانی، حسرت
ن، م، راشد، میراجی، ندیم قاسمی، سردار جعفری، فیض
وم محی الدین، پرویز شاہدی، جرم محمد آبادی، کریم اسدی
غل قادری، اور لطف الرحمٰن کے ساتھ ساتھ سر سید
ی افادی، عبدالحلیم شرر، شبلی، حالی، سجاد حیدر
جہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری،
الماجد دریاآبادی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت
ائی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، عفت موہانی، صدیقہ
، ممتاز شیریں، وغیرہ جتنے شعرا و ادبا گذرے اور موجود
ہیں سبھوں نے گلشن شعر و ادب کی کیاریوں کی آبیاری کی ہے
اور نخل اردو کی نئی کونپلوں اور شاخوں کی خاطر پرانی شاخوں
کو کترنے، بنانے اور سنوارنے میں زندگی کی آخری سانس
تک لگادی ہے۔ انہیں قابل قدر ہستیوں میں جناب قربان علی
قوس کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان کی شخصیت قابل صد
احترام تھی کہ انہوں نے سلمائے اردو کی خاطر بہار سے لے کر
بنگال تک کی خاک چھانی۔ گوکہ آپ کی پیدائش بھاگلپور
کے محلہ بڑے چک (باری چک) میں ۱۸۹۹ء میں ہوئی
لیکن اوائل عمر ہی سے اپنے والد کے ہمراہ کلکتہ میں رہنے
کے سبب تعلیم و تربیت سب آپ کی وہیں ہوئی۔ دینی اور
مذہبی تعلیم آپ نے وہاں کے مدرسوں میں حاصل کی۔ کسی
اسکول اور کالج میں آپ کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں
مل سکا۔ لیکن اپنی خداداد ذہانت، فطانت اور شاعرانہ
صلاحیتوں کے سبب اردو فارسی اور عربی میں اتنی استعداد آپ
نے بہم پہونچائی کہ منشی نعیم لکھنوی، مبارک شاہ اور محمد ابراہیم
اثر جیسے صاحبان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ ہونہار بروا
کے چکنے چکنے پات، منشی نعیم لکھنوی نے جناب قوس کو فن شاعری
کے رموز و نکات سے واقف کرایا فطری ذہانت اور موزونی
طبع کے ساتھ ساتھ استادان فن کی رہبری میں قوس نے

دورانِ قیام کلکتہ لیلیٔ غزل کی زلفیں سنوارنے اور بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

۱۹۲۴ء میں آپ نے نیرنگ قوس کے عنوان سے ایک ادبی مجلہ کا اجرا بھی کلکتہ ہی سے کیا جس کی ادبی نیرنگیوں کے دلدادہ حضرت کلکتوی کے ساتھ ساتھ کلکتہ کے تمام اہلِ ذوق حضرات بھی تھے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ کلکتہ سے بھاگلپور تشریف لائے۔ یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں۔ یاس بھاگلپوری، بیرسٹر ابوالحسن، سید فضل علی افضل، ڈاکٹر ناصر علی، سید نذیر حسین رجسٹرار، جمشید مرزا، شرف الدین شرف وکیل، ماسٹر نور، ندیم نوری، عبدالرؤف وکیل، محمد قاسم ستیدرا، ڈاکٹر عبدالحی عارف، واجد علی تمر، ابوالحسین ادیب، عبدالرحیم عاجز وغیرہم بیمار محفل شعر و سخن تھے۔ شہر بھاگلپور کا گوشہ گوشہ شامِ غزل کی مشک افشانی سے زعفران زار بنا ہوا تھا۔ جناب قوس کی آمد سے بہار شامِ غزل کی رونق اور افزوں ہوگئی۔ حضرت قوس کے بہتیرے شاگرد بھی شریک مشاعرہ ہونے لگے۔ بزمِ سخن کبھی تاتارپور میں سجتی تو کبھی برہ پورہ میں کبھی مجاہد پور حبیب پور اور قاضی ولی چک میں شعر و سخن کی یہ محفلیں اہلِ ذوق کے لئے سامانِ تسکین بن گئیں۔

حضرت قوس کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہوسکتی ہے لیکن قابلِ ذکر ہیں عاشق حسین عاشق، عبدالحمید شوکت مرحوم، مقبول احمد منطق، حافظ اسلم، اقبال حسین اثر (سید ابوالمجید یاس بھاگلپوری کے نسبتی بھائی) وغیرہم۔ حضرت قوس کے فن سے متعلق ڈاکٹر سید احمد حسن صاحب اور شفیق شاعر باقری کا مضمون آپ انہیں صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔ لہٰذا انکی شخصیت کے متعلق چند جملے ہی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ جو شخص جس کے جتنا قریب ہوتا ہے وہی اس کی شخصیت کی بھرپور عکاسی بھی کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے حضرت قوس کی زندگی اور شخصیت کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں بات نہیں آ رہی کہ انکی گوناگوں شخصیت کی کس کس پہلو کی میں عکاسی کر دوں۔ پھر بھی مشتے نمونہ۔

۱۹۵۰ء میں حضرت قوس سے میری پہلی ملاقات قریہ رحمن پور کے مشاعرہ سے چند روز قبل یوں ہوئی کہ میں نے وہاں کی دی ہوئی طرح پر ایک غزل کہی اور حضرت مولانا ساجد اللہ صاحب حشر کی خدمت میں بغرض اصلاح حاضر ہوا تو انہوں نے میری غزل پر ایک نظر ڈالی اور برجستہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ غزل کہی ہے تو خوب کہی ہے۔ تم بیشک اچھے شاعر ہو۔ اور فردا کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ اصلاح سخن کی صلاحیت مجھ میں نہیں تم جناب قوس سے رجوع کرو۔ کیونکہ وہ اس فن کے ماہر اور شعری نزاکتوں، لطافتوں اور رموز و نکات کا عرفان رکھتے ہیں۔ حسب ارشاد مولانا میں حضرت قوس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کا گندمی رنگ، سر د سفید، پرجلال چہرہ اور قد و قامت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ خندہ پیشانی کے ساتھ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا۔ والد کا نام اور مقام پوچھا اور غزل پر اصلاح فرمائی۔ پھر تو حضرت قوس سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کبھی سرِ راہ ملاقات ہو جاتی تو کبھی ان کے در دولت پر۔ باتوں کا سلسلہ اور شعر و شاعری کا دور جو چلتا تو پھر نہ دن کا پتہ رہتا نہ رات کی خبر۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ مجبوراً غریب خانہ پر تشریف لے آتے یہاں بھی یہی شغل جاری رہتا۔

ان کی زندگی کھلی کتاب کی مانند تھی۔ ظاہر و باطن ایک۔ جو کہتے وہی کرتے۔ دغا مکر دنیا سے بالکل عاری۔ اگر وہ شعر کے بجائے فکرِ معاش میں جٹ گئے ہوتے تو پھر ان کی زندگی دوزندگی

نہیں ہوتی جو وہ گذارنے پر مجبور ہوتے۔ بلکہ ایک بہترین شوہر اور ایک شفیق باپ ثابت ہوتے۔

ہندوستان میں تو یہ عام روایت ہے کہ شعر و شاعری، افسانہ نویسی، اور مضمون نگاری سے کسی شاعر و ادیب کا پیٹ نہیں بھرتا۔ دوزخ بھرنے کے لئے کلرکی کرنی اور ڈبل روٹی کھانی پڑتی دکان داری اور گرگھا سوت کا بیلن بیلنا پڑتا ہے۔ بیڑی بنانی اور نعل ٹھوکنی پڑتی ہے۔ تو پھر قوس بھاگلپوری نے ہندوستانی روایات سے انحراف کر کے یہ کیوں سمجھ لیا کہ ان کی خدمتیں روزی روٹی کا وسیلہ بن پہونچائینگی؟

حضرت قوس با اخلاق، ملنسار، اور با عزم و ارادہ، (صرف شعر و شاعری کے معاملہ میں) شخصیت کے مالک تھے۔ ابتداء میں ان کی زندگی بڑی پر مسرت اور پر وقار گذری لیکن آخر زندگی نذر افلاس و بے کسی ہو گئی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ متعدد دن تک ہانڈیاں چڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس کے باوصف لوگوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ جو شاگرد بغرض اصلاح و ملاقات ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ان کی چائے پان سے تواضع کرتے۔ شعر کہنے کا یہ عالم تھا کہ وقت مشاعرہ سے چند گھنٹے پہلے دو ڈھائی سو اشعار ان کے لئے کہہ لینا اور نو مشق شاگردوں میں تقسیم کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ان کے بعض تلامذہ جن میں سے میں بھی ایک ہوں مجھے یہ انداز مطلق نہیں بھاتا تھا اس لئے میں صاف صاف یہ عرض کر دیتا کہ مجھے یہ آپکا انداز مطلق پسند نہیں۔ غزلوں پر اصلاح لیتے وقت ان کے حسن و قبح سے بحث کرنا اور ان کے [illegible] کی کوشش میں الجھ پڑنا میرے لئے معمولی بات تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ میرے اس رویہ پر برانگیختہ ہو جاتے لیکن میرے لئے یہ سود مند ثابت ہوتا پھر وہ [illegible] مغضوب شاگرد کی ساری خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی فرما دیتے۔ اور میرے لئے بڑا کام ہو جاتا۔ شعر و شاعری اور مشاعروں سے دلچسپی کی انتہا کا یہ عالم تھا کہ ایک مشاعرہ کے موقع پر ان کے لخت جگر کی موت واقع ہو گئی اور وہ اس حادثہ جانکاہ سے بے نیاز اصلاح سخن اور شعر گوئی میں اس درجہ منہمک رہے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام کن لوگوں نے کیا، جنازہ کب اٹھا، ان کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

بھاگلپور کے شعراء و ادبا آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے بالخصوص پیر بشر ابوالحسن صاحب آپ سے بڑی محبت و شفقت رکھتے کچھ شعراء کو آپ سے خفگی بھی تھی۔ ان معنوں میں کہ وہ بعض مشاعروں کو اپنی اچھی غزلیں دیگر ایسے شعراء کی مٹی پلید کرتے جو خون جگر جلا کر شمع غزل کو روشن کرتے۔ اور مشاعروں میں خاطر خواہ داد نہیں پاتے۔ اور یہ بات کسی قدر کھٹکتی ہوئی بھی تھی۔ اسی لئے میں نے چند ایک سال تک ان کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرنے کے بعد ان سے اصلاح لینا ترک کر دیا۔

ان کی زندگی کے اوراق ماضی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جناب امیر الدین صاحب وکیل کے اصرار پر آپ کٹیہار تشریف لے گئے اور وہاں کی سنگلاخ زمین میں شعر و ادب کے گل و بوٹے کھلائے، ماسٹر ظہیر الدین احمد، نصیر الدین نصیر، مولوی نثار احمد نادر، منشی طہارت کریم وغیرہ آج بھی ان کی خدمتوں پر روشنی ڈالنے کے لئے باحیات ہیں۔ غیر ممکن ہے کہ اس چھوٹے سے مضمون میں ان کی زندگی اور شخصیت کے ہر گوشہ پر روشنی ڈالی جا سکے۔

المیہ یہ ہوا کہ صاحب گنج سنتھال پرگنہ کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آپ تشریف لے گئے اتفاق یہ کہ وہیں آنکھ میں درد شروع ہوا۔ اور روشنی آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ آخر عمر میں یہ حال تھا کہ خود سے لکھنا پڑھنا، چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ [illegible] پر کچھ معاش کی مجبوری کیسے کیسے [illegible]

نے نہ دیکھے۔ اور اس فلک کج رفتار نے نہ دکھلائے۔ اردو دنیا خصوصاً شاعروں و ادیبوں کے لئے مقام عبرت ہے کہ ان کی زندگی بھر کی خدمتوں کا صلہ ان کو فقر و فاقہ، عسرت و افلاس، کس مپرسی بیچارگی اور بیماری کی زندگی ملی۔ ویسے خدا سبھوں کا رازق العباد ہے۔ زندگی گذر جاتی ہے لیکن اپنے پیچھے گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے ان کے اس شعر سے ان کی روداد زندگی کی مکمل وضاحت ہو جاتی ہے ؎

تم کو معلوم ہے روداد محبت میری
تم جو چاہو تو بدل دو مرے افسانے کو

آپ کا سانحۂ ارتحال ۱۹۶۷ء میں ہوا اپنے پیچھے انہوں نے ایک بیوی کے علاوہ دو لڑکے اور چار لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ایسے " اوراق پریشان " بھی چھوڑے ہیں جو اگر زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ جلد ہی منظر عام پر مجموعہ کی شکل میں نظر افروز ہوں گے۔ آخر میں ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

کوئی دنیا سے فراموش چلا جاتا ہے
ہوش کھو کر کوئی بیہوش چلا جاتا ہے
عقدۂ راہِ عدم قوسؔ کسی سے نہ کھلا
بے زباں آتا ہے خاموش چلا جاتا ہے

بقیہ:- قوسؔ بھاگلپوری

متعین نہیں کرتے اور وہ اس لئے کہ قوس کی مجبوریوں نے انہیں اپنی شاعری میں اپنی زندگی کو سمونے کا موقع نہ دیا۔ لیکن جب ہم قوس پر اس زاویہ سے نظر ڈالتے ہیں کہ جس شاعری کے لئے انہوں نے اپنی زندگی تیاگ دی وہ شاعری بھی ان کی تلخیٔ احساس کا سہارا نہ بن سکی تو ہمیں قوس میں ایک غیر معمولی المیہ کردار ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی شخصیت احساسات سے بھرپور ایک شمع تھی جو اپنی زندگی کی ساری رات اپنی مدھم روشنی سے دوسروں کی رہنمائی کرتی رہی۔ اس مدھم روشنی کی تہہ میں ایک گہرا سوز تھا جو ان کی بے زبانی میں گھٹ کر رہ گیا اور اپنے جاننے والوں کے لئے ایک ایسی زندگی کا نشان چھوڑ گیا جیسے کسی قبر کا تازہ بجھا ہوا چراغ جس سے ابھی دھواں اٹھ رہا ہو۔

بیچارگی نہ پوچھ مری بے بسی نہ پوچھ
اے غمگسار حالِ غمِ زندگی نہ پوچھ

بیرسٹر ابوالحسن صاحب کی شخصیت

نقی شاعر

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

آدم پور بھاگلپور میں ایک یہودی کی کوٹھی ہے جس میں ایک معمر مسلمان چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا بڑے قلعی دار لوٹے سے وضو کر رہا ہے۔ صورتاً انگریز اور سیرتاً مشرقی تہذیب کا یہ وجیہہ انسان ہے جو میدان سیاست کا شہسوار بھی ہے اور بزم سخن کا صدر بھی۔ اس کی کرسی سیاست قابلیت، علم، عمل، ادب و شعر کے درباروں میں یکساں بچھتی ہے۔

کبھی میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے فائلیں دیکھ رہا ہے اور کبھی عدالت میں زنجیر انصاف کو حرکت دیتے ہوئے مستغیث کی حیثیت سے صدائے احتجاج یوں بلند کر رہا ہے کہ مجمع پر سناٹا ہے۔ انگریزی ادب کا ایک بحر ذخار ہے کہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ قانون کی گتھیاں ریشمیں ڈوری کی طرح کھل رہی ہیں۔ مقنن کی حیثیت سے سارے بار میں اس کی دھاک ہے۔

دوسری طرف تقسیم ہند کا مسئلہ سامنے آتا ہے مسلم لیگ کی صدارت کا سوال ہے اور بلا اختلاف اسی عظیم ہستی کو منصب ذ ر منتخب کیا جاتا ہے۔ وکلا اسے چچا سے مخاطب کرتے ہیں اور تجار حضور سے، ادیب اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں اور فضلا اس کے علم کو دیکھ کر جھک جاتے ہیں۔ شرفا کی مجلسیں اس قطن کی منتظر رہتی ہیں جس کی گھنٹی سننے کے لیے مجمع گوش بر آواز ہے۔

سرمایہ داروں کا سب سے بڑا دشمن "بدنام مگر عزت دار، بہادر، تیز طبیعت" نہیں باوا کہتا ہے۔ آپ سمجھے نہیں، یہ ہیں ہمارے ہر دلعزیز چچا ابوالحسن۔

آئیے ان سے آپ کو ملاؤں دیکھئے نا، ان کا وجیہہ چہرہ، بھرا ہوا جسم، لحیم و شحیم اعضا، سرخ رنگت، بھاری آواز اور رشاندار مونچھوں ـ سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، یہ تو خلق مجسم ہیں، یہ اپنا رعب جمانے کے لئے صرف مونچھوں میں مسکرا کر خاموش نہیں رہ جائیں گے بلکہ آپ ان کے منہ سے اس وقت تک گل افشانیاں سنتے رہیں گے جب تک آپ کا وقت آپکو اجازت دے، بات کرتے ہوئے سراسر ریشم کی ڈور کھلتی ہوئی معلوم ہوگی، یہ ارود بولے نہیں ہیں موتی تولتے ہیں ذرا آگے بڑھئے لیجئے وہ کرسی سے کھڑے ہوگئے۔

اخاہ! بیٹا نقی! اچھے ہو نا، آؤ بیٹھو، کھائی

پائے لانا چاہئے

میں تو یہ جانتا ہی تھا کہ کلام کی فرمائش شرط ہے لیجئے ان سے خود ان کا کلام سنئے۔ کوئی بیاض یا تھ میں نہیں ہیں تو یہ جانتا ہی تھا کہ حافظے پر زور نہیں ڈالنے اشعار ہیں کہ روانی سے چلے آ رہے ہیں اور ہم عقیدت و تحسین کا خراج خلوص کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

دعوائے [illegible] الحق [illegible] مل گیا [illegible]

[illegible] ہو [illegible] دار کے آگے

ظاہر ہے [illegible] کا [illegible] تھا جو ہمارے ابوالحسن چچا کا کردار بن گیا تھا۔ حق بات کہتے ہوئے نہ کبھی ڈرے اور نہ کبھی ڈرتے ہوئے حق بات کا اعلان کیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب بھاگلپور فرقہ وارانہ فساد سے مشتعل تھا اس وقت بھی ان کی نغمگی اسی ٹھاٹھ سے ہندو آبادیوں سے گذر کر مسلم محلوں تک پہنچتی رہی۔ شعر صرف شعر کی حد تک نہیں بلکہ ہمارے چچا کے کردار کا صحیح مرقع بھی ہے۔

اور سنئے!

زاہد مجھے کافر نہ سمجھ چشم تو وا کر

ہیں خاک شفا رکھتا ہوں زنار کے آگے

تعقیب نماز کا طول، مصلے پر خشوع و خضوع کا عالم اور خاک شفا کی پاکیزہ تسبیح کا انگلیوں میں حرکت کرنا اور پھر کرنے کے پیچھے رہے گلے ہیں یہی بیتا موصوف کا روزانہ کا معمول تھا۔ اکثر خاک شفا کی اس تسبیح کو آنکھوں سے لگا کر گریہ فرماتے تھے اور پھر آنسوؤں سے پاک کرکے گلا میں پہن لیتے تھے۔

بھاگلپور کے طویل قیام کا سلسلہ ہے۔ وطن مالوف شیخپورہ ہے اور حسین آباد کا ذکر چھڑ جاتا ہے گہر افشاں ہوتے ہیں۔

کسی کے دل کو دکھانے سے کیا ملا تم کو

وطن کا ذکر غریب الدیار کے آگے

بات حسین آباد و شیخپورہ کی عقیدت مندانہ عزہ داری تک جا پہنچتی ہے اور سلام کے اشعار سے فضا کا تقدس زیادہ پاکیزہ ہو جاتا ہے

ایک سن رسیدہ ضعیف العمر گورا چٹا انسان جس پر عربی کی مثل اشتعل الراس شیبا پوری طرح منطبق ہے آبدیدہ آنکھوں میں اپنا رقیق دل سنبھالے سنا رہا ہے۔

ہم اپنے ہاتھوں میں حق کا کلام لیکے چلے

سلامتی حشر کے دن کا پیام لے کے چلے

جگر میں سوز نہاں تشنہ کام لیکے چلے

غم حسین علیہ السلام لے کے چلے

اور پھر ہوتے ہوتے ایک خالص تصوف کا شعر ملاحظہ فرمائیے۔

عجب طرح کی یہ بات ہے جہاں والو

چلے جو گھر سے تو قید دوام لیکے چلے

حیات و موت اور پھر ایک سلسلہ حیات مسلسل، قید دوام نہیں تو اور ہے کیا؟

دکھے نہ دل کسی انساں کا اپنی باتوں سے

بشرز تیغ زباں بے نیام لے کے چلے

اپنی فطری منکسر مزاجی، مرنجاں مرنج احساس اور دوسروں کے جذبات کا مناسب احترام مرحوم کی فطرت بلکہ جبلت بن گئی تھی جن کا عکس آپ کو مذکورہ شعر میں صاف ابھرتا ہوا

دکھائی دے گا۔

کہاں وہ حشر کا میدان کہاں بستر لیکن
محمد عربی انتظام لے کے چلے

یہ ہے اس انسان کی عقیدت جو اعزاز کی کرسی پر سب سے بلند اور مقام عقیدت میں ایک بھکاری دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں خدا پرست خودی اسی کو کہتے ہیں۔ سلام کے آخری حصوں میں اشعار جگر تراش ہوتے جاتے ہیں۔

خدا کی دین کا سکہ بٹھا یا سر دیکر
حسین کفر سے یہ انتقام لے کے چلے

آنسو کا بہاؤ نہیں رکتا، آواز میں ارتعاش ہے، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور ہونٹ لرز رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

چلے جو آخری حجت کو شاہ اعدا سے
حسین ہاتھوں پہ حق کا کلام لے کے چلے

شہادت حسین کے بعد ہی مرد مومن کو اپنی بات یاد آجاتی ہے۔

اکیلے قبر میں تا حشر جب کہ رہنا ہے
تم اپنے ساتھ یہ کیوں اژدہام لیکے چلے

مگر اژدہام نہ پوچھئے۔ بلا تفریق مذہب و ملت خراج عقیدت پیش کرنے والوں کی نہ اس وقت کمی تھی نہ آج ہے۔

الحاج جناب مولوی قاسم صاحب فرماتے ہیں مرحوم کا آخری شعر تھا سنئے۔

سلام خدمت آقا میں نذر کر کے حسن
چلے جہاں سے یہ جنت مقام لیکے چلے

انشاءاللہ جنت کے آرام گاہ ہونے میں کوئی شک ہی نہیں۔ مگر میں نے مرحوم سے آخری غزل کا آخری شعر آخری بار سنا تھا جو مجھے یاد بھی رہ گیا۔ میں اسے بھی پیش کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

ٹوٹی قبر [illegible]
لے حسن عمر کی کشتی کا یہی ساحل ہے

مرحوم کا سایۂ عاطفت بھاگلپور کی بزم سخن سے [illegible] روح سے گفتگو ہو رہی ہے۔

سوالات کو تنگی گنجائش کے پیش نظر نظر انداز کرتے ہوئے صرف جوابات حاضر خدمت ہیں، بیٹا تم تو جانتی ہی ہو وطن مالوف شیخپورہ حسین آباد ضلع مونگیر ہے پیدائش ۱۸۷۹ء میں انتقال ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو ہوا۔

بھاگلپور میں بود و باش کا آغاز ۱۹۱۰ء سے کیا گیا۔

فن خطاطی میرے استاد مظہر صاحب کا فیض ہے

سب سے پہلا مقدمہ بھاگلپور کے مشہور مقنن بابوجی بابو نے دیا۔ ایک اشرفی فیس سے پریکٹس کا آغاز ہوا ———

پہلی منسوب خاندان میں ہی تھی، مگر شادی مقدر نہ تھی انگلینڈ چلا گیا اور موجودہ بیوی (انگلش خاتون جو مسلمان ہو گئی تھیں) میری شریک حیات میں آگئیں۔

دونوں بچیوں سے تم واقف ہو لیلی (بڑی) اور نور (چھوٹی) حیدر آباد میں تاہل کی زندگی گذار رہی ہیں۔ صاحب اولاد ہیں اور خدا کا شکر ہے تمہاری چچی بھی ان کے ساتھ زندگی کے باقی دن سکون و عافیت سے گذار رہی ہیں۔ عقد ثانی اسی بھاگلپور میں کیا تھا جس سے ایک لڑکا ہے اب مشرقی پاکستان میں ہے۔ بچیوں نے تم

سے اور سروش عظیم آبادی سے کہا تھا کہ میرا کلام منتخب کرکے الگ کر دو مگر تم نہ کر سکے۔ بٹیا! وہ میری زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔ تم پر اور جمیل سلمہٗ پر میرا حق ہے پھر مسلمہٗ (ان کا بچہ) میں صلاحیت نہیں جمیل سلمہٗ دور ہیں۔ تم اور سروش مجھ سے نزدیک ہو

ایام طالب علمی کے ہم تین ہم درس تھے میں خورشید (علامہ جمیل کے پدر بزرگوار) اور حکیم محمد مہدی تینوں ہی مظہر صاحب (علامہ جمیل کے جد امجد) کے شاگرد تھے۔ تینوں میں ایک شاعر و ادیب دوسرا حکیم و تیسرا بیرسٹر ہوا۔ تینوں کی صلاحیتیں اپنے اپنے مقام پر منفرد رہیں۔ سب سے پہلے حکیم محمد مہدی کا پادشاہ نواب گزری کے یہاں انتقال ہوا (ان کے طبیب خاص تھے) اور پھر خورشید چھوڑ گیا، اور آخر میں یہ مثلث کا تیسرا زاویہ بھی شکستہ ہو چکا ہے۔ خدا تم لوگوں کو سلامت رکھے اگر اب بھی یہ کام کر گذرو تو ہماری روح کے لئے مزید سکون کا سبب ہو۔

آخر میں یہ التماس ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے مرحوم کے کلام کی بہت کافی جستجو کی ہے اور اب تک مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس لئے جو کچھ حافظے کی عمیق ترین گہرائیوں سے نکال کر پیش کر سکا ہوں اسی پر اکتفا کرتا ہوں مگر سروش بھائی کے کاندھوں پر یہ بار جوں کا توں ہے۔ دیکھیں وہ کب سبکدوش ہوتے ہیں۔

اذکروا موا تکم بالخیر

جناب وصی احمد صاحب مرحوم!

گولہ گھاٹ

وقار عندلیب عظیم آبادی
کٹرہ ابو تراب لکھنؤ

ہزاروں سال پہلے انسان جب غاروں میں رہتا تھا اور شکار پر زندگی گذارتا تھا تو اس وقت ایسے لوگ جو باعمل اور جرأت مند تھے وہ صبح سویرے شکار کی تلاش میں نکل جایا کرتے تھے لیکن سست طبیعت اور دون ہمت اپنے غاروں میں ہی بیکار بیٹھے رہتے تھے لیکن انسان ساکت و سامت بیٹھا رہے یہ امکان سے باہر ہے، زندگی حرکت کا نام ہے وہ جس قسم کی بھی ہو ایسے لوگ اپنی زندگی کا ثبوت ذہنی پرواز سے دیا کرتے تھے غار کے پتھروں پر مختلف قسم کے خطوط کھینچتے تھے یا نقش و نگار بناتے تھے یہی چیز آگے چل کر بت تراشی اور نقاشی میں بدل گئی اور جیسے جیسے اپنے اپنے احساسات اور جذبات کو لفظوں میں ادا کرنے کی صلاحیت انسان بڑھاتا گیا ویسے ویسے ادب و شعر ارتقا پذیر ہوتا گیا جو لوگ شکار کو جایا کرتے تھے وہ واپس لوٹ کر اپنے مشاہدات کا تذکرہ آپس میں کیا کرتے تھے یہی مشاہدات کا بیان، داستان افسانہ، اور کہانی کی شکل میں بدلتا گیا۔ داستان گوئی ایشیائی ادب کا قدیم فن ہے سنسکرت زبان میں اسکے اعلیٰ نمونے ایسے ملتے ہیں جس پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہے۔ الف لیلیٰ بھی داستان در داستان کا ایک ایسا نادر کلاسکل نمونہ ہے جسکی مثال نہیں۔

ہندوستان کے راجاؤں نوابوں اور بادشاہوں کے درباروں میں بھی داستان گو رہا کرتے تھے جنکی ذہانت، ذکاوت مضمون آفرینی اور فنکاری وہ وہ گل کھلاتی تھی جسکو آج پڑھ کر انسان متحیر ہو جاتا ہے کسی دربار کے داستان گو کا واقعہ ہے کہ کسی کام سے اسے باہر جانا تھا اس نے اپنے شاگرد کو چارج دیتے ہوئے بتایا کہ داستان جو میں نے شروع کی ہے وہ ابھی یہاں تک پہنچی ہے کہ بادشاہ سلامت دربار عام میں جلوہ فرما ہونے کی تیاری کر رہے ہیں، چھ ماہ کے بعد جب وہ داستان گو واپس آیا تو اسکے شاگرد نے چارج دیتے ہوئے کہا کہ میں نے چھ ماہ میں جو داستان سنائی ہے وہ بس یہاں تک پہنچی ہے کہ بادشاہ سلامت نے دہلیز پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔

داستان گوئی کی طوالت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو جاتا ہے یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب انسان آج کی طرح مصروف نہ تھا لیکن جیسے جیسے مصروفیتیں بڑھتی گئیں وقت کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوتا گیا مغربی ادب سے جب ہم آشنا ہوئے تو افسانہ نگاری کا فن اردو میں بھی ترقی کرنے لگا۔

مختصر داستان یا کہانی کو افسانہ کہتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ختم ہو جائے ویسے دنیا کی مختصر ترین کہانی دو منٹ میں ختم ہوتی ہے۔ اردو ادب کو جن افسانہ نگاروں نے مالا مال کیا ہے ان میں منشی پریم چند، نیاز فتح پوری منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، شین مظفر پوری، سہیل عظیم آبادی

انور عظیم، شکیب ایاز، کلام حیدری، اختر اورینوی، شکیل الرحمٰن، صمد حمیدی، زکی انور، شفیع جاوید، وہاب اشرفی، محمود واجد، علی حسن ساجدی، مشتاق شاہد، وہ بہت سارے فنکار ہیں جن کا نام گنوانا طوالت کا باعث ہوگا۔ ادب سے تھوڑی سی دلچسپی رکھنے والے احباب ذوق خود واقف ہیں۔

افسانہ نگاری کے عنوانات اور موضوعات میں اس قدر تنوع ہے کہ اس مختصر سی مضمون میں سب کا احاطہ کرنا ممکن ہے اور غیر ضروری بھی، مجھے تو اس مضمون میں وصی احمد مرحوم کے افسانوں پر روشنی ڈالنی ہے جو ایک ایسے افسانہ نگار تھے جن کا خاص موضوع سراغ رسانی ہوتا ہے۔ وصی احمد صاحب نے یوں تو زندگی کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے مگر مرکزی رجحان جاسوسی انداز تحریر رہا ہے۔ آیئے ہم وصی احمد صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کا مشاہدہ کریں۔

گولہ گھاٹ گنگا کے ساحل پر واقع بھاگلپور جیسے عظیم شہر کا ایک محلہ ہے۔ یہ محلہ اپنے جلو میں بہت سارے ارسٹوکریٹ خاندان کو لئے ہوئے ہے۔ اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، شیعہ بھی ہیں، اور سنی بھی، شہر کی مشہور شیعہ مسجد اسی محلہ میں واقع ہے جہاں حضرت مولانا سراج الحسن صاحب قبلہ جیسی عظیم علمی شخصیت آج کل پیش نماز ہے۔ جناب سید محمد وصی احمد صاحب مرحوم کا مکان عین گنگا کے کنارے ہے اور اپنی عظمت رفتہ کی تاریخ زبان حال سے گزرنے والے کو سنا رہا ہے۔ وصی احمد مرحوم ذی علم جدید تہذیب کے دلدادہ اور اخلاق و مروت کے مرقع تھے۔

بھاگلپور کی ہر سوسائٹی میں آپکو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بنگالی، بہاری، پنجابی، مارواڑی ہر سماج میں آپکے قدردان موجود تھے۔ شہر میں جو ارسٹوکریٹ شہریوں کا کلب ہے اس کے مرحوم ایک زندہ دل رکن تھے انگریزی اور اردو ادب کے مطالعہ کا ستھرا ذوق رکھتے تھے شہر کے پرانے رئیسوں میں تھے۔ اپنے بچوں کی تربیت اور تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے جس کا ثمرہ ہے کہ تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور زندگی کے میدان میں نہایت کامیاب آپ نے جہاں مختلف فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھی وہیں وہیں ادبی ذوق بھی رکھتے تھے، شعر گوئی کا بھی ملکہ تھا مگر مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے کبھی شریک نہیں ہوئے، افسانہ نگاری کی طرف رجوع ہوئے تو بے شمار مختصر اور طویل افسانے لکھے جن میں چار افسانے مجھے ملے ہیں، ان افسانوں کو پڑھ کر وصی احمد صاحب کی نثر نگاری کے خدو خال سمجھ میں آتے افسانہ کی تکنیک عہد بہ عہد اپنا روپ رنگ بدلتی رہی ہے جس عہد کے نمائندہ وصی احمد صاحب مرحوم تھے اس عہد کی نمایندگی یقیناً آپکے افسانے میں ہوتی ہے افسانے کی تکنیک میں جو اجزا ہیں وہ وہیں ابتدا انتقاد، عروج اور اختتام اس کے ساتھ ساتھ افسانے کا پلاٹ اور کردار نگاری کا آرٹ ان تمام جہتوں سے وصی احمد صاحب کے افسانے کو پرکھا جاتا ہے تو آپ اپنے وقت کے ایک اچھے افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں،

"سرخ جنگ" کے عنوان سے آپ نے جو افسانہ لکھا ہے اس میں ایک بچے کی غلط تربیت نے اسکو اپنے سوتیلے بھائی کا دشمن بنا دیا جسکا نفسیاتی طور پر تجزیہ کر کے فنکار نے راز دروں کو فاش کیا ہے اور جو اصل رگ ہے اسکی نشان دہی کرتے ہوئے اسکے علاج اور سدھار کی کوشش کی ہے۔ انداز تحریر جاسوسی ہے جو وصی صاحب کا خاص رنگ ہے۔ آپ جس افسانے کو پڑھئے اس میں سراغ رسانی کا کردار ملے گا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا فطری رجحان سراغ رسی کی طرف تھا

اگر علمی حصہ اس کام میں لیتے تو ملک کے ایک عظیم سراغ رساں میں وصی احمد صاحب کا شمار ہوتا، ایک افسانہ ہے جسکا عنوان ہے "فریب"، یہ بھی ایک جاسوسی کہانی ہے جس میں خاص کردار ایک مجرم کا ہے جو کبھی جاپان کے کسی تھیٹریکل کمپنی میں ملازم تھا۔ اور جرم کی پاداش میں وہاں کے جیل میں تھا موقع ملنے پر بھیس بدل کر جیل سے فرار ہو جاتا ہے اور ہندوستان میں آکر لوٹ مار، دھوکہ، فریب، وغیرہ جیسے زبوں کام کرنے لگتا ہے انجام کار اپنے اعمال بد کے صلہ میں کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے، اس افسانے میں مجرم اور جرم کا فنکارانہ تجزیہ کر کے اور اس کے انجام بد کو دکھلا کر افسانہ نگار نے قارئین کو صالح سمت کی طرف رجوع کیا ہے۔ تیسرا افسانہ ہے "آخری ہنسی" اس افسانہ میں ایک ایسے کردار کو پیش کیا گیا ہے جس کو کچھ لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو غیر حقیقی سمجھیں مگر یہ دنیا عجیب وغریب ہے یہاں انسانوں میں اگر ایک طرف ایسے ولی صفت ملتے ہیں جنکی سیرت، عصمت، حرمت کی قسم کھائی جا سکتی ہے تو دوسری طرف ابلیس نفس کریہہ المنظر اور زشت اعمال انسانوں کی بہتات ہے انسان کے مختلف طبائع ہوتے ہیں جن سے مختلف اعمال کا ظہور ہوتا ہے کچھ بد نصیب ایسے بھی ہیں جنکی جنسی بھوک جب نقطۂ عروج کو پہنچتی ہے تو ہر عورت پر انکی حریصانہ نگاہ پڑتی ہے خواہ وہ کوئی ہو انکی ماں، بہن ہو، بیٹی ہو، یا کوئی اور، "آخری ہنسی" کا کردار ایک ایسا بد طینت انسان ہے جسکی بدبختی عروج پر آئی تو اس نے اپنی سوتیلی بیٹی پر حریصانہ نگاہ ڈالی عشق کا ڈھونگ رچا معصوم لڑکی کو اپنے دام فریب میں لا کر فرار ہو گیا، یہ کہانی زلزلہ انگیز اور آج کے اونچے سماج کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ چوتھی کہانی کا عنوان ہے "آخری فتح"، یہ کہانی ایک ہیرے کی چوری کے گرد گھوم پھر کر مکمل ہوتی ہے۔ ہوس زر پرستی کا یہ افسانہ جیتا جاگتا نمونہ ہے اس افسانے میں فنکار نے سراغ رسانی کی مہارت کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے کہانیوں میں ملکی اور غیر ملکی، فضا کی اچھی خاصی آئینہ داری کی گئی ہے افسوس یہ ہے کہ ماہنامہ "سہیل" کا یہ خصوصی نمبر اپنے دامن میں اتنی گنجائش نہیں رکھتا کہ شاعر وادیب کے فن پاروں کے نمونے بھی شامل کئے جا سکیں ورنہ قارئین ان چار افسانوں میں سے اگر ایک بھی پڑھ لیتے تو انہیں وصی احمد صاحب کے زور قلم کی داد دینا ہی پڑتی۔

زبان و بیان کی خوبی و خامی سے قطع نظر جو بات مجھے ان چار افسانوں میں نظر آئی وہ ہے افسانہ نگار کی جدت فکر، وصی احمد صاحب نے زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور زمانے کے رنگ و آہنگ سے خوب خوب واقف رہے ہیں خود ایک اونچے خاندان کے فرد تھے اور ہمیشہ اعلیٰ خاندانوں کے افراد سے آپکا تعلق رہا ہے اس لئے ایسے گھرانوں کی زندگی کا مطالعہ مرحوم نے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا اور چونکہ طبیعت کا رجحان ادیبانہ تھا اس لئے اپنے تجربات اور محسوسات افسانے کے رنگ میں پیش کرنے کی سعی کی جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

نوٹ

مجلس اشاعت بھاگلپور کے سکریٹری جناب حکیم عبدالباقی صاحب نے وصی احمد صاحب مرحوم کے افسانوں کیساتھ مرحوم کے بارے میں جو خاص تعارفی نوٹ لکھ بھیجا تھا اس کی روشنی میں نا چیز نے یہ مضمون لکھ دیا ہے اسلئے تشنگی کی ذمہ داری حکیم صاحب موصوف پر ہے

بھاگل پور کی ایک شاعرہ

حکیم محمد عبدالباقی حکیم

پیش نظر خصوصی نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں بھاگلپور شہر کے مختلف محلوں میں جب گئے اور وہاں کی اہم شخصیتوں سے مل کر بھاگلپور کی ادبی تاریخ معلوم کیا تو عجیب عجیب انکشافات ہوئے انہیں میں سے ایک اہم انکشاف محلہ بھیکن پور میں یہ ہوا کہ اس محلہ میں ایک شاعرہ گزری ہیں جن کا نام محترمہ تسلیماً بی بی تھا اور تخلص مغفورہ' ان کے خاندان میں جب میلاد شریف کی مجلس ہوتی ہے تو مرحومہ کا قلمی میلاد نامہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ بزرگ خاتون شہر کے مشہور و معروف وکیل اور ادب دوست جناب علی عمر خاں صاحب کی دادی تھیں۔ انکشاف ہوتے ہی میں احباب کے ساتھ جناب علی عمر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور "میلاد تسلیمی" کے بارے میں ذکر کیا۔ موصوف نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور فرمایا کہ اس میلاد نامہ کے علاوہ اور بھی کلام مرحومہ کا ہے لیکن کہاں ہے یہ نہیں معلوم' وکیل صاحب موصوف نے اپنی علالت کے باوجود ادھر ادھر تین الماریوں میں تلاش بھی کیا لیکن میلاد تسلیمی کے سوا جب کوئی چیز اور نہ ملی تو مجبوراً میں اسی کتاب کو ایک دن کے لئے لے آیا جناب علی عمر خاں صاحب بہت معروف وکیل ہیں ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ یکسو ہو کر اس قسم کی چیزوں کی تلاش کر سکیں۔ مگر جب کبھی بھی یہ چیزیں حاصل ہو جائیں گی انشاءاللہ ان پر مضمون لکھ کر کسی ادبی پرچہ کو دیدیا جائے گا۔

زیر نظر مقالہ میں صرف "میلاد تسلیمی" کو پیش نظر رکھ کر بی بی تسلیما خاتون علیہا الرحمتہ کے فکر و فن پر کچھ باتیں کی جائیں گی" میلاد تسلیمی ایک قلمی نسخہ ہے اس میں "حمد" باری تعالیٰ، نعت سرور کائنات صلعم، فضیلت میلاد اور سلام کے علاوہ ایک "نظم" دنیا کی بے وفائی کے عنوان سے ہے

مسماۃ بی بی تسلیما خاتون آخری عمر میں بینائی کی نعمت سے محروم ہو گئی تھیں جس کا بڑے دردناک انداز میں مرحومہ نے اشعار میں جابجا تذکرہ کیا ہے مغفورہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک سچی عاشق رسول تھیں اور حج بیت اللہ شریف نیز زیارت گنبد خضریٰ کے لئے ان کی روح عمر بھر تڑپتی رہی۔ آج کے ماحول کو دیکھ کر رجبکہ عورتیں بظاہر بڑی ترقی یافتہ ہو چکی ہیں لیکن حقیقت میں اس نیک سیرتی کی نعمت سے محروم ہیں جس کے ہوتے ہوئے مسلمان بچے ماں کی آغوش میں دین کی دولت سے مالامال ہو جایا کرتے تھے) دل یہ چاہتا ہے کہ اے کاش

کہ! ہر گھر میں بی بی تسلیما مغفورہ جیسی نیک خصلت اور پاک طینت خاتون آج بھی ہوتیں۔ آج کی دنیا ایسی خاتون کو ممکن ہے علم سے بے بہرہ سمجھے مگر جس علم کو دراصل علم کہتے ہیں اور جس کے ذریعہ آدمی عرفان خداوندی حاصل کرتا ہے وہ علم کی دولت بی بی تسلیما کو حاصل تھی۔ حمد باری تعالیٰ میں مرحومہ کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ سے

کروں حمد کیا خالقِ دوجہاں
بنایا ہے جس نے یہ کون و مکاں
بھلا میری ایسی کہاں ہے زباں
کہاں میرا منہ اور کہاں اسکی شان
تمامی شجر کا بنے گر قلم
صفت اس کی ہو گی نہ ہرگز رقم

اسی طرح نعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ فرماتی ہیں

کروں نعت میں سرورِ کائنات
وہ محبوب معبودِ حق پاک ذات
ہے مختار ہم عاصیوں کا وہی
مددگار ہم عاصیوں کا وہی

ہئیت انداز بیان اور زبان کی چاشنی تلاش کرنے والی طبیعتیں معنی کی دلپذیری اور جاں نوازی سے آشنا نہیں ہو سکتیں۔ مگر اپنے پہلو میں مومن کا دل رکھنے والی شخصیتیں مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر مست و بیخود ہو جائیں گی۔ سب سے لطیف ذکر اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یہی دولت کونین ہے جس کسی کو یہ سعادت دارین حاصل ہو گئی اس کو اس دنیا اور آنے والی ہمیشہ کی زندگی میں راحت ہی راحت ہے

بی بی تسلیما خاتون مغفورہ علیہا الرحمتہ کے نعتیہ اشعار میں دل والے حسن بیان کی چاشنی تلاش نہیں کریں گے وہ حسن معنی کی وجد آفریں کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہیں گے۔ اسی قسم کے قارئین کے لئے "میلاد تسلیمی" سے مندرجہ ذیل اشعار پیش کر رہا ہوں

کروں شکر حق کو ن منہ سے ادا
محمد سا ہم کو پیمبر ملا
نکیرین سے بھی نہیں ڈر ہے کچھ
کہوں میرا احمد پیمبر ہوا

بنایا ہے خداوندا نے ختم الانبیاں کو
یقیناً میرا جاگا ہے میرے رہبر محمد ہیں
نہیں ہے خوف مجھ کو تشنگی حشر کا اصلا
ملا ہے ساقیٔ کوثر مرے رہبر محمد ہیں
ہوئی ہوں جیسے میں اندھی اندھیرا ہو گیا ہے سب
اجالا ہو لحد میرا مرے رہبر محمد ہیں
عبادت اور ریاضت تو کبھی میں نے نہ کی مولا
سہارا مجھ کو ہے تیرا مرے رہبر محمد ہیں
بہت ہی خواری دنیا ہے میرے واسطے مولا
چمن دنیا دہاں مولا! مرے رہبر محمد ہیں
سوا نیزے پہ جب سورج نکل کر یہ ملا ہوگا
ہمیں سایہ کریں زہری مرے رہبر محمد ہیں
عمل میرا ترازو ئے عمل میں جب دیا جاوے
تو پلہ میری نیکی کا جھکا دینا مرے رہبر محمد ہیں
یہ مغفورہ ترے در پہ نالاں و گریاں ہے
معافی ہو گنا ہوں کی مرے مولا مرے رہبر محمد ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں ایک مومنہ کا دل بول رہا ہے۔ جہاں دینی عقیدہ کو مغفورہ نے نظم کر دیا ہے۔ وہیں اپنے دل کی کڑک اور کسک کا بھی اظہار کیا ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری اور رہنمائی پر کتنا کامل یقین ہے یہ ان اشعار سے خود ظاہر ہو جاتا ہے۔ مغفورہ اللہ عزوجل سے فرماتی ہیں کہ میرے ہادی و رہبر احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے میرے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ میرے نیک اعمال کے پلہ کو جھکا دیا جائے اور مجھے بخش دیا جائے اس لئے کہ سرکار میرے رہبر ہیں سوا نیزے پر قیامت کے دن جب سورج ہوگا تو مغفورہ فرماتی ہیں کہ مجھ پر حضرت فاطمہ زہرہ رضی سایہ کریں اس لئے کہ سرکار میرے رہبر ہیں وہ براہ راست یہ درخواست سرورِ کائنات کی خدمت میں بھی پیش کر سکتی تھیں لیکن نسوانیت نے اس مومنہ کو مجبور کیا کہ یہ عرضی خاتونِ جنت کی خدمت میں پیش کریں اس میں جو شعری لذت ہے اس سے حظ اٹھائے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

درود شریف کی فضیلت میں مغفورہ علیہا الرحمہ کے اشعار ملاحظہ ہوں

وظیفہ کرو مسلمو تم درود
یہ ہے درود افضل پڑھو تم درود
گناہی تمہاری مٹائے گی یہ
ثوابیں دلا دے پڑھو تم درود
فراغت بھی روزی میں دیوے خدا
نہ ہو تنگدستی پڑھو تم درود
یہ مغفورہ نے اپنے دل سے کہا
کرو تم نہ غفلت پڑھو تم درود

نماز کے عنوان سے چند اشعار معنوی اعتبار سے کتنے اچھے ہیں۔

پڑھو مومنو تم جو دل سے نماز
بہت فائدہ دے گی تم کو نماز
بہت تم کو رکھے گی یہ پاک صاف
کرے گی بہت صاف دل کو نماز
ستون دینِ حق کی یہ لاریب ہے
سلامت رہے دین پڑھو یہ نماز
خشوع و خضوع سے کرو گر ادا
کرے گی بہت پیار تم کو نماز

مغفورہ جیسی مومن شاعرہ کی دعاؤں کے چند اشعار بھی یاد رکھنے کے لائق ہیں۔

سن خدا فریاد میری تو خدائی کیلئے
فضل کر ہم پر تو اپنی کبریائی کے لئے
ذکر میں تیرے زباں میری رہے جاری خدا
رکھ زباں ثابت مری حمد و ثنائی کیلئے
راہ سیدھی پر چلا ہم کو مرے معبود حق
اپنے محبوب محمد مصطفائی کے لئے
صالحوں کے ساتھ میرا حشر کیجو یا خدا
بوبکر و صدیق اکبر باصفائی کے لئے
دور کر دل کی سیاہی نور میرے دل میں دے
حضرت فاروق عادل بے ریائی کے لئے
دو جہاں کے غم سے ہم کو دے رہائی یا خدا
حضرت عثمان صاحب باحیائی کے لئے

مشکلوں سے زندگی میری جو کٹتی ہے خدا
کر دے حل حضرت علی مشکلکشائی کے لیے

ساتھ ایماں کے مرا خاتمہ کیجیو خدا
صدقے اہلِ بیت حضرت با خدائی کیلئے

وقت مردن روح آسانی سے نکلے یا خدا
عرض میری ہو امام پیشوائی کے لئے

اندھی مغفورہ کی جو کچھ ہیں خطائیں یا خدا
بخش دے وہ سب خدا اپنی خدائی کیلئے

مندرجہ بالا دعا اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک مومن کے دل کی نکلی ہوئی آواز ہے۔ وہ شخص جس کا خدا کے وجود پر یقین ہے، انبیا، الہامی کتابوں اور قیامت پر ایمان ہے۔ قرآن حکیم کو عمل یلمقیں تسلیم کرتا ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی، اپنا رہبر اور پیشوا مانتا ہے۔ اس کے دل کی جو آواز ہو سکتی ہے وہ مغفورہ کی مندرجہ بالا دعا میں ہے۔ میں نے ابتدا میں یہ کہا تھا کہ مغفورہ عمر بھر حج بیت اللہ اور گنبدِ خضری کی زیارت کے لئے تڑپتی رہیں تھیں۔ مرحومہ کے اشعار پڑھ کر قارئین بھی میرے اس خیال کی تائید کریں گے

کیسے جاؤں نبی جی کے در پر قدم
نہیں رکھتی کچھ پاس اپنے درم

آنکھ میں موتیا انگ میں دکھ بھرا
ذرا بھی اٹھے ہے نہ میرا قدم

تھے دھرمی گئے جو دواری ترے
میں تھی پاپن رہی کھو کے اپنا دھرم

موری عرضی کو پہنچا دے بادصبا
ہے بانع مدینہ کی تجھ کو قسم

ہے یہ اندھی کے من میں نبی جی یہی
حشر میں کیجیو ہم پہ ارزاں کرم

ایک ہندوستانی خاتون نے اپنے لب و لہجہ میں جس مفہوم کو ادا کیا ہے اس سے متاثر ہی دل ہوگا جس میں اسی قسم کی تڑپ موجود ہو گی۔ دیکھئے مندرجہ ذیل شعر میں خانہ کعبہ کو دیکھنے کی مغفورہ کے دل میں کیسی تڑپ تھی اس کا اظہار کس عنوان سے ملتا ہے

یہ مغفورہ نہیں جیتے جی دیکھا اگر کعبہ
قبر سے لاش تو میری لے جائیے خانہ کعبہ

اس کے جلو میں جو معنی ہے اس کی گہرائی اور گیرائی کتنی پرتاثیر ہے۔ فنی سانچے میں یہ شعر کہاں تک ڈھلا ہوا ہے اس سے قطعہ نظر "میلاد تسلیمی" کا قلمی نسخہ اس قسم کے بے شمار اشعار سے بھرا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے مطالعہ سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ مغفورہ ایک دیندار خاتون تھیں وہیں اس کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ایک فطری شاعرہ تھیں۔ ماحول کے سازگار نہ ہونے کی وجہ سے فن میں جو توانائی اور حسن چاہئے تھا وہ اگرچہ نہیں ہے لیکن اس کی کمی مغفورہ کی معنی آفرینی پورا کر دیتی ہے اور معنی آفرینی صدقہ ہے ان کے ایمان کامل کا۔ اسی بات کا اس نسخہ سے پتہ چلتا ہے کہ مغفورہ اپنے وقت کے اعتبار سے بہت تعلیم یافتہ تھیں اور تربیت یافتہ بھی۔ آج بھی ملت کو ایسی دیندار خاتون کی ہر گھر میں ضرورت ہے کاش کہ! ہمیں اس طرف توجہ کرنے کی توفیق ہو۔

حضرت مولانا صفی العالم صفیؔ بھاگلپوری عرف میاں صاحب

شاغل قادری

رشد و ہدایت سنت انبیاء ہے اس سے بہتر کوئی اور انسانی خدمت نہیں ہو سکتی۔ دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر دور میں اللہ کے نیک بندوں کو رشد و ہدایت کی غرض سے دنیا کے مختلف ممالک میں جانے کا حکم ملتا رہا ہے۔ ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک میں بھی اسلام کے سفراء کا کارواں در کارواں آتا رہا اور گوشے گوشے میں پھیل کر اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے کا فرض ادا کرتا رہا ہے۔ سلطان الہند حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مخدوم بہاری چشتی قدس سرہ العزیز تک اور ان کے بعد کے اسماء گرامی کا شمار کرایا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اولیاء اللہ کے تذکرے اردو زبان میں بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ جن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے اولیائے کرام میں حضرت مولانا شہباز رحمۃ اللہ علیہ کا بلند و بالا مقام ہے۔ مجھے اس پر اس مضمون میں کوئی روشنی نہیں ڈالنی ہے۔ مجھے تو حضرت کی مسند رشد و ہدایت پر جو موجودہ بزرگ حضرت مولانا سید شاہ صفی العالم مدظلہ العالی جلوہ فرما ہیں۔ ان کے کارناموں کی صرف ایک مشق یعنی خدمت شعر و سخن کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ اردو ادب کی پوری

تاریخ گواہ ہے کہ یہ زبان خانقاہوں میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ ہر خانقاہ میں بزرگوں کے ملفوظات اور نعت و حمد کے ساتھ غزلوں کے دیوان کی موجودگی زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ بزرگان دین نے اہل ہند کو جہاں جہنم کی آگ سے بچانے کی جد و جہد کی ہے وہیں یہاں کے تہذیبی اور تمدنی پودے ہی عرب و ایران کے تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی پودے کا قلم لگا کر ایک شاندار تہذیب کا چمن سجایا ہے۔ خانقاہ شہبازیہ کے دارالمطالعہ میں بزرگوں کی تصانیف بے شمار بزرگوں کے قلمی نسخے نہ صرف عربی اور فارسی میں موجود ہیں بلکہ ایک گراں بہا خزینہ اردو میں بھی اسی سلسلہ کے ایک بزرگ جناب مولوی سید محمد فائق صاحب مرحوم فارسی اور اردو کے نہ صرف شاعر تھے بلکہ فن شعر و سخن پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ فائق صاحب مرحوم موجودہ صاحب سجادہ" میاں صاحب" حضرت مولانا سید شاہ صفی العالم کے نانا تھے۔ جن کی تعلیم و تربیت کا اثر حضرت میاں صاحب پر بہت زیادہ ہے اور ہر بات میں موصوف اپنے نانا رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

رہتے ہیں۔

حضرت میاں صاحب نے مشق سخن کا آغاز باضابطہ طور سے ۱۹۵۴ء سے کیا۔ ابتدا نعت سے ہوئی۔ اس کے بعد نعت و غزل کہنے کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ حضرت فائق رحمۃ اللہ علیہ آپ کی تخلیقات پر اصلاح فرماتے تھے۔ موصوف کی اصلاح کردہ ایک غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں

باقی دل میں ایک حسرت رہ گئی
دیکھنے سے ان کی صورت رہ گئی

یہ اثر حسن تکلم کا ترے
لب پہ آ آ کر شکایت رہ گئی

دوسری غزل کے دو اشعار یہ ہیں

تمہاری محبت نے یہ دن دکھائے
کہ پھرتا ہوں دامن سے منہ کو چھپائے
زمانے کی نیرنگیاں اللہ اللہ
کوئی رو رہا ہے کوئی مسکرائے

ابتدا کی یہ دو غزلیں کلکتہ سے شائع ہونے والے روزنامہ "الحق" کے سوموار ایڈیشن "انصاف" میں شائع ہوئی تھیں۔ ایک نعت جو بھاگلپور سے شائع ہونے والے ایک کتابچہ "کہکشاں" میں چھپی تھی۔ اس کے دو اشعار ہیں۔

ترانہ نعت کا ہم گا رہے ہیں
ملک جن و بشر سب آ رہے ہیں
صفی یہ فیض شہبازی ہے بیشک
مضامیں نعت کے خود آ رہے ہیں

اسی بحر میں چند غزلیں بھی ہیں جن کے چند اشعار ہیں

وہ جلوہ بام پر دکھلا رہے ہیں
دل عشاق کو تڑپا رہے ہیں
ہوائے دہر کو عبرت سے دیکھو
ہزاروں آ رہے ہیں جا رہے ہیں
برے ہوں یا بھلے سارے کے سارے
جو جیسا کر رہے ہیں پا رہے ہیں
مریض عشق جنت کو سدھارا
کہے اب دیکھنے وہ آ رہے ہیں

شاعری میں دراصل حضرت میاں صاحب اپنے نانا جان حضرت فائق مرحوم سے متاثر ہیں۔ ویسے ان شعراء سے اثر زیادہ قبول کرتے ہیں جن کے اشعار میں سادگی نفاست اور کچھ ایسے انداز ہوں جنہیں اپنا پن محبت اور خود اعتمادی کے جذبات کے ساتھ شعر سے ذوق کی جلوہ گری ہو جیسے حضرت امیر مینائی داغ، حسرت، جگر، اصغر اور بیدم وارثی وغیرہ۔ ایسے اشعار جن میں ادق اور بہت ہی مشکل الفاظ پائے جاتے ہیں وہ حضرت میاں صاحب کے ذوق پر بار ہوئے ہیں۔ اردو کے متعدد موقر جرائد میں آپ کی غزلیں اور نعتیہ کلام برابر چھپتا رہتا ہے۔ جیسے تاج کراچی، المجیب پھلواری شریف، پگڈنڈی امرتسر، سہیل گیا، سنی لکھنؤ، سیرت بنارس، پیام مشرق دہلی وغیرہ، اس کے علاوہ تذکرہ مسلم شعراء بہار، کراچی میں بھی آپکا تعارف شائع ہوا ہے، گو بہت تشنہ ہے۔ ماہنامہ سہیل گیا کے اکتوبر ۵۵ء کے شمارہ میں جو غزل شائع ہوئی تھی اس کے چند اشعار ہیں۔

وہ درد کیا جو ہمیں بے قرار کر نہ سکے

وہ سوز کیا جو ہمیں اشکبار کر نہ سکے
خدا ہی جانے پھر انداز زیست کیا ہوگا
اگر علاج غم روزگار کر نہ سکے
پلا دی زہر ملا کر شراب ساقی نے
کچھ امتیاز مگر بادہ خوار کر نہ سکے
بیک نگاہ کیا رند نے وہ کام جسے
ہزاروں زاہد شب زندہ دار کر نہ سکے

مارچ ۱۹۵۶ء کے پگڈنڈی میں "آیا نہ قرار آخر" کے عنوان سے جو کلام شائع ہوا تھا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

تقصیر ہوئی کیا کچھ یا یوں ہی ہے رنجیدہ
کچھ بھی تو بتا مجھ کو اے جانِ قرار آخر
چلنا رہِ الفت میں کچھ سہل نہیں ہمدم
کتنوں نے ہے اس رہ میں کی راہ فرار آخر
شاداب و حسیں غنچے مرجھائے رہے لیکن
بھولے سے بھی گلشن میں آئی نہ بہار آخر
اے ساقیٔ میخانہ! یہ بات نہیں کھلتی
کیوں روٹھ گئے تجھ سے سب بادہ گسار آخر

حضرت میاں صاحب ایک گوشہ نشیں بزرگ ہیں جنہیں ورد و وظائف سے اگر فرصت ملی تو خلق اللہ کی خدمت اور ان کے دکھوں کے مداوا کرنے میں کافی اوقات صرف ہو جاتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کے باوصف وہ زمانہ کے تیور سے بخوبی واقف ہیں۔ نومبر ۵۶ء کے پگڈنڈی امرتسر میں آپ کے یہ اشعار ملتے ہیں

کرے تاراج خود جو گلستاں کو
نہ رہنے دیں گے ہم اس باغباں کو
نہیں اب چاہیئے ایسی سیاست
جو کر دے منتشر امن و اماں کو
ابھی اس راہ سے اے دوست مجھ کو
ہٹانا ہے کئی سنگ گراں کو

دیکھا آپ نے غزل کے اشعار میں عصری رجحانات کیسے تیکھے انداز سے جلوہ گر ہیں۔ پھر تغزل کے بھرپور اشعار بھی دیکھئے

سناتا ہوں ابھی روداد اپنی
ذرا تھم لینے دو اشک رواں کو
وہ سنتے کیا مرے غم کا فسانہ
کہ لے بیٹھے خود اپنی داستاں کو

مئی ۵۶ء کے ماہنامہ "سنی" لکھنؤ میں "حسن سرور" کے عنوان سے حضرت میاں صاحب کی ایک نعت شائع ہوئی ہے جس کے چند اشعار ہیں

یہ اثر دیکھو پائے اطہر کے
نقش ہوتے ہیں دل پہ پتھر کے
انبیا سارے ان کے عاشق ہیں
یہ ہیں محبوب رب اکبر کے
یہ مہ و مہر و انجم و اختر
کب مقابل ہیں حسن سرور کے
حشر کے روز سب کے سب عاصی
ساتھ ہوں گے شفیع محشر کے
شوق دیدار میں مرے آقا
دن ہیں گنتے تمہی منتظر کے

سیرت کے ربیع الاول ماہ اگست و ستمبر ۵۶ء میں

نعت سرور علیہ السلام کے عنوان سے جو نعت شائع ہوئی تھی اس کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں

یاد محبوب خدا صبح و مسا کرتے ہیں ہم
دل کو اپنے اس طرح تسکیں دیا کرتے ہیں ہم

کب کسی سے حال دل اپنا کہا کرتے ہیں ہم
جو گذرتی ہے اسے چپکے کہا کرتے ہیں ہم

ہے مدینے میں شفاخانہ مریض ہجر کا
اب وہیں چل کر دلا! اپنی دوا کرتے ہیں ہم

مجھ کو روضہ سے قریب دید تیجئے کوئی جگہ
بس یہی سرکار سے اک التجا کرتے ہیں ہم

عزم طیبہ ہے مگر ہے پاس پیسہ کچھ نہیں
یہ وہ مجبوری ہے جس پر رو دیا کرتے ہیں ہم

دل کا عالم ہی جدا ہوتا اس دم اے صفیؔ
نعت سرور جھوم کر جس دم پڑھا کرتے ہیں ہم

مقطع سے پہلے والا شعر حضرت میاں صاحب کے دل کی تڑپ کا آئینہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سن لیا اور آخر وہ مبارک سال ۱۹۶۴ء کا آہی گیا جب حضرت میاں صاحب جلال خانۂ کعبہ اور جمال گنبد خضریٰ کی زیارت سے مشرف ہوئے

آپ کی غزلوں اور نعت و حمد کا ایک گرانقدر قلمی مجموعہ موجود ہے جس میں سے تبرکاً کچھ کلام نقل کرکے میں نذر قارئین کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ اہل ذوق اور اہل نظر حضرت میاں صاحب کے فن اور ان کے فکر کی گہرائی، گیرائی اور عظمت کا اندازہ بخوبی اس سے کرلیں گے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دن بھی دور نہیں جب حضرت میاں صاحب کا پورا شعری مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر اہل ذوق کے ہاتھوں میں ہوگا۔

خانقاہ شہبازیہ نے بھاگلپور اور اس کے مضافات میں ہمیشہ علم کی روشنی پھیلائی ہے۔ آج بھی موجودہ میاں صاحب مدظلہ اپنے افکار کو شعر و سخن کے سانچے میں ڈھال کر زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ اپنے خاص رنگ میں بحسن و خوبی انجام دیے رہے ہیں۔

حضرت میاں صاحب کا شجرۂ نسب کا سلسلہ حضرت مخدوم سید شاہ مولانا شہباز رحمۃ اللہ علیہ سے یوں ملتا ہے۔

مولانا صفی عالم صاحب ابن مولانا ولی العالم ابن مولانا سعید العالم ابن مولانا شریف العالم ابن مولانا عابد عرف شاہ نوری ابن مولانا صفی ثانی ابن مولانا موحد بن مولانا عابد اول، ابن مولانا عاصم بن مولانا صفی سیالکوٹی بن حضرت مولانا مخدوم سید شاہ شہباز رحمۃ اللہ علیہ

سجادگان کے اسمائے گرامی سلسلہ وار یوں ہیں

۱۔ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب رح
۲۔ 〃 〃 لطیف (برادر مولانا عبدالسلام)
۳۔ 〃 〃 تقی رح 〃
۴۔ 〃 〃 عاصم رح
۵۔ 〃 حافظ ابن مولانا عاصم
۶۔ 〃 〃 عاقل 〃 〃
۷۔ 〃 〃 عابد 〃 〃
۸۔ 〃 〃 موحد ابن مولانا عابد 〃

۹ ۔ ، ، ، صفی ثانی ، ، ، ،

۱۰ ۔ عابد ثانی عرف شاہ نوری ابن مولانا صفی ثانی

۱۱ حضرت مولانا اشرف عالم ابن مولانا شاہ نوری

۱۲ ، ، ، ، رئیس العالم ، ، ، ،

۱۳ ۔ ثانی العالم ابن ، ، شریف العالم نبیرہ مولانا شاہ نوری

۱۴ ۔ ، ، ، ، صفی العالم ، ، ، ، ولی العالم ۱۹۴۲ء

نوٹ :۔ حضرت مولانا صفی سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو سیالکوٹ کی ولایت عطا کی گئی تھی اس لئے وہاں تشریف لے گئے تھے لہذا آپ کی نیابت آپ کے بڑے صاحبزادہ حضرت محمد عاصم نے فرمائی۔

ماحول نمبر کے قارئین کے ذہن میں ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ ایک شاعر کا تعارف کراتے ہوئے کیا ضروری ہے کہ نسب نامہ اور سلسلہ سجادگان کا بھی تذکرہ کیا جائے۔ ایسے اصحاب ذوق سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ فنکار کے فن اور اس کی شخصیت دونوں کے مطالعہ کے بعد اس کی عظمت کا کسی کو عرفان ہو سکتا ہے۔ حضرت میاں صاحب کی شخصیت کو واضح کرنے کا اس سے بہتر کوئی اسلوب میرے خیال میں نہ تھا۔

کلام کا نمونہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں دیا گیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ قدردان ادب اس کے ذریعہ میاں صاحب کی تخلیقی صلاحیت کا درجہ متعین کر سکیں گے۔ جہاں تک میری فہم و ادراک کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ حضرت میاں صاحب کی زبان منجھی ہوئی، خیالات پاکیزہ اور افکار میں متصوفانہ تعلیمات کے نقوش ملتے ہیں۔ سادگی، سنجیدگی، متانت اور خلوص سے آپ کے فن کا رنگ و آہنگ مزین ہے۔

آخر میں حضرت میاں صاحب کے تازہ کلام سے چند نمونے پیش کر کے رخصت چاہوں گا۔

حبیب مکرم رسول گرامی
وہ نور احد ذات رحمت پیامی
بلند عرش سے جن کی اعلیٰ مقامی
چہ ذکر تو اعظم : چہ نام تو نامی
سلامی مری نوشہ دیں سلامی
لیا آج کیسے وہ اسم گرامی
ملک انس و جن حور و غلماں تمامی
بجز عقیدت بشرط غلامی
ہمہ نزد او داد نذر سلامی
سلامی مری نوشہ دیں سلامی

ایک طویل نظم بعنوان "خواب گراں سے اٹھ" زیر تصنیف ہے جس میں حضرت میاں صاحب نے نہایت دل سوزی کے ساتھ ملت کو اس طرح اس دور میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے جس طرح حالی نے مسدس کے ذریعہ بیدار کرنے کی سعی کی تھی اس طویل نظم کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔ خصوصاً قسمیں ملاحظہ فرمائیں۔

تجھ کو رب العالمیں کی ذات اقدس کی قسم
کعبہ کی تجھ کو قسم بیت المقدس کی قسم
ہادیٔ ذیشان کی تقدیس و عظمت کی قسم
کل رسولان ہدایت پاک طینت کی قسم
تجھ کو صحف آسمانی کی ہدایت کی قسم
ہر کتاب اللہ قرآں کی صداقت کی قسم

عرش و کرسی کی بھی اور لوح و قلم کی بھی قسم
جملہ مخلوقاتِ ہستی و عدم کی بھی قسم
ہاں قسم صدیق اکبر کی صداقت کی قسم
ہاں قسم فاروق اعظم کی جلالت کی قسم
ہاں قسم عثمان غنی کی پاک سیرت کی قسم
ہاں قسم شیرِ خدا کی شانِ جرأت کی قسم
واسطہ تجھ کو امام الاصفیا کا واسطہ
یعنی سرکارِ حسن بدر الہدیٰ کا واسطہ
سید الشہداء امام اتقیا کا واسطہ
واسطہ یعنی حسینِ کربلا کا واسطہ

ایک ہو جا نیک ہو جا، حق کا یہ پیغام ہے
حق سے منہ کا موڑنا بس منکروں کا کام ہے
دیکھ سب ہی دے رہے ہیں تجھکو درسِ اتحاد
اتحادِ باہمی ہے دینِ فطرت کی مراد
وقت نازک ہے خدارا جلد کر کچھ فیصلہ
تیرے ٹالے سے نہیں ٹلنے کا اب یہ مسئلہ
قوتِ ایماں اگر ہے فیصلہ مشکل نہیں
عزم پختہ ہے ترا تو مرحلہ مشکل نہیں

بقیہ گردوارہ صفحہ ۱۳۶ کا

خازن :۔ سردار الیشور سنگھ

ممبران :۔ سردار بلونت سنگھ، شری لمبیر داس لہری، سردار سنتوک سنگھ (ایڈوائزر) سردار ترلوک سنگھ۔ سیٹھ اٹل رام سندھی، چوہڑ مل سندھی، اور سردار راجہ سنگھ۔

موجودہ کمیٹی کے عہدہ دار اور ممبر حسب ذیل ہیں۔

صدر :۔ سردار دلدارہ سنگھ۔

نائب صدر :۔ بلونت سنگھ آہلو والیہ۔

سکریٹری :۔ مل سنگھ منگٹ جوگی۔

جوائنٹ سکریٹری :۔ رن جیت سنگھ آہلو والیہ۔

خازن :۔ کلونت سنگھ جانی۔

ممبران :۔ سردار کلدیپ سنگھ جوشی۔ سردار امریک سنگھ گاندھی سردار شلیندر کمار سنگھ اور سردار گروبچن سنگھ۔

گردوارہ سکھوں کی عبادت گاہ ہے لیکن اس کا گہرا تعلق اردو زبان اور اس کے ادب سے بھی ہے۔ گرو گرنتھ صاحب جو سکھوں کی مقدس کتاب ہے اس میں اردو کے بے شمار الفاظ ہی نہیں۔ بلکہ بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے افکار عالیہ بھی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سکھ جیسی بہادر قوم میں بڑے بڑے ادیب و شاعر اردو زبان کے پیدا ہوئے ہیں اور آج بھی یہ لوگ اس زبان کو اپنے خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں جب سے بھاگلپور میں گردوارہ قائم ہوا ہے سکھوں سے قدیم بزم سخن کا تعلق روز بروز استوار ہوتا چلا گیا۔ بے شمار مشاعرے اس عرصہ میں خصوصاً گردوارے میں منعقد ہوئے اردو کا خوش گو شاعر سردار کلونت سنگھ جانی اسی فرقہ کا نمایندہ ہے جس کا حسن اخلاق، خلوص، اور زبان و ادب سے والہانہ لگاؤ ایسا ہے جس پر ہر اردو کا پرستار رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نوٹ :۔ معاونت اور رہنمائی سردار جوگندر سنگھ با ہوا نہ فرماتے تو مضمون کی تکمیل ناممکن تھی اگرچہ جتنی اطلاعات اس میں ہیں ان کی کرم فرمائی کا حاصل ہیں۔

صدرالدین احمد

شخصیت و فن کا ایک خاکہ

از : ۔ ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

زسرِ عشق خبر دار نیست ہر عاشق
حدیثِ عشق ز منصور پرس واز دارش

اس عالمِ آب و گل میں جہاں ہر شئے سرعت و تیز رفتاری کے ساتھ خود فراموشی کے تاریک سمندر میں غرق ہو جاتی ہے صدیاں لمحوں کے دوش پر بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ ابلقِ دہر کے تگ و تاز کا اندازہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اس لئے کہ ہر لحظہ منزل گرد و غبارِ زمانہ کے ساتھ قصہ ماضی یا تجدد خود کا موثی بن جاتی ہے۔ دستِ آرزو کشکولِ گدائی کی طرح خالی رہتا ہے، پسِ پردۂ ذہن میں تمناؤں کے ہنگامے اور دل میں ہجوم و یاس و الم۔ ایسی صورت میں کہ جب ہر آنے والا لمحہ عمرِ گذشتہ کی میت کا پیغامبر ہوتا ہے۔ ماضی کو کون یاد رکھتا ہے۔ اور کسے اتنی فرصت ہے کہ اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر کسی دوسری طرف دیکھے۔ اس اعتراف کے ساتھ آج ایک اور اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ زندگی کے نوع بنوع خرخشوں، الجھنوں، مایوسیوں اور تاریکیوں کے درمیان بعض لمحہ ایسا بھی آتا ہے جو ابدی، اور سرمدی مینارۂ نور بن جاتا ہے۔ اور جس کی روشنی تا عمر دستگیری اور رہبری کرتی رہتی ہے۔ اور زندگی کی تاریک اور اندھیری راتوں میں اعتماد و ایقان کا ماہتاب درخشاں ثابت ہوتی ہے ۱۹۵۳ء میں ایک ایسا ہی لمحہ میری نگاہوں کے سامنے رکا۔ اب تک یہ زمانہ اپنے کاندھے پر کروڑوں لمحے کی لاش اٹھائے ہوئے گذر چکا ہے۔ ہماری نگاہوں نے جلوس قضا کے ان گنت ہنگامے دیکھے ہیں۔ دل سینکڑوں بار موت و حیات کے تصفیہ کن لمحوں کا حشر دیکھ چکا ہے۔ مگر وہ ایک لمحہ جو ۱۹۵۳ء میں مینارۂ نور بن کر ابھرا تھا آج بھی دیدہ و دل اور فکر و نظر کے سامنے رخشندہ و تابندہ ہے۔

میں نے ٹی۔ این۔ کالج (بھاگلپور) میں ۱۹۵۳ء میں داخلہ لیا انٹرمیڈیٹ میں فارسی ایک سبجیکٹ کی حیثیت سے رکھنا میری زندگی کا ایک خوش گوار اور رحمت آور فیصلہ تھا جس کے نتیجہ میں استادِ گرامی قدر پروفیسر صدرالدین احمد مدظلہ العالی کے خلوص و محبت اور شفقت و عنایت کی دولتِ گراں مایہ ملی۔ وہ لمحہ جو میرے لئے زندگی کی اتنی حسین مسرت اور اتنی عظیم دولت لے کر آیا تھا۔ کروڑوں لمحوں کی لاشوں کے نیچے دفن ہونے کے باوجود آج بھی میرے لئے صبحِ صد انوار ہے۔ کہ اسی مخصوص لمحے میں میں اس مینارۂ نور کے قریب ہوا تھا جس کے پیکرِ خاکی کو صدرالدین احمد کہتے ہیں۔

صوبہ بہار میں بہار شریف عظیم آباد کے بعد سب سے زیادہ مردم خیز خطہ رہا ہے۔ یہاں حضرت مخدوم بہاری رحمۃ اللہ علیہ کے مقدس قدموں کے نقشِ پا ابھرے ہیں۔ اور نہ جانے کتنے صوفیائے کرام اور زہاد و عظام نے صدیوں حق گوئی و بے باکی کا درس دیا ہے اور لوگوں کے زندگی کے صحیح مفہوم، مقصدِ تخلیق اور خالقِ کون و مکاں سے قریب تر کرنے کی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ یہ زمین

بیک وقت صوفیوں، شاعروں، ادیبوں، اور سپاہیوں کی انجمن رہی ہے۔ اگر ایک طرف نعرۂ تکبیر بلند ہوا تو دوسری طرف اذاں کی دلنشیں آواز گونجی اور تیسری طرف لحن داؤد سے فضا ترنم ریز ہوئی۔ بہار شریف کی سرزمین کے شکستہ حال کھنڈر آج بھی دور وسطیٰ کے شاندار ماضی کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان لوگوں کو اپنی آغوش میں سلائے ہوئے ہیں جن کے خون دل و جگر سے کبھی سرزمین لالہ زار بنی۔ اسلامی تہذیب و تمدن اور عجمی ثقافت کے منتشر اوراق آج بھی بہار شریف میں کسی مورخ کے منتظر ہیں کہ ان کا تعلق بھی صنادید عجم سے ہے۔ ہاں تو اسی سرزمین پر محلہ دائرہ میں ۱۹۱۴ء میں ایک ایسی شخصیت نے آنکھ کھولی جسے آگے چل کر انوار و تجلی کی دولت بے بہا تقسیم کرنی تھی۔ اور ہم جیسے بے بصر لوگوں کے لئے اکسیر بننا تھا۔ جس خاندان میں استاذی صدر الدین احمد صاحب نے آنکھ کھولی وہ اپنی عظمت و تقدس، علم و فضل، بزرگی و کمال اور تقویٰ شعاری و پرہیزگاری کے لئے از منۂ قدیم سے مشہور تھا۔ اور آج بھی ہندوستان گیر شہرت کا حامل ہے۔ استاد موصوف کے والد بزرگوار جناب سید منظور امام صاحب مرحوم اپنے عہد کے قابل احترام لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ بہت ہی ذی علم اور صاحب فضل و کمال تھے۔ شعر گوئی کا اچھا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ تخلص بقا تھا۔ سنجیدہ و مزاحیہ دونوں رنگ میں کہتے تھے۔ مزاحیہ کلام "اتحاد" پٹنہ میں "منشی سورج مل کی گرن افشانی ــ میری زبانی" کے عنوان سے مستقل شائع ہوتا رہا۔ صاحب دیوان تھے مزاحیہ گوئی میں بھی سنجیدگی، وقار اور تہذیبی روایات کو برقرار رکھتے تھے۔ کبھی اپنی سطح سے نیچے نہیں آئے۔ اور نہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح مبتذل گوئی پر اترے۔ دیوان بعض نامساعد حالات کی بنا پر طبع نہ ہو سکا۔

جناب بقا صاحب مرحوم کے چار صاحبزادوں میں استاد موصوف سب سے چھوٹے ہیں۔ بڑے بھائی حافظ شرف الدین احمد بی، اے۔ بی، ایل ایک مدت سے صغریٰ وقف اسٹیٹ کے متولی ہیں۔ صدر صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت والد محترم کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ بہار شریف سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ بی، اے اور ایم، اے پٹنہ کالج سے کیا۔ انہوں ڈاکٹر علی حسن، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، حافظ شمس الدین منیری، اور پروفیسر عبد المنان بیدل عظیم آبادی جیسی منتخب روزگار شخصیتیں پٹنہ یونیورسٹی میں تھیں۔

ان بزرگوں کی صحبت میں موصوف کے علمی و ادبی ذوق کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ اور ادب و فن کے تمام رازہائے سربستہ منکشف ہوئے۔ اور سلسلہ حجابات فن ان کی نگاہوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ اس طرح فارسی و اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب کے سارے نکات دلبری اور عشوہ ہائے مغربی سے یہ واقف ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیائی ادب کی روح کو جتنے صاف، واضح، وسیع، ہمہ گیری، تنوع، اور ہمہ جہت انداز میں یہ سمجھتے دیکھتے، پرکھتے اور جانچتے ہیں۔ اس انداز تک اس عہد کے بہت کم لوگوں کی رسائی ہے۔ اگر بے نیازی اور قناعت کی صفتیں ان کی طبیعت میں نہ ہوتیں اور انہوں نے بھی شہرت کی خواہش کی ہوتی تو ان کا نام آج صف اول کے لکھنے والوں میں سر فہرست ہوتا۔ مگر بہار شریف صوفیوں کی سرزمین ہے۔ گیا اور راجگیر وہاں سے قریب ہے۔ اس لئے صوفیانہ بے نیازی اور نام و نمود کی خواہش سے گریز ان کی فطرت ثانیہ ہے۔ میں نے اکثر ان کو ایک مخصوص انداز میں بیدل عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھتے سنا ہے۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

استاد موصوف کی زندگی سرتا سر اس شعر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ یا یوں کہئے کہ صدر صاحب بیدل کے اس شعر کی جیتی جاگتی تعبیر ہیں۔

سفید و سرخ رنگ، اوسط قد، شکیل و وجیہہ چہرہ بلند پیشانی، روشن آنکھیں، ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹ، متناسب اعضا، ظاہری شخصیت کی دلکش اور خوبصورت تشکیل کرتے ہیں۔ انگریزی لباس ان کی شخصیت کی دلکشی، وقار، تمکنت اور عظمت و جمال کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ دیکھنے والا پہلی نظر میں مسحور ہوتا ہے۔ اور دوسری نظر میں معتقد اور تیسری نگاہ میں مرید۔ اس لئے کہ پہلی اور تیسری نگاہ کے درمیان تکلف کی ساری دیواریں اجنبیت کی ساری خلیجیں اور پندار کے سارے شیشے ان کی محبت آمیز، شفیق، محترم و موقر، سنجیدگی و بے تکلفی کے " سنگ گل " سے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ ان کی گفتگو کے لب و لہجہ میں بڑی شیرینی، بڑی مٹھاس، نغمگی، ٹھہراؤ، دل پذیری و دلکشی ہوتی ہے۔ ظاہر و باطن میں ہمواری اور یکسانیت ہے جو بات دل میں ہوتی ہے اس کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ کینہ پروری تعصب، تنگ نظری، حسد، رقابت، رشک، دشمنی جیسی خطرناک بیماریوں سے یکسر پاک ہیں۔ اس لئے ظاہر و باطن بہت صحت مند ہے۔ پندرہ سال سے مسلسل خلوت و جلوت اور انجمن تنہائی میں ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کے بعد میں ایمان و یقین کی اس منزل پر پہونچا ہوں کہ ان کی ذات گرامی مرکز علم و ادب، مصدر شعور و آگہی سرچشمۂ فیض و برکت اور منبع شرافت و نجابت ہے۔ آج تک ان کی ذات سے دانستہ تو دور، نا دانستہ بھی شاید ہی کسی کو تکلیف پہونچی ہو۔ اس مادہ پرست دنیا میں کشاکش حیات نے نہ جانے کیسے کیسے صوفیوں، اور زاہدوں کا تقویٰ توڑ دیا۔ مگر یہ آج بھی اپنی وضع دیرینہ پر اسی طرح قائم ہیں۔ کسی کی ذات سے تکلیف پہونچی تو اس کی شکایت نہ کی۔ جذبۂ انتقام کی بات تو دور ہے۔ اسی طرح ان کی باطنی شخصیت اسلامی کیرکٹر کی آئینہ دار ہے۔

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ رنجش و غصہ اور غیظ و غضب کے جذبہ پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اس لئے کبھی پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی۔ سنہ ۱۹۶۲ء سے ٹی، این، بی کالج کے وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ روزانہ سینکڑوں طلبا، اساتذہ اور دوسرے لوگوں کا ان سے سابقہ پڑتا ہے مگر آج تک کسی کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔ طلبا اور اساتذہ میں بے حد مقبول اور محترم ہیں۔ اگر ان کے مزاج میں غصہ کا خفیف سا عنصر بھی ہوتا تو ان کا چپراسی خاص لال جی کب کا ملازمت سے برطرف ہو چکا ہوتا۔ لال جی بھی ایک عجیب کیرکٹر ہے یہ مسئلہ آج تک میری سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ شاعر کیوں نہیں ہوا۔ اس میں ایک شاعر ہونے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس لئے کہ اگر اس سے پانی طلب کیا جائے تو چاک لا کر دیتا ہے۔ رجسٹر مانگئے تو ڈسٹر لا کر دے گا۔ ڈاک لانے کے لئے کہئے تو پانی حاضر کریگا لیٹر پوسٹ کرنے کو دیجئے تو میز کی دراز میں ڈال دے گا۔ آج تک کوئی کام سلیقے سے نہ کر سکا۔ سوائے معصوم طلبہ سے بخشش وصول کرنے کے۔ کہ اس ہنر میں ایکسائز سب انسپکٹر، ٹی ٹی، ای اور سپلائی انسپکٹر وغیرہ کی میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر صدر صاحب نے تہدید کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا قدم نہیں اٹھایا۔

طبیعت میں پروقار سنجیدگی و متانت اور شگفتہ مزاج ظرافت کا عنصر ہے۔ نجی محفلوں کو اپنی دلچسپ گفتگو سے زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ لطائف گوئی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ واقعہ کو ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ سنئے

والا گفتگو اور ادائیگی مفہوم کے انداز سے تمام واقعات کو تصور کے پردہ پر رقص کناں دیکھ لیتا ہے۔ شعر پڑھنے کے انداز میں بھی یہ خصوصیت برقرار رہتی ہے۔ چنانچہ شعر کی تشریح محض اپنے پڑھنے کے مخصوص انداز سے کر دیتے ہیں۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آداب و طریقۂ گفتگو کے ماہر ہیں۔ اور حسب ضرورت آواز و لب و لہجہ میں نرمی، زور، سختی اور دھیما پن پیدا کرتے ہیں۔

سگریٹ نوشی اور یہ لازم و ملزوم ہیں۔ بسا اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ سگریٹ کے لبوں میں ان کی شخصیت سلگتی رہتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سگریٹ کو جلاتے ہیں یا سگریٹ ان کو جلاتی ہے۔ کیپٹن کمپچر کی تیار کی ہوئی سگریٹ مکمل طور پر بجھنے بھی نہیں پاتی کہ ان کی انگلیاں دوسری تیار کرنے لگتی ہیں۔ ہمیشہ سگریٹ ہونٹوں میں دبی ہوئی رہتی ہے۔ اور یہ اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ دھوئیں کے مرغولوں میں یہ سارے تفکرات، پریشانیاں، آلام و مصائب اور آفات و غموم کو اڑا دیتے ہیں۔ ہمت و جرأت اور حوصلہ و بے باکی رکھتے ہیں۔ خطرناک سے خطرناک موقعوں پر بھی ان کا اطمینان تکدر کا شکار نہیں ہوتا۔ اپنی شخصیت اور طبیعت پر اس طرح قابو پانا فقیرانہ روش کا پتہ دیتی ہے۔

مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ فارسی اور اردو ادب کی نادر کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ حد سے زیادہ مصروف و مشغول رہنے کے باوجود کم از کم چار گھنٹے روزانہ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ پرانی تاریخ سے بھی ان کو بڑی گہری دلچسپی ہے۔ پرانی عمارتوں اور مزاروں کی سیر کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ خصوصاً پرانی کتاب، مخطوطے اور پرانی تاریخوں سے زیادہ ذوق ہے۔ بھاگلپور کا کوئی پرانا کتبہ

مزار یا آثار ایسے نہیں جہاں تک ان کی رسائی نہ ہو چکی ہو۔ اگر فرصت میسر ہوتی اور طبیعت میں بے نیازی نہ ہوتی تو یہ علم و ادب کی اہم خدمات انجام دیتے۔ اسی شہر میں ان کی شخصیت واحد شخصیت ہے جو کسی بھی پیچیدہ علمی اور ادبی مسئلہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے ذہانت و طباعی میں یکتائے روزگار ہیں اور کسی بھی مسئلہ کی روح میں آسانی سے اتر جاتے ہیں۔

ان کی شخصیت کے بہت سے دلچسپ اور حسین گوشے ہیں۔ باغبانی اور مرغ بانی کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی پائیں باغ میں کدال بدست اور کھرپی بکف نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ شوق محض شوق کی حد تک ہے۔ مرغی محض اس لئے پالتے ہیں کہ بجٹ میں انڈے کے خرچ کا اضافہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ ان کو کبھی زینتِ دسترخوان بنانے کے لئے نہیں پالتے۔ یوں بھی مرغن غذاؤں سے پرہیز کرتے ہیں۔ مگر خان بہادر توحید صاحب کی رائے اس سلسلہ میں بالکل متضاد ہے۔ اگر آپ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے متمنی ہیں تو ان سے رجوع فرمائیے۔

شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے۔ فطری شاعر ہیں اور تمام اصناف سخن کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ مگر صنف غزل کے جادو سے زیادہ مسحور ہیں۔ کلام میں بڑی سادگی پرکاری معنویت دل نشینی، بے ساختگی، سوز و گداز، بے تکلفی، برجستگی، اثر انگیزی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ کلاسیکی روایات کے احترام کو مد نظر رکھتے ہوئے نکتہ آفرینی اور معنویت کی حسین فضا قائم کرنے پر قدرت رکھتے ہیں عرصہ سے شعر گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر ان کی نشر و اشاعت سے ہمیشہ گریز پائی اختیار کی۔ اپنا خاص آہنگ، لب و لہجہ، ممتاز اسلوب اور انفرادی طرز ذریعۂ اظہار رکھتے ہیں۔ الفاظ

کا استعمال، تراکیب کی معنویت اور برجستگی، مصرعوں کی روانی سلاست
ان کے فن کا خاص جوہر ہے۔ سادہ انداز بیان میں معانی و مطالب
کی وسیع کائنات سمو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلام منفرد و
ممتاز نظر آتا ہے ؎

زندگی ہم سے خراب اور ہم خراب زندگی
کس قدر دو آتشہ ہے یہ شرابِ زندگی

زندگی کی تعریف بہت سے شاعروں نے کی ہے
لیکن جو حقیقت پسندی جو انفرادیت اور عرفان ذات کا تصور
اس شعر میں ہے وہ شاید کہیں نہیں۔ شاعر کی عظمت انسانی
کی معراج سے بول رہی ہے دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

پیچ و تاب زلف پر یہ پیچ و تاب زندگی
اے جزاک اللہ جوابِ لاجواب زندگی

اس شعر میں بھی ایک خاص فضا، ایک خاص کیفیت
ایک خاص بات، اور ایک خاص معنی ہے۔ اپنی نوعیت کے
اعتبار سے یہ شعر اردو کے کمیاب شعروں میں ہے۔ اسی غزل
کا ایک اور شعر سنیئے ؎

آہ وہ بہکا ہوا خانہ خرابِ زندگی
زخم کے انگور کو سمجھا شرابِ زندگی

نہ الفاظ نئے ہیں نہ بظاہر مفہوم میں کوئی ندرت
لیکن لفظوں کے استعمال کے سلیقہ اور فنی شعور نے اس شعر کو
اظہار و ابلاغ کی معراج پر پہونچا دیا ہے۔ دیکھیئے! جذبہ باندانہ
اور حوصلۂ مردانہ کتنے شیریں انداز میں نظم ہو گیا ہے ؎

پہن کر تاج زر ہم ہاتھ میں کشکول لیتے ہیں
خدا نے جس کو سر بخشا وہ سودا مول لیتے ہیں

اسی کو شاہی میں فقیری یا امیری میں قلندری کہتے ہیں
اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

تمہاری ہی زبان بن کر نہیں بولے تو کیا بولے
دہانِ زخم یوں تو بولنے کو بول لیتے ہیں

زندگی کا بہت ہی گہرا تجزیہ و مشاہدہ شاعر کے
یہاں ملتا ہے۔ انداز نظر میں اپج اور اصالت ہے۔ مخصوص
زاویۂ فکر سے جب شاعر آئینۂ احساس میں دیکھتا ہے تو
یہ تصویریں ابھرتی ہیں ؎

زندگی کے پیچ و خم کی شان سے
زلف برہم ہے عجب عنوان سے

چبھ نہ جاؤں تیری نظروں میں کہیں
میں مثالِ شیشہ چلمن چور ہوں

گو یا دستِ شل میں ہوں جام تہی
گو یا میں مجبور در مجبور ہوں

تو مرے اظہار پر مجبور تھا
ہائے میں مجبوریٔ مجبور ہوں

یہ سارے اشعار شاعر کے انفرادی رجحان طبع
اور میلان فکر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں
ان اشعار کا جواب تلاش کرنا مشکل ہے۔ ایک غزل کے
چند اشعار پیش کیئے جاتے ہیں۔ تاکہ ان کے انداز کلام کا
کچھ اور اندازہ ہو سکے ؎

سحر میری بلا کی دور بین و پیش بیں ہوگی
کفن بر دوش نکلی تھی کہ پیوندِ زمیں ہوگی

وہ سنگ راہ جس کو تم نے رستہ سے ہٹایا تھا
وہ سنگ رہ نہیں تھا کی وہ میری ہی جبیں ہوگی

وہ گرد راہ جس کو تم نے دامن سے چھڑایا تھا
وہ دامن گیر گرد خاطر اندوہ گیں ہوگی

وہ جس نے آنکھ کے پردے سے چھپکر بات کہہ ڈالی
تمہاری ہی حیا ہوگی، وہی پردہ نشیں ہوگی
سجود بے خودی تو جل گئے داغِ جبیں بن کر
مگر کچھ راکھ شاید زیرِ محرابِ جبیں ہوگی

یہ غزل ہر اعتبار سے مرصع ہے۔ ہر شعر اپنے اپنے دائرہ میں ایک مستقل نظام فکر و احساس رکھتا ہے اس کے علاوہ غزل کی فضا ایک ہی کیفیت کی آئینہ دار ہے اس طرح ہر شعر ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ غزل مسلسل ہے اور اپنا بھرپور تاثر چھوڑتی ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار مزید پیش کئے جاتے ہیں۔

انتظارِ یار میں اف رات بھر تڑپا کیا
دل کی ہر دھڑکن کو میں آوازِ پا سمجھا کیا
رات دل کی خلوتِ شب گیر میں بکھرائے زلف
آئینہ دیکھا کئے وہ اور میں دیکھا کیا
بزم میں وہ غیر کو دیتے رہے بھر بھر کے جام
اور میں دیکھا کیا، دیکھا کیا دیکھا کیا

تمام اشعار ایک نئی آواز، آہنگ، اور ارتعاش رکھتے ہیں۔ لب و لہجہ میں خود اعتمادی تیقن، احساس ذات، جلالتِ سوز و گداز اور درد مندی و غم گساری ہے۔ اتنا پختہ کلام اس قدر تہذیب فکر اور ذہنی آگہی کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ صدر صاحب اردو غزل میں اپنی جدتِ فکر، ندرتِ بیان، تازگیٔ خیال، نزاکت احساس اور نفاست تخیل کی بنا پر ایک اہم اور ناقابلِ فراموش مقام رکھتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صدر صاحب کی شخصیت و فن دونوں قابلِ صد احترام عظمت و بزرگی رکھتے ہیں۔ میں اس مختصر مقالہ میں ان کی شخصیت و فن کا مکمل جائزہ نہ لے سکا۔ اور صرف بعض خصوصیتوں کی طرف اشارہ کر کے رہ گیا۔ اس کا مجھے افسوس ہے کہ اس مضمون سے ان کی شخصیت و فن کا ایک اجمالی خاکہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ اور یہی میری تسلی کے لئے بہت ہے۔

ڈاکٹر سیّد احمد حسن کا فن

علامہ جمیل مظہری

یادش بخیر۔ بھاگلپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر احمد حسن سے میری ملاقات اس وقت سے ہے جب وہ مسلمہ قسم کے ایک سید سے سادے معصوم نوجوان تھے لیکن میں نے پہلی ہی ملاقات میں یہ محسوس کر لیا کہ اس پیکرِ اخلاص و سعادت کے اندر مستقبل کا ادیب اور معلم چھپا ہوا ہے جو کسی نہ کسی دن باہر آکر رہے گا اور میرا اندازہ غلط نہ تھا کیونکہ میں نے بہت جلد انہیں مونگھیر کالج میں ایک معلم کی حیثیت سے دیکھا اور پھر اس کے بعد ان کی علمی اور تعلیمی ترقیاں بتدریج بلندیوں کی طرف بڑھتی گئیں۔ لیکن مستقبل کے ایک ادیب اور فنکار کی حیثیت سے ان کی شخصیت نے مجھ سے جو وعدے کئے تھے۔

ان کے پورے ہونے کے آثار میری نظر سے اس وقت تک نہ گذرے جب تک کہ عزیزی شاغل قادری نے ان کے مجموعہ کلام کے چند اوراق میرے پاس تبصرے کے لئے نہ بھیجے۔ میں نے بڑے شوق سے ان اوراق کو الٹا اور بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ باوجود نومشقی کے ان کی شاعری کا مزاج تغزل کی عام سطح سے بلند ہے۔ وہ عامیانہ پن وہ سطحیت وہ لفظ پرستی وہ معنی بیزاری ان کے یہاں بالکل نہیں ہے جو جدید غزل گوئی کو اس سطح بلند سے نیچے گرا دی ہے جس پر غالب اور اقبال نے اس کو پہنچا دیا تھا۔ یہ ان کے شعور فن کی سلامت روی کی دلیل ہے کہ ان کی دس بارہ غزلوں میں جو مجھے دستیاب ہوئیں ایک شعر بھی مجھے ایسا نہ ملا جو معنوی معیار سے گرا ہوا ہو مقام شکر ہے کہ جدت طرازی کا شوق جو آجکل کے نوجوان شعراء میں جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے ان کے ذہن کو اپنی گرفت میں نہ لے سکا۔ دیکھئے ان کی شاعری کا عمومی رجحان بالکل قدامت پرستانہ بھی نہیں ہے بلکہ ان کا تغزل جدت و قدامت کے درمیان ایک توازن ایک مفاہمت اور ایک ایسا منصفانہ سمجھوتہ ہے جس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے۔ تخیل کی ندرت، جذبات کی شدت اور بیان کی سلاست جو غزلیت کی روح کہی جاتی ہے اس کی مثالیں ان کی غزلوں میں جابجا نظر آتی ہیں۔ بلکہ تقریباً ہر غزل میں ایک نہ ایک شعر ایسا ضرور ملتا ہے جو ذوقِ سخن کو چونکا دے۔ مشق سخن کا زیادہ سے زیادہ یہی ماحصل ہے۔ آب آئیے میں ان کے چند اشعار آپ کو سنا کر آپ سے اپنی رائے کی تصدیق کراؤں کیونکہ میں یا منا لطہ کوئی ایسا نقاد نہیں جس کو اپنی رائے پر پورا بھروسہ ہو۔

کسی کی یاد ہے تنہائی شب ہے غم دل ہے
اب اپنی زندگی بھی آپ پہچانی نہیں جاتی

پھر آج رقص شرر دامن بہار میں ہے
سلگ رہا ہے کدھر آشیاں نہیں معلوم

عزیز ہے ترے غم ہی سے زندگی ورنہ
یہ درد سر تھی ہم اس درد سر کو کیا کرتے

وہ تو تھا یا تری تصویر تھی یا اک تصور تھا
مری تنہائیوں نے کی ہے جس سے گفتگو برسوں

کشمکش حیات نے چھین لی لذت سجود
اب وہ حرم حرم نہیں اب وہ جبیں جبیں نہیں

نسیم سے کوئی جا کے کہہ دے کہ گدگدائے چمن کو جاکر
خزاں رسیدہ رگ شجر میں تڑپ رہی ہے بہار اتبک

اور اس شعر کی داد تو احمد صاحب کے ذوق سخن کو شاد کی روح سے مانگنی چاہیئے

تمنائیں مجھے بہلائیں گی کیا
تمناؤں کو میں بہلا رہا ہوں

علاوہ غزل کے موصوف کا شعور فن ان کے قطعات میں بھی بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ نمایاں ہے جس کی ایک مثال ملاحظہ ہو

دکھتی رہتی ہے وہم نشتر
زندگی زخم بن گئی شاید

قطعہ اچھا ہے اور بہت اچھا ہے لیکن دوسرے مصرع میں غلط حسی کی ترکیب محل نظر ہے۔ اگرچہ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاعر کو اس قسم کی تراکیب نو کے تراشنے کا حق ملنا چاہیئے لیکن اسی حد تک کہ ترکیب کی ثقالت ذوق سلیم کی سماعت پر گرانی نہ کرے۔ یہاں غلط حسی قطعے کی شعری لطافت کو مجروح کر رہی ہے تھوڑی سی توجہ سے اس میں مناسب ترمیم کیجا سکتی تھی لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد صاحب کی تعلیمی مصروفیتیں ان کو ان کے کلام پر نظر ثانی کا موقع نہیں دیتیں۔ حالانکہ فن ہر حال میں فنکار کی پوری توجہ کو اپنی طرف مبذول دیکھنا چاہتا ہے اسکی سوتیا ڈاہ ضرب المثل ہے۔ یوں بھی شاعر کو اس کا لحاظ چاہیئے کہ جو افکار وہ موزوں کر رہا ہے ان کے لیے حسین ترین پیرایۂ بیان کیا ہو سکتا ہے

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں شاعر ہوں اور شاعر جویائے نقص نہیں جویائے حسن ہوتا ہے۔ میں جب کسی باغ میں داخل ہوتا ہوں تو میری نگاہ پھولوں پر جاتی ہے روشوں پر جاتی ہے۔ چمن کی نالیوں کا معائنہ میرا مقصود نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ اتفاقاً نظر اٹھ جائے تو صاحب باغ کو ادھر متوجہ نہ کرنا خیانت سمجھتا ہوں۔ اسلئے میں اپنے عزیز مکرم سے اخیر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جب شاعری کو منہ لگایا ہے تو اس منہ لگی ڈومنی کی نازبرداری کیلئے پورا وقت نکالئے۔ حسن بیان کے ساتھ صحت زبان کا لحاظ بھی ایک شاعر کا اولین فرض ہے خصوصیت کے ساتھ جب شاعر معلم بھی ہو تو اس کی یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

~~~~~
~~~~~

ڈاکٹر سید احمد حسن

پروفیسر اختر قادری

یہ غالباً ۱۹۶۱ء کا واقعہ ہے کہ ایک صبح مجھے اطلاع دی گئی کہ ٹی۔ ان۔ بی کالج بھاگلپور کے اردو کے کوئی لکچرر مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو ایک میانہ قد، چھریرے جسم اور خوش پوش نوجوان سے تعارف ہوا۔

آپ تھے سید احمد حسن لکچرر شعبۂ اردو ٹی۔ ان بی کالج بھاگلپور۔

احمد صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء اردو میں بی اے آنرس، ۱۹۴۲ء میں ایم اے ۱۹۴۶ء میں فارسی میں ایم اے کیا اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۱ء تک منشی سنگھ کالج موتیہاری میں پھر ۱۹۵۱ء میں ٹی ان بی کالج بھاگلپور میں اردو کے لکچرر ہوئے ۱۹۶۳ء سے صدر شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں

احمد حسن صاحب نے "مثنوی عاشقانہ شاعری میں عشق کا عنصر" کے عنوان پر بہار یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا اور اسی سلسلہ میں ڈاکٹر، داکے لئے مظفر پور آئے تھے۔ چنانچہ بہار یونیورسٹی نے ۱۹۶۱ء میں انہیں اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ ہماری یہ ملاقات روز افزوں ترقی کا موجب بنی۔ اور جبکہ "سہیل گیا" کا خصوصی نمبر "بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر" کے عنوان پر شائع ہو رہا ہے مجھ سے احمد حسن صاحب کا تعارف اور ان کے شعری ادب کے متعلق مجھ سے اپنے تاثرات تحریر کرنے کی فرمائش ہے

جیسا کہ میں نے پچھلی سطروں میں بیان کیا ہے احمد صاحب سے میری ملاقات ان کے تحقیقی مقالہ یعنی ایک نثری کارنامے کے سلسلے میں ہوئی۔ میری اپنی رائے یہی ہے کہ احمد حسن صاحب ایک بہت ہی اچھے اور کامیاب نثر نگار ہیں اور اردو ادب کے کامیاب استاد، ظاہر ہے کہ تعلیم و تدریس کے شغل نے اردو شعر و شاعری سے بھی ان کی دلچسپی قائم کر رکھی ہے اور مطالعۂ فن و ادب نے انہیں شاعری کا اچھا خاصا ستھرا مذاق عطا کر دیا ہے۔ چنانچہ کچھ تو ماحول اور کچھ تو افتاد طبع نے انہیں شعر گوئی کی طرف بھی راغب کر دیا ہے یہ صحیح ہے کہ انہوں نے شاعری کی طرف کبھی کوئی خاص توجہ نہیں کی اور باضابطہ طور پر شاعری کو اپنا شعار نہیں بنایا لیکن اکثر و بیشتر انہیں شعر گوئی پر بھی مائل ہونا پڑا ہے اور اس طرح ان کی ادبی تخلیقات کے ذخیرہ میں شعر

پارے بھی موجود ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ان کی دس اگیارہ غزلیں ہیں اور انہیں کی بنیاد پر مجھے احمد حسن صاحب کی شاعری کے متعلق اپنی کچھ رائیں پیش کرنی ہیں۔

غزل بعض ناقدین کو وحشت میں مبتلا کردیتی ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسے "نیم وحشی صنف سخن" قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ غزل میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو افراط وتفریط کی وجہ سے اس کی رسوائی اور بدنامی کی ذمہ دار ہیں لیکن ساتھ ہی پے درپے حملوں کے باوجود غزل ہمارے ادب میں پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ یہ بات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ شاید ہندوستان کی آب وہوا غزل طبعی سے مناسبت رکھتی ہے۔ کچھ تو یہ طبعی مناسبت اور کچھ قافیہ پیمائی کی سہولت نے غزلوں اور غزل گویوں کی اتنی کثرت پیدا کردی ہے کہ غزل یا غزل گو شاعر کا اس صنف میں کوئی امتیاز خصوصی حاصل کرنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ اب ایسے میں غزل کے کچھ ایسے اشعار تخلیق کرلینا یا کچھ ایسی مرصع غزلیں کہہ لینا جو قاری اور سامع کو اپنی طرف متوجہ کرسکے جوئے شیر لانا ہے۔

آئیے اب احمد حسن صاحب کی غزلوں پر ایک نظر ڈالی جائے۔

اس شمارے میں وہ غزلیں جن کے مطلعے مندرجہ ذیل ہیں غزل گوئی کا اچھا، ستھرا، اور کامیاب نمونہ ہیں ؎

غم سے جو آشنا نہ ہو میرا دلِ حزیں نہیں
تر نہ رہے جو اشک سے میری وہ آستیں نہیں

حیات دی ہے دلِ سوگوار دے کے مجھے
دیا ہے غم بھی تو اک غمگسار دے کے مجھے

اثر اتنا بھی تو لے جذب نہاں ہو جائے
خاموشی ہی غمِ الفت کی زباں ہو جائے

ترا نقشِ قدم ہر سمت پا کر رو برو برسوں
جبینِ شوق نے سجدے کئے ہیں رکو بکو برسوں

ان غزلوں میں فکر وفن کا حسین امتزاج اس کی غمازی کررہا ہے کہ شاعر صرف معلم ادب ہی نہیں بلکہ ادبی تخلیق پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ ان چاروں مطلعوں ہی پر غور کیجئے تو احمد صاحب کی مشق سخن اور قدرت بیانی کی جھلک نظر آجائے گی۔ خیالات بلاشبہ حسن اظہار ہی سے کامیاب شعر کا جامہ پہنتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں کا ہر ایک مطلع حسن بیان، جدت ادا اور الفاظ کی مرصع کاری کے بہت ہی خوب نمونے پیش کررہا ہے۔ غزلوں میں عام طور سے جو چیز دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی غزل میں معیار کی ہم آہنگی مشکل ہی سے قائم رہتی ہے۔ جہاں دو ایک شعر بہت بلند پایہ اور کامیاب ہو کر "بغایت بلند" کی سند حاصل کرتا ہے وہاں دوسرے اشعار محض خانہ پری کی حیثیت رکھتے ہیں اس لحاظ سے احمد حسن صاحب کی یہ چار غزلیں نہایت کامیاب ہیں کہ ان کا ہر شعر غزل کے معیار کو قائم رکھنے میں ممد ومعاون ہے اور مطلع سے جو کیف شروع ہوتا ہے وہ مقطع تک قائم رہتا ہے۔ بالخصوص، یہ چند اشعار قابلِ غور ہیں ؎

عرض کچھ کرنے سے پہلے ہی سنبھل جاتا ہوں میں
جانے کیا خاطر نازک پہ گراں ہو جائے

کہیں رہی کشش و برق آشیاں تو نہیں
بلا رہی ہے نوید بہار دے کے مجھے

لائی ہے بے خودی مجھے ایسے مقام پر جہاں
کوئی گماں گماں نہیں کوئی یقیں یقیں نہیں

زباں ہر شئے کو میرے اضطراب شوق نے دیدی
مہ و انجم سے بھی کرتا رہا ہوں گفتگو برسوں

مجھے اس انتخاب میں بعض اشعار پسند آئے۔

نسیم سے کوئی جاکے کہدے کہ گدگدا کر چمن کو دیکھے
خزاں رسیدہ رگ شجر میں تڑپ رہی ہے بہار اب بھی

اب ان دو اشعار کو ملاحظہ کیجئے۔ احساس ایک ہے۔ جسے "مچل رہا ہے شرار اب بھی" "تڑپ رہی ہے بہار اب بھی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غزل کی یہ بھی ایک کرامت ہے کہ شاعر ادائے مطلب میں محتاج نہیں مصلحت اور وقت کے تقاضے اس کی زبان بند کرنے سے عاجز ہیں اور وہ بادۂ و ساغر" گل و بلبل" بہار و خزاں" سنگ و شرر" کے سہارے وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو عام انداز بیاں میں کرنا مصلحت اندیشی کے منافی ہوتا ہے۔

بہر کیف! میرے خیال میں احمد حسن صاحب کے اشعار کی توضیح و تشریح یا تعریف و توصیف سے کہیں زیادہ بہتر یہ طریقہ کار ہے کہ میں ان کے وہ اشعار پیش کر دوں جو مجھے متاثر کرتے ہیں اور ان کی شعری خصوصیتوں کا فیصلہ قاری کے مذاق سلیم پر چھوڑ دوں۔

عزیز ہے ترے غم سے ہی زندگی ورنہ
یہ دردِ سر تھی ہم اس دردِ سر کو کیا کرتے

جہاں رہا میں پرستار رنگ و بو ہی رہا
مجھے نشاط و غم آشیاں نہیں معلوم

فضا ڈوبی جاتی ہے رنگینیوں میں
حسینوں میں وہ انتخاب آرہا ہے

کیا خطاوار گلستاں ہوں میں ایسا یارب
جو بہار آئے مرے حق میں خزاں ہو جائے

وہ تو ہی تھا، تری تصویر تھی یا اک تصور تھا
مری تنہائیوں نے کی ہے جس سے گفتگو برسوں

میں چونک اٹھتا ہوں سن کر خود اپنی ہی آواز
سنا رہا ہوں کسے داستاں نہیں معلوم

●● ————

ڈاکٹر سید حسن

شاغل قادری

عزیزم لطف الرحمٰن السلام علیکم

یہ آپ کا ناقابل معافی ظلم ہے۔ کہ مجھ جیسے نحیف سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر سید احمد حسن جیسی دیوقامت شخصیت کی تصویرکشی کیجئے۔ دیوقامتی سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ڈاکٹر سید احمد حسن نام ہے سات فٹ لانبے اور ساڑھے تین فٹ چوڑے انسان کا جس کی بڑی بڑی مرعوب کن آنکھیں اور اوندھا گھڑا جیسی توند ہے۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر سید احمد حسن چھریرے بدن کے نہ زیادہ لانبے اور نہ اتنے ناٹے کہ لوگ بونا کہیں آنکھیں بڑی بڑی نہیں ہیں کہ روات کے دلدادہ شعراء معشوق کی کمر سمجھنے لگیں۔ رنگ گورا چٹا اگر نہیں ہے تو ایسا کالا بھی نہیں کہ مدھوبن کی گوپیاں اپنے شیام پر فدا ہونے لگیں، ہاں آواز ایسی ہے جس سے بانسری کی مدھرتا کا لطف آنے لگتا ہے۔ باتیں کیجئے تو پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ اور جنچے تلے الفاظ گھلے رنگا رنگ کی طرح معنویت کی خوشبو بکھیرنے لگتے ہیں۔ گھنٹوں ادب سیاست، مذہب کے موضوعات پر موصوف کی گل افشانیاں سے فیضیاب ہوتے رہئے جی ہی چاہے گا کہ یوں ہی یہ کانوں میں رس گھولتے رہیں۔ اور میں کہتا رہوں مذہب تو ہوسو مشتی کی گولیاں تقسیم کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس کو دیکھئے وہی مذہب کے موضوع پر ہمہ دانی کا مدعی نظر آتا ہے۔ لیکن

ڈاکٹر سید احمد حسن جب ساز کے اس تار کو چھیڑتے ہیں۔ تو ان کی چابکدستی دیدنی ہوتی ہے۔ وہ کبھی اپنی معلومات کی فضا سے بلند ہونے کی سعی نہیں کرتے، یہی حال سیاست کا بھی ہے۔ ادب کا موضوع ان کا اپنا ہے۔ جب یہ ساز چھڑ جاتا ہے۔ تو پھر دیکھئے علم و فن کے موتی فضا میں بکھرنے لگتے ہیں۔ اس منزل پر سید احمد حسن کی دیوقامتی ایسی ہے۔ کہ جبرئیل پر شکستہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ وہ تہلائے عروج ہے جہاں ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں، اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں نے دیوقامت کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ اور ڈاکٹر سید احمد حسن کی شخصیت پر روشنی ڈالنے سے کیوں کترا رہا ہے۔ شاعر کے عبا تیا میں تو ذرہ ہوتے ہوئے بھی آفتاب سے آنکھیں ملا سکتا ہوں۔ مگر نثر نگار کا لبادہ اوڑھ کر خود کنجشک فرومایہ بن جاتا ہے۔ اور آپ ہیں کہ شاہین سے لڑانے پر تلے ہوئے ہیں۔

آپ یہ جانتے ہیں کہ میں سید احمد حسن سے بہت قریب رہا ہوں۔ اور ایک جگہ سے بھی زیادہ مدت سے جانتا ہوں۔ اس حقیقت سے کس کافر کو انکار ہے۔ لیکن ہماری قربت یونہی رہی ہے جیسے ہمالیہ کے مقابلہ میں پارس ناتھ پہاڑ یا گنگا کے مقابلہ میں پن پن یا قطب مینار کے دامن میں اشوک کی آہنی لاٹ۔ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں اور بلند پایہ شاعر، ادیب ہیں اور بہت اونچے ادیب، پروفیسر کیسے ہیں یہ توان کے شاگرد جانیں۔ ویسے

انداز تو یہ ہے کہ استاد کی حیثیت سے بھی یہ یقیناً بہت بلند ہوں گے۔ گلستان اختر اورینوی کا ہر گل اپنی خوشبو میں اپنے باغبان کی خوبیوں کا عکاس ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں۔ ہمعصروں میں یہ کیسے ہیں اس کی تصدیق ان کے ہمعصر کریں گے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ پروفیسر عبدالاحد صاحب صدر شعبۂ اردو ٹی۔ این۔ بی۔ کالج تھے تو ڈاکٹر سید احمد حسن اردو و شعبۂ فارسی کے اساتذہ کا ایک گٹ تھا۔ اس گٹ سے احد صاحب نالاں تھے۔ خدا معلوم اس میں تقصیر کس کی تھی۔ اپنے رفیق کار کے ساتھ صدر شعبہ کی حیثیت سے احسن صاحب کا کیا رول ہے۔ اس کو آپ یا مظفر اقبال بتا سکتے ہیں میں کیا جانوں۔ میری حیثیت تو ایک کج مج بیان شاعر کی سی پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ پرخلوص احباب کے مشورہ کو سن کر اور بات اگر اتر گئی تو مان لینا ورنہ ناصرالدین کی طرح لکھنا اور مٹانا جانتا ہوں۔

شاید سنہ ۱۹۵۱ء میں یتیم خانہ کے سامنے سابق وزیر تعمیرات علامہ سید مقبول احمد کے یہاں "یوم اقبال" منایا جا رہا تھا۔ میں نے ٹوٹا پھوٹا ایک مقالہ پڑھا اور بیٹھ کر شعراء کی فہرست دیکھنے لگا۔ میرے نزدیک ہی ڈاکٹر سید احمد حسن صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ موصوف نے میرے مقالہ کی تعریف کی کلمۂ تحسین سن کر میں ذرا چونک سا جاتا ہوں۔ پہلے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چہرے کی لکیروں سے بھانپنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کہ یہ داد ہے کہ بیداد۔ اپنے اس عمل کو افسوں ڈاکٹر صاحب پر پھونکا تو مجھے خلوص کی بو محسوس ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی مثل مشہور ہے کہ پہلا تاثر آخری تاثر ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے خلوص محبت، اور اخلاق کا گرویدہ ہو گیا۔ میں ملنے جلنے میں بیباک نہیں ہوں اس لئے چیونٹی کی رفتار سے ہمارے تعلقات میں استواری آئی۔

میں نے اپنی ہی افتاد طبع سے یہ درس لیا ہے۔ کہ علم و فضل کا جب کسی انسان کے اعتراف کیا جاتا ہے۔ اور اس کے رتبے کا لحاظ بھی دم پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ تو یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کا پہلے دن سے احترام کرنے لگا۔ ان کے علم و فضل کے اعتراف کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ "متاع شوق" کا تعارف میں نے ان سے لکھوایا اور اس مہم کو سر کرنے کیلئے کئی جوڑے جوتے توڑ ڈالے۔ ان کی محبت اور خلوص کا بھی یہی تعارف ثبوت ہے۔ ورنہ نہ جانے کتنے نے ان سے ایسی درخواست کی۔ مگر انہوں نے طرح دے دی۔

ایک صاحب نے تو متاع شوق کا تعارف پڑھ کر پوری ایک کتاب ڈاکٹر سید احمد حسن اور ناچیز کو نیچا دکھانے کی غرض سے لکھ ماری۔ اور چھپوا کر باذوق اصحاب نظر تک پہنچا بھی دیا صرف اس تصور پر کہ ڈاکٹر صاحب نے ان پر لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اب اس کتاب کا جادو کس کس پر چلا۔ اس کا مجھے پتہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب تمام تر صلاحیتوں کے باوصف لکھنے پڑھنے میں بہت سست واقع ہوئے ہیں۔ بہار کے بزرگوں کی سیرت (یعنی کسر نفسی اور گوشہ نشینی) کا رنگ ان پر بدرجۂ اتم چڑھا ہوا ہے۔ ورنہ دنیائے ادب میں ڈاکٹر صاحب کا مقام بہت بلند ہوتا۔ گوشہ نشینی کا تو یہ عالم ہے کہ شہر میں بھی بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ دوسرے ان کے گھر پر جا کر بور کرنے لگیں۔ تو یہ اور بات ہے کہ ورنہ چند چنیدہ خوش قسمت شخصیتیں ایسی ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب بالاکراہ نہیں ملتے۔ شعر و سخن کی مجلسوں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ مگر جب شریک ہوتے ہیں بہار آجاتی ہے۔

سنہ ۱۹۵۳ء میں میرا تبادلہ بھاگلپور سے جب صاحب گنج ہو گیا تو ملنا جلنا مقابلتاً بہت کم ہو گیا۔ ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آیا تو یہاں کے ادبی حلقہ میں ڈاکٹر صاحب کے ایک کی گونج سنائی دی۔ وہ شعر تھا ؎

بار نغمہ سے بکھر جائے نہ ہر تار حیات
ساز مسموم ابھی خوگر مضراب نہیں

اس وقت یہاں ایک خود ساختہ علامہ تھے۔ انہوں نے تو ایک طوفان کھڑا کر دیا چھی چھی لاحول ولا۔ یہ شعر ہے بھائی کو شعر کہتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک پروفیسر کا، جب استاد ایسا ہوگا تو شاگرد کیا اثر لیں گے۔ یہ تو کسی بھانڈ کی زبان پر بھی اچھا نہیں معلوم ہوگا وغیرہ۔

ایسی باتیں سن کر میرا خون تو کھولنے لگا۔ مگر چپ رہا۔ علامہ کی چیخ پکار اور بار بار عصا اٹھانے کی ورزش سے میں خوف زدہ تھا۔ صاحب گنج واپس ہوا تو مندرجہ بالا شعر کی زمین پر میں نے بھی طبع آزمائی کی اور اپنی غزل میں اس شعر کو بھی شامل کر کے جعفر علی خاں اثر اور نیاز فتح پوری کے پاس اس درخواست کے ساتھ روانہ کر دیا کہ اس غزل کے اچھے اشعار کی نشان دہی کر دی جائے۔ نیاز نے صرف ڈاکٹر سید احمد حسن صاحب کے شعر پر ٹِک لگائی۔ اور لکھا کہ یہ نادر شعر ہے جعفر علی خاں اثر نے بھی اس شعر کی بہت تعریف لکھی۔ موصوف نے دوسرے مصرعہ میں سازِ معصوم کی جگہ پر سازِ خاموش کر دینے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ ایسا کرنے سے کچھ مزید بے پوشی ہو جاتی ہے۔ ویسے یوں بھی یہ شعر بہت خوب ہے۔ افسوس کہ یہ خطوط میری لاابالی طبیعت کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب "بھاگل پور کا ادبی ماحول نمبر" اور لطف الرحمن یہ ستم ظریفی کریں گے۔ کہ مجھ جیسی بونی صلاحیت والے کو ڈاکٹر سید احمد حسن کی ہمالہ جیسی شخصیت پر لکھنے کو مجبور کریں گے۔

لطف الرحمٰن تم پر خدا کی رحمت۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں دعائیں دوں گا۔ اگر تم مجھے بخش دو۔ اور یہ کام کسی صاحب صلاحیت کے سپرد کرو۔ والسلام

دعاگو

شاغل قادری غفرلہٗ

بقیہ کریم اسدی

اللہ تھی۔ بہرکیف کریم اسدی صاحب نے بڑی فراخدلی کے ساتھ ہم لوگوں کی گذارش قبول فرمائی اور ظفر اوگانوی کے جیب میں ایک دس روپے کا نوٹ بڑی آہستگی سے رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد جب ہم لوگ واپس ہوئے تو میں خصوصی طور پر ان کے اخلاق کا مزید قایل ہو گیا تھا۔ ظفر اوگانوی نے اپنے اس وعدہ کے باوجود کہ اگر مرنا بھی ہوگا تو ایک سال پرچہ نکالنے کے بعد مروں گا، زندہ بھی رہے اور اقدار کا گلا گھونٹ دیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے سرزمین بھاگل پور میں میری رسوائی کا ایک سامان مہیا کر دیا ؂

ہرچہ از دوست می رسد نیکوست

مجھے خبر نہیں کہ کریم صاحب نے ہم لوگوں کے نام پر کتنا تبرا پڑھا۔ لیکن ملاقات کے وقت کبھی انہوں نے یہ احساس بھی نہ ہونے دیا کہ انہیں ہم لوگوں سے کوئی شکایت ہے۔ یہ ان کی عظمت کی اور بہت ٹھوس دلیل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ کریم صاحب ہر اعتبار سے ایسے آدمی ہیں جو اپنے اور بیگانے ہر آدمی کی نگاہ میں ایک محترم اور قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ اور اب ایسی ہستیاں ہمارے سماج سے ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی لئے میں نے اوپر کے سطور میں ان کے متعلق یہ عرض کیا ہے ؂

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

کریم اسدی اور ان کی شاعری

ظفر ادیب

غضب کے ہوتے ہیں وہ لوگ جو ہر ایک غم کو غمِ جاناں بنا لیتے ہیں اس کے لئے بڑے ظرف اور بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ کوئی ہی ہوتا ہے جو ابوالکلام آزاد کا قلندر بنتا ہے اور تو سب ہی اس کے ہی حوصلے افزا قدم کے منتظر رہتے ہیں۔ دار و رسن کے سائے بھی بڑے بھیانک ہوتے ہیں لیکن یہ قلندر لوگ اس سے گذر کر جلووں میں پہنچ جاتے ہیں۔

کچھ تو زندگی دشوار ہوتی ہی ہے اور کچھ زمانہ بھی اسے دشوار کر دیتا ہے۔ لیکن زندگی کے جاندار وہ ہر صورت کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے بھیانک روپ سے کچھ زیادہ ہی وارفتگی سے پیش آتے ہیں۔ کریم اسدی چاہے اس وجہ سے کہ وہ مجاہد پور بھاگل پور میں پیدا ہوئے چاہے اس بنیاد پر کہ انہیں زندگی عرصۂ جہاد کے صورت میں ملی' دل و جان بازی پر لگائے ہوئے زندگی سے بغل گیر ہونے کے لئے بڑھتے ہی رہے۔ اسی لئے انہوں نے ہر بلندی پر حریفانہ نظر ڈالی اور اس سے شکست تسلیم کرنے کی بجائے اس پر فتح حاصل کرنے کی جد و جہد جاری کر رکھی۔

فنکار کی انفرادیت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو بچائے رکھے۔ اگرچہ دوسروں کے تاثرات سے روشنی اخذ کرتا رہے لیکن یہ نہیں کہ اپنی منزلوں کو چھوڑ کر دوسروں کی منزلوں کو اپنی منزلیں بنا لے۔ کریم اسدی صاحب نے جہاں سے بھی ممکن ہوا اپنی منزلوں کے لئے روشنی تو حاصل کی لیکن اپنی منزلیں بدل نہیں لیں اگر وہ ایسا کرتے تو اس سے ان کی انفرادیت مشتبہ ہو جاتی اور انہیں ان کا ضمیر بھی ضرور کچوکے دیتا رہتا

اختر ناصح نقیب صاحب "نظارۂ و خیال" میں ان کے باب میں لکھتے ہیں۔

غزل کے نرم و نازک لفظوں میں ایسی اثر انگیز باتیں کر جاتے ہیں جو نظم کے جمال و جلال سے ہرگز ممکن نہیں۔

غزل میں واقعی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہایت سے نہایت موثر انداز میں کہا جا سکتا ہے لیکن نقیب صاحب سے متفق ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر اس کا تذکرہ نہ کیا جائے اور اس سے یونہی گذر جائے تو میں یہ احساس لئے رہوں گا کہ مجھ سے کوئی بڑی فروگذاشت ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں بلکہ مجھے

یقین ہے نظم میں کچھ بھی کہنا ناممکن نہیں ہے۔ غزل کے اپنے حدود ہیں اور نظم کے اپنے حدود، دونوں میں کوئی بھی کسی سے گھٹی نہیں ہے، نظم میں کیا کیا کچھ نہیں کہا جا چکا ہے اور کیا کیا کچھ نہیں کہا جا رہا ہے۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جو غزل میں کہی گئی ہو اور نظم میں نہ کہی جا سکے۔ درحقیقت کسی فنکار کے حسن غزل کو اجاگر اور نمایاں کر کے دکھانے کا یہ طریقہ نہ تو درست ہے اور نہ ہی مناسب ہے۔ غزل کی بات غزل کے ساتھ ہے اور نظم کی بات نظم کے ساتھ دونوں میں سے کسی کے لئے بھی کچھ ناممکن نہیں۔ کلام کے پیش نظر جی چاہتا ہے کہ اسعدی صاحب کی یہ بات تسلیم کر لی جائے

احباب کا خیال ہے کہ میں غزل گو شاعر ہوں میں احباب کے اس خیال سے خوش ہوں کہ لیکن اس ترمیم کے ساتھ کہ انہیں اپنی زندگی کے تجربات اپنے احساسات و جذبات اور ان حوادثات کو جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں، شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

کسی شاعر کا اس سے بڑا کارنامہ شاید اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اشارے کنائے تشبیہات کے معنی بدل دیئے جائیں۔ اسعدی صاحب نے یہ کیا ہے اور اس کی بنیاد ان کی زندگی کے تجربات اور دقیق مشاہدۂ زمانہ ہی ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اس مقصد میں کامیابی محض خیالی خواب ہی رہ جاتی ہے اگر کوئی شاعر یہ نہیں کر سکتا ہے تو ایک تو اس کا کلام روایتی رہ جاتا ہے اور دوسرے وہ خیالی طوطا مینا ہی اڑا سکتا ہے اسکے بس کا نہیں رہتا کہ وہ عصر حاضر یا اپنی زندگی کے کوائف کی ترجمانی کر سکے۔

جمیل مظہری صاحب ان نادرۂ روزگار لوگوں میں سے ہیں جن کی بات سے روگردانی ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

وہ فرماتے ہیں اور بجا ہی فرماتے ہیں

کریم صاحب کی شاعری عالم شعور کی ہے انہوں نے اپنے ذوق شعری کو تحت شعور کی بھول بھلیوں میں گم ہونے نہیں دیا ہے۔

اس بات کا اس لئے بھی بڑا وزن ہے کہ جمیل مظہری صاحب خود بھی اس روش کے سربراہ ہیں ان کے تیکھے تیوروں سے کسی ذی حس کا بچ نکلنا دشوار ہے۔ انہوں نے شاعری میں ایک نئی روش کو آگے بڑھایا ہے بلکہ نکھارا ہے اور خوب نکھارا ہے ان کا کریم اسعدی صاحب کے کلام پر یہ خیال ان اشعار کے پیش نظر اور بھی تقویت پاجاتا ہے

وہ کم نصیب جسے راہ میکدہ نہ ملی
یہ جان لو اسے منزل کا راستہ نہ ملا

یہ شکستہ جام یہ خالی سبو یہ قحط مئے
اب کہاں میخانہ رندو یہ کبھی میخانہ تھا

کیا کیا نہ چھیڑتے ہیں اسے اہل عقل و ہوش
آیا کبھی جو آپ میں دیوانہ آپ کا

جب تغزل اپنے حسن کی معراج پر ہوتا ہے تو کچھ اور ہی لطف ہوتا ہے۔ اس وقت تو بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ کوئی جادو جگائے جا رہا ہو۔ وہ کیفیت

دل و روح کو میسر آتی ہے کہ بس جھوم جھوم کر مزہ لیا
جاتا ہے۔ شاید اسی لئے غزل کی انتہائی منزل نہیں آتی
ہے اور شاید اس وقت تک یہ کسی بھی منزل پر نہ ٹھہرے
جب تک حسن کے جادو جگانے والے اور دل کے
تاروں کو چھیڑنے والے نئے نئے آتے رہیں گے

محفلِ ناز کے دستور رہے ہیں کیا کیا
ہم زباں رکھ کے بھی مجبور رہے ہیں کیا کیا

آتی رہیں جو یاد ادائیں تمام رات
دیتا رہا دل انکو دعائیں تمام رات

کروں تو کس کے حوالے کروں سفینۂ دل
سبھی یہاں نظر آتے ہیں ناخدا کی طرح

نہیں کہ آپکے وعدے کا اعتبار نہیں
یہ اور بات ہے اب تاب انتظار نہیں

چاہے غمِ دنیا ہو چاہے غمِ عقبیٰ ہو
یہ بھی غم جاتا نہ وہ بھی غم جاتا نہ

کہیں کوچہ یہ اسی کا تو نہیں ورنہ مجھے
اس جگہ وحشتِ دل کھینچ کے کیوں لائی ہے

کتر دیتا ہے پر کچھ اور بھی صیاد جھنجھلا کر
لبوں پر میرے جب بھی آشیاں کا نام آتا ہے

ہمارا آشیاں وہ آشیاں ہے
جہاں آسودہ برقِ بے اماں ہے

ایک دل ہے ہزار آفت ہے
میرے اللہ کیا قیامت ہے

اس نے رندوں کو وہیں تک سمجھا
عقلِ ناصح کی جہاں تک پہنچی

وارفتگیٔ شوق کی دشواریاں نہ پوچھ
آنکھیں دکھا رہی ہے تری رہگزر مجھے

ایسے ہی اور کئی اشعار سے "نگارِ فکر" کا دامن بھرا
ہوا ہے۔ اس میں کوئی جرأت کی بات بھی نہیں ہے
کیونکہ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں، شاعر
کی بھی تو کارگزاری کچھ ایسی ہی ہونی چاہئے تھی۔ رہی
یہ بات کہ کہاں کہاں ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے
اس کا ذکر کیا، چاند کی چاندنی کو دنیا دیکھتی ہے اور
اس پر جان دیتی ہے۔ اس کے دھبوں کے سبب
کوئی بھی اس سے بدظن نہیں ہو جاتا۔ پھر انسانی فکر
اور انسانی کاوش میں تو کوئی نہ کوئی رخنہ رہ ہی جاتا
ہے۔ یہ قدرت اور اس کے شاہکار ہی ہیں جو
ہر ایک خامی سے پاک ہیں۔

اس لئے میں اس سلسلے کی کوئی بات بھی نہیں
کرنا چاہوں گا، کیونکہ مجھے کچھ ایسا مناسب بھی معلوم
نہیں ہوتا۔ اسعدی صاحب نے اپنے ماحول اپنے گرد و پیش
اور اپنے کوائفِ زندگی کے ساتھ جتنا اچھا وہ کہہ سکتے تھے

کہا ہے اور یہی ایک شاعر کے لئے کافی ہے۔

اسدی صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان کی ابتدا حافظ کے اس مصرع سے کی ہے۔ خوش می کند حکایت عز و وقار دوست' ——— یہ نظمیں عقیدت کے جذبات اور احساسات لئے ہوئے ہیں اس لئے یہ نظموں کے طور پر نظمیں نہیں کہی ہوئی ہیں' ان میں خلوص اور صداقت کی جھلک ہے کیونکہ ان میں دل کی آنچ ہے۔ جن ہستیوں سے متعلق دل نے واقعی عقیدت محسوس کی ہے ان ہستیوں کے بارے میں کچھ کہنے میں واقفیت کا آجانا لازمی تھا اور یہ ایسی نظموں کی بڑی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان میں فطری آرٹ کی خوبیو۔ ڈھونڈ نا مناسب نہیں۔

اسی ذیل میں چند قومی نظمیں بھی آجاتی ہیں۔ ان سے اسدی صاحب کی حب الوطنی ٹپکتی پڑتی ہے اور اسی وجہ سے ان میں جوش بھی ہے۔ جو آتش فشاں کے لاوے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک سچے اور اچھے وطن پرست کے یہاں یہ ہونا بھی چاہئے۔ میرا خیال ہے ایک اچھے شاعر کو وطن پرست ہونا چاہئے۔ اگر وہ وطن پرست نہیں ہے تو اس کے اچھے شاعر ہونے میں شبہہ ہی رہے گا۔ وطن پرستی سے صدق خلوص کا پتہ چلے گا اور صدق و خلوص سے جو فن معرا ہوتا ہے اس کی آبرو معلوم۔

قطعات بھی ان کے طبع موزوں کا موضوع بنے ہیں لیکن یہ بھی ان کا موضوع نہیں معلوم ہوتے کیونکہ وہ عصری نزاکتوں اور بلندیوں کو نہیں چھوتے۔ اچھے قطعات اس انداز کے دیکھنے میں نہیں آتے ہیں

با وفا بھی بے وفا ہے ان کو کہنے دیجئے	آہ کرنا بھی گلہ ہے ان کو کہنے دیجئے
انکی دنیا ان کی محفل انکے لوگ ان کی زباں	ہاں انہیں سب کچھ روا ہے انکو کہنے دیجئے

لیکن قطعات کے حسن کی بات ہی اور کچھ ہے۔ اکثر اوقات تو وہ رباعی کے حسن کو آنکھیں دکھانے لگتے ہیں' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسدی صاحب کے قطعات توجہ نہیں چاہتے۔ کہنا یہ ہے کہ ان کی طبیعت کے جوہر غزل ہی میں کھلتے ہیں اور غزل ہی ان کا اصل موضوع ہے' نہ نظمیں نہ قطع' اور نہ دوسری چیزیں۔

کریم اسدی کی غزل گوئی

سید غلام السیدین ناوک حمزہ پوری

مدیر سہیل گیا کی وساطت سے جناب کریم اسدی کا مجموعہ کلام "نگار فکر" میرے مطالعہ میں آیا۔ اختر ناصح نقیب کے الفاظ میں جناب کریم خالص غزل کے شاعر ہیں۔ خود کریم صاحب کو بھی اپنے غزل گو شاعر ہونے کا اعتراف ہے اس لئے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس زاویۂ نظر سے "نگار فکر" کا جائزہ لیا جائے

اردو شاعری کا باوا آدم غزل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مشکل ترین صنف غزل سخن بھی ہے۔ غزل ایک مدت مدید تک حسن بے وفا اور عشق باوفا کے رنگین معتقدین میں الجھی رہی۔ آج بھی خالص تغزل کا حمایتی طبقہ "ذکر بتاں" کی حدود میں ہی اسے رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف غزل کو نئے تجرباتی دور سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ اس عرصے میں غزل کے متعلق طرح طرح کے اعتراضات بھی کئے جاتے رہے ہیں۔

غزل کے بارے میں سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ قافیہ و ردیف کی پابندی احساسات و خیالات کی کماحقہٗ ترجمانی میں مخل انداز ہو جاتی ہے معترضین کا دعویٰ ہے کہ اس پابندی کی وجہ سے ہوتا یہ ہے کہ اکثر شعراء کے ذہن میں پہلے قافیہ آتا ہے پھر اسی قافیہ کی مناسبت سے جو خیال ذہن میں آتا ہے اسی کو شعرا قالب شعر میں ڈھال دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر کی تخلیق میں اس کے تجربے اور مشاہدے سے زیادہ اس کے تخیل کی دنیا بچی بسی ہوتی ہے۔ نئے مسائل فلسفیانہ تسلسل چاہتے ہیں اور قافیہ و ردیف کی قید ان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے بات یہیں تک رہتی تو کوئی بات نہ ہوتی۔ اس مکتبۂ خیال کا ترجمان "جرأت مند" شعراء کا ایک طبقہ رسہ تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا اور ان قیود سے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آزاد ہو گیا۔ اسی طرح کبھی غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا گیا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ بدلتے ہوئے حالات اور بڑھتے ہوئے خیالات کا ساتھ یہ نہیں دے سکتی۔

ان اعتراضات کے باوجود غزل برابر ترقی کے زینے طے کرتی گئی۔ اس کی ہر دلعزیزی کبھی کم نہ ہوئی۔ اس کا حسن نکھرتا گیا۔ اس کی دل آویزی اور دل فریبی میں برابر اضافہ ہی ہوتا گیا۔ میر۔ غالب۔ مومن۔ ناسخ۔ داغ جرأت۔ حسرت۔ اصغر۔ فانی اور جگر تک کے تمام شعرا گلستان غزل کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف رہے اور اس کا دامن نئے نئے گل بوٹے سے بھرتے رہے یہی نہیں موجودہ شعراء کی بھی ایک اچھی خاصی جماعت مذکورہ

بشرط استواری ؑ کے مصداق "ذکر بتاں" میں کھوئی ہوئی ہے وہ ان روایات پسندی کو رجعت پرستی نہیں بلکہ ایک صحت مند مسلک تصور کرتی ہے

کریم صاحب کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر تغزی اور جدت طرازی کے دور میں بھی وہ مذکورہ بالا شعراء کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں کریم صاحب کے مجموعہ کلام کی بسم اللہ غزلوں سے ہوتی ہے۔ ان غزلوں میں غزل کی روایات کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔ اساتذہ کے کلام کا شوخ چھاپ بھی جگہ جگہ بہت واضح ہے۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر کریم صاحب کی شروع کی صرف دس غزلوں کے مطلعے نمونتاً پیش کرنا چاہوں گا۔ یہاں یہ بتا دینا بے جا نہ ہوگا کہ یہ اشعار مختلف جگہوں سے منتخب نہیں کئے گئے ہیں بلکہ دس سلسلے وار غزلوں کے مطلعے پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں انتخابی کاوش کو کوئی دخل نہیں اور اسی لئے کلام کریم کا اصلی رنگ یہ اشعار واضح کرتے ہیں۔

۱۔ سارا زمانہ ہوگیا دیوانہ آپ کا
کس کی زبان پر نہیں افسانہ آپ کا

۲۔ میرے لئے یہ عشق نہ پوچھو کہ کیا ہوا
اتنا بڑھا کہ اک مرضِ لا دوا ہوا

۳۔ مشتہر میرا فسانہ ہوگیا
اب تو دشمن اک زمانہ ہوگیا

۴۔ ترے لب پر کب اے ساقی ہمارا نام آئیگا
نگاہ لطف کب ہوگی ادھر کب جام آئیگا

۵۔ محبت کا پیماں نہ سوچا نہ سمجھا
غم ہجر جاناں نہ سوچا نہ سمجھا

۶۔ محفلِ ناز کے دستور رہے ہیں کیا کیا
ہم زباں رکھ کے بھی مجبور رہے ہیں کیا کیا

۷۔ کہوں یہ کیسے محبت کا کچھ صلا نہ ملا
کسی کی یاد ہی کیا کم ہے مجھکو کیا نہ ملا

۸۔ کس قدر خوش بخت و خوش انجام وہ دیوانہ تھا
جس کے لب پر وقت آخر بھی ترا افسانہ تھا

۹۔ دیکھ کر حالِ رقص بسمل کا
اڑ گیا رنگ روئے قاتل کا

۱۰۔ دیکھئے شوق سے ہاں دیکھئے بسمل کی تڑپ
اپنے تیغ نگہہ ناز کے گھائل کی تڑپ

آپ دیکھتے ہیں کہ ان اشعار میں روح غزل اپنی پوری جلوہ سامانی کے ساتھ جاری اور ساری ہے حسن و عشق کے افسانے بھی ہیں۔ ساقی شراب اور پیمانے بھی ہیں۔ محبت کا پیمان بھی ہے۔ غم ہجر جاناں بھی ہے۔ عاشق کی وفاشعاری بھی ہے۔ معشوق کی جفا کاری بھی ہے۔ قاتل بھی ہے بسمل بھی ہے۔ تیغ نگہہ ناز بھی ہے ایک سوز بھی ہے ایک گداز بھی ہے۔ ساز بزم بھی ہے اور گہرا رنگ تغزل بھی ہے

کریم صاحب کے یہاں زبان و بیان کی سادگی سلاست اور روانی بھی اپنے عروج پر ہے بعض غزلیں پوری کی پوری دیکھ جائیے ایک ہلکا پھلکا اسلوب بیان ملے گا۔ درج ذیل ایک پوری غزل میں کہیں یک زیر اضافت بھی نہیں ہے ؎

غضب ہوگیا داستاں کہتے کہتے
قفس کہہ دیا آشیاں کہتے کہتے
بڑھیں حوصلے کیوں نہ میری وفا کے

ترے جور کی داستاں کہتے کہتے
وہ غاروں کو کہنے لگے کیوں رقیب اب

گل و سرو کا راز داں کہتے کہتے
خدا جانے کیوں کہہ رہے ہیں رقیب اب

ستم کو ترے امتحاں کہتے کہتے
ہمیں نے ستمگار تم کو بنایا

بھری بزم میں مہرباں کہتے کہتے
کریم اب تو اپنی زباں رک رہی ہے

نئے عہد کی داستاں کہتے کہتے

پوری غزل کے لب و لہجہ میں یکساں طور پر سادگی و صفائی ہے۔ کسی قسم کا اہتمام بیان نہیں اور یہ خوبی ہر جگہ یکساں طور پر موجود ہے۔ یہ زبان پر قدرت کا ایک ثبوت ہے۔

وہ کم نصیب جسے راہ میکدہ نہ ملی
یہ جان لو اسے منزل کا راستہ نہ ملا

کس طرح چھوٹیں اسیران حیات
سارا عالم قید خانہ ہو گیا

آتی رہیں جو یاد ادائیں تمام رات
دیتا رہا دل ان کو دعائیں تمام رات

بساؤ شوق سے تم اپنی دنیا
ہماری آرزوؤں کو مٹا کر

جناب کریم کے اشعار میں ایک داستان عشق پوشیدہ ہے۔ یہ عشق مجازی نہیں بلکہ عشق حقیقی سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک ہمہ گیر محبت ہے ان کی یہ محبت کسی لیلیٰ یا شیریں کی محبت نہیں بلکہ خدا کی محبت ان کے دل میں کارفرما ہے۔ اس جذبہ حقیقی کی صداقت ان کے ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے ؎

حریم دل مرا مسکن ہے اس کا
مگر شہرہ ہے یہ وہ لامکاں ہے

نہ دیکھا تمہیں یہ مری کم نگاہی
کہاں ورنہ جلوہ تمہارا نہیں ہے

وعدۂ دید قیامت پہ رہا
بات اتنی سی کہاں تک پہنچی

محبت الٰہی میں کریم صاحب کی بے خودی ملاحظہ کیجئے

کچھ ایسے لمحے بھی گذرے ہیں یاد میں ان کی
پتہ خود اپنا نہ پایا کبھی کبھی میں نے

کس قدر بڑھتی گئی ساقی سے میری رسم و راہ
دل کی دنیا ماسوا سے بے خبر ہوتی گئی

اور جذبۂ خود سپردگی دیکھئے ؎

مئے زیست کی گرچہ ہے تلخ لذت
پیئے جا رہا ہوں کہ مرضی تری ہے

مٹیں بھی ہم تو بس مرضی پہ اس کی
یہی جینے کا اپنے مدعا ہے

یہ تو ہوا کریم صاحب کی غزلوں کا روایاتی رنگ ہے یہ کلام اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کے اثر سے پیدا ہوئے

ہوں یا شاعر کی ذہنی کیفیت کی پیداوار ہوں۔ آج کے بحرانی دور میں اتنا تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ آج نہ تو پہلی جیسی آسودگی ہے اور نہ پرسکون فضا ہی میسر ہے۔ آج کا شاعر تخیلی معشوقہ کے حسن و عشق کے بیان میں الجھ کر دنیا ومافیہا سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور اگر رہتا ہے تو اس کی شاعری میں حقیقت کا شائبہ ڈھونڈنے سے بھی دور دور تک نہ ملے گا۔ "خالص تغزل" اور چیز ہے اور جیتی جاگتی دنیا کے مسائل کو تغزل کے پردے میں بیان کرنا اور چیز ہے مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کریم صاحب صرف تخیلی دنیا کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ ہم اور آپ کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی دنیا سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہیں۔ موجودہ دور کی انقلابی اور نفسا نفسی کی کیفیت وہ سمجھتے ہیں ؎

ہر ایک اپنی دھن میں ہے کھویا ہوا کریم
اس بزم میں کسی کو کسی کی خبر نہیں

گردشِ شام و سحر ہے اور ہم
زندگی زیر و زبر ہے اور ہم

موجودہ زمانے کی افرا تفری کی یہ بہترین ترجمانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کریم صاحب غمِ دوراں کو بھی غمِ جاناں کے ساتھ جگہ دینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

آ تجھے بھی دوں جگہ دل میں غمِ جاناں کے ساتھ

یہ اور بات ہے کہ اس محفل کی زباں بندی کے دستور سے کریم صاحب کو اپنی مجبوری کا احساس ہے۔

محفلِ ناز کے دستور رہے ہیں کیا کیا
ہم زباں رکھ کے بھی مجبور رہے ہیں کیا کیا

لیکن اس ظلم و ستم سے مجبور ہو کر ان کی زبان بات کہنے کو ترستی نہیں ہے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا نہیں چاہتے۔ ناگوار حالات کے نرغے میں رہتے ہوئے بھی وہ بہارِ گل کو لٹتے ہوئے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے ؎

بہارِ گل کو لٹتے تا بکے دیکھیں خموشی سے
گلستاں میں رہیں یوں سی کے ہم اپنی زباں کب تک

شاعر کا ذہن تعمیری ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب تک زندگی ہے نئے نئے حادثات سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے اس لئے حادثات کا شکوہ کرنا وہ بیکار سمجھتا ہے ؎

زیست سے وابستہ ہیں جب حادثات
حادثاتِ زیست کا شکوہ عبث

نامساعد حالات میں بھی وہ حوصلے اور عزم بالجزم کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں ؎

اہتمامِ نشیمن کئے جائیں گے
برق بیتاب شعلہ فگن ہی سہی

واقف ہیں ہم مزاجِ برقِ شرر فشاں سے
باز آئیں گے نہ پھر بھی تعمیر آشیاں سے

آتش تحریک آزادی کو شعرائے اردو نے دامنِ شعر و شاعری سے جو ہوا دی اور اسے جس طرح شعلہ فگن بنایا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں لیکن آزادی کے بعد جو حالات پیدا ہو گئے ان سے لازمی طور پر ان میں ایک طرح کی بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی۔ قفس میں رہ کر گلستاں کا جو نقشہ ذہن میں سجا کر، سنوار کر وہ رکھے ہوئے تھے جب گلشن کی حالت دگرگوں نظر آئی تو ان کے دلوں میں ایک

طرح کی مایوسی پیدا ہو گئی

بہار آئی ہے اک موسم ہے کریم مگر
ترس رہی ہے ہمو کو کلی کلی اب تک

نہ شگفتگی ہے نہ تازگی نہ وہ دلکشی نہ وہ دلبری
یہ بہار کوئی بہار ہے کسی گل کے لب پہ ہنسی نہیں

بعض حالات میں جو امتیازی سلوک روا رکھے جاتے ہیں ان کی طرف بھی کریم صاحب کے یہاں ہمیں حسین اشارے ملتے ہیں ؎

زینت چمن کی گل ہیں تو زیبا ہیں خار بھی
دیکھیں اسے جو دیدۂ دوراں کی نظر سے آپ

ترے لب پر کب لے ساقی ہمارا نام آئیگا
نگاہِ لطف کب ہوگی ادھر کب جام آئیگا

خبر کیا تھی کبھی ہم کو بھی یہ دن دیکھنا ہوگا
تری محفل میں سمجھے جائیں گے ہم اجنبی لے دست

کریم صاحب احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی اہمیت کو نہ صرف یہ کہ خود سمجھتے ہیں بلکہ اوروں کو جتا بھی دینا چاہتے ہیں

رونق ترے چمن کی فزوں باغباں رہے
قائم جو شاخ گل پہ مرا آشیاں رہے

کریم صاحب دیر و حرم کے جھگڑے میں الجھ کر گم کردہ منزل ہونے کا عادی نہیں۔ جور و ستم کے زخم پر مہر و وفا کا مرہم رکھنا انہیں آتا ہے۔ وہ وطن عزیز ہندوستان کو ایک بار پھر جنت نشان بنانے کا عزم بلند رکھتے ہیں۔ ؎

چھیڑو نہ ہمدمو! ابھی دیر و حرم کی بات
پیدا کریں خود اپنے وطن میں ارم کی بات

عیش تیز بگو کے مصداق بھی کچھ کہنا چاہوں گا کریم صاحب کے متعلق کہا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں غم دوراں اور غم جاناں کا حسین امتزاج ہے۔ میرا خیال ہے کہ کریم صاحب ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں سے ایک راستہ غم جاناں کی طرف جاتا ہے اور دوسرا غم دوراں کی طرف۔ شاعر ایک کشمکش و پیچ کی حالت میں ہے اسکی قوت ارادی ابھی تک کسی ایک راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔

غزلوں کو حروف تہجی کے مطابق سجانے کی کوشش بے کار کی گئی اور اسی وجہ سے کچھ غزلیں فقط آورد ہی آورد کی رہین منت ہیں۔ آمد کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا ؎

ترے میخانے کی مل جائے جو ساقی تلچھٹ
وہی ہو جائے گی میرے لئے کافی تلچھٹ

صفحہ ۱۳۵ پر ؎

تجھ کو روش صحن چمن ڈھونڈ رہی ہے
ہر اک نگہہ سرو سمن ڈھونڈ رہی ہے

کے مطلع کے تحت جو غزل ہے اسے کسی طرح غزل کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ ان میں ایک نظم جیسا تسلسل بھی ہے اور وحدت تاثر بھی۔ بہتر ہوتا اگر اسے نظم ہی رکھا جاتا ——

کریم اسعدی

از:- لطف الرحمٰن

میانہ قد، متناسب قد و قامت، گندمی رنگ اور اس پر کسی قدر تیکھے نقوش، چوڑی پیشانی، آنکھوں پر عینک، زلف ایسی کہ جیسے صبح و شام گلے مل رہی ہو اور اس پر دستار کے بجائے ایک بہت نفیس ٹوپی، چہرے پر حسن خشی داڑھی۔ جب پہلے پہل ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی اس سج دھج نے جیسے اقبال کے لفظوں میں "ادائے قلندرانہ" کہیے۔ میری توجہ شدت کے ساتھ اپنی طرف مبذول کی لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ کون سی خصوصی چیز تھی جو میرے لئے ان کی شخصیت کو پرکشش بنا رہی تھی۔ کئی ملاقاتوں کے بعد میری وہ انجان سی حیرت یوں ختم ہوئی جب مجھ سے شام کے ایک جھٹپٹے میں بھاگلپور کے اس مشہور میکدے میں ان سے ملاقات ہوئی جو یہاں کے شاعروں کے لئے گوشۂ عافیت بھی ہے اور کعبۂ شعر و سخن بھی۔ مدھم روشنی میں سب سے نمایاں چیز ان کی کج کلاہی کلاہ خسروی کو بھی مات کر رہی تھی۔ ان کی شخصیت میں جو قلندری شانِ استغنا اور دردمندی خود اعتمادی بے نیازی اور خود آگہی ہے۔ ان کا اظہار بہت ہی جامع انداز میں ان کی کج کلہی سے ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کی شرافت، نجابت اور اخلاص و اخلاق کا اظہار بھی ان کی یہی کج کلہی کرتی ہے۔ فیض کے اس شعر میں بھی وہ کیفیت خصوصیت نہیں ہے جو کریم اسعدی میں پائی جاتی ہے۔ فیض کہتے ہیں ؎

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

میں سمجھتا ہوں کہ ان کی کج کلہی میں بھی غرورِ عشق ہی کا بانکپن کارفرما ہے۔ اس لئے میں اس کو "نازِ خسروانہ" سے تعبیر نہیں کر سکتا۔

کریم اسعدی کی شخصیت میں جو تواضع انکساری، خاکساری ٹھہراؤ اور بردباری ہے وہ اس مادی دور میں بڑی انوکھی اور قابلِ حیرت ہے۔ کوئی بھی اجنبی آدمی ان سے پہلی ملاقات کے بعد یہی محسوس کرتا ہے ؎

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

اس لئے کہ وہ ہم میں اگلی شرافت اور وضعداری کی علامت نظر آتے ہیں۔ بھاگ، دوڑ اور مادہ پرستی کا یہ عہد جس نے ساری دنیا کو ایک بے آب و گیاہ ریگستان میں بدل دیا ہے اس میں کریم اسعدی جیسی شخصیتیں نخلستان کی سی شادابی، تر و تازگی، ٹھنڈک اور سکون رکھتی ہیں، ہم نے ہمیشہ ان سے ملنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ میری ملاقات مشین نما آدمیوں کی اس بھیڑ میں ایک انسان سے ہوئی ہے۔ اور وہ بھی ایسے انسان سے جو ہمارے ماضی کی تمام حسین و جمیل قدروں کا امین ہے۔

ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ اس تیز رو کائنات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب یہاں صدیاں بھی لمحوں کے دوش پر

المیہ یہ ہے کہ موجودہ عہد نے ہر انسان کی ذاتی و شخصی زندگی کو بے اندازہ آلام و مصائب اور ہمہ گیر مصروفیات کا شکار بنا دیا ہے جس کی وجہ سے آج کا ہر آدمی مشین بننے پر مجبور ہے۔ اس لئے وہ فرصت کی اک نظر کو بھی ترستا رہ جاتا ہے اس پس منظر میں، میں کریم اسدی صاحب کی شخصیت کا بھرپور اور گہرا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے لئے اتنا وقت نہ نکال سکا جتنا چاہئے اسکے باوصف میں نے جن جن پہلوؤں سے ان کے مزاج اور طبیعت کی افتاد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی روشنی میں ان کی شخصیت کا ایک مختصر خاکہ میرے ذہن میں موجود ہے۔

پہلی بار ان سے میری ملاقات نواب ارشاد حسین زیدی صاحب کے دولت کدہ پر ایک شعری نشست میں ہوئی تھی وہاں شہر کے دوسرے شعرا کرام بھی موجود تھے۔ لیکن جن مخصوص لوگوں نے مجھے اس مختصر سی ملاقات میں متاثر کیا انہیں کریم اسدی صاحب کی شخصیت نمایاں تھی۔ وہ اس بزم میں خالص مشرقی انداز و آداب کا ایک دلکش نمونہ نظر آرہے تھے۔ وضع قطع اور لباس و پوشاک اور نشست و برخواست ہر جہت سے ان میں نمایاں تھی چونکہ اب   ہماری سماجی اور اجتماعی زندگی سے قریباً ناپید ہو چکی ہیں۔ اس لئے میری نگاہ مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ شعر و سخن کی محفل گرم تھی۔ لیکن میں اپنی جگہ پر شدت سے ان کی باری کا منتظر تھا۔ چونکہ ان کی ظاہری وضاحت نے میرے دل میں کافی کشش پیدا کر دی تھی۔ اس لئے میں ان کے فنی شعور اور شاعرانہ مزاج کو سمجھنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ جب خدا خدا کر کے پیر مغاں یعنی پروفیسر مظفر اقبال صاحب نے ان کا اسم گرامی پکارا میں ہمہ تن گوش ہو گیا کچھ ہی دیر کے بعد کریم صاحب نے بڑے متین سنجیدہ اور ٹھہرے ہوئے پروقار انداز میں غزل چھیڑی گرچہ وہ تحت اللفظ میں غزل پڑھ رہے تھے لیکن ان کے اس انداز میں بھی شیرینی دلکشی والہانہ پن رچی ہوئی اور بے اندازہ اثر آفرینی تھی۔ اعلیٰ پایہ کا کلام اور پروقار لب و لہجہ ان دونوں نے سامعین کو بے خود بنا دیا۔ میں بھی اپنی جگہ پر ایک دلکش کیفیت سے سرشار ہوتا رہا۔ انہوں نے غزل ختم کی لیکن اس کا اثر دیر تک مجلس کی فضا پر چھایا رہا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کریم اسدی سے میری وہ پہلی ملاقات نہیں تھی بلکہ میں ان کو برسوں سے جانتا تھا۔

میرا یہ جملہ نہ تو کسی اغراض و نمود کا غماز ہے۔ اور نہ مدح سرائی پر مشتمل ہے۔ دراصل ان کے مزاج میں سرد ست جو رجحانات ہیں وہ میری نظر میں یہی ہیں اور میں ان قدروں پر کچھ ایمان و اتفاق بھی رکھتا ہوں۔ اس لئے مزاج اور سیرت کی کوئی قدر مشترک ایسی ہے جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کئی ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کے یہ عناصر زیادہ واضح اور نمایاں طور پر سامنے آنے گئے۔ کریم صاحب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں جذباتی یا احساسی لہریں کم اثر انداز ہوتی ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ جب زندگی ایک ٹھہراؤ سے آشنا ہو جاتی ہے ایسی صورت حال میں شخصیت کے خارجی اور باطنی دونوں پہلو ایک دوسرے سے گہرے طور پر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے اسی موڑ پر ذہین اور سادہ شخصیتیں تکلف اور ظاہر داری کے عیوب سے پاک ہو جاتی ہیں۔ ان کی خارجیت ان کی داخلیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور ان کی داخلیت کی تشکیل و تعمیر ان کی خارجیت سے ہوتی ہے۔ کریم صاحب کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ یہی بات ہے کہ ان کے فن و شعر میں ان کی شخصیت کے یہ تمام عوامل منعکس ہو گئے ہیں اس اعتبار سے وہ اپنے دل کی دنیا میں جو کچھ سوچتے اور سمجھتے ہیں اسی کا اظہار دوستوں کی محفل میں برملا کرتے ہیں۔ یعنی مصلحت اندیشی اور ہر قسم کے تصنع سے بری ہو کر

ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کی مخلصانہ کوشش کرتے ہیں ان کے کلام
میں ان کی فطرت کی یہ سادگی اور بے تکلفی ہر جگہ روشن ہے جس کی
طرف ان کے کلام کا تجزیہ کرنے والے حضرات موقع و محل کی مناسبت
سے اشارہ کریں گے ۔ چونکہ یہ اپنا موضوع نہیں ہے اس لئے دانستہ
گریز کیا جاتا ہے ۔

کریم صاحب اتنے نیک معصوم اور سادہ دل کے آدمی ہیں
کہ وہ موجودہ معاشرہ کی سازشوں اور چھل کپٹ سے صلح نہیں کرسکتے
اور نہ اس میں کسی طرح ڈھل سکتے ہیں۔ اسی لئے مجلسوں میں ڈبا ہوم
گرما گرمی کے ساتھ بحث و مباحثہ کا ساتھ کے بجائے ایک پروقار
تبسم سے کام لینے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ان کا یہ تبسم اور ان کی
یہ بولتی ہوئی خاموشی ہزاروں تقریروں پر بھاری ہے ۔

پچھلی تہذیب و تمدن کی روشنی نے کریم صاحب کے
دل میں انسانیت کے لئے بڑی جگہ پیدا کردی ہے ۔ آج کے عہد
نے نئی نسلوں کو خود غرضی اور مفاد پرستی کی جن لعنتوں کا شکار
کردیا ہے وہ اجتماعی اور انفرادی دونوں اعتبار سے ہماری سماجی
زندگی کے لئے خطرہ کا زبردست نشان بن گیا ہے ۔ اس گھٹی ہوئی
فضا میں کریم صاحب کی جیسی شخصیتیں گھنگھور تاریکی میں چمکتے ہوئے
جگنو کی طرح ہیں ۔ آج کے عہد میں اپنے آپ کو ہر قسم کی عصبیت تنگ
نظری اور کم دلی سے دور رکھنا بہت مشکل ہے کریم صاحب ان
تمام تفریقوں سے بالاتر ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ حتی الوسع
لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے مواقع پر بلا
تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل ، وہ ضرورت مند کی
طرف دست تعاون بڑھا دیتے ہیں ۔ اس سے بڑھکر موجودہ
سماج میں کسی انسان کی عظمت اور کیا ہوسکتی ہے ۔ جب
ساری زندگی ظاہری آب و تاب ، چمک دمک اور شان و
شوکت کی نذر ہو کے رہ گئی ہو ۔ اس وقت حقیقتوں کی تہ تک
پہونچنے کی کاوش سچائی کی تلاش جاں نثاری کا جذبہ اور
انسانیت کے دکھ درد سے متاثر ہونے کی صفت کوئی معمولی
صفت نہیں ہے ۔ کریم صاحب میں یہ ساری صفتیں کوٹ
کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

یوں تو کریم صاحب وضع قطع کے اعتبار ہی سے مسیحا
معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن دو جہتوں سے خصوصی طور پر مسیحائی کے فرائض
انجام دیتے ہیں ۔ ایک تو شاعرانہ اور فنکارانہ جہت ہے یعنی وہ
اپنے شعر و سخن سے تشنہ دلوں کی مسیحائی کی کوشش کرتے ہیں۔
لیکن حقیقی معنوں میں وہ اس طرح مسیحائی کرتے ہیں کہ بیماروں اور
معذوروں کو مفت دوائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے وہ
اپنے دولت کدہ پر جو ہومیوپیتھک مطب رکھتے ہیں اور ضرورت
مندوں میں بلاکسی معاوضہ کے دوائیاں تقسیم کرتے ہیں یہ سلسلہ
بقول نسیم صاحب ایک مدت سے چل رہا ہے ۔ زمانے بدلتے
گئے اور زندگی کے تقاضے نئی نئی صورتوں میں ان کے سامنے آتے
رہے ۔ لیکن انہوں نے خیر اور بھلائی کے اس پہلو کو کبھی نظر انداز
نہ کیا ۔ اور اپنے دیرینہ وضع پر استحکام کے ساتھ گامزن رہے
یہ صفت بھی ان کی محبوبیت کا پتہ دیتی ہے ۔ انہیں اسباب کی
بنا پر وہ اپنے شہر میں بے حد مقبول و معروف ہیں۔

ذریعہ معاش کے اعتبار سے استاد کا صاحب کی
زندگی کچھ ستم ظریفی کا شکار رہے ۔ فطرت نے انہیں شاعرانہ ذہن
و دماغ عطا کیا ہے ۔ اور وقت نے اوائل عمر ہی سے ایسا معروف
تاجرانہ کاروبار اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہے جس کو شعریت یا
ادبیت سے دور کا بھی علاقہ نہیں بلکہ کسی حد تک اس کی راہ میں
سنگ گراں کی حیثیت رکھتا ہے ۔

کریم صاحب کی شاعری محض رجعت پسندی یا قدامت
پرستی کا دوسرا نام نہیں ان کے ذہن رسا اور ان کی حد سے زیادہ

احساسی قوت نے زندگی کے ہر پہلو کو بدلتے ہوئے حالات سے
نیا سبق حاصل کرنے کی صلاحیت دی ہے اس لئے ان کے یہاں زندگی
کے تمام پہلوؤں کے تمام اہم تقاضے مل جاتے ہیں اسلوب کے اعتبار
سے ان کے کلام پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد کوئی شخص یہ کہہ سکتا
ہے کہ کریم صاحب کی شاعری گل و بلبل کی بزنام اصطلاحوں
سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکی۔ مگر ان کے کلام کا ایک گہرا مطالعہ بڑی
آسانی کے ساتھ قاری کو یہ بتا دیتا ہے کہ کریم صاحب نے ان
اصطلاحوں کو بھی نئے نئے مفاہیم و مطالب سے آشنا کیا ہے
ان کے یہاں اصطلاحیں اکثر و بیشتر علائم و رموز کی صورتیں اختیار
کر لیتی ہیں اس لئے ان کے شعر صد پہلو ہوئے ہیں۔ اب جو کوئی جس
نظر سے دیکھے اور جس طرح کا معنی اخذ کرے یہ اس کے اندازِ نظر کی
بات ہوگی۔ فنکار کسی بھی صورت میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا
جا سکتا۔

کریم صاحب کا اسلوب صاف سادہ رواں
سلیس اور مترنم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ تمام رجحانات ان
کی شخصیت میں گہرے طور سے پیوستہ ہیں۔ میں نے کبھی انکو تکلف
و تصنع کا شکار نہیں دیکھا۔ قبل کے سطور میں بھی ان کا ذکر
کر چکا ہوں کہ ان کی شاعری میں بھی میرا تجربہ اسی نوعیت کا
حامل ہے۔ یعنی وہ جو کچھ دل میں محسوس کرتے ہیں اس کو سچائی
خلوص اور صداقت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں اس لئے ان کا
سارا کلام آمد کی خصوصیات رکھتا ہے۔ جیسا تشنگی اور تاثر آفرینی
تقریباً لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا ثبوت کریم اسعدی کا مجموعہ کلام
"نگار فکر" ہے۔

کریم صاحب سے میری ملاقات زیادہ تر شعری
محفلوں کی رہین منت ہے۔ ان کے دولت کدہ پر حاضری دینے
کا مجھے موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ مگر پہلی بار اپنے ایک دوست کی
علالت کا شکار ہو کر میں ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتا ہوا جب
ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں اپنی
ساری بے تکلفی کے ساتھ براجمان تھے۔ لنگی اور گنجی زیب جسم
کئے ہوئے پان سے شغل بھی کرتے جا رہے تھے۔ بیماروں کی
مسیحائی بھی فرما رہے تھے اور کاروباری فرائض بھی انجام
دئے جا رہے تھے۔

اتنے میں فضا چائے کے گرم گرم بھاپ سے آشنا
ہوئی گلاسوں میں چائے پیتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا ؎

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

وہ کمرہ کچھ اسی طرح کی ایک علامت نظر آ رہا تھا اپنی
تنگ دامانی کی وجہ سے وہ گور غریباں تھا۔ اور کریم صاحب کی
فراخدلی نے اسے فردوس نشاں بنا دیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے انہوں نے ہم لوگوں کی آمد کا مقصد
دریافت کیا میں جس مقصد کے پیش نظر وہاں جانے پر مجبور کیا
گیا تھا وہ کچھ عجیب قسم کا تھا اور اس لئے مجھے اپنے مقصد کے
اظہار میں کچھ تامل ہو رہا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے مولانا ارج الحسن
صاحب کا (مولانا موصوف خاص لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اور
امیر واعظ اور پنڈت بھی ہیں اور بھاگلپور میں اثنائے عشری کے
امام بھی ہیں) اس وقت ہم لوگوں کے کام آئے اور اپنے
مخصوص لب و لہجہ میں میری مجبوری ظفر اد کانوی صاحب
کی ضرورت اور اپنی موجودگی کا ذکر خیر کیا دراصل ظفر اد کانوی
"اقدار" کی خریداری کے سلسلہ میں بلائے ناگہانی کی طرح
میرے سر پر نازل ہو گئے تھے۔ میرا جرم محض یہ تھا کہ میں
ایم اے کے کلاسوں میں ان کا ہم سبق رہ چکا تھا مگر سزا تو
بھاگلپور کے احباب کو بھگتنی پڑی جس سے میری کچھ یاد

باقی صفحہ ۲۱۰ پر

شاغل قادری کی شاعری پر ایک نظر

از: ——— ظفر ادیب

قدرت کے تماشے عجیب ہی نہیں عجیب ترین ہوتے ہیں، جہاں امکان و آثار نہیں ہوتے وہاں گل کھلا دیتی ہے اور جہاں یقین کی فرماں روائی ہوتی ہے۔ وہاں وحشت برسا دیتی ہے۔ شاغل قادری صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ قدرت نے انہیں شاعر بنانا تھا، شاعر بنا دیا۔ اور ایسے سامان مہیا کر دئے کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

شاعری کے دو بڑے سرچشمے ہوتے ہیں، ایک تو خاندانی روایات و اقدار دوسرے زندگی۔ اگر یہ سرچشمہ خشک ہو تو قدرت کا معجزہ ہی ہوتا ہے کہ کوئی شاعر ہو جائے۔ اگرچہ اس صورت میں بھی شاعری حقیقی شاعری نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا چربہ بھی ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں بہت سی مل جاتی ہیں اور بہت حد تک لوگ شاعری کا دھوکہ کھاتے رہتے ہیں۔

اردو زبان میں شاعری کو شروع ہوئے طویل زمانہ گذر گیا۔ کیا کیا اور کیسے کیسے شاعر ہو گذرے۔

لیکن میر، غالب، اور اقبال کی بات کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ حالانکہ وہ اپنی بساط بھر بہت کچھ کر گئے، جو جگنو اور ستاروں کی مانند جگمگاتے رہتے ہیں۔ اور آج بھی نگاہ و دل کے لئے ایک انداز کی دعوت دئے جاتے ہیں۔ لیکن اتنے نہ ہوئے اور صرف تھوڑی دیر کا حسن دکھا کر چلے جاتے ہیں۔

دل کی فرماں روائی صوفی کے یہاں بھی ہے اور شاعر کے یہاں بھی یہ دونوں عاشق ہوتے ہیں۔ سجادہ میں رہ کر بھی اور سجادہ چھوڑ کر بھی۔ قادری صاحب دوسری ذیل میں آتے ہیں اسی لئے انہوں نے زندگی کی آنچ کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔ تہذیب اور تادیب تو انہیں ورثہ میں ملی ہیں۔ زندگی زمانے کے نشیب و فراز نے دیدی جب یہ کچھ ہو گیا تو پھر گنگنا اٹھنا دشوار نہ رہا۔

تہذیب نفسی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ اور یہ زندگی کے ہر شعبے میں کام آتی ہے۔ فن کی تو جان ہی ہوتی ہے وہ شاغل صاحب کو اپنے خاندان کے فیض سے حاصل رہی ہے۔ اسی لئے ان کی شخصیت میں اور ان کے فن میں انسانی قدروں کی آبرو موجود ہے ورنہ ممکن تھا کہ وہ کچھ نہ ہو سکتے جو آج ہیں۔ انہیں اس کے لئے اسی تہذیب نفس کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔

زندگی جیسے کہ ہر ایک بیدار دل کو عزیز ہوتی ہے ویسے ہی انہیں بھی عزیز ہے۔ بیشتر لوگوں کو زندگی صرف اپنے لئے عزیز ہوتی ہے۔ لیکن اہل دل کو زندگی دوسروں کے لئے عزیز رہتی ہے وہ اپنی زندگی سے زیادہ دوسروں کی زندگی کو نکھرا ہوا دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں ورنہ وہ ہر ایک کسک سے محروم ہو جائیں اور جیتے جی مرگھٹ سے بھی بدتر ہو جائیں۔

میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ طنزیہ نظموں کی طرف کیوں آئے اور کون سا رجحان انہیں اس رخ پر لے آیا۔ حالانکہ اس کے لئے انہوں نے جو تخلص منتخب کیا ہے (تلخ زمانی) وہ مجھے بہت ہی پسند ہے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر میں انفرادیت بھی ہے اور تر کی احساسات و جذبات بھی ہیں۔ اگر وہ اپنا تخلص ہی تلخ رکھ لیتے تو ان سے اور کچھ ہی ظہور میں آتا۔ جو موجودہ صورت میں نہیں ہو سکا۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ تخلص بدلنے میں توجہ نہ دیں تو طنز کو تیکھا کر کے جز و شاعر بنا لیں، اس لئے کہ ان کی شاعری کے خد و خال اور تیور بڑے ہی پیارے انداز میں کیلئے ہو جائیں گے۔ یہ نہ کر سکیں تو پھر اس طنزیہ شاعری میں اپنی قوت تخلیق بیکار نہ کھوئیں، اس سے بہتر ہے کہ وہ یہ بالکل نہ کہیں۔ اردو کی بدنصیبی کو بڑی حد تک اس کے شاعروں اور ادیبوں نے دور کیا ہے دنیا کی کسی بھی بڑی زبان سے کم اردو میں شاعر اور ادیب نہیں ہوئے ہیں اس سے جہاں اس کی آبرو حدود سے باہر پہونچ جاتی ہے وہاں آنے والوں کو بھی خوب سے خوب تر کی تلاش کا جذبہ ملتا ہے۔ ابوالکلام آزاد ایک ایسی ہی اردو زبان کو قدرت کی دین ہیں ان سے بہت سے لوگوں کو ولولہ ملا ہے اور بیشتر لوگوں نے اپنی زندگی اور اپنے ادب کی راہوں کے لئے ان سے روشنی حاصل کی ہے۔ میں شاغل صاحب کی نظر انتخاب کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے انہیں مطمح نظر بنائے رکھا۔ اس بات کا بھی شاغل صاحب کی شاعری کے نکھرنے میں بڑا ہاتھ ہے انہوں نے اپنے اسلوب اور اظہار کو باآہنگ اور پر وقار بنانے کے لئے انہی سے تحریک حاصل کی ہے۔

یہ درست ہے کہ ان کے یہاں موضوع کا نیا پن نہیں ہے یا بہت کم ہے۔ اور فن میں آرٹ کی تراش خراش بھی نہیں ہے لیکن اس کا اسلوب اور اظہار بے کیف نہیں ہونے پایا ہے۔ اور انہوں نے بات ایک خوشگوار انداز سے کہہ دی ہے یہ سید صاحب بھی انکی خاندانی روایات کی دین ہے یا ان کی سادہ اور سیدھی زندگی زبان کہیں بھی تیکھے ان کے تیور اختیار نہیں کرتی ہے۔ میں طوالت سے بچوں گا اور ہر بات کے لئے اشعار پیش نہیں کروں گا مگر کہیں کہیں اس سے مجھے پہلو بچانا ناگزیر بھی ہو جائے گا۔

قادری یہ سنز کردو شمع بقیں

چند لمحوں کی اب شبِ غم ہے

گھپ اندھیرا ہے تو کیا دل تو بہل جائے گا

آمدِ صبحِ درخشاں کی نزاکت کرد

جہاں چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرنے والے ہوں

دلِ ناداں وہاں سمجھے گا کوئی کیا ترے غم کو

چمن والو بہاروں کو ترس جاؤگے سن رکھو

ستم سے تنگ آکر صحنِ گلشن سے جو ہم نکلے

ان کے سارے شاعرانہ شوق میں اس انداز کے جواہرات بکھرے ہوئے ہیں اور صفحہ صفحہ پر دل و نظر تھامے رکھتے ہیں کوئی مقام ایسا نظر سے نہیں گذرتا۔

انہوں نے بہت کم ہی لیکن شاذ و ہی حسن کے دامن کو ہاتھ سے جانے دیا ہے۔ انہوں نے بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں جن میں نعت، اور منقبت اور عقیدت و اعتراف کا ایک خاصہ حصہ ہے۔ لیکن ان کی نظموں کے انداز میں بھی غزل کا ہی طور آیا ہوا ہے۔ میرے خیال میں اگر کہیں کہیں ہئیت سے قطع نظر کر لی جائے تو انہیں نظم کے مقابلے میں مسلسل غزل ہی کہنا بہتر ہوگا یوں وہ ہر کہیں اعلان بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

غزل میں قادری یہ زندگی کی ترجمانی کیا

یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کی حد کر بتانا مشکل ہے

مجھے نہ قادری نام و نمود کی تھی ہوس

بیانِ غم کے لئے کی ہے شاعری میں نے

اشعار کے پردے میں حدیثِ دلِ مضطر
کہنے سے کبھی قادری چوکا نہ کریں گے

اگرچہ اس دور میں یہ سب کچھ کہنا بہت ہی عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں حقیقت کو ظاہر کرنے میں باک محسوس نہیں کیا ہے، فکر میں تو کہیں کہیں دیکھتا ہوں کہ زندگی بھی در آئی ہے۔ اور انہیں صرف بیانِ غم کا شاعر نہیں رہنے دیا ہے۔ یہی نہیں کسی کسی جگہ تو عصریات نے بھی جا پالی ہے۔

نظم کو بڑے حسن کارانہ ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے نہ انتہائی سادگی بھلی معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہائی مرصع کاری اس کا آرٹ اپنی جگہ ہے اور غزل کا آرٹ اپنی جگہ، ہر ایک کے الگ الگ تقاضے ہیں۔ محض ہیئت کی برقراری سے کوئی نظم صحیح معنی میں نظم نہیں بن جاتی اور کوئی غزل اپنی تعریف میں چاروں چول برابر غزل نہیں ہو جاتی، میں اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہر ایک فنکار کے اپنے حدود ہوتے ہیں اور اس سے صرف اس کے حدود کے مطابق توقع کی جانی چاہئے۔ پھر بھی فن کے عصری رجحانات کو پیشِ نظر رکھنا ایک فنکار کا اولین فرض ہوتا ہے۔ اگر وہ اس سے چشم پوشی کرتا ہے چاہے اس کے لئے کتنی ہی وزنی وجہ ہو تو وہ اپنے فرضِ منصبی سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ جو کسی طور بھی قابلِ درگذر نہیں، پھر کوئی ضروری نہیں کہ ایک شاعر نظم بھی کہے جب کہ اس کے مزاج کو غزل سے مطابقت اور موزونیت ہو، عقیدت کی بات ہی دوسری ہے اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس میں فن سے زیادہ جذبات کی بات کچھ زیادہ ہی رہتی ہے۔

شاغل صاحب کہتے ہیں :۔

ممنون قادری ہوں اس نکتہ چیں کا دل سے
تنقید جس کی صیقل ہے میری شاعری پر

خدا کرے کہ اس سلسلے میں ان کا قول و فعل مختلف نہ ہونے پائے۔ میں اس کے ساتھ انہیں یہ بھی کہوں گا کہ سب کی سنیں اور اس پر غور کریں۔ اگر کوئی بات مناسب ہو تو اس پر عمل کریں ورنہ کہنے والے کی نا سمجھی پر محمول قرار دیں اور اس سے کچھ کہیں بھی نہیں ——— اس سے ہر ایک فنکار کو روشنی ملتی ہے اور اس روشنی میں وہ اپنا راستہ خود نکالتا رہتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شاغل صاحب پہلے سے کچھ اور زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے۔ اس لئے بھی کہ آج اردو زبان اور ادب کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے کچھ ہی لوگ ہوتے ہیں جو تعمیری اقدام کے مرتکب ہوتے ہیں اور ہر شے کو جس سے وہ وابستہ ہوتے ہیں استحکام دیتے ہیں۔ ہم اردو والوں کا گرد و پیش نہایت اعلیٰ اور نفیس نمونوں سے بھرا ہوا ہے ہم ان سے تحریک حاصل کر سکتے ہیں۔ اور نئے نئے نمونے وجود میں لا سکتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اب کرنے میں کوئی شئے بھی مانع نہیں آسکتی۔ اور ہم اردو زبان کو اس کی تابندہ زندگی کے لئے تازہ خون دیتے رہ سکتے ہیں۔

از: حکیم عبدالباقی حکیم

شاغل قادری

اگست ۱۹۶۱ء کی بات ہے جب ایک دن کو لاکے ایک مریض نے مجھ سے کہا کہ بائٹ پوری اسٹیشن پر ایک مولوی صاحب اسٹیشن ماسٹر آئے ہیں، بڑے نزدی ہیں۔ کسی بلا ٹکٹ مسافر کو چھوڑتے نہیں تملو پر کے ایک مریض نے بھی کہا بات درست ہے ایسا سخت آدمی میں نے دیکھا نہیں انرگاری کے ایک مریض نے بات کو لوکتے ہوئے کہا آتنی کڑائی چلے گی نہیں کچھ لو دیا، دھرم چاہئے۔ دیکھنے میں تو مولانا لگتے ہیں مگر غریب ہو ... سب کے ... کڑائی سے پیش آتے ہیں۔ میں یہ سب باتیں سنتا ... اور دانیں دیتا رہا۔ مگر دل میں یہ امنگ ہوئی کہ ایک مرتبہ میں بھی ... دیکھوں اور لوگوں سے بھی دریافت کروں پھر ملوں جس سے بھی ... دریافت کیا شکایت ہی کرتے ہوئے پایا۔ ایک دن موہن ٹولہ کے ایک ہومن صاحب برادرم منظر بھاگلپوری کو تلاش کرتے ہوئے آئے اور انہوں نے کہا شاغل قادری صاحب نے مجھ سے خواہش ظاہر کی ہے کہ منظر بھاگلپوری سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے پوچھا شاغل قادری کون صاحب ہیں موصوف نے کہا آپ کے اسٹیشن کے انچارج اور اردو کے بہت اچھے شاعر، پہلے صاحب گنج میں تھے وہیں سے میرے تعلقات ہیں۔ برادرم اختر رضا منظر صلہ کو میں نے خبر کردی۔ اور دل میں آیا کہ مولوی صاحب سے یہاں کے لوگوں کی شکایات کا تذکرہ کروں۔ مگر سوچا کہ ان کے قدیمانہ تعلقات ہیں خدا معلوم کیا سمجھیں میں نے صرف یہ پوچھا کہ شاغل قادری کیسے آدمی ہیں مولوی صاحب نے کہا نہایت خلیق، ملنسار، اور زبان و ادب کی خدمت کو اپنا فرض سمجھنے والے انسان ہیں۔ ان کے دم سے صاحب گنج ضلع سنتھال پرگنہ میں بہار آئی ہوئی تھی۔ ریلوے کلب اور شہر کے مختلف محلوں میں مشاعرے انہیں کی سعی سے منعقد ہوتے تھے۔ صاحب گنج کالج میں اردو کا شعبہ نہیں تھا اس کا احساس یوں تو جناب عبدالعزیز گارڈ مرحوم نے پہلے پہل انہیں دلایا۔ مگر صاحب گنج کی لٹریری سرکل کے نوجوانوں، بزم سخن، اور انجمن ترقی اردو کے اراکین کو صاحب گنج کے کالج میں شعبۂ اردو کی غیر موجودگی کا احساس دلانا شاغل قادری کا کارنامہ ہے، بالآخر سات سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد اردو کا شعبہ کالج میں کھل گیا۔ یہ صاحب گنج کی ہر سوسائٹی اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں میں بڑی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے وہاں سے آنے کے بعد گلستانِ سخن کی بہار ہی ختم ہوگئی۔ اتنے میں منظر آگئے جن کے ساتھ مولوی صاحب اسٹیشن کی طرف چلدئے۔ منظر بھاگلپوری جب اسٹیشن سے واپس ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک جلد "نقوش کارواں" کی تھی میں نے پوچھا۔ بات کیا تھی کیوں انہوں نے بلایا تھا کہنے لگے اردو کے مشہور افسانہ نگار صمد تمیری نے یہاں کے لئے رخصت کرتے وقت شاغل قادری سے کہا تھا کہ منظر سے وہاں ضرور ملنا میں نقوش کارواں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا یہ کتابچہ ابراہیم ہمایوں کوکب کا مرتب کردہ ہے جس کو بزم گلستان سخن صاحب گنج نے شائع کیا ہے اس میں صاحب گنج کے قدیم و جدید شعراء کا تذکرہ ہے صفحہ ۵۲ پر شاغل

قادری گیاوی کا عنوان دیکھا تو میری نظر وہاں پر جم گئی اور کوکب صاحب کا پہلا جملہ پڑھ کر لوگوں کی شکایات کو غلط سمجھنے پر مجبور ہو گیا دل ان سے ملنے کے لئے مچلنے لگا وہ جملہ یہ تھا۔

" قادری سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ گھٹی فضا سے یک دم کھلے میدان میں آگئے ہیں جہاں ہر طرف چمن زار ہے، رنگینی ہے، اور مسرت ہے، غم و فکر کا نام و نشان بھی نہیں۔ "

دوسرے دن منظر کے ساتھ غریب خانہ پر خود میرا مطلوب آ گیا کچھ رسمی گفتگو ہوئی، چائے پان کا مشغلہ رہا اور پھر وہ مجھ سے رخصت ہو گئے۔ ایک دن منظر نے خوشخبری دی کہ اسٹیشن پر مشاعرہ ہونے والا ہے جس کا مصرعہ یہ ہے۔ جیسی بھی ہو سکی میں نے غزل کہی اور مشاعرہ کے دن اسٹیشن گیا مولانا عبدالواسع صاحب صدیقی مدظلہ نے صدارت فرمائی۔ بھاگلپور سے آئے ہوئے شعراء جناب کریم اسدی، نسیم آروی، محی الدین غنی، مسرور آروی، اکرام انجم، جمال پھلواروی، تصدیق اشہر، عادل غازی پوری، عاشق حسین عاشق، کے علاوہ کچھ صاحب گنج کے بھی شعراء تھے جن میں جمال الدین جمال صدیقی، اور شعلہ غازی پوری مرحومین کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ اس مشاعرہ کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا اور گاؤں میں بھی مشاعرے ہونے لگے۔ یہاں ایک بزم ادب بھی قائم کی گئی جس کا صدر ناچیز کو شاغل قادری کے مشورہ سے منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر مسعود احمد، جناب مظہر حسن ہاشمی، مسرور احمد عثمانی شہاب الدین، اور عین الحق سبھوں سے رفتہ رفتہ شاغل قادری کے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ ہر مشاعرہ سے پہلے اور بعد نجی بات چیت میں شاغل قادری یہاں کے ہر ملنے والے سے عموماً اور مجھ سے خصوصاً کہا کرتے کہ یہ عجیب حادثہ ہے جب کہیں اسکول نہ تھا تو پورینی میں مڈل اسکول تھا اور جب گاؤں گاؤں اسکول ہو گئے تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ بار بار ایک بات کو سنتے سنتے آخر ایک دن احباب نے مشورہ کیا کہ ایسا مشاعرہ ایک کیا جائے جس میں پورینی اور اس کے مضافات کے صاحب الرائے اصحاب کو دعوت دی جائے اور تعلیمی محکمہ کے کسی افسر کو بلا کر صدارت کرائی جائے جس میں اسکول قائم کرنے کے لئے لوگوں کو ابھارا جائے۔ یہ مشاعرہ پرانے اسکول کے کھنڈر میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب عبدالقیوم صاحب اسپیشل آفیسر بھاگلپور نے فرمائی۔ اس مشاعرہ میں ایک پر اثر مضمون میں نے اسکول کے سلسلہ میں پڑھا جس کی تفصیل آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ قیام اسکول کے لئے صاحب الرائے اصحاب آمادہ ہو گئے۔ جدوجہد شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اسکول منظور بھی ہو گیا اور اس کی عمارت بھی اگر مکمل نہیں ہو سکی ہے تو ضرورت کے لائق ہو گئی ہے۔ اس جدوجہد میں جناب ڈپٹی نورالحسن صاحب جناب مولوی نثار احمد صاحب، جناب مولوی سید ابوالبقا صاحب جناب مولانا عبدالواسع صاحب صدیقی اور بہت سارے دوسرے بزرگوں اور نوجوانوں کے ساتھ جناب شاغل قادری نے بھی ہمیشہ تعاون کیا۔

بھاگلپور کے شعراء سے تعلقات استوار ہوئے تو یہ معلوم ہوا کہ سنہ ۱۹۵۰ء سے سنہ ۱۹۵۳ء تک شاغل قادری نے قدیم بزم سخن بھاگلپور کے سایہ میں زبان و ادب کی گراں بہا خدمتیں انجام دی تھیں بسنہ ۱۹۵۳ء میں جب یہ صاحب گنج چلے گئے تو بھی بھاگلپور سے تعلقات کسی نہ کسی حد تک استوار رہے کچھ دن تک صاحب گنج میں رہتے ہوئے انجمن فلاح المسلمین بھاگلپور کے شعبہ ادب کے جنرل سکریٹری بھی یہ رہے تھے۔ اس

مرتبہ سنہ ۱۹۶۰ء میں جب یہ آئے تو اپنے قدیم احباب سے آ ملے
اور یہ یقینی جانے کے باوجود قدیم بزم سخن کے ذریعہ زبان و ادب
کی خدمت میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔ جناب محی الدین غنی کے
ہوٹل میں جو روزانہ بیٹھک ہوتی ہے وہ صرف نشستند و گفتند
و برخواستند کی مصداق نہیں ہوتی۔ کوئی نہ کوئی تعمیری کام ہوتا ہی
رہتا ہے۔

شاغل قادری سچ مچ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں اور
فکر و تردد سے بہت دور رہتے ہیں۔ مگر بات دراصل یہ نہیں
ہے ان کی زندگی کا سب سے عظیم حادثہ یہ ہے کہ موصوف کی
اہلیہ دائمی مریض ہیں جن کی دلداری اور علاج و معالجہ کے ساتھ ساتھ
اپنے دفتری جھمیلوں سے وقت نکال کر ادبی خدمات میں منہمک
ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں گھریلو زندگی کی کرب ناکی کا
علاج شاغل قادری کے پاس کوئی دوسرا نہ تھا سوائے اس کے
کہ یہ خود کو دوسری مصروفیات میں لگا دیں مگر یہ کہنا بھی انصاف
نہ ہوگا کہ یہی ایک سبب ہے۔ اب ان سے ملتے جلتے سات سال
گذر چکے ہیں ان کے مزاج، انداز اور ان کے ماضی سے بھی
بہت کچھ واقفیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ جھریا راج اسکول میں پڑھتے تھے جہاں سے بنگالی
راجہ نے اردو اور ہندی پڑھنے والے طلبہ کو سنہ ۱۹۳۰ء میں اس
وقت نکال دیا جب ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیمات تھے اور
موصوف نے فخر الدین مرحوم کے زمانہ کے اس قانون کو کالعدم
ٹھہرا دیا کہ ریاست بہار میں کوئی ہائی اسکول اس وقت تک
منظور نہیں کیا جائے گا۔ جب تک بہار یونیورسٹی کی تمام
منظور شدہ زبانوں کے پڑھانے کا انتظام نہ ہو جائے گا! اور
اس کے بدلے میں اس قانون کا نفاذ ہوا کہ بہار یونیورسٹی کی
منظور شدہ کسی ایک زبان کا بھی ہائی اسکول منظور ہو سکتا ہے

سنہ ۱۹۳۰ء میں جب راج ہائی اسکول کے اردو ہندی پڑھنے والے
طلباء نکال دیئے گئے تو سات اردو ہندی پڑھانے والے اساتذہ
اور انتیس ۲۹ میٹرک کے طلبا نے اپنی جد و جہد سے جھریا اکیڈمی نام کا ایک
اسکول قائم کیا۔ اردو داں طلبہ میں صرف شاغل قادری اس
جد و جہد میں تھے اور ان کی کوششوں سے ان کے ایک ساتھی جناب
علی عباس انصاری نے تعاون کیا تھا۔ یہ پڑھنے یا ملازمت کے سلسلہ
میں جہاں بھی رہے وہاں شعر و شاعری اور مشاعرہ بازی کا مشغلہ ان کے
دم کے ساتھ ہمیشہ رہا۔ موصوف کے برادر معظم جناب مولانا سید محمد ذاکر
قادری کے دوست جناب محمد جان علی صاحب انصاری مدظلہ ہمیشہ
کہا کرتے تھے "ارے شاغل کی جیب میں تو ہمیشہ مشاعرہ رہتا ہے"
یہ اس وقت کی بات ہے جب یہ طالب علم تھے۔

شاغل قادری کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسروں
سے کام لینے کی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ جذباتیت کا عنصر اگر غالب
نہ کہا جائے تو ایک حد تک ضرور ہے جلال میں جب آ جاتے ہیں تو
پھر یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی باتوں کا دوسرے کیا اثر لیں گے۔ نا
واقف لوگ غصہ سے لال پیلے بھی ہو جاتے ہیں مگر جاننے والے
جانتے ہیں کہ قادری کے اس تپاک میں خلوص کار فرما ہے۔ تھوڑی
دیر کے بعد طوفان جب ختم ہو جائے گا تو پھر اپنی حالت پر آ جائیں گے
کینہ، بغض، عداوت، کا جذبہ قادری میں قطعی نہیں ہے۔ ایسے
لوگوں میں ہوتا بھی نہیں ہے۔ ورنہ کوئی کام یہ کر سکیں گے اور نہ
کوئی کام کسی سے لے سکیں گے۔ شاغل قادری کا ایک عیب
یہ ہے کہ یہ ہر شخص کی تعریف کرتے ہیں۔ مشاعروں میں ہر قسم کے
اشعار پر داد دیں گے۔ اور جب کوئی پوچھے گا کہ ایسا کیوں کرتے
ہیں تو جواب دیں گے کہ میں تعریف جب کسی انسان کی کرتا ہوں تو
اس کی جو خوبی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر، اور خرابیوں سے
نظر کر کے اشعار کی داد اپنی پسند کے معیار پر نہیں بلکہ شاعر کے

رنگ اور آہنگ اور صلاحیت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو شعر کامیاب ہوتا ہے اس کی تعریف کرتا ہوں۔ یہاں تک تو درست ہے مگر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص کی بہت تعریفیں کر رہے ہیں پھر اس کے شکوہ سنج ہو گئے۔ اور اس کی موجودگی میں الٹ پلٹ بول رہے ہیں۔ اس کی وجہ دریافت کرنے پر بتائیں گے۔ نجی پسند ایک الگ بات ہے۔ مگر اجتماعی کام میں کسی کی ذات سے نقصان پہونچے گا تو اس کو ٹوکنا اور اس پر اعتراضات کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ شاغل قادری کی یہ حکمت عملی ایسی ہے جس کو ان کے بہت سارے مخلص احباب بھی ناپسند کرتے ہیں۔ مگر یہ جانتے ہوئے کہ اس شخص کا دل صاف ہے اور سب کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے اس لئے کوئی مزاج شناس ان سے نفرت نہیں کرتا۔

اردو دنیا کے قابلِ قدر شعرا اور ادبا کا تذکرہ جب بھی کرتے ہیں، حسین انداز میں کرتے ہیں، تنقید کرتے وقت ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اور بزرگوں کی پگڑی نہ اچھالی جائے۔ اپنے سے بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا شاغل قادری کا طرز عمل ہے۔ اور خواہ مخواہ چاہتے ہیں کہ ہر کوئی اپنا یہی شعار بنا لے۔

شاغل قادری کو مطالعہ کا ذوق بہت ہے، ادبی اور دینی، کتابوں کا ایک ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے جس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بیس پچیس[25] روپے ہر ماہ اپنے اس ذوق کی خاطر یہ خرچ کرتے ہیں۔ ایک معاملہ میں مگر بہت بڑے بخیل واقع ہوئے ہیں۔ کہ کسی دوسرے کو پڑھنے کے لئے کتابیں، اخبار یا رسائل مستعار نہیں دیتے۔ کوئی طلب کرتا ہے تو خدمت زبان و ادب کے موضوع پر لیکچر جھاڑنے لگتے ہیں۔ ان کے خاص خاص جملے یہ ہیں۔" اردو کوئی دیوی نہیں جس کو پوجا جائے۔ اس کی خدمت کا یہ طریقہ نہیں کہ غیر اردو داں کی اردو دشمنی کا دن رات تذکرہ کیا جائے۔ اور انہیں صلواۃ سنائی جائے۔ اردو کی خدمت یہ ہے کہ اس کے اخبار، رسائل، اور کتابیں خرید کر پڑھی جائیں اس کے شاعر و ادیب کی قدر افزائی کی جائے۔ نوخیز نسل کو اردو اور اس کے ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کی جدوجہد کی جائے وغیرہ۔ اس قسم کی تقریر کے بعد کس کی ہمت ہوگی کہ پھر قادری سے اخبار و رسائل مستعار دینے کی درخواست کرے۔ دراصل یہ جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کے سب ملنے والے ایسے ہی ہو جائیں۔ اردو کے رسائل اور اخباروں کی توسیع میں بھی ہمیشہ دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔

اسکول اور کالج کے طلبا اکثر شاغل قادری کی دار المطالعہ سے استفادہ حاصل کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں اور میں نے اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے نصاب کی کتاب طلباء کو پڑھا رہے ہیں۔ اقبال، غالب، میر، جمیل اور فراق وغیرہ کی نظمیں سمجھا رہے ہیں اور اس پر نوٹ لکھا رہے ہیں۔ اب تو اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ طلباء سے صرف پوچھ لیتے ہیں کہ کون سی نظم پر نوٹ لکھوانا چاہتے ہو۔ اور عنوان معلوم ہوتے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔

شعر کہنے کا ڈھنگ بھی شاغل قادری کا نرالا ہے کاغذ، قلم لے کر ہزار سوچتے رہیں گے مگر کچھ نہیں کر سکیں گے اگر کوئی لکھنے والا مل جائے تو ہزار" موڈ " آف کیوں نہ ہو فوراً تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اس وقت جو بھی مصرعہ سامنے آیا شعر پہ شعر لکھواتے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے موصوف نے پکڑ لیا اور ایک گھنٹہ میں ، ، اشعار کی ایک مثنوی بعنوان " پوربی نامہ " کہہ گئے۔ ان سے زیادہ زود گو شاعر میں نے

نہیں دیکھا۔ مگر ان کی اس صفت کو وہ جانتا ہے جو بہت قریب ہے۔ ورنہ اس کا تذکرہ وہ خود کسی سے نہیں کرتے۔

۱۹۵۰ء سے مسلسل ہند و پاک کے مختلف پرچوں میں شاغل قادری کا کلام چھپتا رہتا ہے۔ اس طرف (شاید متاعِ شوق کے بعد) چھپنے چھپانے کی طرف کم دھیان دیتے ہیں۔ صرف قطعۂ تاریخ وفات کبھی کبھی اخباروں کو دیدیتے ہیں۔ تاریخ گوئی میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ پروفیسر مظفر اقبال انہیں جانشین حضرت بسمل سہسرامی کہتے ہیں جو اس عہد کے سب سے بڑے تاریخ گو شاعر اور استاذ الاساتذہ تھے۔ مگر شاغل قادری خود اس کی پرزور تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تمبر مخدوم آبادی اور حکیم یوسف پھلواروی اس اعزاز کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جس کو ان تینوں کی تاریخ گوئی کو پرکھنے کا موقعہ ملے۔ ریڈیو سے بھی شاغل صاحب کا کلام گاہے گاہے نشر ہوتا ہے۔ بحیثیت شاعر ان کی شہرت پوری اردو دنیا میں ہے۔ کسی شہر میں جائیے شاغل قادری سے غائبانہ تعارف رکھنے والے مل جائیں گے۔ بہار میں تو زیادہ تر لوگ ذاتی طور پر شاغل قادری کو جانتے ہیں۔

بھاگلپور کی ادبی فضا نہایت صحت مند اور خوش گوار ہے شاعر و ادیب کا اتحاد جو اس شہر میں ہے وہ شاید کہیں اور ہو، شعراء بلا تکلف ایک دوسرے کے اشعار پر تنقید کرتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں بحثیں ہوتی ہیں لیکن کوئی کسی کا برا نہیں مانتا۔ اس قسم کی فضا پیدا کرنے میں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ شاغل قادری کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اپنی نظمیں اور غزلیں دوسروں کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ لوگ پڑھیں اور مشورہ دیں۔ اسی طرح دوسروں کے کلام کو یہ پرکھتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں۔ یہاں کے لئے یہ بات ایسی ہو گئی ہے جیسے کہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر صرف ایک اعتراض سے شاعروں میں عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی میل و محبت کا ثمرہ ہے کہ بھاگلپور کے شعراء

کا مختصر تذکرہ بنام "نظارۂ خیال" شائع ہوا جس کے بعد باضابطہ مجلس اشاعت قائم ہوئی جس نے "متاعِ شوق"، "آتشیں" اور "نگارِ فکر" شائع کیا۔ چوتھی کتاب محی الدین غنی کا مجموعۂ کلام بنام "عنبریں" زیرِ ترتیب تھی کہ ماہنامہ "سہیل" نے ایک خصوصی نمبر بعنوان "بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر" کا اعلان کر دیا یہ سارا کام جو بھاگلپور میں ہو رہا ہے سب میں شاغل قادری کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر ہر ادیب اور ہر شہر کا وہ ہر شخص جسے زبان و ادب سے دلچسپی ہے شاغل قادری کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

شاغل قادری کا تذکرہ نظارہ لکھنؤ" نقوشِ کاروان" صبحِ گنج" گلستانِ ہزار رنگ" (مرتبہ جناب بہاء الدین صاحب) "نقشِ دوام" گیا اور "نظارۂ خیال" بھاگلپور میں پڑھکر یہ معلوم ہوا کہ یہ شاعری دس سال کی عمر سے کر رہے ہیں انکی شاعری کا آغاز موضع پیر بیگہہ ضلع گیا سے ہوا۔ جہاں ۱۹۳۵ء میں یہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس گاؤں میں ہر ہفتہ کسی نہ کسی کے بنگلہ پر مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کے دو چار مشاعروں میں شرکت کے بعد شاغل قادری نے بھی شاعری شروع کر دی۔ انہوں نے پہلا تخلص سنجیدہ کلام میں صادق اور مزاحیہ میں کاذب رکھا۔ جھریا میں یہ دانش ہوئے پھر شاہد، کرڈوبی انجنیئرنگ ورکس میں جب یہ تھے تو وہاں انہوں نے اپنا تخلص شرر رکھا شرر کے بعد موصوف نے تخلص رکھنا ترک کر دیا اور ایک مدت تک مقطع میں قادری جو ان کے نام کا آخری ٹکڑا ہے لاتے رہے اور اب کبھی شاغل اور کبھی قادری تخلص کرتے ہیں۔ مزاح میں کاذب سے یہ تلخ زمانی بن گئے۔ اس قسم کی نظموں میں تلخ حقیقتوں کو ہی یہ بیان کرتے ہیں۔ زبان و ادب شعر و شاعری کے علاوہ بھی شاغل کی ایک شخصیت ہے جو اب بہت زیادہ نمایاں ہے

کسی ناواقف کا شاغل قادری کو دیکھ کر جو پہلا تاثر ہوگا وہ یہ کہ یہ حضرت کسی مسجد کے پیش امام یا مدرسہ کے معلم ہیں۔ بڑی بڑی داڑھی لحیم و شحیم جسم کھدر کا کرتہ پائجامہ اور سر پر دو پلی ٹوپی اور اب کچھ دنوں سے ہاتھ میں ایک پرانا عصا (جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ حاجی ملنگ کا عصا ہے جو ایک شخص نے انہیں لاکر سات گز مارکین کے عوض میں دیا ہے) لئے ہوئے جس طرح جھومتے جھومتے یہ مشاعروں میں جاتے ہیں اسی طرح مسجد اور دینی مجالس میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ان کا روپ رنگ یونہی نہیں ہے ان کے برادر معظم جناب مولانا ذاکر قادری کی تربیت اور گھر کے ماحول کا اثر ہے۔ کھدر کا لباس دیکھ کر اکثر لوگ انہیں سیاسی آدمی سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی سیاست طالب علمی کے ساتھ ختم ہوگئی یہ لباس ایسا کیوں پہنتے ہیں اگر ان سے پوچھئے تو بتائیں گے کہ چونکہ جمعیۃ علما کے اکابرین اور میرے بڑے بھائی اسی لباس میں رہتے ہیں اس لئے مجھے بھی یہ پسند ہے۔ نیز کھدر کے استعمال سے گھریلو صنعت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اب کسی کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند شاغل قادری کی پسند یہی ہے۔ یہ عالم نہیں ہیں عربی کچھ نہیں جانتے لیکن دینی باتوں کو جاننے کے ذوق نے انہیں چھوٹا موٹا مولوی ضرور بنادیا ہے۔ یہ باتیں کریں یا شعر پڑھیں یا نثر پڑھیں ہمیشہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ان کی زبان و قلم سے کوئی ایسی بات نکل نہ جائے جو خلاف دین فطرت ہو ویسے انسان سے بھول چوک ہونا فطری امر ہے جس سے یہ بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

شاغل قادری کا مطالعہ وسیع ہے۔ یہ ایک باخبر انسان ہیں جس طرح شعر و ادب کی تاریخ اور اس کے ارتقا پر حسن و خوبی پر یہ اپنے انداز میں روشنی ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسی طرح دینی معاملات اور دنیاوی حالات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ پورینی کے اکثر احباب چھیڑ کر کسی موضوع کی طرف موصوف کے ذہن کو منعطف کر دیتے ہیں۔ اور مضراب کی ایک ہلکی سی ضرب سے جب یہ ساز نغمہ بکھیرنے لگتا ہے تو ہر شخص توجہ سے باتیں سنتا ہے۔ اور حظ اٹھاتا ہے۔ ان کی فطری کمزوری ان کی جذباتیت ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ یہ اس وقت بہت جذبات میں آجاتے ہیں جب کوئی علما کو برا بھلا کہتا ہے اس معاملہ میں اگر کوئی محتاط رہا تو شاغل قادری سے بہتر ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا۔

داستان لذیذ ہے اس لئے طویل ہوتی جارہی ہے۔ مگر ماحول نمبر کے دامن کا لحاظ رکھنا ہے۔ اس لئے قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

از: علامہ جمیل مظہری

تقی شاعر باقری کی قصیدہ گوئی

مشہور انگریزی شاعر گرے نے اپنی المیہ نظم ایلیجی میں فطری جوہر طبیعت کی ناقدری پر ماتم کرتے ہوئے کہا ہے کہ بہت سے پھول ایسے ہوتے ہیں جو جنگل ہی میں کھلتے ہیں اور جنگل ہی میں مرجھا جاتے ہیں اور ان کی خوشبو مشام گلچیں تک نہیں پہنچ پاتی۔ بھاگلپور کے گمنام مگر خوش نام و خوش فکر سخنور شاعر باقری بھی ہمارے چمن ادب کے ایسے ہی پھولوں میں ہیں، جن کی نکہت حجاب آلودہ کو نسیم و صبا کا ایک جھونکا بھی میسر نہ آیا، خوشبو پھیلی مگر ایک حلقے میں، ان کے قدرشناسوں کا دائرہ ہمیشہ تنگ رہا۔ اگرچہ اس دائرے کی تنگی کی ذمہ داری بہت کچھ ان کے موضوع سخن پر بھی ہے، انھوں نے طبیعت کا سارا زور قصیدہ نگاری پر صرف کیا اور قصیدہ نگاری وہ صنف سخن ہے ہندوستان میں جس کا دور شہنشاہی اور جاگیرداری کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ ممدوح نہ رہے تو مداح کہاں سے آئیں سودا اور ذوق کی میراث اپنے ورثا کو پکارتی رہی لیکن ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

دلی کا تخت شاہی مدتوں سے مسند فقر بن چکا تھا لکھنؤ کے دربار دربار میں قصیدہ گوئی کے پنپنے کے بہت کچھ امکانات تھے لیکن یہاں نبردوں سے شاعری کے جو آفتاب طلوع ہو رہے تھے ان کی تیز روشنی میں قصیدہ کا چراغ کیا ٹھہرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ تو لکھنؤ دبستان دلی میں بھی ذوق مومن اور غالب کے بعد کوئی ایسا قابل ذکر قصیدہ نگار پیدا نہیں ہوا جسے تاریخ کا حافظہ اپنی جھولی میں محفوظ رکھتا، انیسویں صدی کے اواخر میں محسن کاکوروی نے البتہ بڑی جرأت سے کام لیا، سرور کائناتؐ سے انھیں والہانہ محبت تھی۔ ان کے سوز عشق نے دبستان لکھنؤ میں نعتیہ قصیدے کا ایک ایسا دیا جلایا جس کی جھلملاتی ہوئی روشنی نفیس اوج اور وحید جیسے ستاروں کے مقابلے میں اپنی توانائی سے ادبی افق کو روشن کرتی رہی، بیسویں صدی کی ابتدا میں عزیز لکھنوی نے ان کے تتبع میں نعت و منقبت کو موضوع خاص بنایا۔ اور ایسے پرزور قصائد لکھے کہ اردو کی یہ صنف عرفی و قاآنی سے آنکھیں ملانے لگی۔ عزیز کی اس ادبی میراث پر اہل لکھنؤ کا حق مقدم تھا۔

لیکن ان کے اس حق کو بہار کا نوجوان طالب علم مصطفیٰ جوہر زبردستی ان سے جھٹک کر بہار لے آیا اور بہار کی ناموافق سرزمین میں اس تخم کی آبیاری اس محنت سے کی کہ گوشے گوشے سے قصیدہ نگار اگنے لگے۔ خود مولانا جوہر کے معاصرین نے بھی ان کے کمال فن سے متاثر ہو کر اس صنف خاص کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ ان کے احباب میں اجتبیٰ رضوی اور آزاد عظیم آبادی کے وہ جگمگاتے ہوئے قصیدے

لکھے جو اردو قصیدہ نگاری کے ماتھے پر مانگ کے ٹیکے کی طرح آج بھی آویزاں ہیں۔ مولانا نے بہار خصوصیت کے ساتھ پٹنہ میں اپنے درسی شاگردوں کے علاوہ فنی شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا اور اپنی پیشانی جو محنت کے پسینوں سے ان ہونہار پودوں کی ایسی آبیاری کی کہ بہت جلد ان کے چکنے چکنے پات باغبانِ سخن کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ ان میں سے بعض تو ایسے تناور درخت ثابت ہوئے کہ ان کی شاخیں جملہ اصنافِ سخن پر سایہ افگن ہونے لگیں خصوصیت کے ساتھ فنِ قصیدہ نگاری پر ان میں سے دانش عظیم آبادی، سرخوش عظیم آبادی۔ غالب عشروی، عباس علی جذب اور مرزا اعجاز حسین مرحوم کے نام بھلائے نہیں جا سکتے۔ دانش کے مجموعۂ کلام پر مقدمہ لکھتے ہوئے میں نے جو رائے قصیدہ گوئی کے متعلق ظاہر کی تھی اس کی تائید نیاز فتحپوری نے بھی اپنے تبصرے میں کی۔ اس سے بڑی سند اور کیا ہو سکتی ہے، سرخوش عظیم آبادی بھی فن کی خدمت میں اپنے استادِ محترم کی سنت پر پوری طرح عامل ہیں اور صاحبگنج جیسے کوردہ مقام پر رہ کر بھی اپنا ادبی فیضان دور دور تک پھیلا رہے ہیں۔ اعجاز حسین اور غالب عشروی نے حالات کے تحت فن سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے لیکن عباس علی جذب حالات کی نامساعدت کے باوجود ایک مجاہد کی طرح خدمتِ فن کا حق ادا کر رہے ہیں۔ مولانا جوہر کے ان تمام شاگردوں میں غالباً سب سے چھوٹے باقری صاحب ہیں مثل مشہور ہے چھوٹا کھوٹا مگر انکی کم عمری نے اس ضرب المثل کی پرزور تردید کر دی۔ چنانچہ آج یہ چھوٹا اپنے مخصوص صنف میں اپنی عظمتِ فن کی بنا پر ہم جیسے بہت سے بڑوں سے بڑا ثابت ہو رہا ہے ان کا جذبۂ عقیدت ان کے ذوقِ سخن پر ہمیشہ سے غالب رہا اسلئے دوسرے اصنافِ سخن کو نظر انداز کر کے مدح گوئی کو شاعری کا موضوعِ خاص بنا لیا ہے لیکن اس محدود دائرے میں بھی ان کا فنی شعور شاعری کا قرض کوڑی کوڑی ادا کر رہا ہے۔

قصیدہ نگاری کی وہ تمام فنی خصوصیات جو ایک قصیدہ نگار کو ایک کامیاب شاعر بنا دیتی ہیں بدرجۂ اتم انتہائی توازن کے ساتھ ان کے قصیدوں میں نمایاں ہے۔ بندشش کی چستی، الفاظ کی شوکت، تخیل کی بلند پروازی استعارات کی جدت اور تشبیہات کی ندرت ان کے حسنِ بیان کو الفاظ و معانی کا ایک ایسا طلسم خانہ بنائے ہوئے ہیں جو صرف ذوقِ سلیم کی کنجی سے کھل سکتا ہے۔ ورنہ ان کی شاعری کی روح کو پہچاننا ہر مدعی دو سخن کے بس کی بات نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر باقری موجودہ دور کے قصیدہ نگاروں میں عزیز لکھنوی کے سچے شاگرد ہیں بلکہ ان کی قصیدہ نگاری کی ایک خصوصیت تو ایسی ہے جس میں عزیز لکھنوی بھی ان کے شریک نہیں اور عزیز لکھنوی پر ہی کیا منحصر ہے قصیدے میں متقدمین سے یہ بدعت چلی آتی ہے کہ وہ طبیعت کا اشارہ زورِ تشبیب میں صرف کر دیتے ہیں، مدح کی منزل تک آتے آتے ساری پونجی صرف ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدح جو قصیدہ کا موضوعِ اصلی ہے ایک سطحی اور رسمی چیز ہو کر رہ جاتی ہے ——— مبارکباد کا مستحق ہے ہمارا یہ شاعر جو مدح کی کڑی منزل میں بھی اپنے زورِ کلام کو مدھم ہونے نہیں دیتا بلکہ بعض جگہ لفظ و معنی کا یہ تلاطم مدح میں اور شور انگیز ہو جاتا ہے ——— اس مختصر سے تعارفی مقالے میں اگر گنجائش ہوتی تو میں اپنی رائے کی تائید میں جابجا سے ان کے قصیدے کے اشعار پیش کرتا لیکن ———

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

ان کے کلام میں ہیں محاسن ہی محاسن نظر آتے ہیں۔

اگر کمی ہے تو صرف سادگی کی جس کی مثالیں ان کے یہاں بالکل ہی نہیں ملتی ہیں بلکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ عزیز موصوف اپنی عروس سخن کو کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ زیور پہنا دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معانی کا حسن ذاتی تکلفات لفظی کے ہجوم میں گم ہونے لگتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا فنی شعور بہت جلد رنگینی اور سادگی میں ایک خوشگوار مفاہمت کر کے رہے گا اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ سادگی بیان کی گنجائش قصیدے میں کم ہوتی ہے، سادگی جو غزل کا حسن ہے کبھی کبھی قصیدے کا نقص بھی بن جاتی ہے۔

اخیر میں یہ گذارش ہے کہ ان کی گرجتی برستی طبیعت جو قصیدے کی زمین پر موسلا دھار برس رہی ہے ان کی چھینٹوں سے غزل کی کھیتی محروم نہ رہنا چاہئے غزل ہماری شاعری کی جان ہے عرفی جیسے عظیم قصیدہ گو کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

قصیدہ کار ہوس پیشہ گان بود عرفی
تو از قبیلہ عشقی وظیفہ ات غزل است

اگرچہ باقری کے قصائد اہل دنیا کی تعریف میں نہیں ہوتے لیکن ہوس دنیا کی ہو یا دین کی بہر حال ہوس ہے جو بقول غالب ع

درد یک ساغر غفلت سے زیادہ نہیں

لیکن ہم اپنے شاعر کی حمایت میں یہ کہیں گے کہ ان کا قصیدہ ہوس کی آواز نہیں بلکہ اس جذبۂ عشق کی پکار ہے جو انھیں محمد اور آل محمد سے ہے اس لئے انھیں بجا طور پر مبارک عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھنے کا حق حاصل ہے۔

جبیں پر خاک ہے یہ کس کے در کی
بلائیں لے رہا ہوں اپنے سر کی

بقیہ :۔ نظارۂ و خیال

ان کا ہی کام تو ہے حنا بندیٔ چمن
گل سے حسین ہیں خار، تجھے کیوں یقیں نہیں ۔ فرحت القادری

آؤ مل جل کے اسے شیشۂ دل سے ڈھا دیں
درمیاں بغض کی دیوار جو ہے گی کب تک

مانا کہ دھرپوں میں اور نہ انجم
اک پیکر خاکی ہوں مگر سب سے سوا ہوں

کرم نواز نے روزانہ بہ ذیل ابر
بشر بنایا تو فطرت بھی دی خطا کی مجھے ۔ ناظر فنا

مانا کہ لطف عشرت ساحل بھی کم نہیں
لیکن نشاط شورش دریا کچھ اور ہے ۔ حکیم عبدالبا[ری]

اردو پرست بقول غالب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۔ غالب

شاعر کی شاعری

شاہ محمد تقی شاعر باقری — ایک جائزہ

ش ش مشہدی

کارلائل نے شاعری کو موسیقیانہ خیالات سے موسوم کیا ہے اور ایڈگر ایلن پو نے "موزوں جمالیاتی تخلیق" سے ۔ میکولے اسے ایک ایسا فن تصور کرتا ہے جس میں الفاظ کے استعمال سے تخیل میں وہی کیفیت پیدا کی جاتی ہے جو ایک مصور رنگ استعمال کرکے پیدا کرتا ہے ۔ شاعری کی یہ تشریح بہت جامع نہ سہی پھر بھی اس سے شاعری کی وضاحت ہو جاتی ہے

دراصل شاعری ہمارے تخیلات، احساسات ومشاہدات کا وہ حسین روپ ہے جو فن کے سانچے میں ڈھل کر، الفاظ کے حریری ملبوس میں سج کر قاری کے ذہن پر ایک مخصوص تاثر چھوڑ جاتا ہے ۔

پکاسو نے مصوروں کے بارے میں ایک بڑی ہی خوبصورت بات کہی ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ بعض مصور ایسے ہوتے ہیں جو سورج کو ایک پیلے نقطے میں تبدیل کر دیتے ہیں لیکن بعض ایسے مصور بھی ہیں جو اپنے فنی ادراک کی مدد سے پیلے نقطے کو سورج بنا دیتے ہیں ۔

شاعر ہو یا مصور نقطے کو سورج بنا دینا ہی فن کا کمال ہے اور یہی فنی ادراک ہمارے وجدان کو جمود کی حالت سے چونکا دیتا ہے

اردو شاعری پیدا ہوتے ہی صوفیوں کی گود میں کھیلنے لگی، اس کی نشو ونما، نوابین اور سلطانوں کے دربار میں ہوئی اور نازوں کی پلی دوشیزہ قصیدہ گوئی اور مثنوی کو اپنا محبوب بنا کر گل وبلبل کے نوک وپلک سنوارنے لگی ۔ قدیم غزل گوئی نے اسے عاشقانہ مزاج عطا کیا اور صدیوں تک یہ شاعری گل وبلبل اور عشق وعاشقی کی ترجمانی کا ذریعہ بنی رہی

انقلاب زمانہ کی فطرت ہے، مادی اشیاء کے تغیرات سے پورے زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب اسی وقت آتا ہے جب ہمارے نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور جب انقلاب آتا ہے تو اکثر اپنی زد میں خس وخاشاک کے ساتھ روایات، ادب، تہذیب وتمدن اور اقدار کا بہت کچھ حصہ ساتھ بہا لے جاتا ہے اور تب ایک نئے نظام کی تشکیل ہوتی ہے

جس میں شعر و ادب بھی نئے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں
اردو شاعری بھی ایسے انقلابات سے دوچار ہوتی رہی
ہے اور ہر دور میں اس نے نہ صرف انقلاب کا ساتھ دیا
ہے بلکہ اپنے اندر وہ لچک بھی پیدا کی ہے جس کے
سہارے آج بھی دنیائے ادب میں اس کی ایک
ممتاز حیثیت بنی ہوئی ہے ۔

قدیم غزل گوئی کے دور میں سب سے پہلے
نظیر اکبرآبادی نے اردو شاعری میں ایک انقلاب لایا۔
(اور یہیں سے ترقی پسند شاعری کا آغاز ہوتا ہے)
اور شاعری کو وہ نئے زاوئے عطا کئے جس نے اسے زندگی
اور اس کے گرد و پیش کے مسائل سے قریب تر کر دیا
غزل ہو یا نظم اگر فن کی پرکاری کے ساتھ
اس میں زندگی کی دھڑکنیں اور رفتار وقت کی آہٹیں سموئی
ہوئی نہ ہوں تو تخلیق میں وہ ہمہ گیری اور وہ تاثر پیدا
نہیں ہو سکتا جو ادب کو زندگی کا آئینہ دار بناتا ہے۔
غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ غالب نے بھی کیا تھا۔ اور
"کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے" کی تمنا
کی تھی مگر غالب کو وہ وسعت میسر نہ ہو سکی جو نظموں نے
نظیر اکبرآبادی کو عطا کی۔ شاید غزل کی تنگ دامانی کا ہی
تقاضہ تھا جس نے جناب تقی شاعر کو بھی مجبور کیا کہ وہ میکدۂ
غزل سے نکل کر میخانۂ نظم میں اپنی پیاس بجھائیں اور
شاعری کی یہ تشنگی جستجو کے منزل میں انہیں وہاں تک
لے آئی جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر منزل نہیں بھی مل
سکی ہے تو وہ منزل سے قریب ضرور ہو گئے ہیں ۔

اپریل ۱۹۶۳ء کی بات ہے ۔ بزم احباب
کی شعری نشست منعقد تھی کہ دفعتاً جناب شاہ محمد تقی شاعر
کا نام پکارا گیا۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا
اس لئے کہ میں ان سے واقف نہ تھا اور پھر میری نگاہ
ایک ایسے شخص پر جا کر ٹھہر گئی جو سراپا شاعر تھا۔ کھدر
کا کرتہ پائجامہ، چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی فلسفیوں کی
طرح الجھے ہوئے بال، آنکھوں پر دبیز سا چشمہ جس کے
پیچھے سے دو دبیز قسم کی آنکھیں روشن تھیں۔ کشادہ پیشانی
سے ذہانت اور مزاج کا جلال و جمال پھوٹا رہا تھا
انداز گفتگو میں خلوص و نفاست کی آمیزش اور انداز
بیان میں جادو کا اثر تھا۔ انہوں نے اپنی تازہ ترین
نظم "حصار مونگیر" سنائی جو اسی دن کہی گئی تھی۔ پہلا شعر
میرے چونکا دینے کیلئے کافی تھا ۔

مشہدی ساحل گنگا یہ گئے ہونگے ضرور
تم نے دیکھے ہی تو ہونگے وہ شکستہ سے قصور

ایک انجان شخص سے اپنی نظم میں خطاب کر کے
شاعر نے اپنے بے پناہ خلوص کا اظہار کیا تھا۔ مگر
نظم سن کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ جی چاہتا تھا کہ یہ
نظم پڑھتے ہی جائیں اور ہمہ تن گوش اسے سنتے رہیں ۔
سارے ماحول پر ان کی نظم کا جادو چل چکا تھا اور تب
مجھے محسوس ہوا کہ واقعی شاعری میں کس قدر تاثر اور سحر انگیزی
ہو سکتی ہے ۔ یہ ہے شاعر سے میری پہلی ملاقات کا تاثر جو
آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے اور اکثر سوچتا ہوں کہ
اگر اس بلند پایہ شاعر سے میری ملاقات نہ ہوتی تو یقیناً
میری زندگی ادھوری رہتی ۔

جناب شاعر کے کلام میں بلا کا تصور اور بے پناہ
درد ہے ۔ یہ درد انہیں اس زندگی نے عطا کیا ہے جو
قدرت سے انہیں حصے میں ملی ہے ۔

جناب تقی شاعر کی زندگی کا حال خود انکی زبانی ملاحظہ
ییئے ۔ فرماتے ہیں : ۔
۷ رجمادی الثانی ۱۳۳۴ھ بروز شنبہ مطابق
پریل ۱۹۱۶ء مطابق ۷ اردی بہشت ۱۳۲۵ء مطابق ۲۲ جیت
۱۳۲۳ بنگلہ عین رام نومی کا دن ، ارود ۱ گاؤں مونگیر میں
ہوئے ۔ پھر لوٹ کر اس موضع کا منہ آج تک نہیں دیکھ
کا ہوں (ان کا وطن مشہور و معروف موضع حسین
د مونگیر ہے ۔ مگر طاعون کے دیار کے باعث ان کے
دین عارضی طور پر ہجرت کر گئے تھے ۔ جہاں حضرت شاعر
پیدائش ہوئی) آگے فرماتے ہیں ! ۔
والدہ صرف ڈھائی سال سہاگن رہ سکیں میں ابھی
ل کا تھا کہ والد نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ دم واپسیں
لوں نے میرے بارے میں ان سے سوال کیا کہ اسے
س کو سونپے جاتے ہیں تو پورے یقین کے ساتھ انہوں
، ایک لفظ کہا تھا اور وہ تھا "خدا"، دریتیمی کی ساری
سواریوں کے باوجود آج تک وہی خدا ہے جو ذہنی
رمادی طور سے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا فرماتا
ہتا ہے ۔

مندرجہ بالا جملے شاعر کی ساری زندگی کو محیط کئے
وئے ہیں اور آخری جملہ شاعر کے انداز فکر اور ذہنی رجحان
ا ترجمانی کرتا ہے ۔ غمِ دوراں نے انہیں حساس دردمند
ل بھی عطا کیا ہے اور ان کی شاعری پر وہ جلا دی ہے کی جس
ا تابانی سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ۔

تقی صاحب کی تعلیم مدرسہ عباسیہ اور مدرسہ
لیمانیہ پٹنہ سیٹی میں ہوئی اور پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ
سے ۱۹۳۸ء میں انہوں نے فاضل کے امتحان میں اس
امتیاز سے کامیابی حاصل کی کہ سارے بہار میں اوّل آئے
اور سنہرا تمغہ عطا ہوا ۔ مگر دراصل ان کی تعلیم کا سنگ
بنیاد ، خود موصوف کے منجھلے چچا مولانا شاہ غلام حیدر
صاحب نے رکھا تھا ۔ جن کے تبحر علمی کا شہرہ ہندستان
سے بڑھ کر افریقہ تک پہونچ چکا تھا ۔ جہاں مولانا موصوف
تبلیغ کے سلسلے میں دوبارہ تشریف لے گئے تھے ۔ حضرت مولانا
ہی کی آغوش شفقت میں شاعر صاحب کی نشو و نما ہوئی ۔
اور انہیں کی فضیلت تھی کہ یہ ذہین طالب علم اپنی ذہانت
و علمیت کا سکہ جماتا ہوا آج ایک کامیاب استاد بن گیا
ہے ۔ ان دنوں شاعر صاحب ٹیچرس ٹرننگ اسکول پھلوریا
بھاگلپور کے وائس پرنسپل ہیں بلکہ استاد ہی نہیں
بلکہ استادگر بھی ہیں ۔

جناب شاعر کی شاعری کی داغ بیل اسی وقت
پڑ چکی تھی جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے ۔ بیشتر
شعراء کی طرح انہوں نے بھی ابتدا میں غزلیں کہیں اور خوب
کہیں مگر غزل کی تنگ دامانی راس نہ آسکی اور انہوں نے
غزل گوئی گویا ترک کر دی ۔ مجموعی طور پر آپ نے غزلیں،
مثنویاں رباعیات ، قطعات ، مرثئے ، سوز ، سلام نوحے
نظم ، الغرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔۔ یہ
روایت کے پابند ضرور ہیں مگر نئے تقاضے کے منکر بھی نہیں ۔
معنوی اقدار کی روز افزوں تبدیلیوں کو الفاظ ، زبان
اور اوزان کے مزاج سے ہم آہنگ رہنے کے قائل
ہیں ۔ مغربی شاعری کی صرف وہی باتیں قابل قبول سمجھتے
ہیں جو اردو کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں نئی شاہراہوں
کی جستجو روا سمجھتے ہیں اور ادب میں افادیت کے بھی یہ
قائل ہیں ، مگر اردو شاعری کی روایت مزاج اور

س کے قدیم سرمایہ کو نظر انداز کرنا شان وضعداری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ آپ خاص طور سے غالبؔ، انیسؔ نظیرؔ، اقبالؔ اور جوشؔ سے بے حد متاثر ہیں۔ اسی لئے ان کے مرثیوں اور نوحوں میں انیس کا رنگ، نظموں کے موضوع میں نظیر کا تنوع، انداز بیان کے پروقار لہجہ پر اقبال کی چھاپ، تراکیب و اسلوب میں جوش کی قادر الکلامی اور الفاظ کی تراش وخراش میں جدت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ شاعر کی نظم "میں ہوں شاعر" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

مرے کلام سے داحن دمشق کے ابواب
مرے سلام سے اٹھتی ہے ان کے رخ کی نقاب
مرے حضور لرزتی ہے شانِ پرویزی
مری جناب میں ذرہ بھی ہے دُرِ نایاب
مری نظر ہے مشیت کے اس ارادے پر
جو معصیت کے سبو میں بھرے کرم کی شراب
ابھر تمازتِ مہر جبیں کہ بیٹھا ہوں
خود اپنے ذہن کے سائے میں زیرِ اسطرلاب
مری نگاہ میں ڈھل کر سبک ہوئی دنیا
مری نظر میں تمنا بھی ہے فریبِ سراب
ادب سے میرے دبستاں میں شام آتی ہے
جو کھولتا ہوں کبھی میں صحیفۂ مہتاب
کرم کی بزم میں جب بھی ہیں نغمہ سنج ہوا
تو میرے نطق سے شرما گیا خدا کا عذاب

شاعر کے کلام کا بنیادی جوہر رفعتِ احساس اور عصمتِ تخیل ہے۔ ان کے کلام میں فکر و فن کی گہرائی بھی ہے اور انداز بیان کی دلکشی بھی۔ اکثر نظموں میں جا بجا فکر و فلسفہ اور تصوف و طریقت کی سرحدیں ملتی نظر آتی ہیں۔ غالب کی طرح ان کے یہاں عارفانہ مضامین بھی ہیں اور صوفیانہ حقیقت نگاری بھی۔ عشق و عرفان کے اسرار و رموز بھی ہیں اور حسن و جمال کے پرتو بھی ہیں مگر اس سے الگ بات جو شاعر کے کلام کو انفرادیت بخشتی ہے، موضوع کا انتخاب، انداز بیان کی دلکشی، جذبات کی شدت اور تراکیب کی جدت ہے۔ ان کی چند نظموں کے عنوانات پیش کر رہا ہوں جس سے اس پہلو پر روشنی پڑ سکتی ہے: "ہولی، پہاڑ کی صدا، آپریشن، بھکارن، ذکر و فکر، حرف آخر، میراث، شبنم، تحمیل، میرا مزار، شفق کی صدا، مغرب و مشرق اور کسان۔

نظم گو شعراء پہ مضمون لکھنے میں سب سے بڑی دقت یہی ہوتی ہے کہ اقتباسات اور نمونۂ کلام پیش کرنے میں سامنے کی وسعت حائل ہوجاتی ہے نظم کے ساتھ یہ دقت ہے کہ جب تک پوری نظم نہ پڑھی جائے وہ تاثر پیدا نہیں ہوسکتا جو نظم کو کامیابی عطا کرتا ہے۔ برعکس اس کے غزل سے ایک شعر پیش کر دینا ہی کافی ہوجاتا ہے۔ میری اس مجبوری کو قارئین ملحوظ خاطر رکھیں۔

شاعر کی نظر فطرت پر بہت گہری پڑی ہے نظیر کی طرح شاعر بھی اپنے گرد وپیش کی معمولی چیزوں کو بھی موضوع سخن بنا کر وہ بات پیدا کر دیتا ہے جو کسی نے نہ کہی تھی۔ گویا پیلے نقطے کو سورج بنا دیتا ہے۔ ان کی نظم "شبنم" سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جن میں تخیلات کی رفعت، تراکیب کی جدت اور تاثر کی شدت کا اندازہ

اے سفیرِ خنکیٔ شب چاند کی لختِ جگر
روزنِ بابِ دقوفِ خلوتِ فکر و نظر
مختصر سی اک کہانی گردشِ ایام کی
سرحدیں تجھ میں گلے ملتی ہیں صبح و شام کی

اے سکوں ناآشنا سیماب سے سے دماغ
چاند کی آغوش کے پالے ہوئے چشم و چراغ
اے صدف کی گود سے ناآشنا درِ یتیم
اے ہوائے سرد کے پروردۂ ناز و نعیم

اخگرِ برقابِ فطرت اے یخِ آتش بجام
صوفی سادا قبا، شفاف دل، بلور فام
طلعتِ بزمِ سحر میں رات کا جگنو ہے تو
عارضِ خنداں پہ اک ڈھلکا ہوا آنسو ہے تو
عرش سے اتری ہوئی چھوٹی سی اک قندیل تو
صبح کو پرواز فرماتا ہوا جبریل تو

اے جبینِ حور کے ٹپکے پسینے السلام
السلام! اے نرم و نازک آبگینے السلام!
السلام! اے عارضِ دوشیزۂ ناکتخدا!

السلام! اے مادرِ فطرت کی دختِ پارسا
شرمِ نسوانی کی پاکیزہ امانت دار تو
دسترس جس پر نہ ہو ایسا درِ شہوار تو

اے حیا پرور نگیں سہمی ہوئی سی آبشار
اک ذرا سی ٹھیس بھی تجھ کو ہے اتنی ناگوار
چٹکیوں کے لمس میں آکر پگھل جاتی ہے تو

خلوتِ ہستی سے شرما کر نکل جاتی ہے تو
اب میں سمجھا سینۂ فطرت میں جو کہرام ہے
وصل کا احساس مرگِ شوق ہی کا نام ہے

(ہر چند یہ نظم مکمل نہیں، پھر بھی میں نے اشعار میں ربط قائم رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ نظم کے مجموعی تاثر کا اندازہ ہو سکے)

شاعر کا دل بڑا احساس ہوتا ہے اور یہی حساس پن تخلیق کے لئے اکساتا ہے اور وہ اپنے مشاہدات و احساسات کے صنم تراش کر فن کے حریری ملبوس میں سجا کر اسلوب کے غازے سے سنوار کر قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس لئے شاعر خود کو اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر کئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہمالیہ کی سرحدوں پر یورش کی اور جب برفیلی چوٹیوں پر خون کی شفق بکھرنے لگی تو شاعر کا جذبۂ وطنیت بھی چیخ اٹھا۔ اس کی دھمک آپ موصوف کی نظم "ہمالیہ چلو" میں سن سکتے ہیں۔

چند اشعار بطور نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہیں۔

نظم کا تیور اور جذبے کی صداقت ملاحظہ ہو۔

اے رفیقہ ذرا ہشیار ہو اب نیند سے جاگ
لوٹنے آگیا دشمن تری بہنوں کا سہاگ
تک رہا ہے ترا منہ کب سے لگائے ہوئے آس
دیکھ، یہ فرضِ وطن ہے وہ شعورِ احساس
زندگی جن کے لئے موت بھی ہے جن کے لئے

ہم کو ماؤں نے سنوارا تھا اسی دن کے لئے
کب وہ کام آئے گی رکھی ہوئی تلوار تو دے
لا وہ اجداد کی بخشی ہوئی دستار تو دے

آنچ اس تیغ کی برسے گی خطاکاروں پر
برف خود بڑھ کے چلی آئی ہے انگاروں پر

آبشار امن کی اس خاک پہ گویا بہتی ہے
مزرع سبز مگر آج یہ ہی کہتی ہے
ہر سپاہی کا لہو دیش کی گنگا ہو جائے
خون چوٹی پہ ہمالہ کی ترنگا ہو جائے
زندہ لوٹا تو تری شان دوبالا ہوگی
مر بھی جاؤں تو مری قبر ہمالہ ہوگی
دے دعائیں کہ یہ قسمت کا اشارہ ہو جائے
خون دشمن کا مری قبر کا گارا ہو جائے

جناب شاعر کو تاریخی پس منظر میں لکھنے کا وہ جوہر ملا ہے جو موجودہ دور میں کم ہی شعراء کو نصیب ہوا ہے بہت ممکن ہے یہ دبیر و انیس اور علامہ اقبال کے کلام کا شاعر پر وہ بے پناہ اثر ہے، جس نے ان کی نظموں کو ایک مخصوص تیور، اور تشبیہات و محاکات، کا وہ خزانہ عطا کیا ہے جو ان کی نظموں کی جان ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں مغربی طاقتوں کی سازش نے صیہونیت کی بربریت کا جو تماشہ سرزمین عرب میں دکھایا ہے اس کا اثر ہر حساس ذہن پر ہوا ہے۔ شاعر کے سینے میں تو دھڑکتا ہوا دل ہے، اس سے کیسے بچ سکتے تھے۔ "سقوط" کے عنوان سے ان کی تازہ ترین نظم پڑھ کر جوش و ولولے کا سمندر رگوں میں موجیں مارنے لگتا ہے۔ اے کاش مضمون کی وسعت یہ اجازت دیتی کہ پوری نظم پیش کر سکتا۔ پھر بھی کچھ بند پیش خدمت کر رہا ہوں۔

جنگ کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا گیا ہے اس پر توجہ کی ضرورت ہے

گولی بندوق کی ٹکراتی ہے دیواروں سے
سانس آندھی کی اکھڑ جاتی ہے تلواروں سے
شعلۂ مرگ نپٹتا ہے جو بم باروں سے
موت اٹھلا کے گذر جاتی ہے بازاروں سے
سامنے جو بھی ملا توڑ دیا موڑ دیا
لاش کی شکل میں بس نقش قدم چھوڑ دیا

سانس مسموم ہواؤں میں ہے لینا دشوار
ریت اڑ اڑ کے بناتی ہے شہیدوں کا مزار
ہے براہیم پہ نمرود کی خونی یلغار
آئینۂ برق تجلّی کو دکھاتے ہیں رڈار
پنجۂ ظلم میں انسان کی گردن کب تک
پھر ہو آباد خدا جانے نشیمن کب تک

دندناتا ہوا جب ٹینک نکل جاتا ہے
سینۂ وادیٔ سینا کو کچل جاتا ہے
موت کا دیو شہیدوں کو نگل جاتا ہے
طور تک بم کے دھماکوں سے دہل جاتا ہے
آج شیطان گلے ملتا ہے ایوانوں میں !!!
خون انسان کا چراغاں ہے شبستانوں میں

شہسواران عرب بن گئے غیروں کے سئیس
آج عفریت کے قبضے میں ہے تخت بلقیس
سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں پاتی تقدیس
آج جبریل کے پر نوچ رہا ہے ابلیس
محور برج اسد میں جو یہ تور آیا ہے
انبیا چپ ہیں کہ یہ کون سا دور آیا ہے

کئی برس پہلے کی بات تھی صاحب ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے اور پٹنہ ہوسپٹیل میں ان کا آپریشن ہوا۔ مہینوں کی کشمکش کے بعد شاعر کو گویا دوبارہ زندگی

ولی۔ موت و زندگی کی اس کشمکش سے متاثر ہو کر
جو نظم بہ عنوان "آپریشن" لکھی ہے وہ میرے خیال
معرکتہ الآرا نظم کہے جانے کی مستحق ہے خصوصاً
وہ بند جس میں انہوں نے بے ہوشی کی
شعری جامہ پہنایا ہے۔ ان کا شاہکاری
میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ان کا فن
ہے معراج تک جا پہونچا ہے۔ بے ہوشی کی
ی کو کہتے ہیں، جب ہوش باقی نہ رہے مگر
کر بھی شاعر کا اس قدر باہوش رہنا اور اتنی تفصیل
کیفیت کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا بلاشبہ
حصہ ہے۔

میں کہ تھا میں موت سے جب ہمکنار
خشک ہونے ہی کو تھی جب زندگی کا آبشار
وقت میں اے ہم نشیں میں کیا کہوں
موت کا پنجہ تھا اور میرا گریبان جنوں
بالیں سر مہلک معالج کا قدوم
اور بستر کے قریں شفاف نرسوں کا ہجوم
ہمدردانہ لہجے میں وہ انداز سوال
اُف کلیسا کے تقدس کا وہ پاکیزہ جمال
سی چھری جب قبضۂ قاتل میں تھی
سامنے تھی موت اور جینے کی حسرت دل میں تھی
قوں میں کلورو فورم لے کر آ گیا
آنکھ ساغر سے لڑی ہی تھی کہ چکر آ گیا
جاتا تھا ہلکے خواب کا مدھم سرور
ڈوبتی جاتی تھی آب سکر میں نبض شعور
میدان میں تھا ذہن اسپ بد لگام
ہو رہا تھا حافظے کے شہر میں اک قتل عام
پاس کی ہر گفتگو ایک دور کی آواز تھی
ایک لامحدود سناٹا تھا اور پرواز تھی

اور شاعر کو جب کئی دن کے بعد جب ہوش آیا تو اس نے اپنی چارہ گر کی طرف غور سے دیکھا جو کلیسا کا تقدس لئے نرس کے روپ میں بیمار کی چارہ گری کر رہی تھی۔ شاعر نے جن الفاظ میں چارہ گر کا نقشہ کھینچا ہے اسے پڑھ کر شاعر کا جمالیاتی احساس اور جزویات پر نظر رکھنے کی صلاحیت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی فن پر ان کے عبور حاصل رکھنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

اس کے آتے ہی اچانک پھیلتی تھی چار سو
کاربولک کچھ کلوروفارم، کچھ ایتھر کی بو
جب بھی آ کر وہ گذر جاتی تھی میرے پاس سے
آنکھ کھل جاتی تھی ایک لذت بھرے احساس سے
سنگ مرمر کا تراشیدہ وہ ایک شہکار تھی
یا قبائے برف میں دوشیزۂ کہسار تھی
آئینے کی طرح کپڑے بے نیاز رنگ و بو
پنڈلیوں پر چست جرابیں حیا کی آبرو
آبنوسی زلف پر رومال کا شفاف روپ
رات کے سینے پہ جیسے پڑ رہی ہوں دن کی دھوپ
گیسوؤں کی بے قراری ریشمی جالی میں بند
حسن کی معصوم گردن اور تہ دام و کمند
اوس میں دھوئی ہوئی کرنوں میں نہلائی ہوئی
بنت مریم چارہ گر کے بھیس میں آئی ہوئی!

اوپر کے اشعار پڑھ کر ان کے sensuousness

کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شاعر کی قادر الکلامی محتاج وضاحت نہیں۔
قدرت نے انہیں وہ جوہر عطا کیا ہے جو بہت کم لوگوں
کو نصیب ہوتا ہے۔ بہار کے اکثر شعراء کی طرح انہیں
بھی چھپنے چھپانے سے دلچسپی نہیں رہی ہے اور یہی وجہ
ہے کہ ایسا بلند پایہ نظم گو ابھی تک دنیا میں وہ شہرت
نہ پا سکا جس کا وہ مستحق ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ
ایسی نظمیں کہنے والے کم از کم بہار میں کم ہی لوگ ملینگے
میں نے گلستان شاعر سے چند گلہائے تر پیش
کئے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کا دماغ اس کی
خوشبو سے معطر ہو گیا ہوگا۔

شاعر صاحب محض شاعر ہی نہیں، ایک درد
مند دل رکھنے والے مخلص انسان بھی ہیں جن کی زندگی
میں سادگی اور خیالات میں بلندی ہے
فراق گورکھپوری نے لکھا ہے کہ شاعری ہمارے
وجدان کو جمود کی حالت سے چونکا دیتی ہے۔ بلاشبہ
تقی شاعر کی نظمیں اس جملے کو آئینہ دکھاتی ہیں۔

بقیہ غزلیات غنی :-

تبسم دے دو غنچوں کے لبوں کو
ہر اک پتہ پہ ہریالی جگا دو

تخریب کاریوں اور انتہا پسند جارحیت پسندوں سے
وہ بہر حال متنفر ہیں۔ حب وطن اور ملکی مسائل کا گہرا احساس
بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ چنانچہ "تحفظ وطن" کے عنوان
سے جو نظم موصوف نے کہی ہے اس میں اپنے انہیں احساسات کو
پیش کیا ہے۔ یہاں بھی یہ خوبی نظر آتی ہے کہ فنکار" حالات کے
پریشان کن جاں گسل حالات سے ناامید نہیں ہے۔ اور اسے یقین
ہے کہ مستقبل قریب میں حالات کے ناز و انداز تبدیل ہو جائینگے
چند اشعار ملاحظہ کیجئے :-

تسکین دل و جان و جگر ہو کے رہے گی
گلشن کی زمیں خلد اثر ہو کے رہے گی
ہر ذرہ سے پھوٹے گی کرن مہر و وفا کی
اے دوست شب غم کی سحر ہو کے رہے گی
سہما ہوا بے نور سویرا نہ رہے گا
پھیلے گا اجالا یہ اندھیرا نہ رہے گا
ہر داغ جگر غیرت خورشید بنے گا
ظلمت کا چمن زار میں ڈیرا نہ رہے گا

یہ رجائی انداز بیان صحت مند ذہن و فکر کی
علامت ہے۔ غزلوں ہی کی طرح غنی صاحب کی نظموں میں بھی
سادگی، صفائی، مصرعوں میں تیز روانی اور برجستگی اور پختہ
تر شعوری و ادراکی صلاحیت کار فرما نظر آتی ہے۔ چونکہ فکری
طور پر وہ کسی مخصوص نظریہ کے پابند نہیں ہیں اس لئے انکی تخلیقات
کی معنوی فضا آزاد اور کشادہ ہے انکے یہاں وہ گھٹن اور جکڑن نہیں
ہے جو نظریہ بند فنکاروں کے یہاں امتیازی بات ہوتی ہے۔

تقی شاعر

پروفیسر مہدی علی

شاہ محمد تقی شاعر سے میری شناسائی کوئی نئی نہیں ہے۔ اس وقت جب میں نے ادبی شغف کا آغاز کیا تھا میرے پیش نظر ایک ابھرتی ہوئی شخصیت تھی جس کی غلافدار آنکھیں اور تیکھے خد و خال میرے لئے ایک فطری کشش کا سبب تھے۔ مشاعروں میں ان کی باری کا منتظر رہتا اور جب وہ آجاتی تو پہلو بدل کر میں ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ متوازن ترنم، انگلیوں کا اشارہ اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے انہیں مجمع کو مسحور کر لینے کی صلاحیت تھی۔ اس سے اشعار کا پس منظر اور بھی واضح ہو جاتا تھا اور یہی مخصوص طرز ادا تقی صاحب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا راز تھی۔ وہ شریک مشاعرہ ہمعصروں پر چھا جاتے تھے اور ہر ایک سے خراج تحسین لے لیتے تھے ——— برسوں بعد آج بھی ان کے پڑھنے کا وہی انداز ہے اور ہر محفل میں ان کی شخصیت نمایاں ہو کر رہتی ہے۔ جب وہ اپنی نظمیں اپنے مخصوص انداز میں پڑھتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔

ایک عرصہ کی بات ہے جب حسین آباد بھاگلپور میں بزم حسینی کا کے زیر اہتمام بزم مقاصدہ کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ وہ مقاصدے تقریباً کل ہند پیمانے کے ہوا کرتے تھے جس میں سالک لکھنوی، فضل نقوی، ہزار لکھنوی، کرشن بہاری نور اور ماتھر وغیرہ پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ان مقاصدوں میں میں نے تقی صاحب کو بھی پڑھتے سنا۔ قصیدہ کا آغاز مقدس ماحول میں ایک خاص ٹھہراؤ اور خفیف ترنم سے ہوتا اور جیوں جیوں تشبیب آگے بڑھتی جاتی رات کا سناٹا واہ واہ کی ہلچل سے گونجتا جاتا اور جناب شاعر کی آواز بھی لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی۔ جیوں جیوں تعریف کا شور اور قصیدہ کا عروج ان کا دل بڑھاتا وہ خود بھی ایک محتاط جوش کے ساتھ اپنے ترنم کو تیز تر کرتے جاتے۔ ایسے مواقع آتے کہ واہ واہ کی گونج میں دوسرا شعر سننا مشکل ہو جاتا۔ میں نے ایک ممتاز قصیدہ گو جناب حکیم باقر لکھنوی مرحوم کو سر مشاعرہ کہتے سنا کہ اب کیا پڑھوں! ساری قوت تو تقی صاحب کی تعریف میں کھپا چکا ہوں ——— ایک بار تو خود میرے دادا مرحوم مسٹر ابوالحسن بیرسٹر نے بے اختیارانہ برسر مشاعرہ تقی صاحب کو گلے لگا لیا ——— اب نہ وہ قدرداں ہیں اور نہ مقاصدوں کا وہ سلسلہ۔

جناب تقی صاحب کو اپنی ذہنی تربیت کے

اچھا خاصہ ماحول میسر تھا۔ موصوف کی ننہال میں بہت بلند پایہ شاعر گزرے ہیں اور شاعری وراثتاً ان کے حصہ میں آئی ہے۔ ان کے پرنانا مرزا ماہر صاحب نواب مرشد آباد کے استاد تھے۔ ان کے نانا مرزا اظہر صاحب مدت العمر غزلیں، قصیدے، سلامی اور مراثی لکھتے رہے۔ ان کے چچا مولانا غلام حیدر صاحب قبلہ ایک باوقار اور ہر دلعزیز عالم تھے اور مسجد موقوفہ حسین آباد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بے مثال علمی خوبیوں کے علاوہ اونچے درجہ کے عربی و فارسی انشاء پرداز تھے۔ شاید انہیں بزرگوں کا فیض تھا کہ تقی صاحب اپنی شخصیت کو ادب کے سانچے میں ڈھال سکے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور سر فخر الدین گولڈ مڈل پایا۔ فارسی اور عربی تعلیم کے علاوہ خود اپنی کاوش سے تقی صاحب نے انگریزی کا بھی اچھا مطالعہ کیا ہے اور انگریزی شعراء کے کلام سے بھی استفادہ حاصل کیا ہے۔

جب میں نے مونگیر کالج میں بزم ادب کے جلسے شروع کئے تو لکھنؤ اور عظیم آباد کے شعراء کے پہلو بہ پہلو تقی صاحب کو بھی بلوایا اور مونگیر کے اردو دوست طبقہ نے بے ساختہ ان کو اپنا لیا۔ خوش قسمتی کہئے کہ حالات نے مونگیر میں ایک جا ہونے کا موقع بھی دیئے دیا اور تقی صاحب بہ سلسلہ ملازمت مونگیر آ گئے کچھ عرصہ قبل حکیم باقر صاحب کی اچانک موت نے ہم لوگوں کی بزم کو سونا کر دیا تھا۔ مگر تقی صاحب کے آتے ہی ادبی ماحول ایک آہنگ کے ساتھ جاگ اٹھا۔ حالات بھی سازگار ہوتے گئے اور ؎

"لوگ ساتھ ہوتے گئے اور کارواں بنتا گیا"

یہ حسن اتفاق کہ انہیں دنوں ہم لوگوں کے عزیز دوست شفیع مشہدی مجسٹریٹ ہو کر مونگیر آ گئے۔ پھر جناب سروپ سنیط سیتا پور سے مونگیر پہونچے اور کچھ دنوں بعد جناب عنایت الرحمٰن صاحب جج بھی شہر میں تشریف لے آئے۔ مقامی احباب تو پہلے ہی سے تھے اب ان شخصیتوں کے یکجا ہونے سے ہملوگوں کی بزم سنور گئی اور پھر تو وہ وہ بے تکلف صحبتیں ہوئیں جن کو اب بھلانا غیر ممکن ہے۔

مونگیر پہونچ کر تقی صاحب مجھ سے مشہدی اور اظہار صاحب وکیل سے بہت قریب ہو گئے اور یہ یاران میکدہ خوب خوب رنگ رلیاں منانے لگے سردیوں کی رات تھی اور ہم چار یار، سکنڈ شو سینما دیکھ کر لوٹ رہے تھے۔ کڑاکے کی سردی تھی مگر ہم اس گھڑی جشن منانے کے موڈ میں تھے۔ رات کے ۲ بجے ہوں گے اور گرما گرم کافی کا گھونٹ لیتے لیتے تقی صاحب کے منہ سے ایک مصرع نکلا ؎

کھلے ہیں بادباں طبع رسا کے

نہ جانے کافی کا اثر تھا یا فلم کا جادو مگر یہ بات واضح تھی کہ جناب شاعر کی طبیعت موزوں ہو چکی تھی ہم لوگوں نے فرمائش کر دی کہ بس اب اسی فلم پر نظم ہو جائے۔ صبح ہوتے ہوتے جناب شاعر ہملوگوں کو نیند سے جھنجھوڑ کر اٹھا رہے تھے اور کہہ رہے تھے ؎

مبارک صحبتِ یار، خوش اوقات

نظم مکمل ہو چکی تھی۔

یہ پچھلی رات یہ جھونکے ہوا کے
کھلے ہیں بادباں طبع رساں کے
تمنا مضطرب جذبات بے تاب
مبارک مختصر سی بزم احباب
بہ فیضِ صحبتِ یار خوش اوقات
مبارک زندگانی کے یہ لمحات
بنامِ "ساقی صوفی صافی"
پیو پیتے رہو جب تک ہے کافی

گھر کے دودھ میں بنی ہوئی ذائقہ نواز کافی اور اس پر "صوفی صافی" کے لطیف اشارہ نے کافی کو شراب دو آتشہ بنا دیا ـــــ جو فلم ہملوگ دیکھ کر آئے تھے وہ ٹیکنی کلر تھی۔ کشمیر کے مناظر کی بہتات نے سارے ماحول کو گلابی بنا دیا تھا۔ شاعر اس ماحول پر ایک مسلسل بند نظم کرتا ہے ؎

سر کہسار کی لے کر بلائیں
گلابی ہوگئیں اودی گھٹائیں
برستی ہے گھٹاؤں سے گلابی
نظر سرشار ہر جلوہ شرابی
ہے رخ کا سیب تازہ بھی گلابی
لب نازک یہ غازہ بھی گلابی
حسیں پھولوں کی چادر ہے گلابی
غرض آفاق کی ہر شئے گلابی
کوئی بڑھ کر اگر انگلی سے چھودے
یہ گل کیا چیز ہے کانٹا لہو دے

صرف دو گھنٹوں کے مختصر وقفہ میں یہ فی البدیہہ ایسی رومانی نظم کا لکھ ڈالنا شاعر کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

احباب میں سن و سال کے اعتبار سے تعلق شاعر ہمارے اور جناب ضبط سیتاپوری کے درمیان کی کڑی ہیں۔ محترم ضبط صاحب قیام مونگیر تعلق شاعر سے بلاناغہ ملنے والوں میں تھے۔ دونوں ہی گاندھیائی اصولوں کے پیرو ـ کھدر پوش اور مخلوط تہذیب کی یادگار ـــــ ایک ہندو اور دوسرا مسلمان مگر غضب کا اتحاد دونوں کے انداز فکر اور اصول حیات میں ہے۔ جب ہی تو گاندھی جینتی کے مشاعرہ میں شاعر کی زبان پر یہ اشعار گونج اٹھے ؎

خدا ئے پاک تیری پاک روح کو سکون دے
مری رگوں کو بھی تری رگوں کے ایسا خون دے
قسم خدا کی ہم تری جینتیاں منائیں گے
ترے قدم کی خاک سے نیا حرم بنائیں گے
حرم کہ جس کو اے خدا صنم کدوں کی شان دے
حرم بھی وہ حرم کہ جس میں برہمن اذان دے
نیے بھی اے خدا وہ جلد بیت محترم بنے
جو میرا تپکدہ بنے جو ضبط کا حرم بنے

بہ ظاہر یہ نظم کا اقتباس ہے مگر اس میں شاعر کی عقیدت اس کے سیاسی اور معاشرتی نظریات اور پھر اپنے بزرگ ترین دوست سے قلبی لگاؤ یہ سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے موقع پر "یوم غالب" اردو لائبریری مونگیر میں منایا جا رہا تھا۔ وہاں نظم سناتے ہوئے شاعر نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

تو نے دنیا کو پکارا ہے نئے انداز سے
وقت پیچھے رہ گیا تیری حد پرواز سے

سال گذشتہ بہار قحط کی آگ میں جھلس رہا تھا اور عید آئی اور کتنوں کے لئے بے سروسامانی لے کر آئی عید کی رنگین شام میں سوئیوں سے لطف لیتے ہوئے ہم سب چہک چہک کر شعر سنا رہے تھے مگر تقی صاحب نے اپنی تازہ نظم ہلال عید سنا کر ماحول کو سنجیدہ بنا دیا

(۱)

چاند مایوس نظر آتا ہے کچھ اب کی سال
سر جھکائے ہوئے کیوں دوش افق پر ہے نڈھال
وصل کی رات میں جیسے شب فرقت کا خیال
کہہ رہا ہے یہ اشاروں ہی اشاروں میں ہلال
کچھ تو افلاس کے ماروں کا سہارا ہوتا
کاش چھوٹا سا میں روٹی کا سہارا ہوتا

(۲)

ہوتی جاتی ہے زمانے سے مسرت معدوم
حکم حاکم ہے کہ مظلوم ہے زیادہ مظلوم
قبر افلاس پہ اک جشن ہے یا قحط کی دھوم
عید کے دن یہ سر خاک بلکتے معصوم
خشک سالی میں برستے ہیں جو بادل کی طرح
اشک آنکھوں سے ڈھلے پڑتے ہیں چھاگل کی طرح

(۳)

روح ایثار ہے یہ فلسفۂ صوم و صلوٰۃ
مکتب تزکیہ نفس ہے یہ صبر و ثبات
خشک ہوتی ہے تو ہو جائے زبان سادات
کوئی پیاسا نہ رہے پھر بھی لب نہر فرات
کیڑے پڑ جائیں سویوں میں جو تقسیم نہ ہوں
منعمو! غور سے دیکھو یہ جراثیم نہ ہوں

شاعر یوم جمہوریہ کے موقع پر بھی صرف مسرت کے شادیانے نہیں بجاتا بلکہ ایک پیغام دیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جناب شاعر اپنی نظم کا انجام افادیت پر تمام کرتے ہیں اور صحیح معنوں میں افادیت کے علمبردار ہیں۔ عوامی اضطراب سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ وطن اور قوم کا سچا درد ان کی فطرت میں داخل ہے۔ اشتراکی پرچم کی ہوائیں گلابی آگ کو اور سرخ کر دیتی ہیں

سر پہ لہراتا ہے کس شان سے قومی پرچم
سایۂ رحمت باری ہے کہ یہ ابر کرم
کتنے مضبوط ارادوں سے یہ گاڑے ہے قدم
چھیڑتی ہے جو پھریرے کو ہوائے برہم
دیکھ کر منہ مرا شرما کے سمٹ جاتا ہے
چوب رایت سے یہ گھبرا کے لپٹ جاتا ہے

غیرت قومی کی کتنی خوبصورت تصویر پیش کی گئی ہے ——— ایک چونکا دینے والا پیغام دے کر شاعر خاموش ہو جاتا ہے۔

ہو رہا ہے نئے شعلوں کا جو مطلع سے ظہور
اب بھی دکھلائی نہ دے کچھ تو ہے آنکھوں کا قصور
ہاں یہ بات اور ہے تم نار کو کہتے رہو نور
استخوانوں سے جلائے ہیں یہ بھوکوں نے تنور
اب بھی ہشیار! کہ دامن نہ شرر تک پہنچے
آگ قدموں سے جو لپٹی ہے نہ سر تک پہنچے

جناب شاعر کو میں نے اب تک صرف ایک پیامبر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اب ان کی نظم کا ذرا رومانی پہلو ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی نظم "عروس نو" میں بھی گرچہ ایک حسین پیغام

ہے۔ مگر اس کا رومانی حصہ منظر نگاری کے اعتبار سے شاہکار ہے۔

اٹھی ہے فرشِ خوابِ جوانی پہ لیٹ کر
بیٹھی ہے دستِ شوق سے ارماں سمیٹ کر
ماتھے پہ آرہا ہے پسینہ حجاب سے
لبریز ہو گئی ہے صراحی شراب سے
بیٹھی ہے نورِ صبحِ درخشاں بنی ہوئی
لٹنے کی آرزو میں گلستاں بنی ہوئی
بیٹھی ہوئی ہے حجرۂ شوقِ خیال میں
یا شمعِ انتظار ہے طاقِ وصال میں
دوشیزگی کے ظرف میں صہبا بھری ہوئی
مسند پہ اک حسین صراحی دھری ہوئی
جھجکی ہوئی شباب کی فصلِ بہار سی
سہمی ہوئی سی شوخ مگر اس کے پیار سی

نفسیات کی نازک موشگافیاں شاعر کا خاص حصہ ہیں شرم سے پسینہ آنا۔ لٹنے کے شوق میں ہمہ تن گلستاں ہو کر بیٹھنا اور بیچ آنے والے وقت کا خوف اور شوق کی کشمکش! ان متضاد جذبات کی تصویر کشی اس سے زیادہ کیا کی جا سکتی ہے۔ اور جذبات کا عالم یہ ہے کہ

چپکے سے پاس کوئی سہیلی جو آ گئی
آہٹ سے فرطِ شوق کی لو تھرتھرا گئی

کتنا جذباتی اور نفسیاتی شعر ہے اور چپکے سے میں جو رمزیت ہے اسے بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہوتے ہوتے اقرار کا وقت آتا ہے اور خود سپردگی کے لئے لئے "ہاں" کہنا ہے اور اس وقت :—

ٹوٹی جو مہرِ نطق کلی سے چٹک گئی
ہاں اس نے یہ کہا کہ گلابی چھلک گئی

رومانی نظمیں ایک دو نہیں کثرت سے ہیں اور ہر نظم شاعر کے جمالیاتی احساس کا عکس ہے ——— شاعر ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں یا یہ کہئے کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں" اگر کسی صنفِ سخن میں انہوں نے کوشش نہیں کی ہے تو وہ آزاد شاعری ہے جس سے انہیں نفرت ہی نہیں بلکہ وحشت ہے ——— جناب شاعر رباعی نظمیں قصیدے، سلام اور مثنوی سب کچھ کہتے ہیں۔ غزلیں کم کہتے ہیں مگر مونگیر کی طرحی نشستوں میں ان سے غزلیں سنی گئیں۔ وقت کی قدروں سے مزاجِ غزل کو ہمنوا کرنے میں شاعر کو خاص ملکہ ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تری برقِ نظر کیا لے رہی ہے امتحاں اپنا
دھواں کیوں دے رہا ہے ڈھیر ڈھیر آشیاں اپنا
بھٹکتا پھر رہا ہوں رات بھر منزل نہیں ملتی
نہ جانے کارواں گم ہے کہ میرِ کارواں اپنا

اور معرفت کا ایک پاکیزہ شعر ملاحظہ فرمائیے

تماشہ ہے اٹھا کر ایک ذرہ محوِ حیرت ہوں
مکاں کیا ہے؟ سمٹ آیا ہے اس میں لامکاں اپنا

اپنا مضمون ختم کرنے سے پہلے جناب شاعر کی ایک نظم "احباب" کے چند بند پیش کر رہا ہوں۔ اس نظم سے مونگیر کے یارانِ سخن کا مخصوص تعلق ہے اس لئے جذباتی طور پر بھی اسے پیش کرنے کی خواہش ہے اس نظم سے جناب شاعر کی احباب نوازی کا اندازہ ہو سکے گا۔ یہ نظم خانقاہ رحمانیہ کی ایک مخصوص نشست میں پڑھی گئی تھی۔

چاندنی میں یہ چمکتا ہوا اونچا مینار اپنے ماتھے پہ دھرے چاند کی ترچھی دستار
کہہ رہا ہے کہ رہے اس بھی اونچا کردار میرے خاموش مبلغ تری عظمت کے نثار

جیسے ہو مائلِ پرواز فرشتہ اپنا
جوڑتی ہے یہ زمیں عرش سے رشتہ اپنا

ہم وفاؤں کے پرستار محبت کے رفیق جسم بے جبہ و دستار مگر فکر عمیق
رکھتے ہیں پہلوئے بیدار میں ایک قلب رفیق فرش ہو جاتے ہیں ملتا ہے اگر کوئی شفیق

مولانا شفیق عالم مدرس جامعہ رحمانی اور میزبان

آج کی شب ہیں مہمان بنانے والے
دل ہتھیلی پہ لئے آئے ہیں آنے والے

گونجتی ہے مری محفل میں صدا سے منصورؔ منتظر بزم میں ہے حضرت مہدیؔ کا ظہور
دور ہم سے نہیں کچھ ہم نہیں ممتازؔ سے دور بن پیئے مست ہیں کیا بادۂ احمرؔ کا قصور

سب ہی الفاظ میں اظہار اثر رکھتے ہیں
ہم ہیں وہ لوگ جو پہلو میں شررؔ رکھتے ہیں

ڈاکٹر منصور ۲ پروفیسر مہدی ۳ ممتاز صاحب مزاحیہ شاعر ۴ یٰسین احمر ۵ اظہار صاحب ... کمال ۶ روح اللہ شمیم

اب جناب شاعر کا تبادلہ ہو چکا ہے اور وہ مونگیر سے جا چکے ہیں مگر ہمارے پاس ان کی شعریں یاد رہ گئی ہے ۔ لگتا ہے کہ ہم مخصوص نشستوں میں انہیں اب بھی تکلیف دیتے رہتے ہیں ۔ مشہدی صاحب کا تبادلہ ہو چکا ہے ۔ عنایت الرحمٰن صاحب ڈسٹرکٹ جج ہو کر پورنیہ جا چکے ہیں ۔ ڈاکٹر منصور احمد صاحب اس دار فانی کو چھوڑ کر خلد کی محفل میں جا بیٹھے ہیں اور ہماری بزم کے مضبوط ستون ٹوٹ چکے ہیں مگر ہم بادۂ شبانہ کی سرمستیوں سے اب بھی لطف اندوز ہو لیتے ہیں ——— کیونکہ

اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

احمد :۔ بھئی آج کل خالص تیل اور عطریات تو بالکل نایاب ہیں

محمود :۔ کیا تم نے جو پنور پرفیومری تاتار پور بھاگلپور سے رجوع کیا ہے ؟

احمد :۔ نہیں ——— !

محمود :۔ تو پھر گھر بیٹھے ریمارک پاس کرنا غلط ہے اگر اعلیٰ درجے کی روغنیات اور عطریات کی تلاش ہے تو **جو پنور پرفیومری** تاتار پور بھاگلپور سے خریدیں ۔

غزلیاتِ غنی — ایک مطالعہ

از:- قمر اعظم ہاشمی

غزل ایک صنفِ سخن ہی نہیں ایک باشعور انداز فکر بھی ہے۔ اور مہذب طریقۂ گفتگو بھی۔ اس کا حسن آہنگ اور حسن کلام دوسروں کو بھی متاثر اور متوجہ کرتا ہے۔ چونکہ ذات کا اظہار ہی یہاں اصل معاملہ ہے اس لئے اس صنف میں داخلی شعور خود تشخیصی اور خود آشکاری نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ فنکار ان بیباک تخلیقی رویوں کا رخ تو نہیں موڑتا جو پیمانۂ غزل میں ڈھلنے کے لئے مضطرب ہوتی ہیں البتہ اپنی اندرونی کائنات کی عریاں فکری اور خیالی تصویروں کو بلاغت کے دبیز پردوں میں چھپا ضرور دیتا ہے تاکہ ایک جانی بوجھی پوشیدگی سی برقرار رہے۔ احساس کی دنیا میں، معلوم اور غیر محسوس طور پر ہر فرد ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ چنانچہ جب کوئی اپنے دل کا حال، مسرت انگیز یا المناک، دوسرے سے کہتا ہے تو یہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور پھر غزل تو بہ اعتبار مزاج دلی احوال و کوائف کی ترجمان ہی ہے۔ بالکل فطری طور پر پڑھنے والے اس سے لطف و اثر لیتے ہیں وہ ارتسام احساس ———— جو غزل میں شاعر کا قطعی نجی ہوتا ہے۔ عمل تخلیق سے گذرنے اور منظر عام پر آجانے کے بعد اپنے دائرۂ اثر کو کافی پھیلا دیتا ہے اور اسوقت کوئی احساس یا خیال نجی نہیں رہ جاتا۔ غزل کا یہی داخلی سرمایہ اس کے اندر وہ مقناطیسی حسن و اثر پیدا کرتا ہے جو قریب سے گذرنے والے کو بھی بے تعلق نہیں جانے دیتا۔

میں اسی لئے غزل کو داخلی کائنات کی ایک ایسی رازدار صنف تصور کرتا ہوں جس میں فنکار بالکل اپنے فن کی دنیا میں ڈوب کر تخلیقی سفر کرتا ہے۔ غزل نگار کے پیش نظر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے محض اس کی ذات ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ خارجی اور داخلی کائناتوں کے تمام رنگ و بو سے فائدے اٹھاتا ہے وہ صرف تصویریں نہیں اتارتا ان میں جان ڈالتا ہے صرف پیکر تراشی نہیں کرتا پیکروں میں روح پھونکتا ہے۔ وہ دیکھتا سب کچھ ہے، سنتا ہے سب کی، لیکن کہتا وہی ہے جسے وہ کہنا چاہتا ہے اپنا وہ رازِ دروں بھی غزل میں پیش کر دیتا ہے جسے وہ دوسروں کو نہیں بتا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ غزل کے داخلی مزاج اور فنکار کے مزاج میں کسی طرح کا حجاب نہیں ہوتا اور غزل کہہ لینے کے بعد فنکار سکون و کیفیت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ دراصل غزل کی صنفی بیریئی نے انتشار پسند فکر و خیال کی بالکل سچی ترجمانی کرتی ہے۔ انسانی ذہن میں احساسات و خیالات کی لہریں تیزی سے رنگ بدلتی اور ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ غزل کے شعروں میں احساس و خیال کے رنگ بدلنے کا یہی عالم ہوتا ہے

غزل کے صنفی وجود کو ختم کرنے کے لئے خواجہ الطاف حسین حالی، عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد اور انکے منفرد ہم خیالوں نے بہت تیز و تند کوششیں کی اور تنقیدیں کیں۔ پھر بیسویں صدی کے اوائل ہی سے نظم نگاری کا میلان سرعت سے فروغ بھی پانے لگا۔ اس کے ردعمل میں ایک اندیشہ سا ہوا تھا کہ غزل کی آب و تاب ماند نہ پڑ جائے۔ مگر یہ خوف دھیرے دھیرے خود ہی زائل ہو گیا کیونکہ شعور فن کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ غزل کا رنگ و آہنگ رفتہ رفتہ نکھرتا چلا گیا اور اس کی جادو اثری، سحر طرازی اور افسوں نگاری کا دائرہ عمل و اثر پھیلتا چلا گیا۔ اب جب کہ نئی نظم نگاری کا رجحان زور و شور سے آگے بڑھنے لگا ہے۔ غزل گوئی کے رجحان نے بھی جدید تر لب و لہجہ کو اپنا لیا۔ موجودہ دور کی غزل گوئی میں متوازی طور پر دو طرح کی نمایاں لہریں ہیں۔ نئی نسل کی غزلوں میں شبیہہ سازی، جنسی الجھنوں کا رمزی اظہار پرانی علامتوں اور روایتی آہنگ سے نفرت و بیزاری کا میلان عام طور پر ملتا ہے۔ یہ غزل نگار تغزل یا حسن تغزل کا اہتمام یا احترام نہیں کرتے۔ احساس اور جذبہ کی صداقت اور وارفتگی البتہ ان کے یہاں ملتی ہے۔ دوسری طرف غزل نگاروں کی وہ صنف ہے جن کے یہاں غزل کی تمام پرانی صفتیں ملتی ہیں جنہوں نے روایتوں کا احترام بھی کیا ہے۔ اور غزل کے مطالبات کو برتنے کا اہتمام بھی۔ جناب محی الدین غنی بھی غزل نگاروں کی اسی صف سے وابستہ ہیں۔ ان کی شخصیت کو کچھ اور واضح کرنے کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں ان کے معاصرین جناب کلیم عاجز، جناب ہوش عظیم آبادی، جناب شاداں فاروقی، جناب وفا ملک پوری، جناب شاغل قادری جناب غیاث افر، جناب شبیر کاظمی وغیرہم ہیں۔

جناب محی الدین غنی کی غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فنی شعور بالیدہ اور پختہ ہے۔ غزل کے ناز و انداز سے نہ صرف یہ کہ غنی صاحب آگاہ ہیں بلکہ پورے ضبط و نظم کے ساتھ اس کے آداب کو برقرار رکھنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ ان کی کچھ غزلوں کے اکثر شعروں میں جذبۂ احساس کی فراوانی، تخیل کی بلند پروازی اور فکر و خیال کی نزاکت ملتی ہے۔ جہاں ان لوازم کی کمی ہے وہاں الفاظ و تراکیب کی سادگی اور روانی اور صوتیاتی حسن و آہنگ اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔ اگرچہ علامتوں اور تشبیہوں میں جدت و ندرت بہت کم نظر آتی ہے۔ مگر پرانی علامتوں کی تعبیر نو اور پرانی تشبیہوں کی تفسیر جدید پیش کرنے میں یہ ایک خاص امتیازی سلیقہ رکھتے ہیں۔ غزلوں میں جانداری توانائی اور تابناکی خارجی ہیجانات کی قوت و صلاحیت اور داخلی محرکات کے شدید عمل اور ردعمل سے آتی ہے۔ غزلیات غنی کے مطالعہ سے محسوس ہوا ہے کہ فنکار کے یہاں خلوص فکر و فن بھی ہے اور اخلاص جذبہ بھی۔ یہاں یہ عرض کرتا ہوں کہ غزل ایک ایسی صنف تو ہے جس کا گہرا تعلق داخلیت اور داخلی احوال و کوائف سے ہے۔ اور یہ کہ یہاں جذبہ و احساس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن جذبہ و احساس اور اس کا اظہار تنہا سب کچھ نہیں۔ تہذیب جذبہ اور تحمل جذبہ بھی بے حد ضروری ہے۔ غیر مہذب جذبہ اور اس کا بیباک اظہار غیر تربیت یافتہ اور ناپختہ ذہنوں کی نشاندہی کرتا ہے یہ اطمینان کی بات ہے کہ غنی صاحب کی غزلوں میں جذبہ و احساس کا سرمایہ مہذب اور متمدن ہے۔ ان کی غزلوں میں انفرادی زندگی کی آسودگی و ناآسودگی بھی ملتی ہے اور اجتماعی زندگی کے شب و روز کی کہانی بھی مگر غم حیات و غم کائنات

کی کشمکشوں اور الجھنوں کے باوصف ان کے یہاں داخلی قنوطیت کا شخصی المیہ نہیں ملتا۔

رجائیت کی ایک ہلکی سی سوچ پس پردہ فکر انگڑائیاں لیتی نظر آجاتی ہیں۔ اور اسی خصوصیت نے محی الدین غنی کو اس مریضانہ یاسیت سے محفوظ رکھا ہے جس کی وجہ سے صحت مند شخصی ارتقا کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

محی الدین غنی کی غزلوں میں عشقیہ احساسات کثرت سے ملتے ہیں۔ یوں تو اردو غزل کے سرمایہ کا ایک خاص حصہ حسن و عشق کی داستان سے بھرا پڑا ہے۔ مگر اس میں رفعت فکر و نظر، پاکیزگیٔ احساس و خیال اور معنوی بلندی و تہہ داری کے ساتھ ساتھ سطحیت خارجیت، اور "نہایت لپسند" والی بات بھی موجود ہے۔ غنی صاحب کی غزلوں میں فنکارانہ صناعیوں کا ایک مخصوص توازن، دروں بیں نقطۂ نظر، واردات قلب اور ان کے اظہار و اسلوب کا ایک خوش آہنگ رکھ رکھاؤ اور تخلیق کا ایک پائدار حسن سلیقہ ملتا ہے۔ ان کا میلان عشق، محبوب حقیقی کے حسن لازوال سے وابستہ ہے اسی لئے جا بجا صوفیانہ خیالات کی لہریں بھی موجزن نظر آتی ہیں اور مادی زندگی اور اس عالم بے کیف وکم کے خواب و سراب انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے بلکہ اسی سے سنئے ناپائدار کے احساس کا نقش اور گہرا ہو جاتا ہے۔ ذیل میں کچھ غزلوں کے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہزاروں مرحلے ہیں زندگی کے
یہ عمر مختصر ہے۔ اور میں ہوں
غنیؔ آسودۂ منزل ہے کوئی
مسلسل اک سفر ہے اور میں ہوں

زیست کی ناکامیاں بھی تھیں اور دلِ دیوانہ تھا
اس پر بھی ہر اک قدم پر سجدۂ شکرانہ تھا

جو نگاہوں میں جچ گیا تیری
سارے عالم میں سرفراز ہوا

ذرا دادِ وفا دیجئے ہمارے ضبط پیہم کو
دبا لینا نہ تھا آساں دل میں شورش غم کو

مذاقِ عاشقی نے مشکلیں سب سہل کر ڈالیں
ستم تیرے کرم نکلے کرم تیرے ستم نکلے

غنیؔ میں چپ ہی رہ جاتا اگر معلوم یہ ہوتا
مرا حرف تمنا بھی انہیں بارگراں ہوگا

آج اس نے نگہ لطف سے دیکھا ہے غنیؔ
میں نے بھی آج سے جینے کی قسم کھائی ہے

دل کو آئینہ بنا لو تو مقدر چمکے
حسن حیراں ہے آئینۂ حیراں کے لئے

لطف آگیں شام کی کیا صبح عبرت تھی غنیؔ
شمع محفل گل ادھر تھی خاک ادھر پروانہ تھا

بے خودی جب گذر گئی حد سے
ختم فرق نیاز و ناز ہوا

بدل دیتے ہیں ہم صبح طرب میں ہر شب غم کو
بایں صورت میسر ہے نشاطِ زندگی ہم کو

تو نے مری تخیل کو دی قوت پرواز
اور ذہن کو میخانۂ الہام کیا ہے

شیشۂ دل پہ جلا دیتا گیا عکس جمال
زندگی آئینہ آئینہ گر ہوتی گئی

ان اشعار میں سادگی ہے۔ صفائی ہے معصومیت ہے۔ اثر انگیز مہذب جذبہ وخیال ہے۔ مانوس بین ترکیبوں تشبیہوں، اور استعاروں کا حسن استعمال ہے کہیں کہیں شاندار برجستگی اور روانی ہے۔ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ماحول کے بے رحم دباؤ اور عصری دکھ درد کے احساس کا انعکاس ہوا ہے۔ لیکن ایسے شعروں میں بھی مثبت انداز حیات کارفرما نظر آتا ہے۔

بے کیف یہ انداز بہاراں نہ رہے گا
جو آج ہے یہ رنگ گلستاں نہ رہے گا

بدل دیتے ہیں ہم صبح طرب میں ہر شب غم کو
بایں صورت میسر ہے نشاط زندگی ہمکو

اب اہل چمن اٹھے ہیں تعمیر چمن کو
تخریب وحوادث کا یہ طوفاں نہ رہے گا

فنکار اپنے نامساعد حالات، ناسازگار، اور ناخوشگوار حالات کے باوجود یاسیت اور قنوطی اضمحلال کا شکار نہیں ہوتا۔ ویسے بھی صحت مند رجحان اعلیٰ فنکاری کے لئے اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے بے تکلفی سے یہ عرض کرنے دیجئے کہ جناب محی الدین غنی ایک غیر معروف غزل گو تو ہیں مگر بعض معاصرین سے بہتر تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر انہوں نے معنی اور اسلوب کے اعتبار سے غزل کے روایتی حصار سے باہر نکل کر الفاظ وبیان کی تازگی وشگفتگی، فکر وخیال کے نئے آفاق جذبہ واحساس کی تہہ داریوں اور شعور وبصیرت کے نئے زاویوں کی جستجو کی تو یقینی ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے پوشیدہ گوشے منظر عام پر آئیں گے۔

محی الدین غنی نے غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ میں نے موصوف کی جن نظموں کا مطالعہ کیا ہے ان میں ایک امتیازی بات یہ نظر آئی کہ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے فروغ واستحکام کے خواہاں ہیں۔ انسانوں کے درمیان حائل نسلی، ملکی، جغرافیائی دیواروں کی لعنتوں اور نفرتوں سے ان کا شعور آگاہ ہے۔ انسانی برادری کی تعمیر وترقی کے لئے یہ ضروری ہے بھی کہ چھوٹے چھوٹے اختلافات ختم کر دئیے جائیں۔ انسان اگر انسان ہی ہو جائے تو یہ بڑی بات ہے۔ موجودہ دور میں کہ جب ہر فرد اپنی غرض وافادہ کے لئے دوسروں کو زک پہونچانے پہ آمادہ ہے۔ یہ شعور آدمیت فروغ پا جائے تو اہم بات ہے غنی صاحب کی نظم "مشورہ" کے چند اشعار دیکھئے۔

سبق اخلاص والفت کا پڑھا دو
ہر اک انسان کو انساں بنا دو
کرو ذروں کو مہر وماہ وانجم
زمیں کو چرخ کا ہمسر بنا دو

باقی صفحہ ۲۴۳

محی الدین غنی کی شخصیت

از ——— شاغل قادری

گدڑی میں لعل کا محاورہ بچپن سے سنتا آیا تھا لیکن ذاتی طور پر کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا جس سے اس محاورے کا من وعن مفہوم ذہن نشین ہو جاتا۔ صاحبگنج سے ۱۹۶۰ء میں جب دوبارہ بھاگلپور بدل کر آیا اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا چاہا تو میرے دفتر سے بہت قریب ایک ایسا ہوٹل ملا جو دن بھر ہوٹل اور شام ہوتے ہی شعر و ادب کا مرکز بن جایا کرتا ہے۔ اس ہوٹل کے مالک محی الدین غنی صاحب دیرینہ ملاقاتی نکلے۔ اور جو شعراء یہاں ہر شام یہاں محفلیں سجایا کرتے تھے ان میں بھی اکثر و بیشتر وہ احباب ملے جنہیں میں ۱۹۵۳ء میں صاحب گنج جاتے وقت خوش یا ناراض کر گیا تھا۔

یوں تو موجودہ قدیم بزم سخن اس بزم ادب کی ایک کڑی ہے جسے ڈاکٹر ناصر صاحب اور بیرسٹر ابوالحسن مرحوم نے ۱۹۲۹ء میں قائم کیا تھا۔ لیکن بزم سخن نام کی جو بزم سخن قائم ہوئی اس کی تاریخ تاسیس مئی ۱۹۵۰ء ہے اس کے مشاعرے ہر ماہ شہر کے مختلف محلوں میں باری باری ہوا کرتے تھے۔ جس میں اور شعراء کے ساتھ محی الدین غنی بھی شریک بزم رہا کرتے تھے۔ غنی صاحب کو ایک شاعر کی حیثیت سے میں انہی دنوں سے جانتا ہوں مگر یہ نہ جانتا تھا کہ پیر و مرشد یا شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اقدس کے قریب میں جو ہوٹل ہے اس کے مالک یہی ہیں۔ نیز ان کے مزاج، افتاد طبع، صلاحیت وغیرہ سے بھی کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ اس مرتبہ جو آیا تو رفتہ رفتہ میں غنی صاحب کے بہت قریب ہو گیا۔ شام کی نشست میں تقریباً شہر کے کل قابل لحاظ شعراء اور ادباء شریک رہا کرتے تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ "بزم سخن" کی کاروائیاں ساری کی ساری یہیں ہوتی ہیں۔

بزم کے جنرل سکریٹری یوں تو جناب عبدالرحیم نظر ہیں مگر میں نے یہ دیکھا کہ جوائنٹ سکریٹری محی الدین غنی کل احباب میں سب سے زیادہ فعال ہیں۔ اور ہر فرد پر ان پر ہی بزم کے امور کے سلسلہ میں ہر معاملہ کا انحصار رکھتا ہے۔ شام کی یہ نشست جو بعد میں "میکدہ" کے نام سے مشہور ہوئی غنی صاحب کی شخصیت اس میکدہ میں روح رواں جیسی ہے۔ جس دن یہ غیر حاضر رہے ایسا معلوم ہوا سارا معاملہ ٹھپ پڑ گیا ہے۔ ابتداء میں میں نے یہ سمجھا کہ یہ ہوٹل کے مالک ہیں شاید اسی لئے ایسی بات ہے۔ لیکن بعد کے تجربات نے یہ بات واضح کر دی کہ غنی صاحب نہایت سنجیدہ، ملنسار، اور بامروت انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ہر معاملہ کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غیر حاضری احباب کو کھلنے لگتی ہے۔ میں نے انہیں عام تک بند شاعروں کے زمرہ میں دو چار ملاقاتوں تک رکھا۔ مگر جیسے جیسے قریب ہوتا گیا وہ یہاں میں

جو پردے حائل تھے اٹھ گئے اور جب غنی صاحب کا صحیح روپ میرے سامنے آیا تو جو پہلا تاثر مجھ پر ہوا وہ میری مرعوبیت کا تھا۔ اپنا حال یہ ہے کہ فن عروض کے رموز دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہوں مگر فاعلاتن فاعلن کی مشق ایسی نہیں ہے کہ بیک نظر کوئی فیصلہ کر سکوں۔ غنی صاحب کو اس معاملے میں بڑا ماہر پایا۔ غزل میں جو آج نئی نئی راہیں نکلی ہیں ان سے موصوف نے صرف استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنا جداگانہ لب و لہجہ ایسا اختیار کیا ہے کہ ان کی آواز دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ شعری ادب کا مطالعہ بھی اپنے ہم عصروں سے کم نہیں رکھتے۔ یہ تو فن کی بات ہوئی۔ ان کی شخصیت میں جاذبیت کا جو سب سے بڑا سبب ہے وہ ہے ان کی نرم مزاجی، دور بینی اور اخلاق ہے۔ میرے جیسا جذباتی انسان جو تعمیری کام کرنے کی بات سوچے تو اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کو تخریب میں بدل دے اور اس طرح خود ناکام ہو اور دوسروں کو بھی ناکام کر دے ایسے شخص کو میٹھے بولوں سے رام کرنے کا ہنر اگر کوئی جانتا ہے تو وہ محی الدین غنی کی شخصیت ہے۔

غنی کے مطالعہ نفسیات انسانی کا پھل ہے کہ آج میرے کل احباب میرے جذبات کی تہ میں جو خلوص ہے اس کو سمجھنے لگے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء سے آج تک یہاں کی ادبی خدمات کی جو ایک طویل فہرست ہے اس کا سہرا اگر کسی ادارے کے سر ہے تو وہ قدیم بزم سخن ہے۔ اور اگر کسی واحد شخصیت کا نام لیا جائے تو اس میں ہر فرد نے گرچہ اپنا اپنا رول ادا کیا ہے مگر محی الدین کی ذات نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ "نظارہ و خیال" کی طباعت کا سلسلہ ہو یا "متاع شوق"، "نگار فکر" اور "آتش" کے چھپنے کی مہم۔ ہر مرحلہ پر غنی کا خلوص کارفرما رہا ہے آج بھی "ماحول نمبر" کے سلسلہ میں ان کی انتھک محنت، جذبۂ ایثار اور حسن کارکردگی قابل داد ہے۔

ماضی بعید میں اس شہر کے ادبی حلقہ میں جو پے بہ پے طوفان اٹھتے رہتے تھے اس سے اہل شہر کے ذہنوں میں ایک عجیب سی بات بیٹھ گئی تھی۔ وہ یہ کہ بھاگلپور کے شعراء صرف آپس میں لڑتے ہیں، زبان و ادب کی خدمت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں یہ ایک ایسی متعدی بیماری تھی جس کے سدباب کی سبیل ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی تھی۔ شعراء کو گوشہ گیر ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ غنی صاحب نے میری یہاں آمد سے بہت پہلے احباب کے مشورہ سے یہ سبیل نکالی کہ اب بھی مخصوص قسم کے طرحی مشاعروں پر اکتفا کرنا چاہئے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ تخریبی عناصر سے پرہیز نہ کر کے انہیں تعمیر کی راہوں پر لگا دیا جائے۔

یہ بڑے صبر و تحمل اور آزمائش کا معاملہ تھا مگر اس آگ میں اس شہر کا کاروانِ ادب تپ کر جو نکھرا ہے اس کی کامیابی کا زیادہ تر انعام اگر کسی کو ملنا چاہئے تو وہ غنی ہے صبر کی ایک حد ہوتی ہے اس کے آگے سے بڑھنے سے شیشۂ دل چکنا چور ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

نہ جانے کتنی مرتبہ ایسے معاملات آئے جب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طوفان سر سے نہ ٹلے گا۔ خصوصاً "نظارہ و خیال" کے بعد اشاعت کے مرتب کے مضمون کے چند جملے ایسے تھے جو ایک صاحب کو ناپسند ہوئے۔ وہ جملے حقیقت یہ ہے کہ مرتب کے نہ تھے۔ کچھ احباب نے بہت سوچ بچار کے بعد ان جملوں کو لکھنے کی رائے دی تھی۔ مگر اس مشورہ کے ساتھ غنی تھے اور نہ میں۔ جب طوفان اٹھا مجرم اول مجھے ٹھہرایا گیا۔ غنی نے اس کی پرزور تردید کی۔ اور صلح و صفائی میں آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ انجام کار کے ان جملوں پر سیاہی پھیر دی گئی۔ اس طرح کے اور بہت سارے واقعات ہوتے رہے اور طوفان منڈلاتا رہا۔ یہاں تک کہ

وہ دن آیا جب وثوق کے ساتھ یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شہر والوں کو جو شکایتیں تھیں وہ بہت حد تک دور ہو گئیں۔ یہ درست ہے کہ اس میں کریم اسدی صاحب کی صوفیانہ روش اور نسیم آروی کی نرم مزاجی کو بھی دخل ہے مگر غنی کا کردار بھی اس سے کم درخشاں نہیں ہوتا۔

محی الدین غنی کی سیرت کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ بظاہر ان کے شاگردوں کی تعداد ـــــــ صرف تین ہے مگر ایسے لوگوں کی کتنی تعداد ہے اور وہ لوگ کہاں کہاں ہیں کسی کو علم نہیں ہے۔ جو غنی سے صرف استفادہ حاصل نہیں کرتے بلکہ غزل کی غزل لے کر اپنے شاگردوں میں بھی تقسیم کرتے ہیں۔ اس ساز کو غنی کبھی چھیڑتے نہیں اور کبھی کوئی دوسرا مضراب لگانا چاہتا ہے تو سختی سے جس میں شماتت کا بھی عنصر ہوتا ہے منع کرتے ہیں۔

آج دنیا کی عام روش یہ ہے کہ لوگ ملتے سب سے ہیں مگر کسی کو اپنا نہیں سمجھتے۔ غنی کی سادگی یہ ہے کہ ملنے والوں کو اپنا سمجھتے ہی ہیں جس سے غیریت کی بو آتی ہے اس کے جامۂ اخلاق میں بھی محبت کا عطر ملنے کی سعی کرتے ہیں۔ غنی کو مومنانہ فطرت کا اقتضا تھا کہ یہ رندمشربی کو ترک کر دیں۔ مگر یہ حادثہ ہوتے ہوتے رک گیا۔ جہاں تک ذہن سے بے نیازی کا تعلق ہے غنی اس سے اب بہت دور ہو چکے ہیں۔ صورت و سیرت سے دونوں سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ غنی کی رگ و پے میں جو دینی عنصر تھا وہ اب نہ عروج پر ہے اللہ کے فضل و کرم سے حج بیت اللہ شریف سے بھی فیض یاب ہو چکے۔ ملنے والوں اور خصوصاً شعراء کو یہ خطرہ تھا کہ غنی روایتی قسم کے مذہبی نہ بن جائیں اور سورۂ شعراء کے صرف لاتقربوا الصلوٰۃ کی طرح نہ سمجھنے لگیں۔ مگر بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ غنی کا دل اس مومن کا ہے جو دین کے مزاج کو کیا خدا سمجھتا ہے اور اس سے ہم آہنگ ہے۔ حاجی ہونے کے بعد غنی کے فکر و فن میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے پہلے کوئی ایسا نشیب و فراز نہ تھا جس میں تبدیلی لانے کی طرف یہ مائل ہوتے، ذہن ابتدا سے تعمیری تھا اللہ آج بھی تعمیری ہے۔ دین فطرت کے تقاضوں کو اپنے فکر و فن کے سانچے میں یہ پہلے بھی ڈھالتے تھے اور آج بھی ڈھالتے ہیں عمل میں کوئی خاص تبدیلی ہوئی تو بس یہ کہ صوم و صلوٰۃ اور درود و وظائف کے سختی سے پابند ہیں۔

شاعر دنیا سے بے نیاز ہو کر، دنیا والوں کی بھلائی سوچنے کے لئے گوشہ گیر رہتا ہے۔ عمل سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کلیہ سے غنی مستثنیٰ ہیں۔ فسادزدہ مصیبت زدگان کا معاملہ ہو یا کوئی اہم موقع، غنی کو آپ میدانِ عمل میں دیکھیں گے اس موقع پر اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ غنی شاعر ہیں تو آپ شاید یقین نہ کریں۔ انتھک محنت اور سعیٔ پیہم سے یہ گھبراتے نہیں یہ دوست ہوں یا رشتہ دار سب پر بھروسہ کرنے کے فطرتاً عادی ہیں۔

کاروبار کا سارا معاملہ ان کے قریبی عزیز واجد علی تمر کے سپرد ہے۔ حساب و کتاب کا معاملہ کیا ہے یہ غنی جانیں اور تمر۔ آج تک کسی قسم کی تلخی کی بھنک تک نہ ملی۔ شاعر و ادیب دوستوں سے صرف سیکدہ تک کی دوستی نہیں ہے۔ بلکہ غنی ان کے دکھ سکھ کے بھی ساتھی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ برے کو بھی برا نہیں کہنے دیتے اس سختی سے روکتے ہیں کہ کبھی کبھی انسان جھنجھلا جاتا ہے۔ صلح کل کا مشرب بھی اپنے حدود میں ہوتا ہے۔ مگر غنی اس کے قائل نہیں۔ یک طرفہ صلح جوئی ان کی فطرت ہے۔ اس سے نقصان جو کچھ بھی ہو لیکن آخری فتح کا پرچم غنی کے ہاتھ ہی میں رہتا ہے۔

مظفر اقبال اور لطف الرحمٰن صاحبان مقامی کالج میں جب پروفیسر ہو کر آئے تو ادبی حلقوں سے ان دونوں نے بہت جلد رابطہ پیدا کر لیا۔ یہاں کے ہر شاعر و ہر ادیب کو نجی صحبتوں اور ادبی مجلسوں میں پرکھتے رہے انجام کار سب سے زیادہ میرے خیال میں جو شخصیت ان اصحاب کے لئے باعثِ کشش ہوئی وہ

غنی کی ذات تھی۔ اس لئے جب حلقۂ ادب شاخ بھاگلپور کا قیام عمل میں آیا تو احباب کی پرزور مخالفت کے باوجود حلقہ کا سکریٹری اقبال صاحب نے غنی صاحب ہی کو چنا۔ اور سب کو مجبور کیا کہ انکے اسی فیصلے کو تسلیم کر لیا جائے۔ احباب کی مخالفت کا سبب یہ خدشہ تھا کہ مبادا غنی حلقہ کے کام میں اس قدر نہ الجھ جائیں کہ قدیم بزم سخن کی چلتی ہوئی گاڑی رک جائے۔ مگر غنی نے اپنے عمل سے یہ دکھلایا کہ حلقۂ ادب اور قدیم بزم سخن دونوں کا بار وہ اپنے دوش توانا پر اٹھا سکتے ہیں۔ یہ مختلف حقیقتیں غنی کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ عام دیکھنے والی نگاہ سے یہی تاثر لیں گی کہ غنی بہت سکھی ہیں، لیکن بات ایسی نہیں ہے۔ وہ بھی آدمی ہیں جو دنیا میں کبھی سکھی نہیں رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک شخص دکھوں کے وار سے بیتاب ہوکر ہائے وائے کرنے لگتا ہے۔ اور غنی نالہ و شیون سے کوسوں دور ہیں۔ غم واندوہ کے منڈلاتے ہوئے بادل میں غنی کا مسکراتا ہوا پیکر دوسرے الم نصیبوں کے لئے ایک درس ہے۔ زندگی وہ زندگی کیا جو صرف اپنے سکھ چین کی تلاش میں بیت جائے۔ زندگی تو وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ اور یہی مسلک غنی کا ہے۔

غنی نے آج سے بیس پچیس سال پہلے جب مشق سخن کی ابتداء کی تھی تو صرف ایک مرتبہ چند اشعار پر مولانا ساجد اللہ حشر سے مشورہ کیا تھا۔ لیکن جب غنی کا پہلا تعارف کلکتہ کے ہفتہ وار "عبرت" میں عادل غازیپوری کے قلم سے شائع ہوا تو اس میں غنی کا یہ اعتراف تھا کہ مولانا ساجد اللہ حشر اویسی استاد ہیں۔ اسی طرح بھاگلپور کے معروف کہنہ مشق شاعر حضرت قوس بھاگلپوری مرحوم سے بھی غنی نے بہت کم مدت تک استفادہ حاصل کیا جسکے عوض میں شاگرد کو استاد کا جو حق ادا کرنا چاہئے وہ حضرت قوس مرحوم کے مرتے دم تک غنی نے ادا کیا۔ اور آج بھی ان کے بچوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں۔ یاران میکدہ میں سے زیادہ تر میز کے گرد باتیں کرنے والے ہیں یا پھر شعر و سخن کی محفل کو گرمانے والے تیری کام کا جہاں تک تعلق ہے چند ہی ہیں۔ بقیہ حامی بھر دیتے کے بعد صرف یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ کام کرنے والے کیا کر رہے ہیں۔ انہیں جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ فعال طبیعت بھی سست پڑنے لگی ہیں تو سب سے پہلے جس شخص پر اعتراضات کا وار ہوتا ہے وہ محی الدین غنی کی شخصیت ہے۔ اور غنی سب کی باتوں کو مسکرا مسکرا کر سنتے رہتے ہیں اور اپنی مجبوری کا دکھڑا روتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سوال کبھی نہیں اٹھاتے کہ اور لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل ایسا ہے جس سے بگڑتا ہوا کام اگر ایک طرف سنبھل جاتا ہے تو دوسری طرف صرف باتیں بنانے والے بھی فعال بننے کی سعی کرنے لگتے ہیں۔

بھاگلپور کے ادبی ماحول میں آج جو زندگی اور توانائی کے پھول کھل رہے ہیں اس میں یوں تو سب کا حصہ ہے۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ غنی کچھ زیادہ ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شخصیت نگاری کا تقاضہ ہے کہ خوبیوں اور خرابیوں دونوں کی عکاسی کا حق ادا کیا جائے۔ مگر میری مجبوری یہ ہے کہ ڈھونڈھنے سے بھی غنی میں مجھے کوئی کھوٹ نظر نہیں آیا۔ شاید یہ ان کی محبت کا افسوں ہو اس لئے کہ معشوق کی ہر ادا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے ساتھ بہت کم انصاف کرتے ہیں۔ مطالعہ کا ذوق بھاگلپور کے ہم عصر قابل لحاظ شاعر و ادیب میں جتنا ہے غنی میں ان کے مقابلے میں یہ عنصر بہت کم ہے ان کی نجی لائبریری بھی بہت مختصر ہے اردو اور فارسی کے شعراء کے چند دیوان، چند تنقیدی اور ادبی کتابیں اور بقیہ رسائل کا ایک ذخیرہ کے سوا کوئی اور پونجی ان کے پاس

نہیں ہے ۔ ان کی نطری ذہانت اور قدرت کی عطا کردہ صلاحیت اور چمک جاتی ۔ اگر یہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کی طرف مائل ہوتے مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہیں ہے ۔ اگر یہ بھی کریم آسوی صمد حمیدی ، جمال سیلواروی ، مسرور آروی اور دوسرے بہت سارے احباب کی طرح مطالعہ میں غرق ہوگئے تو بزم سخن ، حلقۂ ادب ، ریلیف سوسائٹی اور دوسرے سماجی معاشرتی ادارے ان سے محروم ہو جاتے ۔ اپنی تخلیقات کو ادبی پرچوں میں جہاں تک بھیجنے کا تعلق ہے اس میں بھی غفلت شعاری سے کام لینا غنی کی عادت ہے ۔ ویسے صمد حمیدی اور دوسرے احباب کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جب کبھی اور جہاں کہیں بھی ان کا کلام گیا ہے اس کسی نہ کسی دور میں بھی مدیران جرائد نے بڑی خوش دلی کے ساتھ پذیرائی کی ہے ۔ پہلی مرتبہ غنی صاحب کو جب ریڈیو پروگرام ملا اور اردو دنیا کے مانے ہوئے افسانہ نگار حضرت سہیل عظیم آبادی نے ان کی غزلیں دیکھیں تو پھڑک اٹھے سلسلہ وار تین چار خطوط سہیل صاحب نے غنی صاحب کی تعریف میں میرے پاس ارسال کئے اور غنی صاحب کے پاس تو خطوط کا انبار لگ گیا ۔ عام طور سے بڑے ادیب کسی کے فن پر لکھنے سے کتراتے ہیں ۔ اور بخل سے کام لیتے ہیں مگر غنی کی غزل پر لکھنے کے لئے سہیل عظیم آبادی صاحب نے خود آمادگی کا اظہار کیا ۔ اور بار بار ان سے مجموعۂ کلام طلب کیا مگر برا ہو ان کی سست روی اور بے نیازی کا کہ آج تک سہیل صاحب کی اس فرمائش کو یہ پورا نہ کر سکے

غنی صاحب کی زندگی کے بہت سارے پہلو ہیں جس کو صرف اس ڈر سے نظر انداز کر رہا ہوں کہ ہمارا یہ مضمون مدحت نامہ نہ بن جائے ۔ بہتر یہ ہے کہ معاملہ مستقبل کی نسل پر چھوڑ دیا جائے ۔ جو غنی جیسے شاعر اور خادم زبان و ادب پر اظہار خیال کرنے کے زیادہ مستحق ہیں ۔

محی الدین غنی

اپنی شخصیت کے آئینے میں

از:- لطف الرحمٰن

شہر بھاگلپور ۔ نوبنونفسیات و مزاج کا آئینہ دار ہے ۔ اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کم و بیش ہر ذوق و شوق کے آدمی کو اپنا ساتھی دستیاب ہو سکتا ہے ۔ میں جب ملازمت کے سلسلے میں یہاں وارد ہوا تو میری پہلی ملاقات ان حضرات سے ہوئی جو گیسوئے اردو کے لیے شانے کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔ محترمی و محبی مظفر اقبال صاحب جنکو از راہ خلوص و شرافت پیر مغاں کہا کرتا ہوں انہوں نے جن حضرات سے میرا تعارف کرایا ان میں ایک صاحب محی الدین غنی بھی ہیں ۔

شاعرانہ زبان میں قد و قامت کے اعتبار سے ان کو رشک شمشاد کہہ سکتے ہیں اور کاٹھی کے اعتبار سے یہ افغانی معلوم ہوتے ہیں اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ——— چہرہ گرچہ کچھ چیچک زدہ ہے ۔ لیکن اس پر ایک نورانی داڑھی کے اضافے نے ان کی شخصیت کو سر تا سر نورانی بنا دیا ہے ۔ مزاج اور دل کے اعتبار سے بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی مستغنی اور بڑے ہی صاف باطن واقع ہوئے ہیں ——— ویسے کون کہہ سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے لیکن میرا مطالعہ کچھ ایسا ہی ہے ممکن ہے بعض احباب کو میری اس رائے سے اختلاف ہو لیکن یہ اختلاف محض انداز نظر اور گو نگلس کا نہیں ہو گا ۔ بلکہ قوت مشاہدہ، صداقت مشاہدہ اور نگاہ دوربیں کا بھی ہو گا ۔ میں نے مختلف مواقع پر غنی صاحب کی شخصیت کے رجحان اور میلان کا مطالعہ بڑی گہری نظروں سے کیا ہے ۔ اور میں نے ایماندارانہ طور پر یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی شخصیت میں سادگی، خلوص، سچائی، دردمندی اور بے انتہا نیک نیتی ہے ۔ ذہانت و فطانت اور دوررسی بھی ان میں کم نہیں ہے ۔ لیکن ان صفتوں کے اظہار میں یہ کچھ بخیل واقع ہوئے ہیں ۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو ان کے اسم بامسمیٰ ہونے میں مائل ہو جاتا ہے ۔ مگر دیکھنے والی آنکھیں ——— غنی کے کلام میں ان چیزوں کا مشاہدہ کر سکتی ہیں ———

ادب ——— زندگی کی تعبیر اور تعذیر کے ساتھ ساتھ خالق فن کی افتاد طبع اور نفسیاتی عوامل کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے ——— ان جہات سے غنی کا کلام ——— خارجی اور داخلی تمام رجحانات اور میلانات کا پوری طرح عکاس ہے ۔ ان کے کلام میں جو سوز و گداز ——— دردمندی اور شرافت و تہذیب کے نمونے ہیں ——— دراصل وہ ان کی شخصیت کے عناصر ہیں جو ان کے کلام میں جلوہ طراز ہیں اس طرح ان کے کلام اور ان کی شخصیت میں اجنبیت کی کوئی دیوار حائل نہیں ہے اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے یہ چیز جہاں مستقبل میں ان کی شاندار شاعرانہ کامیابیوں

کی طرف اشارہ کرتی ہے وہاں یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ غنی تکلف و تصنع، ظاہرداری بناوٹ سے مبرا ہیں۔ میں نے درج بالا سطور میں جن خوبیوں کی طرف اشارہ کئے ہیں اس سے بھی غنی کی شخصیت کا یہ پہلو سامنے آجاتا ہے لیکن یہاں تفصیل اس لئے دی گئی ہے کہ نتیجے کے استنباط میں کوئی دقت نہ ہو۔ شخصیتیں بالخصوص ادبی وہی شخصیتیں قابلِ قدر ہوتی ہیں جو گفتار و کردار میں ایک ہی تاثر دیتی ہوں ——— میں ذاتی اعتبار سے ایسی شخصیتوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس لئے اس وقت محی الدین غنی کی قلمی تصویر کھینچتے ہوئے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو واضح طور پر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ میرے خیالات سے آپ یہ اندازہ لگائیں کہ میں نے قصیدہ خوانی کی ہے یا یہ کہ دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے۔ لیکن میں دوستی کا حق ادا کرنے میں حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہوا ہوں ——— غنی کے جتنے دوستوں سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے بھی کم و بیش انہیں تاثرات کا اظہار کیا ہے اس لئے بھی مجھے اپنی ان باتوں پر صداقت کا یقین ہے۔

پچھلے ایک ڈیڑھ سال کی ملاقات میں ہم لوگ جس تیزی اور شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں وہ معاملہ بھی بڑا ہی توجہ کش ہے۔ یہاں بات کچھ تعلی کی آجائے گی ورنہ میں یہ کہتا کہ روابط میں پختگی اور گہرائی جبھی آتی ہے جب ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے دو مختلف شخصیتیں ہم آہنگ و یک رنگ ہوتی ہیں۔ اس شہر کی بیکراں آبادی میں چند ایسے لوگوں سے دیکھتے دیکھتے قریب ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی قدر مشترک ہم میں پائی جاتی ہے ——— یہاں ہم کو "ہم" کی وضاحت ضروری ہے۔ غنی صاحب کے مخلص دوستوں میں شاغل قادری، کریم آسری صاحب، نسیم آروی صاحب صمد حمیدی صاحب، اکرام انجم صاحب، جمال پھلواروی صاحب وغیرہ بہت قریب ہیں اور ان حضرات سے میری بھی مخلصانہ ملاقات ہے بلکہ کچھ لوگوں سے ملاقات کی نوعیت گہرے روابط کی شکل میں بدل چکی ہے

میں یہ باتیں اپنی پہلی بات کی تصدیق میں عرض کر رہا ہوں۔ یعنی غنی کی شخصیت کی جس بے ساختگی اور بے تکلفی کا ذکر میں نے کیا ہے ان کے ثبوت کے طور پر ان حضرات کا ذکر یہاں پر آگیا ہے۔ ان میں سے کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جن سے میں آپ کو اس شمارے کے دوسرے اوراق میں متعارف کرا رہا ہوں۔ وہاں بھی ان کی شخصیتوں کا یہ مشترک پہلو سامنے آئے گا حاصل گفتگو یہ ہے کہ غنی کی خارجی اور داخلی سیرت جن خصائص سے مزین ہے انہیں خصائص سے مزین لوگوں کی رفاقت بھی انہیں حاصل ہے۔ جو کہ ایک عرصۂ دراز سے خلوص و صداقت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر شخصیت میں یہ مذکورہ صفات بدرجۂ اتم موجود نہ ہوتیں تو شاید یہ روابط برقرار نہیں رہ سکتے ——— ادبی دنیا کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ شعراء یا ادباء آپس میں کچھ نہ کچھ کشمکش یا شکر رنجی کے شکار دیکھے گئے ہیں۔ غالباً یہ ایک عالمگیر ادبی روایت بن گئی ہے۔ مگر بھاگل پور کی محدود و مخصوص ادبی فضا میں مجھے یہ لعنت کہیں نظر نہیں آتی ——— مجھے اس چیز نے بڑا متاثر کیا ممکن ہے کہ کچھ اس طرح کی بات ہو بھی تو میری نگاہیں ان کی حقیقتوں تک نہیں پہونچ سکیں ——— یا یہ کہ (معذرت کے ساتھ) یہ اصحاب اپنے روابط کے اظہار میں تقیہ کر گئے۔ یہ جملہ میں نے تفنن طبع کی خاطر لکھ دیا ہے۔ ورنہ کیا عجب کہ مجھے بعض دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لفظ تقیہ کے ساتھ مجھے نواب ارشاد حسین زیدی صاحب کی یاد آگئی۔ نواب صاحب موصوف خلیفہ باغ کے پرانے رئیسوں میں ہیں اور اپنی تمام جدت پسندی کے باوجود روایات و رسوم دیرینہ کے کسی حد تک پابند ہیں بلکہ وضعداری کو بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سنبھالتے ہیں۔ ان کا دولت کدہ جسے اب "یاران طریقت" "ایوان ارشاد" سے موسوم کرتے ہیں یہاں کے تمام شاعروں اور ادیبوں کے لئے "دشت نجد" کا مقام رکھتا ہے۔ یہیں ہر شاعر اپنے گریباں کی دھجیاں اڑاتا ہوا نظر آتا ہے

یا دامانِ تار تار کے سینے میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔

غنی صاحب سے میری پہلی ملاقات جہاں تک مجھے یاد آتا ہے اسی دشت نجد کے سائے میں ہوئی تھی۔ دشت کے ساتھ "سائے" کی رعایت اس لئے رکھی گئی ہے کہ حالات و حادثات کی کڑی دھوپ میں دیوانگانِ شوق کے لئے شجر و ادب سے بڑھکر نخلستان اور کون ہو سکتا ہے ؎

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

بہرکیف "ایوان ادب" کی اس پہلی ملاقات میں ہی ——— میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے غنی صاحب کے ہونٹوں سے بہکتی ہوئی مترنم باتیں میرے دل سے نکل رہی ہیں۔ ان کی غزلوں کے مخصوص مزاج نے میرے دل پر گہرے اثرات مرتسم کئے تھے۔ یہ تسلیم ہے کہ میں اس صحبت میں غنی صاحب کے کلام کا ناقدانہ تجزیہ کرنے نہیں بیٹھا۔ اور اگر ایسا کرتا ہوں تو آپ اسے ایک ٹریجڈی کہیں گے اس لئے کہ شخصیتی مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی ——— مگر بقول رشید احمد صدیقی "حقیقتوں کے ٹکراؤ کا دوسرا نام ٹریجڈی ہے" اور یہاں بات اس موڑ پر آگئی ہے کہ جہاں سے حقیقت کی سرحد شروع ہوتی ہے اس لئے میں آپ کی اجازت سے غنی صاحب کی غزلوں پر اپنے تاثرات کا کچھ اظہار کروں گا۔

اب تک غنی صاحب کی بے شمار غزلیں میں نے سنی اور پڑھی ہیں، اور میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی غزلیں موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے ان کی گہری بصیرت اور بصارت کا پتہ دیتی ہیں۔

غزل کی صنف آج کے عہد میں بڑی وسیع، ہمہ گیر اور متنوع صنف ہے۔ اب یہ صرف حدیثِ حسن و عشق کیلئے مختص نہیں رہی بلکہ اس کا دائرہ کار حیات و کائنات کی ساری وسعتیں اور ساری بوالعجبی پر پھیلا ہوا ہے۔ بہت سے دوسرے غزل گو شعرا کی طرح غنی کی غزلیں بھی اس کے ثبوت میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ہماری زندگی کا کارواں فکر و نظر کے اعتبار سے گذشتہ صدیوں میں جن ٹیڑھے میڑھے اور امتحانی راستوں سے گذرا ہے۔ ان تمام کے اثرات اور جھلکیاں ان کی غزلوں میں آپ بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ غنی سچے، حقیقت پسند اور نازک طبع کے آدمی ہیں اس لئے وہ ان تمام تحریکات اور عوامل سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ جس نے پچھلے برسوں میں انسانی قافلے کو کسی نہ کسی اعتبار سے متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں فن غزل میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ سوز و گداز اور درد مندی کے بے انتہا نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

مری زندگی چمن میں کبھی خار خار گذری
کبھی پھول پھول ٹھہری، کبھی پات پات ٹھہری

کبھی دور یہ بھی آیا مری زندگی جہاں میں
پسِ انقلاب ٹھہری، سرِ حادثات ٹھہری

لیکن اس کے باوجود ان کے قلب و ذہن کو جو عزم و حوصلہ اور یقین و اعتماد حاصل ہے اس نے ان کی ہر گام پر بڑی رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

میں گذر گیا جدھر سے وہ رہِ حیات ٹھہری
جو میں کہہ گیا جنوں میں وہی بات بات ٹھہری

ان کی خود اعتمادی کے ثبوت میں ایک شعر اور پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا ؎

میں چلا تو ساتھ میرے یہ زمانہ چل پڑا ہے
بڑی معتبر جہاں میں غنی اپنی ذات ٹھہری

عالمی اعتبار سے یہ دور تشکیک، بے یقینی، کلبیت اور نامرادی و احساس ناکامی کا دور ہے۔ مجموعی اعتبار سے

زندگی کی ساری قدریں انتشار اور بحث کا شکار ہو رہی ہیں انسانی قافلے پر اس سے زیادہ صبر آزما اور کٹھن دور غالباً کبھی نہیں آیا۔ خصوصاً ہندوستان کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی اتنی کشمکش اور تصادم کا شکار کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جب جدید عہد کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو انقلاب ۱۸۵۷ء کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے احتشام صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" انیسویں صدی کے وسط میں مسلمان کئی راہوں کے اتصال پر پہنچکر راستہ ڈھونڈھنے کی ہمت کھو چکے تھے۔ نہ پیچھے پلٹ سکتے تھے نہ آگے بڑھنے کی جرأت تھی "

احتشام حسین صاحب کا یہ مشاہدہ بڑا حقیقت پسندانہ ہے۔ لیکن میں اس میں یہ ترمیم کرنا چاہوں گا کہ انیسویں صدی کے وسط میں سارا ہندوستانی سماج انہیں حالات کا شکار تھا جن سے نبرد آزما ہونے کے لئے مختلف ہستیاں برسرپیکار تھیں راجہ رام موہن رائے سرت چندر چٹرجی، دیانند سرسوتی، سرسید مرحوم، مولانا شبلی، حالی، مولانا نانوتویؒ، اکبر الہ آبادی وغیرہ اس دور کی بہت بڑی اور عظیم شخصیتیں گذری ہیں جو اس عہد کے انتشار اور اختلال کو ختم کرنے کے لئے مخلصانہ جدوجہد کر رہی تھیں۔ مگر اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ دور ایسے مخلص سے محروم ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کا یہ خیال بہت صحیح ہے کہ آج ہم ایک دوسرے سرسید کے ظہور کے منتظر ہیں بلکہ اقبال کے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

یہ براہیم اس دور کو کب ملے گا یہ تو مشیت ہی جانتی ہوگی لیکن میں عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ کم از کم آج کے کچھ شاعر و ادیب ایسے ضرور ہیں جو براہیمی صفات سے متصف نہ بھی ہوں تو ان کے یہاں "ضرب کلیمی" کے آثار و صفات ملتے ہیں ——— غنی کی شاعری میں بھی مجھے یہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ میں یہاں مثالیں دینے سے گریز کروں گا۔ کیا ضرور ہے کہ ہر دعویٰ کے ثبوت میں کوئی دلیل ہی دی جائے۔ بلکہ میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ کو غنی صاحب کے مجموعۂ کلام "عنبریں" (زیر طبع) کی سیر و سیاحت کا مشورہ دوں تاکہ آپ خود حقیقت اور واقفیت کا اندازہ لگالیں۔

میں نے پچھلے اوراق میں غنی صاحب کی خود اعتمادی اور تیقن کا ذکر کیا ہے۔ یہ جنس گراں انہیں کیسے دستیاب ہوئی۔ یہ چیز ایک عرصہ تک میرے لئے عقدۂ لاینحل بنی رہی لیکن مجھے جب یہ خبر ملی کہ غنی صاحب کی نظر میں ایوان ارشاد کا مذکورہ دشت نجد محدود و مختصر معلوم ہوا تو یہ بھی غالب کی آواز سے آواز ملا کر یہ کہتے ہوئے کہ ؎

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

کسی ایسے دشت نجد کی تلاش کی طرف مائل ہوئے جو زیادہ وسعت اور ہمہ گیری اور تنوع کا حامل ہے اور یہ تلاش انہیں حقیقتاً اسی دشت نجد کی طرف لے گیا جہاں عربی، فارسی اور اردو شاعری کا کلاسیکی عاشق مجنوں کبھی داد جنوں دے چکا تھا اور جب وہاں سے یہ کچھ دنوں کے بعد واپس ہوئے تو صاحب! لوگوں کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے دامن و گریباں کے تمام تار سلامت تھے۔ لیکن یہ راز تو کچھ دنوں کے بعد کھلا کہ اس سفر میں غنی صاحب ——— خارجیت سے داخلیت تک کا سفر طے کر چکے تھے۔ نتیجے کے طور پر ان کے دل و جگر کی دھجیاں اڑ چکی تھیں۔ اب یہ تو ان لوگوں کا قصور ہے کہ جنہوں نے انکے ظاہری دھج پر کوئی رائے قائم کرنی چاہی تھی اور اس طوفان کو نظر انداز کر گئے تھے۔ جو ان کے درون سینہ انگڑائیاں لے رہا تھا مگر ظاہر میں

نگاہوں نے محض یہ سمجھا کہ غنیؔ صاحب محض حاجی نہیں دراصل بات یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی قدروں پر مکمل یقین و اعتبار نے ان کی فکر و نظر کو وہ اعتماد اور تیقن بخشا ہے جنکا میں ذکر کر رہا ہوں غنیؔ صاحب بہت وضع دار آدمی ہیں اور اپنی وضعداری کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ نیفق کی طرح اپنی وضع دیرینہ کو تشکیک کی طرح نہیں دیکھتے۔ بلکہ رسم وفا کو سچائی کے ساتھ ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اس لئے یہ دوست نواز بھی بہت واقع ہوئے ہیں۔ ان کی دوست نوازی کبھی کبھی ان حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، جہاں ایک انسان کی ازدواجی زندگی خطروں میں گھر جاتی ہے۔ پتہ نہیں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہے یہ تو کچھ راز درون میخانہ والی بات ہے۔ لیکن قیاس اغلب یہ ہے کہ کسی نہ کسی نہج سے یہ بھی شکوۂ خانہ بربادی کے احساس سے دوچار ضرور ہونگے ورنہ ان کی شاعری میں یہ دل کو چھو لینے کی بات کہاں سے آتی یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی کی پرشباب بہاروں میں کوئی پھول ایسا رہا ہو جو ان کے سینے میں داغ لالہ کی صورت اختیار کر گیا ہو۔ مگر یہ سب راز کی باتیں ہیں نہ غنیؔ صاحب کبھی کھلے اور نہ میں نے کبھی اس پہلو سے ان کے مضراب دل و ذہن کو چھیڑنے کی کوشش کی۔

غنیؔ صاحب کو فطرت نے اک ذہن رسا عطا کیا ہے اس لئے کہ یہ بڑی آسانی کے ساتھ معاملات کی تہوں تک پہونچ جاتے ہیں کہہ سکتے ہیں کہ غواصی میں درجۂ کمال حاصل ہے اس غواصی کی بھی مختلف جہتیں ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ سب کا گہر ہائے آبدار کی تحصیل ہوا کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی غواصی یا بہ الفاظ دگر تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر کیسے کیسے گہر ہائے آبدار کی تحصیل کی ہے۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ میں ان کی اولاد ظاہری کے شمار سے ناواقف ہوں۔ جہاں تک اولاد باطنی کا سوال ہے میں ان کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ممکن ہے کہ غنیؔ صاحب کو یہ اعتراض ہو کہ میری نگاہیں جب ظاہری آثار کا مشاہدہ نہ کر سکیں تو باطنی حادثات تک کیسے پہونچ گئیں یہاں حادثات کا لفظ دیدہ و دانستہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہرکیف اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ بعض مواقع ایسے بھی ہوتے ہیں جب نگاہوں کا تعلق خارجی عوامل سے منقطع ہوتا ہے اور محض باطنیت سامنے ہوتی ہے۔ میرا مشاہدہ کسی ایسے ہی لمحے کا رہین منت ہے۔

ایک انسان کی زندگی "گفتنی" اور ناگفتنی بہت سے حوادث کا مجموعہ ہوتی ہے غنیؔ صاحب کی زندگی میں جو گفتنی حوادث تھے وہ میں نے آپکے سامنے پیش کر دیے اگر ناگفتنی کو جاننے کی خواہش ہو تو غنیؔ صاحب کی ضیافت سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجئے۔

نسیم کی شاعری کا انتقادی تجزیہ

از ——— وقار عسکری

بھاگلپور اور اس کے علمی تہذیبی اور تمدنی کارنامے یوں تو دنیائے ادب کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہیں۔ بھاگلپور کی سرزمین ہمیشہ سے ہی شاعروں کے لئے زرخیز خیال کی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں اردو کے بڑے بڑے قادرالکلام شاعروں نے جنم لیا اور شعر و سخن کے بادۂ رنگین سے میکشانِ ادب کو نوازا۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کی آنکھیں شہرت کی جلوہ آرائیوں سے چکا چوند ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنہیں وقت نے گمنامی کے غار میں ڈال دیا۔ مرتب اختر ناصح نعیب نے تذکرہ شعراء بھاگلپور "نظارہ و خیال" میں لکھا ہے کہ اگر نسیم آروی ادبی پرچوں کو اپنی تخلیقات دیتے تو آج یہ اردو دنیا کے شاعروں کی دوسری صف میں ممتاز نظر آتے"۔ میں بھی یہی خیال کرتا ہوں کہ خود اعتمادی کے فقدان نے واقعی انہیں اس شہرت اور مقبولیت سے محروم رکھا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ پھر بھی ہمیں مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ مستقبل قریب میں ان کی شاعری کے امکانات تابناک ہیں۔

نسیم آروی نے ۳ جنوری ۱۹۳۲ء کو اس دنیائے آب و گل میں آنکھ کھولی۔ وہ ابھی آٹھ برس ہی کے تھے کہ ظلِ پدری سے محروم ہو گئے۔ دستگیری کے لئے ان کی والدہ ماجدہ کے سوا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ نسیم کی تعلیم و تربیت انہی کی توجہ خاص کا نتیجہ تھی۔ نسیم عہدِ طفلی ہی سے نہایت ذکی اور ذہین واقع ہوئے ہیں۔ ابتدائی درجے کے امتحانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور میٹریکولیشن کا امتحان درجۂ اول سے پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ ایس۔ پی جین، کالج شہسرام سے آئی اے اور آرہ سے بی۔ اے آنرز کرنے کے بعد سرکاری ملازمت میں لگ گئے۔

شعر و ادب کا ذوق فطری تھا۔ معقول تعلیم نے اس پر اور جلا کی۔ جناب نسیم نے غزلوں کے اعتبار سے نظمیں زیادہ لکھی ہیں۔ نسیم کی نظموں میں گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ تاثر کی شدت، معنویت، بلاغت اور تاثراتی کیفیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو اس دور میں کم ہی لوگوں کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ ان خصوصیات و صفات کو آپ نے جو زبان عطا کردی ہے وہ آپ کے حقیقی شاعر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ کلام میں دیرپا تازگی، جدت اور ذاتی تجربے یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے نسیم آروی کی شاعری اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ [illegible] سے ہم نسیم کی شعری کاوشوں کا بصد خلوص احترام کرتے ہیں۔

"آتشیں" نسیم آروی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ "آتشیں" کے لئے پروفیسر امان اللہ غازی صاحب نے "نسیم آروی

کی شاعری شاہ آباد ضلع کے ادبی پس منظر، میں کے عنوان سے ایک شاندار اور منصفانہ مضمون سپرد قلم فرمایا ہے۔ صاحب مضمون نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے "روایت کے احترام میں نسیم بہت زیادہ شدید واقع ہوئے ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے آج تک آزاد نظم نگاری کی طرف مطلق توجہ نہ دی اور یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کلاسیکیت اور جدیدیت کا ایک دلکش امتزاج، ایک حسین سنگم ہے۔ تقسیم ہند اور تحصیل آزادی کے بعد اردو شعر و ادب میں ایک قسم کے جدید رجحانات اور تصورات نے جڑ پکڑی جس کی وجہ سے اردو شاعروں کے لب و لہجہ اور طرز فکر میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ آج اسی انقلاب کا نام جدید شاعری ہے جو جدید دور کا المیہ ہے۔ جدید شاعری میں آزاد نظم نگاری کے کامیاب اور دلچسپ تجربے ہو رہے ہیں۔ جہاں تک ادب میں نئے تجربات کا تعلق ہے یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ روایت کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن میں جمود کا قائل نہیں، آخر اردو شعراء فارسی اور ایرانی شاعری کی کورانہ تقلید کب تک کرتے رہیں گے؟ ایرانی شاعری تو عربی عروض کی قید و بند سے آزاد ہو چکی ہے۔ لیکن اردو شاعری ابھی تک ایرانی شاعری کے اثر سے آزاد نہ ہو سکی۔ اگر اردو شاعری اپنی ترقی کے اولین مدارج طے کرنے کے بعد ایرانی غیر ملکیت کی [illegible] ream سے الگ ہو کر اپنی دنیا الگ بنا لیتی تو آج اردو دنیا کی دوسری ہی فضا ہوتی۔ لیکن اردو دانوں نے کلاسیکیت سے بلند ہو کر کوئی نئی راہ ہموار نہیں کی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا ہماری شاعری کے اقدار کی موت ہوگی۔ بہرحال! جدید شاعری میں دلچسپی لینے والے ذہن کا فروغ ہو رہا ہے اور آج اردو میں جو شاعری ہو رہی ہے وہ فخر کے ساتھ دنیا کے کسی بھی ادب کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔

نسیم آروی طرز فکر اور طرز احساس کے اعتبار سے ترقی پسندوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی نشو و نما آزادی کے بعد ہوئی۔ ان کی شاعری کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ میر، مومن، جوش اور جگر کا نہیں۔ ترقی پسندوں کا اثر ان کی شاعری میں جا بجا نمایاں ہے۔ خصوصاً فیض سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ فیض کو کسی نہ کسی طرح سے اقبال، سردار جعفری اور اختر الایمان کا تسلسل Continuation تو کہا ہی جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان کی نظموں میں کفایت لفظی، اختصار، اور ادبی کنایہ کے بجائے سیاسیانہ جذبات، حرارت، پھیلاؤ اور ایک طرح کا خطیبانہ آہنگ ملتا ہے۔

جو چیز نسیم آروی کی شاعری کو ہمارے لئے قابل قبول بناتی ہے وہ ان کے لب و لہجہ کا خلوص، طرز احساس کی انفرادیت اور فنکارانہ چابکدستی ہے۔ نسیم کے موضوعات وہی ہیں جو ترقی پسندوں اور آج کے بیشتر شعراء کے موضوعات ہیں۔ مثلاً وقت کے حادثات و سانحات اور اس کا المیہ، خواب اور خواب کے ٹوٹنے کا ردعمل، زندگی اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومیاں، عشق اور ہجر عشق سے بیگانہ دشتی وصل کے مزے اور مفارقت کا غم، عید و سعید کی خوشیاں زندگی اور اس کے اسرار و رموز، غم جاناں اور غم دوراں کی کشمکش کا تعلق، مزدوروں پر ڈھائے جانے والے ظلم و استبداد کے خلاف ان کو بھڑکانے کا جوش انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہتر زندگی اور خوشیوں کی تمنائیں حریت، جنگ، تحفظ امن، اور جبر و تشدد کے خلاف اعلان جنگ وغیرہ۔ نسیم نے جنگ و جارحیت کے موضوع پر

بیشتر مصالحت انگیز اور لہو گرمانے والی نظمیں لکھی ہیں۔ جنگ کے بارے میں غالباً تحفظ امن کے لئے اعلان جنگ ان کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ حقیقی مشاہدات و تجربات سے قطع نظر نظم میں پیامی تخیلی اور نیم خطابت کا رنگ نمایاں ہے ؂

اس سے پہلے کہ اٹھائی پڑے تہذیب کی لاش
اس سے پہلے کہ تمدن کی چتا جلنے لگے
اس سے پہلے کہ ہوا سانس کے قابل نہ رہے
ایٹمی زہر کا یوں نخل مجسم پھیلنے لگے
دوستو آؤ بڑھیں امن کے پرچم لے کر
اتحاد اور محبت کے عزائم لے کر

شاعر میں نزاکت احساس کے ساتھ عظمت فکر بھی ہے وہ دور اندیشی اور دوراندیشی کا نباض ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے ازلی انسانیت اور بنیادی شرافت کو بچانے کے لئے اپنے طور پر جدو جہد کرنی ہوگی، جنگ، جو فرد و قوم اور انسانی اقدار کی تباہ کاری، بربریت اور وحشت کا ردعمل، اور قابیل کی اولاد کا بہیمانہ جنون ہے وہ انسان کے بڑھتے ہوئے مشکل اور پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ نکالنے کا سبب نہیں۔ بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ انسان اور انسانی وقار پر ایک بدنما داغ ہے اور اس داغ کو مٹانے کے لئے میدانِ جنگ کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔ بلکہ بین الاقوامی سطح پر امن اور شانتی کا پیغام دینا ہوگا کیونکہ اس میں ہمیں ازلی انسانیت اور بنیادی شرافت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے ؂

تو نچکاں زیست کے حالات بدلنے کیلئے
نسل آدم کا شجر پھولنے پھلنے کے لئے
دہر کو امن کا گہوارہ بنانے کے لئے
اپنی دھرتی کو بہاروں سے سجانے کے لئے
زیست کو مرکز انوار بنانے کے لئے
دہر کو گلشن بے خار بنانے کے لئے
قحط کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے
بھوک کو بیتی ہوئی یاد بنانے کے لئے
سخت سے سخت مراحل سے گذرنا ہوگا
حشر انگیز منازل سے گذرنا ہوگا
دوستو! موت کے غاروں میں اترنا ہوگا
ہمیں جینے کی تمنا ہے تو مرنا ہوگا

مجموعی طور پر پوری نظم میں پیامی انداز نمایاں ہے جس سے شعریت کو بہر حال نقصان پہونچا ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں جابجا شعری محاسن ملتے ہیں۔

انسان اور انسانی وقار کا معیار اسی وقت بلند ہو سکتا ہے۔ جب کہ انسان زمانے کے حادثات ومصائب کے حشر انگیز منازل سے مسکراتا ہوا گذر جائے ورنہ حیات وکائنات کے عیش ونشاط خوشگوار اور کامیاب زندگی کے لئے بے پناہ حادثات اور مشکلات کا باعث بن جائیں گے

نسیم کو اپنی زندگی کے ابتدائی سفر میں وقت اور زمانہ کے جس نشیب وفراز سے گزرنا پڑا اس کا پس منظر خود ان کی نظم پیش کرتی ہے۔ حیات کی رسم انجامی اور حالات کی ستم ظریفی شاعر کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ نظم میں المناک تجربہ کا شاعرانہ اظہار ہے۔ جذبہ کی شدت نے خاص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ شاعر پہ المناکی کیفیت طاری ہے —— یاس وقنوطی کیفیت جو المیہ ڈراموں میں بھرپور طور پر ہوتی ہے۔ لیکن احساس وتجربات کی گہرائی نے شاعر کو قنوطی ہونے سے بچا لیا ہے۔ نسیم کی یہ نظم جس کا حوالہ دیا گیا ہے

اور جس کا عنوان "نقوش ماضی" ہے ان کی نظموں میں غیر معمولی
اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نظم نسیم کی ماضی کی آئینہ دار اور یادگار
ہے جس میں داستان زمانہ کے مارے ہوئے شاعر کے مجروح
جذبات واحساسات کا عکس صاف جھلکتا ہے ؎

شوخ راتیں مرے ماتم میں سیہ پوش ہوئیں
سوگ میں میرے ہوا چاک گریبان سحر
میری تقدیر پہ ساون کی گھٹائیں روئیں
دیکھ کر مجھکو جلا خون گل و لالہ کا جگر

جذبات کو کتنی خوبصورتی اور پر اثر تصویروں کے
ذریعہ پیش کیا گیا ہے! فنکارانہ توازن کی وجہ سے عمق اور
گہرائی کا عنصر نمایاں ہے اور اس بلند ہمتی کی داد دینے ہی
بنتی ہے کہ ؎

میں گرا بھی تو مری لغزش نے اٹھنے کے لیے

منزل رسی کی تمنا ہے، لغزش سے منہ ممکن نہیں۔ کیونکہ
یہی لغزش راہ سے بھٹکے ہوئے مسافروں کو منزل کا پتہ دیتی
ہے۔ جس کی جستجو میں کوہ و دمن شہر و بحر در حیات و کائنات
کی جان لیوا منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سنگلاخ [illegible]
منازل سے گزرنے کے بعد ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب...
منزل مقصود خود بڑھ کے راہرو کے قدم لیتی ہے یہ وہی منزل
ہے جہاں ؎

آج کشتی کے قدم لیتا ہے ساحل آکر
اور میں جوش میں ساحل سے گزر جاتا ہوں
آج ہر گام پہ بہلاتی ہے منزل مجھکو
اور میں ہار کے منزل سے گزر جاتا ہوں

نظم کی تکنیک کامیاب ہے۔ نسیم کی نظم نقوش ماضی میں
ذاتی مشاہدہ کا رنگ غالب ہے۔ تجربات مصنوعی نہیں،

شاعرانہ کیف و کم، درد و گداز کی لطافت اور فنکارانہ
رنگ و آہنگ نے شعریت کی اداؤں میں اضافہ کیا ہے۔ "نقوش
ماضی" کے بعد نسیم کی دوسری نظم "آہنگ" کے عنوان سے شروع
ہوتی ہے جو لارڈ بائرن کی نظم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ نظم
میں احساس، جذبہ اور تخیل کی کارفرمائی بدرجۂ اتم موجود ہے
انداز بیان کی سلاست، شگفتگی اور تاثراتی کیفیت
حسن و نغمگی پیدا کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل بند کی جذباتی تخیلی
اور تاثراتی کیفیت ملاحظہ ہو ؎

ہماری محبت کا پرسوز نغمہ
ہمارے ہی سینوں میں مدفون ہوگا
نظر کتنی اشکیں، جو ان آرزو میں
ہر ایک پاک جذبہ کا اب خون ہوگا

ذاتی تجربے اور انفرادی غم نے شاعر کو مجبوری کا احساس
عشق اور عشق کی ناکامی اور زمانے کے حادثات و سانحات
کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ محبت قدرت کا
بیش بہا عطیہ ہے جو انسانی سینے میں قدرت کی جانب سے ودیعت
کی گئی ہے۔ لہٰذا انفرادیت کے احساس بے پایاں اور وقتی حسن
کی حفاظت کے لیے شاعر اپنے معشوق سے ایک مستحکم عہد لینے
کا مشتاق ہے ؎

مری جان قسمت ہے تیرا نصیب [illegible]
اب آؤ کہ ہم مل کے اک عہد کرلیں
نہیں موت پر یوں تو قابو کسی کا
مگر اپنے جینے تلک عہد کرلیں
کہ ظلم تشدد کی شمشیر کو توڑ دیں گے

مجموعی طور پر نظم میں ارتقائے خیال بھی ہے اور ربط
و تسلسل بھی جس میں فاضل شاعر نے اپنے جذبات و احساسات

کو خوبصورت اور پر اثر تصویروں کے ذریعہ پیش کیا ہے نظم
کے پہلے بند میں "تڑپتا" اور "بنتا"، اور پانچویں بند میں "اک اور"
"تلک" کے ایسے غیر مانوس اور دلچسپ قوافی ہیں جن کا
استعمال اب تک اردو میں نہیں کیا گیا۔

نسیم نظم کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں ان
کی نظمیں تاثیر سے شروع ہو کر تاثر پر ختم ہوتی ہیں جن میں ان
کے فکری وفور کی لہری فکر آمیز اور فکر انگیز شعری تمثالوں سے
رنگ بھرتی ہیں۔ نظم کی تعمیر اور حسن تکمیل میں انہیں توازن کا
احساس ہے۔ ان کی خیال انگیز اور نمائندہ نظموں میں "نقوش ماضی"،
"خواب"، "کائنات کا راز"، "مرحمتِ ناز"، "قضا و
یاددہانی"، "نور محبت"، "سر دیجات"، "پہلی گھٹا"، "فلسفۂ
شادی" اور "لوحِ تربت" وغیرہ خصوصی طور پر قابلِ
ذکر ہیں۔

نسیم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور یہی شعری
حیثیت ان کے شعری اظہار کے لئے موزوں ہے۔ انہوں نے
جس حقیقت کو موضوع سخن بنایا ہے اس میں وسعت اور
پھیلاؤ کی بڑی حد تک گنجائش ہے۔

نسیم کی غزلوں کے سلسلے میں اتنا عرض کرنا چاہتا
ہوں کہ ان میں ان کی نظموں جیسی وسعت اور گہرائی نہیں۔ غزل
اردو کی ممتاز ترین صنف سخن ہے۔ یہ ہمارے شعری مزاج
میں اس قدر رچی بسی ہے کہ کوئی دوسری صنف نہیں۔ غالباً غزل
ایسا ذریعہ اظہار ہے جو تحت الشعور کی باتوں کو شعور میں لے
آتا ہے۔ غزل میں چند منتشر اور پراگندہ خیالات کو ایک
پیکر ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن غزل کے مختلف شعروں میں
کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔ غزل میں نظم، قطعہ، قصیدہ،
مرثیہ اور مثنوی کی [illegible] کا فقدان ہے جس سے
پڑھنے والے کے ذہن میں کسی مکمل تجربہ کا کوئی نقش نہیں ابھرتا
کہتے ہیں کہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک آزاد اور مکمل ستارہ
ہوتا ہے ہر شعر ایک دوسرے سے یگانہ و یکتا ہوتا ہے۔ غزل
غنائی شاعروں کا climaxes ہے۔ غزل کی
غنائیت اور اس کی لطیف گونج فوراً ہمیں اپنی طرف ملتفت
کر لیتی ہے۔ لیکن اس تاثر سے قطع نظر اگر ہم تھوڑا سا عقل کے
ساتھ اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کی سعی کریں تو یہ
حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے آئے گی کہ غزل کا صوری
حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی حسن نہیں بخشتا۔ فراق کہتے
ہیں "غزل اشاروں کا سلسلہ ہے" تو واقعی اس میں com-
prehensiveness کی گنجائش ممکن نہیں مگر انتہا کی
خاطر ابہام اور اختصار کی ضرورت لازمی ہے۔ غزل پر
ایک عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی خیال کو منظم
طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شعر مفرد کے مختصر پیمانہ میں
کسی پیچیدہ تخیلی یا جذباتی تجربے کو سمونے کی گنجائش
ممکن نہیں۔ یہ شعر مفرد اور غزل کی معنوی بے ربطی اور
انتشار ہے۔ جس کی وجہ سے کلیم الدین احمد جیسے لوگ غزل
کو نیم وحشی صنف سخن سے مطعون کرتے ہیں۔ غزل کا دامن
تنگ ہے غالب کو بھی اس کا شدت سے احساس تھا۔

بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل کی معنوی بے ربطی اور شتر گربگی مسلم ہے۔ اور
اسی انتشار کے سبب غزل کی مخالفت کی بھی ایک تاریخ
ہے۔ حالی، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خاں، جوش،
آزاد، انصاری، اور دوسرے درجنوں شاعروں نے
غزل کی بے ربطی اور پراگندگی کو دور کرنے کے لئے مربوط

مسلسل غزلوں کے دلچسپ تجربات کئے۔ ایک نظیر تو دیکھئے ان کی بہت سی غزلیں مربوط اور مسلسل ہیں۔ اقبال کی بعض غزلیں بھی معنوی اعتبار سے نظم کی خوبیاں رکھتی ہیں۔ جسے عام غزلوں سے کوئی مناسبت نہیں اور نہ ہی وہ انتشار و پراگندگی ہے جو عام غزلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اردو کے مایہ ناز شعراء غالب، نظیر، اقبال، جوش کی طرح نسیم آروی کو شعوری طور پر غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں

مجھے غیر مربوط غزل نہ جانے کیوں پسند نہیں۔ ناپسندیدگی کی وجہ معلوم ہے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

نسیم نے غیر مربوط غزلوں کے علاوہ مربوط اور مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں ان کی بیشتر غزلیں خیالات کے تسلسل کے لحاظ سے نظم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں ذیل میں صرف ایک غزل کی مثال پر اکتفا کروں گا۔

وہ حیات سے تم خار و خس ہٹا کے چلے
زمیں کو ہمسر باغ جناں بنا کے چلے

ہمیں تو اور بھی جانا ہے دور منزل سے
ہم اے جنوں یہ کہاں ساتھ رہنما کے چلے

زمیں کو غرق نے رنگ و نور ہونا تھا
ہم اپنے خوں سے چمن در چمن کھلا کے چلے

انہیں کے عزم و عمل سے ہے حوصلہ دل میں
جو سوئے دار بھی ہنس ہنس کے سر اٹھا کے چلے

بنائے رسم وفا استوار ہوتی ہے
جنون شوق کا ہم مرتبہ بڑھا کے چلے

مرا ہی دل تھا کہ ثابت قدم وفا پہ رہا
دگرنہ جو تھے یہاں اپنی جاں بچا کے چلے

نسیم اب نہ یہاں کوئی کاروان بھٹکے
لہو کے دیپ ہر اک گام پر جلا کے چلے

غزل کا فورم ہے لیکن خیالات منتشر نہیں، دماغ کو ایک شعر سے دوسرے شعر تک کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نسیم کی مندرجہ بالا غزل میں ایک تنظیم، ربط، تسلسل اور ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ غزل کے شروع سے آخر تک تصورات میں مرکزیت ہے۔ جس طرح موتی کے ہار میں ایک مخفی ربط ہوتا ہے۔

اسی طرح مندرجہ بالا غزل کا ہر شعر آپس میں پیوستہ ہے جس سے غزل میں نظم کی خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ نسیم کے ہاں مسلسل و مربوط غزلوں کے دلچسپ اور کامیاب تجربے بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انہوں نے بار بار مسلسل تجربوں کا بیان اپنی غزلوں میں کیا ہے۔ اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ غزل میں بھی مسلسل تجربہ کا بیان ممکن ہے

بقیہ نسیم آروی

فکر و فن کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی نجی زندگی میں بھی اسی طرح کے جذبہ و جرأت سے کام لیا ہے۔

میں نے ابتک جتنی باتیں کہی ہیں ان تمام باتوں میں حقیقت و واقعیت کا دامن میرے ہاتھوں میں رہا ہے نہیں جذباتی ہوا ہوں اور نہ دوست نوازی کا شکار اسلئے نسیم صاحب کا یہ تعارف میں ایماندارانہ یقین اور اعتماد کے ساتھ آپکی خدمت میں اس شعر کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

نسیم آروی

از ـ لطف الرحمٰن

حدودِ سال کے تعین کے اعتبار سے نسیم آروی صاحب سے میری ملاقات بھی انہیں حدود کی پابند ہے جن کا ذکر میں نے محی الدین غنی صاحب اور کریم اسری صاحب کی تصویر کشی کے سلسلہ میں کیا ہے یعنی گذشتہ ایک ڈیڑھ سال سے پہلے ان سے میری کوئی دیرینہ شناسائی نہ تھی ایوان ارشاد میری زندگی میں ایک خوبصورت موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اسی کے آغوش میں میں بھاگلپور کے ان فنکاروں سے مل سکا جو مستقبل کے افق پر شاندار وعدوں کی صورت میں جلوہ گر ہونے والے ہیں نسیم صاحب کو بھی میں ادب کی امیر فردا کی صورت میں دیکھتا ہوں حالانکہ اس وقت بھی وہ فکر و فن کی قابل رشک بلندیوں پر جلوہ طراز ہیں لیکن ادبی دنیا ان سے زیادہ توقعات رکھتی ہے۔

جب پہلے پہل ان سے تعارف ہوا تو ان کی ظاہری شخصیت باوجود اپنی سادگی اور احتیاط کے اپنا ایک نقش میرے دل پر چھوڑ گئی اس ہنگامی اور مختصر ملاقات میں میں ان کے قد و قامت اور سج دھج کا بھی ٹھیک سے مطالعہ نہ کر سکا تھا دو چار ملاقاتوں کے بعد میری نظران کی ظاہری شخصیت کے مطالعہ سے بری طرح بے نیاز ہو چکی تھی اور ان کی باطنی سیرت کی گرہ کشائی کی آرزو مند تھی ہر ملاقات کے بعد میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جیسے نسیم صاحب کی تخلیق اسی آب و گل سے ہوئی ہے جس سے میری فطرت کا خمیر تیار کیا گیا ہے جذباتی احساسی اور فکری اعتبار سے میں ان کی شخصیت میں اپنے احساسات اور جذبات کی تسلی کے سامان تلاش کر لیتا تھا۔ اتحادِ طبع اور فطرت کی یہ ہم آہنگی اتفاقی عجیب و غریب تھی بہر کیف تنگ ملاقاتوں کے باوجود وہ میرے تصور کی دنیا سے بہت زیادہ دوریوں پر پہنچ گئے تھے لیکن مشکل یہی تھی کہ میں روزمرہ زندگی میں ان کے معمولات اور ان کے عادات و اطوار سے ناواقف تھا۔ کبھی کبھی ان مذکورہ صفتوں کو جاننے کی خواہش بھی میرے دل میں شدت سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ مشکل شاید بہت دنوں کے بعد حل ہوئی لیکن میں امان اللہ غازی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میری یہ مشکل حل کر دی نسیم صاحب کے مجموعہ کلام "آتشیں" پر تعارف و تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے ان کی خارجی شخصیت کی تصویر کشی ان الفاظ میں کھینچی ہے

"اوسط جسم، اوسط تن و توش، اوسط رنگ، اوسط خد و خال، یہی توازن قدرت نے ان کی روح کو بھی عطا کیا ہے گویا نسیم کا ظاہر و باطن ایک ہے" ان سطور سے گذرنے کے بعد جب میری نظروں نے نسیم صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیا تو مجھے امان اللہ غازی کی قوت مشاہدہ کی داد دینی پڑی انہوں نے بڑے اچھے اسلوب میں نسیم صاحب کا یہ قلمی خاکہ کھینچا ہے یہ اعتبار سے حقیقت پسندانہ ہے۔ میں یہاں پر تھوڑی سی ترمیم ان الفاظ میں کروں گا۔ نسیم صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے اوسط ہے۔ مگر ذہنی اعتبار سے قدرت نے ان کو بلندی و عمیق

گہرائی، گیرائی، آفاقیت اور کائناتیت سے سرفراز کیا ہے
ان کی قوت تخیل بڑی ہی بلند پرواز ہے۔ اور قوت فکر بھی بہت
ہی اعلیٰ۔ تفکر میں بھی یہ ہمہ گیری اور گہرائی۔ لکھتے ہیں ان خصوصیات
نے ان کی شاعرانہ شخصیتوں کو رفیع اور گراں قدر بنا دیا ہے
اپنے ظاہری قد و قامت کے ہر اعتبار سے اوسط ہوتے ہوئے
بھی فطری اور روحانی اعتبار سے میں ان کو اوسط نہیں سمجھتا۔
اس لئے کہ معمولی یا اوسط ذہن و فکر کا آدمی اتنی عظیم تخلیقی صلاحیتوں
کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ جیسے تخلیقی ثبوت انہوں نے اپنے فکر و فن
کے روپ میں ادبی دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اصلی اور غیر فانی
تخلیق ہمیشہ کسی نہ کسی دیوانگی کی احسان مند رہی ہے۔ نسیم صاحب
میں یہ دیوانگی پوری طرح موجود ہے۔

وہ ایک بیدار ذہن، بے چین روح، مضطرب دل
اور ملتہب فکر کے حامل ہیں۔ اس طرح داخلی اعتبار سے اوسط
کی تمام سرحدوں سے وہ بہت دور واقع ہوئے ہیں۔ آپ ان کی
کسی بھی اختراعی کاوش کو سامنے رکھئے، اس میں آپ کو یہ خصوصیت
مل جائے گی۔

سماجی روابط اور معاشرتی رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے
بھی ان کی شخصیت دلکش ہے۔ اس سلسلہ میں میں بھی پروفیسر
امان اللہ غازی کے ان جملوں کو دہرانا پسند کروں گا۔ جو نسیم صاحب
کے متعلق لکھتے ہیں:" وہ فطرتاً نیک، طبعاً پر خلوص، اور
مزاجاً معصوم واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت نیکی، خلوص
اور معصومیت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ وہ ذہین بھی ہیں، اور
متین بھی۔ حساس اور طباع بھی۔ پر مذاق اور بذلہ سنج بھی
خوددار اور غیور بھی۔ وہ متوازن دل و دماغ کے مالک ہیں۔
بحیثیت شاعر دعوائے جنوں رکھنے کے باوجود عملی زندگی میں
بیحد تعقل پسند اور میانہ رو واقع ہوئے ہیں۔"

امان اللہ صاحب نے جتنی باتیں کہی ہیں وہ حقیقت پر
مبنی ہیں۔ ان آخری دو جملوں کے میں ان سے مکمل اتفاق کرتا
ہوں ان کا یہ جملہ "وہ متوازن دل و دماغ کے مالک ہیں" میری
قوت مشاہدہ اور میری قائم کردہ رائے سے کچھ مختلف ہے۔
جس کا اظہار میں کچھ قبل کر چکا ہوں۔ دوسرا جملہ "بحیثیت شاعر
دعوائے جنوں رکھنے کے باوجود عملی زندگی میں بے حد تعقل پسند
اور میانہ رو واقع ہوئے ہیں۔" دو حصوں میں منقسم ہے جس کے
پہلے حصے سے میں متفق نہیں۔ اس لئے کہ نسیم صاحب کو میں نے کبھی
جنوں کا دعویٰ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جنوں کا دعوے
(اور امان اللہ غازی صاحب سے معذرت کے ساتھ) عموماً سطحی
لوگ کرتے ہیں۔ سنجیدہ اور گمبھیر ادبی شخصیتیں کبھی اس سطحیت کا
ثبوت نہیں دیتیں اس لئے کہ خود ان کے آداب زندگی سے ہمیشہ
اظہار جنوں کا انتہائی مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ نسیم صاحب
کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ بلکہ وہ اکثر و بیشتر آداب
جنوں کو آداب زندگی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے
ہیں۔ لیکن جنوں لاکھ پردوں میں مستور رہ کر بھی کسی نہ کسی طرح
ظہور کی منزلوں سے گذرتا ہے۔ نسیم صاحب کی دیوانگی بھی
پاسبان عقل کا کہنا اکثر و بیشتر نہیں مانتی۔ اور یہ بڑی اچھی بات
ہے۔ وہ مئے کش ہی کیا جو میکدے سے نکلے اور لغزش پا کا شکار
نہ ہو۔ یہ لغزش تو ان لغزشوں میں شمار کی جاتی ہے جنکو بارگاہ
ایزدی میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ نسیم صاحب کی
لغزش رندانہ بھی خداوند ادب کی بارگاہ میں بڑا اونچا
مقام رکھتی ہے۔

نسیم صاحب اپنی زندگی میں ہر اعتبار سے بہت ہی
متحرک اور باعمل نظر آتے ہیں۔ ان کی روح میں چھپی ہوئی بجلی
کبھی بھی چین نہیں لینے دیتی چونکہ وہ معاملات کی چھان بین

مختلف پہلوؤں سے کرتے ہیں اس لئے وہ گم کردہ منزل نہیں انکو اپنی
منزل کی سمت معلوم ہے اور وہ اپنی راہ کا تعین کر چکے ہیں اور اب
بڑے عزم و اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن نظر
آرہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں ذہنی اور نفسیاتی جمود و
تعطل اور انتشار و بحران کا کوئی شائبہ تک نہیں جس نے آفاقی
طور پر آج کے ذہنوں کو اپنا اسیر کر لیا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر کے اعتبار
سے وہ بڑی حد تک بیسویں صدی کی اس عالمگیر تحریک سے
متاثر ہیں جس نے ترقی پسند تحریک کی صورت میں ہندوستان کی
ادبی فضا پر اپنے اثرات منتشکل کئے تھے۔ لیکن ان کے یہاں
بہت سے ترقی پسند شعراء کی طرح وہ افراط و تفریط نہیں ملتی جس
نے اس تحریک کے زیر اثر تخلیق کی گئی شاعری کو کچھ کم قدر و قیمت
سے منعطف کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فن اور فکر کا بہت متوازن
اور گہرا رچاؤ ان کے یہاں ملتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ مزاج کے
اعتبار سے یہ بڑی حد تک رومانیت کے شکار ہیں اور فکر کے اعتبار
سے ترقی پسند تحریک کے افکار و آراء سے متاثر۔ یہ دونوں رجحانات
ایک دوسرے سے اتنے متضاد ہیں کہ قطبین کے فاصلہ پر واقع
ہوئے ہیں۔ اگر علم ریاضی کے اصول سے ان کی نسبت تلاش کی
جائے تو یہ وہ مسئلہ ہے جو کبھی حل نہ ہو۔ ادب کو ریاضیات سے
کیا سروکار۔ مگر نسیم صاحب نے کچھ اس میں بھی جدتیں پیدا
کی ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

انہوں نے ایک ماہر فنکار کی حیثیت سے ان دو متضاد
رجحانات کو اس طرح سے آپس میں شیر و شکر کر دیا
ہے کہ اب یہ دو اجنبی چیزیں نہیں رہ گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ میری
باتوں سے بعض احباب کو اختلاف ہو لیکن فیض کی شاعری بھی
ایسے ہی متضاد عناصر کے ایک حسین مجموعہ کا نام ہے۔ بعض ان
کے یہاں بھی رومانیت اور ترقی پسندی بڑے حسین اور دلکش انداز
میں ہم آہنگ ہوگئی ہیں۔ نسیم صاحب کے فن میں بھی یہی خصوصیت
ملتی ہے۔ نسیم صاحب جب تو تمام کلاسیکی شاعروں کو پڑھ
چکے ہیں اور تمام جدید شاعروں کو سمجھ چکے ہیں اور ان سب
سے شعوری اور غیر شعوری اثرات بھی قبول کئے ہیں امان اللہ
غازی صاحب نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ یہ فیض سے زیادہ
متاثر ہیں۔ مجھے ان کی اس رائے سے سو فیصدی اتفاق ہے
اس لئے کہ نسیم صاحب کا کلام بھی اس کی آئینہ داری کرتا
ہے۔ اور خود نسیم صاحب بھی۔ یوں تو نسیم صاحب کو بے اندازہ
اشعار یاد ہیں جو ان کی ذہانت کا ایک واضح ثبوت ہے لیکن
خاص طور پر فیض کا کلام انہیں بہت یاد ہے کبھی کبھی تو مجھے
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیض کا سارا کلام ان کے ذہن میں
محفوظ ہے۔ اس سے فیض اور نسیم صاحب کی ذہنی مناسبت
کا اندازہ ملتا ہے۔ غالباً انہوں نے فیض ہی کے یہاں
انداز کا فن سیکھا ویسے اس کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام
انہوں نے بھی کیا ہے۔ بہرکیف در اصل ان کے مزاج کی رومانیت
اور فکر کی ترقی پسندیت کا ذکر کرنا چاہ رہا تھا اس سلسلہ
میں چند باتیں اور عرض کروں گا ان کے مزاج پر چھائی ہوئی
رومانیت پہلو دار واقع ہوئی ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے
کہ وہ بھی ایک حساس اور ایماندار فنکار کی طرح تہذیب کے
اس کھوکھلے دور سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لئے روح اور معاشرہ
کی جھوٹی قدروں سے گریز پائی کا تقاضہ ان کے ذہن میں پیدا
ہوتا ہے۔ اگر فکری اعتبار سے یہ ترقی پسند تحریک کے
قریب نہ ہوتے تو اردو کے ایک عظیم رومانی شاعر ہوتے مگر ان کو
توازن کی راہ ان کے فکری رجحان نے بتلائی۔ ان کی رومانیت
کا ایک اور بہت ہی واضح نقش ان کی نگاہوں کی تشنگی سے
ملتا ہے۔ ان کی نظریں کبھی کبھی ان کی داخلی شخصیت کو بے نقاب

کردیتی ہیں۔ انسان کی نگاہ یوں بھی بڑی بے وفا اور غیر معتبر ہے۔ یہ بسا اوقات ان رازوں کو افشا کرنے کا سبب بن جاتی ہے جسکو کوئی مستور رکھنا چاہتا ہے۔ ان کی نگاہیں عذباتی زندگی میں ان کی ناکامی کی غماز نظر آتی ہیں اور ایسے لمحوں میں یہ نگاہیں ہمہ اتنظار اور ہمہ نامرادی کا جیتا جاگتا ثبوت بن جاتی ہیں۔

میں نے ان کی نگاہوں کے اس انداز سے یہ استنباط کیا ہے کہ وہ آج بھی خوابوں کی دنیا میں کسی شہزادی کی آمد کا منتظر ہیں اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بسا اوقات تصورات کی دنیا میں بھی گم رہتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کے لئے یہ کچھ معیوب بھی نہیں ہے۔ اس سے دل میں گداز اور وارفتگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اگر نسیم صاحب کو یہ تشنہ لبی نہ ملتی تو ان کے کلام میں یہ گداختگی اور شعلگی کہاں سے آتی؟ وہ بھی احمد فراز کی طرح یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ

جس کو چاہا ہے اسے شدت سے چاہا ہے فراز

سلسلہ لوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

نسیم صاحب کی زندگی بھی ایک ایسی تہائی زنجیر سے تعبیر کی جاسکتی ہے یوں تو محفل یاراں میں چہکتے بھی ہیں اور بہکتے بھی ہیں مگر ان کے چہرے اور آنکھوں کے پس پردہ جو شعلگی چھپی ہوئی ہوتی ہے اس کا احساس "دل ریزہ ریزہ ہی کرسکتا ہے" اگر میں اس مشاہدہ میں حقیقت سے قریب ہوں تو یہ دعا کروں گا کہ ان کی یہ تشنگی محرومی اور تلخ کامی برقرار رہے تاکہ ان کی شاعری میں درد کا عنصر کبھی کم نہ ہونے پائے۔ اقبال نے کہا تھا ؂

یہ ہے مری دعا تجھے منزل نہ راس آئے

نسیم صاحب کے لئے بھی میں یہی دعا کرنا چاہوں گا ——

ان کی شخصیت کا ایک پہلو میرے لئے بڑا حیرت انگیز رہا ہے۔ جب میں نے یہ سنا کہ سیاسیات اور ریاضی کے ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یوں مجھے ریاضیات سے کچھ فطری کد ہے اور یوں بھی میں اسکو حساس اور ذہین لوگوں کے لئے سم قاتل سمجھتا ہوں۔ اور تضیع اوقات بھی۔ اس لئے میری حیرت دوچند ہوگئی۔ اور مجھے یہ خدشہ ہوا کہ نسیم صاحب بھی خدانخواستہ اس زہر کے شکار ہونے کی وجہ سے مزاج میں خشکی اور بے کیفی رکھتے ہوں گے۔ مگر نسیم صاحب کو ریاضی سے یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے جمع و تفریق کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی عملی زندگی میں خشکی اور بے کیفی کو تفریق کے دائرہ میں رکھا اور شگفتگی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی کو جمع کے دائرہ میں ان کے دوستوں کی زندگی ان کے علم ریاضی کا شکار ہونے سے بچ گئی۔ سیاسیات نے بھی ان کو اسی طرح کے فائدے پہونچائے۔ اور اس سے بھی انہوں نے اپنے علم کی وسعت اور تجربے کی نیرنگی میں اضافہ کیا۔ نہ یہ دو چیزیں انکو غارت کرنے کے لئے کافی تھیں۔

نسیم صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بے اندازہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں اس کا مظاہرہ انہوں نے ازدواجی زندگی کے مخصوص شعبے میں بھی کیا ہے اور ادبی شعبے میں غضب کی تیزی اور سرعت کے ساتھ دلکش خوبصورت اور کامیاب نظمیں خلق کی ہیں اسی حساب سے آغوش زہرہ میں بھی گل بوٹے کھلائے ہیں۔ ان کی یہ کامیاب تخلیقیں ان کی اس فطری بےچینی کا اظہار کرتی ہیں جن کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے اس لحاظ سے وہ قابل تعریف بھی ہیں اور قابل رشک بھی جو کم سے کم ان کے جذبۂ جنوں کے اظہار کو کچھ تو مثبت سہارے ملے۔

نسیم صاحب دوستوں کی محفل میں ہر مسئلے پر بلا تکلف اپنے خیال کا دلنشیں انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ بزم شعر میں بھی ان کا وہی انداز گفتگو ہوتا ہے جو بزم بحث و مباحثہ ایسے موقعہ پر میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی آواز جلال و جمال کا ایک حسین سنگم ہوا کرتی ہے۔ جلال و جمال کی یہ متوازن

کیفیت ان کی زندگی اور ان کے ادب میں واضح طور پر نظر آتی ہے
غزل ہو یا نظم ان کا ذریعۂ اظہار یہی مخصوص صفت رکھتا ہے
یہ صفت محض خارجی نہیں ہوتی ۔ فطری اعتبار سے بھی یہی توازن
ملتا ہے وہ نعرۂ انقلاب بھی اس انداز و اسلوب دیگر میں
ملبند کرتے ہیں جو اثر و تاثر کی کیفیت رکھتا ہے ۔ عدم توازن
اور شور و شغف ان کے یہاں کبھی نہیں پایا جاتا اس لئے ان کے
کلام میں دل کو چھو لینے والی بات ملتی ہے ۔ میں نے حسرت کے
اس شعر کی تعبیر ان کے کلام میں پائی ہے ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

شاعرانہ اعتبار سے نسیم صاحب کو وہ سلیقۂ شاعری
حاصل ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے ۔ یہ سلیقہ برسوں خون جگر
صرف کرنے کے بعد آتا ہے ۔ نسیم صاحب نے بھی ایک مدت تک
ذہن و دل کی مہمان نوازی کے لیے خون جگر کا صرفہ کیا ہے ۔ مجھے
کبھی کبھی یہ گمان گذرتا ہے کہ ان کا کلام شاعرانہ اسلوب اور
کیف و اثر کے اعتبار سے وہی درجہ رکھتا ہے جو ابو الکلام کی
نثر کو حاصل تھا ۔ میں یہ باتیں نسیم صاحب کی محبت یا دوستی
کے جذبے سے سرشار ہو کر نہیں کہہ رہا ہوں ۔ "آتشیں" آپ
کے سامنے ہے اور آپ کا تنقیدی رجحان آپ کے پاس ۔

"آتشیں" جیسا کہ آپ کو علم ہے نسیم صاحب کا
مجموعہ کلام ہے انہوں نے اس کا نام "آتشیں" رکھا ۔ ظاہر
ہے کہ ان کے اس فیصلہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیات کارفرما
ہوگی ۔ اگر اس نفسیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے
آتی ہے کہ نسیم صاحب کا کلام آتشیں صفات سے متصف ہے
دوسری طرف ان کا تخلص یعنی لفظ نسیم سامنے آتا ہے جو
نزاکت و نفاست اور خوشبو و بہار کی علامت ہے ۔ اس
تخلص کو بھی اختیار کرنے میں ان کی نفسیات کو دخل ضرور ہوگا
اس "آتشیں" کے پیچھے جو نفسیات کام کر رہی ہے وہ نفسیات
نسیم کے پس پشت ہرگز نہیں ہوگی دونوں میں بڑا بعد ہے
اور ہونا بھی چاہیے لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ نسیم کی تخلیق
"آتشیں" ہے ۔ میں نے انہیں اسباب کی بنا پر یہ عرض
کیا تھا کہ ان کا کلام جلال و جمال کا ایک حسین سنگم ہے ۔

نسیم صاحب نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ
عرصہ تک صنف غزل کو صرف یہی نہیں کہ ناپسند کرتے رہے
بلکہ اس کے سخت مخالف بھی رہے ۔ اردو ادب میں یہ صنف
بڑی متنازعہ فیہ رہی ہے ۔ اور بڑی بدنصیب بھی لیکن یہ بھی
ایک عجیب ستم ہے کہ ہر دور میں یہی سب سے زیادہ محبوب
صنف ادب رہی ہے ۔ حالی ہوں یا جوش ، یا کلیم صنفی
اعتبار سے وہ غزل شکن ضرور رہے ۔ لیکن طرفہ تماشا
یہ ہے کہ حالی نے بھی غزلیں کہیں اور جوش نے بھی کلیم کی اب تک
کوئی غزل سامنے نہیں آئی ہے لیکن قیاس اغلب یہ ہے
کہ ان کی تنہائیوں کی رفیق بھی یہی صنف ہوگی ۔ نسیم صاحب
بھی ایک عرصہ بعد غزل پر ایمان لے ہی آئے ۔ ان کے رجحان
کی یہ تبدیلی بڑی خوش گوار ہے ۔ بقول خود ان کے غزل سے
تنفر کرنے والی چیز اساتذہ کرام کے وہ دواوین تھے
جو کسی بھی کیفیت احساس یا اثر آفرینی سے عاری تھے انہوں
نے کلاسکی اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ گہری بصارت و
بصیرت کے ساتھ کیا ہے ۔ اس مطالعہ کے سلسلے میں جب
ان کے دامان نگاہ ناسخ اور ان کے قبیلے کے دوسرے شاعروں
کے خارزار غزل میں الجھے تو انہیں اس سے بیزاری ہوئی اور
پھر بعد میں نفرت ہو گئی ۔ مگر پھر جب اپنے ایک دوست کامرید
رفیق کی تحریک پر انہوں نے شبلی کی غزلوں کا مطالعہ کیا

تو ان کی یہ نفرت بتدریج کم ہوتی گئی۔ اور پھر اس کی انتہا یہ ہوئی کہ بزم شعر ایک دن انکے غزلوں کی ترنم سے جھوم اٹھی ان تمام باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسیم صاحب کسی بھی فیصلہ تک پہونچنے کے لئے اپنے ذہن و شعور اور اپنی عقل و خرد پر بھروسہ کرتے ہیں وہ نہ تو اندھی تقلید کے قائل ہیں اور نہ خواہ مخواہ کی نفرت و دشمنی کے۔ ان کا شعور و ادراک جو فیصلہ کرتا ہے وہ اسی پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی کی مختلف منزلوں میں بھی ان کا یہی طریق کار رہا ہے۔ ملازمت کے سلسلہ میں بھی انہوں نے اسی طریقہ کار سے کام لیا ہے۔ وہ کسی فیصلہ پر پہونچنے کے بعد مزید کشمکش یا الجھاوے کے شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ اس پر سختی سے کاربند ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بار اپنی ملازمت سے محض اس لئے استعفا دے دیا کہ وہاں کے ارباب اختیار انہیں ایک مقابلہ کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے بظاہر یہ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر ان دنوں ملازمت کی دشواری اور کمیابی کے مسئلہ کو اگر سامنے رکھا جائے تو ان کا یہ اقدام اہمیت اور قدر و قیمت کا اظہار کرے گا صرف یہی نہیں کہ ان کے اس اقدام سے ان کی قوت فیصلہ کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کسی دباؤ یا سختی کو یہ برداشت نہیں کر سکتے۔ نسیم صاحب خلوص اور سچائی کی قدروں پر جان دیتے ہیں۔ اور اس کے لئے اپنی جان بھی نچھاور کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر جبر اور دباؤ کے ساتھ جنت بھی ملے تو شاید ٹھکرا دیں۔ غالب نے کہا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

آزاد روی اور خود بینی میں نسیم صاحب غالب سے بھی آگے ہی نظر آتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسیم صاحب عزت نفس خودداری اور خود آگاہی سے پوری طرح مزین ہیں۔ ان چیزوں نے ان کے یہاں ایک "جذبۂ انانیت" بھی پیدا کر دیا ہے۔ لیکن ان کی یہ انانیت نفسیاتی اعتبار سے مریض، مجروح، زخمی یا بیمار نہیں بلکہ بڑی صحت مند اور تعمیری ہے۔

نسیم صاحب سے باتیں کرتے ہوئے یوں تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ رنگ کا رہا ہے۔ انکی یادداشت خصوصاً اشعار کے سلسلہ میں جیسی کچھ ہے اس کا ذکر کر چکا ہوں اس لئے کوئی بھی آدمی ان کی صحبت میں بے کیفی اور گراں باری کا شکار نہیں ہوگا۔ مجھے ان سے باتیں کرتے ہوئے کچھ اس وجہ سے بھی بھلا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو میں وہ ادائے تکلمی بہت مختصر طور پر ہی سہی مگر موجود ہے جو اللہ کو بہت پسند تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ وہ باتیں کرتے ہوئے تکیۂ کلام کے طور پر "تو صاحب" "کیا کہتے ہیں" کی تکرار بڑے شیریں انداز میں فرماتے ہیں جس سے باتوں کا سلسلہ بھی برقرار رہتا ہے اور اس کی لذتیت میں بھی خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

نسیم صاحب موجودہ عہد کے تمام تقاضوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ انہوں نے زندگی سے کبھی فرار یا گریز کی راہ نہیں اپنائی بلکہ ہر موقع پر بے اندازہ جرأت و جسارت کا ثبوت دیا۔ عملی زندگی اور ادبی زندگی دونوں کے تقاضے کو انہوں نے برابر بھی نبھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شخصیت کے اس رخ پر گفتگو کرتے ہوئے مجھے بے اختیار یہ شعر یاد آ گیا ہے ؎

اس کی تو داد دے گا ہمارا کوئی رقیب
جب سنگ اٹھا ہے سر بھی اٹھاتے رہے ہیں ہم

میری نظر میں نسیم صاحب اس شعر کی تفسیر نظر آتے ہیں

باقی صفحہ ۲۶۹ پر

مظفر اقبال

ایک چشمۂ فیض

محمد قمر علی قمر

سرزمین بھاگلپور میں اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما اس کی ترویج اور ارتقاء کی داستان صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدائی دور میں شعر و ادب عام طور پر صوفیائے کرام کی مجالس مقدسہ کی متصوفانہ فضا میں پر پرواز کو جنبش دیتا رہا اور مذہبی و دینی افکار و نظریات کی ترجمانی و اشاعت کا خوش گوار فرض انجام دیتا رہا یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔ بھاگل پور کی زمین ابتداء ہی سے مردم خیز سرزمین رہی ہے۔ یہاں کی خاک سے بڑے بڑے علماء، فضلاء، صوفیاء، عرفاء، ادباء، شعراء منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے رہے اور اپنا انفرادی رنگ زمان و مکان کے سینے پر ثبت کرتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج وہ حضرات قعر گمنامی میں سوئے ہوئے ہیں کہ جنکے دم سے کبھی بھاگل پور کی سرزمین بہار صد رنگ کے لئے باعث رشک تھی۔ اگر بھاگل پور کی سیاسی و ادبی تاریخ کا بالتفصیل مطالعہ کیا جائے تو پتہ نہیں کیسے کیسے لعل گراں مایہ اس کی خاک میں آرام فرما نظر آئیں گے۔ جن لوگوں کے خون اور ہڈی کی بنیاد پر یہ شہر آباد ہے وہ اس سرائے فانی میں نہیں رہے لیکن ان کے نقوش مختلف صورتوں میں آج بھی جلوہ گر ہیں۔ بھاگل پور کی ادبی تاریخ بہرحال انہیں بزرگوں کی رہین منت ہے بیسویں صدی میں جمہوری اور عوامی شعور کی بیداری کے ساتھ ساتھ ادبی بیداری کا آغاز بھی ہوا اور باضابطہ طور پر بھاگل پور میں شعر و سخن کا جمہوری دور شروع ہوا۔ اوائل بیسویں صدی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوئی۔ طرحی مشاعرے ہونے لگے اور بھاگل پور کے مختلف محلوں میں ادبی محفلیں منعقد کی جانے لگیں۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے اس سرزمین پر ادیبوں اور شاعروں کا ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ مختلف ادوار میں مختلف حضرات اس قافلے کی رہنمائی و رہبری کرتے رہے ہیں۔ بہت سی دوسری محفلوں اور بہت دوسرے حضرات کے ساتھ ہی ٹی، این بی کالج بھاگل پور کی بزم ادب اور ٹی، این، بی کالج کے اساتذہ کرام کی خدمت بے پایاں بھی اس نہج سے قابل قدر اہمیت رکھتی ہیں۔ مذکورہ کالج ۱۸۸۳ء میں قائم ہوا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ دانش کدہ ادب و فن کا ایک گہوارہ رہا ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلبا و علوم و دانش کے نور ہی سے متصف ہو کر نہیں نکلے بلکہ شاعرانہ شعور و آگہی اور ادبی ذوق و شوق کی دولت بے پایاں بھی انہیں ملتی رہی۔ اس طرح یہ کالج ادب و فن کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے کا اہم فرض انجام دیتا رہا ہے اور ادیبوں اور شاعروں کا کارواں در کارواں تیار کرتا رہا ہے۔ آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ یہ کالج ادب و فن کی خدمت میں مصروف ہے آج اس کالج کے جو اساتذۂ کرام مسلک ماضی پر ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ان میں پروفیسر صدرالدین احمد، ڈاکٹر احمد حسن، پروفیسر مظفر اقبال، ڈاکٹر غفار انصاری، پروفیسر غلام مجتبیٰ اختر اور پروفیسر لطف الرحمٰن کے اسمائے گرامی ادب و فن کی دنیا میں اجنبی ہوں تو ہوں مگر ان کی خدمات سے بہرحال انکار ممکن نہیں۔ ان حضرات کی شخصیات انفرادی طور پر انجمن در انجمن کی خصوصیات رکھتی ہیں لیکن میں یہاں صرف استاذی پروفیسر مظفر اقبال صاحب کی شخصیت و فن کا ایک مختصر جائزہ

پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جب میں اردو ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ٹی۔ این۔ بی کالج کے دائرہ علم و ادب میں داخل ہوا تو پروفیسر صدر الدین محمد ڈاکٹر احمد حسن اور پروفیسر مظفر اقبال کی شخصیتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ جہاں تک اول الذکر دو بزرگوں کا تعلق ہے ان کی ذات بابرکات سے میں نے جو استفادے اور اکتساب علمی و ادبی کئے اسکے اظہار کے لئے دفتر چاہئے۔ چونکہ میں پروفیسر مظفر اقبال صاحب سے نسبتاً زیادہ قریب رہا ہوں اور میں نے ان کو نسبتاً زیادہ قریب سے مختلف مواقع پر مختلف صورتوں میں دیکھا ہے اس لئے میں ان کی شخصیت و فن پر خامہ فرسائی کی جرأت کر رہا ہوں۔

گیا ضلع کا شہر اورنگ آباد خوش نصیب ہے کہ اس کی آغوش میں پروفیسر عبد المغنی (شعبۂ انگریزی بی۔ این۔ کالج پٹنہ یونیورسٹی) اور پروفیسر مظفر اقبال (شعبۂ اردو ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگلپور یونیورسٹی) جیسی دو منفرد شخصیتوں نے پرورش پائی۔ یہ دونوں حضرات حقیقی بھائی ہیں۔ پروفیسر عبد المغنی، مظفر اقبال صاحب سے بڑے ہیں۔ ان کے والد مولانا عبد الرؤف صاحب مدظلہ العالی کی شخصیت بھی مرکز علوم و افضال ہے۔ کسی دور میں موصوف جنگ آزادی کے ایک سرگرم رہنما رہ چکے ہیں مگر اب گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ موصوف علم و فضل کے اعتبار سے یکتائے روزگار اور تقویٰ شعار میں فرد ہیں۔ ان کے زیر تربیت ان دونوں بھائیوں نے حیات و کائنات کے مسائل کو حقیقت پسندانہ نگاہوں سے دیکھنے کا فن سیکھا اور ان مسائل کو دردمندانہ انداز میں حل کرنے کا ہنر جانا۔

پروفیسر مغنی صاحب صرف انگریزی کے استاد ہی نہیں اردو کے مانے ہوئے ناقد ہیں۔ اور کل ہند و پاک شہرت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو، انگریزی صحافت موجودہ عالمی سیاست اور ادبی تحریکات کے تمام مسائل کی معتبر باخبری رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی شروع ہی سے قومی و ملی خدمات میں بسر ہوتی رہی۔ کئی ادبی اور سیاسی رسائل کے مدیر رہ چکے ہیں۔ فی الحال ماہنامہ "مریخ" پٹنہ انہیں کی ادارت میں نکل رہا ہے۔

اپنے برادر معظم کی طرح استاذی اقبال صاحب بھی بیحد متحرک، فعال، بیدار مغز، باشعور، دردمند اور ذہین ہیں۔ کالج کی مشغولیات کے علاوہ شہر کی سماجی قومی، ملی، تہذیبی، علمی اور ادبی زندگی کے ہر مسئلہ میں مخلصانہ صداقت اور ایماندارانہ جرأت کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ ان کے بغیر ہر بزم سونی اور پھیکی نظر آتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ اتنا وقت کہاں سے نکال لیتے ہیں۔ اور کس طرح مشغولیات کو بحسن و خوبی سرانجام دے لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کبھی تنہا نظر نہیں آتے ہمیشہ کچھ نہ کچھ لوگ ان کے ساتھ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے نظر آتے ہیں غالباً ان کا مسلک یہی ہے ؎

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اوسط قد و قامت، گندمی رنگ، گداز جسم، روشن پیشانی چمکتی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ اقبال صاحب کی ظاہری شخصیت کو بہت ہی جاذب نظر بنا دیتے ہیں۔ جامہ زیبی میں فرد ہیں۔ اس لئے ہر لباس میں جچتے ہیں۔ اور کسی بھی بزم میں وضع قطع کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ علم و ادب اور فکر و شعور کی وسعت و نیرنگی اور ہمہ گیری و بوقلمونی نے ان کی ظاہری و باطنی شخصیت کو بے حد اثر آفریں اور قابل رشک بنا دیا ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت بزم کی مرکزیت رکھتی ہے۔ اور مختلف جماعت و گروہ کے افراد ان کی ذات سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اور یہ ہمیشہ دامے درمے قدمے سخنے حتی الوسع ہر ایک کے کام آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھاگلپور کے ہر حلقے میں یہ بے حد مقبول و محترم ہیں۔

نظم، نثر اور تحریر دونوں میں قدرت نے ان کو خاص

انفرادیت سے نوازا ہے۔ یہ کسی موضوع پر فی البدیہہ اپنے افکار و نظریات کا متاثر کن اظہار کرنے پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ میں نے کلاس روم میں بھی ان کی تقریر سنی ہے اور مجالس و محافل میں بھی ان کی خطابت انداز بیان کے اعتبار سے اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ کلاس روم میں ان کی تقریر عالمانہ طرز و آہنگ کے ساتھ سادگی و پرکاری کی حامل ہوتی ہے اور اظہار و ابلاغ اور افہام و تفہیم کا بہترین اسلوب ادبی محفلوں کی تقریر سرچشمۂ علم و ادب کی ترنم ریزۂ آبشار اور نغمہ برلب مضراب فن سے مماثل ہوتی ہے اور سماجی و مذہبی جلسوں کی خطابت، بلند آہنگ، پر زور اور جلال و عظمت کا آہنگ و طرز رکھتی ہے۔ ان کی ہر تقریر سامعین پر سحرکارانہ انداز میں اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ یہ اپنی تقریر وں کے ذریعہ مجمع کے ذہن و دل اور فکر و نظر پر چھا جاتے ہیں۔

فنی اور جمالیاتی اعتبار سے ان کی شخصیت بے حد متنوع ہے۔ نثر نگاری اور شاعری کی مختلف صنفوں سے ان کو فطری لگاؤ ہے۔ تحقیق و تنقید خاص موضوع ہے مگر افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی میں بھی کامیاب ہیں۔ کئی ڈرامے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ جن میں "عدل بے نظیر" مطبوعہ "ساتھی" پٹنہ اور "پیار یا بیوپار" مطبوعہ ماہنامہ "صنم" پٹنہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ افسانوں میں "متعصب کون" "ارماں تڑپ کر رہ گئے" اور "ناکام نگاہ" شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین میں درج ذیل مضامین اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ بہار کی اردو شاعرات — مطبوعہ "صنم" پٹنہ
۲۔ مراثی ناسخ — " " "
۳۔ علامہ فضل حق آزاد اور انکی شاعری — " " "
۴۔ شاد عظیم آبادی کا ناول صورت الخیال — " " "
۵۔ مبارک عظیم آبادی اور ان کی شاعری — مطبوعہ "آج کل" دہلی
۶۔ فکی اورنگ آبادی اور ان کی شاعری — " "شاعر" بمبئی
۷۔ اردو میں عکسی و اضافی تراکیب کا مسئلہ — " "آثار" کلکتہ
۸۔ اردو میں خواتین کا اولین ناول - اصلاح النساء
مطبوعہ "ہماری زبان" علیگڑھ
۹۔ جمیلہ خاتون راضیہ اور اس کی شاعری۔
مطبوعہ "عید نمبر صنم" پٹنہ
۱۰۔ ادب اور زندگی — " "ساتھی" ہفتہ وار پٹنہ
۱۱۔ معین الدین دردائی کی اردو خدمات
مطبوعہ "ساتھی ہفتہ وار" پٹنہ
۱۲۔ منظر شہاب کی شخصیت — مطبوعہ "رفتار نو" دربھنگہ
۱۳۔ البنیٰ سنہ ۱۹۰۰ء — مطبوعہ "معاصر" پٹنہ
۱۴۔ عبدالغفور شہباز کی ایک غیر مطبوعہ نظم
مطبوعہ "معاصر" پٹنہ
۱۵۔ میر مہدی مجروح کی ایک نایاب تحریر
مطبوعہ "قومی زبان" کراچی
۱۶۔ قدیم اسٹیج کے بنیادی عناصر۔ مطبوعہ "تند ڈرامہ نمبر" پاکستان
۱۷۔ اختر اورینوی کی ڈرامہ نگاری
مطبوعہ "ساغر نو اختر اورینوی نمبر" پٹنہ
۱۸۔ اردو سانیات اور اختر اورینوی
مطبوعہ "ساغر نو اختر اورینوی نمبر" پٹنہ
۱۹۔ متنی تنقید پر ایک نظر — مطبوعہ "مریخ" پٹنہ

ان کے علاوہ کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جنکی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ سہل قواعد — تصنیف
۲۔ مثنوی سوز و گداز — ترتیب

۲۔ تنقیدی مضامین   ترتیب
۳۔ وہابی تحریک بہار میں   ترجمہ

پی ایچ ڈی۔ صوبہ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے موضوع پر ڈی لٹ کے لئے ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھ رہے ہیں جو تقریبا زیر تکمیل ہے۔ یہ مقالہ اردو ادب کی تاریخ میں نئی سمتوں اور نئے آفاق کی نشاندہی کرے گا۔

شعر و سخن کا بھی فطری جذب جمالیاتی اور دلنشیں ذوق رکھتے ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ اور منظومات کی صنفوں میں کامیابی کے ساتھ دل فریب پیرائے میں طبع رحجانیت حساس پر قدرت رکھتے ہیں۔ غزل کی صنف میں معنوی اور تغزل رنگ آہنگ کو برقرار رکھتے ہیں۔ اور ایک مخصوص صناعی، ہنرمندی، فنکاری اور سلیقے سے کام لیتے ہیں۔ اظہار بیان پر قدرت حاصل ہے اس لئے آسانی کے ساتھ دلکش اور درد انگیز انداز میں واردات قلبی اور جذبات باطنی کی عکاسی کرتے ہیں۔ اشعار میں سوز و گداز اور اثر و تاثر ہوتا ہے ؎

مری آہیں مجھکو عزیز ہیں مرے نالے مجھکو رفیق ہیں
انہیں بے اثر نہ کہے کوئی انہیں نارسا نہ کہے کوئی
مجھے مٹنے کا کوئی غم نہیں، مجھے فکر ہے تو بس اتنی ہے
انہیں فتنہ زا نہ کہے کوئی انہیں بے وفا نہ کہے کوئی

ہجر کی لذت کے دن شاید کہ پورے ہو گئے
شام ہی سے دل مرا کیوں آج ڈوبا جائے ہے
اس کے وعدوں کی حقیقت دل کو سب معلوم ہے
پھر بھی جانے کس نے یکلخت دھوکا کھائے ہے

غم کو افسانہ بنایا نہیں ہم نے ورنہ
اس سے بہتر نہ حقیقت نہ فسانہ ملتا

مجھ سے بہتر تو مری تصویر ہے
خواب ہوں میں اور وہ تعبیر ہے
رنج و اندوہ و مصیبت، غم و الم
زندگی کی بس یہی تفسیر ہے
ہو میسر دو گھڑی عیش و نشاط
کب بھلا ایسی مری تقدیر ہے
نارسائی، نامرادی، غم کشی
میری قسمت میں یہی تحریر ہے
دیکھ لو اقبال کو ہاں دیکھ لو
زندگی نادرہ اک تصویر ہے

یہ تمام اشعار بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ انکی معنویت، درد انگیزی، سوز و گداز، سلاست و برجستگی اور اثر اندازی شاعر کے رجحان شعری، احساسات قلبی اور اسلوب بیان و طرفگی ادا کی خود آئینہ دار ہے۔ اقبال صاحب غزل مسلسل بھی کہتے ہیں۔ میں یہاں ان کی ایک غزل مسلسل پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اہل نظر ان کے فنی بصیرت اور کمال کا اندازہ کر سکیں

تیری آنکھوں کی یہ مستی، تیری نظروں کی شراب
دل ستا و دلربا و دلکش و خانہ خراب
سرکشی کرتے ہیں تجھ سے تیرے آثار شباب
جیسے ساغر میں ابلتی ہے کوئی کہنہ شراب
تیرے اعضا کا تناسب، تیرے چہرے کی تراش
شاہکار آذری ہے یا کسی شاعر کا خواب
کتنا محشر خیز ہے یہ تیرا انداز خرام

جس کے نظارے سے دل میں اک جہانِ اضطراب
تیری زلفوں کی سیاہی، تیرے چہرے کا نکھار
بادلوں کے درمیاں ہنستا ہے جیسے ماہتاب
تیری آوازوں کا جادو تیرے لہجے کی مٹھاس
باعثِ رشکِ نوائے چنگ و آہنگِ رباب
تیرے غمزے روح پرور تیرے عشوے جاں فروز
موسمِ سرما میں جیسے دوپہر کا آفتاب
تیرے پیراہن کی خوشبو، تیرے آنچل کی ہوا
موتیا، بیلا، چنبیلی، مشک و عنبر کا جواب
مختصر یہ ہے کہ تیری سب ادائیں دل فریب
حسن کا نادر نمونہ ہے تو اے جانِ شباب

نظم نگاری میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ آزاد اور پابند دونوں طرح کی نظمیں لکھتے ہیں۔ اور دردآفریں اسلوب میں موضوع کو پیش کرتے ہیں۔ موضوع اور اسلوب بیان میں بڑی ہم آہنگی توازن، اور اعتدال ملتا ہے۔ ان کی مشہور و مقبول نظموں میں "سراپا"، "یہ شہکار تیرے ہنر کا"، "ناگن"، "چاند نکلا گہن سے اندھیرا چھٹا"، اور "ساون کا درد" وغیرہ ہیں۔ ان نظموں کا تنقیدی جائزہ پیش کرنا یہاں ممکن نہیں۔

فراقؔ گورکھپوری کے طرز پر گھونگھٹ کی صنف میں بھی بعض تخلیقات نادر و فکر آفریں ہیں۔ میں یہاں ان کی چار ایسی اختراعات پیش کر رہا ہوں ؎

نشانِ خنجرِ ابروئے جوہر دار باقی ہے
کہ تاثیرِ نگاہِ سادہ و پُرکار باقی ہے
ترا عکسِ رخِ زیبا مگر اے یار باقی ہے
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا } غالبؔ

طبعِ نازک پہ نہ ہو بار کہوں یا نہ کہوں
شکوہ سمجھے نہ اسے یار کہوں یا نہ کہوں
ہو نہ جائے کہیں بے زار کہوں یا نہ کہوں
اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں } غالبؔ

کچھ ایسی لگی ضرب دل پر ہے ناصح
کہ حالت بہت اس کی ابتر ہے ناصح
نصیحت تری نوکِ نشتر ہے ناصح
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
کہ کب تک مرے منہ کو دھونا رہے گا } میرؔ

حقیقت کو جلوہ نما چاہتا ہوں
کبھی رخ سے پردہ اٹھا چاہتا ہوں
تجھے جانِ جاں دیکھنا چاہتا ہوں
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں } اقبالؔ

ان تمام تضمینوں میں فنکار نے روحِ شعر کو مزید شرح و بسط کے ساتھ دل نشیں اور دل پذیر انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے اور اس طرح مصرعے لگائے ہیں کہ شعر کے تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ فن شعر کو دو آتشہ بلکہ کبھی کبھی سہ آتشہ بنا دیتا ہے۔ اقبال صاحب کا یہی فن ان کی ادبی حیثیت کو اور بھی شہرت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال صاحب کی شخصیت و فن مجموعی طور پر اس پرآشوب دور میں ایک نعمت سے بھلے ہے۔ بے شمار افراد اس چشمۂ فیض سے اکتساب نور کرتے ہیں۔ اور ابداً آباد تک کرتے رہیں گے۔ میں ذاتی طور پر ان کی شخصیت و فن کی عظمت و جلالت کا قائل ہوں اور ان سے عقیدت مندانہ ارادت رکھتا ہوں ان کی شخصیت و فن جتنی متنوع اور ہمہ گیر ہے اس کی مکمل آئینہ داری الفاظ و حروف کے تنگ دائرے میں ممکن نہیں۔ اس لیے اس اعتراف کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں ؎

گلچیں بہار تو زداماں گلہ دارد

غیاث کی شاعری

ایک تجزیہ

علیم اللہ حالی

کبھی کشاکش دوراں کبھی غم جاناں
عجیب رنگ یہ ہے اپنی شاعری کا مزاج

اس میں شک نہیں کہ شاعری میں یا کشاکش دوراں کا اظہار ہوتا ہے یا غم جاناں کا ——— یا ان دونوں کا۔ دراصل شاعری زندگی کی ناتکمیلیت کا اظہار ہے۔ یہ اظہار مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی، کبھی شاعر اپنی ذات یا شخصیت میں بعض صفات کے فقدان پر لاشعوری طور پر ماتم کناں ہوتا ہے اور کبھی ان کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ اس طرح شاعری غم و آلام کے بے رحم وار کو روکنے میں ایک ڈھال کا کام کرتی ہے اور کبھی زندگی میں عزائم و مقاصد کی تعمیر کرتی ہے۔ ان دونوں امور کے لئے بنیادی طور پر اس امر کی ضرورت ہے کہ شاعر اپنے فن میں آپ بیتی بیان کرے ——— لیکن یہ آپ بیتی ایسی آپ بیتی ہو جو اپنے اندر ذاتی تجربات و احساسات کے تمام تر اثرات رکھتی ہو۔ غالباً اسی وجہ سے علامہ جمیل مظہری نے کہا ہے کہ ؎

دردِ جمیلؔ اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے
شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی بیتی گاتا ہو

یہ اپنی بیتی، ذاتی درد اور نجی احساسات سے الگ ہو کر کوئی شے نہیں رہتی، پھر چونکہ ذاتی درد اور نجی احساسات بے پناہ وسعت رکھتے ہیں اس لئے "آپ بیتی" بھی اپنے اصطلاحی لفظ میں محدود ہونے کے باوجود معنوی حیثیت سے لامحدود ہے۔ یہ جب سمٹتی ہے تو دلِ عاشق بنتی ہے اور پھیلتی ہے تو زمانہ بن جاتی ہے۔ اس وسعت اور تنوع کے بعد بھی غم معتبر بہرحال ایک وحدت کا تاثر رکھتا ہے اور عظیم شاعری کسی واحد معتبر کی دین ہوتی ہے اور ہر وہ شاعر جو عظمت و رفعت کا متلاشی ہوتا ہے اس امر کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کی شاعری میں وحدت پائی جاتی ہے، احساسات کی وحدت، درد و غم کی وحدت، ذہنی حادثہ کی وحدت اور تاثر و جذب کی وحدت، غرض اونچی شاعری ان چھوٹی چھوٹی وحدتوں کی ایک رفیع و اعلیٰ وحدت ہوتی ہے۔ مگر زندگی کی ایک بڑی ٹریجڈی یہ ہوتی ہے کہ اس میں غم و آلام کا تنوع ہوتا ہے اور یہ تنوع ایک طرح کی بے چیدگی، الجھن اور بے ربطی پیدا کرتا ہے۔ اگر گہرا زخم بھی کسی ایک جذبے کا عطیہ ہو تو درد کو پورے تاثر کے ساتھ اپنے سینے سے نہیں

چھپا سکتا۔

جناب غیاث اثر کی شاعری میں بھی مجھے تعدد آلام کا شکوہ نظر آتا ہے اور جہاں یہ شکوہ نہیں ہے وہاں اس تعدد کا اظہار واقعی ہے۔ کشاکش دوراں اور غمِ جاناں اپنے اپنے اندر نہ جانے کتنے غموں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ غیاث اثر کی شاعری جگہ جگہ ان بھرپور وحدتوں کو بے نقاب کرتی ہے اور غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں سموئے ہوئے دکھوں کا اظہار کرتی ہے

ایک اور صرف ایک سلسلہ غم کی تلاش اور اس سے ذہنی ربط کی تمنا اثر کی شاعری میں بعض بڑے دلچسپ اور نئے پہلو پیدا کرتی ہے مثلاً ان کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات اسی سرچشمۂ فکر و احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کثرت سے گھبرا کر وحدت کی تلاش کرتا ہے۔ اسے یہ وحدت اپنے ماحول اور سماج میں میسر نہیں ہوتی تو وہ اوپر کی طرف رخ کرتا ہے اور یقین و گمان کے ملے جلے اثرات میں کہتا ہے کہ ؎

پسِ پردہ جلوہ فگن ہے تو کہیں دورِ منظرِ عام سے
کبھی میرے دل کے قریب آ تو اتر کے رفعتِ بام سے

اس حقیقتِ معتبر کی دوری کا جو درد شاعر کے تارِ احساس کو نئے انداز سے چھیڑتا ہے اور وہ اپنی وحدتِ منتظر کو مشخص کر کے اسے بام کی رفعتوں سے نیچے آنے کی دعوت دیتا ہے اور منظرِ عام پر لا کر اس کے وجود اور اس کی قربت کو سبھوں پر عیاں کر دینا چاہتا ہے۔ دوری کا درد، قربت کی تمنا اور جذبۂ تشخص یہ تمام کیفیات شعر میں ایک ایسے پرِ اثر ماحول کو پیش کرتی ہیں کہ قاری تو، کی تکرار کی قباحت بھی محسوس نہیں کرتا اور فکر اور جذبے کے ایک سماوی اور ملکوتی عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی سلسلۂ فکر و احساس کی نمائندگی کرتے ہیں ؎

یہ جہانِ حسن کی وسعتیں مری اک نظر میں سمٹ گئیں
کبھی تیری سمت نگاہ کی جو پہنچ کے دل کے مقام سے

کبھی مہر و ماہ و نجوم میں کبھی کہکشاں کے ہجوم میں
ترے نقشِ پا کی تلاش میں جو اتر گیا تو خفا نہ ہو

دیر و حرم تو ہیں مگر سجدۂ گر نظر نہیں
اے غمِ معتبر ٹھہر ان کی یہ رہگذر نہیں

ویرانی اور مایوسی بھی محبت کے جلوۂ صد رنگ کا ایک منظر ہے۔ یہ منظر ایسا ہے کہ اس سے قاری اس حد تک متاثر ہوتا ہے جس حد تک شاعر، اثر صاحب کے یہاں مایوسی اور ویرانی کے احساسات تجسس اور تلاش کے ساتھ ساتھ آئے ہیں اور اس چیز نے ان کی شاعری کو زیادہ فطری بنا دیا ہے۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کی ابتدا مایوسی سے نہیں کرتے بلکہ یہ تو دراصل نتیجہ ہے ان کی جستجوئے ناکام کا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ درد و کرب اور بے چینی سے عبارت ہے۔ مگر یہ سب کے سب قلبِ مضطرب اور دلِ مبتلا کا عطیہ ہیں ؎

ایک ویرانی کا آ جاتا ہے اس وقت خیال
دل کی جانب جو کبھی اپنی نظر جاتی ہے

دیکھئے فکر و احساس کس فطری قرینہ سے سامنے آنے

آتے ہیں۔ غیاث اثر کی شاعری میں جو بنیادی جذبہ نظر آتا ہے وہ یقینی طور پر سکون دل کی تلاش ہے اور یہ تو یہ ہے کہ اگر اسی حد تک محدود رہے تو پھر کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سکون دل کی تلاش تو کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں ہوتی ہے بلکہ جو شاعر نہیں ہیں ان کی زندگی کا مطمح نظر بھی یہی حصول سکون ہوتا ہے یہ تو بنیادی جذبہ ہے لیکن کسی غزل گو شاعر میں انفرادیت بنیادی جذبہ کے فرق سے نہیں آتی بلکہ اس امر سے آتی ہے کہ وہ اس بنیادی جذبۂ و احساس سے کس طرح Dealing کرتا ہے یا Dealing ——— Treatment ہی انفرادیت کا باعث بنتا ہے

غیاث اثر صاحب کی شاعری میں جذبات و احساسات کو نئے انداز سے ڈھالنے کی خوشگوار کوشش نظر آتی ہے۔ چند مختلف المفہوم اشعار سے یہ بات پورے طور پر ثابت ہو سکے گی ؎

ہم تو مدت سے یقیں کرتے چلے آئے ہیں
تم جو چاہو تو نیا وعدہ و پیماں کر لیں

میں کشاکشِ غمِ زیست سے میں سکون دل کی تلاش میں
تری رہگذر کے قریب سے جو گذر گیا تو خفا نہ ہو

کیسے کہوں مآلِ غم دار و رسن پہ ختم ہے
گیسوؤ قد کی داستاں اتنی تو مختصر نہیں

قریب آکے تجھے دیکھ لوں ان آنکھوں سے
نہ دے نہ دے دل ویراں کو دور سے آواز

آتی ہے راس کس کو محبت بھلا اثر
بس میں نہیں مگر دلِ ناداں کو کیا کروں

تری بزم مے میں اگر کبھی جو میں بے خودی میں اٹھا بھی لوں
مجھے ڈر ہے خون جگر اثر نہ چھلک پڑے کہیں جام سے

ان شعروں کے معنوی اور خارجی حسن نے انہیں انفرادیت بخش دی ہے۔ معشوق کے وعدۂ پرفریب کو مختلف شاعروں نے اپنے اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ کسی نے یہ کہا کہ ؎

تیرے ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

غالب نے طنز لطیف سے کام لیا ؎

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

کسی اور نے کہا ؎

مجھے اے دل تری جلدی نے مارا
نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی

ان تینوں شعروں میں اپنا اپنا مخصوص رنگ ہے اور بظاہر ان کے تیور مختلف ہیں۔ لہٰذا ان تینوں کا معیار کے اعتبار سے مقابلہ مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک چیز ان تینوں میں قدر مشترک ہے۔ یعنی وہ مخصوص معنوی جہت، جس کے ذریعہ یہ باہمی طور پر متمیز ہوتے ہیں۔ اب یہ صفت خاص جتنی نمایاں ہوگی شعر اسی قدر حسین ہوگا۔ اس نکتہ کی نشاندہی کے بعد جناب غیاث اثر کا یہ شعر دیکھئے ؎

ہم تو مدت سے یقیں کرتے چلے آئے ہیں

باقی صفحہ ۲۹۰ پر

غیاث اثر کا معجزۂ فن

از ——— غنی حمید زکریا بی اے قاسمی ہائی اسکول گیا

اردو ادب سے اگر نظموں کو خارج کر دیا جائے تو یقیناً ایک بہت بڑے سرمائے سے اردو زبان محروم ہو جائیگی لیکن اگر غزل کو خارج کر دیا جائے تو زبان اردو کی روح نکل جائیگی۔ غزل بقول رشید احمد صدیقی ہماری تہذیب کی آبرو ہے اور بقول علامہ جمیل مظہری غزل زبان و ادب کی جان ہے۔ یوں تو اس صنف سخن پر ۱۹۵۷ء کے دور انحطاط میں ایک ایسا بھی وقت آیا جب غزل صرف زلف معشوق کی گرہ گیریوں میں الجھی ہوئی تھی مگر جیسے جیسے ملک و ملت کے مضمحل اعضاء میں توانائیوں کی لہر دوڑی اردو غزل میں بھی نئی روح حلول کرنے لگی۔ اسے نئی ہوا اور تو انا زندگی بخشنے میں یوں تو بہت سارے شعراء نے حصہ لیا لیکن جدید غزل کے چار ستون، فانی حسرت اصغر اور جگر کا اس صنف سخن پر جو احسان ہے وہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ موجودہ ادب میں فیض احمد فیض اور فراق گورکھپوری نے گیسوئے غزل کو اپنے شانۂ فن سے جس طرح سنوارا ہے وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ صنف سخن کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ غزل کی گردن قابل زدنی ہے یا یہ نیم وحشی صنف سخن ہے غزل پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔ غزل گو شعراء کا کارواں اتنا عظیم ہے کہ اس بھیڑ میں کسی واحد فنکار کو پہچاننا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ عام طور پر غزل کا موضوع یکساں ہے مگر صرف طبائع کے اختلاف سے یقیناً انداز بیاں میں کچھ فرق آجاتا ہے۔ مگر صرف انداز بیان کے اختلاف سے کسی فنکار کی عظمت نمایاں نہیں ہوتی تا وقتیکہ اس کے لب و لہجہ میں ندرت اور فسوں گری نہ ہو۔ غیاث اثر کی غزلوں کو دیکھ کر چونک جانے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہی چونکا دینے والا لب و لہجہ اس امر کا ثبوت ہے کہ غیاث اثر کی غزل گوئی اپنی انفرادیت کی منزل حاصل کر چکی ہے۔ ایمائیت کی جادوگری غزل کو روح عطا کرتی ہے۔ عشق کا جذبہ جب اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے اور عاشق اپنے احساسات و جذبات کو جامۂ شعر میں ملبوس کر کے اور سنوار سجا کر پیش کرتا ہے تو ایسی شاعری جادوگری بن جاتی ہے چنانچہ غیاث اثر کا یہ شعر کچھ اسی قسم کا ہے ؎

وہ تو کہئے شوق جنوں مرا میرے ہر قدم پہ رہا بہر
کہیں نقش پا کا نشاں نہیں کوئی تیرے حسن خرام سے

غیاث اثر اپنے تصور میں جس حسن کو دیکھ رہے ہیں اس کی تلاش میں وہ اس لئے سرگرداں ہیں تاکہ اپنے تصور کے حسن کو مجسم دیکھ لیں اس بے تابانہ کیفیت کو وہ اس طرح شعر کا جامہ پہناتے ہیں ؎

ابھی میرے شوق نگاہ کو ہے تلاش جلوۂ معتبر
ہیں ہزاروں نقش حسین ابھی جو مری نظر میں ہیں خاک سے

غزل میں ہمیشہ تشبیہ و استعارات سے کام لیا گیا ہے جس کے بغیر اس کی عمارت میں جلال و جمال پیدا ہی نہیں ہو سکتا لیکن حالات و ظروف کے پیش نظر ہمیشہ اشارے کنائے، تلمیحات و

تشبیہات کے مفہوم میں تبدیلی ہوتی رہی ہے آج کے جو حالات ہیں اس کی ترجمانی غیاث اثر نے کیا خوب کی ہے

ہماری ناکامیوں کو دیکھو چمن کی ویرانیوں کو دیکھو
ذرا کوئی باغباں سے پوچھے یہی ہے فصل بہار آخر؟

آزادی سے پہلے جس حسین خواب کو دیکھ کر لوگ آتش نمرود میں کود پڑے تھے اس خواب کی جو تعبیر سامنے آئی اس کی نہایت کامیابی کے ساتھ اس شعر کی عکاسی کی گئی ہے۔

غزل میں معاملات حسن و عشق کا بیان ہر شاعر نے کیا ہے مگر غیاث اثر کی محبت کا عالم ہی کچھ اور ہے یہ خود سپردگی کے جذبات سے کنارہ کش رہتے ہیں محبت کی قربان گاہ پر اپنی خودی کی بھینٹ چڑھانے کے لئے آمادہ نہیں۔ مندرجہ ذیل مطلع کی تشریح پوچھئے تو لفظوں میں نہیں کی جا سکتی صرف اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کے جمال و جلال سے حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ راس آیا محبت کو بندگی کا مزاج
بدل سکو تو بدل دو میری خودی کا مزاج

اثر نے مندرجہ ذیل شعر میں گرد و پیش کے حالات کا کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے ملاحظہ ہو۔

چمن میں صورت شبنم وہی ہیں بیگانے
سمجھ رہے ہیں جواب تک کلی کلی کا مزاج

حقیقت یہ ہے کہ زمانے میں کچھ ایسا انقلاب آیا ہے کہ جو لوگ دوربین و دور اندیش اور صائب الرائے ہیں وہ زمانے کی قیادت اور سعادت سے الگ کر دیئے گئے ہیں اور اس عہدۂ جلیلہ پر وہ لوگ فائز ہیں جو کور دیدہ اور کور باطن ہیں نتیجہ زوال آمادگی کے سوا کچھ بھی نہیں ایسے بگڑے ہوئے ماحول کی عکاسی شاعر نے جس فنکارانہ انداز میں کی ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

دل کی دنیا عجیب ہے۔ مسرت کے جذبات جب اس میں مدتے ہیں تو یہ آباد نظر آتی ہے اور جب اس پر غم و آلام کے بادل چھاتے ہیں تو رجائیت پسندوں میں ایسا جذباتی احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ درد و غم کو مغلوب کرنے کی جد و جہد میں لگ جاتے ہیں مگر قنوطی فطرت کے حاملین مایوسی کے قعر عمیق میں لڑھک جاتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں مگر زندگی کا ایک حادثہ ضرور ہے اور شاعر اس حادثے کی ترجمانی جب اپنے حسین انداز بیان میں کرتا ہے تو اس کے انداز بیان کی داد دینی ہی پڑتی ہے مایوسی کے عروج کا نقشہ غیاث اثر نے کتنے کامیاب انداز میں کھینچا ہے۔

؎ ایک ویرانی کا آجاتا ہے اسوقت خیال
دل کی جانب جو کبھی اپنی نظر جاتی ہے

دیر و حرم کی اصطلاح غزل گو شعراء میں عام ہے اور اس موضوع کی پامالی اسقدر اظہر من الشمس ہے کہ کسی کا کوئی شعر دامن کو اپنی جانب نہیں کھینچتا لیکن اس ضمن میں غیاث اثر نے ایک ایسی راہ نکالی ہے جس کے حسن و جمال کو دیکھ کر نظر خیرہ ہو جاتی ہے ؎

دیر و حرم تو ہے مگر سجدہ گہہ نظر نہیں
اے غم معتبر ٹھہر ان کی یہ رہ گذر نہیں

معشوق کا روائتی جور و ستم مشہور ہے غیاث اثر ایک ایسے عاشق ہیں جو غم میں بھی نشاط محسوس کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے ہی معشوق کا جھنجھلانا فطری امر ہے اس لئے کہ اس کی ساری ستم رانی کا مقصد عاشق کے دل کو جلانا ہوتا ہے غیاث اثر کے نشاط غم کا ردعمل معشوق پر اور معشوق کے احساسات کا ردعمل شاعر پر جو ہوا اسے کسی فنکارانہ انداز میں اثر نے بیان کیا ہے ؎

میرا نشاط درد انھیں ناپسند ہے
اے زندگی بتا غم جاناں کو کیا کروں

غیاث اثر نے حسن و عشق کی واردات کو جہاں نئے نئے انداز میں بیان کرکے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے وہیں سیاسی حالات کو غزل کے سانچے میں ڈھال کر اپنے دور کے شعراء میں موصوف نے ایک نمایاں حیثیت بنائی ہے مندرجہ ذیل تین اشعار نمونتاً پیش کر رہا ہوں اس قسم کے بے شمار اشعار جا بجا اثر کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں ؎

بنایا بلبل رنگین نوا کو ہم زباں ہم نے
چمن والوں پہ ظاہر کر دیا درد نہاں ہم نے

وفور شوق میں اے دل یہ کس منزل پہ آ پہنچے
غبار راہ کو سمجھا تھا شاید کارواں ہم نے

خدا جانے کہاں لیجائے گی ان کی یہ گمراہی
بنایا ہے جنہیں اپنا امیر کارواں ہم نے

غیاث اثر میری نظر میں ایک کامیاب پختہ غزل گو شاعر ہیں جنکی غزلوں میں عصری رجحانات جا بجا ملتے ہیں موصوف داخلی و خارجی معاملات کو ایک ایسے لب ولہجہ میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا بے ساختہ متوجہ ہو جائے۔ کسی غزل میں اگر دو تین اشعار بھی قابل قدر سمجھے جاتے ہیں تو شاعر اپنی محنت بار آور سمجھتا ہے لیکن محتاط نگار کہنہ مشق شاعر اپنی پوری غزل کو اس طرح خون جگر سے سینچتا ہے کہ قاری کو شاعر کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔ ڈاکٹر غیاث اثر کی یہ غزل اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔

بکھیر دے رخ ہستی پہ اپنی زلف دراز
الجھ گیا غم دوراں سے عشق کا انداز

قریب آ کہ تجھے دیکھ لوں ان آنکھوں سے
نہ دے نہ دے دل ویراں کو دور دور سے

ہزار کرتی ہے شبنم گلوں کی غمازی
کھلا نہ باد صبا پر چمن کا کوئی راز

وہ خار ہوں جو کھٹکتا ہو چشم گلچیں میں
کلی کلی کا چمن میں رہا ہوں میں ہمراز

سسکتی شمع ہے اور جل بجھے ہیں پروانے
کہاں وہ گرمی محفل کہاں وہ سوز و گداز

خبر کچھ اپنی نہ تیری ہے ان دلوں اے دوست
شکست دل سے بھی آتی نہیں کوئی آواز

فریب خوردہ نگاہیں وہ وسعت صحرا
خرد کو بھی میں سکھاؤں جنوں کے کچھ انداز

خدا کرے کہ نشیمن سے دل نہ ہو مانوس
چھٹا ہوں لیکے قفس سے ہی طاقت پرواز

یہ کہہ کے اٹھ گیا آخر اثر بھی محفل سے
مجھے تو راس نہ آئے گی تیری بزم ناز

بقیہ :- ذکی انجم

کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور اپنے عزم و ارادہ کی مشعل شب تاب لئے ہوئے کامرانی و ظفرمندی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

ذکی انجم اول و آخر غزل گو شاعر ہیں ویسے انھوں نے قطعات بھی کہے ہیں۔ مگر ان کا اصلی رنگ غزل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ زور زبان نگارش حاصل ہوتے ہوئے بھی ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات میں اب تک اجتماعی دکھ درد کی شان پیدا نہیں ہوسکی ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جس پر انھیں سنجیدگی سے غور کرنا ہے ویسے میں ان کے فکر و فن سے مایوس نہیں۔

ڈاکٹر غیاث اثر

اپنی شخصیت کے آئینے میں!

شاغل قادری

شاید ۱۹۵۰ء کے کسی ماہ کا واقعہ ہے کہ میں ریلوے کالونی سے ناتھ نگر کے لئے جو راستہ نکلتا ہے اس پر ایک دن جا رہا تھا جیسے ہی ناتھ نگر کے سرحد پر قدم رکھا تو شمال کی جانب ایک نئے مطب پر نظر پڑی ڈاکٹری وضع قطع اور ڈسپنسری کی سج دھج سے اندازہ تو کیا کہ یہ کسی ایلوپیتھ کا مطب ہے۔ لیکن یہ ڈاکٹر صاحب کون ہیں کہاں سے آئے ہیں؟ یہ سوالات میرے ذہن و دماغ میں گونجنے لگے میں نے حمید رسمی صاحب کو ڈسپنسری میں ڈاکٹر صاحب سے باتیں کرتے دیکھا اور کتاب منزل کی طرف چلا گیا چند رسائل خریدنے کے بعد پان کی دکان پر رکا تو جناب حمید رسمی کو آتے دیکھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر غیاث احمد ہیں، جنکے ایک بھائی وارث صاحب جج کے عہدہ پر ہیں اور والد بزرگوار کٹیہار میں وکیل ہیں ویسے باشندہ محلہ یحییٰ پور شیخ پورہ ضلع مونگیر کے ہیں رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے کچھ احباب کے مشورہ سے انجمن "فلاح المسلمین" قائم کی ہے اور چاہتے ہیں کہ اس انجمن کے ذریعہ فلاح کا کام شہر میں ہو۔ اس وقت بزم سخن کے علاوہ کوئی مسلم ادارہ نہ تھا جان نکہ اس ادارہ کو بھی مسلم ادارہ کہنا غلط تھا اس زمانہ میں ایک سے زیادہ ہندی کے شعرا اردو میں طرحی غزلیں بزم سخن کے مشاعرہ میں پڑھتے تھے اسطرح سے بزم سخن کو قومی یک جہتی کا اولین ادارہ کہا جا سکتا ہے۔ خیر تو ڈاکٹر اثر رفتہ رفتہ بزم سخن کے قریب ہوتے گئے اور جب یہ راز کھلا کہ حضرت نرے ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ شاعر بھی ہیں تو ارباب سخن کو بڑی مسرت ہوئی کچھ دنوں تک تو اہل شہر میں چہ میگوئیاں رہیں کہ ڈاکٹر غیاث احمد صاحب کی ڈاکٹری کو انکی شاعری لے ڈوبے گی مگر غیاث اثر نے ثابت کر دیا کہ چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہ سکتی ہے اب تنقیص کرنے والے نگاہ حسرت سے غیاث اثر کے مطب کی طرف دیکھتے ہیں جہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور شام کے وقت تھوڑی دیر کے لئے وہی ڈسپنسری گوشۂ ادب بن جاتی ہے جس میں ڈاکٹر ناصر نواب ناصر رضا گاہے ڈاکٹر سید احمد حسن، محی الدین غنی، حکیم مولوی عبدالباقی حکیم پورینوی، مسعود آروی، عبدالمجید صاحب وغیرہ علم و ادب کے گہر ہائے گراں مایہ لٹاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، مے کدہ کے بعد شہر بھاگلپور میں یہ دوسری جگہ ہے جہاں صاحبان علم و دانش کا مجمع لگا رہتا ہے۔

ڈاکٹر غیاث اثر ۲۹ر اگست ۱۹۲۲ء میں محلہ یحییٰ پور شیخ پورہ ضلع مونگیر میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر سے کٹیہار میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہنے لگے اثر کے والد حضرت الحاج مولوی امیر الدین صاحب وکیل مد ظلہٗ کٹیہار میں صرف وکالت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایک سرگرم قومی خادم کی حیثیت بھی آپ کی تھی، سماجی، دینی، ادبی، ہر شعبہ حیات میں آپ اچھے نقش قدم دیکھیں گے۔ یہاں تک کہ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر آپ

نے رام کرشن کے انتقال کیا اور اس قسم کے دوسرے ادارے سے بھی دلچسپی لی مثلاً اکیڈمی کے بیس سال تک سکریٹری رہے۔ میونسپل بورڈ کے وائس چیرمین بھی تھے۔

اثر نے ۱۹۳۹ء میں منشوری اکیڈمی سے میٹرک پاس کیا اس زمانے میں حضرت قوس بھاگلپوری مرحوم کا کٹیہار میں طوطی بول رہا تھا۔ مشاعرے ہر ہفتہ ہوتے تھے جس کی صدارت اکثر اثر صاحب کے والد کیا کرتے تھے۔ مشاعرہ کی مسلسل شرکت اور والد کی تربیت نے اثر کو شعر و سخن کا دلدادہ بنا دیا۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک اثر پٹنہ میں رہے جہاں سے آئی۔ ایس۔ سی۔ اور پھر ایم۔ بی بی ایس۔ کیا اس طرح پٹنہ کا صحت مند ادبی ماحول بھی ملا جس کا اثر نے پورا فائدہ اٹھایا ادبی محفلوں میں شرکت کی اور اپنے تعلیمی ادارہ میں ادبی ہماہمی برپا کرتے رہے جس میں ڈاکٹر سید ندیم امام اثر کے ہمیشہ معاون رہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد یوپی میڈیکل سروس میں منسلک رہے دو ... تک رہے پھر ملازمت ترک کر کے فروری ۱۹۵۰ء میں بھاگلپور آگئے۔

بھاگلپور آتے ہی انجمن فلاح المسلمین جیسا ادارہ قائم کیا اور بزم سخن سے بھی قریب تر ہوتے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں بھاگلپور سے کیر تبادلہ کے زمانے میں بزم سخن میں جو عارضی تعطل واقع ہوا تو غیاث اثر نے انجمن فلاح المسلمین کا ایک ذیلی ادارہ شعبہ ادب کے نام سے قائم کیا اور میری موجودگی میں مجھے اس انجمن کا جنرل سکریٹری مقرر کر دیا۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر یہ کام انتہائی محبت سے کیا تھا اور میں بھی انتہائی سادگی سے کچھ نہ کر سکا پھر یوم غالب، یوم شاد، یوم یاس۔ اور سلامتی بو... کی ہماہمی رہی جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اگر کسی کو تفصیل

جاننے کا ذوق ہو تو ڈی۔ ایس۔ کالج کٹیہار کی بزم ادب کا شائع کردہ کتابچہ بنام "ترس" پڑھئے جس میں ناچیز کی مثنوی اسی موضوع پر ہے۔

غیاث اثر محتاط نگار، خوش فکر، اور خوش گو شاعر ہیں، تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اقبال نے تو لوگوں کے اعصاب پر عورت کو سوار کیا تھا مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس عہد کے شعراء کے اعصاب پر اقبال سوار ہے۔ غیاث اثر نے بھی بسم اللہ کرتے وقت اقبال کے رنگ سخن کو اپنانے کا ارادہ کیا اور دو چار قدم اسطرف بڑھے بھی مگر فوراً سمجھ گئے کہ اس کوہ گراں سے سر ٹکرانا لاحاصل ہے۔ شعور کی اس بیداری نے غیاث اثر کو وہاں تک پہنچنے کے لئے خود شدہ راہ بنانے کا عزم و ارادہ عطا کیا، اور آج ان کا رنگ، آہنگ ایسا ہے جسے پہچاننے والے دور سے پہچان لیتے ہیں۔

غیاث اثر خوش اخلاق، ملنسار، وفا شعار، دوست، اہل علم کے قدر داں اور صلح کل مشرب رکھنے والے ایک ایسے انسان کا نام ہے جو خلق اللہ کی خدمت میں صرف ڈاکٹر کی حیثیت ہی سے معروف نہیں ہیں بلکہ ان کا ایک سیاسی مسلک بھی ہے جس ماحول میں وہ سانس لے رہے ہیں اس کو سمجھتے ہیں، زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کا کھلا نعرہ بلکہ عمل کی دنیا میں ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں جس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی اپنے اپنے مذہبی عقائد پر سختی سے عمل کرتے ہوئے اتحاد و اتفاق کے پرچم کو سربلند رکھ سکیں۔ غیاث اثر پیدگی و صحیح پر گوشہ نشین رہنے کے قائل نہیں ہیں وہ ڈاکٹر ہیں اور یہ خوب سمجھتے ہیں کہ صرف اپنا گھر صاف ستھرا رکھنے سے وبائی امراض دبائے نہیں دبتے اسلئے گلی کوچوں اور دوسرے کے گھر والوں کو صفائی پر بھی تلقین دیتے ہیں۔

تاتار پور مارکیٹ ایسوسی ایشن، انجمن ترقی اردو، حلقۂ ادب، پرجا سوشلسٹ پارٹی شاخ بھاگلپور ہر جگہ غیاث اثر کے اثرات کی چھاپ نمایاں طور پر ملیگی، میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ بھاگلپور والے کیا سمجھتے ہیں مگر وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غیاث اثر خود کو بھاگلپوری سمجھتے ہیں اور اس شہر کی علمی، ادبی، سیاسی، اور معاشرتی، فضا کو پر بہار بنانے کی تڑپ اپنے دل میں بدرجۂ اتم رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اثر نے مختلف ادبی، اور مذہبی، انجمنوں کا صدق دل سے ساتھ دیا دارالمطالعہ قائم کئے، مشاعروں کے ذریعہ اردو کو ہر دلعزیز بنانے کی جد و جہد میں بزم سخن کے کام میں ہمیشہ معاون رہے۔ انجمن ترقی اردو، رویت ہلال کمیٹی، وغیرہ میں اہم کردار ادا کیا اور مدتوں ان اداروں کے عہدہ دار رہے، مردم شماری کے زمانے میں اردو دانوں کی خانہ پری کو صحت مند طریقہ سے کرانے کے لئے آپ نے بڑی محنت کی جب بہار یونیورسیٹی بین بنگلہ اور اردو زبانوں میں امتحانات کو بند کرنے کا قانون منظور کیا گیا تو مادری زبان حفاظتی کمیٹی کی تشکیل میں دوسرے شہریوں کے ساتھ غیاث اثر نے بڑھ چڑھ کر تعاون کیا اور اسکو کامیاب بنایا بھاگلپور کی میڈیکل ایسوسی ایشن سے بھی آپ کو گہری دلچسپی ہے۔ قدیم بزم سخن کے یہ کبھی باضابطہ رکن نہیں ہوئے مگر اس کے ہر کام میں معاون رہے اور انشاء اللہ ہمیشہ معاون رہینگے مریضوں کے ہجوم کے سبب مشاعروں میں آجکل بہت کم شریک ہوتے ہیں۔

بقیہ ڈاکٹر غیاث اثر

تم جو چاہو تو نیا وعدہ و پیماں کر نیں

اس شعر میں معشوق کے وعدۂ فردا کے لئے مدت سے یقین کرتے رہنا اور پھر معشوق کے چاہنے کی شرط پر نئے وعدہ و پیماں باندھنے کا ارادہ کرنا بہت سے دلچسپ اور تہہ دار معنوی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے ــــــ

اسی طرح شاعر موصوف کے محولہ بالا دیگر امثلہ (ب، ج، د، ہ اور و) میں اظہار و بیان کی ندرتیں نظر آتی ہیں۔ ان اشعار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لینا آسان ہے کہ غیاث اثر کی شاعری مستقبل میں بہتر توقعات کی یقین دہانی کرتی ہے۔ غزل بہت باریک اور لطیف فن ہے۔ اس فارم میں خیالات کو پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ اندیشہ ہر وقت موجود رہتا ہے کہ اگر خیال پورے تاثر اور چابکدستی سے بیان نہ ہوا ہو تو قاری اور ناظم کا رشتہ ٹوٹ جائیگا غزل کے اشعار میں شاعر کے جذبات و خیالات کا اظہار ہی کافی نہیں ہے بلکہ قاری پر ان کی ترجمانی بھی ضروری ہے۔

غیاث اثر کی شاعری ان کے تہہ در تہہ احساسات کی مکمل ترجمانی کرتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مکمل اظہار پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں ــــــ

مشتاق علی شاہد

از ناطق قادری

میرے منجھلے ابا حضرت شاغل قادری مدظلہ کا حکم ہے کہ میں اپنے دوست مشتاق علی شاہد کی شخصیت پر کچھ لکھوں۔ میری مجال کہاں کہ اس حکم نامہ کو ٹال دوں پھر بھی یہی کہ اس کی تعمیل میں لذت ہی لذت رہی۔ صاحب گنج ضلع سنتھال پرگنہ میں میرے لئے کوئی کشش نہ تھی وہاں منجھلے ابا کی سرپرستی میں مقامی [illegible] زیر تعلیم تھا عام طور پر میرے ہم جماعت کچھ ایسی مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ جن سے مجھے مل کر کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی تھی۔ تلاش تھی کسی ایک ساتھی کی جو ادبی ذوق رکھتا ہو اور زندہ دل ہو۔ مشتاق علی شاہد سے جیسے جیسے میں قریب ہوتا گیا میں نے محسوس کیا کہ جس کی مجھے تلاش تھی وہی شخصیت ہے، ہنس مکھ چہرہ، توانا جسم، تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی سیرت اور ادبی ماحول کا تربیت یافتہ ذہن مجھے شاہد کے روپ میں ملا۔ ہم ایک ساتھ رہنے لگے۔ صاحب گنج کی زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگے۔ شعر گوئی کا شوق مجھے بچپن سے تھا جس کے اظہار کرنے کی جرأت منجھلے ابا کے سامنے اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ ایک مرتبہ اسی قسم کی جرأت رندانہ پر بڑے بھائی جان جناب حسن عسکری کو ڈانٹ پلائی جا چکی تھی۔ شاہد نے میری شاعری کا ذکر ایک دن منجھلے ابا کے سامنے چھیڑ ہی دیا اتفاقاً میں نے بھی شاہد کا پول کھول دیا کہ یہ حضرت بھی آزاد شاعری کے دلدادہ ہیں اس طرح وقتاً فوقتاً ہم دونوں کو منجھلے ابا کی رہبری کا اعزاز بھی حاصل ہوتا رہا۔ مشتاق شاہد فطری شاعر ہے یہ [illegible] ذوق سے نا واقف تھا تب بھی شاعری کرتا تھا آغاز شاعری آزاد نظموں سے اس نے کی مگر مشاعروں میں [illegible] کرتے کرتے [illegible] غزل میں بھی اچھی خاصی کرنے لگا اور اب نئی نسل [illegible] جدیدیوں کے قافلہ سالاروں میں ایک ممتاز غزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدیدیوں کا جدید، مجموعۂ کلام جو [illegible] کے نام سے شائع کیا گیا ہے جس میں انکا بھی کلام ہے۔

مشتاق شاہد کے ساتھ میں دو سال تک صاحب گنج میں تھا اس کے گھر بھی گیا، وہ بھی میرے گھر آیا [illegible] ہم دونوں گھل مل گئے جیسے کہ ایک ہی خاندان کے افراد ہوں [illegible] والد جناب محمد علی صاحب بھی مجھے [illegible] مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح [illegible] آئی۔ ایس۔ سی۔ کے بعد میں نے [illegible] کالج میں داخلہ لیا اور مشتاق علی شاہد ٹی، ان، بی، کالج بھاگلپور چلے آئے جہاں سے بی۔ اے۔ اور پھر "لا" انگریزی میں (بی ایل) کرنے کے بعد اپنے وطن پاکوڑ (PA KUR) میں وکالت کرنے لگے۔ مشتاق علی شاہد کی ذہنی تربیت میں ان کی والدہ محترمہ کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے ابتدائی تعلیم بھی دی اور تربیت بھی کی۔ شاہد کو ادبی ذوق اگر کہا جائے کہ وراثت میں ملا ہے تو غلط نہ ہوگا ان کے ماموں ڈاکٹر [illegible] جو دنیائے ادب کے جانے پہچانے افسانہ نگار اور نقاد ہیں۔ دوسرے ماموں جمیل الرحمن صاحب جمیل اچھے شاعر ہیں۔ شاہد بھی جہاں ہر صنف سخن میں طبع

باقی صفحہ ۲۹۵ پر

مشتاق علی شاہد

فن اور فکر کے آئینہ میں

لطف الرحمن

ترقی پسند تحریک جب اپنے زوال سے ہمکنار ہوئی اور اردو شعراء مارکس اور لینن کی نعرہ بازی سے اکتا گئے تو انہوں نے اپنے جذبات واحساسات اور زندگی کے نو بنو اور گوناگوں اور نئے نئے تقاضوں کی ترجمانی و آئینہ داری کے لئے ادب وفن کی نئی سمتوں کی جستجو کی ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا حادثہ اس برصغیر میں انسانیت کا سب سے بڑا المیہ بن کر آیا۔ اس وقت انسانوں نے صدیوں کی مذہبی اخلاقی تہذیبی اور انسانی قدروں کو بالکل فراموش اور اپنے اندر کے حیوان کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ آسمان کی نگاہوں نے اور زمین کی دوسری تمام مخلوقوں نے انسانوں کے اندر بسنے والے حیوانوں کا ننگا ناچ دیکھا۔

سیتا کی مقدس دھرتی پر دادن کا ننگا ناچ ہوتا رہا اور رحمت عالم کے عقیدتمندوں نے اپنے پڑوسیوں دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ساری اسلامی قدریں پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ سعدی نے ایسے ہی موقع کے لئے کہا ہے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

اس عظیم ترین انسانی المیے کے نتیجے کے طور پر برصغیر کے تمام اذہان وقلوب کم وبیش تشکیک، بے یقینی مایوسی، کلبیت اور نامرادی وناکامی کے شکار ہو گئے اس نفسیات عام کا اظہار تقسیم ہند کے بعد کے تمام ادبا وشعراء کے یہاں مکمل طور پر موجود ہیں۔ ہندوستانیوں کو ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے جتنا دھکا دوسری جنگ عظیم نے نہیں پہنچایا تھا اس سے کہیں زیادہ قیامت خیزی کا شکار تقسیم ہند نے کر دیا اس لئے کہ یہ آگ اپنے دامن کی آگ تھی۔ اس تمام مذکورہ بالا قدروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ دامن کی آگ تھی۔ اس تمام مذکورہ بالا قدروں کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ دامن کی اس آگ کا اثر کم وبیش بارہ تیرہ برس ہندوستانی فنکاروں پر رہا۔ لیکن وقت کی جبریت نے آہستہ آہستہ مرہم کا کام کیا [illegible] زخم بھی مندمل ہوتا چلا گیا لیکن آزادی کے بعد اس طویل عرصے میں عالمی سطح پر جو سیاسی تہذیبی علمی ادبی انقلاب وتغیرات آئے انہوں نے پورے عالم انسانی کی نسل کو متاثر کیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے اپنے سامنے موضوعات وافکار و اسالیب بیان کی جہاد سے گھٹن، پیچیدگی اور بے کیفی محسوس کرنی شروع کی، انسانی نفسیات روز بروز پیچیدہ تر ہوتی گئی اور

جذبات واحساسات میں بھی شدیدگی پیدا ہوئی۔ زندگی
کے اس عملی ارتقائی نے اظہار کے لئے نئے اسالیب
کی تلاش فطری تھی۔ ہر دور اپنے اظہار کے لئے ایک
مخصوص اسلوب وانداز کا متقاضی ہوتا ہے۔ ہمارے
شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نفسیاتی کشمکش اور بے
حد تنوع اور وسیع وعریض مشاہدات وتجربات اور
محسوسات ومطالعات کے اظہار کے لئے نئے اسالیب
کی تلاش میں کامیابی حاصل کی۔ آج اس انداز شاعری
کو نئی شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

آج ہمارے ادب میں یہ نئی شاعری خصوصی
طور پر موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ ہمارے ناقدین
وفنکار اس کے متعلق متضاد نظریات پیش کرتے
ہیں جن سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔ میں ایماندارانہ
طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ ادب کا نیا رجحان ومیلان
خاص اہمیت وحیثیت کا حامل ہے۔ اسے کسی بھی
طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندہ ادب وہی ہے
جس میں بدلتے ہوئے حالات وحادثات ونفسیات
واذہان کی ترجمانی ہو۔ آج ہمارا عہد حسن تیزی کے ساتھ
ارتقائی راہ پر گامزن ہے اور صدیاں جس طرح لمحوں
کے دوش پر بھاگ رہی ہیں۔ ان کی ترجمانی کے لئے
کلاسیکی اسلوب بیان مکمل طور پر ہمارے کام نہیں
آسکتا۔ کسی نئے اسلوب اور ذریعہ اظہار کی یقیناً
ضرورت تھی جو شکر کہ ہمارے عہد کو مل گیا ہے۔ زندگی
کے ان نئے تقاضوں کی کامیاب ترجمانی کرنے والوں
کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے جن میں
مشتاق علی شاہد کا نام بھی خاص وزن اور اہمیت
رکھتا ہے۔

مشتاق علی شاہد کی پرورش وپرداخت والدہ
کے زیر تربیت ہوئی جو اردو کے مشہور نقاد اور افسانہ
نگار ڈاکٹر شکیل الرحمن کی بڑی بہن ہیں۔ یہ خاندان
ہمیشہ سے علم ودانش اور ادبیات کا دلدادہ رہا ہے
اس لئے مشتاق علی شاہد کو ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے
اپنی تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے کچھ عرصہ بھاگلپور میں
بھی گذارا۔ یہاں کے ادبی ماحول نے ان کے شاعرانہ
ذوق کو جلا بخشنے میں بڑا حصہ لیا۔ شاہین غازی پوری
شمس لزماں جہاں پھلواروی، محی الدین تمنیٰ، شاغل قادری
حکیم عبدالباقی حکیم پورینوی، صمد حمیدی، ڈاکٹر عنایت
اثر، محمود واجد، پروفیسر مظفر اقبال، وغیرہ کی صحبتوں
میں ان کا ادبی ذوق نکھرتا اور سنورتا رہا جس کو پروفیسر
ڈاکٹر احمد حسن کی رہبری نے خوب تر کرنے میں خوشگوار
حصہ لیا۔ نتیجے کے طور پر جدید شعراء کی صف میں وہ یہ
کہ صرف جانے اور پہچانے ہی نہیں ہیں بلکہ ایک باوقار
مقام رکھتے ہیں جس کا ثبوت ان کی گرانقدر تخلیقات
کی اردو کے موقر جریدوں میں اشاعت پذیری بھی
ہے۔ نئے نام میں ان کی شمولیت بھی ان کے عظمت
فن کا پتہ دیتی ہے۔

شاہد غزل اور نظم دونوں صنفوں میں کامیابی
کے ساتھ اپنے محسوسات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی
غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ نیا آہنگ
اور نیا لب ولہجہ بھی موجود ہے۔ وہ ہمیشہ نئے آفاق
اور نئی دنیاؤں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔
خود کہتے ہیں۔

مقصد ہائے رنگ و نغمہ توڑ کر

اک نئی دنیا کوئی پیدا کرے

لیکن وہ اس نئی دنیا کی تلاش بھی ایک سلیقے کے ساتھ کرتے ہیں اور رہبر فن کی اہمیت کے قائل ہیں ـــ فرماتے ہیں

اس کی قسمت میں کہاں منزل نصیب

راہبر ہے جو کوئی الجھا کرے

اس لئے ان کی غزلوں میں جدید و قدیم کا ایک امتزاج ملتا ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار ہیں

کوئی بھی ایسا مجھے ملتا نہیں

میری خاطر جو دردِ دل دا کرے

چھیڑنا ہرگز نہ شاہد کو کبھی

جب وہ پچھلی رات کو رویا کری

کیا ہم نشیں سنائیں تجھے بے بسی کی بات

آنسو مچل مچل گئے اک شرہستی کے بعد

سننے میں بات آئی ہے اللہ خیر ہو

رہبر بنا ہوا ہے کوئی رہزنی کے بعد

پہلی کرن نکھرتے ہی صبح بہار کی

لائی ہے روشنی کی خبر تیرگی کے بعد

ان اشعار میں شاہد کا فن مکمل طور پر جلوہ گر نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لئے مزید مثالوں کی ضرورت ہے لیکن ان کی غزلیں فی الحال دستیاب نہیں۔ بہر کیف ان اشعار سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر باتیں کہی ہیں مذکورہ بالا اشعار شاہد کے فنی شعور، نزاکتِ احساس اور ندرتِ طبع کے شاہد ہیں۔

مشتاق علی شاہد ـــــــ اپنی نظموں میں غزلوں کی نسبت زیادہ جدید نظر آتے ہیں۔ نظم نگاری میں ان کا اسلوب مکمل طور پر ان کے جذبِ احساس سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیات کسی فنکار کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ان کی نظموں میں علامیت و رمزیت کی دلکش معنی آفریں اور حسین و جمیل کیفیتیں ملتی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ انہوں نے علائم و رموز کو جذب و احساس کی گرمی اور فضائیت بخشدی ہے اسی لئے ان کی نظموں میں سطحی جذباتیت کے بجائے لطیف تاثراتی کیفیت موجزن ہوتی ہے اور ایک بہت ہی ثقیف، مترنم انداز و آہنگ بھی۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ریت محل (مطبوعہ آئینہ بمبئی) پیش کی جاتی ہے

ننھا سا ایک ریت محل

ساحل پانی جھاگ

روشن روشن کرنیں

نکھرا نکھرا چاند

بھینی بھینی خوشبو

دھیمی دھیمی آنچ

اوٹ میں کالے بادل کی

چاندا بھی گم ہو جائے گا

موجیں اپنا سر پٹکیں گی

اور کفِ افسوس ملیں گے

ان کے لمبے لمبے ہاتھ

ریت محل کی پائیداری

ریت کے ذریعے وصول عبار

نظم کے عنوان میں جو رمزیت ہے وہی موضوع اور اسلوب میں بھی ہے۔ اس طرح یہ نظم موضوع اسلوب اور عنوان ہر جہت سے بہت ہی امتزاجی انداز میں ہم آہنگ و مربوط ہے۔ شاہد کے اسلوب کی یہی خصوصیت ان کی دوسری نظموں میں بھی ملتی ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ غزلوں کے اعتبار سے اپنی نظموں میں شاہد زیادہ جدید اور نئے آہنگ اور لب و لہجے کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ندرت فن بھی ہے اور جدت طبع بھی اور نئے عہد کے نئے حالات کا احساس بھی۔ اس لئے ان کی نظم نگاری کا پہلو ان کی غزلوں سے زیادہ منور اور اجاگر ہے۔ مجموعی طور پر وہ نظم کے زیادہ کامیاب اور اچھے شاعر ہیں۔ پھر بھی ان کی غزلیں اپنا ایک خاص وقار رکھتی ہیں اور انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

بقیہ مشتاق علی شاہد

آزمائی کرتے ہیں وہیں ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ماہنامہ "شاعر" اور دوسرے ادبی پرچوں میں ان کی کہانیاں اور [illegible] رہتی ہیں۔ خصوصاً جدیدیت نے جب سے سر اٹھایا ہے سب نوں کے لکھنے والوں میں سے ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سماجی، معاشرتی، ادبی اداروں میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ صاحب گنج میں تھے تو بزم سخن اور لٹریری سرکل کے اہم رکن تھے۔ بھاگلپور میں قدیم بزم سخن یوتھ ایسوسی ایشن فروغ ادب، ادارۂ ترقی اردو وغیرہ جیسی بزم اور ہر سوسائٹی میں مشتاق علی شاہد اپنی صلاحیت اور خدمات کے صلے میں نمایاں رہے ہیں۔ پاکر PAKUR میں بھی انجمن ترقی اردو کی شاخ انہیں کے دم سے قائم ہے۔ جب سے وکالت کرنے لگے ہیں لائنس کلب اور دوسری اعلیٰ سوسائٹی کے بھی رکن ہو گئے ہیں۔ شاہد کے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے کے آداب ایسے ہیں کہ ایک مرتبہ بھی جو کوئی ان سے ملے گا وہ ان کا گرویدہ بن جائے گا بزم میں وہ جب پڑھنے جاتے ہیں اپنے حسن کلام اور انداز بیان دونوں کا جادو اس طرح جگاتے ہیں کہ سامعین کا مسحور ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنے دوست شاہد کی دو طرفہ کامیابی کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔ وکالت میں پہلے دن سے کامیابی نے ان کے قدم لینا شروع کر دیا۔ اور ادبی دنیا میں اس تھوڑے سے عرصہ میں وہ جس مقام پر پہنچ گئے ہیں دوسرے لوگوں کو اس منزل پر پہنچنے کے لئے برسوں کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرا دوست مشتاق علی شاہد وہ شخصیت ہے کہ ایک طرف جدید ادب کے آسمان کا ستارہ بن کر چمک رہا ہے تو دوسری طرف صالح ادب میں بھی قابل ذکر مقام کا حامل ہے۔ مجھے اپنے دوست شاعر فرد امشتاق علی شاہد سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں

جمال کی شاعری پر فارسی کا اثر

حکیم محمد یوسف

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے کسی مضمون میں پھلواری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "محافل سماع کی کثرت کی وجہ سے یہاں ہر دور میں شاعرانہ ماحول بہت اچھا رہا ہے" اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن ہی سے مسلسل جب اچھے اشعار کان میں پڑتے رہیں گے تو کچھ بھی اگر ذوق شعری طبیعت میں موجود ہے تو یقیناً ایک روز ابھر کر رہے گا۔ جمال بھی اسی خاک پاک کے ابھرتے ہوئے نونہال ہیں۔ خود ان کے والد مولوی شاہ وارث امام فلش مرحوم نہ یہ کہ صرف ایک ذی علم اور با صلاحیت انسان تھے شاعری میں مولانا تمنا عمادی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ فارسی کی استعداد بہت خوب تھی۔ فارسی اشعار ان کو بے پناہ یاد تھے۔ ظہیر فاریابی، عرفی وغیرہم کے وقائع نوک زبان تھے۔ فارسی لغت میں ایک رسالہ بھی شائع کیا تھا جو طلبہ کے لیے مفید ثابت ہوا۔

جمال نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اس طرح ادبی مذاق ان میں بچپن ہی سے پیدا ہوا جب مولانا تمنا کی محفل برہم ہوئی، تقسیم ہند کے بعد مولانا پاکستان تشریف لے گئے تو ان کے بعض ممتاز شاگرد نجم ندوی مرحوم نیز بعض دوسروں نے بھی اپنے فارسی کلام کے لیے، راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید محمد شعیب نیّر رح کی طرف رجوع کیا۔

جمال کا ہر چند بچپن تھا مگر اب شعور کی منزل میں قدم رکھ رہے تھے۔ طبیعت میں کچھ موزونی تو تھی ہی اب اشعار بھی موزوں کرنے لگے۔ اصلاح کے لئے حضرت نیّر کی خدمت میں حاضر ہوئے (وہ ان کے قریب رشتہ میں دادا ہوتے تھے) موصوف کی اصلاح کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ اشعار کاٹ کر بنانے کے قائل نہ تھے۔ ہر شعر میں جو خامی ہوتی وہ بتا دیتے اور اس کی درستگی کی طرف اشارہ کر دیتے۔ پہلے خود درست کرنے کی ہدایت کرتے پھر قدرے الفاظ کے رد و بدل سے شعر کی اصلاح کر دیتے اس کا اثر یہ ہوتا کہ ابتدا ہی سے صحیح شعور پیدا ہونے لگتا تھا۔ جمال کو بھی کچھ دنوں اسی منزل سے گذرنا پڑا۔ اور خود بقول جمال وہی شعور ہے جو اب تک دلیل راہ ہے۔

جمال کی شاعری محض پرداز فکر نہیں زندگی کا تجربہ بھی ہے جس میں خود شاعر کی زندگی بھی شریک ہے اور زمانہ بھی مبتلا ہے۔

ہر یک سے ہم دوراں سے برسر پیکار

کسے فراغ مرا کا سے سکوں بخش دے

مری طرح سے ہیں میرے بزرگ رشتہ دار
نہیں ہے سختیٔ حالات سے جنہیں فرصت

غلط ہے یہ کہ ہوئی سرد خون کی حدت
تمام مہر و کرم ہیں وہ پیکر ایثار

سبھی ہیں میری طرح سے اسیر بند بلا
تفکرات کے گھیرے میں ایک میں ہی نہیں

مگر غم زندگی کو انسان کہاں تک روئے؟
قید حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ایسی ماحول میں زندگی بسر ہوتی ہے کچھ سامان نشاط بھی چاہیے۔ ورنہ کم از کم فکر کی دنیا ہی میں کچھ ایسا سماں بندھے کہ غم دوراں سے کچھ تو نجات مل سکے۔ عالم خیال میں محفل سجے، کسی کے آنکھوں کے اشارے ہوں، فکر کا ساغر چھلکے تو کچھ دیر ہی کے لئے سہی غم دوراں سے فرصت مل جائے۔ جمال اپنا غم یوں ہی بھلانا چاہتے ہیں ——

تیری آنکھوں سے ملے گر مجھے پیغام غزل
ساغر فکر کو چھلکاؤں بھردوں جام غزل

اور یہ حقیقت ہے کہ جب شاعر محو فکر ہوتا ہے —— تو سب کچھ بھول جاتا ہے مگر عالم خیال میں نشاط کی محفل سجائیے یا شبستان عیش آراستہ کیجئے دل کی آرزو زبان پر آ ہی جاتی ہے۔

ہیں تیری بزم ناز میں ایسے بھی کم نصیب
اک رخصت نگاہ بھی جن کو ہے کم نصیب

اس بزم ہستی کا یہی عالم ہے۔ جمال کے کلام میں ایسے نمونے آپکو بہت ملیں گے مگر میں جمال کی شاعری پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا اور نہ ان کے کلام کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنی چاہتا ہوں کیونکہ جو قربت انکو مجھ سے حاصل ہے جنبہ داری کی تہمت بھی لگا سکتی ہے اس لئے یہ کام تو اوروں کے لئے چھوڑتا ہوں بلکہ ان کے کلام کے اس پہلو کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے خاص اپنے ماحول سے حاصل کیا ہے، وہ فارسی کی ترکیبیں ہیں۔

جمال نے اردو اشعار بعد میں سنے ہیں، فارسی اشعار سے ان کے کان پہلے آشنا ہوئے اس لئے پہلی چھاپ ان پر فارسی ہی کی پڑی اور جب اردو کا نام آیا تو وہ بھی غالب کے نام کے ساتھ۔ اس لئے اردو کا سبق بھی فارسی ہی کی مدد سے پڑھا۔

چستیٔ پیرہن ہوس انگیز اب کہاں
گل پیرہن ہر ایک بہ تشکیل صلیب ہے

وابستگی یہ ہائے پس ترک عاشقی
ہر اک سے پوچھتا ہوں تری انجمن کی بات

رموز زیست کی تشریح خندۂ پنہاں
نظر نظر میں لئے ہے فروغ کون و مکاں

وہ فارسی ترکیب اور بندشوں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور خوبی کے ساتھ ان کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں انہوں نے اپنی مشق جاری رکھی، اصول عروض اور زبان و محاورات کی نگہداشت کے ساتھ اگر برابر کہتے رہے تو طبیعت کا جو انداز ہے اس سے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ اپنا رنگ آپ پیدا کریں گے۔ ••

جمال پھلواروی

ایک تاثراتی جائزہ

از: شاہین غازی پوری

یادش بخیر!

آج سے پندرہ سال قبل میں نے بھاگل پور میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے قدم رکھا۔ میں نے اس رنگت جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہاں دور دور تک ادب و شعر کا چرچا نہ تھا۔ بھاگلپور آنے کے بعد چند ادب نواز شخصیتوں سے تعارف ہوا۔ انہی دنوں وہاں کے ادبی حلقوں میں ایک نئے نام کا اضافہ ہوا یا غالباً میرے آنے سے قبل ہی اس نام کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بہر نوع میرے دوست محمود واجد نے جو شاعر اور نقاد ہونے کے علاوہ مشہور افسانہ نگار بھی ہیں (ان کے افسانوں کا مجموعہ "خزاں کے پھول بہار کے دن" حال ہی میں شائع ہوا ہے) ایک نئے شخص سے تعارف کرایا "ان سے ملئے یہ ہیں سید جلال احمد فراق مجیبی پھلواروی یہ بھی شاعر ہیں اور خوب کہتے ہیں" جہاں تک ان کے شاعر ہونے کا تعلق ہے وہ میں نے ان کے چہرے مہرے سے اندازہ لگایا تھا البتہ "خوب کہتے ہیں" والا ٹکڑا کچھ دنوں تک کھٹکتا رہا کیونکہ بقول ماجد سہندی علی خاں کسی شاعر کا کسی دوسرے شاعر کی تعریف کرنا آدمی کا نہیں فرشتے کا کام ہے۔ اور محمود واجد جواں دنوں دھڑلے کی شاعری فرما رہے تھے آدمی ہوتے ہوئے کس منہ سے ایک دوسرے شاعر کی تعریف کرتے۔ پھر میں نے سوچا ممکن ہے ان کا کہنا درست ہو کیونکہ محمود واجد اس بات سے خوش ہو سکتے تھے کہ مد مقابل نرا شاعر ہے۔ ان کی طرح بیک وقت شاعر، افسانہ نگار اور نقاد تو نہیں۔ لہٰذا تھوڑی تعریف کر دینے سے بھی ان کے پلے سے کچھ نہ جائے گا۔ پھر معلوم ہوا دونوں رشتہ دار بھی ہیں۔ لیجیے یہ گرہ اور مضبوطی سے بیٹھ گئی۔

پھر یوں ہوا کہ کچھ ہی دنوں بعد ایک مخصوص شعری نشست میں ان صاحب کو بھی زحمت دی گئی کہ وہ اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین کو محظوظ فرمائیں۔ انہوں نے اپنی مختصر سی بیاض نکالی اور غزل کے چند شعر (بہاریں کون دیکھے گا، گلستاں کون دیکھے گا) تحت اللفظ انداز میں پڑھے۔ انہیں ہر شعر پر داد ملی۔ غزل بڑی جاندار تھی اور اس میں ایک نیا رنگ جھلکتا تھا۔ بڑا رشک آیا۔ میرے تصور میں جو بد ہیئت عمارت کھڑی ہوئی تھی اڑا اڑا دھم ہو کر رہ گئی۔ لیکن اس عمارت کے ملبوں سے ایک خوشنما پیکر نمودار ہوا۔ اور پھر جمال صاحب ایک جانی

پیچانی اور محبوب شے بن گئے۔

جیسا کہ اندازہ ہوا ہوگا جمال صاحب پہلے فراق تخلص فرماتے تھے۔ میرا اور میرے دوستوں (شمس الزماں سہیل یزدانی، سید نثار احمد، محمد سلیمان خاں وغیرہم) کا خیال تھا کہ فراق گورکھپوری جیسی ایک دیو پیکر شخصیت کے موجود ہوتے ہوئے خود کو فراق کہلوا کر اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر احساس کمتری کا شکار کر لینا اچھا نہیں۔ لہٰذا ہم لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا۔ جب نہ مانے تو ڈرایا دھمکایا۔ کچھ من گھڑت اور کچھ دوسروں سے منسوب لطیفے سنائے یہاں تک کہ ان کے تخلص سے بہت سارے مشتقات بنائے گئے جو قواعد کی رو سے ہرگز درست نہ تھے۔ جمال صاحب مٹی کے بنے ہوئے تھے تنگ آگئے اور چپکے سے اعلان کر دیا کہ اب وہ صرف جمال ہیں یعنی سید جمال احمد جمال پھلواروی۔

جمال صاحب اپنی شخصیت کے اعتبار سے بہت دلچسپ ہیں۔ پہلا تاثر نیم خوشگوار یا نیم خوش گوار لیکن دھیرے دھیرے حج اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں والا مرحلہ در آئے گا۔ اور پھر ان کی شخصیت کی ساحری کرشمے دکھانا شروع کر دے گی۔ کبھی کبھی تو ان کا چھوٹا سا نتھرا ماحول کی گھٹن پر بھاری ثابت ہوگا۔ آپ بزعم خود کوئی بہت اچھی اور حیرانگیز بات کہیں گے۔ لیکن اچانک یوں احساس ہوگا کہ ایک زیر لب سرگوشی نے آپ کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ مجھے اکثر احساس ہوا کہ یہ ان کی اپنی معاشی زندگی کی گھٹن کو دور کرنے کا ایک بہترین موثر ذریعہ ہے۔ ورنہ دن رات تاجروں اور بیوپاریوں کی بھاگ دوڑ کے ریلے میں ریل گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ سے گونجی ہوئی مال گودام کی ٹین کی چھتوں کے نیچے کام کرنے والا شخص عام حالات میں اپنی تمام تر حیات لطیف سے محض عاری ہو کر رہ جاتا ہے۔ جمال صاحب نے اپنے آپ کو اس سے بچائے رکھنے

انہوں نے ایک نظم میں اپنے اس ماحول کی کامیاب عکاسی کی ہے۔

جمال صاحب میں انکساری، خودداری اور انا کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی اردو کی عشقیہ شاعری کا دلدادہ شاعر خود بھی معشوق صفت بن جائے تو تعجب نہ ہونا چاہیئے (جمال صاحب اگر روٹھ جائیں تو انہیں منانا بہت مشکل ہو جاتا ہے)

جمال صاحب نے خانقاہی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا۔ ان کے والد فارسی و عربی داں شاعر تھے۔ جمال صاحب نے بھی فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ فارسی شاعروں کا مطالعہ کیا۔ انہیں سمجھا اور ان سے استفادہ کیا۔ بدقسمتی سے ان کے خانگی حالات کچھ خوشگوار نہ رہے اور اس بنا پر اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور غم معاش کی نذر ہو کر رہ گئے۔ لیکن اس سے ان کی شاعری چمک گئی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں جو کلاسیکی رچاؤ ہے اس میں ان کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان حالات کو بھی بڑا دخل ہے انہوں نے خود اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے ؎

اے دل غم حیات کے قربان جایئے
جس کے سبب ہے خدمت لوح و قلم نصیب

ادبی رسائل عموماً بڑے ناموں کی طرف بھاگتے ہیں بہت سارے ایسے ادیب و شاعر جو ایک ذرا سی حوصلہ افزائی سے کافی اونچے جا سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مدیران گرامی کی عدم توجہی کا شکار ہو کر کسی کے نہیں رہتے۔ لیکن ان میں سے بعض ہر حال میں اپنی تخلیقی توانائی رکھتے ہیں اور اپنی انجمن خیال کو سنوارتے رہتے ہیں۔ جمال صاحب انہی سخت مزاجوں میں سے ایک ہیں۔ انہیں اپنی صلاحیت کا علم ہے۔ ان کے اشعار ان کی صحیح پہچان ہیں۔ بغیر کسی انتخاب کے ان کی غزلوں کے چند شعر

درج ذیل ہیں۔

ہیں تیری بزم ناز میں ایسے بھی غم نصیب
اک رخصتِ نگاہ بھی جن کو ہے کم نصیب

وابستگی یہ ہائے پسِ ترک عاشقی
اک اک سے پوچھتا ہوں تری انجمن کی بات

یوں تو ہے گردشِ ایام بھی اک صیدِ زبوں
حسن خود بیں نہ مگر آیا تہہ دام غزل

جس بت کو دیکھتا ہوں وہ دل کے قریب ہے
اے شوقِ عاشقی ترا عالم عجیب ہے

ان اشعار سے نہ صرف قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ ایک پختہ شعور کی بھی غمازی کرتے ہیں۔ جمال صاحب نے کلاسیکی شاعروں میں میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، اور مومنؔ کے اشعار کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کسی طرح کی ناہمواری (جدیدیت؟) نظر نہیں آتی۔ ان کے اشعار میں بسا اوقات ایسے آڑے ترچھے نقوش مل جاتے ہیں جن پر کلاسیکی رنگ غالب ہوتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں اور انوکھی بھی نہیں۔ ہر شاعر و ادیب اپنے کاندھوں پر صدیوں کی روایات، تجربات اور ادبی شعور کا پشتارہ لادے ہوتا ہے۔ اس میں وہ اپنے حصہ کا بھی اضافہ کرتا جاتا ہے۔ البتہ اضافے کی شکل ہر ایک کے ساتھ ایک سی نہیں ہوتی اس ضمن میں جمالؔ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ناصح ہے کوئی اور نہ کوئی رقیب ہے
یک گونہ خوشگوار فراق حبیب ہے

لیتا ہے نبض ہاتھ میں تیرے مریض کی
عرشِ بریں پہ آج دماغ طبیب ہے

جو دردِ دل کو متاعِ گراں بہا کہئے
تو درد جس نے دیا ہے پھر اس کو کیا کہئے
بہار نام ہے ان کے جمال رنگیں کا
خزاں کو دل کسی حسرت نصیب کا کہئے

دم توڑے ہوں تیری چوکھٹ پہ بہ ہنگام سفر
جانے لے جائے کہاں شوق گریزاں اے دوست
کس کو معلوم کہ وہ ایک غضب ہے تیرا
لوگ سمجھے ہیں جسے تلخیٔ دوراں اے دوست

باندھ کر عہد وفا دار سے کھیلے ہیں مگر
تیرے دیوانوں پہ اب سخت ہے پیمانِ وجود

سیاستِ انجمن کے صدقے مآلِ اہلِ وفا بھی دیکھا
کہ اب تو تاریخ عاشقی میں بھی ذکر دار و رسن نہیں ہے

ان کی غزلوں میں کہیں کہیں غالبؔ، یگانہؔ چنگیزی اور شادؔ عارفی کا سا تیکھا پن پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں ان کی باہم آمیزش بھی۔

شیخ جی نے رند کو آواز دی
دیکھیے کچھ دال میں کالا نہ ہو

پھر اسی شہناز کو ڈھونڈھے ہے دل

تمنا کو کچھ اشعار کی پروا نہ ہو
عشق سے تسخیرِ عالم ہو جہاں
اور کسی کا بال بھی بیکا نہ ہو

غزلوں میں ہیئتی تجربہ ممکن نہیں۔ لیکن جمال نظموں میں بھی بہت حد تک اس سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں غزلوں کی سی چاشنی ہوتی ہے۔ اور جمال اکثر و بیشتر غزل کے رموز و علامات کو ہی نظم میں لاتے ہیں۔ ان کی ایک بہت اچھی نظم "رسوائی" کا یہ بند ملاحظہ ہو ؎

لٹا تھا رختِ تمنا بلا سے لٹ جاتا
مگر وقارِ غمِ عشق پہ نہ حرف آتا
ہوئی ہے ترکِ تعلق کی تیرے یوں تشہیر
کہ عشق اب ہے شہیدِ جفائے نامعلوم
نگاہِ لطف نے غیروں کی کر دیا پامال
تری نگاہِ کرم سے جو میں ہوا محروم

اس نظم میں انہوں نے ان (بظاہر) عمل کے رد عمل کا تجزیہ کیا ہے۔ جن کی ہستی غمخواری، خلوص و مہر و وفا سے عاری ہوتی ہے۔

جمال صاحب نے اپنے اس عالم کا بھی تجزیہ کیا ہے جب ہر طرف مایوسی اور بے کسی کی گھٹا ٹوپ تیرگی چھائی ہوتی ہے۔ ایسے میں فکرِ شعر و سخن ان کے لئے نجات کا باعث ہوتی ہے اور ان میں نئے سرے سے تاب و توانائی آ جاتی ہے۔ وہ بس شعر ان کی غمگساری کو بڑھتا ہے اور وہ والہانہ انداز میں پکار اٹھتے ہیں ؎

وہ دیکھو سامنے نظر آئی ساحل ہمیں
مری ہی سمت بڑھی ہیں وہ مرمری باہیں
اب اور کس سے مداوائے رنج و غم چاہیں

یہ جائزہ بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ ہم تمام احباب جو کبھی کالج میں ایک دوسرے کا سایہ بنے پھرتے تھے اب ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں (دیاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں) اور جمال صاحب کے مجموعہ کلام تک میری رسائی نہیں میں نے ان کی چند نظموں اور غزلوں کی روشنی میں جو کچھ پیش کرنے کی جسارت کی ہے وہ محض میرے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہے۔ پھر بھی مجھے یہ کہنے میں قطعاً باک نہیں کہ جمال صاحب کی شاعری قابلِ قدر اور توجہ کی مستحق ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے قدردانوں کے لئے خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رکھیں گے۔

جمال پھلواروی

از:- شاغل قادری

پھلواری شریف ریاست بہار میں وہ مقام ہے جس کو بجا طور پر مسلم تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے۔ خانقاہ مجیبیہ جہاں روحانی اصلاح کا مرکز رہے ہیں وہیں علم و ادب کا دبستان بھی ہے۔ میر تقی میر کے ہم عصر حضرت عماد رحمۃ اللہ علیہ بھی پھلواری شریف کے تھے۔ آج بھی حسان الہند حضرت تمنا عمادی حضرت مولانا عون احمد قادری، حضرت مولانا نعمت امام، جناب جعفر شاہ پھلواروی، مولانا عبداللہ عباس ندوی اپنے اپنے مو- پر علم و فن کے آفتاب و مہتاب ہیں۔ جمال پھلواروی کے والد بزرگوار حضرت مولانا وارث امام رحمۃ اللہ علیہ بھی خوش فکر شاعر اور صاحب دل بزرگ تھے۔ فارسی ادب پر آپ کو کیسا انتہا عبور حاصل تھا۔ جمال کو وراثتاً شرافت، نجابت، علم و فضل، سنجیدگی اور متانت ملی ہے۔ یہ دبلا پتلا ننھا منا سا آدمی جس کو دیکھ کر ناواقف ممکن ہے کچھ اثر نہ لیں مگر باتیں کرتے ہی محسوس ہوگا کہ یہ شخص بڑا دلچسپ ہے

آج کل مانگے کی شاعری کرنے والوں سے لوگ اس قدر چوکنا رہتے ہیں کہ بھاری بھرکم شخصیت اگر نہ ہو تو تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں ہوتے کہ یہ حضرت خود شعر کہتے ہیں۔ جمال کے بارے میں بھی نئے لوگ پہلے کچھ اسی طرح کا خیال دل میں لاتے ہیں مگر باتیں کرتے ہی موصوف کے علم و دانش کی گہرائی اور گیرائی تک رسائی ہوتے ہی متحیر ہو جاتے ہیں۔ جمال کے قد و قامت کی ساخت ایسی ہے کہ جب تک ان کے بال سفید نہ ہو جائیں اور دانت جواب دینے پر آمادہ نہیں ہو جاتے ان کا شمار ٹیڈی کٹ نوجوان ہی میں ہوتا رہے گا۔

پیر بیگہ یا پھلواری شریف میں جمال کو میں نے دیکھا نہ تھا، ہاں نام سنا تھا اور ان کے کچھ ہم سنوں کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ لوگ جمال کی صلاحیت سے بہت متاثر ہیں اور انہیں کچھ خود بھی سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ پیر بیگہ گیا تو دور سے میں نے جمال کو دیکھا ضرور لیکن باتیں نہ ہو سکیں۔ ممکن ہے یہ جھجک رہے ہوں مگر مجھے تو غرور والی بات یاد تھی۔

اس کے بعد بی، این کالج کے ایک مشاعرہ میں جب میں اپنی نظم، جرس پڑھ کر ڈائس سے نیچے آیا تو جمال نے شاغل بھائی کہتے ہوئے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں اس دن جمال سے مل کر بہت مسرور ہوا ان کے چہرے پر بھی مسرت کی چمک تھی۔

اب گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ یہ حضرت بھی ریلوے میں ملازم ہو کر بھاگلپور آگئے۔ اور جب ہم یکجا ہوئے تو جمال نے مجھے کیسا پایا یہ تو وہ جانیں۔ لیکن میں نے جمال کے پیکر میں ایک خلیق، ملنسار، محبت شعار، ذی علم اور دور اندیش

شاعر کو دیکھا۔ لوگ جس کو جمال کا غرور کہتے ہیں وہ چیزے دیگر ہے۔ یہ کمزوری کہئے یا جمال کی خوبی کہ جب نا دانوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے تو سکوت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور چپ پر کچھ ایسی لکیریں نمایاں ہو جاتی ہیں جن کو دیکھ کر نا سمجھ انہیں مغرور سمجھنے لگتے ہیں۔ علمی مجالس میں بھی الگ تھلگ سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن جمال نے جہاں یہ سمجھ لیا کہ معقول باتیں کرنے کی ہے تو پھر ان کی گل افشانی صرف دیدنی نہیں ہوتی بلکہ محور کن ہوتی ہے۔ بلکہ کچھ لوگوں کے لئے رشک کا سبب بن جاتی ہے۔ فی البدیہہ اشعار کہنا نظم و نثر پر تنقیدی نظر ڈالنا، سوالوں کا استوار جواب دینا، عروض، قواعد اور فن پر سیر حاصل بحث کرنا جمال اس وقت شروع کرتے ہیں جب ماحول اور وقت کو ساز گار سمجھ لیتے ہیں۔ ورنہ قلب از جا نہی جنید، والی کیفیت ان پر طاری رہتی ہے جس سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مکروہات زمانہ سے تھوڑی دیر کے لئے الگ ہو کر شام کے وقت جہاں بھاگلپور کے شعراء روزانہ جمع ہو جاتے ہیں اس جگہ کا نام "میکدہ" پڑ گیا ہے۔ اس میکدہ نے "نظارہ و خیال" کے ذریعہ دنیائے ادب بھی واقف ہو چکی ہے۔ میکدہ سے جمال کو مانوس کرنے میں بہت دیر لگی مگر اب ماشاء اللہ یہ میکدہ کے ایک اہم رکن اور رند بلانوش ہیں ان کی غیر حاضری ارباب میکدہ کو بہت کھلتی ہے۔ اور یہ بھی بغیر مجبوری غیر حاضر نہیں ہوتے۔

جمال کو قدیم "بزم سخن" اس کے ذیلی ادارے مجلس مشاورت اور مجلس اشاعت سے دلی تعلق ہے پہلے یہ فراق تخلص کیا کرتے تھے مگر احباب کے مشورے سے تو تخلص کو ترک کر چکے ہیں اور اب صرف جمال رہ گئے ہیں۔ ان کے احباب اس دن کے منتظر ہیں جب یہ اپنا مجموعہ کلام "جمالِ سخن" کو مجلس اشاعت کے نام وقف کر دیں گے۔

بقیہ حکیم عبد الباقی حکیم ———

آؤ مل جل کر منائیں آج ہم جشنِ بہار
دیکھ کر ہو جائے جس کو خود خزاں بھی شرمسار

——— حاصل نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے آپ کی نظموں میں "جشنِ آزادی منانا ہے" نظم شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس میں "مسائل حاضرہ" پر تبصرانہ انداز میں روشنی ڈال گئی ہے اور سماج کے فاسد مادوں پر نشتر زنی کی گئی ہے اس میں طنز یا تی روح بھی پائی جاتی ہے اور معاشرتی تنقید کے نقوش بھی ملتے ہیں یہ نظم معاشرتی برائیوں، سماجی نا انصافیوں، باہمی نفرتوں اور کدورتوں پر تازیانہ و نشتر کا حکم رکھتی ہے اس سے آپ کی شستہ و پختہ فکر و نظر کا پتہ چلتا ہے۔

قصہ کوتاہ ——— حکیم صاحب کی شخصیت بڑی چمکدار اور طرحدار نظر آتی ہے۔ آپ کے ہاں جمود فکر نہیں جولانئ فکر ملتی ہے۔ اور ایمائیت و رمزیت کی دھوپ چھاؤں بھی۔ ویسے آپ کا کلام حکیمانہ سے زیادہ شاعرانہ ہوتا ہے رفعت و رجائیت سے بھرپور اور مثبت قدروں سے معمور!

کاش! آپ جلدی کوئی کلیات ترتیب دیں جو آپ کے کلام کو دست زمانہ کی دست برد سے محفوظ کر لے اور سینے کی بات سفینے تک آ جائے تاکہ لوگ اس سے فیض حاصل کر سکیں۔ اور اس طرح آپ کا نام رہتی دنیا تک روشن ہوتا رہے۔

جمال پھلواروی

از:۔ یحییٰ ابدالی

بہار کے مختلف خطے تصوف و عرفاں کے مراکز کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں قدیم مراکز بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کی کچھ زیادہ پرانی تاریخ نہیں پھر بھی شہرت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ پھلواری شریف انہیں موخرالذکر زمرے میں آتا ہے۔ اس کی ہمہ گیری بھی مسلم ہے یعنی ایک طرف تبلیغ واصلاح کا کام اس قصبہ سے ہوا تو دوسری طرف بحر سلوک کے شناور یہاں سے ابھرے۔ علم وادب کے میدان میں بھی اہل پھلواری نے اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ جناب آیت اللہ جوہری کی مثنویاں فرد پھلواری کے مراثی اور مولانا تمنا عمادی کی غزلیں ادب اردو میں بیش بہا اضافے ہی نہیں، ادب کی تاریخ مرتب کرنے والوں کے لئے سہولت کا سبب ہیں۔

انہیں عظیم قصبہ پھلواری سے جمال صاحب کا پیدائشی تعلق ہے۔ جس نے اپنے ادبی اور علمی ماحول میں بہت سے اہل کمال کی تربیت کی ہے اور جو آسمان علم وادب کے درخشندہ ستارے بن کر چکے ہیں۔ لیکن ان کے فن پر نکھار سچ پوچھئے تو بھاگلپور کے ادبی ماحول کا رہین منت ہے۔ جہاں کی ادبی نشستیں، شعری محفلیں اور اہل ذوق کی ذاتی کاوش ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ کہنے اور لکھنے پر ابھارتی رہتی ہیں۔ سنجیدہ مشاعرے عام طور پر ایک خیال موہوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن بھاگلپور کے لئے نہیں یہاں کا ادبی ماحول آج بھی جواں سال اور پربہار ہے یہ وہی ماحول ہے جس میں جمال پھلواروی جیسے ہونہار، جواں عمر اور متین و سنجیدہ شاعر کی ایک بڑی تعداد آپ کو فکر شعر و سخن کرتی ملے گی لیکن جمال پھلواروی اپنے ذوق شعری کی تسکین کے لئے شعر گوئی نہیں کرتے بلکہ یہ تحریک کسی دوسری طرف سے ہوتی ہے اور تب ان کی غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ سنئے خود ہی فرماتے ہیں ؎

تیری آنکھوں سے ملے گر مجھے پیغام غزل
ساغر فکر کو چھلکاؤں بھروں جام غزل
روئے روشن ہے ترا مطلع صبح امید
فکر رنگیں ہے مری جلوہ گہ شام غزل

جمال کی شاعری محض گل وبلبل کی شاعری نہیں، بلکہ انہوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں سمونے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس میں غم روزگار بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ وہ اپنی شکست کی آواز بھی خود ہی سنتے ہیں اس لئے کہ دوسرے اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ؎

جو بار گوش ہے ہر بار یاب محفل کو
شکست شیشۂ دل کی اسے صدا کہیئے

اداسی، دل شکستگی اور ارمان نصیبی نے انہیں شعر گوئی
کی طرف مائل کیا۔ یہ کہتے ہیں ؎

اے دل غم حیات کے قربان جائیے
جس کے سبب ہے خدمت لوح و قلم نصیب

شکوہ و شکایات جمال کی عادت نہیں، وہ اپنی حرماں
نصیبی کا بھی شکوہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ کہتے ہیں ؎

محرومیٔ حیات کا شکوہ نہیں جمال
ویرانیٔ حیات کا بنتے ہیں ہم نصیب

اگر انہیں شکوہ ہے بھی تو بس اسی قدر ؎

عشق سے تسخیر عالم ہو جمال
اور کسی کا بال بھی بیکا نہ ہو

ورنہ وہ بڑی ہمت اور استقلال کے ساتھ ناساز
حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اور زندگی کی کٹھن
گھڑیوں کو ہنستے ہنساتے گذار دینے کی امید رکھتے ہیں ملاحظہ
ہو کتنا حوصلہ افزا شعر ہے ؎

خاکستر حیات بھی لودے اٹھے جمال
گر عزم نو کے ساتھ ہو عیش کہن کی بات

فارسی زبان کا ایک مشہور شاعر خاقانی مدتوں
قید و بند کی زندگی گذارتا رہا۔ اسے مدت العمر بڑی مایوسی
اور ناکامی کا سامنا رہا۔ یہاں تک کہ اپنے وطن شروان میں
بھی اس کا کوئی ہمدرد اور غمگسار نہ رہا۔ چنانچہ اس حادثہ کا
انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ اپنے ایک شعر میں اس طرح
کرتا ہے ؎

در ہمہ شروان مرا حاصل نیامد نیم دوست
دوست خود ناممکنت اے کاش بودے آشنا

پتہ نہیں جمال کو کن حالات کا سامنا [illegible]
بھی خاقانی ہی کی طرح اپنے درد و کرب کا اظہار اس طرح
کرنا پڑا ہے ؎

کہاں کوئی جو مداوائے رنج و غم کردے
نہ کوئی دوست نہ ساتھی نہ مونس و غمخوار

ہر ایک ہے غم دوراں سے برسر پیکار
کسے فراغ ہو ادراک سکوں بھر دے

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ جمال نے اپنی تکلیف
کا اظہار کر کے کسی پر الزام عاید نہیں کیا ہے۔ بلکہ دوسروں
کو بھی مجبور سمجھتے ہوئے اپنے غم میں برابر کا شریک کر لیا۔
یہ ان کی رواداری کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ اکثر شعراء
روایتی طور پر جور و جفا کو محبوب سے منسوب کرکے اپنا دل بہلا
لیا کرتے ہیں۔ لیکن جمال [illegible] بلکہ اس کا سبب بھی
اپنی ہی ذات کو قرار دیتے ہیں۔

جمال اپنے حال سے بیزار ہیں لیکن ماضی سے مطمئن
نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے انوکھے انداز میں اپنی گذشتہ زندگی
کے اوراق کو پلٹتے ہیں جس میں انہیں ایک گونہ آسودگی اور
سکون حاصل تھا۔ کسی کے قرب نے طمانیت اور شادمانی
سے بہرہ مند رکھا تھا۔ ان کی غزلوں کے متعدد اشعار اس
حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

دل میں گر عکس رخ زیبا نہ ہو
کیسے افزوں رونق کاشانہ ہو

آنے کو یوں بہار تو آئی چمن چمن
پیدا کہاں کسی میں ترے بانکپن کی بات
دیکھی ہے تیرے زلف معنبر کی برہمی
[illegible] مشک ختن کی بات

جمالؔ کے مشاہدات اور محسوسات ہی ان کی شاعری کی بنیاد ہیں۔ انہیں شعر ہائے نقل سے کوئی سروکار نہیں اس لئے ان کے کلام کی صداقت اثر انگیز اور دردرس ہے۔ انہوں نے ہلکی پھلکی نظمیں بھی لکھی ہیں جوان کی زندگی کے پیچ وخم کو اور زیادہ ابھارتی نظر آتی ہیں۔ ایک نظم " تجربہ " دوسری " رسوائی " اور تیسری " سہارا " میں بھی انہیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جوان کی شاعری کی روح ہے۔ یعنی حوادث روزگار اور آلام زمانہ کے ساتھ کشمکش حیات کی بڑی چابک دستی سے ان نظموں میں عکاسی کی گئی ہے۔ پیشکش کا انداز حسین ہے۔ لیکن فنکارانہ مہارت کے لئے ابھی مزید مشق کی ضرورت ہے۔ خیالات کے ہجوم بعض نظموں میں تسلسل نظم اور ربط قائم نہیں رہنے دیتے۔ اسی طرح مترادف الفاظ غیر ضروری طور پر بعض جگہ استعمال میں آگئے ہیں۔ کہیں معمولی سی ترکیب کی غلطی نے شعر کے مفہوم پر برا خراب اثر کیا ہے۔ مثلاً ؎

جب بھی چلی کمال عروج سخن کی بات

میں کمال عروج اگر معطوف ہوتے تو دونوں کے استعمال کا جواز نکل سکتا تھا۔ موجودہ حالت میں ایک لفظ بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم رسوائی کے آخری بند کے آخری چار مصرعے ملاحظہ ہوں جس میں دوسرا مصرعہ قطعی بے ربط اور غیر ضروری طور پر نظم میں سمو دیا گیا ہے ؎

جو جانتے بھی نہیں ہیں کہ عاشقی کیا ہے
کٹے جو ہجر میں تیرے وہ زندگی کیا ہے
غضب ہے آج وہ مجھ پر ہیں مائل احساں
بعبد خلوص وہ آئے ہیں پرسش غم کو

قاعدے کی بات ہے کہ جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی پائے جاتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس دور جدیدیت میں تو عجیب عجیب تجربے ہو رہے ہیں۔ انکو دیکھتے ہوئے جمالؔ کی شاعری بسا غنیمت ہے۔ اور اسکی خامیاں بھی قابل اعتنا نہیں رہتی۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی مشق جاری رکھی اور ان کا ذوق شاعری بہ دیر قائم رہا تو اردو شاعری ان پر بجا طور سے فخر کر سکے گی۔

بقیہ حکیم عبدالباقی حکیم

مجھے شکریہ کا مستحق نہیں سمجھتے۔ حکیم عبدالباقی صاحب اس بد اخلاقی دور میں جب کہ دینی قدریں مفلوج ہوتی جارہی ہیں۔ ایک خدا ترس، دیندار، وقت کے پابند، خوش اخلاق اور مخلص شخص ہیں آپ کی شاعری آپ کے مبلغ علم کی عکاس ہے۔ مضمون آفرینی نظموں کے دروبست اور فن کی پابندی آپ کی شاعری کو حسین و جمیل بنا دیتی ہے۔ آپ کی طبیعت میں شوخی بھی ہے ایک شعر ملاحظہ ہو

خیال وصل سے دل گدگدا رہا ہے حکیم
اگر وہ ساعت نیک آگئی تو کیسا ہوگا

یہ مطلع بھی آپ کی شوخی کا عکاس ہے ؎

کتنا عتاد شب ہجر ستم کوش رہا
نالہ کش میں رہا جبتک وہ گراں گوش رہا

بہرحال مجھے حکیم عبدالباقی صاحب کی شخصیت پر لکھنا تھا۔ آپکی شاعری کو پرکھنے والے بہ لوگ ماحول نمبر میں حصہ لے رہے ہیں انکے حصے میں کچھ اڑالوں یہ بے انصافی ہوگی۔ اس لئے میں اپنا مضمون یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

غالب

میں محمد اکرام انجم کا نام لے رہا تھا۔ لفظ انجم کے ساتھ رنگ و نور کی جو کیفیتیں وابستہ ہیں وہ تمام ترکیفیتیں اکرام انجم کے نام کے ساتھ ذہن میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں اور وہی متین و متبسم چہرہ، وہی سادہ و پر کار آنکھیں وہی جچا تلا شیریں انداز گفتگو اور مترنم رنگ تغزل سامنے آجاتا ہے۔ کیوں نہ ہو، ایک حد درجہ دردمند ذکی اور حساس طبیعت رکھنے والا شخص اپنے درد و غم کا اظہار غزل کے پیرایۂ بیان میں کرے اور پھر ترنم کے بے پناہ سوز و گداز کی کرنیں بھی ہم رکاب ہوں تو کون پتھر دل ہوگا جو اس کا اثر قبول نہ کرے اور بغیر آہ یا واہ کئے گذر جائے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے سوز علاں کے نام سے اہلِ دل یاد کریں گے اور یہی وہ منزل ہے جس کا حصول فطری وجدان، درد و غم کی پائدار خلش اور برسوں کی مشق و ریاضت کے بغیر ممکن نہیں

ایں سعادت شہپر شہباز و شاہین کردہ اند

میں نے درد و غم اور سوز و گداز کی جاودانی کا ذکر انجم کی غزلوں کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی

نسیم آروی

ابتدا بھی دردانگیز الم سامان ہے اور ارتقا بھی۔ محمد اکرام کلیم اپریل ۱۹۳۷ء کو قصبہ برہج بازار ضلع دیوریا یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف تین سال کے دودھ پیتے بچے تھے کہ دست قدرت نے ماں کی محبت سے محروم کر دیا۔ ماں! جس کی مار بھی سارے جہان کے پیار سے دلپذیر ہوتی ہے اس کی محبتوں کا بدل یہ سرزمین کیا پیدا کر سکے گی ——— سوتیلی ماں نے ہر چند آرام کا خیال رکھا اور والد محترم نے شفقت فرمائی مگر ایک انجانی اور ان دیکھی محبت کی کمی کا احساس تمام عمر کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا اور اس ہونہار اور حساس بچہ کے دل میں ایک نامعلوم خلش ہمیشہ چٹکیاں لیتی رہی۔ کسے خبر تھی کہ یہی خلش یہی فقدان محبت کا احساس ایک دن غزل کا روپ دھارے گا اور سننے والوں کے دل پر بجلیاں بن کر گرے گا۔

یہی احساس محبت کا بدل بنتا ہے
دل میں رہتا ہے تو رنگین کنول بنتا ہے
جام الفاظ میں ڈھل کر یہ غزل بنتا ہے
مادہ پاکے یہی تاج محل بنتا ہے

(نازش پرتاب گڑھی)

ابتدائی تعلیم قصبہ کے مکتب میں ہوئی جہاں حافظ محمد

الیاس صاحب اعظم گڈھی اور بعدہٗ مولوی محمد امین حسب منشا نے بڑی توجہ سے اس بچہ کو پڑھایا اور بنیاد اس قدر ٹھوس کردی کہ آگے کبھی ہل نہ سکی۔ پھر جارج کنگ اسٹر کالج بوارج مازار سے آئی لے ممتاز نمبروں سے پاس کیا اور سینٹ اینڈ روز ڈگری کالج گورکھپور میں داخلہ لیا جہاں ملک کے مشہور فنکار جناب مجنوں گورکھپوری نے ان کے خیالات واحساسات کی نوک پلک سنواری۔

وہاں سے ۱۹۵۶ء میں انجم صاحب شعبۂ فن میں گریجویٹ ہوکے نکلے تو بیشتر رموز وایما اور نکات فن سے واقف ہو چکے تھے۔ کالج کے مخلوط طریقۂ تعلیم نے نوجوان دل کو نئے احساسات وجذبات عطا کئے۔ اگرچہ یہ ہمیشہ کم آمیز رہے لیکن سورج کی کرنیں تو دور دراز گوشوں کو بھی اپنی تمازت سے شعلہ بکنار بنا دیتی ہیں ———— اور یہیں سے ان کی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ تقریباً ۱۹۵۳ء کی کہی ہوئی ان کی پہلی نظم "دورِ نو کی لڑکیاں" کے دو بند ملاحظہ فرمائیے

یہ دورِ نو کی لڑکیاں!
حسیں جمیل تتلیاں!

نقاب بار دوش ہے
حجاب سخت کوش ہے
شباب کا یہ جوش ہے
یہ دورِ نو کی لڑکیاں

بہار سر سے پاؤں تک
خمار سر سے پاؤں تک
نگار سر سے پاؤں تک
یہ دورِ نو کی لڑکیاں

شہر کی ہما ہمی اور کالج کی ہنگامہ خیزی میں شبیر احمد اور مہدی حسن دو ایسے ہم جماعت تھے جنہیں یہ کلام سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے اور انہیں بھی انجم جیسا ترجمان دل مل گیا تھا جس کے بغیر ان کے جذبات اظہار کی لذت سے آشنا نہ ہو سکتے تھے اور یہی مخصوص حلقہ اپنے دامن میں پرورش تو یرا انجم سخن کرتا رہا۔

مطالعہ کے سلسلے میں جن شعرا سے زیادہ متاثر ہوئے ان میں میرؔ مومنؔ غالبؔ اقبالؔ جوشؔ اور بعد میں مجازؔ اور فضا ابن فیضی خاص ہیں۔ فضا صاحب کا نام آنے پر انجم جس آب وتاب سے چمک اٹھتے ہیں وہ سماں دیدنی ہوتی ہے۔ فضا صاحب کے اشعار یہ بڑی لجاجت سے سناتے جائیں گے اور داد وتحسین کے موتی لٹاتے جائیں گے۔ خود اس انداز سے واہ واہ کرتے جائیں گے کہ دوسرے لوگ بغیر داد دئے رہ ہی نہ سکیں۔

اور پھر سردار مخدوم اور فیض سے قریب تر ہوئے راقم الحروف نے ان شعرا کا بیشتر کلام مسلسل سنایا ہے اور یقینی احباب میکدہ نے ان کے رنگ وآہنگ کی مدح سرائی کی ہے اور اثر قبول کیا ہے۔ خصوصی طور پر انجم صاحب کا ذہن وقت آشنا سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ آپ "ویتنام کے نام" "نغمۂ حیات" "نذر بہادر شاہ ظفر" "تنہائی" یا "میکدہ کے نام" کسی بھی نظم کو پڑھیں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اور صرف انجم ہی پر کیا منحصر کون ہے؟ جس نے ان عہد آفریں فنکاروں کے رنگ وآہنگ پر اپنے دل وجان نچھاور

نہ کئے ہوں۔ ع

اب بھی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے!
حادثۂ عشق بھی اسی زمانہ طالب علمی کی دین ہے

جو ایک جانکاہ المیہ پہ ختم ہوا۔ وہ محبت بھرے دلوں کا
منا یہ طبقات زدہ سماجی ماحول کو برداشت کر سکتا

تھا۔ ابر و باراں کی راتوں میں سماج کے ٹھیکیداروں سے
آنکھیں بچا کر ... کنج تنہائی میں ملنے کی

جب آج بھی یاد آجاتی ہے تو یہ سراپا تصویر حسرت
نظر آتے ہیں۔

لگا ہے دل پہ وہ زخم کاری کہ تا ابد مندمل نہ ہوگا
وہ درد دی کیا کہ جس کے دل پر اثر کوئی جاوداں نہیں

امان احمد عارف

۱۶ جون ۱۹۵۳ء شادی ہوئی اور اس شاہین
فلک مقام کو زیر دام لانے کی سعی کامیاب کی گئی۔ اب
ان کا آشیاں تین شاہین بچوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے
اس دور کے دیگر نوجوانوں کے برخلاف ان کو فکر معاش
نے کبھی متردد نہیں کیا۔ فراغتِ تعلیم کے فوراً بعد گھوڑ
ہی میں محکمۂ رسل و رسائل (ٹرانسپورٹ) میں ملازمت کرلی
مگر تھوڑے ہی دنوں میں دل برداشتہ ہوگئے اور نادرن
ریلوے میں آگئے۔ اسی سلسلے میں ان کی تقرری جودھپور
کے علاقہ میں ہوئی جہاں کی رومان پرور فضا شاعری کے
لئے زرخیز ثابت ہوئی۔ اجمیر کے قریب کھاٹو کا ریلوے
اسٹیشن اور اس کی رومانیت، مضافات کے مرغزاروں
میں ہر طرف دوڑتے پھرتے اچھلتے کودتے ہرن، اور ٹلتے
ہوئے موزوں طبع موزوں کو دعوتِ سخن دیتے رہے ———
یہ کیفیت انتظار ہے اور پھر سجی سجائی ہوئی حسین و جمیل راج

... دوشیزائیں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پانی
بھرتی ہوئی اپنے مخصوص علاقائی لباس میں ملبوس لوک
گیت گاتی ہوئی اور اپنی الھڑ جوانیوں کے جلوے دکھاتی
ہوئی اپنے مخصوص علاقائی لباس میں دلوں کو چھو لینے والی
اداؤں سے مسکراتی ہوئی ——— کون ہوگا جو دل تھام
کر نالہ و شیون نہ کرے ——— اور پوچھے جانے
پر یہ نہ کہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

اس ماحول میں اگر انجم نے یہ اشعار کہے تو اس میں
کیا تعجب

ع پوچھتے کیا ہو دل کا عالم
گاہ ہے شعلہ گاہ ہے شبنم
ع لے ہی گیا انجم کو سنگِ درِ جاناں تک
صد شکر تمہارا ہے لے ذوقِ جبیں سائی

پردہ جو اٹھا رخ سے خورشید نکل آیا
بکھرا دئے گیسو تو ہر سمت گھٹا چھائی

جودھپور اور اس کے آس پاس جہاں راجستھانی
بولی بولی جاتی ہے اور کلچر بھی جداگانہ ہے وہاں دو واقف
(جناب سید قمر حسین جو کانپور کے قریب کے تھے اور محمد
ظہیر خاں جو لکھنؤ سے وارد تھے) کی موجودگی بڑی تقویت
کا باعث تھی۔ وہ زندہ دل بھی تھے اور سخن فہم بھی۔ ورنہ
خون جگر کے اجزائے ترکیبی سے تخلیق شدہ پارہ فن
کی کون داد دیتا؟

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

غرض ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک کا زمانہ یہاں گزرا اور

خوب گذرا لیکن جولانی طبع نے مستقل رہنے سے گریز پائی اختیار کی اور اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ بعدہٗ نورتھ ایسٹرن ریلوے میں ملازمت کرلی اور اسی سال ۱۹۵۹ء میں بھاگلپور آ گئے۔ بھاگلپور کا آنا اس ماحول کے لئے سازگار ثابت ہوا اور خود ان کے لئے بھی۔ اس شہر میں سب سے پہلے اختر ناصح نقیب مرتب "نقاد" و "خیال" سے تعارف ہوا اور پھر انہیں کے ساتھ میکدہ تک پہنچے اور احباب میکدہ سے متعارف ہوئے۔ رفتہ رفتہ دلوں کا فاصلہ کم ہوتا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں احباب میکدہ سے یک دل و یک جان ہو گئے۔

میں اس شہر میں ۱۹۶۱ء کے اوائل میں آیا اس وقت انجم صاحب کی ڈیوٹی مونگیر گھاٹ پر تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب وہ اس ڈیوٹیشن کو ختم کرکے بھاگلپور آ گئے تو میکدہ میں تعارف ہوا۔ یہ اس وقت بہت متوحش نظر آ رہے تھے اس وقت بھی مونگیر گھاٹ کی ڈیوٹی اور سخت ناسازگار ماحول کے اثرات شاعر کے دل و دماغ پر سایہ فگن تھے مگر چند ہی منٹوں کے بعد رسمی گفتگو ختم کرکے جب سننے سنانے کا دور شروع ہوا تو یہ کھل اٹھے اور جب غزل چھیڑی تو ایسا معلوم ہوا جیسے ماحول کے درد و غم کو گنگا کی ریت کے ڈھیر نے دفن کر دیا ہو اور زندگی اپنی تمام لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہو ——" پھر ہم لوگ قریب ہوئے اور اتنے قریب کہ ہم لوگوں کی شریک ہائے حیات نے ایک دوسرے کو اپنا رقیب سمجھا۔ انہیں اب بھی تعجب ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اتنا وقت کیسے دیتے ہیں —— انہیں کون سمجھائے کہ اس کثیر التعداد عول، نسانی میں کہیں بھی دو شخصیتوں کا مزاج دھیان ہی، اطوار و عادات ہی، نظریۂ حیات اور فرمانِ درد و غم ہیں، کچھ بھی قدر مشترک کا ہونا ایک کو دوسرے سے قریب تر کر دیتا ہے اور اگر بیشتر قدریں مشترک ہوں تو محض ظاہری اور مادی بعد کے سوا تمام تر یکرنگی و ہم آہنگی ہی کی کارفرمائی نظر آئے گی لیکن وہاں تو بات ہی کچھ اور ہے۔

؎ یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

بھاگلپور کا ماحول شاعری کے لئے سازگار ثابت ہوا۔ احباب بزم سخن ایک دوسرے پر صحت مند تنقید و تبصرے کرتے رہے اور ایک کے تجربہ نے ہمیشہ دوسرے کو روشنی دی اس طرح یہ کارواں آگے بڑھتا رہا اور اس کارواں میں انجم نے اپنی راہ بنائی —— ایک مشاعرہ ہوا۔ بھاگلپور میں انجم کے قیام کے دوران غالباً یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ غالب کی زمین تھی۔ ؎

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس زمین شعراء شعر پڑھتے جاتے تھے اور غالب سے مغلوب ہوتے جاتے تھے کہ اسی زمین میں اس نوجوان نے جب یہ شعر پڑھا تو

یہی آنسو کا اک قطرہ بظاہر کچھ نہیں لیکن
ڈھلک جائے تو انگارہ ٹھہر جائے تو دم نکلے

تو اہل مشاعرہ نے تعجب اور رشک سے دیکھا۔ مکرر ارشاد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ نوجوان نے پھر یہی شعر پڑھا اور داد و تحسین کے پھولوں سے محفل دیر تک زعفران زار بنی رہی اور یہ شعر اب تک بہتوں کی زبان پر ہے —— شاعر کے مستقبل سے کتنوں نے بڑی بڑی امیدیں باندھی تھیں اور آج وہ خوش ہیں

کہ ان کی امیدیں بار آور ہو رہی ہیں

پھر کتنے مشاعرے ہوئے کتنی نشستیں ہوئیں شہر سے باہر اور شہر کے اندر جہاں یہ اپنی سحر آفریں آواز اور روح پرور تخیل کے پھول کھلاتے رہے روزانہ میکدہ سجتا رہا اور حیات و کائنات کے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ حالات بنتے اور بگڑتے رہے ——— پھر یہ غزلوں کے مزاج میں ڈھلا ہوا شاعر نظم کی طرف دھیرے دھیرے راغب ہوا۔ کن محرکات نے کلیتاً نظم کی طرف انہیں راغب کیا اور مزاج کے اس چنچے تلے سچے بسے ہوئے غنائی انداز بیان میں حالات کی تلخی کا زہر گھول دیا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن خود حالات کی تلخی، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ اور سلطانی جبر و تشدد، ویتنام، اور دیگر نوآبادیاتی ممالک کے مجاہدین آزادی کی سامراجیت کے خلاف جنگ مزاحمت، جنگ فلسطین، عرب عوام اور دیگر مظلوم و مقہور کی بیداری نو، ان ساری چیزوں نے بیک وقت بھی اور یکے بعد دیگرے بھی شاعر کے ذہن و دماغ پر اثر ڈالا ہوگا اور پھر احباب کی ان موضوعات پر کہی ہوئی نظمیں بھی مشعل راہ بنی ہوں گی۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ یا کچھ اور سبب ہو لیکن یقیناً کوئی بڑا سبب ہوگا جس نے غزل کے ترنم کو بادلوں کی گرج اور بجلیوں کی کڑک عطا کی اور ایسے پُرتعریب اشعار کہنے والا شاعر:۔

ﷺ گذرے دنوں کی بات چلی ہے
تم بھی ذرا لے گردشِ دوراں

ﷺ دیکھو وہ کوچہ محبوب نظر آتا ہے
دل بیتاب سنبھل اے دلِ بیتاب سنبھل

ﷺ دن کے گلنار سے عارض کی صباحت انجم
جیسے سپنوں کے جزیرے میں کوئی شیش محل

ﷺ یہ کون ہے متبسم سرِ خیال انجم
کہ اپنی حدِ نظر تک چراغ جلتے ہیں

ﷺ شام غم کی تیرگی میں یاد آتے ہیں تری
یوں ہوا محسوس جیسے روشنی تک آ گئے

ﷺ گردش میں بھی ہوتے ہوئے لے گردشِ دوراں
تاریخ کے اوراق پہ ہم چھائے ہوئے ہیں

ﷺ یارب کہیں انہیں نہ خود اپنی نظر لگے
آئینہ دیکھتے ہیں وہ زلفیں سنوار کے

ﷺ وہ جس سے مری تشنہ لبی تشنہ لبی ہے
محفل میں اسی بات کو سب پوچھ رہے ہیں

ﷺ جہاں جہاں دلِ لالہ سے خون ٹپکا ہے
وہیں وہیں خس و خاشاک بن گئے ہیں چمن

ﷺ یہ نقش، نقش جو تیری جبیں سے ٹپکا ہے
وہیں وہیں خس و خاشاک بن گئے ہیں چمن

وہ اس قسم کی نظمیں کہنے پر کیسے مجبور ہوا :۔

ﷺ آج پرواز سے میری ہے خلاؤں میں خروش
جوششِ عزم سے جلتے ہیں بیاباں میں چراغ
منتظر ہیں مرے قدموں کے فلک پر انجم
بادۂ جوش سے لبریز ہے ہستی کا ایاغ

(ماخوذ از تعبیر خواب)

سر پہ منڈلاتے ہیں پھر جنگ کے وحشی بادل
مطلعِ زیست پہ چھانے کو ہے پھر شب کا دھواں
مہر تاباں گہن آلود ہوا جاتا ہے
دیدنی ہے رخِ انساں پہ تفکر کا سماں

ﷺ اتنا سنگین ہے ماحول کہ دم گھٹتا ہے

آنکھیں تعبیر کی کرنوں کو ترس جاتی ہیں
آرزو کرتا ہے کوئی جو اجالے کے لئے
دور تک رات کی تصویر نظر آتی ہے
(ماخوذ از نغمۂ حیات)

اداس اداس سے منظر بجھی بجھی سی فضا
یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھ کو
نہ غمگسار نہ ہمدم نہ ہم سفر کوئی
ہر ایک شئے نظر آتی ہے اجنبی مجھ کو
(ماخوذ از تنہائی)

گرچہ یہ تبدیلی خوش آئند ہے اور اس سے زندگی کے تلخ حقائق کا حقیقت پسندانہ اور مجاہدانہ انداز میں مقابلہ کرنے کے عزم و حوصلہ کا پتہ چلتا ہے۔ مگر ڈر ہے کہ کہیں گلستان تغزل انجم کے تخیل کی شبنم افشانی کے بغیر خشک لب و تشنہ دہن نہ رہ جائے۔

انجم صاحب کی ذاتی زندگی نہایت سادہ اور تصنع سے یک لخت پاک ہے۔ آپ انہیں ہر وقت کاربند پائیں گے۔ اپنے بچوں کو پڑھانا، ٹھیک وقت پر اسکول جانا، شام کو پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر میکدے کی حاضری، اخبارات و رسائل کا مطالعہ، نو دس بجے رات تک گھر واپس آکر کھانا پینا اور پھر لکھنا پڑھنا۔ بہت رات گئے سونا اور بہت سویرے اٹھنا، پھر دن بھر کام کرنا، او سط سے تیز چلنا۔ کم بولنا مگر پتے کی باتیں بولنا، فطرت میں تیزی اور تلون پسندی، ایثار و قربانی، وفا و دوستی اور خلوص و محبت کے پیکر، نہایت غیور و خود دار مزاج میں حد درجہ نفاست اور بالیدگی، نا گرجب سے ملنا خلوص سے ملنا۔ خوشامد پسندی اور خوشامد گذاری کے سخت مخالف ——— میں نے انہیں کوئی کھیل کھیلتے نہیں دیکھا۔ سینما سرکس نہیں دیکھتے۔ یہ لذیذ کھانوں کے رسیا ہیں۔ بڑے خلیق اور دوست نواز ہیں۔

مجھے تو ان کی بہت ساری چیزیں پسند ہیں مگر غزلیں سب سے زیادہ پیاری ہیں
کتنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں سے دل جوڑے ہیں
جب کہیں جا کے ہوا ہے ہمیں عرفانِ غزل

چونکہ میرا موضوع انجم کے فن پر تنقید یا تبصرہ نہیں ہے اس لئے میں ان کی غزلوں یا نظموں کے فنی حسن و قبح پر خامہ فرسائی کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا اور صرف اتنا کہوں گا کہ اس تیس سال کے نوجوان کے لئے اگر قدرت نے چاہا تو کام کرنے کے بہت دن باقی ہیں اور ترقی کی رفتار کو مد نظر رکھ کر حصول منزل کی پیش گوئی بایقین کی جا سکتی ہے۔

یوں ہی گر سلسلۂ جوشش پرواز رہا
زندگی رفعت گردوں سے گذر جائے گی
ہوگی ہر منزل نادیدہ برافگندہ نقاب
اور تغلیس کی نظر لوٹ سے بھر جائے گی
——— (ماخوذ از تعبیر خواب) ———

اکرام انجم میری نظر میں

دل حسینی

اس دور میں جبکہ اردو شاعری بہت سے لایعنی مسائل لے کر چل پڑی ہے تو یہ فیصلہ کرنا ہی دشوار ہے کہ آج کس نوع کی شاعری کو اپنایا جائے اور کس طرح اپنے خیال کا اظہار کیا جائے۔ پھر بھی کچھ ایسے سنجیدہ حضرات نظر آتے ہیں جو غزل کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں میں انجم صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ہر دور میں غزل نے اپنا ایک مقام اور مزاج خود پیدا کر لیا ہے۔ ولی سے لے کر حالی اور حالی سے لے کر فیض تک جیسے جیسے زمانہ کروٹیں لیتا رہا غزل اپنا مقام اور مزاج بدلتی گئی۔ آج غزل کا وہ مقام ہے کہ نظم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ غزل کا ایک ایک شعر بذات خود ایک نظم کا کام کرتا ہے۔ لیکن یہ معیار ہر شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اس قسم کی شاعرانہ تخلیقات انہیں لوگوں کے یہاں پائی جاتی ہیں جن کا ضمیر روشن ہو۔ ذہن بیدار اور احساس جاگتا ہو ورنہ آج بھی بیشتر شاعر ایسے ہیں جو زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

مگر انجم صاحب کی یہ شعری تخلیق اس اسیری اور پیچ و خم سے دور ہے اور پھر یہ شعر کہنا پڑتا ہے کہ

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم دیا اسے غم جاناں بنا دیا

انجم کا کلام ان کی قلبی واردات کا نمونہ ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے ان کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے فنکار کے یہاں ضروری ہیں۔ ان کے یہاں موجودہ سیاسی بحران کی طرف بھی اشارہ ہے اور غم جاناں سے لگاؤ بھی پایا جاتا ہے اور ان کی تلافی کا راستہ بھی اپنایا گیا ہے اور غم روزگار کی جھلکیاں بھی ہیں جس سے شاعر کے صحیح ماحول کا پتہ بھی چلتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جنہیں نصیب فراغت ہے اک زمانے کی
ستم ہے وہ بھی ہماری ہی طرح جلتے ہیں

شدت سے گلابی کی ہر شئے سے خالبتہ
ان کے لب لعلیں سے پھوٹی ہو کرن جیسے

اشعار کے پردے میں جذبات کی یہ تندی

ملبوس میں غلطاں ہو خوشبوئے بدن جیسے

پھر جنوں خیز ہے یہ موسم گل
پھر سلاسل کی بات کرتے ہیں
ہمکو منجدھار کی تمنا ہے
لوگ ساحل کی بات کرتے ہیں
ہے چمن جن کے خون سے رنگیں
ان عنادل کی بات کرتے ہیں

لوگ کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں صلیب
شاید اس شہر وفا سے رہِ مقتل ہے قریب
روح جلتی ہے تو ہر سانس سے آتی ہے صدا
نغمہ لو دیتا ہے جب درد سے ہوتا ہے قریب
مل گیا درد کے ماروں کو مسیحا کا نفس
ایک مدت پہ نظر آئے اجالوں کے نقیب
ایک ہنگامہ ہے دنیائے ادب میں برپا
وقت کی چال ہے ہشیار نہ شاعر نہ ادیب
اس پرآشوب زمانے میں غنیمت ہے ندیم
ایک لمحہ بھی فراغت کا جو ہو جائے نصیب

تم لاکھ چراغ حرم و دیر جلاؤ
اک موڑ پہ دو فکر کے دھارے نہیں ملتے
دل کو بھی خود اپنے پہ بھروسہ نہیں ہوتا
جب تک تیری نظروں کے اشارے نہیں ملتے

ان کو منظور تھا یہی ورنہ
خانۂ دل خراب کیا ہوتا

تیری یادوں کے سمن بیرے نصیبوں کے کمل
دلکشی باغ عدن غیرتِ صد تاج محل
اب خطا کار سزاوار کرم ٹھہرے ہیں
تو بھی افسانۂ پُردرد کے عنوان بدل
نکہتِ گل جو اڑی حسن کے کاشانے سے
کھل گئے راہ میں کتنے ہی دلستان غزل
کتنے شاداب وحسیں خواب ہیں ملبوس یہاں
کوئی دیکھے تو سہی آکے پرستان غزل
دل کے گوشے ہیں کہ تاریک ہوئے جاتے ہیں
عقل انساں ہے کہ بیدار ہوئی جاتی ہے

مندرجہ بالا اشعار کی شستہ پرکاریوں سے انکار ناممکن ہے۔ انجم صاحب موجودہ دور کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں پختگی، زندگی اور زندہ دلی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ آپ کے یہاں صالح شعور اور نئی اقدار کی جستجو کا ذوق بھی ہے جس کی نمائندگی آپکی نظمیں "تعبیر خواب" "نغمۂ حیات"، "تنہائی اور بہادر شاہ ظفر" کرتی ہیں۔

آپکے آئینۂ خیال پر ماحول کا گہرا اثر ہے اور ہر شعر آپ کی دلی کیفیات کی ترجمان ہے اور یہ خوبیاں جس کے کلام میں ہوں اس کی شاعری ضرور زندہ رہنے کی مستحق ہے۔ مجھے امید ہے کہ انجم صاحب کا کلام اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہر طبقہ کے لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

~~~~~~
~~~~~~

اکرام انجم کا فن

ایک تجزیہ

از: ——— لطف الرحمٰن

بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ادب وفن نے بھی بہت سے روپ دھارے ہیں، اردو ادب میں ایک نمایاں تغیر انیسویں صدی کے وسط میں ہوا تھا جب ہندوستان کا ہندو مسلم مشترکہ کلچر مغربی کلچر سے متصادم ہوا تھا۔ یہ تصادم ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بڑا گراں قدر ثابت ہوا، اور بیسویں صدی کے اوائل سے پہلے اردو ادب میں بہت سی ایسی صنفیں در آئیں جو اٹھارہ سو ستاون ۱۸۵۷ء سے پہلے نایاب تھیں، یہ تبدیلیاں صرف صنفی اعتبارات سے نہیں ہوئیں بلکہ معنوی جہات سے بھی نظریات و افکار میں بڑی عظیم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور ادب وفن، زندگی اور کائنات کی قدروں کے بعید قریب ہوئے، بیسویں صدی کے اوائل میں فرائڈ، مارکس اور آئنسٹائن کے افکار و آرا نے زندگی کے بہت سے قدیم تصورات و افکار میں تبدیلیاں پیدا کیں اور دیکھتے دیکھتے حیات و کائنات اور ادب وفن کے بالکل نئے تصورات سامنے آئے۔ عالمگیر طور پر سائنسی، نفسیاتی اور معاشی، تصور حیات نے سارے نظام جہات کو بدل دیا، یوں بھی بیسویں صدی میں سائنسی ایجادات سے زندگی زیادہ تیز رفتار ہو گئی اور ایک طرح سے یہ وسیع و عریض کائنات بے حد محدود و مختصر ہو گئی۔ پہلی جنگ عظیم اور پھر دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں اور بربادیوں نے انفرادیت اور اجتماعیت کے حدود اربع متعین کیے۔ اور باشعور افراد نے انفرادیت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کے تحفظ کو بھی اپنا فرض سمجھنا شروع کیا۔ غرض یہ کہ ان تمام انقلابات و تغیرات نے عالمگیر طور پر کچھ ایسی قدریں خلق کیں جو بغیر کسی تفریق مذہب و ملت کے تمام انسانوں کا حق اور فرض سمجھی گئیں۔ یہ قدریں انسانی اور اخلاقی قدریں ہیں لیکن عملی طور پر جو دیرینہ رسوم و اقدار تھیں وہ غارت ہو گئیں، اس طرح ساری دنیا ایک عجیب کرب ایسے جینی تشنگی، کلبیت، تشکیک، اور احساس ناکامی و نامرادی کا شکار ہو گئی، مادی اعتبار سے انسانی قافلے نے جو ترقیاں کی تھیں ان کی روشنی میں یہ روحانی اور اخلاقی دیوالیہ پن بہت گراں ثابت ہوا۔ فرد کا زندگی سے اعتماد اٹھ جانا اور اپنی ذات کو ایک خلا سمجھنا یہ انسانیت اور بشریت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ گذشتہ ایک صدی نے اپنے تمام مادی فیوض و برکات کے ساتھ ہمیں یہ لعنت بھی دی جس کا اظہار ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ آج ساری دنیا کا ادب خصوصًا انگریزی ادب اسی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ اردو ادب میں بھی یہ پراگندگیٔ خیال اپنی ساری لعنتوں کے ساتھ موجود ہے۔ آج کا اردو ادب جتنے متضاد تصورات، نظریات، اور اسالیب و افکار کا شکار ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی، انسانیت اور تہذیب و تمدن کی ساری قدریں مسخ ہو کر رہ گئی ہیں اور انسان

ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ کم از کم آج کے اردو ادب کا مطالعہ ہی کچھ ایسا تاثر دیتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی کلبیت اور انتشار خیالی کو فطرت وجلالت کا نام دیا جا رہا ہے۔

موجودہ عہد کی اس پراگندگی کے درمیان اگر کوئی ایسا فنکار سامنے آتا ہے جس نے زندگی اور ادب کے لئے ایک متوازن اور درمیانی راہ اختیار کی ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اکرام انجم صاحب کے کلام نے مجھے اسی لئے اپنی طرف متوجہ کیا کہ ان کے ہاں ایک متوازن اور متناسب فنکارانہ شعور ملتا ہے۔ نہ یہ روایت پسند ہیں اور نہ جدت پسند، اور یوں دیکھئے تو دونوں مذکورہ قدریں ان کے کلام میں موجود ہے، زندہ ادب وہی ہوتا ہے جو ماضی کی قدروں کے ساتھ ساتھ حال ومستقبل کی قدروں کو اپنے دامن میں جگہ دے۔ کلاسیکی ادب، یا ادبی روایات، بنیاد کا کام کرتی ہیں، جن پر ادبا اپنے قدموں کو جما کر حال اور مستقبل کی گذرگاہوں سے نئی نئی تجلیوں اور افکار ونظر کے نئے نئے آفاق تلاش کرتے ہیں اس لئے غیر فانی، اور پائدار ادب کی تخلیق ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی ادیب ماضی سے اپنے رشتہ کو توڑ لیتا ہے اور صرف مستقبل کی طرف اپنی نگاہوں کو مرکوز رکھتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح سے ہے جس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اور وہ فضا میں معلق ہے۔ جو چیز فضا میں معلق ہوتی ہے اس کے وزن [illegible] اس کی قیمت اور اس کی ابدیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ کچھ یہی حال دور جدید میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کا ہو کر رہ گیا ہے مگر اکرام انجم صاحب کی شخصیت وسیرت اور نظم وغزل میں یہ سطحیت، ناپائداری اور بے دھری نہیں ہے۔ ان کے ہاں اردو کی کلاسیکی روایات کا سارا حسن وجمال، اور بدلتی ہوئی زندگی کے تمام شعور وافکار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس طرح ان کا فن جدید وقدیم کے درمیان ایک سنگم نظر آتا ہے۔ ان کے فن کی اس انفرادی خصوصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ چنانچہ میں ان کے فن وادب کے متعلق اپنے افکار وآراء سے آپ کو واقف کرانے جا رہا ہوں۔

اکرام انجم کو بنیادی طور پر صنف غزل سے بڑی دلچسپی، رغبت، اور محبت ہے۔ ان کی پرورش وپرداخت جس ماحول میں ہوئی وہاں غزل کا جادو ہر طرف چھایا ہوا تھا اس لئے تغزل کے مزاج اور نفسیات سے اکرام انجم صاحب پوری طرح واقف ہیں مگر مجنوں گورکھپوری، اور پروفیسر نفیس حسین لکچرر انگلش کے زیر تربیت اکرام انجم کو نئے حالات وحادثات کے سمجھنے کا بھی موقع ملا اس لئے ان کے ہاں متغزلانہ مزاج نئے دور کی تمام تلخی اور شیرینی کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت چونکہ گورکھپور کی فضا میں ہوئی ہے اس لئے گورکھپور کے ادبی ماحول نے ان کی ذہنی ساخت وتربیت میں بڑا حصہ لیا ہے۔ فراق گورکھپوری اور مجنوں گورکھپوری ترقی پسند ہونے کے باوجود تخلیق فن کے معاملے میں بے حد سنجیدہ، متین، متوازن، اور مخلص رہے ہیں۔

اکرام انجم کی شاعری میں بھی یہ خصوصیات موجود ہیں غزل کے علاوہ نظم سے بھی اکرام انجم کو خاصا شغف ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص غزل کے اسلوب وانداز اور مزاج ونفسیات پر قابو پالے گا وہ دوسری صنفوں میں بھی کامیاب رہے گا۔ دراصل غزل کا فن سب سے مشکل فن ہے۔ تلوار کی باڑھ پر چلنا آسان ہے۔ مگر غزل کے رموز ونکات سے مکمل آگہی حاصل کرنا مشکل ہے۔ جگر نے کہا تھا ؎

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

غزل بنیادی طور پر واردات عشق کے اظہار کا دوسرا نام ہے

اسلئے غزل نگار شاعر کو آگ کے دریا سے ڈوب کر گذرنا پڑتا ہے
ق میں ممکن ہے کہ ایک بار ڈوب کر گذرنے کے بعد معراج محبت
صل ہو جائے۔ لیکن غزل گوئی کے لئے آگ کے دریا سے بار بار
رنا پڑتا ہے۔ یہ کام کچھ اتنا سہل نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس
میاب ہونے کا دعویٰ کرے مگر اکرام انجم نے غزل کے فطری
تقاضوں کو تمام امکانی حدود تک پورا کیا ہے۔ وہ ہر لحظہ اس
مشاطگی و آرائش کے لئے آگ کے دریا سے گذرتے رہے ہیں
اکی اسی ریاضت اور فنی جہاد نے ان کو ایک فطری غزل گو بنا
یا ہے۔ اس طرح غزل ان کی روح میں رچ بس گئی ہے یا یوں
ہئے کہ وہ غزل کی معراج حاصل کر چکے ہیں۔ اس منزل سے گذرنے
بعد کوئی بھی فنکار دوسری منزلوں کو بآسانی طے کر سکتا ہے
ظم نگاری کے تقاضوں کو اکرام انجم نے کامیابی، اثر انگیزی
یانداری، حسن سلیقہ، خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پورا کیا ہے
سلئے کہ فنی رموز و اسرار اور تقاضوں سے وہ غزل گوئی کے دور
لہ میں واقف ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی نظموں میں حد سے زیادہ
سلیقۂ فن نظر آتا ہے۔ شاعری تو یوں بھی ایک سلیقہ کا نام ہے
یر تقی میر اسی لفظ "سلیقہ" کو شاعری کی روح سمجھتے ہیں۔
سلیقۂ فن کا مطلب یہ ہے کہ بہترین خیالات کو خوبصورت اور
ثر انگیز اسلوب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اور یہی سلیقۂ شاعری
ہے۔ اور یہ چیز اکرام انجم کی نظموں میں بے حد نمایاں ہے۔ ان کی
ظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک ایک لفظ معنویت
ن و جمال، علامتیت اور رمز و کنایہ کی جہات سے اپنی جگہ
نگینہ کی طرح چسپاں رہتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان کے بارے
ں بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ نگینہ سازی کرتے ہیں
گریزی میں (Ornamention) کی ایک ترکیب
بت مشہور ہے۔ اکرام انجم کے اسلوب کے بارے میں بھی یہی کہا

جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں انگریزی کی اسی ترکیب کا سہارا
لینا ہوگا۔ مزید تشریح کے لئے میں آتش کا یہ شعر سنانا پسند کروں گا۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کی یہ تعریف شاعری اکرام انجم کے ہاں عملی طور
پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی کئی نظموں کا حوالہ
دینا پسند کروں گا۔ مجھے ان کی نظموں میں "جذبۂ تخلیق"، "انتظار"
"نذر بہادر شاہ ظفر"، "سیلاب کے نام"، "ویتنام کے نام"،
"نغمۂ حیات"، "تاشقند"، "سوال"، "تعبیر خواب"، "امید فردا" وغیرہ
بے حد پسند ہیں۔ اس لئے کہ ان میں فنکاری بھی اعلیٰ درجہ کی ہے
اور موضوع بھی بہت نفیس اور قابل قدر۔ یعنی داخلی اور
خارجی دونوں جہتوں سے یہ نظمیں فنکاری کا اعلیٰ ترین نمونہ
کہی جا سکتی ہیں۔ نظم "انتظار" کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ اس
بند میں لفظوں کا انتخاب، سلاست، موسیقی، اور برجستگی
ایسی خصوصیت ہے جو اب عام طور پر اردو شاعری سے
عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

جو تم نہیں ہو تو بزم خیال کی شمعیں
تمہاری یاد میں دیوانہ وار گذری ہیں
جھپک گئی ہیں جو پلکیں تو درد کی کرنیں
صبا کی طرح بہت بے قرار گذری ہیں

اس بند کا پہلا مصرعہ جس کی تشریح و تفسیر باقی تین
مصرعے کرتے ہیں۔ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور پہلا
مصرع بقیہ تین مصرعوں سے اس گہرے طور پر جڑا ہے کہ
کسی مصرع کی معنویت ایک دوسرے کے بغیر اجاگر نہیں ہوتی
"بزم خیال کی شمعیں" کا جو تعلق "درد کی کرنیں" اور
"صبا کی طرح بے قرار گذرنے" سے ہے۔ وہ ظاہر ہے اور

ان تینوں مصرعوں کی معنویت کے بعد " تمہاری یاد میں دیوانہ وار گزری ہیں " کے مصرع میں جو نشتریت پیدا ہوتی ہے وہ اہل فن کی نگاہ سے مخفی نہیں۔ اس طرح پہلے مصرع کی اثر آفرینی میں دوسرا مصرع اور اس کے بعد تیسرا اور چوتھا علی الترتیب اضافہ کرتا ہے اور جب چار مصرعوں کا یہ بند مکمل ہوتا ہے تو انتظار کی کسک اور جلن کا احساس قاری کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بند ہر اعتبار سے بیحد مکمل، مربوط، منظم اور مرتب ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد جو کسک ہم اپنے سینے میں محسوس کرتے ہیں اسی کی تشریح کے لئے دوسرا بند ملاحظہ ہو ؎

تمام رہزنِ ایماں ہے آفتِ جاں ہے
وہ اک خلش کہ جسے حرفِ آرزو کہیئے
تمام عمر جو سیماب وار رکھتی ہے
جسے حدیثِ رخ و زلف شکبو کہیئے

یہ دوسرا بند دل کی اس کسک میں مزید اضافہ کرتا ہے وہ اک خلش جو رہزن ایماں بھی ہے اور آفت جاں بھی اور جو تمام عمر سیماب وار رکھتی ہے۔ وہ حدیثِ رخ و زلف شکبو ہے اور یہی حدیث بزم خیال کی شمع بن کر پہلے بند میں دیوانہ وار گزری ہے۔ دراصل پہلے بند اور دوسرے بند میں جو معنوی ربط و تعلق ہے اسی کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں یہ دوسرا بند جو ہر اعتبار سے تراشیدہ و خراشیدہ اور سانچے میں ڈھلا ہوا ہے پہلے بند کی تفسیر بھی ہے۔ اور آئینہ بھی اور اس کو دو آتشہ بھی بناتا ہے۔ اگر دوسرا بند کامیاب اور موثر نہ ہوتا تو نظم کا ارتقا مجروح ہو جاتا۔ اس بند کو پوری نظم میں اس لئے مرکزی حیثیت حاصل ہے کہ اپنے پہلے اور بعد کے دونوں بندوں کو اس نے بڑے سلیقے کے ساتھ ہم آہنگ کر رکھا ہے۔ وہ اک خلش جو انتظار کی صورت اختیار کر گئی ہے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے فنکار نے اس بند کو مرکزی حیثیت دی ہے اس خلش کی تعریف و توصیف شاعر نے جس انداز سے کی ہے وہ ذریعۂ اظہار کی دلکش مثال ہے۔

تمام رہزن ایماں ہے آفت جاں ہے، کا مصرع اس حرف آرزو کی تفسیر کے لئے کافی ہے جس کی تشریح کے لئے دفتر چاہئے۔ رہزن ایماں، اور آفت جاں کی ترکیبوں نے خلش اور حرف آرزو دونوں کی بہترین تشریح و توضیح کر دی ہے۔ اس طرح اس بند میں آکر نظم کا "ٹیمپو" Tempo یکایک بہت بڑھ جاتا ہے اس کے بعد تیسرا بند آتا ہے جو اس طرح ہے۔

مری نظر میں ہے رقصاں تمہارا پیراہن
اور اک فریب مسلسل ہے اے مری محبوب
جلا رہی ہے کچھ اس طرح جسم و جاں کی یہ آگ
بجز تمہارے نہیں کوئی شے مجھے مطلوب

یہ آخری بند انتظار کی تمام کیفیتوں کو مکمل و منظم طور پر پیش کرتا ہے، اس بند کے پہلے اور دوسرے مصرع میں جو حقیقت پسندی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ شاعر کی نگاہ میں محبوب کا پیراہن آرزوؤں اور تمناؤں کے روپ میں رقصاں ہے۔ آرزوئے دل کو محبوب کا رخشندہ پیراہن کہنا، ذریعۂ اظہار کی دلکش مثال ہے۔ انداز زندگی کے دوسرے علائق کو ایک فریب مسلسل سے تعبیر کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ فنکار عرفان حیات و کائنات حاصل کر چکا ہے۔ تعبیر و تفسیر کی یہ حسن کاری بڑی ریاضت فن چاہتی ہے۔ اور اقبال کے لفظوں میں " خون جگر " کی متقاضی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اکرام انجم نے فن کے لئے خون جگر خوش دلی کے ساتھ صرف کیا ہے۔ تیسرے مصرعے میں " جسم و جاں کی یہ آگ " ان کے خون جگر کے صرف کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چوتھا مصرع شاعر کے شدت جذبات

واحساسات کا مظہر ہے یہی وہ منزل ہے جب کوئی عاشق حیات وکائنات سے گذر کر معشوق کی بارگاہ میں پہونچنے کا متمنی ہوتا ہے اور ہم کناری کے مخلصانہ اور سچے جذبہ سے سرشار ہوتا ہے اس طرح میں خلوص، سچائی اور ایمانداری ہے۔ اس کا اظہار نظم کے آخری شعر میں اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ ہوا ہے۔

بس آبھی جاؤ کہ دل بیقرار ہے کب سے
ہمہ نگاہ، ہمہ انتظار ہے کب سے

اس شعر نے نظم کی تاثیر میں بڑا اضافہ کیا ہے انتظار کے موضوع پر اردو میں اشعار اور نظمیں بھری ہوئی ہیں مگر دل کو ہمہ نگاہ اور ہمہ انتظار کہنا اور وہ بھی اس طرح کہ شدت جذبات ابھر کر سامنے آجائے۔ اکرام انجم ہی کا حصہ ہے۔ سات اشعار پر مشتمل یہ نظم جتنی گھٹی ہوئی، مربوط اور دلکش وحسین ہے اتنی ہی کامیاب اور عمدہ فنکاری کا بہترین نمونہ بھی انتظار کے موضوع پر اردو کی کامیاب اور مشہور نظموں میں اسے شمار کیا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس نظم کی یہ ہے کہ اسلوب اور موضوع دونوں بڑے حسن اور خوبی کے ساتھ آپس میں شیر وشکر ہو گئے ہیں۔ غیر فانی ادب کی شرط یہ ہے کہ موضوع اور اسلوب میں مکمل ہم آہنگی ہو اور یہ خصوصیت فن اس نظم میں موجود ہے یہی وجہ ہے کہ انفرادی تجربہ ہونے کے باوجود اس نظم میں اجتماعی کسک اور خلوص کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

"جذبۂ تخلیق" ان کی دوسری نظم ہے جو ہر اعتبار سے کامیاب اور مکمل نظم ہے اس نظم میں گیارہ بند ہیں، ہر بند مربع کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح چوالیس مصرعوں کی یہ نظم "جذبۂ تخلیق" کے تمام تخیل و جذبات کو بے حد شاعرانہ اور فنکارانہ انداز میں پیش کرتی ہے اس نظم کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کا فنی ارتقاء اس طرح ہوتا گیا ہے جس طرح کوئی تخلیق اپنی ارتقائی منزل طے کرتی ہے۔ پہلا بند ملاحظہ ہو ؎

ایک مبہم سی خلش پردۂ دل پر ابھری
جام چھلکے کئی اس جذبۂ بے نام کے نام
سامنے آنے لگی حافظ و خیام کی بات
ذہن آذر نے تراشے نئے اصنام

انسان کے سینے میں تخلیق کا جذبہ جہاں ابھرتا ہے اس کی آئینہ داری اس سے بہتر طور پر نہیں کی جاسکتی۔ "مبہم سی خلش" کی ترکیب اگر تفصیل کی منزلوں سے گذرے تو بات "کن" کی حدود میں جا پہونچے گی۔ دنیا کا کوئی بھی ماہر نفسیات اس "مبہم سی خلش" کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ تخلیق کا سارا کرب اسی کا رہین منت ہے۔ جسے اکرام انجم "مبہم سی خلش" کہتے ہیں۔ آج تک کوئی فنکار اپنی اس خلش کا شعور حاصل نہ کرسکا۔ اکرام انجم کو اس خلش کے مبہم ہونے کا احساس ہوا یہ بڑی بات ہے۔ اس تصور کے پیچھے انسان کے ادھورے پن یا نا تکمیلی کا احساس کرب موجود ہے۔ یا یہ کہ ماورائی کا دکھ نمایاں ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کائنات میں حسن کے جلوہ ہائے گریزاں انسانوں کی مکمل تشفی نہیں کرتے تجلی کی ایک ہلکی سی کرن کبھی کبھی نگاہوں کے سامنے رقصاں ہوتی ہے اور پھر تیزی کے ساتھ گذر جاتی ہے۔ اور انسان دوسری طرف اس تجلی کو اسیر کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اور یہیں سے اپنی نامرادی، ناتکمیلی اور کمی کا احساس اسے ستاتا ہے۔ "مبہم سی خلش" کی اس ترکیب کے پس پردہ سارے دکھ درد جو اجتماعی بھی ہیں اور انفرادی بھی موجود ہیں۔ اکرام انجم نے اس خلش کو دوسرے مصرعہ میں "جذبۂ بے نام" سے موسوم کیا ہے اور اس طرح انہوں نے قاری کے دل میں بھی غم والم کے

کئی جام چھلکائے ہیں" وہ جذبۂ بے نام " کہ جو بہرکیف ایک خلش مبہم ہے جسے آہ و فغاں کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہے اور اس آہ و فغاں یا " جذبۂ بے نام " کی تسلی کے لئے حافظ و خیام کے فلسفۂ جبری میں پناہ مل سکتی ہے ۔ میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ہر مصرع کتنی گہری معنویت کی بنیادوں پر ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اسکو سامنے رکھنا چاہئے ۔ یہ تینوں مصرعے ایک دوسرے سے بے نیاز ہوکر خوبصورت تو رہ سکتے ہیں ۔ لیکن یہاں سلسلے اور سلیقے کے ساتھ آئے ہیں تو ذہن آذر کی شکل میں ڈھل گئے ہیں ۔ جس کا نتیجہ خیالی اصنام کی تراش و خراش ہوتی ہے اور اس طرح چار مصرعوں پر مشتمل یہ بند ہمیں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے ۔ دوسرا بند دیکھئے ؎

سینۂ فکر میں مہتاب کا چہرہ چھلکا
رفعتِ بام پہ آئی لب و رخسار کی دھوپ،
کرب کی آنچ سے احساس کی شمعیں پگھلیں
اور بھی تیز ہوئی عارضِ گلنار کی دھوپ

دوسرے بند کا پہلا مصرعہ کتنا متوازن ہے، غور کرنے کی چیز ہے ۔ سینۂ فکر اور مہتاب کی تجلی جلال و جمال کی ہم آہنگی کا بہترین ثبوت ہے اس طرح " لب و رخسار کی دھوپ " میں بھی وہی تعاون پایا جاتا ہے ۔ تیسرے مصرع میں جلال ہی جلال ہے ۔ کرب کی آنچ سے احساس کی شمع کا پگھلنا کچھ آسان نہیں ہے ۔ پہلے مصرع میں فکر، دوسرے میں جذبہ اور تیسرے میں احساس کی پگھلی ہوئی شمع اور چوتھے میں عارضِ گلنار کی دھوپ یعنی جذبۂ تخلیق ایک مکمل صورت اختیار کر رہا ہے ۔ تخلیق کے بنیادی تقاضوں میں تحریک تخلیق کی اہمیت ہوتی ہے ۔ یعنی شاعر یا فنکار کسی موضوع سے تحریک حاصل کرتا ہے ۔ اس تحریک کو فنکار کی قوت تخئیل مرکزیت اور اہمیت دیتی ہے ۔ پھر اس میں فکر، جذبہ، اور احساس شامل ہوتا ہے اور اس طرح شاعر تخلیق کے مراحل طے کرتا ہے ۔ اس تخلیقی تسلسل کو اکرام انجم نے دو بند میں بے حد کامیابی کے ساتھ پیش کر دیا ہے ۔ پہلے بند میں جس مبہم سی خلش کا ذکر ہے دراصل وہ تحریک تخلیق ہے ۔ پہلے بند کے دوسرے اور تیسرے مصرعے سے قوت تخئیل نے اپنا کام شروع کیا ہے اور چوتھے مصرعے میں فنکار کی قوت تخئیل اسے ذہن آذر بخشتی ہے ۔ اس طرح تخلیقی عمل کا ابتدائی حصہ بالکل مکمل ہو جاتا ہے ۔ مگر تحریک اور تخئیل فن کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتے جب تک ان میں جذبہ" احساس "، اور تاثیر کی آمیزش نہ ہو ۔ فن تو وہی عظیم و لافانی ہوتا ہے ۔

جس میں انسانی ادراک، تخئیل، جذبہ، احساس اور فکر متوازن انداز میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوئے ہوں ۔ تخلیقی عمل کے ان تقاضوں کا احساس و شعور اکرام انجم کو حاصل ہے ثبوت کے طور پر یہ دو بند پیش خدمت کئے جا چکے ہیں ۔ طوالت کے خوف سے میں اس نظم کے صرف ایک دو بند آپ کو سنا کر اس نظم کی اہمیت کو روشن کرنے کی کوشش کروں گا ؎

سج گئی ہر روش فکر و نظر کی محفل
دیکھتے دیکھتے کلیوں کی جوانی جاگی
جل گئے رشک سے گردوں پہ ستاروں کے کنول
آگ شیشے میں جو رکھی تھی پرانی جاگی

اس بند کے متعلق میں آپ سے اتنا عرض کروں گا کہ اکرام انجم نے انسان کی تخلیقی قوت، صلاحیت، اور عظمت و بلندی کا بہت ہی دلکش اظہار کیا ہے ۔ یہاں عظمت، انسانیت کا وہی تصور موجود ہے جو اقبال کے یہاں " تو شب آفریدی، چراغ آفریدم " کے پس پردہ رہا ہوگا ۔ مصرع بے حد قابل قدر ہے ؎

جل گئے رشک سے گردوں پہ ستاروں کے کنول

اس بند کے بعد میں آپ کو دسواں بند سنا رہا ہوں ؎

سامنے آگئی " تہذیب جنوں " کی منزل

آمنہ بن کے۔ تخئیل منور کا موسم
کہیں کشکول غزل۔ اور کہیں پیمانہ نظم
لے گئے اجرامِ فلک تک کا موسم

اس بند میں نظم اپنے ارتقاء کے قریب ہے۔ چنانچہ تہذیب جنوں۔ کی بات پہلے مصرعہ میں نظر آتی ہے۔ تخلیق عمل کے لئے وحشت دیوانگی ضروری ہے۔ تخلیقی منزل میں دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کا ہونا بھی بڑا ضروری ہے۔ ورنہ انسان اپنی دیوانگی، وحشت یا اپنے جذبہ واحساس کی گرم آنچ میں خود پگھل جاتا ہے۔ اکرام انجم کو اس حقیقت کا احساس وشعور اچھی طرح سے ہے۔ وہ تہذیب جنوں کی بات کرتے ہیں۔ یہ دراصل غزل کی کسوٹی کا دوسرا نام ہے جس کا ذکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے اگر کوئی شاعر "تہذیب جنوں" کے آداب سے واقف نہ ہوسکا تو وہ کبھی ابدی اور سرمدی حیثیت حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے سامنے اس کا بہترین ثبوت جوش ہے۔ اگر جوش کو یہ تہذیب جنوں، حاصل ہوتی تو وہ آج اردو کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔ اور اس کی یہ عظمت غیر فانی اور پائیدار ہوتی۔ مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ جوش کا اثر اردو شاعری پر سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی واحد وجہ یہی "تہذیب جنوں" کی کمی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ اکرام انجم جوش کی طرح تہذیب جنوں کے آداب سے ناواقف نہیں۔ اب اس نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

تشنگی سے سے پگھل جاتی ہے مینا کیسے
پھینکتا ہے کوئی کس طرح ستاروں پہ کمند
آج یہ بات کھلی مجھ پہ سرِ بزمِ خیال
خضرِ منزل ہے فقط عزمِ جواں، عزمِ بلند

میں اس بند کے متعلق صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس کا ایک مصرعہ بے حد قابلِ غور ہے۔ اس مصرعہ میں اکرام انجم نے عزمِ جواں اور عزمِ بلند کی بات کہی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جذبۂ تخلیق سے عزمِ جواں کا کیا تعلق۔ لیکن یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ تخلیق کا کوئی بھی جذبہ عزمِ بلند کے بغیر اظہار وعمل کی منزل نہیں پا سکتا۔ اسی لئے اکرام انجم نے عزمِ جواں کو جذبۂ تخیل کا خضر قرار دیا ہے۔ اور یوں یہ نظم فنی یا جمالی اعتبار سے اس مصرعے پر آکر مکمل ہوگئی ہے۔

نظموں کے علاوہ اکرام انجم نے صنفِ غزل میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ غزل میں ان کے یہاں روایت وجدت کا ایک خوشنما امتزاج ملتا ہے۔ روایتی شاعری پر ان کی نگاہ اچھی ہے۔ اس لئے اردو غزل کی فنی روایات کو وہ بڑے سلیقہ سے برتتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ روایات کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے عہدِ حاضر کے فنی، فکری، نفسیاتی اور جذباتی تقاضوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں فن اور فکر دونوں جہتوں میں ایک نیاپن پایا جاتا ہے۔

غزل کی شاعری ایک داخلی شاعری ہے جس میں فنکار اپنے نجی، شخصی، یا داخلی تجربات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مگر اس کے میڈیم یا ذریعۂ اظہار میں آفاقیت اور جہانگیریت ہوتی ہے۔ کامیاب غزل گو وہی ہے جو انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی اور آپ بیتی ہونے کے باوجود جگ بیتی کے خصائص رکھتی ہو۔ میر تقی میر کے یہاں حد سے زیادہ داخلیت ہے۔ لیکن اس داخلیت میں ایک ایسا اندازِ بیان پایا ہے جس نے میر ان کے نجی احساسات وواردات سے اسے ہم آہنگ کردیا ہے۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کا خیال، جذبہ اور کوشش کارفرما ہے۔ انجم بھی اپنے ذاتی احساسات کو عالمگیر اندازِ اظہار بخشنے کی کوشش کررہے ہیں۔

یوں تو وہ کہتے ہیں ؎

آئینہ دار ہے مرا ہر شعر ــــ درحقیقت مرے غم دل کا

لیکن یہ آئینہ داری ہر فرد دلبشر کے غم دل کی ہوا کرتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو ہر غزل گو کو غیر فانی شہرت دیتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حال دل پوچھ رہے ہیں مجھ سے
پاس ناموس وفا ہو جیسے

ہر نفس دیتا ہے پیغام شکست ہستی
دیکھئے اس کو تقاضائے اجل کہتے ہیں

آئی تمہاری یاد اچانک کچھ اس طرح
چھپ جائے جیسے کوئی کسی کو پکار کے

حیاتِ غم کے جلو میں گذار دیتے ہیں
ہلاکتانِ محبت کی بات کیا کہیے

جگمگائے ہیں کیا صنم خانے
اک حقیقت کو کہہ دیا جو مجاز

کاٹ دی جبر و بے حسی میں انجم
زندگی کا حساب کیا ہوتا

روز بکتے ہیں یہاں سیکڑوں یوسف سے حسیں
زندگی مصر کا بازار ہوئی جاتی ہے

دل کے گوشے ہیں کہ تاریک ہوئے جاتے ہیں
عقل انساں ہے کہ بیدار ہوئی جاتی ہے

درج بالا اشعار میں روایت کا حسن اور جدت کی تازگی دونوں متوازن انداز میں ملتے ہیں۔ یہ اشعار بڑی بلندی سے کہے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں شاعر کا خلوص، ایمانداری، اور صداقت موجود ہے۔ انجم پچھلے تیرہ چودہ برسوں سے مشاغلِ شعر و سخن کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں انہوں نے مشق و مہارت کی کٹھن منزلیں طے کی ہیں، اور "خونِ جگر" کو صرف کرنے کا حوصلہ، جرأت اور فن سیکھ لیا ہے ان کی غزلوں میں وہ انداز صاف طور پر جھلکنے لگا ہے جو عظمت فن کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر وہ اسی خلوص، توجہ اور ایمانداری کے ساتھ اپنے ذوق کی پرورش کرتے رہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں ایک ناقابلِ فراموش ادبی اور فنی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

توازن اور اعتدال کی راہ سب سے اچھی اور قیمتی ہوتی ہے۔ اکرام انجم نے اپنے لئے فن کی اس راہ کو اپنایا ہے جس کی طرف میں نے درج بالا سطور میں اشارے کئے ہیں۔ ابھی ان کے کلام میں کلاسیکی روایات کا بڑا گہرا اثر جھلکتا ہے بعض بعض اشعار قطعی روایتی انداز کے حامل ہیں مثلاً

زلفوں کی سیاہی ہو کہ عارض کی صباحت
تا حد نظر شام و سحر دیکھ رہا ہوں

یہ بت نہیں اے شیخ فقط دیر کی زینت
کعبہ کے بھی صدیوں یہ نگہبان رہے ہیں

یارب کہیں نہیں نہ تمہیں نظر لگے
آئینہ دیکھتے ہیں وہ زلفیں سنوار کے

پھر وہ شانۂ زلف پہ آمادہ ہیں
پڑ نہ جائے کہیں پھر نظم دو عالم میں خلل

دل سے وحشی کو رام کرنا تھا
کوئی یوں بے نقاب کیا ہوتا

دیوانگیٔ عشق سلامت کہ ان دنوں
باقی نہیں ہے جیب کو اب حاجت رفو

کہتا ہے کوئی کعبہ کوئی اسے بت خانہ
دل ہے کہ حقیقت میں ٹوٹا ہوا پیمانہ
پھر شیخ و برہمن کو یہ راز ہے سمجھانا
سب اس کے مظاہر ہیں کعبہ ہو کہ بت خانہ

اس قبیل کے دیگر اشعار بھی انجم کی غزلوں سے بآسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ انداز بیان کی شگفتگی اور صفائی کے باوجود ان اشعار میں روایات کی جھلک پائی جاتی ہے جو ماضی وحال کے ارتباط کا حسین نمونہ ہے۔ ان اشعار کو روایتی کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ ان میں تکرار خیال اور تکرار تجربہ کی گرانباری، بوجھل پن، اور ثقالت ہے۔ اس لئے ان سے قاری کے ذہن و دل اور روح کو کوئی تسلی بخش نشاطیت نہیں ملتی۔ مگر ان ہی کے پہلو بہ پہلو انجم کے کلام میں ایسے شعر بھی کافی مل جاتے ہیں جو نئے، اچھوتے، تازہ اور جدید رنگ و آہنگ سے ہیں۔ اگر انجم مکمل طور پر اپنی اس روش کو برقرار رکھ سکے جو جدید اور قدیم کی درمیانی روش ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنی انفرادی حیثیت حاصل کر لیں گے۔ ابھی ان کے یہاں کچھ تذبذب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کبھی تو وہ روایتی رنگ و آہنگ اختیار کرتے ہیں اور کبھی تو روایت و جدت کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا کرتے ہیں۔ دراصل یہی مؤخر الذکر رنگ ان کے اسلوب اور فن کی امتیازی اور انفرادی خصوصیت ہے۔

ابھی وہ فنکاری کی جس منزل پر کھڑے ہیں وہاں ان کے فکر و فن میں ہم آہنگی اور امتزاج موجود ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے مگر ان کو ابھی فکر و فن دونوں جہتوں سے ارتقاء کی ایک طویل رہگذر طے کرنی ہے۔ ابھی ان کی فکر میں پختگی، عظمت، صلابت، تنوع وسعت ہمہ گیری، عمیق اور بلند پرواری کی ضرورت ہے۔ اور یہی خصوصیتیں ان کے فن کو بھی درکار ہیں۔ جب ان کے فکر و فن میں یہ مذکورہ بالا صفتیں آ جائیں گی تو وہ ابدی و سرمدی حیثیت و اہمیت حاصل کر لیں گے۔ لیکن اس موڑ پر بھی ان کی فنکاری بہت سے اچھے اور مشہور شاعروں سے زیادہ عظمت و جلالت کی حامل ہے۔ اس بنا پر میں ان کو اردو شاعری کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔

حکیم عبدالباقی حکیم

ایک تعارف ـــــ ایک تجزیہ

از: ۔ پروفیسر سید عبدالخالق

شخص اور شخصیت الگ الگ چیزیں ہیں۔ جب تک شخصیت میں " تب و تاب دروں " شامل نہ ہو شخصیت " دیدہ وری " حاصل نہیں کر سکتی ہے اور نہ بلندیوں کو ہی چھو سکتی ہے شخصیت جہاں مرہون منت ہوتی ہے ماحول کی ۔ وہاں اس کی اٹھان میں ورثے کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ پھر ذوق و وجدان ـــــ اسے اپنے رنگ و نور سے نئی جلا بخشتے ہیں۔ جب کہیں جاکر شخصیت میں " بالیدگی اور بالغ نظری " پیدا ہوتی ہے اور ایک عالم کو اپنا گرویدہ بناتی ہے ۔

بڑی شخصیت ـــــ وہ ہوتی ہے جو ماحول کی پروردہ ہوتے ہوئے بھی ماحول کی پروردگار بنتی ہے۔ زمانہ اور زندگی دنیا رنگ و روغن عطا کرتی ہے۔ " اس کے سیل رواں " کو نہ صرف تھام لیتی ہے بلکہ اسے نئے رخ اور نئی جہت سے آشنا بھی کرتی ہے ۔

بڑا شاعر وہ ہے ـــــ جس نے زمانے کے تقاضوں کو نیرنگی و خوش آہنگی کی قوس قزح دیئے ہیں غزنوی تڑپ در " زلف ایاز " میں خم دیکھے ہیں اور گلشن و گلخن کے نشاط و تپش کی لہریں قلب تپاں میں محسوس کی ہیں ـــــ اس نے نئی فضا نئی پرواز سکھائی ہے ۔

بڑی شاعری اور اعلیٰ شاعری ـــــ وہ ہے جو زمانہ اور زندگی پر محیط ہو اور اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرتی ہو حسن و حیات کا نیا تصور دیتی ہو ـــــ کبھی تفسیر کی زبان بن کر کبھی گل و گلزار کی کہانی سنا کر، تو کبھی حسن و عشق کی داستاں کہہ کر، اور کبھی بادۂ تصوف و عرفاں کا چراغ روشن کر کے ـــــ ہماری زندگی کی تماشیں پیش کرتی ہو!! ـــــ چنانچہ اس سلسلے میں اردو شاعری بھی اپنا خاص خدوخال رکھتی ہے اور قد و قامت بھی ـــــ یہ شاعر کے اپنے ذہن و ذوق اور نقد و نظر کی بلند آشیانی پر منحصر ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو کہاں تک شعریت اور نغمگی کی زبان عطا کرتا ہے اور کس حد تک اپنے ماحول اور ورثے کو برت کر " جام سفال " کو " جام جم " بنانے میں اپنے تجربوں کو تکلم بخشتا ہے۔ پھر مشاہدہ و مطالعہ کی نگہہ و نکہت کس سادگی و پرکاری سے لفظ و نقوش میں ڈھالتا ہے۔ اور کس زاویے سے ذوق و وجدان زندگی کی جمالیات اور حسن کی نایابی سے ہم آہنگ کرتا ہے ـــــ یہ وہ گوشے ہیں۔ یہی وہ زاویے ہیں جو شاعر کو نئے بال و پر عطا کرتے ہیں۔

کوئی بھی شاعر عصری تقاضوں اور تحریکوں سے بے نیاز

نہیں رہ سکتا۔ ورنہ نقش سارے ناتمام ہی رہ جائیں گے ——— یہی لکیریں ۔ یہی گو مجیں ۔ شاعر کو کبھی تو طاؤس و رباب کی دعوت دیتی ہیں اور کبھی شمشیر و سناؤں کی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہی شاعر جو کبھی "گلستاں راہ" میں آئے تو ، جوئے نغمہ خواں ہونے کی نرم ہدایت کرتا ہے تو کبھی "مصاف زندگی" میں ، سیرت فولاد پیدا کرنے کی تلقین ، اس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی شاعر زندگی کی شاہراہ پر آنکھیں بند کر کے فکر و جذبہ کا کارواں لیے آگے نہیں بڑھ سکتا تا آنکہ وہ اپنے تجربہ و مشاہدہ کو جذب و کیف سے ہم آہنگ کر کے زمانہ کی گرم رَو کا ساتھ نہ دے۔

اب آئیے ذرا بہار کی سیر کریں ——— اور شعر و سخن کا عمومی جائزہ لیں۔ ماضی میں بہار شعر و سخن کا ایک اہم مرکز رہا ہے اس نے ہر عہد میں جوہر قابل پیدا کئے ہیں اسکے در و دیوار سے نغمے پھوٹے ہیں ، چشمے ابلے ہیں اور ساغر اچھلے ہیں ——— عظیم آباد کی گلیاں ——— اس کی شاہد ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عظیم آباد اپنے عروج و عروج کے دور میں کبھی کسی دبستان کا خوشہ چیں نہ رہا بلکہ اس نے خود ایک نئے دبستان کی طرح ڈالی اور شیریں دیوانگی ، اور مقدس سنجیدگی کو نئے زیور اور نئے خلعت سے آراستہ کیا۔ یہ عظیم آبادی کا توفیق تھا کہ شعر و شاعری کی محفلیں دوسرے شہروں میں بھی ترتیب دی جانے لگیں اور آسمان سخن پر فکر و نظر کی کہکشاں روشن ہونے لگی۔ پھر تو دیکھتے ہی دیکھتے عظیم آباد کی یہ روایت بہار کے اہم تہذیبی شہروں میں فروغ پانے لگی ، چنانچہ ان معروف عام شہروں میں بھاگلپور کو خصوصی درجہ حاصل ہے جہاں شاعری کو نئے افق ملے ، نئی شمعیں ملیں ۔ اور نئی زمین اور نئے آسمان ملے !

بھاگلپور شہر کے متصل ہی ایک مشہور مردم خیز قصبہ واقع ہے جو پورینی کے نام سے موسوم ہے ۔ اس کی خاک پاک سے بڑے بڑے علما اور فضلا اٹھے ہیں ۔ اور ایک عالم کو علم و عرفاں کا درس دیا ہے ۔ آج بھی یہاں کے لبوں پر شعر و نغمے مچلتے ہیں اور ان کے چرچے عام ہیں ——— حکیم عبدالباقی حکیم ——— کا تعلق اسی قصبہ کے مشہور علمی خانوادہ سے ہے جہاں شاعری آپ کو ورثے میں ملی ہے اور طبابت بطور پیشہ خاص اختیار کیا ہے ۔ ایک طرف تو آپ گل قند تیار کرتے ہیں تو دوسری طرف گلشن کو اپنے دامنِ دل سے ہوا دیتے ہیں ایک جانب مسیحا کا لبادہ پہن کر مریضوں کی صحت و توانائی کے لئے نسخے مرتب کرتے ہیں تو دوسری جانب "نرگس بیمار" کا وظیفہ پڑھنے میں مصروف نظر آتے ہیں ، اور قفس میں آشیاں کے لئے خس فراہم کرنے میں غلطاں ——— غالب کو تو اپنے پیشۂ آبا پر فخر تھا ، آپ کو اپنے حکمت کے فن "پر ناز ہے ، چنانچہ ایک جگہ آپ نے خود فرمایا ہے ملاحظہ ہو ؎

حکمت کے فن پہ ناز کا حق ہے مجھے حکیم
عظمت کی وجہ صرف مری شاعری نہیں

آپ بنیادی طور پر غزل گو واقع ہوئے ہیں۔ ویسے غزل ہی میں بند ہو کر نہیں رہ گئے ہیں ، منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کبھی کبھار نظموں اور قطعوں سے بھی اپنا خوانِ سخن سجاتے ہیں اور وقت کی پکار کا ساتھ دیتے ہیں ۔ قطعات بطور تبرک ہی حوالۂ قلم کئے ہیں ۔ البتہ غزلوں میں خوب خوب جوہر دکھائے ہیں ——— وہی غزل جو شاعری کی آبرو بھی ہے اور معراج بھی ——— دشوار بھی ہے اور سہل بھی۔ اور کہیں معیوب ہے تو کہیں محبوب ——— اس کے باوجود آج بھی اردو شاعری کی اہم ترین صنف ہے اور شاعروں کیلئے غلامے کی چیز ——— اب بھی اپنے اندر بھرپور جذب و کشش رکھتی ہے

کیوں نہ ہو؟ حکیمانہ مضمون کو سمونے کی جو صلاحیت اس میں پوشیدہ ہے وہ کسی اور صنف سخن میں کہاں! ——— اور قطرے میں دجلہ دکھانے کا جو ہنر اس کے اندر خوابیدہ ہے وہ کسی اور صنف لطیف میں کہاں — یہ صحافی پان کا مزاج رکھتی تو ضرور ہے مگر جب لالہ و گل کے ہی پردے میں زندگی کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی حقیقتوں کی ترجمانی کرتی ہے تو خونِ جگر سے "قصۂ آدم" اور بھی رنگین و دل نواز بنا جاتی ہے اور حیات و کائنات، سیاست و انقلاب کو شعریت کا بادہ کچھ اس خوبصورتی سے پہنا دیتی ہے کہ ذوق و ذہن چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں ——— اس سلسلے میں آپ نے وہ مشہور شعر تو سنا ہی ہوگا جیسے سراج الدولہ کی شہادت کے موقع پر راجہ رام نرائن موزوں نے ارشاد کیا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اس سے جہاں غزل کے مزاج و منہاج متعین کرنے میں رہنمائی ملتی ہے، وہاں غزل کی اہمیت بھی جھلک اٹھتی ہے۔

حکیم صاحب کے ہاں فکر و فلسفہ کی وہ بلندیاں تو نہیں ملتی ہیں مگر ہاں کہیں کہیں دبے دبے انداز میں چنگاریاں ضرور مل جاتی ہیں ——— آپ کے ہاں نہ وہ شوریدہ سری ہے اور نہ وہ گھن گرج ہے جو ترقی پسندوں کا طرۂ امتیاز ہے البتہ نئے تجربے سنجیدہ قالب میں ڈھل کر دعوت فکر دئے جاتے ہیں ——— ویسے آپ کا کلام امید و آہنگ سے ہم آہنگ بھی ہے اور تندرستی کا اشاریہ بھی ——— نئی صبح، نئے سویرا کی پیش گوئی ملاحظہ ہو ؎

اب آخر شب آئی بیکار نہ گھبرا دل
چمکے گا نیا سورج، اک صبح نئی ہوگی

شاعر کے ہاں جو غم ملتا ہے وہ غم شخصی نہ رہ کر آفاقی "کونینی" بن جاتا ہے۔ اس غم میں سارے جہاں کا غم پوشیدہ نظر آتا ہے ——— شاعر کو خاص قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے اس غم میں۔ بلا سے کوئی غمخوار ملے یا نہ ملے ؎ غم کا تیور تو ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ شاعر کس طرح اسکی پذیرائی کرتا ہے ؎

غم کونین کو غم اپنا سمجھتا ہوں حکیم
مجھکو کیا غم ہو مرا اگر کوئی غم خوار نہیں

کبھی شاعر اقبال کی آواز میں اپنی آواز ملا کر جب یہ کہتا ہے ؎

ندامت کے سجائے دامنِ عصیاں پہ جو موتی
ملے گی سایۂ رحمت میں جا اس چشم پر نم کو

تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو یقین ہے اور بھرپور یقین کہ روز حشر شان کرم بیتاب نکلے گی ——— راحت و رحمت، بخشش و بخشائش کے لئے۔ تو کیوں نہ دامنِ عصیاں پر ندامت کے آنسو سجا رکھیں تاکہ موتی سمجھ کر شان کریمی اسے چن لے۔

ابھی شاعر اس منزل سے نہیں گذرا ہے جہاں سے خود شناسی اور خدا شناسی کی راہیں پھوٹتی ہیں اور دار و رسن کی آزمائش شروع ہوتی ہے اسی لئے تو شاعر اس ہفت خواں سے کترا کر صاف نکل جانا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ سالک عشق کی منزل دار و رسن نہیں۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

اک اہم موڑ محبت کی گذر گاہ کا ہے
سالک عشق کی منزل رسن و دار نہیں

شاعر کی آنکھیں کھلی ضرور ہیں، اسی لئے تو گرد و پیش کے واقعات سے جو آئے دن رونما ہو رہے ہیں شاعر کافی سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں شاعر نے تغزل کا سہارا لے کر سیاسی افق بھی پیدا کئے ہیں اپنے اشعار میں۔ ملاحظہ ہو اس سلسلے میں یہ شعر جس میں شاعر نے اس حقیقت

کی طرف اشارہ کیا ہے کہ چمن کی زینت گلہائے رنگا رنگ سے ہے نہ کہ یک رنگی سے ؎

ایک ہی رنگ کے ہوں پھول تو کھیتی سمجھو
گل صد رنگ نہ ہو جس میں وہ گلزار نہیں

شاعر کا اثاثہ واساس دل ہے ——— یہ وہ جگہ ہے جہاں بہت سارے غم۔ خواہ وہ غم دوراں ہو، خواہ غم جاناں۔ آکر ملتے ہیں اور یہ جوہر غم ہی تو ہیں جو شعر و سخن کی دوکان کو چمکا دیتے ہیں اور اسے لالہ زار بنا دیتے ہیں!

شاعر کے خیال میں وہ انسان انسان نہیں جس انسان کے دل میں درد نہیں، آلام روزگار نہیں، تپش اور تڑپ نہیں اس خیال کا اظہار وہ یوں کرتا ہے ؎

اس کے پہلو میں یقیناً نہیں انسان کا دل
غم و آلام زمانہ سے جو دوچار نہیں

اردو شاعری میں طنز و تعریض کے نشانہ ازل سے ہی صوفی و واعظ، محتسب و زاہد بنتے چلے آئے ہیں لیکن کبھی تو ان ستم ظریف شاعروں نے خانقاہ، اور میکدہ کو ایک ہی صف میں لاکر ملایا ہے تو کبھی شیخ حرم، اور پیر مغاں، کو معانقہ کرتے دکھلایا ہے اور کبھی صدائے ہو، حق اور شور ہاؤ ہو میں کوئی فرق روا نہیں رکھا ہے۔ چنانچہ ہمارا شاعر بھی آخر کو شاعر ہی ٹھہرا، وہ اپنی ریت و روایت کو ترک کرے تو کیوں کر کرے یہاں بھی آگ طنز و ظرافت بھڑک رہی ہے۔ طنز و مزاح کی ایک دو لہریں تو ملاحظہ کیجئے ——— اور دیکھئے کیسی آن بان لئے ہوئے ہیں یہ ؎

وہ میکدہ ہو یا کسی صوفی کی خانقاہ
دونوں جگہ پہ ایک سماں ہے شور ہاؤ ہو

———

یا پھر اسے دیکھئے ؎

میکدے آنے لگے ہیں شیخ بھی
میکشوں سے ان کی اب ان بن کہاں

———

شاعر پھر شاعر ہے، ساغر و پیالہ نہیں، گردش دوام سے اس کا دل کیوں نہ گھبرا اٹھے۔ چنانچہ حالات و حوادث کی سنگینی میں جب گھر جاتا ہے تو اس کی لے مایوسی پر آکر ٹوٹنے لگتی ہے ——— تب وہ گھبرا کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ غم کی سحر ابھی کہاں ؎

ہیں وہی ہر طرف اب بھی تاریکیاں
کیسے سمجھوں کہ غم کی سحر ہو گئی

جب بھی شاعر اپنے گرد اگرد نااہلوں کی عملداری دیکھتا ہے تو وہ مایوس نہیں ہوتا ہے اور نہ اپنے اندر گھٹن ہی پیدا ہونے دیتا ہے بلکہ رجائی انداز میں اسے انگیز کرتا ہے اس سلسلے میں جب کبھی ناقص، و کامل کے موضوع پر بحث کرتا ہے تو اپنے لب و لہجہ کو تلخ نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ نئے عزم و عظمت کے ساتھ یہ احساس اس کے ہاں جاگ اٹھتا ہے کہ اہل ہنر کی قدر مرور ایام کے باوجود گھٹ نہیں سکتی۔ بھلے ہی ابھی الو بلبل بنے بیٹھے ہوں اور زاغ و زغن کی غوغا آرائی میں بلبل کی نغمہ سنجی کی کور دب کر رہ گئی ہو۔ باوصف اس کے شاعر پر امید ہے کہ طوق و تاج کی یہ سرد جنگ۔ ایک نہ ایک دن تاج کو ظفر مند کر کے ہی چھوڑے گی۔ ملاحظہ ہو اس سلسلے میں یہ شعر ؎

گھٹ نہیں سکتی کبھی قدر ہنر پرور حکیم
آج ناقص کی عملداری ہے کامل پہ ضرور

یہاں پر یہ تذکرہ کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا کہ حکیم صاحب کے ہاں مصرعے بڑے ترشے ترشائے ملتے ہیں ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصرعے نہ ہوں، مصری کی ڈلیاں ہوں ———

وہ خالصۃً جاندار بھی معلوم ہوتے ہیں اور معنویت کا ایک جہان تازہ بھی لئے ہوئے نظر آتے ہیں اس سلسلے میں چند "بولتے مصرعے" پیش خدمت ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

حیات نام ہے اک اضطراب پیہم کا

یا یہ ؎

گل صد رنگ نہ ہوں جس میں وہ گلزار نہیں

یا پھر اسے دیکھئے ؎

یہ کشت محبت ہے جل جل کے ہری ہوگی

اور آخر میں اسے بھی دیکھتے چلئے ؎

تکمیل جس کی ہو گئی وہ کیا ہے آرزو

مذکورہ بالا مثالوں سے اس امر کی غمازی ہو جاتی ہے کہ شاعر نے مصرعوں کی تخلیق و تحسین میں بڑی فنکاری اور چابک دستی کا ثبوت دیا ہے!

———

تغزلانہ قوس قزح لئے اشعار آپ کے ہاں بکثرت ملتے ہیں جہاں حسن بھی ہے اور حیات بھی، رنگ و نور بھی ہے اور نغمہ و نشاط بھی ——— بخوف طوالت چند ایک مثالوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں ؎

تنگ بخشی کا شکوہ جرم ہے رندوں کا گر ساقی
تری خاطر کہیں گے ہم زیادہ آتی ہے کم کو

———

اداسی صبحدم چھائی گل و لالہ و نسریں پر
نہ جانے کیا کہا چپکے سے تم نے شبنم کو

———

طعنہ زن اغیار ہوئے حرز تمنا سے پہ مگر
میں وفا پیشہ تھا ایسے میں بھی خاموش رہا

———

وہ حیات میں بس آپ کا سہارا ہے
خدا کے واسطے مجھکو نہ بے پناہ کریں

———

مانا کہ لطف عشرت ساحل بھی کم نہیں
لیکن نشاط شورش دریا کچھ اور ہے

———

بہار آئی جنوں کی پیامبر ہو کر
تم اپنے جیب و گریباں کو تار تار کرو

———

کچھ نظم کے بارے میں

آپ کی نظمیں عام طور پر وقت کی پکار ہوتی ہیں۔ اور زمانے کی پکار بھی ——— نظم "للکار" میں آپ نے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے، اس میں الورا اور تاج، دیوگھر و دیوبند کی قوم کو للکارا ہے، اور میرا بائی و میراجی، گاندھی و آزاد کے وارثوں کو "کاشی" و قطب کے تحفظ کے لئے آواز دی ہے اور اس ہمالہ کی پاسبانی کے لئے ——— جو کبھی ہماری پاسبانی کرتا تھا۔ شمشیر و سناں کی دعوت دی ہے! اسی لئے تو اس نظم میں حرکت و حیات کا تازہ تازہ خون دوڑتا ہوا نظر آتا ہے عزم و حوصلہ، تہور و شجاعت کی لہریں موجزن ہیں، اور جوش و ولولہ ہے کہ امڈا آتا ہے ——— اس موقع پر آپ کا لب و لہجہ "افغانی" بن جاتا ہے۔ فغانی نہیں رہتا۔ البتہ تشنگی و تنگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ جیسے کچھ کھانچے رہ گئے ہیں اس میں!

"جشن بہاراں" خاص دلکش نظم ہے اس کا آخری شعر ؎

باقی صفحہ ٣٠٣ پر

کلام حکیم عبدالباقی کا مختصر جائزہ

از:- منیر واحدی

فنِ مصوری و موسیقی کی طرح شاعری بھی انسان کی دلی کیفیات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ خواہ محرکات خارجی ہوں یا داخلی۔ تمام دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح شاعری بھی چند خاص اصول و ضوابط کی پابند ہے۔ اگر بہ اعتبار ہیئت، مواد ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو تو اس کی دلآویزی اور تاثیر پر اضافہ ہو جاتا ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی، ندرتِ تخیل، لطافتِ بیان اور تسلسل وہ لوازمات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر شاعر فی الواقع ادب کا پیامبر بنتا ہے اور شاعری صحیح معنوں میں سحرِ حلال بن جاتی ہے۔ ہر اہلِ قلم حیات و کائنات کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نظر اور تصور رکھتا ہے۔

جب تک شاعر اپنے ماحول سے بے نیاز رہتا ہے اس کی فنی صلاحیتیں منفی قدرِ حیات کی ترجمانی تک محدود رہتی ہیں جب زمانہ کی رفتار اور ماحول سے متاثر ہو کر اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں تو وہ قلم سے سیف و سناں اور الفاظ سے برق و شرر کا کام لے کر ماحول کی اصلاح کی جانب مائل ہوتا ہے اور مثبت فلسفۂ حیات کی پائیدار قدروں کی بنیاد پر قصرِ شاعری تعمیر کرتا ہے وہ خودگری محض قبول ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے کلام میں محفل گدازی کے جوہر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ سیلِ سبک سیر و گراں گیر کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ اور تمام دشواریوں، بندشوں اور رکاوٹوں کو توڑتا ہوا منزل تک پہونچنے کی سعی میں مصروف رہتا ہے۔

جناب حکیم عبدالباقی صاحب کا جو مختصر انتخاب کلام میرے پیش نظر ہے اس کے مطالعہ سے میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے کلام میں ادب برائے زندگی کا عنصر بھی موجود ہے ان کے کلام میں شائستگی، فکر میں آراستگی اور اندازِ بیان لطیف اور متوسط ہے نہ تو تغزل کے پردے میں وہ حیا سوز قدروں کے ہراول شکر نوجوانوں کے دلوں میں سفلی جذبات کا طوفان بپا کرتے ہیں اور نہ ان کا لب و لہجہ اتنا پست ہے کہ رنگ تغزل جن خیالات کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی کیف و اثر کے حامل نہ ہوں۔ اندازِ فکر مجموعی طور پر متوازن ہے۔ شائستگی کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا البتہ نظموں میں جا بجا شدتِ جذبات سے مغلوبیت کی مثالیں ملتی ہیں مگر چونکہ مقصد محمود ہے اس لئے گوارہ ہے۔

شاعری شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے ان کے کلام سے ان کے سیاسی، معاشرتی اور ذہنی رجحان کا اندازہ مشکل نہیں، کلام میں حب الوطنی، جوشِ عمل، یکجہتی، بلندیٔ کردار،

اور صالح فکر و نظر کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے سینے میں
شمع امید روشن ہے۔ جس کی ضیا سے اہل وطن کے تیرہ تاریک دل و
دماغ کو منور کرنے کی سعی ان کا فرض ہے۔ عشق حقیقی ان کا ایمان
ہے مگر عشق حقیقی کے اظہار کے لئے مجازی لوازمات کو روایتی
انداز میں اپنائے بغیر چارہ نہیں۔ چونکہ حسن لم یزل مجرد غیر جسمی
اور فطرت میں لامکانی ہے لہٰذا ادراک سے بالاتر ایک ایسی ذات
جو واجب الوجود ہو اس سے ربط و تعلق کا اظہار کئے بغیر مجازی
علامتوں کا سہارا لئے دشوار ہے۔ اور اگر اس سے صرف نظر کر لیا
جائے تو غزل فہم سے بالاتر اور کیف و اثر سے عاری ہوگی ۔۔۔
آمدم برسر مطلب۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو مضامین
کی روشنی میں کلام کا جائزہ لینے میں سہولت ہو۔ طلب صادق ہو
تو رہروان منزل عشق کو کسی رہبر کی حاجت نہیں ہوتی۔ جذبۂ شوق
خود ہی رہنمائی کرتا ہے۔ شاعری میں جسے منزل سے تعبیر کرتے ہیں
اسے حلقۂ اہل دل میں ذات محبوب تصور کیا جاتا ہے۔ کبھی نقوش
پائے محبوب کو عشاق اپنی منزل قرار دیتے ہیں کیوں کہ بقول رومیؔ
" مزید براں یہ احترام محبوب کی انتہائی منزل یعنی
فلو فی المرتب المحبوب ہے۔

انداز بیان ملاحظہ ہو ؎

تمہاری آرزو میں رہنما کی جستجو کیوں ہو
تمہارے نقش پا کو اپنی ہم منزل سمجھتے ہیں

چارہ گر مداوا کی فکر میں ہے۔ مگر عاشق کو ان کی سعی لاحاصل پر
افسوس ہے کیونکہ وہ لذت سوز و گداز سے واقف ہے اور
درد دل کو اپنی زیست کا حاصل سمجھتا ہے۔ اپنے طور پر اس کی
خوب ترجمانی کی ہے ؎

حکیم خستہ دل ہیں آشنائے لذت الفت
وہ درد دل کو اپنی زیست کا حاصل سمجھتے ہیں

عاشق کے حال زار اور محبوب ستم طراز کے انداز تغافل
کو دیکھتے ہوئے بارہا اغیار نے خاک اڑایا، طعنے دئے مگر وفا دار شاعر
تھی بہر حال اس نے خاموشی اختیار کی کیونکہ شکوہ کو شیوۂ
وفا کے منافی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

طعنہ زن غیر ہوئے طرز تغافل پہ مگر
میں وفا پیشہ تھا ایسے میں بھی خاموش رہا

میخانۂ الہام میں عرفان عشق الٰہی کے جام سے جو
سرشار ہوا اسے خود اپنی ہی خبر نہیں رہتی۔ امروز و فردا کا ہوش
تو دور کی چیز ہے۔ مئے مرد افگن عشق کا نشہ ابدی اور کیفیت
لازوال ہوتی ہے ؎

جس کے دل میں ہوئی اے دوست محبت تیری
فکر فردا رہا اس کو نہ غم دوش رہا

محبت میں وفا شرط اولیں ہے۔ عشاق پر خواہ ستم کے پہاڑ
ہی کیوں نہ ٹوٹیں مگر رشتۂ روحانی کب ٹوٹتا ہے کیونکہ عشق میں
ترک و اختیار کسی کے بس کا روگ نہیں شوخیٔ مضمون ملاحظہ
فرمائیں ؎

لاکھ وہ کرتے رہیں مشق ستم
ٹوٹتا ہے عشق کا بندھن کہاں

آمد محبوب کا ادنیٰ اعجاز ہے کہ زندگی کے گلشن میں
بہار آ جاتی ہے اور تمام بے کیفیاں جسے خزاں سے تعبیر کرتے
ہیں چشم زدن میں دور ہو جاتی ہیں ؎

سیر کو آیا ہے وہ گل پیرہن
اب خزاں رقصاں سر گلشن کہاں

وہ محبوب ہی کیا جس کی بدگمانی دور ہو۔ مگر یہ ادائے
محبوبی لاکھ دل پذیر سہی عاشق حتی الوسع رفع بدگمانی کی
کاوش میں مصروف رہتا ہے۔ گرچہ اسے احساس ہے کہ وہ

اپنا دل بھی چیر کر دکھا دے کہ اس میں اس بت بدگمان و نامہرباں کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تو بھی لا حاصل۔ بدگمانی دور ہونے سے رہی ؎

چیر کر دل میں دکھا تو دوں حکیمؔ
دور ہو گا ان کا سوئے ظن کہاں

جادۂ عشق لاکھ دشوار گذار سہی۔ عشق خود ہی معرکہ سر کرتا ہے تمنائیں ہم سفر اور عزائم راہبر ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

اکیلا چل پڑا ہوں جستجو میں اپنی منزل کے
تمنائیں ہیں دل کے ساتھ میر کارواں ہوکر

کاشانۂ دل میں شمع محبت فروزاں ہو تو، کدورت، بغض و حسد اور چیرہ دستی جیسے سفلی جذبات وہاں بار نہیں پاتے۔ کیونکہ عشق نور ہے اور یہ جذبات ظلمت کی دلیل ہیں۔ غلبۂ نورِ عشق نفس مردہ کرتا ہے اور ضمیر کو توانائی بخشتا ہے۔ رواداری اور ایثار کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ کائنات کی ہر شے سے محبت ہو جاتی ہے۔ حسن بیان ملاحظہ فرمائیں ؎

دل چرا یا عشق سے روشن کہاں
ورنہ دنیا میں کوئی دشمن کہاں

سائنس نے مختلف قسم کے سامان عشرت ایجاد کیے۔ مگر طمانیت و سکونِ قلب کے لوازمات بکسر مفقود ہیں عجیب بحرانی کیفیت ہے غارتگری کی رسم عام ہے۔ لوگ امن کی ضرورت کو محسوس تو کرتے ہیں مگر قیام امن کی کاوش نہیں کرتے۔ حکیم صاحب کو اس کا شدید احساس ہے ؎

یعنی امن و سکون کی ہے زمانہ کو تلاش
گلستاں میں ہے نشاں اس کا نہ ویرانے میں

رنگ حیات و کائنات کی تابناکی کسی فرد واحد کے بس کا روگ نہیں۔ جب تک معاشرہ کا مزاج نہ بدلے اور کسی خاص لائحہ عمل کے تحت افراد معاشرہ عمل پیرا نہ ہوں اعلیٰ مقاصد حیات کا حصول ناممکن ہے ؎

کارواں سے بھٹک کے حیرت ہے
ڈھونڈھتا ہوں نشان منزل کا

شمشیر و سناں کے دور میں طاؤس و رباب کا مشغلہ زیبا نہیں۔ وقت کی پکار اور زمانہ کی رفتار سے جو غافل ہو وہ شاعر کیوں کر ہو سکتا ہے۔ منفی قدر حیات کا مبلغ اجل کا پیامبر ہے شاعر تو عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ عمل کی ترغیب اور حب الدنیا و کراہیۃ الموت سے پرہیز کی تلقین ملاحظہ فرمائیں ؎

شانۂ حسن عمل سے گیسوئے گیتی سنوار
تو بتِ رعنا کی زلف پرشکن کو بھول جا
موت کی آغوش میں ہے زندگی تیری حکیمؔ
بھول جا اب ہیبتِ دار و رسن کو بھول جا

سازِ دل کے ٹوٹے ہوئے تار دل سے جو نغمہ ابھرتا ہے وہ سوز و اثر کا حامل تو ہو سکتا ہے مگر سامع نوازی کی کیفیت اس میں نہیں ہوتی شاعر کو خود اپنے ہی نغمے نامانوس اور اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی حالات پر وہ بے حد مغموم ہیں ؎

دل کا ہر تار شکستہ ہے کہوں کیا ہمدم
اپنے ہی ساز کی آواز پہ رونا آیا

موصوف بھاگلپور کی ادبی زندگی میں روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ مجھے بھائی شاغل القادری سے معلوم ہوا۔ آپ کا پیشہ طبابت ہے مگر نبض ہستی بھی ان کے ہاتھوں میں ہے کائنات کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہیں اور بے چین ہو جاتے ہیں چنانچہ اپنی نظم "انکشاف" میں مشرق وسطی میں طاغوتی ریشہ دوانیوں کے خلاف اپنے تاثرات کا اظہار یوں فرماتے ہیں ؎

یہ فتنہ سامراجی بھیڑیوں کا اک نیا رخ ہے
کدورت کے سوا دل میں نہیں ہے جن کے کوئی شے

یہ ظالم چاہتے ہیں دہر کو زیر نگیں رکھنا
جھکی انسانیت کی اپنے قدموں پر جبیں رکھنا

ان کے کلام میں حب الوطنی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے ؎

صلح کا پیغام دنیا کو دیا کرتے ہیں
مادرِ ہندوستاں کی آن پر مرتے ہیں ہم
ہم کسی پر حکمراں ہوں یہ ہوس ہرگز نہیں
یہ ارادہ بھی نہیں لے لیں کسی کی سرزمیں
ہم لہو دیتے ہیں ہنس ہنس کر وطن کے واسطے
جان دینا ہم نے سیکھا ہے وطن کے واسطے

آزادی کی قدر و قیمت نہیں معلوم ہے۔ گرچہ ہمارے مذموم اعمال کے سبب ہماری آزادی فارغ البالی اور طمانیت و سکون قلب کی ضامن نہ بن سکی پھر بھی اس کی عظمت سے کسے انکار ہے ایک نظم میں جشن جمہوریہ کے موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے

آج ہی منزل پہ پہونچا تھا ہمارا کارواں
آج ہی کے دن بنے تھے ہم وطن کے حکمراں
آؤ مل جل کر منائیں آج ہم جشنِ بہار
دیکھ کر ہو جائے جس کو خود خزاں بھی شرمسار

دینی، دنیاوی یا سیاسی اعتبار سے غفلت کا انجام ناکامی و محرومی ہے۔ اس دورِ پُر فتن میں جب کہ معصوموں پر ستم ہوتا ہے۔ زمانہ ان کے گرد سازش کا جال بنتا ہے اہتمام دار و رسن کے مناظر ہر گام پر نظر آتے ہیں۔ ایک ہی ماحول اور معاشرہ میں زندگی بسر کرنے کے باوجود باہمی اختلاف اور بدگمانی شرمناک ہے۔ باقی صاحب نے ان تخریبی عوامل کے خلاف نہایت لطیف پیرائے میں پیام بیداری دیا ہے ؎

گل یاسمین و سرو سمن جاگتے رہیں
کہہ دو چمن میں اہلِ چمن جاگتے رہیں
صیاد گھات میں ہے عنادل کو دو خبر
ہوتا ہے ظلم دار و رسن جاگتے رہیں

ان دنوں رہبری کے پردے میں رہزنی کرنیوالے گندم نما اور جو فروش رہبر عام ہیں۔ شاعر کو اس کا علم ہے مگر عزائم کی بلندی نے اسے بے نیازی عطا کی ہے اسے اپنی کامرانی کا یقین کامل ہے فرماتے ہیں ؎

کوئی رہبر ہو یا رہزن مجھے اسکا نہیں کھٹکا
رہینِ عزم ہوں زندہ رہونگا کامراں ہو کر

واعظ نے عرفان و آگہی کا موضوع چھیڑ رکھا ہے مگر سامعین کے دلوں پر اثر مرتب نہیں ہوتا۔ شاعر اسے مشورہ دیتا ہے کہ واعظ میکدۂ اہل حال میں شریک زمرۂ زنداں ہو۔ اور چراغ عشق سے اپنے خانۂ دل کو منور کرے تاکہ وعظ میں کیف و اثر پیدا ہو ؎

چراغِ عشق روشن ہے سر میخانہ اے واعظ
اٹھا کر میکدہ سے دل کے کاشانے میں رکھ لینا

پرسکون ماحول میں زندگی بسر کرنا بھی خالی از لطف نہیں مگر بحر عشق کے گرداب میں مبتلائے بیم و رجا ہو کر جو کیف و نشاط انسان کو حاصل ہے وہ ایک علیحدہ شئے ہے ؎

مانا کہ لطف عشرت ساحل بھی کم نہیں
لیکن نشاطِ شورشِ دریا کچھ اور ہے

اگر اسی خلوص اور لگن کے ساتھ حکیم عبدالباقی صاحب مشاطگی گیسوئے سخن فرماتے رہے تو قیاس غالب ہے کہ وہ ترقی کی اور بھی منزلیں طے کریں گے۔ بہرحال وہ مائل بہ ارتقا ہیں اور ان سے بجا طور پر اپنی امیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

حکیم عبدالباقی

از:- کریم اسدی

سنہ ۱۹۶۰ء کے جون میں شاغل قادری جب پورنیہ جانے لگے تو اسی وقت میں نے سمجھ لیا کہ ان کا یہ تبادلہ جنگل کے مزید گل دمیدہ کو چمن میں لے آئے گا۔ اور واقعی یہی ہوا بھی، قادری نے جاتے ہی اپنے سٹیشن پر ایک نشست رکھی جس میں بھاگلپور کے تقریباً تمام شعراء شریک تھے۔ کچھ نئے شعراء سے بھی تعارف ہوا ترنم پورینوی، تاباں مصطفےٰ پوری، عقیل حماد، ہنر جاگل پوری اور حکیم عبدالباقی یہ تھے مہمان۔ ہم لئے وہ نئے شعراء جن سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ متفرادہ حکیم صاحب قدیم بزم سخن کی نشستوں میں برابر شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کی گوناگوں صلاحیتوں کے رخ سے یکے بعد دیگرے پردے اٹھنے لگے۔

بزم سخن نے مجلس اشاعت کے قیام کا جب فیصلہ کیا تو حکیم صاحب کو اس کا جنرل سکریٹری منتخب کیا۔ جنہوں نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود اس کو قبول فرمایا جس خوبی، لگن، اور فرض شناسی کے ساتھ یہ اب تک اس عہدے کے بوجھ کو ڈھوئے جا رہے ہیں۔ یہ امر قابل رشک ہے اور قابل قدر بھی حکیم عبدالباقی صاحب صرف شاعر ہی نہیں ہیں۔ بجا طور پر جس فن پر انہیں ناز ہے وہ ہے طبابت آپ کے والد بزرگوار حضرت حکیم مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم اور برادر بزرگ جناب حکیم انیس احمد صاحب قبلہ دنیائے طب کے اگر آفتاب و ماہتاب سمجھے جائیں تو حکیم عبدالباقی صاحب کو انجم تاباں یقیناً تسلیم کرنا ہوگا۔ نبض شناسی دست شفا، خوش اخلاق، اور فن طبابت میں ماہر اپنے مریضوں سے خلوص اور اخلاق سے پیش آنے والے۔

حکیم عبدالباقی ارباب قدیم بزم سخن سے اس قدر قریب ہوئے کہ ایک دن موصوف کو بھاگلپور میں اپنا مطب کھولنا ہی پڑا۔ یہ ان کا اخلاص ہے اور اپنے دوستوں سے قریب تر رہنے کی خواہش کا رد عمل ورنہ پورنیہ میں رہتے ہوئے بھی موصوف کو مریضوں کے ہجوم سے فرصت نہیں ملتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ اس قدر مصروف انسان شاعری کے لئے وقت کیسے نکال لیتا ہے اور وہ بھی ایسی شاعری جو زندہ جاوید رہنے والے فکر و فن کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ طبابت اور شاعری کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب نقیب امارت شرعیہ، خطیب مسجد قاضی دائرہ پورنیہ، صدر بزم ادب پورنیہ اور جنرل سکریٹری مجلس اشاعت بھاگلپور، ناظم نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو بھاگلپور، جوائنٹ سکریٹری سیرت النبی کمیٹی بھاگلپور بھی ہیں۔ جہاں آپ خوش فکر ہیں وہاں خوش نویس بھی اور ایسے خوشنویس کہ آپ کا لکھا ہوا مسودہ جب کاتب کے پاس جاتا ہے تو وہ غریب حکیم صاحب کے خوبصورت تحریر کو دیکھ کر پانی پانی ہو جاتا ہے

"متاع شوق" کی اشاعت کے بعد کاتب کا جب شکریہ ادا کیا تو کاتب نے جواب دیا کہ مسودہ کی تحریر اتنی حسین و جمیل تھی کہ مجھ میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا: نہ ث یلہ پ

باقی صفحہ ۳۰۰ پر

تلخ زمانی مزاح اور طنز نگاری کی حیثیت سے

از لطف الرحمان

میتھو آرنلڈ کا یہ قول بہت بوسیدہ ہو چکا ہے اس کے باوجود کبھی کبھی اس کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے اس نے کہا ہے۔ ART IS THE CRETISIM OF LIFE بظاہر یہ سادہ سا جملہ ہے لیکن اپنے دامن میں بڑی وسعت و نیرنگی اور معنی آفرینی رکھتا ہے حقیقت یہی ہے کہ ادب ـــ زندگی اور کائنات کی صرف عکاسی ہی نہیں بلکہ اسکی تنقید بھی ہے۔ اور یہ تنقید تعمیری اور جمالیاتی ہوتی ہے۔ ادیب اپنے فن کے ذریعہ فطرت کے بے جان مظاہر و آثار اور بے معنی اظہارات و کوائف کو حسن معنویت تہ زندگی اور روح بخشتا ہے اسی بناء پر ارسطو نے اسکو فطرت کی تخلیق جدید اور تعبیر نو کہا تھا۔ ہر ادیب بنیادی طور پر یہی نصب العین رکھتا ہے۔ وہ زندگی، فطرت، اور کائنات کو زیادہ حسین و جمیل اور معنی آفریں بنانے کی کوشش میں اپنی خون و جگر سے کام لیتا ہے۔ اس کا یہی مقصد اس کو خالق کا درجہ عطا کرتا ہے کیونکہ وہ سنگ سے آئینہ اور زہر سے نوشینہ بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہے اپنے اس مقصد کی تکمیل کیلئے وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور اسکے اس تنقیدی نظر کا اظہار مختلف پیرایۂ بیان میں ہوتا ہے جن میں ایک مزاحیہ ادب بھی شامل ہے۔

طنز و ظرافت کا عنصر ہر ادب میں بہت شروع سے جاری و ساری رہا ہے اردو میں بھی طنز و ظرافت شروع سے موجود رہی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے خصوصی طور پر اسکی طرف توجہ کی ان میں جعفر زٹلی کا نام تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اسکے بعد ایک طویل فہرست مزاحیہ اور طنزیہ کہنے والوں کے سامنے آتی ہے۔

بیسویں صدی میں ادب کے اس پہلو پر زیادہ پرخلوص اور باشعور انداز میں توجہ دی گئی اور اسکے تعمیری محاسن کو پیش نظر رکھا گیا۔ فی الحال مزاحیہ نثر نگاروں کا ذکر ممکن نہیں اسلئے کہ مزاحیہ لکھنے والے ایک شاعر کی تخلیقات میرے سامنے ہیں۔

اس دور میں جن لوگوں نے مزاحیہ و طنزیہ شاعری میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے ان میں انجم مانپوری رضا نقوی واہی راجہ مہدی علی خاں، سید محمد جعفری، مجید لاہوری، دلاور فگار وغیرہ خاصے مقبول و معروف ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں زندگی اور فن کا بڑا رچا ہوا اور گہرا احساس و شعور ملتا ہے انہوں نے زندگی، ماحول اور معاشرہ کے ہر پہلو کو تنقیدی انداز نظر سے دیکھا ہے، اور زندگی کی خرابیوں، برائیوں اور لعنتوں کو ـــ فیوض و برکات اور محاسن سے بدلنے کی تعمیری، مخلصانہ سعی اور پیہم کوشش کی ہیں۔ انہیں لوگوں کی صف میں تلخ زمانی بھی آتے ہیں۔

تلخ زمانی جو شاغل قادری کے نام سے سنجیدہ شاعری میں

بھی خاصہ مقام رکھتے ہیں اور چونکہ شاعری کے اس پہلو پر اسی شمارہ میں مؤقر ناقدین کے مضامین بھی شامل ہیں) نے بھی بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ اس نوع کی شاعری میں فنکارانہ اور صناعانہ شعور کا ثبوت دیا ہے۔ تلخ زمانی کی شخصیت میں تخلیق فن کی تمام بنیادی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ فن کے متعلق کہا گیا ہے۔ ART IS AT ONCE A SETHITIC INTENTIVI A. ILIELLETUAL

شاغل قادری کے فن میں ——— یہ خصوصیات مکمل طور پر جلوہ گر ہیں۔ ان کی دوسری ادبی شخصیت یعنی تلخ زمانی ——— کے اظہار میں بھی مندرجہ بالا خصوصیتیں وقار اور اعتماد کے ساتھ منعکس ہوتی ہیں۔ انکا تجربہ بھی گوناگوں ہے مشاہدہ بھی وسیع، مطالعہ بھی ہمہ گیر اور جذب و احساس میں تنوع و ندرت ——— اسلئے وہ سماج اور ماحول کے ہر پہلو کو دردمندانہ انداز میں دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماج کی بعض خرابیوں اور کمزوریوں کو انہوں نے بڑی شیریں تلخی کے ساتھ فنکارانہ جلال و جمال کے روپ میں پیش کر دیا ہے۔ انکی بہت سی مزاحیہ و طنزیہ نظمیں بڑی کامیاب اور اثر آفریں ہیں۔ فنکاری کیلئے ایک منظم دیوانگی کا برابا شعور اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار انکی تلخیوں کو صرف شیریں ہی نہیں وقار بھی بخشتا ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

دیوانگی سے تلخ کی توقیر بڑھ گئی
اکلے رجال بھی ساتھ ہے گذر جلے سر بھی

پہلے مصرع میں لفظ تلخ کے پیچھے تلخ زمانی ہی نہیں بلکہ تلخ بیانی بھی پنہاں ہے۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں "حسن ظن"، "مشاعرہ"، "تعارف"، "بادسموم"، "ساز نگار"، "بلیک آؤٹ"، "ننگ وطن"، اور "شہتیر" وغیرہ کامیاب اور مقبول ہیں۔ ان نظموں کا موضوع ہماری روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہے ان موضوعات کے ساتھ انہوں نے انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

سنجیدہ نظموں کی طرح انکی مزاحیہ نظمیں بھی تیکنیک کے اعتبار سے بیانیہ ہیں۔ کہیں کہیں مکالماتی انداز نظر بھی ملتا ہے لیکن پھر بیانیہ انداز اس پر حاوی ہو جاتا ہے غور و فکر کے ساتھ انکی اس طرح کی نظموں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تکنیک کے جہت سے تلخ زمانی اپنے ہمعصر واہی کے بہت قریب ہیں واہی کی نظم انٹرویو کی طرح ان کی نظم "بادسموم" ایک کامیاب نظم ہے۔ ایک ہی وقت اور ماحول میں ایک ہی رنگ کی خیال آفرینی تعجب کی بات نہیں ہے پھر فرق یہ ہے کہ واہی کے یہاں اجمال ہے انکے یہاں تفصیل۔ اس نظم کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

مارکس نے لکھی ہے روحانی فضائل پر کتاب
اور ہیگل کی ہے تھیوری علم طب میں لاجواب
ڈارون کو بھی فوق البشر کی تھی تلاش،
ارتقا کے نظریے سے نطشے کا دل تھا پاش
روس میں روسو نے لایا تھا نیا اک انقلاب
ہند کے فتح دبرہمن کی ہے جو تعبیر خواب
شاعر مشرق جگر پنجاب میں پیدا ہوئے
آتش و گل میں ڈرامے حضرت اقبال کے
بھاگوت گیتا لکھی ہے سنت تلسی داس کی
نظم رامائن کے شاعر ہیں شری نادر منی،

ان اشعار کے بعد نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

آپ سے جہل مرکب جب ہو ئے بحر العلوم
گلشن علم و ہنر پر چھا گئی بادسموم

تلخ زمانی کے آخری شعر میں طنز کی تیغ کی اور لطیف و نفیس کیفیت کم ملتی ہے۔ لیکن دروں بینی ژرف نگاہی اور دلکش

اسلوب بیاں نے اس نظم کو وقیع بنا دیا ہے۔ تفصیل نگاری میں جزئیات اور تفصیلات کی موجودگی اس نظم کے مجموعی تاثر کو بڑھا دیتی ہے۔ نظم کی تعمیر اور ارتقا میں ہنرمندی اور فنکاری کا لحاظ رکھا گیا ہے اسکے شعروں میں ربط و تنظیم اور آہنگ موجود ہے۔ جس سے غنائی کیفیت اور موسیقی کی فضا پیدا ہوتی ہے اور اسطرح نظم ایک بھرپور تاثر قاری کے ذہن پر چھوڑ جاتی ہے۔ تلخ زمانی کی شاعری کے تمام موضوعات اپنی نوعیت کے اعتبار سے اجتماعی تجربے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے سماج میں ایسے افراد کی کمی نہیں جنکی تصویر کشی انہوں نے "حسن ظن" "مشاعرہ" اور "تعارف" وغیرہ میں کی ہے۔

ان کی مزاحیہ نظموں میں طنز زیادہ تیکھی اور نشتر آگیں نظر آتی ہے اس کے مقابلے میں مزاح وظرافت نسبتاً کم ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی سنجیدگی اور متانت کی فضا نے طنز کو زیادہ اجاگر کر دیا ہے لیکن جہاں مزاحیہ انداز بیان آگیا ہے وہاں نظم کی فضا بہت خوشگوار ہو گئی ہے ان نظموں میں حقیقت پسندی ضرور ہے۔ لیکن علامیت و رمزیت کی کمی ہے۔ اگر طنز وظرافت پہلو دار ہو تو زیادہ زندہ اور طرحدار ہوا کرتی ہے۔ اردو کے مزاحیہ لکھنے والوں نے عام طور پر اس فنی اظہار کو پس پشت ڈالدیا ہے حد تو یہ ہے کہ اکبر جیسے عظیم و جلیل فنکار کے یہاں بھی کبھی کبھی جھلاہٹ، سطحیت، تنگ نظری، اور بے حد قدامت پسندی نظر آتی ہے۔ اس لئے اگر ہمیں دوسرے شعراء کے یہاں اس طرح کی خامیاں ملیں تو وہ صرف نظر کی جاسکتی ہیں۔ تلخ زمانی کی خوبی یہ ہے کہ بیانیہ اظہار رکھنے کے باوصف انہوں نے طنز وظرافت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے دراصل اس طرح کی شاعری انکی ادبی شخصیت کا فطری اظہار کم اور فنکارانہ اظہار زیادہ ہے کیوں کہ فطری اظہار کے لئے انہوں نے سنجیدہ شاعری کے اسلوب کو اپنایا ہے۔ جہاں وہ بے حد کامیاب ہیں لیکن موضوع کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہوں نے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب بیان کو اپنایا چونکہ وہ ایک بیکراں تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں اور فن شاعری سے بھی کما حقہٗ واقف ہیں اس لئے انہوں نے مزاحیہ موضوعات کے فنی اظہار میں توازن و اعتدال سے کام لیا ہے۔

فن فطرت اور فنکار کے درمیاں ایک سازگار اور امتزاج مفاہمت کی ضرورت ہوتی ہے اگر ان میں معتدل اور ربط و تنظیم پیدا نہ ہو سکے تو فنکار کا خون جگر بیکار جاتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کو پائدار اور غیر فانی ادبی تخلیق کا درجہ اسی وقت ملتا ہے جب موضوع ہیئت اور اسلوب آپس میں شیر و شکر ہو جاتی ہے۔ تلخ زمانی کی بیشتر نظموں میں یہ خوبی موجود ہے اسی خوبی نے انکی بعض نظموں کو غیر فانی ادبی تخلیق کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

یہ خیال صحیح ہے کہ مزاحیہ نگاری سنجیدہ ادبی تخلیق سے زیادہ فنی ریاضت چاہتی ہے مزاحیہ نگاری کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس پر نشتر زنی کر رہا ہے اسکو اپنی نشتریت کا احساس نہ ہونے دے یعنی جو اسکا ہدف ہو وہ بھی اسکی باتوں سے لطف اندوز ہو اس اعتبار سے مزاحیہ نگار اپنے ہدف کو کلاسیکی عاشق کی نفسیات سے متصف کرتا ہے اپنے معشوق کو اپنی ادائے شمشیر زنی کا مدح خواں کرنا آسان فن نہیں ہے۔ ذرا سی غفلت اور چوک قاتل کو بسمل بنا سکتی ہے مزاحیہ نگار اگر شعور فن سے کام نہ لے تو خود اپنی طنز کا ہدف بن جاتا ہے۔ اور اسکی ظرافت خود اسی کی ذات پر منطبق ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ تلخ زمانی اپنی طنز وظرافت کے ہدف خود کبھی نہیں بنتے ———

یہ ان کی مزاحیہ نگاری کی روشن مثال ہے۔

عبدالرحیم ناظر اپنے فن کے آئینے میں

علیم فاضلی بمبئی

غزل نیم وحشی صنف سخن ہے یا تہذیب و تمدن کی آبرو، اس کی گردن اڑا دینے کا کوئی نعرہ لگائے یا اس کی صورت کو مسخ کرنے کے ارادہ سے کوئی جدیدیت کی مہم چلائے مگر وہ یہ صنف سخن ہے جس کا جادو ہر ایک کے سر پر چڑھ کر بولتا رہا ہے اور یہ افسوں گری کبھی روبہ انحطاط نہ ہوگی۔

اردو ادب پر جہاں ہندوستانی فضا کا گہرا اثر ہے وہیں فارسی کے رنگ و روغن نے بھی اس کو حسین وجمیل بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو کے وہ شعرا جن پر زبان و ادب کے پرستاروں کو ناز ہے سب کے سب نے آغاز سخن غزل سے کیا اور جب عروج فن پر پہنچے تو دوسرے پیرایۂ سخن کے مقابلہ میں ہمیشہ غزل گوئی میں کامیاب ثابت ہوئے عربی فارسی اور اردو کے علاوہ دنیا کی کسی اور زبان میں غزل جیسی کوئی صنف نہیں ہے۔ اب جو اردو داں دنیا کی مختلف زبانوں کے اثر سے متاثر ہوئے تو اپنی زبان کے ادب کو بھی متاثر کرنے کے ذوق میں نئے نئے تجربات کے مرحلوں سے گزرنا شروع کیا۔ یہ ایک مبارک اقدام ہے مگر ہیئت میں نت نئے تجربات کا یہ تقاضہ کہاں ہے کہ اردو کے موجود

اصناف سخن کو سرے سے قابل گردن زدنی سمجھ لیا جائے ایسا خیال رکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس میں زندگی کی توانائی موجود ہے وہ کسی کے مارنے سے مر جائے یہ ممکن نہیں۔ یہ تو درست ہے کہ زندگی کا کارواں آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے مگر اس پیش قدمی میں کسی نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ بھوک، پیاس خواب، بیداری علالت صحت اور جنسی خواہشات کے فطری عنوانات میں بھی کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہو گئی ہو، جب یہ نہیں ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ واردات عشق و محبت اور حسن وجمال بھی انسانی فطرت میں اس طرح داخل ہیں کہ جن میں کسی قسم کی تبدیلی یا انقلاب کی گنجائش نہیں ہے آج سے چند صدی پہلے کے لوگ بھی عشق و محبت کے جذبات سے مغلوب تھے اور آج بھی وہی کیفیت ہے فرق صرف انداز بیان اور اظہار کا ہے۔

میر تقی میر سے آج تک کی غزلوں کو پرکھنے سے اگر کوئی فرق نظر آئے گا تو بس یہ کہ جیسے جیسے زبان بدلتی گئی انداز بیان بھی بدلتا گیا لیکن نفس مضمون جو کل تھا وہ آج بھی ہے۔ ہاں میر کے عہد میں پردہ کی پابندی ایسی تھی کہ میر دیدار کے لئے پس دیوار روزن کی طرف

ٹکٹکی لگائے کھڑے رہتے تھے اور اب حسن کی جلوہ آرائی عام ہے ۔

جناب عبدالرحیم نظرؔ بھاگلپوری ایک کہنہ مشق غزل گو ہیں جن کی صاف ستھری زبان اور انداز بیان کی ندرت نے ان کے فن کو ایک خصوصی امتیاز کا حامل بنا دیا ہے حسن وعشق کی باتوں کے علاوہ مسائل حیات کے الجھے ہوئے گیسو سنوارنے کی باتیں بھی کرتے ہیں مگر بنیادی طور پر وہ ایک رومان پرور طبیعت رکھتے ہیں اور غزل کی جو کلاسیکل تعریف ہے اس کے پابند ہیں ۔

محبت کی شرط وفا ہے اور وفا کا تقاضہ معشوق کی جفاؤں پر شکوہ سنج ہونے سے اجتناب کرنا لازمی ہے نظر صاحب شدت غم کے احساس سے مجبور ہو کر اگر گلہ مند بھی ہوتے ہیں تو اس کے انداز بیان یوں ہوتا ہے

گلہ ذرا نہیں اس کا کہ تم نے بل جل کر
ہمیں مٹانے میں چرخ کہن کا ساتھ دیا

نظرؔ کے عشق کی بلندی یہ ہے کہ وہ اپنے معشوق کو اپنے دل کی مملکت کا ایک ایسا حکمراں سمجھتے ہیں کہ نظرؔ کے سامنے نہ رہنے کے باوجود اس کی حکمرانی میں کوئی فرق نہیں آتا ۔

نظرؔ کے سامنے آتے نہیں مگر چھپ کر
وہ دل پہ حکم چلاتے ہیں حکمراں کی طرح

نظرؔ کے نزدیک محبت کیا ہے ؟ اس کی ترجمانی خود ان کے مندرجہ ذیل مسلسل اشعار کریں گے جسے محبت کا عنوان دے کر نظم بھی کہا جا سکتا ہے

محبت زندگانی ہے بہار باغ رضوانی ہے
معراج راہ منزل ہے عروج بزم انسانی ہے
غم و آلام اسکے فیض سے ہیں باعث عشرت
خزاں پامال ہے گلزار میں فصل بہاراں ہے
گذر تاریکیوں کا ہو نہیں سکتا دیار ہرگز
محبت کی جہاں اے ہمنشیں مشعل فروزاں ہے
اسی کے نور کی تابانیوں سے ہے جہاں روشن
اسی کے دم قدم سے زندگی فردوس ساماں ہے
محبت کی نظر سے کوئی چھپ جائے نہیں ممکن
نظرؔ کے روبرو آ کر کہاں چھپنے کا امکاں ہے

محبت کی اس تعریف کے آئینے میں عبدالرحیم نظر کی غزلوں کو جب دیکھا جاتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ معاملات حسن وعشق میں نظر اپنے خیالات اور احساسات کے ہمیشہ آئینہ دار رہے ہیں اور کبھی اپنے نقطۂ نظر سے بھٹکے ہوئے نظر نہیں آتے ۔ معشوق کے حسن وجمال کی تعریف اپنے جذبۂ عشق کی وارفتگی، وصل کی تشنگی کا احساس اور ہجر کی بے انتہا کرب ناکیوں کا بیان نظر ایک ایسے انوکھے انداز میں کرتے ہیں جس سے ان سے جاننے پہچاننے والے لوگ ان کی آواز کو دور سے پہچان لیں گے اور ناواقف چونک جائیں گا ۔ یہی چونکا دینے والی بات عبدالرحیم نظر کی فنی کا[illegible] کا ثبوت ہے ۔ ورنہ غزل ایک روایتی صنف سخن ہے جو بغیر روایاتی اصولوں کی پابندی کے اپنے حسن وجمال کی جلوہ آرائی نہیں کر سکتی ۔ روایات کے باغی ارباب فن اسی وجہ سے غزل کے خلاف اپنے اپنے انداز میں آوازیں اٹھاتے ہیں ۔ مگر غزل کو اگر اردو ادب سے الگ کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہ جاتا ہے ۔ یہ وہ زبان ہے جس کو حکمرانوں کی سرپرستی کبھی حاصل نہیں ہوئی ۔ بہادر شاہ ظفر اگر اس زبان کے رسیا بنے بھی تو اس وقت جبکہ مغلیہ

سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور بہادر شاہ کی حکمرانی قلعہ معلیٰ کے اندر محصور تھی ——— اس زبان نے عوام کے دلوں پر حکمرانی کی ہے آج بھی کر رہی ہے اور انشاء اللہ کرتی رہے گی مگر یہ حکمرانی جس فوج ظفر موج کے سہارے پر قائم ہے وہ غزل ہے جس کے اشعار بڑے سے بڑے دشمن کو بھی پچھاڑ دیتے ہیں۔

عبدالرحیم نظّر نے اس صنف سخن میں اپنے فن کا خوب خوب جوہر دکھلایا ہے جس میں ان کے خلوص تجربہ فن پر عبور اور زبان و بیان پر قابو کا دخل ہے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ شاعر اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی سے محبت نہ کرے مجھے تو اس کا علم نہیں کہ نظّر صاحب نے کسی سے محبت کی ہے یا نہیں اور اپنی محبت میں ناکام ہوئے ہیں یا کامیاب مگر ان کی غزل کے اشعار غماز ہیں کہ وہ عاشق رہے ہیں اور ناکام عاشق۔ ہمیشہ معشوق کی بے اعتنائیوں کا رونا روتے ہیں اور پاس وفا کا لحاظ رکھتے ہوئے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آداب محبت سے آشنا ہیں۔ شاید میرے یہ اشعار میرے اس دعوے کی دلیل فراہم کر سکیں

للہ یہ بتا دے لے چشم یار مجھ کو
کیا مل گیا نظّر کا صبر و قرار لے کر

———

بیمار غم جئے بھی تو اب کس امید پر
مونس نہیں، شفیق نہیں، چارہ گر نہیں

———

مسیحا دیکھو لی میں نے تری طرز مسیحائی
ترستے رہ گئے زخم جگر تا عمر مرہم کو

نظّر سنگ دیار کی تلاش میں افتاں خیزاں کو بکو پھر رہے ہیں اور جس کسی سنگ در کو دیکھتے ہیں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں مگر جب سکون دل نہیں ملتا تو سمجھ لیتے ہیں کہ یہ وہ سنگ در نہیں ہے جس کی انہیں تلاش ہے اور جستجو میں آگے بڑھ جاتے ہیں

مری جبین شوق کو حاصل نہیں سکون
شاید یہ سنگ در بھی ترا سنگ در نہیں

نظّر کا یہ شعر ان لوگوں کی بے چینی اور بے قراری کا مرقع ہے جو عقل کے سہارے عرفان الٰہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ تصور الٰہ کی ارتقائی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اصحاب نظر اس شعر پر جھوم جائیں گے۔

زمانے کے بدلے ہوئے تیور کو نظّر جب دیکھتے ہیں تو اپنے غم کو سینے میں چھپائے رکھنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

کسی سے اپنے غم دل کی بات کیا کہئے
بدل گیا ہے نظام حیات کیا کہئے

فنکار اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے اور زندگی کا ترجمان۔ جس عہد میں جس قسم کے سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالات ہوں گے اس کی جھلک فنکار کے فن میں ضرور نظر آئے گی۔ نظّر نے بھی اپنی غزلوں میں عصری رجحانات سے اجتناب نہیں کیا ہے ؎

غم دوراں ہے یا کہ ہے غم جاناں نہیں کھلتا
مگر اک اذیت گہری ہے غم سے کشتۂ غم کو

———

کہیں الجھ کے نہ رہ جائے دامنِ ہستی
لباسِ گل میں نظر آ رہے ہیں خار مجھے

گلچیں ترے حوالے ہے اب سارا گلستاں
ہم تو اسیر ہو گئے فصلِ بہار میں

انسانیت جہاں سے معدوم ہو گئی ہے
اب اعتبار کیسے کوئی کرے کسی کا

مندرجہ بلا قسم کے اشعار جابجا نظر صاحب کی غزلوں میں ملتے ہیں جو اس بات کے گواہ ہیں کہ نظر مسائلِ حیات کو اپنے خاص انداز میں سمجھتے ہیں جس کا بے تکلفانہ اظہار کرنے سے چوکتے نہیں۔ اس راہ میں اس کی کہنہ مشقی بہت معاون ثابت ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر پیشِ نظر نمونہ کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نظر ایک رومان پرور شاعر ہیں اور اسی وجہ سے غزل گوئی میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار بھی قابلِ تحسین ہیں ——

جب سے کسی نے جامِ محبت پلا دیا
ہے بے خودی کچھ ایسی کہ اپنی خبر نہیں

جذبِ الفت کا معنی جس میں کہ جوہر ہوگا
دل وہ پتھر کا ہے کو ہوگا کوئی پتھر ہوگا

ابروئے یار کو اللہ سلامت رکھے
یہ گلا میرا نہ منت کشِ خنجر ہوگا

ہر ایک بات میں ملتی ہے چاشنی دل کو
کسی کی بات ہے قند و نبات کیا کہئے

جبیں پر آ گیا بل رخ بدل ڈالا بگڑ بیٹھے
کسی کے لب پہ محفل میں جواں کی میرا نام آیا

نہ رکھا گھر کا نہ تیرے در کا نہ آسماں کا نہ اس زمیں کا
ترے تغافل نے بندہ پرور رکھا نہ آخر نہیں کہیں کا
نظر کو روزِ ازل سے جس کی تلاش تھی جس کی جستجو تھی
دلِ شکستہ بھی صید نکلا اسی کے گیسوئے عنبریں کا

تیرِ نگاہ آپ کا اللہ کی پناہ
گھر کر گیا ہے میرے دلِ بیقرار میں

حسن اور عشق کی کشاکش میں
دامنِ دل مسک نہ جائے کہیں

ظرف کو دیکھ کر پلا ساقی
پینے والا بہک نہ جائے کہیں

باادب اے صبا کہ اس گل کے
سر سے آنچل ڈھلک نہ جائے کہیں

وہ میہماں کی طرح ہے نہ میزباں کی طرح
ہے اس کا ساتھ ہمیشہ سے جسم جاں کی طرح

عبدالرحیم نظر بھاگلپوری

از:- شاغل قادری

عبدالرحیم نظر صاحب امین ہیں، اپنی خودی کے امین، اپنی شرافت اور ہر دل عزیزی کے امین، جذبہ دینداری اور خدا ترسی کے امین، قدیم بزم سخن اور میکدہ کے امین۔ کام ہے روزانہ دفتر جانا بلدیہ کا چکر لگانا، مکانوں کے نقشے بنانا، فیتے سے زمین کو ناپنا۔ اور عروض کے پیمانے سے شعر کو ناپنا، شعوری شاعری کرنا، مسجد جانا، اور میکدہ میں بیٹھ کر ایک جرعہ پر آسمان و زمین کے قلابے ملانا۔ جب تک شاعری نہیں چھڑتی سنجیدہ بیٹھے لوگوں کی گل افشانیوں سے محظوظ ہوتے رہیں گے مسکراتے رہیں گے اور پان چباتے رہیں گے۔ جہاں شعر خوانی شروع ہوئی نہیں کہ سنبھل کر بیٹھ جائیں گے۔ اور چشم و ابرو کے اشارے، مسکراہٹ سے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کرتے رہیں گے۔ کبھی کچھ نہ بولیں گے اور اگر بولیں گے تو وہ پتھر کی لکیر ہوگی۔ ان کا قدیم وطن جائس تھا لیکن بھاگلپور نے اس طرح ان کو اپنی طرف کھینچا کہ اب وہ جائسی لکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ مگر زبان و بیان کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ حضرت جائسی ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے جائسی لکھ دیا تو بگڑ گئے۔ "مجھے جائسی نہیں لکھا کیجئے۔ میں بھاگلپوری ہوں۔" بزم سخن کے یہ قدیم کرم فرما ہیں۔ اسی اعتبار سے اپنی سکریٹری شپ میں بزم سخن کو بھی انہوں نے قدیم بزم سخن بنا دیا ہے۔ بزم کے یوم تاسیس سے یہ اب تک اس کے پرچم کے سائے میں زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

ایک وقت بزم سخن پر ایسا بھی آیا جب معلوم ہوتا تھا کہ یہ بزم ادب باقی نہیں رہے گی۔ ایسی مشکل اور کٹھن گھڑی میں عبدالرحیم نے عزم و ہمت اور نظر بلند سے کام لیا۔ علاج بالمثل کے ماہر تو کریم بھائی ہیں (کریم اسدی) جنکی مہارت صرف ہومیوپیتھی طریقۂ علاج تک محدود ہے۔ مگر نظر صاحب نے سیاسی بازیگروں کی ریشہ دوانیوں کے لئے بھی اس طریقے کو اپنایا۔ ان کے اس عمل پر ڈاکٹر ہنومن بھی اپنی قبر میں پھڑک اٹھا ہوگا۔

اس وقت سید مقبول احمد صاحب بھاگلپور کے ذی اثر کانگریسی رہنما تھے۔ نظر صاحب نے انہیں پہ قدیم بزم سخن کی صدارت سونپ دی۔ اس طرح مقبول صاحب کے حواری بھی بزم کے ہمدرد ہو گئے۔ اب کیا تھا ڈوبتی ہوئی ناؤ سطح پہ آگئی۔ اور بھنور سے نکل کر ساحل مقصود کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ اس وقت سے آج تک مقبول احمد صاحب صدر اور عبدالرحیم نظر قدیم بزم سخن کے سکریٹری ہیں۔ جب صبا گنج تک جب نظر صاحب کی اس حکمت عملی کی خبر پہونچی تو میں بہت محظوظ ہوا۔ مقبول صاحب کے صدر ہو جانے سے یہ نہیں ہوا کہ یہ بزم سیاسی بازی گروں کا اکھاڑہ بن گئی۔ بلکہ اس سے محفوظ ہو گئی۔

باقی صفحہ ۳۴۴ پر

قمر بھاگلپوری

پروفیسر سید علی حیدر نیرّ

واجد علی نام ۔ قمر تخلص

ولدیت ۔ منشی کفایت اللہ مرحوم

آپ نے اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ آپ کو خطاطی، فنون لطیفہ اور فنِ مصوری سے بھی شغف ہے ۔ آپ کو ماحول سازگار رہا ۔ یاس بھاگلپوری کی مشفقانہ سرپرستی نے آپ کو شعر و سخن کے مراحل سے آشنا کیا ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

ساز کا چھیڑنے والا نہیں کوئی صد حیف　　کیا کہا تم نے کہ نغمہ کوئی بیتاب نہیں

———

پنہاں تھی اس میں یہ بھی کیا تھی خبر کسی کو　　آئی بہار لیکن برق و شرار لے کر

———

ہر ایک حال میں ہم نے چمن کا ساتھ دیا　　وطن پہ آنچ جب آئی وطن کا ساتھ دیا

———

یہ آب و تاب رخِ گل یہ رقص شبنم نے　　حسین صبح کی پہلی کرن کا ساتھ دیا

———

چوٹ پیہم غموں کی کھا کھا کر　　بڑھ گیا اور حوصلہ دل کا

———

سانس اکھڑی نبض ڈوبی ہچکیاں آنے لگیں　　یوں قضا نزدیک سے نزدیک تر ہوتی گئی

———

جس جگہ جھک گیا یہ سر اپنا　　وہ ترا سنگ آستاں تو نہ ہو

———

جان لینے کے لئے جنبشِ ابرو ہے بہت　　بڑھ کے تلوار لگانے کی ضرورت کیا ہے

———

قمر بھاگلپوری

از :۔ شاغل قادری

جنوری، یا فروری ۱۹۴۹ء کا ایک دن تھا، جب یہ خبر ملی کہ آج مغربی مجاہد پور میں ستوت صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہے میں بھاگلپور کے لئے قطعی اجنبی تھا سوائے برادر مکرم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب قدوائی اور ڈاکٹر محمد یونس کے اس شہر میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو مجھ سے واقف ہو۔ یہاں کی ادبی مجلسوں اور ماحول سے میں بالکل ناآشنا تھا۔ ایسے میں واجد علی قمر نائب سکریٹری بزم ادب کے دستخط سے دعوت نامہ کا ملنا حیرت انگیز اس لئے تھا کہ ڈاکٹر یونس، یا مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی مجھے شاعر کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ اس وقت شعر و شاعری کا "بھی" بری طرح اعصاب پر سوار تھا اس لئے مجی ابوالحسن نادری گنجوی کے ساتھ بڑی تیاریوں کے ساتھ مشاعرہ میں گیا۔ ستوت صاحب کا مکان تلاش کرتے ہوئے جناب کریم اسری صاحب کے دولت کدہ تک پہونچ گیا وہاں دیکھا کہ استاذی حضرت سروش عظیم آبادی موجود ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی یہ معمہ حل ہو گیا کہ مجھے دعوت کیسے ملی۔ جناب سروش نے کریم اسری، عاشق حسین، نظر بھاگلپوری، قاسم پانی پتی اور قمر بھاگلپوری سے میرا تعارف کرایا اور پھر سب کے سب مشاعرہ میں جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مشاعرہ کا منظر دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی بمشکل سے دس بارہ سامعین تھے۔ اور اتنے ہی شعراء میر ابوالحسن صاحب مرحوم کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد دیگرے شعراء بلائے جانے لگے اس طرح ایک گھنٹہ میں مشاعرہ ختم ہو گیا۔ مشاعرہ میں تو خیر کچھ مزہ نہیں آیا۔ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ یہاں کے شعراء سے میں متعارف ہو گیا۔ اب کریم بھائی کی قیام گاہ پر روزانہ جناب واجد علی قمر بھاگلپوری، قاسم پانی پتی، نظر بھاگلپوری سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

واجد علی قمر صاحب نے بھاگلپور کی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۹ء تک کی ادبی تاریخ دہرائی، جناب یاس بھاگلپوری جمشید مرزا، قوس بھاگلپوری، ڈاکٹر ناصر وغیرہ کی خدمات کا تذکرہ کیا۔ اور یہ بتایا کہ یہ بزم ادب جس کا میں نائب سکریٹری ہوں اسی زمانے سے قائم ہے۔ قمر صاحب قدیمانہ رنگ تغزل کے جہاں رسیا معلوم پڑے وہیں پرانی تہذیب کے دلدادہ نظر آئے یہ صوم و صلوٰۃ کے پابند علماء کے احترام کا لحاظ رکھنے والے، دوستی کا حق ادا کرنے والے وضع دار انسان ہیں خوشنویسی اور مصوری کے دلدادہ ہیں۔ شعر گوئی میں بے راہروی ان کو پسند نہیں۔ جب غالب جوان تھا تو ترنم میں بھی دلکشی و رعنائی تھی۔ قمر صاحب جہاں نہایت خلیق، اور ملنسار ہیں وہاں اپنے اصولوں کے پابند بھی ہیں۔ وہ دوستی کرنا بھی جانتے ہیں اور جس بات کو وہ حق سمجھتے ہیں اس کے لئے لڑنا بھی جانتے ہیں۔ مئی ۱۹۵۰ء میں جب قریہ رحمان پور کے مشاعرہ کے اختتام پر بزم سخن قائم ہوئی تو قمر صاحب اس کے نائب سکریٹری چنے گئے۔

اس وقت کریم آسری، نظر بھاگلپوری، قاسم پانی پتی ناچیز اور قمر بھاگلپوری بزم سخن کے مینار تسلیم کئے جاتے تھے اس وقت سے آج تک سوائے پانی پتی کے بقیہ اصحاب اسی طرح اس بزم کو زبان و ادب کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ جب میں قاسم گیا چلا گیا تو بزم سخن کو جن لوگوں نے سنبھالے رکھا ان میں قمر بھاگلپوری کا نام سرفہرست ہے۔ کچھ ایسی باتیں درمیان میں آگئیں جن سے یہ سمجھا جانے لگا کہ اب یہ بزم شاید زندہ نہ رہ سکے گی لیکن قمر کی مجاہدانہ کوششوں نے اس کو قدیم بزم سخن کے نام تلے ہنوز زندہ اور فعال رکھا ہے۔ آجکل قمر صاحب درود وظائف میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں بہت کم شریک ہوتے ہیں مگر بزم سخن کی تمام تحریکوں میں ان کی کارفرمائی کا اثر نمایاں رہتا ہے۔ وہ میکدہ کی مجلس شاورت ہو کہ مجلس اشاعت قدیم بزم سخن کی خدمات کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا تو قاہو عل قمر کا نام ضرور آئے گا۔

بقیہ نظر بھاگلپوری

نظر صاحب بزم سخن کے پانچ ستونوں میں سے ایک ہیں ہزار مصائب کے شکار بنے رہنے کے باوصف ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ معدوم نہیں ہوتی ہے۔ یہ بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں اپنے دکھوں کو چھپائے رکھنے میں لذت محسوس کرتے ہیں ان کا معیار سخن قدیم رنگ تغزل ہے۔ زبان سادہ، بیان سادہ، رہن سہن سادہ، یعنی ان کی ہر ادا سے سادگی کا جوہر ٹپکتا نظر آتا ہے نہایت دیندار، خوش وضع، اور خوش اخلاق ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سنتے زیادہ اور بولتے بہت کم ہیں۔ لوگوں کی باتیں سن سن کر محظوظ ہونا خوب جانتے ہیں۔ نظر صاحب کام کریں یا نہ کریں لیکن دوسروں سے کام لینے کا ہنر انہیں معلوم ہے۔ قدیم بزم سخن کے سکریٹری ہونے کے باوجود ان کا اس پر ہرگز اصرار نہیں ہوتا کہ ان کی بات ہے وہ تو یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ بزم کا جو کام ہے وہ ٹھیک ڈھنگ سے ہو رہا ہے یا ں جس دن انہیں یہ محسوس ہو جائے کہ بغیر ان کے گاڑی اٹک رہی ہے تو وہ خاموش تماشائی نہیں بنے رہیں گے۔ بزم سخن اور اس کے ذیلی اداروں نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، مثلاً نئی نسل کی ذہنی تربیت، شعری مجموعوں کی اشاعت، بھاگلپور کے شعراء کا تعارف۔

ان تمام تحریکات سے تعاون جو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے سلسلے میں ہوتی رہتی ہے۔ سب کا سہرا ظاہر ہے کہ اس بزم کے عہدہ داروں کے سر ہے۔ خصوصاً جنرل سکریٹری کا عہدہ ایسا ہے جو اگر فعال نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سکریٹری ہیں جناب عبدالرحیم نظر، لہٰذا ان کی اہمیت کتنی ہے اس کو لفظوں میں ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس سماج میں نظر جیسے لوگ موجود ہیں اس سماج کی تہذیبی اور لسانی عمارت کبھی زمیں بوس نہیں ہو سکتی۔

قمر بھاگلپوری

از:- سید قسیم الحق گیاوی

محترم واجد علی صاحب قمر بھاگلپوری حضرت یاس بھاگلپوری کے شاگرد ہیں۔ اور بھاگلپور کے شعری و ادبی ماحول میں اپنی تابندگی کے اعتبار سے ایک مقام رکھتے ہیں ان کی شاعری اور فن سے ان کی والہانہ محبت ہر شعر و ادب کے عاشق کیلئے حوصلہ افزا اور ان کی ادبی خدمات ہر طرح قابل تحسین ہیں۔

قمر صاحب کا انداز بیان دل نشیں ہے اور فن شعر سے ان کا تعلق اور ان کی محبت وانسیت دیرینہ ہے اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ وہ شعر و ادب کے تحفظ و ترقی کے سر تیری کام سے گہرا لگاؤ اور اس کی اہمیت و ضرورت کا عرفان رکھتے ہیں اور گیسوئے شعر و شاعری کے پیچ و خم کو سلجھانے اور سنوارنے میں نہایت ہی محنت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔

قمر صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار خصوصیت سے ہر صاحب ذوق کیلئے قابل مطالعہ ہیں ؎

جستجو میں اور بھی جوش جنوں بڑھتا گیا
ہر حسیں منزل ہماری رہ گزر ہوتی گئی

سانس اکھڑی، نبض ڈوبی، ہچکیاں آنے لگیں
یوں وقت نزدیک سے نزدیک تر ہوتی گئی

سخن طراز نہیں ہے مری زباں لیکن
ہے ترجمان مرے دل کی چشم تر اب تک

جان لینے کے لئے جنبش ابرو ہے بہت
بڑھ کے تلوار لگانے کی ضرورت کیا ہے
سنگ در پہ ترے سر رکھنے کا ہو تعمر تو لے
پھر بتا دوں گا کہ دل کی مرے حسرت کیا ہے

پی رہے ہیں جو وہ ہنس ہنس کے مزے لے لے کے
خون ارماں ہے کسی کا وہ مے ناب نہیں

ان اشعار سے قمر صاحب کے انداز فکر اور طرز بیان کی جو جھلک ملتی ہے وہ ہر باشعور قاری کے لئے باعث تسکین و طمانیت ہے۔ اس سے قمر صاحب کی غزل گوئی کے حسین خد و خال نمایاں ہوتے ہیں اور فن روایت سے ان کا مضبوط تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے جدید شعراء کو ان کی روایت پسندی اور فن کے اس گہرے لگاؤ سے قدامت پسندی کی جھلکی نظر آئے۔ مگر یہ

باقی صفحہ ۳۴۸ پر

ظفر الاسلام (راجکیشن کولونی لیک روڈ ہزاری باغ)

جناب مسرور آروی کا رنگِ تغزّل

ہر گلے را رنگ بوئے دیگر است

غزل کا سب سے اہم موضوع عشق ہے۔ تمام غزل گو شعراء نے عشق ہی کی مختلف کیفیات کا بیان کیا ہے مگر چونکہ ہر شاعر کی افتادِ طبع، طرزِ فکر اور وارداتِ قلبی کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اسی لئے موضوع کی یکسانیت کے باوجود ہر شاعر کا رنگ دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔ مسرور آروی کی غزلوں کو دیکھ کر میں نے جو تاثر لیا ہے وہ یہ ہے کہ مسرور صاحب معمولی سی بات کو ایسے مؤثر اور دلکش انداز میں ادا کرتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو شعر و ادب کا رسیا ہے بے اختیار تڑپ اٹھتا ہے مسرور صاحب فرماتے ہیں ؎

نہ گھبرا اے دلِ ناداں وہ یوں بھی آزماتے ہیں
جو ان کو یاد کرتا ہے اسی کو بھول جاتے ہیں

مفہوم کے لحاظ سے کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اندازِ بیان نے وہ عالمِ کیف و سرور کا جادو جگایا ہے کہ ہر صاحبِ دل اس شعر کو پڑھ کر جھوم جھوم اٹھے گا۔

عاشق کا معشوق کی بزم میں جانا اور ناکام لوٹنا ایک ایسا مضمون ہے جسے ہر شاعر نے باندھا ہے لیکن مسرور کے طرزِ ادا نے اس میں جو لطافت پیدا کی ہے اس سے حظ اٹھائے بغیر نہیں رہا جا سکتا ؎

چھپا کر کاسۂ ارماں الگ ہی بیٹھ جاتے ہیں
جب ان کی بزم کا بگڑا ہوا ماحول پاتے ہیں

وفورِ شوق میں ایک ایسا بھی وقت آتا ہے جب انسان جس کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے اسی کو بھول جاتا ہے اس داخلی تاثر کو مسرور نے جس طرح شعر کا جامہ پہنایا ہے وہ بڑا دلربا نہ ہے ؎

خدا شاہد کہ اپنی محویت کا اب یہ عالم ہے
تمہاری یاد میں اکثر تمہیں کو بھول جاتے ہیں

انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا اثر پیدا کرنا ہے جسے تاثر کہتے ہیں۔ شاعری کا وجود اسی لئے ہوا کہ تاثر پیدا کیا جائے۔ غزل میں تاثر یعنی تغزل کا ہونا ضروری ہے اور یہ بات عبارت، اشارت، اور حسنِ ادا سے پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے مضامین زیادہ تر داخلی ہوتے ہیں اور اس وجہ کر اکثر اشعار فلسفیانہ اور متصوفانہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پیالے میں جو ہوگا وہی ٹپکے گا۔ مسرور آروی کا ذہنی رجحان دین کی طرف ہے اس لئے ان کے اکثر اشعار تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں یہ مطلع ملاحظہ کیجئے ؎

عیاں کہنا ہی پڑتا ہے، نہاں کہنا ہی پڑتا ہے
ترے جلووں کو نیرنگِ جہاں کہنا ہی پڑتا ہے

عشق میں وفا شعار ہے۔ معشوق کے ظلم و ستم کا شکوہ

عاشق بھول کر بھی کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ خوشی میں واہ اور دکھ میں دل سے آہ نکل ہی جاتی ہے۔ عشق کی سلیقہ مندی یہ ہے کہ ایسے میں بھی کچھ ایسا انداز اختیار کرے جو بارِ خاطر نہ ہو۔ اور عاشق پر جفا کا الزام نہ آئے مسرورؔ کا دل جب غم و آلام کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے تو ان کے اظہار کا انداز وہ یوں اختیار کرتے ہیں ؎

چھپانے سے نہیں چھپتا ہے جب رازِ دلی اپنا
بہ اندازِ حدیثِ دیگراں کہنا ہی پڑتا ہے

معشوق کی رسوائی کا لحاظ عشق میں ہر قدم پر رکھنا ایک مخاط عاشق کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مسرور کتنے محتاط ہیں یہ دیکھئے ؎

چھپانے کے لئے رازِ محبت غیر کے آگے
اسے دشمن نصیبِ دشمناں کہنا ہی پڑتا ہے

غزل کے شعروں میں دو اجزا ہوتے ہیں۔ تخیل اور محاکات دو لوازم ہوتے ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ اور مطالعۂ فطرت اور دو شرطیں ہوتی ہیں وزن اور قافیہ، قافیہ اور ردیف شرطیں ہیں۔ لیکن شعر کی خوبی تخیل اور اس کے اندازِ بیان یعنی حسنِ ادا میں مضمر ہے۔ شاعر کبھی صرف ایک قافیہ باندھنے کے لئے بھی شعر کہتا ہے۔ مسرور نے "کہاں" کے قافیہ کو لانے کے لئے جو اہتمام کیا ہے، اس نے تخیل اور حسنِ ادا کو کس عروج پر پہونچا دیا ہے وہ دیدنی ہے ؎

محبت میں ہر اک موقع محل کو دل سمجھتا ہے
کہاں خاموش رہنا اور کہاں کہنا ہی پڑتا ہے

عام طور سے ایسے موقع پر قافیہ پیمائی مہمل سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس شعر میں ایسی کوئی جھلک نظر نہیں آتی اور یہی شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔

محاکاتی اندازِ بیان نہایت مشکل ہے۔ کہنہ مشقی کے بغیر یہ صلاحیت حاصل نہیں ہوتی۔ مسرور کی پختگی مشق اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے ؎

دیکھ کر مجھکو خمِ گیسوئے پیچاں دیکھا
کس تکلف سے مرا حال پریشاں دیکھا

شعر وہ ہے جسے پڑھ کر ہمارے تخیل اور جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو مسرور کے اس شعر میں محسوس کیا جا سکتا ہے ؎

وہ شبِ ماہ و مئے ناب و شباب گُل رنگ
جلوہ میں جلوہ بہاراں میں بہاراں دیکھا

دنیا کی بے ثباتی ایک ایسا موضوع ہے جس پر میر تقی میر سے لے کر آج تک کے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مسرور نے اس موضوع کو اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

کیف آگیں سہی مسرور دریا فنِ ہستی
چپے چپے کو مگر خاک بداماں دیکھا

مسرور آروی کی چند غزلوں کو دیکھنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ موصوف ایک پختہ ذہن غزل گو شاعر ہیں۔ فن پر عبور رکھتے ہیں اور کلاسیکل شاعری کا مطالعہ مسرور صاحب کا وسیع معلوم ہوتا ہے۔ کوئی شعر معیار سے گرا ہوا نظر نہیں آیا الفاظ کا انتخاب اور اس کی نشست میں افسوں گری ہے زبان سلیس اور رواں ہے۔

اساتذۂ فن کی پیروی مسرور کا مسلک ہے اور یہی موصوف کے فن کا عروج ہے۔ غالب کی زمین پر طبع آزمائی کرنا کوئی معمولی جسارت نہیں ہے۔ ویسے تو اس قسم کی جرأت اندازؔ بھی کرتے ہیں۔ مگر جس سلامت روی کے ساتھ مسرور نے اس میدان میں قدم رکھا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ مندرجہ ذیل غزل میں اپنے

اس دعوے کی دلیل میں پیش کر کے رخصت چاہوں گا ؎

قیامت ہے کہ اربابِ سخن کی آزمائش ہے
پئے تفریحِ خاطر اہلِ فن کی آزمائش ہے
گل و نسرین و ریحان و سمن کی آزمائش ہے
کسی کی سادگی سارے چمن کی آزمائش ہے
محبت اور وعدے کی وفا کا امتحاں کیا ہو
ابھی تو میرے ان کے حسنِ ظن کی آزمائش ہے
یہ ہل سکتے نہیں صیاد گر آزاد بھی کر دے
قفس میں کیوں اسیرانِ کہن کی آزمائش ہے
کہیں آوازِ ناقوس و اذاں مل کر نہ ٹکرائیں
رواداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
کبھی بحرِ وفا میں جو نہ ڈوبا بوالہوس کیا سمجھے
کہ ہے یہ جان کی بازی کہ تن کی آزمائش ہے
وہ اب تو وعدۂ فردا سے بھی پرہیز کرتے ہیں
دلِ مسرور کے رنج و محن کی آزمائش ہے

بقیہ قمر بھاگلپوری

حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ ہر جدید شئے میں قدیم حقیقتوں کا عکس ہوتا ہے۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ قدامت سے بالکل علٰحدہ ہو کر جدیدیت بالکل بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ قدیم فنون پر مضبوط گرفت رکھنے والے ہی صحت مند جدید فن کی مضبوط بنیاد رکھ سکتے ہیں کیونکہ جب تک کسی بھی فن کا پورا مطالعہ نا درن نا آخر نہ کر لیا جائے اس فن میں کامیاب نئے تجربے کی باتیں کرنا خام خیالی کے سوا کچھ نہیں جو لوگ قدیم فن سے واقفیت کے بغیر کسی نئے تجربے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس تجربے کی کامیابی کا یقین رکھتے ہیں در حقیقت وہ خیالات کی دنیا میں رہتے ہیں حقیقت سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں۔

قمر صاحب کی شاعری قدیم روایتوں سے استفادہ کر رہی ہے۔ اور روز افزوں اپنی انفرادیت نمایاں کرتی چلی جاتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ان کی شاعری جدید اسلوب، جدید طرز اور جدید انداز بیان سے بھی مزین ہوتی چلی جائے گی مگر وہ جدت ایسی ہوگی جو اپنے اندر قدامت کا حسن بھی لئے ہوگی۔ یعنی کسی بھی پہلو سے ان کا فن نا مکمل اور تشنہ نہیں رہے گا۔

بقیہ تصدیق استشہر

فراقؔ کی نظروں نے دیکھا تھا کہ ؎

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

آج کارواں کے انتظار میں پڑے رہنا نہ صرف وقت کی بربادی ہے، بلکہ صلاحیتوں کو رفتہ رفتہ ضائع بھی کرنا ہے، ضرورت ہے کہ آبلہ پا خود ہی نکل کھڑے ہوں، کارواں بنتے دیر نہیں لگے گی۔

جناب سرور آروی کے خدوخال

شاغل قادری

۱۹۵۲ء کی بات ہے شاید فروری کا مہینہ ہوگا صاحب گنج اسٹیشن پر ایک ٹرین آئی اور جہاں پر میں کھڑا تھا انجن آ کے وہیں پر رکا اس کا ڈرائیور ایک حلیم حکیم کلین شیو خوش پوش تھا، مجھے دیکھ کر مسکرایا اور انجن سے اتر کر قریب آگیا۔ میں واقف نہ تھا کہ یہ حضرت کون ہیں۔ لیکن یہ بھانپ لیا کہ یہ مجھے ضرور جانتے ہیں۔ لوکو ایک ایسا سکشن ہے جس کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اس ریگستان میں بھی سایہ دار درخت ہو سکتا ہے۔ اس لیے میرے گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکی تھی کہ انجن کا ڈرائیور بھی شعر و سخن کا رسیا ہوگا مگر جس ڈرائیور کا تذکرہ میں نے کیا اس کے پہلے ہی جملے نے مجھے حیرت و استعجاب میں ڈالدیا میں ہکا بکا رہ گیا سوچنے لگا ایسی شستہ اور پاکیزہ زبان بھلا کوئی ڈرائیور بول سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک ڈرائیور ہی بول رہا تھا ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تو یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت ملکی محلہ آرہ کے رہنے والے ہیں اور نام خداداد ہے۔ صاحب گنج میں خداداد صاحب ریلوے کالونی میں رہتے تھے اور میں محلہ قلی پاڑہ میں کام بھی الگ الگ تھا اس لئے کا ہے کا ہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں نے جناب سروش عظیم آبادی سے بھی ان کا تعارف کرایا جن کے پاس یہ کبھی کبھار آنے جانے لگے مولوی جمال الدین صدیقی مرحوم نے صاحب گنج میں بزم سخن کی بنیاد ڈالی تو ایک غیر طرحی مشاعرہ میں یہ راز فاش ہوا کہ جناب خداداد شاعر بھی ہیں اور مہجور تخلص فرماتے ہیں اس انکشاف نے ایک دوسرے سے اور بھی قریب کر دیا مشاعرے ہوتے رہے اور ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں بزم سخن کے علاوہ بزم سروش کے طرحی مشاعروں میں بھی اکثر و بیشتر یہ شریک ہوتے رہے۔ بھاگلپور کی ادبی مجلس میں بھی ہمارے ساتھ یہ شریک ہوئے خصوصاً یوم غالب، یوم شاد، یوم سلامتی ابوالحسن جیسے معرکتہ الآرا مشاعروں میں شرکت نے مہجور آروی کو ادبی حلقوں سے بخوبی روشناس کرایا اور ان کے رنگ سخن پر پڑھنے کے موثر انداز نے وہ جادو جگایا کہ ہر شخص ان کا گرویدہ بن گیا سلسلۂ فکر سخن تو اوائل عمر سے ہی چلا آرہا تھا لیکن سروش عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کا آغاز کیا لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش نے انہیں حضرت راز عظیم آبادی مرحوم کے آستانہ تک پہنچا دیا، مرحوم جب تک زندہ رہے مہجور صاحب ان سے فیض یاب ہوتے رہے اور ان کی رحلت کے بعد اپنی صلاحیت وجدان اور آگہی کے سہارے شعر و سخن کی دنیا میں گلہائے رنگا رنگ کھلا رہے ہیں۔

صاحب گنج سے بھاگلپور جب مہجور صاحب کا تبادلہ ہونے لگا تو میں نے مشورہ دیا کہ جب موقع ملے تو جناب کریم اسدی، نکہر بھاگلپوری، قمر بھاگلپوری سے مجاہد پور میں اور تاتار پور میں ڈاکٹر حیات اثر صاحب سے ملاقات کا

سلسلہ استوار کیجئے گا انہوں نے میرے اس مشورہ پر عمل کیا یہاں کی صحبتوں نے انہیں اور بھی نکھار دیا ۱۹۶۰ء میں جب میں دوبارہ بھاگلپور آیا اور محی محی الدین غنی کے ہوٹل میں نشستیں ہونے لگیں تو ایک دن تخلص کے نیک و بد اثرات پر باتیں ہوئیں محمود صاحب نے فرمایا مجھے بھی اپنا تخلص پسند نہیں ہے، تصدیق اشہر نے بھی جو اس وقت نیر تھے اپنے تخلص کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا میں نے برجستہ کہا کہ محمود سے مسرور بن جائیے اور نیر سے اشہر یہ سنتے ہی دونوں احباب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس دن سے تصدیق نیر تصدیق اشہر ہو گئے اور محمود آروی مسرور آروی بن گئے۔

مسرور آروی جہاں غزل کے کامیاب شاعر ہیں وہاں وہ بالیدہ تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں ویسے تو ہر فنکار کم سے کم اپنے فن کا نقاد ہوتا ہے ورنہ تخلیق میں جلال و جمال کی گری کا امکان ہی نہ رہے لیکن دوسروں کی تخلیقات پر تبصرہ اور تنقید ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے۔ کاش کہ مسرور صاحب دل جمعی کے ساتھ اس طرح رجوع کرتے تو شاعر سے بہتر نقاد ہوتے میں نے مسرور صاحب کو غزل گو کہا ہے اسکا مطلب یہ نہیں کہ وہ نظمیں نہیں کہتے لیکن جو رنگینی و رعنائی انکی غزلوں میں پائی جاتی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ انہیں غزل گو کہا جائے

ابتدائی زندگی میں دنیا کے معروف اہل قلم حضرت مالک آروی مرحوم کے فیض صحبت نے مسرور آروی کے شعور کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا مالک صاحب کے مشورہ اور انکی مشفقانہ سرپرستی میں ادیب فاضل کے نصاب کی تکمیل مسرور صاحب نے کی مگر چند در چند مجبوریوں کے سبب امتحاں نہ دے سکے کچھ خیر خواہوں کے مشورے سے ایک خاص کام کے لئے آپ دربھنگہ وہاں کے دوران قیام میں موصوف نے اپنے ایک ہندو دوست کو اس شرط پر اردو پڑھانا شروع کر دی کہ اسکے عوض میں وہ انہیں انگریزی پڑھائیں نتیجہ یہ ہوا کہ انکے دوست نے اردو میں قابلیت حاصل کر لی اور مسرور صاحب نے انگریزی میں میٹرک تک کا نصاب پڑھ لیا۔

مسرور صاحب نے فارسی کی کلاسیکل شاعری کے مطالعہ سے بھی بہت حد تک فیض اٹھایا ہے ان زندگی نشیب فراز سے خوب خوب گذری ہے، اندی و مستی کا موڑ بھی ملا ہے اور مشکلات کے پہاڑ بھی سد راہ بنے ہیں لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کے سہارے یہ آگے بڑھتے رہے اور اب ایک ایسے موڑ پر آگئے ہیں جہاں یہ دنیا اور اسکی رنگینیاں مسرور آروی کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی

مسرور آروی خدا ترس اور دیندار آدمی ہیں یہ اس وقت بھی دیندار تھے جب ایک صاحب بہادر تھے اور آج تو ماشاء اللہ انہیں کوئی ناواقف دیکھے تو یہی سمجھے گا کہ یہ کسی دینی مدرسہ کے مدرس ہیں یا خانقاہ کے سجادہ نشین احباب کے خیر خواہ اور دشمنوں کو بھی دوست بنا لینے والے مسرور آروی کی شخصیت میں آدمی کی خامی اور خوبی کی تمام تر جلوہ گری پائی جاتی ہے قدیم بزم سخن، مجلس اشاعت، مجلس مشاورت ہر جگہ مسرور آروی کی صائب رائے اور حسن اخلاق کی چھاپ نظر آئے گی۔ ان سے کوئی محبت سے ملا تو یہ بچھ جاتے ہیں یہ خود زندہ دل ہیں اور دوسروں کو بھی زندہ دل دیکھنا چاہتے ہیں میں اس دن کا منتظر ہوں جب اپنے مجموعۂ کلام کو ترتیب دینے کے لئے رضامند ہو جائیں گے۔

مسرور آروی کی ابتدائی زندگی گوناگون مصائب

اور کس مپرسی میں گذری ہے غم روزگار نے انہیں جابجا ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا ہے انہوں نے فوجی زندگی بھی گذاری ہے اور اس سلسلے میں انہیں مختلف مقامات کی سیر کرنے کا موقع ملا ہے جس نے انکے تجربات کو اور بھی وسیع کر دیا ہے ان تجربات کے نچوڑ کی جھلک ان کے فن میں نمایاں ہے۔ یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن ادب کی دنیا میں بے ادبی کو پنپتے دیکھ کر ایک قسم کے اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ان کا اپنا فن نکھر گیا ہے لیکن نوشقوں کے لئے انکی یہ افتاد طبع صبر آزما ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ مسرور جیسا خلیق انسان کچھ لوگوں کو ایک نظر نہیں بھاتا اور انہیں یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ مسرور کی باتیں اخلاص پر مبنی ہیں بہرحال مسرور آروی ایک سنجیدہ اور باوقار انسان ہیں، اور ایک اچھے دوست۔

———— بقیہ مسرور آروی ————

ایک مرتبہ ہم مزرل بیٹھے ہیں شاعری خود فنکاری ہے۔ اس کے ساتھ تنقید و تبصرہ کا ملکہ بھی اگر ہو تو کیا بات ہے۔ مسرور صاحب اس میں بھی ستھرا ذہن و ادراک رکھتے ہیں۔ مسرور کی شاعری کا عروج ہے مگر صبح پیری آشکار ہے۔ خدا نہ کرے ان کے اندر پھر پرانا مجھور کروٹ بدل کر بیدار ہو جائے

دل نشۂ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا

زور آزمائی کو کوئی دردِ کھڑا نہ ہو

یگانہ چنگیزی کا شعر سن کر یہ نہ سمجھے گا کہ جناب مسرور یگانہ پسند ہیں، نہیں نہیں یہ تو دوگانہ سہ گانہ، چہارگانہ بلکہ نماز پنجگانہ کے سختی سے پابند ہیں۔ مسرور کا خدا بالکل کے خدا کی طرح نہ کھو گیا ہے اور نطشے کے خدا کی طرح اس کا جنازہ نکل گیا ہے بلکہ وہ ان کے یقین کو مصائب کی اندھیری راتوں میں آج بھی استقامت و استواری کا سہارا دے رہا ہے، یہ ہیں ہمارے مسرور اور ان کی زندگی کے تھپکے، بحمد اللہ پھر بھی ان آندھیوں سے ان کا گاماتی جسم تناور درخت کی طرح جھوم جھوم کر مقابلہ کر رہا ہے مگر ہے اپنی جگہ مستقل"

———

———— بقیہ تصدیق اشہر

اشہر کے نوجوان چہرے پر جھریاں بن کر نمودار ہوں گے

مجھے اشہر سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ خصوصاً ایسے ماحول میں جب ان کے دوسرے ہم سن آیا تو اردو زبان اور اس کے ادب سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے یا امریکی رنگ سخن کے صرف اس لئے دلدادہ بنے ہوئے ہیں کہ وہ اشہر کی طرح محنت سے گریز کرتے ہیں۔ اور جلد از جلد اخبار رسائل میں چھپ کر مشہور ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اشہر گمنام ہیں، نہیں، ایسی بات نہیں ہے ناسازگار حالات کے باوجود حیرت انگیز حد تک یہ ایک ہر دل عزیز شاعر ہیں ——— اور مستقبل تو یقیناً تابناک ہے۔

مسرورؔ آروی ، ایک تاثر

نقی شاعر

اگر حیدر علی سلطنت خداداد کا موجد ہے تو یاران باصفا خداداد مسرور کے پہلے خداداد صاحب اسم بامسمیٰ اور مسمیٰ بااسم ہونے کے ساتھ ساتھ مہجور تخلص کرتے ہوئے اپنی شب ہجر پر قانع تھے۔ عالم ہجرت کا یہ کاروانِ حیات بیار سفر باید تا پختہ شود خامے" کی منزلوں تک لے گیا۔ مگر ان کی سیمابی فطرت اپنی ہمیشہ آتش زیر پا بنے رہی۔ ہمیشہ ٹھہراؤ میں جمود موت کے احساس نے کہیں سکون سے نہ رہنے دیا۔ غرض ساری زندگی حرکت اور مسلسل حرکت سے عبارت ہوتی رہی یا وہ خود زندگی کو حرکت سے تعبیر کرتے رہے۔

مشکل یہ تھی کہ مہجور شمسی اور خداداد مہجور ایک ہی مردم خیز ضلع کے چشم و چراغ تھے اس لئے ذہنی التباس فطری اور تخلص کا بدل لینا ناگزیر تھا۔ "لفظ مسرور" کا ارتقا شاغل قادری کے اس قلب پر ہوا جو ان کے کشادہ سینے میں لوہار کی دھونکنی کی طرح تیز سانس لیا کرتا ہے اور ہوا کی تیز آمد و رفت اس پر گرد کدورت ٹھہرنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔

تعارف کراتے ہوئے اب تک تین نام آئے ہیں عجیب اتفاق ہے کہ انہیں تین زاویوں کی پیمائش سے مقرر اقلیدسی مثلث مکمل ہو جاتا ہے۔ حسن یہ ہے کہ تینوں ہی شاہ آباد سے تعلق کسی نہ کسی جہت سے رکھتے ہیں۔ میرا مقصد مہجور اور شاغل قادری اور خداداد مسرور سے ہے خداداد مسرور کو مہجور شمسی سے ترنم کا حصہ اور شاغل قادری سے جسمانی جثہ ملا ہے بلکہ ان سے بھی عظیم الجثہ اور کثیر الحصہ ہیں۔ میرے مہجور خداداد مسرور صاحب کا بھاری بھرکم شاعرانہ وجود بستر کی شکن میں نہ تلاش فرمائیں۔ البتہ ان کی پیشانی پر شکن در شکن ذہنی الجھنوں کے آثار آپ بکھرے ہوئے پائیں گے جن پر دلشکنی کا شبہہ ہوتا ہے مگر ایسا ہے نہیں۔ آپ کو ان کی آنکھوں میں ایثار اور وفاداری استوار کے معصوم فرشتے کروٹیں لیتے ہوئے ملیں گے، فرض کی قربان گاہ پر دوسروں کے لئے اپنی استراحت بھینٹ چڑھا کر آج خانماں برباد بلکہ خانہ خراب قسم کے شاعر بنکر رہ گئے ہیں۔ کبھی رند خراباتی بھی رہے ہوں مجھے اس کی خبر نہیں اور نہ پوچھنے کی ضرورت ہی سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ یقینی طور پر جانتا ہوں کہ کلاسیکی موسیقی سے ان کی عملی دلچسپی نے ان کی زندگی کو درد آفریں اور دلپسند بنا دیا ہے، حالانکہ بقول مولانا آزاد مرحوم" اب داغ ہے وہاں یہ جہاں پہلے درد تھا" اب اپنے اس شغل سے تائب نظر آتے ہیں۔ کہہ سکتا ہوں

کہ پہلے بھی موصوف کو موسیقی سے نسبت تھی سو نیت سے نہیں چنانچہ بسلسلہ ملازمت سستی ہر دلعزیزی سے پرہیز کرتے ہیں حالانکہ اس سلسلہ کی شہرت انہیں خود تلاش کرتی رہی ہے۔ فی الحال پاتا ہوں کہ وہ غدا جس کا جنازہ نکال کر نغمے نے سانس لی تھی اس کا ادراک مسرور کے شفاف دل و دماغ میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ریلوے کی تکنیکی ملازمت کے پہلو بہ پہلو درد و وظائف سے عملی دلچسپی نے انہیں "دست بکار و دل بیار" قسم کی شخصیت بنا رکھا ہے۔

مہجور مرحوم (خدا۔ اللہ رکھو) کو سلامت رکھے میری پہلی ملاقات بزم حسینی کے مقاصدے میں ہوئی تھی بھاگلپور کی ادبی زندگی ان دنوں شباب پر تھی یا یوں کہوں کہ ادبی زندگی پر شباب تھا اور مہجور کی قصیدہ گوئی شباب پر تھی۔ غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہے جب رانچی سے بھاگلپور طلب کیا گیا تھا۔ مہجور صاحب سروش عظیم آبادی اور شاغل قادری کے ساتھ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ مرحوم صحبتیں بھاگلپور کی نفس بہار ہوا کرتی تھیں۔ ارباب فکر لکھنؤ عظیم آباد اور جہاں جہاں سے ممکن ہوتا اپنے پرپرزے سمبھال اور سجا کر آتے تھے اور وہیں۔

وہیں بھی میں نے دیکھا تھا مجو ہمارے خوار اں ہیں مسرور سابقہ مہجور اپنے کلام سے ... پر تکلم و ترنم کی بارش فرما رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رشن بہاری نور نے بڑی حسرت سے کہا تھا"

تیری بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

حالانکہ نور خود بہت اچھے ترنم سے پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں لکھنؤ کی خاک میں۔

دن گذرتے گئے مشق سخن جاری رہی۔ قسمت نے ہمیں جمالپور اسٹیشن پر ملایا۔ ان دنوں بہ سلسلہ تبادلہ مونگیر آچکا تھا۔ معلوم ہوا کہ غریب مہجور عالم بقا کو ہجرت فرما چکے ہیں اور ان کی روح عالم بالا سے مسرور آروی کی شکل میں مجھ سے ہم کلام ہے۔

غرض اللہ رکھو یہ خداداد مہجور اور پھر مسرور کے عوارض بتوسط کے مختلف مراحل کی طرح عارض ہوتے رہے۔ خدا رکھے ہمارے اللہ رکھو کو' زندہ و پایندہ ہیں اور جسمانی اعتبار سے مستقبل قریب میں انشاءاللہ کسی خطرے کا بھی امکان نہیں ہے۔ گرچہ اب سیاہ و سفید داڑھی کے پیچھے ان کی شخصیت عجیب گنگا جمنی قسم کی ہوگئی ہے مگر قدر مشترک اب بھی قائم ہے اور وہ ہے لہجے کا ٹھہراؤ' آواز کا دہرا پن' کم سخنی اور اس کے ساتھ سبے وطنی بھی۔ ماتھے کی شکن' تیور کا بانکپن اور اس بانکپن میں ... پٹھانیت کی جھلک' جو مضبوط قوت ارادی کی غمازی بھی کرتی ہے اور عکاسی بھی (اس سے بحث نہیں کہ وہ پٹھان ہیں یا نہیں) ہاں تو ہم بھاگلپور میں اتر پڑے جہاں میرا دولت خانہ (سسرال) اور موصوف کا ملازمت کدہ تھا۔ خواہش کے باوجود ہم ... نہ سکے۔ کیارٹمنٹ کا ماحول بڑا ناخوشگوار تھا۔ ہماری باتوں پر ... ہی اس سفر کی یادگار رہے اور یہی ہم تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے اس لئے "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" والی بات سامنے تھی۔

مونگیر سے پھلور یا تبادلہ ہوا تو بھاگلپور کی ادبی صحبتوں میں جہاں اور قابل قدر شعراء سے ملاقات ہوئی حضرت مسرور آروی بھی ملے اور اب تو ہفتہ میں کم از کم

باقی صفحہ ۳۵۱ پر

ششر کمار لعلؔ

پروفیسر امان اللہ غازی

ہردوار سے کلکتہ تک کے ان شہروں میں جو آبرودِ گنگا کے کنارے کنارے سرسبز و شاداب چمن زاروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں بھاگلپور کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ اس شہر کی تاریخی حیثیت علمی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت عہد مغلیہ ہی سے آشکارا ہے بہار کے دوسرے شہروں کی طرح اس شہر میں بھی ادب اردو کی مجلسیں آراستہ ہوتی رہی ہیں اور آج بھی دلدادگانِ سخن شعر و ادب کی انجمن میں دادِ فن دے رہے ہیں۔ قدیم بزمِ سخن زمانہ دراز سے فنکارانِ بھاگلپور کی کاروان سازی اور راہنمائی کے فرائض انجام دیتی رہی ہے۔ جواں سال و جواں طبع ششر کمار لعل اسی کہکشانِ ادب کے ایک اخترِ جواں بخت ہیں۔

ششر کمار لعل گیا کے ایک متمدن اور سربرآوردہ خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو فارسی ادبیات کا ذوقِ لطیف اسلاف کا ورثہ ہے لیکن ان کی شاعرانہ تربیت میں شاغل قادری کا بھی خصوصی ہاتھ رہا ہے۔ مزید برآں لعل کی اپنی فطری صلاحیتیں ان کے آئینۂ کلام کا جوہر ہیں۔ معلوم نہیں لعلؔ کو دیکھ کر اور ان کا کلام ان کی زبان سے سن کر مجھے مجاز لکھنوی کی یاد کیوں آجاتی ہے۔ شکل و صورت میں نمایاں اختلاف کے باوجود قامت و جسامت میں کچھ مطابقت ہے یا شاعرانہ واہیاپن اور انداز و ادا کا بانکپن مجاز کی شخصیت کی یاد دلاتا ہے ——— یا شاید یہ ان کا گدازِ قلب ہے جو کلام مجاز کی غمازی کراٹھتا ہے ——— خدا کرے میرا اندازہ بحیثیت فن صحیح ثابت ہو۔

لعلؔ کو ابھی دنیائے شعر و سخن میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ لیکن ان کا برق رفتار ارتقاء فن کہنہ فنکاروں کو بھی چونکائے دیتا ہے۔ ان کے یہاں وہ حقائق ابتدا ہی سے نمایاں ہونے لگتے ہیں جن کا فروغ وارتقا کسی فنکار کی عظمت فن کا ضامن ہوتا ہے۔ فطرت پرستی انسان دوستی محبِ وطن عشق و مستی، آزادہ روی، وسیع المشربی، تحقیق و تفکر ——— اور تجربات حیات کا شاعرانہ اظہار وابلاغ ———!

لعل کم گوئی و نغز گوئی کے دلدادہ ہیں۔ اس وقت ان کی جو چند نظمیں، بعض غزلیں اور کچھ متفرق اشعار میرے پیش نظر ہیں۔ وہ فنکار کی نیرنگ سامانی اور بوقلمونی کی طرف صاف اشارہ کررہی ہیں۔ ان میں بعض نظمیں وطنیہ ہیں جو چین و پاک کی جارحیت سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔ علاوہ سیاسی خیالات کی ادائیگی

کے ان نظموں میں شاعر ہندو مسلم فسادات کی بیخ کنی
کرتا، فرقہ وارانہ اختلافات کے خلاف احتجاج کرتا ——
اور ہندوستانیوں کو درس محبت دیتا نظر آتا ہے
اس نوع کی تمام تر نظمیں حب الوطنی سے سرشار
ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ نعل کی زبان سے چکبست کا
ذہن بول رہا ہے۔ بعض نظمیں عالمی سیاسیات کے
پس منظر میں کہی گئی ہیں جو امن کو حیات انسانی کے
پس منظر میں حفظ و ترقی کا ضامن بتاتی ہیں اور جنگبازوں
کی تنبیہہ و تہدید کرتی ہیں۔ ان نظموں میں انسانیت کا
درد اور تاریخ انسانی کا شعور ہم آہنگ ہے

وطنیہ نظموں میں ایک نظم "وادیٔ کشمیر" سے متعلق
ہے جو نعل کی فنی صلاحیتوں کو کماحقہٗ اجاگر کرتی ہے
گرچہ سیاسی حالات ہی سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی
ہے لیکن کشمیر سے شاعر کی بے پناہ امنڈتی ہوئی محبت
اسے کچھ اور رنگ بخش دیتی ہے۔ کشمیر کے قدرتی مناظر
کے جمالیاتی اظہار نے اسے ایک حسین منظریہ نظم بنا دیا
ہے۔ قارئین کی تسکین ذوق کے لئے بند اول پیش خدمت
ہے۔ جس میں تلمیحات کا لطف بھی غور طلب ہے۔

قدرت نے یدِ خاص سے کی ہے تری تعمیر
تو خواب زلیخا کا ہے، یوسف کی ہے تعبیر
ہر سو ہے ترے حسن کی پھیلی ہوئی تنویر
شاعر کی نگاہوں میں ہے تو خلد کی تصویر
اے وادیٔ کشمیر
اے وادیٔ کشمیر

علاوہ اور خوبیوں کے ہم جو نعل کی نظموں میں
پاتے ہیں ایک اہم خوبی اس کا ہندوستانی رنگ ہے
یعنی خالص ملکی تلمیحات کا استعمال! نظیر اکبرآبادی
کے کلام کا یہ جوہر خاص اس نوجوان شاعر کی تیغ زبان
کو صیقل کرتا نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے نظم کشمیر کا
یہ آخری بند بھی ملاحظہ ہو۔

باپو کی قسم عظمتِ آزاد کی سوگند
نہرو کی قسم جرأتِ فولاد کی سوگند
ناموسِ وطن عزتِ اجداد کی سوگند
بننے نہیں دینگے تجھے ہم غیر کی جاگیر
اے وادیٔ کشمیر
اے وادیٔ کشمیر

"امن کے پیغامبر کو چھیڑنا آسان نہیں" میں یہ
جنگبازوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں ؎

آج کے راون اگر تم ہو تو ہم بھی رام ہیں
ظلم کے بانی کے حق میں حشر کا پیغام ہیں

نظم نگاری کے ساتھ ساتھ نعل نے غزل گوئی
پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایات
کا التزام بھی ہے اور مسائل حاضرہ کا اہتمام بھی۔ بڑی
بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تغزل برقرار
رہتا ہے۔

اکثر و بیشتر اساتذہ نے متصوفانہ مضامین کے
انبار لگائے ہیں۔ نعل نے ان سے بھی خوشہ چینی کی
ہے اور انتہائی خوش اسلوبی سے روایات کا التزام
کیا ہے۔

یہ رنگ و بوئے چمن کا ہے عکسِ جمالِ دوست

کہتا یہی ہے جلوۂ گلہائے تر ہمیں

اک تیری رضا تھی پیشِ نظر غیروں کو بھی اپنا سمجھا تھا
اب تیری رضا کی خاطر ہی اپنوں سے کنارہ کرتے ہیں

مرے سجدوں نے سنگِ در کی عظمت کو بڑھایا ہے
جبینِ شوق کا ممنون ان کا آشیاں تک ہے

جلوہ ہے جس کے دل میں بتِ سومنات کا
عرفان ہو گیا ہے اسے حسن ذات کا

روشن ترے وجود کی یہ بھی دلیل ہے
گمراہ گر یہ کہتے ہیں موجود تو نہیں

سبھی کو رونا ہے دنیا کی بے ثباتی کا
شہید ناز ہیں کیوں جاوداں کسے معلوم

"رندمشربی" بھی مضامین غزل میں شامل ہے اور شیخ وزاہد کے ساتھ شوخیاں کرنا بھی شعار فن میں داخل رہا ہے۔ ان ہر دو موضوع پر لعل نے بھی دلچسپ اشعار کہے ہیں۔ بعض اشعار کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن میں غور طلب امر یہ بھی ہے کہ انہوں نے مولانا حالی کی ہدایت کے مطابق اہلِ زہد کی خواہ مخواہ پگڑیاں نہیں اچھالی ہیں بلکہ خدا لگتی باتیں کہی ہیں ؂

یہاں شیخ بھی آ کے انساں بنے ہیں
بھلا بزم رنداں میں کیا کچھ نہیں ہے

نگاہ میگوں نہیں تو کیفِ اثر نہ ہوگا کبھی بھی رندو
کہ میکدہ میکدہ نہ ہوگا جو ساقیٔ خوش ادا نہ ہوگا

عاشق ہے بنا شیخ بھی کیا بنت عنب کا
آتا تو نہ تھا یاد کبھی اس کو خدا یوں

ہر دم ذکر حرمت مئے سے
کھل گئی سب پہ شیخ کی نظرت

جنت کی آرزو میں گنوائی یہ زندگی
واعظ تجھے جہان میں آنے سے کیا ملا

پی کے اک جام ذرا دیکھ کرشمہ واعظ
ابھی دامن سے ترے داغ رہا جاتا ہے

عجیب شئے ہیں جناب واعظ برا ہر اک کو سمجھ رہے ہیں
انہیں خبر ہی نہیں کہ ان سے جہاں میں کوئی برا نہ ہوگا

حسن وعشق غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ حسن وعشق کے بیان میں معاملہ گوئی کا پہلو بھی بہت اہم رہا ہے۔ انشاء، جرأت، رنگین، مومن، داغ، اس رنگ کے استاد مانے گئے ہیں۔ دورِ حال میں فراق کے ہاں یہ رنگ کافی نمایاں ہے۔ لعل کی جواں سالی اکثر پریم کی دیوالی منایا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کا دامن بھی اس رنگ سے خالی نہیں۔

کہتے ہوئے آئے وہ بصد ناز وادا یوں
ہوتے ہیں رہا غم سے گرفتار بلا یوں

جو میں نے ان سے کہا کہ اک دن ضرور آؤ گے پاس میرے
وہ مسکرا کر یہ بول اٹھے، تمہارا ہرگز کہا نہ ہوگا

زوال کے آئینہ کو دیکھ ہمدم
ترے حسن کے ماسوی کچھ نہیں ہے

وعدے پہ نہ آئیں گے ہرگز یہ بات سمجھتا ہوں لیکن
گیسوئے تصور میں دل کو الجھا کے میں شاداں کیوں نہ کروں

آپ کی قامت جب بھی دیکھی
یاد آئی ہے مجھ کو قیامت

ان کے خرام ناز کی شوخی
حشر کا ساماں موت کی دعوت

لیکن اس قیامت اور موت کی اصل وجہ بھی اسی غزل کے مطلع میں یوں بیان کر چکے ہیں ؎

مجھ میں نہ ہو گر خوئے محبت
تیری جفا کی کیا ہے حقیقت

اس والہانہ عشق و مستی کے باوجود شاعر کی خوش نفسی پر قربان جائیے۔

ادائیں جن کی ہیں کافرانہ وہ مجھ کو کہتے ہیں نقل کافر
کسی کو ایسا صلہ محبت کا اس جہاں میں ملا نہ ہوگا

نقل نے غزل کے پرانے نقوش و علامات کو نئے معانی میں بھی استعمال کیا ہے اور ایسا کرنے میں استادانہ مہارت دکھائی ہے اور اس طریقۂ کار سے جدید خیالات کو بطرز احسن پیش کیا ہے ؎

آ ہم صفیر پھر سے قفس ہی کو اڑ چلیں
صیاد اب سمجھتا ہے بے بال و پر ہمیں

پہچانتے ہیں شیخ و برہمن کو خوب ہم
گمراہ راہ لائیں گے کیا راہ پر ہمیں

یہ شگفتگی گل و سخن یہ بہار و نکہت نسترن
کہیں پاسبان چمن ہی کو یہ تھپک تھپک کے سلا نہ دے

ذرے کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں
فطرت کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

اب اخیر میں مجموعی طور پر چند ایسے اشعار بھی ملاحظہ کیجئے جن میں شاعر کا عمیق مطالعہ زندگی، حالات کا غم، ارتقا کا فلسفہ، انسانیت کا درد، سعی و عمل کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔

رواں حیات ہے مدت سے ارتقا کی طرف
کہاں یہ ٹھہرے گا یہ کارواں کسے معلوم

جس کو سجدہ فرشتوں نے بھی تھا کیا
اب وہ ابلیس کا ہمنوا ہو گیا

بہار آئی تو سب نے چمن کا ساتھ دیا
خزاں میں کس نے گل خستہ تن کا ساتھ دیا

اڑائیں جیب و گریباں کی دھجیاں میں نے
قفس میں رہ کے بہار چمن کا ساتھ دیا

باقی صفحہ ۳۶۱ پر

لعل گیاوی

ایک ابھرتا ہوا فنکار

از : ——— ھوش عظیم آبادی

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفتہ تر میگوید این افسانہ را

جنابِ شترکمار لعل کی دلکش شخصیت جب مجھے یاد آتی ہے تو ان کا اپنے کو گیاوی لکھنا مجھے شاق گذرتا ہے اور جی یہ چاہتا ہے کہ وہ بھی اپنے کو عظیم آبادی ہی لکھتے اس سے میرا یہ فائدہ ہوتا کہ قرب زمانی کے ساتھ ساتھ مجھے ان سے قرب مکانی بھی حاصل ہو جاتا۔ اور کسی قدر یہ صحیح بھی تھا کیونکہ ان کی جنم بھومی عظیم آبادہی ہے۔ اور جنم بھومی کا حق بہرحال مقدم ہے۔ اس مقام پر مجھے اندیشہ ہے کہ اہالیان گیا کہیں مجھ سے خفا نہ ہو جائیں اور یہ نہ کہنے لگیں کہ ان کے دامن میں جو لعل شب چراغ ہے میں اسے چھیننا چاہتا ہوں چنانچہ اپنا حق رکھتے ہوئے بھی یہاں پر خاموش ہو جانا ہی قرین مصلحت سمجھتا ہوں اور یہ سوچ کر اپنی تسکین کر لیتا ہوں کہ عظیم آباد سے گیا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

ان کے خانوادے سے میرے ذاتی تعلقات باون برس سال سے ہیں۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں ان کے والد ڈاکٹر نول کشور صاحب سے میری پہلی ملاقات بھاگلپور میں ہوئی اور جب سے آج تک میرے اور ان کے گھر والوں کے درمیان انتہائی مخلصانہ اور عزیزانہ رسم و راہ چلی آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب صرف ڈاکٹر ہی نہیں ایک خاندانی جاگیردار اور زمیندار بھی ہیں اور اپنے علاقہ کے رئیس بھی لیکن رئیسوں اور امیروں میں جو چیز انہیں ممتاز کرتی ہے وہ انکی عالمانہ اور فاضلانہ شخصیت ہے۔ ہندی، سنسکرت، اور انگریزی زبان پر مکمل دستگاہ رکھنے کے ساتھ فارسی اور اردو ادب پر بھی ان کی بڑی گہری اور فیصلہ کن نگاہ ہے آج تک ان کا سنایا ہوا یہ شعر —

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

مجھے یاد ہے اس سے ان کے ذوق طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، موصوف نہایت پر مذاق بذلہ سنج، شعر و شاعری کے رسیا اور موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ وأملن ایسا بجلتے ہیں کہ دعذدور ان کا ثانی نہ ملے گا۔

آج سے تیس سال پیشتر کی بات ہے کہ اپنے دولت کدہ کھوائی ضلع گیا میں ہولی کے مبارک موقع پر انہوں نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور موسیقی کا بھی پروگرام مرتب فرمایا تھا جس میں بیشتر گانے کے ماہر اساتذہ موجود بھی تشریف لائے تھے از راہ عنایت مجھے بھی دعوت شرکت دی تھی۔ میں حاضر ہوا تھا اور مشاعرہ کے بعد موسیقی کی پرلطف صحبتوں میں بھی شریک رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس اہتمام اور تکلف سے کام لیا تھا کہ آج بھی جب اس صحبت کو یاد کرتا

ہوں تو انتہائی لذت محسوس ہوتی ہے۔

لعل تگیاوی کی ننہال بھی شاندار روایات کی نمائندہ ہے بھاگلپور میں شیو صبون کو کون نہیں جانتا ان کے نانا رائے بہادر کملیشوری سہائے کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ دولت و حشمت کے ساتھ ساتھ سیاسی دنیا میں صف اول کے رہنماؤں سے ان کے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن سابق صدر جمہوریہ ہند جیسی عہد آفریں شخصیتیں اور دیگر بڑی ہستیاں ان کے دولت کدے پر ان کی مہمان رہ چکی ہیں۔

لعل تگیاوی اسی مرکز دولت و حشمت اور مخزن علم و حکمت کے لعل شب چراغ ہیں۔ ابھی اگرچہ نوجوان ہیں مگر سلامت روی شائستگی اپنے بزرگ سے میراث میں پائی ہے۔ انسانیت، شرافت، اور پر خلوص رسم و راہ کا احترام گویا ان کا حصہ ہے۔ نگاہ اتنی تیز اور ذہن و ضمیر اتنا بالغ و بیدار ہے کہ جس سے ایک بار ملتے ہیں اسے پھر کبھی نہیں بھولتے اپنے حلقۂ تعارف اور دوستوں کی صحبتوں میں جب آتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ کوئی امتیاز نہیں گوارہ کرتے اپنی شخصیت کو یک قلم تہ کر کے ملتے ہیں۔ ان کے رہن سہن، چال ڈھال، طور طریقے غرض کہ تمام انداز و ادا سے ان کی اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی اور خاندانی شرافت و عظمت ٹپکی پڑتی ہے۔ ممکن ہے یہاں پر کوئی صاحب یہ سمجھیں کہ میں ان کا نثری قصیدہ لکھنے بیٹھ گیا ہوں جس کی یہ تشبیب ہے۔ تو اس کے جواب میں بلا جھجک میں یہ کہوں گا میرا جذبۂ خلوص، ان کی شخصیت کے باب میں گرچہ اسی کا متقاضی تھا مگر میں سچ کہتا ہوں کہ اگر میں ان کا قصیدہ لکھ کر تمام بھی کر دوں جب بھی بقول جوش آخر الامر یہی کہنا پڑ جائیگا کہ ؎

پوچھ شاعر سے کہ وہ کیا کہہ گیا کیا رہ گیا

مجھے اقرار ہے کہ میرا قلم ان کے محاسن شخصیت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

ان کی دلکش شخصیت کا تعارف تو ہو چکا اب آئیے اصل موضوع کی جانب یعنی اب میں آپ سے ان کے مذاق سخن کا تعارف کراؤں! جی ہاں صرف تعارف! کیونکہ مجھ میں اپنی بے بضاعتی کی بنا پر کسی تنقیدی موشگافی کی نہ تو صلاحیت ہے اور نہ میں اس صنف ادب کے متعلق کوئی خوش عقیدگی رکھتا ہوں۔ کیونکہ بہ استثنائے چند عموماً ہمارے نقادان فن دور کی کوڑی اس کثرت سے لاتے ہیں کہ ان کا سرمایۂ نقد و نظر اس شعر کا مصداق بن کر رہ جاتا ہے ؎

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
کہ جس کا ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں

سیدھے سادے لفظوں میں ان کی شاعری اور ان کے مذاق سخن کا مجملاً تعارف یہ ہے کہ ذوق سخن انہیں فطری طور پر ودیعت ہوا ہے۔ ان کی خاندانی علم پروری کا تذکرہ میں کیا ہی کر چکا ہوں اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ ابتدا میں انہوں نے ہندی کے ذریعہ اردو ادب کا مطالعہ کیا رفتہ رفتہ براہ راست اردو میں انہوں نے ادبیات اردو سے متعلق تمام کتابیں پڑھیں اور فی الحال وہ فارسی ادب کا بھی مطالعہ فرما رہے ہیں۔

وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں مگر ان کی محبوب ترین صنف سخن غزل ہے اور یہ ہونا بھی چاہئے کیونکہ غزل کے محرکات ذہنی کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان کے پاس ان کی کمی نہیں۔ بلکہ بہتات ہے۔ فارغ البالی، آسودگی، جوانی، اور ذوق سلیم ان کے تغزل کے اجزائے ترکیبی اور عناصر اربعہ ہیں۔

ان کی شاعری کے جس حسن نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ ہے ان کا صحت مند ادبی شعور ان کی شاعری اور ان کا تغزل ایک رئیس زادے کی تعیش پسندی سے الگ عام انسانی زندگی اور اس کی شدت کرب کی سچی ترجمان ہے۔

غزل محبت کی زبان اور پیار کے لہجے کا نام ہے ان کے
لئے بہت آسان تھا کہ وہ سستے قسم کے جذبات پرستی اور لاابالی
پن میں مبتلا ہو جاتے اور ؎

مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

کہکر اپنا اور اپنے سامعین کا دل موہ لیتے مگر ایسی سطحیت سے نہ
صرف یہ کہ ان کا دامن پاک ہے بلکہ اس کوئے ابتذال کی گرد بھی
ان کے لطافت مزاج پر بار ہے۔

محبت ان کی نگاہ میں جوانی کا ایک تفریحی مشغلہ نہیں
بلکہ زندگی کی ایک ٹھوس اور پائدار حقیقت ہے جس کے تحفظ کے لئے
وہ عزم و عمل کا افسوں بھی لائے ہیں ؎

مشکل ہیں وفا کی سب راہیں منزل ہے کٹھن جب الفت کی
میں عزم و عمل کے افسوں سے دشوار کو آساں کیوں نہ کروں

یہ پوری غزل مرصع ہے۔ اس شعر کو دیکھئے کتنے مزے کی بات
کہی ہے ؎

جب آپ ہی کہتے ہیں مجھ سے یہ عشق کا سودا مہنگا ہے
پھر خون جگر ہی کو اپنے اس راہ میں ارزاں کیوں نہ کروں

وہ تخریب میں بھی تعمیر کا پہلو تلاش کرتے ہیں ناامیدی
اور یاس انہیں پسند نہیں اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کے لئے
وہ بہر حال بیتاب نظر آتے ہیں ؎

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے گلشن میں خزاں کا چار طرف
ایسے میں نشیمن پھونک کے میں سامان چراغاں کیوں نہ کروں

ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں مجھے جگر کے لہجے کا گداز
محسوس ہوتا ہے آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

مجھ میں نہ ہو گر خوئے محبت
تیری جفا کی کیا ہے حقیقت
آپ کی قامت جب بھی دیکھی
یاد آئی ہے مجھ کو قیامت

ارزاں ان کا مجھ پہ کرم ہے
کوئی نہ کوئی آئے گی آفت

ظرف نظر سے حسن بڑھا جب
عشق بنا ہے نقش حیرت

اس شعر میں حسن کی بیچارگی ملاحظہ کیجئے۔ کیا سچا مرقع
کھینچا ہے ؎

یہ باتوں باتوں میں آخر کو آگئی کیسے
کسی کے لب پہ مری داستاں کسے معلوم

نازونیاز حسن و عشق کی کیا خوب تعبیر کی ہے ؎

ہم نے سمجھا کہ معراج ہم کو ملی
وہ یہ سمجھے کہ ہم خاک پا ہو گئے

یہ مطلع جس بے پناہ کسک اور جس شدت کرب کی
آواز دیتا ہے اس کا لطف تو کچھ وہی لے سکتے ہیں جو کبھی ان
منزلوں سے گذرے ہوں ؎

غم و آلام کا احساس بڑھا جاتا ہے
پھر پریشان دیا دل کا بجھا جاتا ہے

میر کا انداز تغزل کسے پسند نہ ہوگا آپ بھی میر سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ایک غزل خالص میر کے لہجے میں کہی
ہے جس کا مطلع پیش کرتا ہوں ؎

افسانہ محبت کا جب کوئی سنائے ہے
یاد اس بت کافر کی آ آ کے ستائے ہے

غزل میں تصوف کی روایات بہت قدیم ہیں۔ ہمارے
لعل گیاوی بھی اپنے ذوق تصوف کی داد دئے بغیر نہ رہ سکے
کتنا لاجواب اور بلیغ شعر ارشاد فرمایا ہے ؎

یہ تسلیم ہستی نہیں کوئی میری — مگر تو بھی میرے سوا کچھ نہیں ہے

ان کچھ نہیں کی داد تو عرفا ہی دے سکتے ہیں۔ اسی غزل میں خالص زبان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجئے ؎

جو راز بقا ہے وہ راز فنا ہے
فنا کچھ نہیں ہے بقا کچھ نہیں ہے

ادھر ادھر سے جو چند شعر مجھے یاد رہتے اور مل سکے وہ میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے۔ ان کا سارا ذخیرہ کلام پیش نظر ہوتا تو ان کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو بھی آپ کے سامنے پیش کرتا۔ بہرحال ان اشعار سے ان کی افتاد طبع اور ان کے مذاق سخن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان کے ذوق سخن کی داد دی جا سکتی ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں ان کا آفتاب سخن اگرچہ ابھی افق تابانی کی منزل میں ہے مگر میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ابھرتا ہوا نوجوان فنکار مستقبل میں آفتاب بن کر چمکنے والا ہے جس کی شعاعیں دور دور تک بساط شعر و سخن پر اپنی ضو پاشی کریں گی۔

میں قبل ہی کہہ چکا ہوں کہ یہاں میں لعل گیاوی کی شاعری کا کوئی تنقیدی جائزہ نہیں لے رہا ہوں میں تو دنیائے ادب میں محض ان کا اجمالی تعارف کرانے آیا ہوں۔ چنانچہ جو مواد میں پیش کر سکتا تھا وہ حاضر کر دیا ہے اب یہ نقادان سخن کا فریضہ ہے کہ وہ اپنا کام شروع کر دیں۔

بقیہ ششر کمار لعل

زندگی ہے قفس میں باد صبا پھولوں کی مہک جب گلشن سے
پھر ایسے سنہرے موقع پر میں جشن بہاراں کیوں نہ کروں

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے گلشن میں خزاں کا چار طرف
ایسے میں نشیمن پھونک کے میں سامان چراغاں کیوں نہ کروں

مشکل ہیں وفا کی سب راہیں منزل ہے کٹھن جب الفت کی
میں عزم و عمل کے افسوں سے دشوار کو آساں کیوں نہ کروں

دنیا میں سرفراز کنول کی طرح رہو
جو آب و گل میں کھلتا ہے لیکن جدا بھی ہے

مشعل حق و صداقت ہے مرے ہاتھوں میں
جس طرف جاتا ہوں چھڑ جاتی ہے تنویر کی بات

زیست کا ہر ورق پریشاں ہے
تم سجاؤ تو اک کتاب بنے

جو راز فنا ہے وہ راز بقا ہے
فنا کچھ نہیں ہے بقا کچھ نہیں ہے
گلوں میں جو بوئے وفا کچھ نہیں ہے
مزا عاشقی میں رہا کچھ نہیں ہے

روشن تو ترے دم سے زمانہ ہوا اے لعل
لیکن بتا کہ تجھ کو زمانے سے کیا ملا

اللہ کرے یہ زندہ دلی قائم رہے اور لعل ایک دن گنجینۂ سخن میں لعل بے بہا ثابت ہوں۔ آمین !

از :- تاج انور

ایک آبلہ پا

تصدیق اشہر بھاگل پوری

فراق نے کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے آج سے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

کرۂ ارض پر پھیلی، وسیع اور عریض زندگی کی بیچاگیوں کا فراق نے ایک بظاہر سادہ عکس پیش کیا ہے۔ لیکن آپ اس شعر کو زیر لب دہرائیے اور تصور کی آنکھ سے اطراف عالم کا جائزہ بھی لیجئے۔ اچانک آپ کے حساس دل میں ایک چبھن ایک ٹیس، ایک کسک ابھرتی محسوس ہوگی۔ ممکن ہے آپکی پلکیں بھی نم ہو جائیں، اور تب آپ محسوس کریں گے کہ فراق نے محض سادہ سا شعر نہیں کہا ہے۔ زندگی کی کس پیرشی کے نقوش ابھار کر رکھ دئے ہیں۔

آپ آدمیوں کے خول پہنے متحرک جسموں کی بستیوں پر نظر دوڑائیے۔ ان کے درمیان زندگی سسکتی ہوئی طے گی رعنائی جمال سے یکسر محروم تھکی تھکی اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی، گویا موت کا خوف نہ ہوتا تو کب کی ہانپ ہانپ کر مر چکی ہوتی۔ زندگی کے چہرے پر کرب کی ان لکیروں کو دیکھ کر زندگی کو ہر لحہ متبسم دیکھنے والے کا اداس ہو جانا فطری ہے وہ تو زندگی کے رخساروں کی دمک، آنکھوں میں ہر لمحہ بڑھتی چمک، گیسوؤں کے دراز تر ہوتے چلے جانے اور لبوں سے پھوٹتے قہقہوں کا رسیا ہوتا ہے نہ کہ سسکیوں بھری تنہائی اور اپنے بوجھ سے آپ دبی جاتی زندگی پر قناعت کرنے والا۔

فتنہ و فساد، حرص و ہوس کی پذیرائی اور کشت و خون کس دور میں نہیں ہوا۔ لیکن ہمارا دور اس لحاظ سے زیادہ قابل رحم ہے کہ یہ زندگی کو خوبصورت فریم میں نصب کرنے کی مسلسل جد و جہد کر رہا ہے۔ مگر بذات خود زندگی کو جن دیمکوں سے صدمہ پہونچ رہا ہے وہ یا تو اس کی نگاہوں کی پہونچ سے دور ہیں یا ان کی موجودگی سے پیدا ہونے والے خطرناک نتائج اس کی فہم سے بالا ہیں۔ اب اس غفلت یا خوش فہمی کی بنا پر زندگی کی نبض ڈوبتی چلی جاری ہو تو اس کے پرستاروں کی آنکھوں سے خون ٹپکنا ہی چاہئے۔

فنکار، خواہ وہ ادیب ہو یا شاعر یا فنون لطیفہ کی کسی شاخ پر کھلا ہوا پھول ہو۔ ہمیشہ زندگی کو خوب سے خوب تر دیکھنے کے متمنی ہوتا ہے۔ وہ آرزوؤں بھری

اکتفا نہیں کرتا، مستقبل کے لیے دلکش و دل فریب خاکے اور پائیدار منصوبے بھی بناتا ہے۔ مگر ان کی موڑ کی نشان دہی بھی کرتا جاتا ہے۔ اور ان عناصر پر ضرب بھی لگاتا ہے جنہوں نے زندگی کو یا تو صدمہ پہونچایا ہے یا صدمہ پہونچانے کے درپے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے ——— لیکن زندگی کے بازوؤں میں اس وقت کہاں توانائی بچی ہوگی جب فنکار خود مایوسیوں کا شکار ہو گیا ہو؟ ہمارے ادب پر آج کچھ ایسا ہی وقت آپڑا ہے!

آزادی کی تحریک نے ہمیں آگے بڑھنے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا جو حوصلہ دیا تھا آزادی کے بعد وہ اور بتدریج مدھم ہوتا چلا گیا ہے۔ بدلے ہوئے حالات حالانکہ ان تبدیلیوں میں جوشِ نمو کا فقدان ہے۔ پر کچھ دیر کے لیے ماتم بھی ہوتا ہے۔ مگر اسے سمجھوتہ بھی کر لیا جاتا ہے! یہ سلسلہ جاری ہے جس کے نتیجے میں زندگی کے بیشتر شعبے انتشار اور افراتفری سے دوچار ہیں۔ زندگی کی اس بیچارگی سے ہمارے فنکار متاثر ضرور ہیں مگر مرض کی تشخیص اور علاج کے سلسلے میں ان کی حالت ان ڈاکٹروں کی سی ہے جو مریض کو آپریشن ٹیبل پر بیہوش چھوڑ کر آپریشن کے طریقہ کار اور اس سے برآمد ہونے والے نتائج پر طویل بحثیں کر کے ایک دوسرے پر اپنے نظریوں کی بجگی کی دھونس جمانے میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ آج کے ادب کا زیادہ تر حصہ اسی قسم کی بیکار، جھنجلاہٹ اور سطحی کامرانیوں کے غلغلوں کا آئینہ سامان نظر آتا ہے۔ دوسرا حصہ زندگی کے حالِ دگرگوں پر محض آنسو بہا کر کے اپنی تسکین کر رہا ہے اس شور و غل اور آہ و فغاں میں چند مدھم آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جو دور سے زندگی کو آواز دیتی نظر آتی ہیں۔ زندگی ان کی طرف بڑھنا بھی چاہتی ہے مگر شور و غل اور آہ و فغاں کی دیواریں راستے میں حائل ہو گئی ہیں پھر بھی یہ آوازیں اندھیری رات میں جگنو کی مانند ہیں جن کی چمک دامنوں کو اجاگر کرنے سے قاصر ہے۔

جب ملک کا عام ادبی مزاج حوصلہ شکن ہو تو بہار، جو عام طور پر ادب کا پس ماندہ گوشہ متصور رہا ہے کے مرکز عظیم آباد سے دور افتادہ شہر بھاگلپور کا ایک کم عمر شاعر تصدق اشہر کس طرح مایوسیوں سے دامن بچا سکتا ہے ؎

پناہ ڈھونڈ رہی ہے قضا کے سائے میں
ہے آج کتنی پریشان حیات کیا کہئے

زندگی، زندگی سے برہم ہے
ظلم مظلومیت پہ ہنستا ہے
ظلم کے ان گھنے اندھیروں میں
زندگی کا سہاگ لٹتا ہے

یہ انقلاب زمانہ ہے آج کیا کہئے
کہ زندگی بھی ترستی ہے زندگی کے لئے
نظر نہ آئے کسی میں بہار کے آثار
چمن میں جا نزے ہم نے کلی کلی کے لئے

روز نیلام ہوتی رہتی ہے
زندگی آج کتنی سستی ہے
آج حرص و ہوس کی منڈی میں
لاش انسانیت کی بکتی ہے

اشہر نوجوان ہیں ان کے پاس آرزوئیں بھی ہیں۔ اور خواب بھی ہیں ؎

ان کو آرائشِ گیسو سے ہے فرصت ہی کہاں
کیا سناؤں میں انہیں گردشِ تقدیر کی بات

اللہ رے وہ حسنِ تغافل کے مرحلے
پہچانتے نہیں تھے وہ پہچان کر ہمیں

میری باہوں میں سمٹ آئی ہے اک رات کی یاد
میری رگ رگ میں کوئی برق رواں ہے جیسے

حوصلہ بھی ہے ؎

کئے جائے غمِ دوراں تو ہم پہ یورشیں پیہم
کہ ان شعلوں میں تپ کر اور نکھرے جا رہے ہیں ہم
منانے جا رہے ہیں جشنِ غم ہم پھر ترے صدقے
ادھر آ اے غمِ دوراں گلے تجھکو لگا لیں ہم

وہ سمجھتے ہیں کہ حالات کی ستم ظریفی زیادہ دنوں چلنے کی نہیں ؎

معطر نہ رہے گا کوئی گریباں نہ رہے گا
یہ رنگ ترا اے غمِ دوراں نہ رہے گا
مجبور کے آنسو پہ امیری نہ ہنسے گی
انصاف کا خوں اس طرح ارزاں نہ رہے گا

اور اک انقلاب بس آنے کو ہی ہے ؎

سنوارے گا اسے اب انقلابِ وقت کا شانہ
پریشاں اور ہو جانے دو گیسوئے شبِ غم کو

چمن میں اڑ رہی ہیں دھجیاں جو میرے دامن کی
بنے گا ان سے اے اشہر انقلابِ وقت کا پرچم

مگر عام شعرا پر جو خوف و ہراس طاری ہے اور اسکے نتیجے میں رجائیت جس طرح مجروح ہو رہی ہے وہ اشہر کے یہاں بھی ہے ؎

روٹھی ہے ہمیں سے نگہِ ساقیٔ محفل
یہ کم نگہی ہے کہ ادا کہہ نہیں سکتے
دنیا ہے کہ آمادۂ پیکار کھڑی ہے
گونج اٹھے کب ایٹم کی صدا کہہ نہیں سکتے

ڈر ہے وہ آگ پھیل نہ جائے چمن چمن
دامن میں جو چھپی ہے گلِ دلفگار کے

ان کو بھی شامِ غم کے اندھیروں نے ڈس لیا
جو لوگ دے رہے تھے پیامِ سحر ہمیں

لہٰذا مایوسیوں کے ان اندھیروں میں اگر درج ذیل اشعار اشہر کے یہاں مل بھی جاتے ہیں تو انہیں اندھیری رات میں دور اڑنے والے جگنوؤں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ؎

ہم نشیں ساز اٹھا — صبح کے گیت سنا
ان اندھیروں سے نہ ڈر — ان سے فریاد نہ کر

تیرے چہرے پہ یہ اداسی کیوں — کس لئے سوگوار بیٹھا ہے
تیری آنکھوں میں اشک کیا معنی؟ — کیا اندھیروں سے ہار بیٹھا ہے

باقی صفحہ ۳۴۸ پر

تصدیق اشہر کی شاعری کا ایک مختصر جائزہ

فرحت القادری

میرے پیش نظر بھاگلپور کے خوش گو خوش فکر شاعر تصدیق اشہر کا مختصر سا انتخاب کلام ہے۔ میں ذاتی طور پر اشہر صاحب سے متعارف نہیں۔ لیکن آپ کا یہ مختصر سا انتخاب کچھ حد تک آپ کی شخصیت کو (بہ اعتبار فنکار) سمجھنے میں معاون ثابت ہوا ہے

فنون لطیفہ میں شاعری سب سے زیادہ خصوصیت کی حامل ہے ——— چونکہ فن میں اثر آفرینی بہت بڑی شئے ہے اس لئے وہ فن یقیناً قابل قدر ہوگا جو انسانیت عظمیٰ کے لئے مفید ہو ——— اشہر صاحب کے یہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں جذبۂ ایثار اور درد انسانیت کی فراوانی ہے

عروسِ فصلِ گل ہم چاکداماں سے واقف ہے
چمن سینچا گیا جب بھی دیا ہم نے لہو پہلے
وہ ہم ہی تھے جو رہے قائم وگرنہ راہِ الفت میں
ہزاروں حادثے گذرے ہزاروں پیچ و خم نکلے

پناہ ڈھونڈھ رہی ہے فضا کے سائے میں
ہے آج کتنی پریشاں حیات کیا کہئے

شاعری زندگی کی تعبیر و تفسیر ہے اسی لئے شاعری میں تجربات اور مشاہدات کی اہمیت زیادہ ہے۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ جس چیز کی تصویر پیش کرے وہ ایسی ہو جیسے وہ خود اس چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے ——— اشہر صاحب نے بھی اپنے گرد و پیش پھیلے ہوئے انسان کے ژولیدہ مسائل کو قریب سے دیکھا ہے اور انہیں صداقت کے ساتھ شعر کا جامہ پہنایا ہے

کچھ بتاؤ تو سہی صبح کے پیغامبرو
آخرش غم کی شبِ تار رہے گی کبتک
ظلم کبتک غمِ مفلس پہ ہنسے گا اشہر
کند انصاف کی تلوار رہے گی کبتک

اور کچھ بڑھنے کو ہے تاریکیٔ شامِ الم
صبحِ نو کے منتظر! تابکے شکیبائی رہے

شاعری میں جذبات کی گرمی اور تخیل کی گہرائی کو لوگ زیادہ ڈھونڈھتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ صرف تخیلات جذبات، محاکات ترنم اور توازن کا استعمال ہی شاعری نہیں بلکہ فنکار کا کام یہ بھی ہے کہ اپنے جذبات اور واردات کو ایسے خوبصورت پیرائے میں پیش کرے کہ اس سے سامع یا قاری کو مسرت حاصل ہو اور اس میں زندگی کی صداقت بھی پائی جائے اشہر کی شاعری اس میزان پر پوری اترتی ہے۔ ملاحظہ

فرمائیں۔

میں بھی انسان ہوں پتھر نہیں دنیا والو
میرے سینے میں بھی ارمان بھرا اک دل ہے
پیار پر حق تو نہیں صرف شہنشاہوں کا
پیار کرنے کا تو ہر ایک کو حق حاصل ہے

پھر مرے پیار پر یہ شور قیامت کیسا
لوگ کیوں لوٹ رہے ہیں مرے ارماں کا چمن
کیوں تمنا کا گلا گھونٹ رہی ہے دنیا
لوگ کیوں سینے لگے میری محبت کا کفن

(جرم محبت)

اشہر صاحب آج کی ذلیل سیاست سے نالاں ہیں اور ملوکیت و اقتدار کی تباہ کن کشاکش سے حیران و ششدر!

آج اس دور میں کہ جب انساں
کر رہا ہے خلاؤں میں پرواز
آج پیدا ہوئے ہیں ہر جانب
جب ترقی کے بت نئے انداز
زیست سے بے قرار کیا معنی
مضطرب کائنات کیا معنی
صبح نو کے حسین موسم میں
غم کی یہ کالی رات کیا معنی

(فریب سحر)

ایک حساس اور انسانیت کا درد رکھنے والا شاعر جب سیاسی بازیگروں اور جنگی دیوتاؤں کی انسانیت سوز حرکتوں اور ہولناک عزائم کا تصور کرتا ہے تو اس کی روح تک لرز جاتی ہے۔

نقشہ جو چمن کا یہ نظر دیکھ رہی ہے
لفظوں میں اسے ہم بخدا کہہ نہیں سکتے
ہر پھول ہے دامن میں چھپائے ہوئے شعلے
کب دیدے کوئی ان کو ہوا کہہ نہیں سکتے
دنیا ہے کہ آمادۂ پیکار کھڑی ہے
گونج اٹھے کب ایٹم کی صدا کہہ نہیں سکتے
ہے سخت گھڑی آج ذرا جاگتے رہیے
اشہر تو کچھ اب اسکے سوا کہہ نہیں سکتے

(اندیشۂ فردا)

مگر اس کے ساتھ ہی اشہر صاحب اس ہمت شکن تاریکی میں عزم و حوصلہ کی قندیل روشن کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ان گھٹا ٹوپ اندھیروں سے مرعوب نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ظلمتیں چھٹ کے رہیں گی۔ آفتاب طلوع ہو کے رہے گا ———

اٹھے گا جنوں شانۂ تدبیر سنبھالے
پھر گیسوئے تقدیر پریشاں نہ رہے گا
ہر سمت مسرت کی کرن پھوٹ پڑے گی
کوئی بھی اسیر غم و حرماں نہ رہے گا

پوری غزل عزم و حوصلہ اور رجائیت سے ہم آہنگ ہے۔ اشہر کے بیشتر اشعار میں یقین محکم اور عمل پیہم کا جذبہ کارفرما ہے ——— دیکھئے اس شعر میں عزم و حوصلہ کی وہ انتہائی منزل ہے جو چیلنج کی حدود کو چھو رہی ہے۔

رسائی اب ہماری بجلیو ! دیکھیں کہاں تک ہے
ہمارا ہی نشیمن آج صحن گلستاں تک ہے

شاعری کی دنیا جذبات، تخیل، تشبیہ، تمثیل، استعارے والہیے اور خواب کی دنیا ہے۔ یہاں الفاظ صرف اپنے عمومی، عملی، بین اور منطقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتے۔ یہاں مناسبت الفاظ، توازن، بحر، قافیہ، ردیف، اشاروں اور محاکات سے الفاظ اور جملوں میں نغمگی اور موسیقیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعر ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ہمارے ان جذبات کو بیدار کرتا ہے اور احساسات کے ان تاروں کو چھیڑ دیتا ہے جنکے وجود کا ہم کو علم تک نہیں ہوتا۔ ایسے خوبصورت اور وقیع اشعار اشہر صاحب کے یہاں جا بجا ملتے ہیں

اے دامنِ حیات ذرا غم سمیٹ لے
یہ دلنواز تحفے اسی مہرباں کے ہیں

پاؤں روکے تو بہت راہ کی دشواری نے
آپ تک لے ہی گیا ذوقِ فراواں آخر

چراغ عزم مرا اور جگمگا اٹھا
رہِ وفا میں جو جھونکے کبھی ہوا کے چلے

سمجھ رہے ہیں سحر کو بھی رات کیا کہئے
فریب خوردۂ وعدہ کی بات کیا کہئے
نکھر گئی ہے کچھ آج ایسی شام غم آخر
کہ بھول بیٹھے اجالے کی بات کیا کہئے

صدیق اشہر کے اس مختصر سے انتخاب کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ آج کا یہ سلجھا ہوا نوجوان شاعر مستقبل میں روشنی کا مینارہ ثابت ہو سکتا ہے جو جدیدیت کے ہلاکت آفریں سیلاب میں ثابت قدم رہ کر خس و خاشاک کی طرح بہنے والوں کو ادب کی زندگی آموز منزلوں کی طرف بلاتا رہے گا۔

اس وقت "جدیدیت" (یہ لفظ بذات خود محلِ نظر ہے) کے نام پر اردو ادب میں بے ادبی کا ایک طوفان برپا ہے۔ صالح روایات اور تہذیبی ادب کے اقدار پر عریاں اور گمراہ کن "جدیدیت" نے شبخون مارا ہے ——— ایسی ادبی بے راہ روی اور سرکشی کے قابلِ نفریں دور میں اگر کوئی نوجوان شاعر میر و غالب یا چکبست و اقبال کے روشن کئے ہوئے چراغوں سے چراغ جلاتا ہے اور فن و ادب کی روشنی دور دور تک پھیلاتا ہے تو اسے بجا طور پر مستقبل کا مینارۂ نور کہا جائے گا ——!

اشہر صاحب نے جدیدیت کے علمبرداروں کی کیا خوب نباضی کی ہے

خدا سمجھے نئی تہذیب کے ان ناخداؤں سے
یہ ہر جہلِ مرکب کو بڑا قابل سمجھتے ہیں
مگن ہیں اپنی دھن میں یہ نئے رہرو نئے رہبر
وہ ہیں خاموش جو دشواریٔ منزل سمجھتے ہیں

یہ خاموشی محض اسلئے ہے کہ ایسے برساتی سیلاب جس تیزی سے آتے ہیں اسی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ ان سے صرف خذف ریزے متاثر ہوتے ہیں۔ کوہ گراں کا کچھ نہیں بگڑتا۔

تصدیق اشہر

کریم اسلامی

یوں تو اشہر سے میری دیرینہ ملاقات تھی مگر ۱۹۵۵ء میں جناب سعید وکیل کے مکان تاتارپور میں ایک طرحی مشاعرہ تھا جس کا مصرع تھا ؎

پھول بھی ہے زندگی کے باغ میں کانٹا بھی ہے

اس مشاعرہ میں انہیں شریک مشاعرہ دیکھا اور سنا تو ان کی دلربا طرحی غزل سے میں بے حد متاثر ہوا — خصوصاً اس شعر نے نہ صرف مجھے بلکہ کل شعراء کو متاثر کر دیا حضرت سروش عظیم آبادی نے تو بے ساختہ کہا کہ مشاعرہ ختم کیجئے اس سے بہتر شعر نہیں ہو سکتا ؎

کچھ نہیں آتا سمجھ میں تیرے دیوانے کا راز
خود گریباں چاک بھی کرتا ہے خود سیتا بھی ہے

اس کے بعد بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک مرتبہ ۱۹۵۹ء میں جناب نواب ناصر رضا صاحب کی سعی سے ایک فی البدیہہ طرحی مشاعرہ جناب مسرور آرزوی کے مکان پر منعقد ہوا جس میں تمام شعراء کے ساتھ اشہر بھی شریک تھے۔ اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام سے مصرع نکلا۔

ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

اشہر نے مقررہ وقت پر فکر سخن ختم کرتے ہوئے کہا بس ایک مطلع سنئے بقیہ اشعار بس جیسے ہیں ویسے تو ہیں ہی وہ شعر تھا

اپنا کہیں جسے وہ پرایا کہیں جسے
قسمت ہے اپنی اپنی وہ جیسا کہیں جسے

یہ مطلع سن کر حاضرین صرف متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ سبھوں نے یہ تسلیم کیا کہ سچ مچ اشہر ایک فطری باکمال شاعر ہیں۔ یہ مشاعرہ امتحان کے لئے تھا جس میں اشہر نے اپنی شخصیت و صلاحیت کو اپنے احباب سے تسلیم کرایا۔

تصدیق خاں محلہ برہ پورہ کے رہنے والے ہیں جہاں علم و ادب کا خاصہ چرچا رہا ہے۔ آج وہاں شاعر و ادیب کی تعداد اچھی ہے۔ تصدیق پہلے حضرت قوس کی طرف مائل ہوئے لیکن ان کی بلند پروازی نے زیادہ دنوں تک آستانۂ قوس پر ٹھہرنے نہ دیا۔ یہ پہلے نیر تخلص کرتے تھے۔ بعد میں میکدہ کی ایک نشست میں شاغل قادری کے مشورہ سے نیر سے اشہر ہو گئے اور اب یہ تصدیق اشہر ہیں۔ دونوں لفظوں کی معنویت پر اگر غور کیا جائے اور اشہر کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہ سچ مچ اسم بامسمیٰ ہیں۔

تصدیق اشہر میں خودداری عزت نفس اور بلند پروازی کا جذبہ بدرجہ اتم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی مراحل میں انہوں نے جو کچھ کسی کی رہبری تھوڑی دیر کے

لئے جتنوں کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی افتاد طبع اپنی آپ راہبر ہے۔ ان کی موزونیٔ طبع فطرت کا عطیہ ہے۔ مطالعہ نے جس میں جلا بخشدی ہے۔

غزلوں میں سبک اور رواں لفظوں کا انتخاب اور نظموں میں عصری رجحانات کی عکاسی یہ ہے اشہر کا رنگ سخن۔ ان کی حسین غزلیں اور جمیل قبول عام کی صلاحیتوں سے مالامال ہیں ان کی خودی و خودداری' بلند پروازی اور عبقری فطرت' احساس ابتری کی آگ میں تپ کر کندن بن گئی ہے۔ اپنی بے پایاں صلاحیتوں کے سمندر کی اتھاہ کم لوگوں نے لگائی اور جس کسی نے ایسا کیا ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اشہر کی طرح ورطہ گرداب سے کشتیٔ سخن کو مردانہ وار ٹکرا نہیں سکتا۔ اشہر انسان ہے کوئی فرشتہ نہیں جس سے لغزش کا امکان ہی نہیں مگر ٹھوکر کھا کر سنبھلنا جانتے ہیں۔ کسی کے مبلغ علم اور وسعت مطالعہ سے مرعوب ہونا اشہر کی فطرت کے خلاف ہے۔ مرعوبیت کسی قسم کی کیوں نہ ہو انسان کو پر شکستہ بنا دیتی ہے اور اشہر افق سے بھی آگے اڑنا چاہتے ہیں۔

آج دنیا کا جو حال ہے اس کا اثر ہر انسان پر یکساں پڑ رہا ہے۔ آج کوئی سکھی نظر نہیں آتا جس کو بھی دیکھئے غم سے نڈھال ہے۔ بقدیق اشہر ماحول سے بیگانہ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر ایسے میں جبکہ خاندان کا سارا بوجھ ایک دوش ناتواں پر ہو مگر یہ اشہر ہی کا دل گردہ ہے کہ تفکرات کے طوفان سے دوچار ہونے کے باوجود فرار کی راہ اختیار کرنے کی طرف مائل نہ ہوئے کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ایسے عالم میں گھر بار چھوڑ کر اپنا الگ بسیرا بنا لیا یہ ایک ادبی قسم کی شکست خوردہ ذہنیت ہے

جس کا شکار اشہر جیسا خوش فکر انسان اگر ہو جاتا تو عظمت کا لفظ لغت سے الگ کر دیا جاتا۔ مصائب کے گہرے سمندر میں تبسم آفرینی کوئی اشہر سے سیکھے۔ ہمت شکن اور جرأت آزما ماحول میں بھی مسکراتے رہنا کوئی عام آدمی کا کام نہیں ہے۔ یہ ایک شاعر ہی کا دل ہے جو بہرحال عزم و ارادہ کی پختگی کے فیض سے خود مسکراتا اور دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ مثل مشہور ہے "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات" میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب مغربی ادب کا آسیب اردو کے سر سے اتر جائے گا اور جدیدیت جیسے پاکیزہ لفظ کے پردے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا پول کھل جائے گا تو اشہر کا فن اپنی دلربائی اور عشوہ طرازی کے سہارے عروج پر نظر آئے گا۔ اس بات کا اظہار میں اس لئے کر رہا ہوں کہ بقدیق اشہر بھی نوجوان ہیں اور وہ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ٹیڈی لباس اور ٹیڈی فکر کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں غوطہ لگا سکتے ہیں مگر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے جذبے نے اور دوسروں کی ذہنی غلامی نہ اختیار کرنے کی خواہش نے اشہر کی اس تخریب آفریں راستے سے الگ تھلگ رکھا ہے اور یہ ثبوت ہے کہ اشہر ایک ایسا فنکار ہے جس کا فن حیات دوام کی قدروں کا امین ہے۔ علم و فن میں سن و سال کی قید ہرگز روا نہیں رکھی گئی ہے اور ممکن بھی نہیں ہے۔ یہ تو قدرت کی دین ہے وہ جس کو نواز دے۔ ہاں زمانے کے سرد و گرم اثرات سے جو نکھار آتا ہے وہ چیزے دیگر ہے۔ اگر کسی کو اشہر میں اس چیزے دیگر کی تلاش کرنی ہے تو اس دن کا انتظار کرنا ہوگا جب ماہ و سال کی تہیں

باقی صفحہ ۳۷۵ پر

ایک نئی آواز کا ہونے والا شاعر

"ظفر ادیب"

ہندوستان کی تقسیم کا حادثہ ہر اعتبار سے تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اس سلسلے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کھیل قدرت نے کھلایا ہے یا خود انسانوں نے کھیلا ہے۔ کتنا خطرناک تھا یہ کھیل ـــــ آدمی مجبور ہو گیا۔ اجنبی ماحول میں سانس لینے کے لئے اور ایک پشت در پشت ہی نہیں کئی پشتوں تک کی نشو و نما نہ جانے کس حالت کو پہنچ گئی۔ کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ماحول سے اکھڑ کر غیر ماحول میں زندگی بنا لی۔ اگر ہزاروں بنے ہیں تو لاکھوں برباد ہوئے ہیں اور شاید ہمیشہ کے لئے برباد ہوئے ہیں ـــ

کون کہہ سکتا ہے کہ جانی راولپنڈی میں ہوتے تو اپنے موجودہ حالات سے کہیں بہتر حالات میں نہ ہوتے اور اسے زندگی کے بہتر مواقع حاصل نہ ہوتے۔ اس نے زندگی کے بہترین سال کسی ایک مقام پر استقلال سے جینے کے ناقابل ہونے میں گذار دئے اگر یہی برس اسے زندگی کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے میں صرف کرنے کا موقع ملتا تو وہ کہیں زیادہ زندہ شعور انسان ہوتا۔ اس کے شعور پر تو ہوش و حواس کے پنپتے ہی ضربیں پڑنے لگیں۔ پھر اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ ایک شاعر کی کسک کو پرورش دیتا رہا۔ جس پر حالات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہی کسک اس کی شاعری میں لاوا اگلتی ہے اور اسے جلاتی ہے۔ اگرچہ شاعری کے سانس اور شاعری کی آنچ کو بڑھاتی ہے

قمر جلال آبادی بہت ہی سلجھے ہوئے اور سنجیدہ ذوق کے فنکار ہیں۔ انہوں نے لاہور کی گل پاش فضاؤں پر اپنے ذوق کو پروان چڑھایا ہے وہ لاہور ـــــــ جو لاہور سے آنے جانے والوں کے لئے غالب کے کلکتہ کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ جانے کس کس کے دل اس کے ذکر پر چھد جاتے ہیں۔ ممکن ہے قمر صاحب کو لاہور الیا محسوس نہ ہوتا ہو کیونکہ وہ لاہور سے بمبئی پہنچے اور خوب پہنچے۔ انہوں نے لاہور سے اچھا شہر بھی پایا اور لاہور سے اچھے حالات بھی۔ ـــــ ـــــ لیکن کوئی ان سے پوچھے جو ان کی طرح خوش نصیب نہیں ہو سکے ان کے لئے تو لاہور کیا چھوٹا کہ ان کی زندگی چھوٹ گئی۔ میں جانی کی لئے اس ساعت کو نہایت مبارک سمجھتا ہوں جب اسکو قمر صاحب سے قرب حاصل ہوا اور انہوں نے اس کے ذوق کی رہنمائی بھی قبول کر لی اس خوش ساعت کے اثرات و نتائج اس صورت سے کہیں زیادہ اچھے ہیں جو صورت اس سے مختلف طور پر پیش آئی۔

جانی کے لئے یقینی تھا کہ [illegible] پس منظر کے ساتھ اپنی شاعری میں نئی آواز جیسی کوئی [illegible] رکھتے۔ اگر وہ اس

میں کامیاب نہ ہوتے تو یہی کہا جاتا کہ وہ بزم سوختی کی دلالت نہیں۔ مجھے شکر ہے کہ اس پر یہ الزام نہیں آیا اور وہ بہت کچھ توقع کے مطابق ابھرا اور نکھرا ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اسے زندگی اور دنیا کتنا موقع دیتی ہے اپنی شاعری پر اپنے خلوص کی رنگینی، شگفتگی اور صداقت کی بارش کرنے کا ـــــــ

جیسے ایک حساس اور انسانیت کی اقدار کا احترام کرنے والے کو ہونا چاہیئے۔ جاؔنی بالکل ویسا ہی ہے اخلاق، ملنساری اور انکساری اس سیرت و سرشت کے عناصر غالب ہیں۔ تصنع، نمائش اور تکبر اسے چھو تک نہیں گیا وہ خاموش خدمتِ ادب کا آدمی ہے۔ اسی لئے کافی مدت کے بعد بھاگلپور میں بھی جانا پہچانا گیا وہ بھی اس صورت میں کہ احباب نے بہت اصرار کیا تو مشاعرے میں شرکت کرنے لگا اور ادبی کاوشوں کو اشاعت کے لئے بھیجنے لگا۔ اگر طبعی طور پر خلیق اور منکسر نہ ہوتا جیسا کہ عام طور سے بیشتر شعراء نہیں ہوتے تو اپنی ادبی کاوشوں کو بھی خوب خوب اچھالتا اور اس اس انداز سے متعارف ہونے کی کوشش کرتا کہ ایسے لوگ بھی معترف ہو جاتے جو موجودہ صورت میں نہیں ہوئے۔ پھر ایک ذمہ دار انسان کی طرح جیسا کہ اسے اپنی فطرت اور طبیعت کے ساتھ ہونا لازم تھا اپنی سب ہی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی اپنی بساط بھر کوشش کرتا ہے

ساحر لدھیانوی کو وہ اپنا محبوب اور پسندیدہ شاعر کہتا ہے یہ ایک طرح سے اس بات کی جانب ایک اشارہ بھی ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں نئی روش کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ جس کی قمر جلال آبادی صاحب کی

رہنمائی کے نتیجے میں بھی توقع کی جاتی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک اندیشہ بھی لاحق ہوتا ہے کہ کہیں یہ پسندیدگی اور رہنمائی کسی کے اپنے پن پر اثر انداز نہ ہو اگر جاؔنی نے اپنے اپنے پن کو اس نرغے میں محفوظ رکھا ہے تو قابلِ تعریف ہے، میرا مشورہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کر سکا ہے تو آئندہ اپنے پن کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے ورنہ اس کی اپنی کوئی آواز نہ ہوگی۔ جاؔنی کا ایک شعر ہے

ہماری تلخ باتوں سے نہ ہونا بدگماں یارو
دیا ہے زندگی نے جو ہمیں تقسیم کرتے ہیں

مجھے اس شعر میں جاؔنی کا اپنا پن برتا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ساحرؔ کے شعر کی ہی صدائے بازگشت ہے لیکن یہ شعر جاؔنی کے مستقبل کا پتہ بھی دیتا ہے، اگر وہ اپنے اس انداز کو برقرار رکھ سکا۔

مجھے کچھ روز جینے کے لئے اتنا ہی کافی ہے
کہ میرا دل وہ اپنے درد کے قابل سمجھتے ہیں

اچھا ہوتا ہے اگر وہ کچھ روز" کی محدودیت کو بھی پار کر جاتا اور اس احساس کی وسعت کو ابد تک پھیلا دیتا لیکن شاید ابھی وہ فن کی اس منزل میں نہیں پہنچا ہے لیکن اس سے یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ وہ ایسے دل کو چھونے والے خیالوں کی راہ میں پڑ گیا ہے ؎

خوشی آئی مرے در پر تو اس کا منہ نہ دیکھونگا
مگر جاؔنی میں مرگِ ناگہاں سے کچھ نہیں کہتا

یہ زندگی کا عزم لائقِ ستائش ہے۔ مرگِ ناگہاں کا راستہ روکنے کی ہمت نہ کسی کو ہوتی ہے نہ جاؔنی کو ہو سکتی ہے بلکہ جاؔنی اسے لبیک کہنے کو بڑی خندہ پیشانی سے آمادہ ہوتا ہے۔ اس شعر میں کئی پہلو ہیں اس میں تہہ در تہہ

مفہوم کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تیرا بسیرا ہے وہ ذرے بھی صنم ہوں گے
تجلی جس کی مہماں ہو وہ کوہِ طور ہوتے ہیں

اس شعر میں ایک کیفیت ہے اگر اس کے نوک پلک کچھ اور تیکھے ہو جاتے تو یہ یاد میں رہنے والا شعر بن جاتا

کیونکر دھواں دھواں نہ ہو رخ کائنات کا
دیوانہ چھوڑنے کو ہے دامن حیات کا

روایت کو سینے سے لگاتے ہوئے بھی جانی ایسے خیالات کا اظہار کر جاتا ہے۔ خدا کرے اسے کوئی طرحدار یا تیور دار مل جائے جو اسے روایات کی منزل سے آگے بڑھا دے۔

ابھی جانی کا فن ارتقا کی طرف مائل ہے اس لئے اس کے اشعار کے خدوخال کا نکھار بھی ارتقا کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ زبان و بیان اور فن کی پوشیدہ نزاکت ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے یہاں تخیل کی فراوانی، تجربہ اور تجزیہ کی جلوہ گری اور ایک قسم کی سرمستی کا سا انداز ہے ذرا اس شعر کی بیساختگی دیکھئے

زاہد سے طبیعت نہ ملی ہے نہ ملے گی
میخوار تھا میخوار ہوں میخوار رہوں گا

مزاج ہر ایک کے بس کی چیز نہیں۔ اگر جانی مزاج سے اپنی توجہ ہٹا لے تو اس کے لئے اچھا ہی ہوگا۔ یہ تو وہ رَم خوردہ آہو ہے کہ اچھے سے اچھے بھی مشکل ہی سے رام کر سکتے ہیں۔ پھر طبیعت کی بات بھی ہوتی ہے جب طبیعت ہی دوسرے رنگ کی ہو تو وہ اسی میدان میں نیا پن ابھار سکے گا یوں اسے اختیار ہے جو راستہ اختیار کرے میں نے اسے جیسا پایا ہے ویسا بنانے میں گریز نہیں کیا۔ اب جب وہ اس خارزار میں آ ہی گیا ہے تو اسے اپنے جنون کو کام میں لینا چاہیئے ورنہ یہ خارزار گریز پائی پر مجبور کر دے گا۔

کلونت سنگھ جانیؔ

کی غزل گوئی

محمد قائم شبنمؔ ۔ بی ۔ اے

شعر وہ کلام موزوں ہے جس کے ذریعے سے شاعر اپنے خیالات کو ایسے دلکش انداز سے پیش کرتا ہے کہ سننے والے پر ایک عالم سرور طاری ہو جاتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شاعری بات کہنے کا فن ہے اور شعر اس فن کا خارجی مظاہرہ ۔ میتھو آرنلڈ شاعری کو زندگی کی تفسیر کہتا ہے ۔ اور تفسیر یا ترجمانی میں اس کے کہنے کے مطابق شعریت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں تخیل اور جذبات دونوں موجود رہیں ۔ شیلی کا قول ہے کہ " شعر تخیل کی زبان ہے ۔ یعنی شعر نام ہے قلبی جذبات کو موزوں الفاظ میں بیان کرنے کا ۔ اس روشنی میں جب ہم کلونت سنگھ جانیؔ کی غزلوں کو دیکھتے ہیں تو جانیؔ کے فن کی تعریف کرنی پڑتی ہے ۔ شاعر کو سمجھنے کے لئے اس کی ذہنیت سے آگاہی ضروری ہے ۔ کلونت سنگھ جانی ایک ایسی شخصیت ہے جسے نو عمری میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا ۔ اور آگ کا دریا عبور کرنے کے بعد وہ اپنی نئی زندگی بنانے میں کامیاب ہوا ۔ [illegible] جس کی زندگی گذری ہو اس کے مزاج میں تلخی کا پیدا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسا شخص زندگی اور اس کے حسن و رعنائی سے واقف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے باوجود کلونت سنگھ جانیؔ کی غزلوں میں رسیلاپن اور مٹھاس ہے ۔ زندگی کے سرد و گرم تجربات کی جلوہ گری ہے ۔ شباب و رعنائی کا حسن ہے زندہ دلی کی تصویر کشی ہے ۔ اور وہ تمام باتیں ہیں جو کسی شاعر کو فن کے عروج تک پہونچانے کی ضامن ہو سکتی ہیں ۔ ایمائیت اور رنگینی بیان کا جادو جانیؔ نے اپنے اس شعر میں کس طرح جگایا ہے وہ ہر صاحب دل خود سمجھ سکتا ہے ۔

کوئی شبنم کوئی موتی کوئی آنسو سمجھتا ہے
ابل کر دل کے جو ٹکڑے سر مژگاں چلے آئے

صبح کا منظر نہایت دلکش اور حسین ہوتا ہے اس لئے شعر کی زبان میں خوشی کے اظہار کے موقع پر صبح کی تشبیہ اور استعارے سے کام لیا جاتا ہے ۔ جانیؔ کو صبح کے حسین منظر میں بھی کچھ کمی محسوس ہوتی ہے ۔ اور وہ کمی ظلمت کی سیاہی ہے ۔ یعنی صرف خوشی انسان کی زندگی کے لئے اہمیت نہیں رکھتی اس خیال کو جانیؔ نے یوں پیش کیا ہے ؎

مانا کہ صبح کے دامن میں ہر چیز ہے لیکن اے جانیؔ
ظلمت کی سیاہی سے خالی دامان سحر ہو جاتا ہے

انداز بیان کا جادو دیکھنا اگر دیکھنا ہو تو جانیؔ کے اس شعر کو دیکھئے ؎

انہیں مجھ سے، مجھے ان سے نہیں نسبت کوئی جانیؔ
وہ اک نظرے میں قلزم ہیں میں اک قطرہ ہوں قلزم میں

رومانس آج کے شاعروں کا خاص موضوع ہے۔ جس میں خارجیت کا اندازِ بیان خوب خوب آتا ہے۔ اس موضوع پر جاؔنی نے بہت کامیاب اشعار کی تخلیق کی ہے۔ جاؔنی کے مندرجہ ذیل شعر میں جدید رنگِ بیان کی عکاسی حسین پیرائے میں ملتی ہے ؎

کتنی مغرور حسیناؤں کے برفیلے بدن
میرے ہاتھوں کے سبک لمس سے انگار ہوئے

معشوق کی محفل میں عاشقِ ناکام کے جذبات کی ترجمانی جاؔنی نے کیا خوب کی ہے ؎

تری محفل کا دستورِ زباں بندی سنبھالیں گے
مگر ہوتا نہیں اشکوں پہ کوئی اختیار اپنا

جاؔنی نے بڑی کامیاب غزلیں کہی ہیں ان کے فن میں قدامت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی شبہہ نہیں محسوس ہوتا کہ مستقبل قریب میں کلونت سنگھ جاؔنی اپنے فن کا لوہا دنیائے ادب سے منوالیں گے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار مجھے بہت پسند آئے ؎

تو اپنے ساغر و مینا کو رکھ دے طاق پر ساقی
کسی شے کی نہیں حاجت نظر سے پینے والوں کو

کون سا اس میں پیچ ہے زاہد بات ہے کیا سمجھانے کی
جو مسجد کی راہ نہیں ہے وہ ہوگی مے خانے کی

بلا کی مستیاں ہیں آپ کی مخمور آنکھوں میں
اگر زاہد پہ نظریں پھیر دے میخوار ہو جائے

رنگ ہیں قوس و قزح کے ترخ پہ اے دوستو
یا کہ میرے یار کا آنچل سا اڑتا جائے ہے

تعلق ترک کرنے پر بھی رہتی ہے خلش باقی
نگاہیں پھیر لینے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا

ملاحظہ ہو اجارہ داری مری ہر اک چیز پر کسی کی
کہ دل ہے میرا تو یاد ان کی نگاہیں میری تو خواب ان کا

دیکھنا ہے کس کی قسمت میں فتح کا تاج ہے
جنگ ہے اس دور میں تخریب کی تعمیر سے

کانٹوں میں بسر کرنے کی خو ڈال لے جاؔنی
عاشق کے لئے تختِ سلیماں نہ رہے گا

مانا کہ احتیاط سے رکھو گے دل مرا
پر شیشہ جب بھی ٹوٹتا ہے دیکھ بھال میں

جبینِ شوق ہے اک بار جھک کر اٹھ نہیں سکتی
وگرنہ ہم بھی مومن ہیں یہ بتخانے سے کہہ دینا

تجلیؔ طور کی موسیٰ نے دیکھی تھی جہاں اک دن
وہاں پہ اہلِ دنیا کو نہ اک ذرہ نظر آیا

مری عادت میں شامل ہے، مری فطرت کا حاصل ہے
کہ دل پہ چوٹ کھا کر بھی زباں سے کچھ نہیں کہتا

صمد حمیدی

جاؔنی کی کہانی!

کلونت سنگھ جاؔنی گبرو جوانوں اور جیالوں کا دیس پنجاب کا باشندہ ہے تقسیم ہندوستان سے اور جو بھی نقصانات ہوئے ہوں لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا بہت سارے ادیب و شاعر جن میں جانی بھی ایک ہے۔ ہمارے حصے میں آ گئے جنہوں نے یہاں آکر سروس اختیار کی، کاروبار کیا، مکتبہ و پریس قائم کیا۔ انڈسٹری اور فیکٹری کی بنیاد رکھی۔ نئے نئے اخبار و رسالے جاری کیے، تعلیم گاہیں، ادبی ادارے و ادبی مجلسیں قائم کیں، شعر و شاعری کا بازار گرم کیا اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دلی ـــ دوسرا لاہور ہو گیا، بمبئی دوسرا کراچی اور چنڈی گڑھ دوسرا راولپنڈی بن گیا تو اسی راولپنڈی کے محلہ آسال گڑھ میں کلونت سنگھ جاؔنی مرواہ کی پیدائش ۱۹۳۳ء کے چودہ جولائی کو ہوئی۔ سردار سنتو کھ سنگھ مرواہ کے گھر پیدا ہونے والا گل گوتھنا سا یہ بچہ کون جانتا تھا کہ [illegible] شاعر ہوگا لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ کلونت سنگھ۔ جانی بن کر رہے۔

جاؔنی بچپن میں بڑے زیرک، فہیم، اور حد درجہ باتونی شرارتی تھے۔ اپنی شرارتوں اور حرکتوں سے اپنے گھر اور محلہ والوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کتنی ہی بار والدہ نے آپ کے کان کھینچے۔ سرزنش کی، توبہ تلہ کروایا لیکن وہ عادت ہی کیا جو بدل جائے۔ خیر صاحب آپ کو نانا بزرگوار سردار سکھا سنگھ کے حوالہ کیا گیا وہ سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائے اور ابتدائی تعلیم و اسباق سے آشنا کرایا۔ درجہ چہارم تک آپ نے نانا سے تعلیم حاصل کی بعدہٗ خالصہ اسکول راولپنڈی میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے خالصہ کالج میں داخلہ لیا لیکن ۴۷ء کی قیامت صغریٰ نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ادھوری تعلیم کو خیرباد کہہ کے والدین کے ہمراہ جیتے جیتے دھنباد پہنچے اور تین برس تک وہاں قیام کیا اس درمیان والد صاحب وھیکل انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے ۵۰ء میں بھاگلپور تشریف لائے اور یہیں بس گئے۔ ابتدا میں ٹرانسپورٹ بزنس کے جھمیلوں میں گرفتار رہے اور خوب خوب سیر و سیاحت کی۔ چار سال قبل آپنے سنگھ موٹرس کے عنوان سے لوئس روڈ بھاگلپور میں اپنی موٹر پارٹس کی دوکان کر لی ہے اور آج جاؔنی اپنے حسن اخلاق اور نیک کارکردگی کی بنا پر اپنے حلقے میں خاصے مقبول و مشہور ہیں۔

۴۸ء میں گھومتے پھرتے بمبئی پہنچے اور اپنے والد صاحب کے خاص الخاص دوست کی وساطت سے جناب قمر جلال آبادی صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا صحبتیں رنگ لائیں فطری ذہانت و فطانت اور ذوق شعری نے مہمیز کا کام کیا۔ اور آپ سوچنے بچارنے اور گنگنانے پر مجبور ہو گئے۔ جانی ـــ ایک نئی آواز کا ہونے والا شاعر اسی کی دین ہے۔ ۴۹ء میں پہلی غزل کہی اور قمر جلال آبادی صاحب کی خدمت میں اصلاح کیلئے

بھیجی ۱۹۵۲ء میں شری نانک چند ناز کے روزنامہ "پرتاپ" جالندھر میں سب سے پہلی غزل شائع ہوئی۔ آج تک ان کی سینکڑوں غزلیں نظمیں، اور قطعات اشاعت پذیر ہو چکی ہیں اور ان کا منفرد رنگ و آہنگ جانی کو جاننے اور پہچاننے کے لئے کافی ہیں۔

خلیق، ملنسار اور بچھ بچھ جانے والا ـــ یہ ہے جانی کی دوسری خصوصیت ـــ نمود و نمائش اور چھپنے چھپانے سے عادتاً گریزاں۔ اسی لئے بھاگلپور کے ادبی حلقے کو جانی سے روشناس ہونے میں کافی عرصہ لگا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ اب آپ نے اپنے طرز عمل کو بدل دیا ہے۔ گاہے ماہے مل لیتے اور مشاعروں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اکثر غزلیں، مزاحیہ نظمیں وغیرہ ملک کے مؤقر جریدہ و ماہنامہ میں نظر آ جاتی ہیں۔

جانی سے میری پہلی ملاقات ڈاکٹر محمد یونس صاحب کے دردولت واقع کوتوالی پر منعقدہ ایک مشاعرہ میں ہوئی یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ میں اور اعجاز ابراہیم، جن کا آج کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہیں، جب مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک نوجوان سے سردارجی رنگ گندمی، نقوش تیکھے، سر پر پگڑی باندھے، عینک لگائے ـــ خوب اسمارٹ سے ایک کونے میں بیٹھے غزل پر غزل سناتے چلے جا رہے ہیں۔ گرد و پیش ان کے دو اور سکھ بھی براجمان ہیں ان میں سے ایک (بعد میں عقدہ کھلا) کرمل سنگھ جوگی ملنگ اور دوسرے ان کے شریک کار سردار جوگندر سنگھ جی ہیں۔ داد کا ریلا ہے کہ تھمتا نظر نہیں آتا وہ مجوب سے سمٹے سمٹائے داد وصول کر رہے ہیں اور آداب تسلیم بجا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آگے پیچھے بیٹھنے والوں سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "(آپ نہیں جانتے۔ یہ کلونت سنگھ جانی ہیں ایک اچھے شاعر"۔

یقین جانئے کوئی لگی لپٹی نہیں کہتا اس دن کے مشاعرہ میں جانی ہی کا پلہ بھاری رہا پھر تو جانی بھاگلپور کی محفل شعر و ادب کے موضوع بحث بن گئے۔ کوئی ان کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تو کوئی ان کی شاعری کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھتا حالاں کہ بات ایسی بالکل نہیں، جانی کے پاس جو شعری سرمایہ ہے وہ آج بڑے بڑے شعراء کو بھی حاصل نہیں اس سے ان کی زود گوئی اور ذوق شعری کا پتہ چلتا ہے یہ اور بات ہے کہ ان کو کوئی اور اُستاد، رہنما اور ایسی سوسائٹی میسر نہ آسکی جہاں یہ اپنے فن کو بنا، سنوار اور نکھار سکتے۔ پھر بھی اپنے طور پر جو کچھ آپ نے محسوس کیا اور کہا ہے وہ خوب اور قابل داد ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں کبھی کبھی اوزان و بحور، اور زبان کی خامیاں نظر آتی ہیں لیکن ان کو وہ اپنے وسیع مطالعے اور مشق و ممارست فن کی رہبری میں دور کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب جانی دنیائے شعر و ادب کا درخشندہ ستارہ ہوگا۔ اور جس کے اشعار سند کے طور پر پیش کئے جائیں گے۔

جانی کے جوہر ان سے ملنے کے بعد ہی کھلتے ہیں جوں جوں ان کے قریب ہوتے جائیے ان کے تیکھے نقوش رفتار گفتار خوش اطواری و خوش ذوقی، محبت، باتوں میں رس، اور من موہنی کیفیت کا اندازہ ملتا ہے۔ ویسے قد اور کاٹھی کے اعتبار سے آپ پورے سردار جی ہیں لیکن سرداروں میں خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں اور ان کے متعلق بہت سارے لطیفے بھی، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے جانی سے متعلق کوئی لطیفہ مشہور نہیں۔

ایک لطیفہ یہ ضرور ہے کہ آپ نے شادی ۱۹۶۸ء میں کی اور عمر کے اس حصہ میں کی جب کہ آپ کو چار پانچ بچوں کا باپ بن جانا چاہیے تھا۔ چھوٹی بہنوں کی پرورش و پرداخت و تعلیم اور گھریلو ذمہ داریوں کے بار گراں نے اب سے پہلے آپ کو یہ فریضہ انجام دینے کا موقع نہیں پہنچایا۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ آپ اس کمی کو جلد ہی پورا کرنے کی سعی کریں گے۔

میرا دُوسرا بچّہ کب ہونا چاہیئے؟

ڈاکٹروں کا کہنا ہے، بچّے کی نشوونما میں پہلے چار پانچ برس کا عرصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ ماں کی بہتر صحت کے لئے بھی ضروری ہے کہ دُوسرا بچّہ تین چار برس بعد ہو۔

آج کل آپ برتھ کنٹرول کے متعدد محفوظ، مؤثر اور سادہ طریقوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اب بچے کا جنم اتفاق کی بات نہیں ——— یہ آپ کے اختیار میں ہے۔

مکمل مشورے اور خدمات کے لئے قریبی فیملی پلاننگ سینٹر میں آج ہی تشریف لائیں۔

اور یاد رکھیں ....

بچے دو ہی کافی ہیں

Sohail Gaya.

December 68

مولانا ساجد اللہ حشر

حسن معصوم

جبکہ کچھ لوگ تنگنائے غزل کہہ کے اپنے طور پر کم عیار
بنانے کی کوشش کرتے ہیں اس کی وسعت، گہرائی اور گیرائی
کا اندازہ اس کو ہو سکتا ہے جو خلوص سے کہ سا ہو غزل (۳)،
کی ہیئت نغمگی، اختصار اور اختصار میں وسعت پیدا کرنا
چاہتا ہے۔ کہنے کو یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ غزل کا دامن
بہت کوتاہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کوزے
میں بحر بیکراں موجزن ہے۔ صرف ضرورت ہے پرخلوص
دوربین نگاہوں کی۔ مولانا ساجد اللہ حشر کا مختصر سا مجموعہ
کلام میرے پاس ہے۔ اس میں سنہ ۴۸ء سے آج تک
کا کلام ملتا ہے جس میں تقریباً ۷۰ غزلیں ہیں اور کچھ سہرے
ان غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں
کہ مولانا ساجد اللہ حشر روایاتی اصول برتنے میں نہایت
محتاط ہیں۔ اساتذہ فن کے متعین کردہ اصولوں سے سرمو
انحراف کرنا جرم سمجھتے ہیں۔ زبان میں سادگی اور مٹھاس
ہے۔ حسن بیان مولانا کی سیرت کا آئینہ ہے فکر کے
رنگ و روغن پر مولانا کی طرز تعلیم کی چھاپ ہے۔
غزلیں عنفوان شباب سے اس وقت تک کی
ہیں جب مولانا ضعیفی کی طرف قدم رکھتے ہیں اور شباب
کو الوداع!

مثل مشہور ہے، پیالے میں جو ہوگا وہی ٹپکے گا۔
نثر ہو یا نظم انسان اپنے دلی جذبات اور احساسات کو
اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے کے لئے
کچھ لکھتا یا بولتا ہے۔ اب لکھنے کا انداز حسن و جمال لئے
ہوئے ہو تو ایسی تحریر ادب کے دائرے میں آجاتی ہے
اور پھر یہ موزوں بھی ہو تو منظوم کلام سمجھا جاتا ہے۔ شعر
و ادب انسانی زندگی سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اسی
کا آئینہ ہے۔ آئیے ہم مولانا کو ان کی غزل کے آئینے میں
دیکھیں آپ فرماتے ہیں ؎

دل کے جذبات کو لے حشر اشاعت کیلئے
اپنے اشعار میں تحریر کیا کرتے ہیں

اس شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا حشر
شعر و سخن کو زندگی کا آئینہ دار اور حدیث دل بیان کرنے
کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کی ساری کی ساری غزلیں اسی ایک
شعر کے محور پر گردش کرتی ہیں۔ حشر صاحب نے سچ
سچ اپنے ہر شعر میں واردات حیات بیان کیا ہے۔ شروع
شروع میں غزل کا جو کلاسیکل مفہوم ہے اس رنگ میں
بھی آپ نے خامہ فرسائی کی ہے اور نوجوانی کا اقتضا بھی
یہی تھا۔ اس کے بعد مصنف دینی درسگاہ کی تعلیم کا اثر کچھ

ایسا ہوتا ہے کہ انسان نوجوانی کے نشہ میں بھی گرمی کی
باتیں نہیں کرتا۔ دیکھئے کیسا رنگین شعر حشر نے کہا ہے
مگر دوسرے مصرع میں کس طرح وہ اپنے مدرسانہ رنگ
کو برقرار رکھے ہوئے ہیں ۔

میرا قصور کیا ہے جو دل تم پہ آ گیا
منظور تھا یہی مرے پروردگار کو

محبت کیجئے اور پھر راحت کی بھی امید ہو۔ حشر
صاحب کے خیال میں یہ ایک تضاد ہے جس کو وہ
روا نہیں رکھتے ۔ شعر ملاحظہ ہو ۔

خیال راحت و آرام کیوں بے کار ہوتا ہے
محبت میں تو بس آزار ہی آزار ہوتا ہے

مندرجہ بالا شعر سے ایک اور حسین نکتہ یہ واضح
ہوتا ہے کہ شاعر خود راحت و آرام کا متلاشی ہے اور
ناکام ہونے پر خود اپنے دل کو سمجھا رہا ہے کہ بھئی! محبت
جب کیا ہے تو اس راہ میں تکلیف ہی تکلیف ہے
آرام کی تلاش فضول ہے اس نظریہ کو اپنانے کے بعد
ذرا شاعر کے تحمل کو بھی دیکھئے ۔

بزم دشمن میں کلیجہ تھام کر بیٹھا رہا
کیا تحمل ہے تمہارے عاشق دلگیر میں

حشر صاحب کو ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ جو بات اپنے معشوق
سے وہ کہیں گے وہ غیر تک پہنچ جائے گی اور وہ بھی معشوق
کے ذریعہ ———

آپ کہہ دیں گے عدو سے ہے مجھے اس کا یقین
میں بتا سکتا نہیں جو دل میں میرے راز ہے

اس شعر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شاعر کا معشوق گوشت پوست
کا ہے اس طرح حشر صاحب مومن سے قریب ہو جاتے
ہیں۔ اس کے ثبوت میں ایک شعر اور ملاحظہ ہو

ممکن ہے مل گئی ہو خبر میرے عشق کی
ساجد وہ جل رہے ہیں بہت دیکھ کر مجھے

اسی قسم کے ایک اور شعر سے لطف اندوز ہوں

جس طرف جاتا ہے تو ہوتا ہے اک محشر بپا
کیا قیامت ہے او ظالم تری رفتار کی

نوجوانی کی غزلوں میں اس قسم کا رجحان ساجد اللہ
حشر کے یہاں ملتا ہے ۔ لیکن کبھی وہ معشوق حقیقی کی بھی
باتیں کرنے لگتے ہیں جیسے اس شعر کو دیکھئے

انداز عاشقوں کے چھپیں گے محال ہے
پہچان لے گی حشر میں ان کی نظر مجھے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان
کی شفاعت پر یقین شاعر کو کس درجہ ہے وہ اس شعر کے
آئینہ میں نظر آئے گا ۔

کیوں روز حشر کا ہو بھلا خوف حشر کو
ہے جبکہ مدح خواں وہ رسالت مآب کا

سرکار کی محبت سے سرشاری اس شعر میں بھی جھلکتی ہے

عشق شہہ والا ہی سچ جانئے ایمان ہے
ایمان سے کہتا ہوں شاہد مرا ایمان ہے

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا خوانی پر بجا طور پر
حشر کو کیسا ناز ہے وہ دیکھئے ۔

اے حشر قیامت میں پہچان کے مجھے رضواں
کہنے لگے یہ دیکھو حضرت کا ثنا خواں ہے

مدینہ منورہ کی مدحت میں ایک شعر کتنا حسین
کہہ گئے ہیں ۔

طیبہ کا دشت باغ جناں سے بھی بڑھ کے ہے

خدا کی راہ میں عشاق جب جی سے گذر تے ہیں
حقیقت میں وہ زندہ رہتے ہیں ظاہر میں مرتے ہیں

راہ حق میں جو کٹا دیتے ہیں گردن اپنی
حشر میں شان سے نکلیں گے وہ تیغ کے سائے

انقلابات زمانہ نے جب مصائب کا پہاڑ توڑنا شروع کیا اور لوگ پریشان ہراساں اور دل گرفتہ ہونے لگے تو مولانا نے جس انداز میں انہیں مخاطب کیا وہ یہ تھا

معیبت میں کیوں آپ گھبرا رہے ہیں
یہ اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں

ساجد اللہ حشر مولوی ضرور ہیں لیکن ایسے مولوی نہیں ہیں کہ ہر کس و ناکس پر کفر کا فتویٰ عائد کرتے چلیں رشد و ہدایت کا سنجیدہ طریقہ جو اسلام نے سکھایا ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔ اختلافی مسائل سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ کسی کی برائی کبھی نہیں سوچتے اور اسی لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب میں کسی کی برائی نہیں چاہتا تو میرا کوئی بدخواہ کیوں ہوگا۔

کرے کیوں کر کوئی بدگوئی میری
کہ میں ہرگز نہیں دشمن کسی کا

آپ نے مدرسہ خیریہ سہسرام میں تعلیم پائی ہے اس لئے سہسرام سے بھی والہانہ لگاؤ اور محبت ہونا فطری بات ہے۔

یہاں تو عیش ہمیشہ ہے غم کا نام نہیں
دراصل باغ جناں ہے یہ سہسرام نہیں

آخر میں ایک غزل کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں جس میں حشر صاحب کے دونوں رنگ نمایاں ہیں۔

پہلا رنگ

دل بہلتا ہے رخ گلرنگ جاناں دیکھ کر
کون ہے جو خوش نہیں ہوتا گلستاں دیکھ کر
چھپ گئے تارے جبیں پر انکی افشاں دیکھ کر
چاند بھی شرماکے ڈوبا روئے تاباں دیکھ کر
کرتے ہیں پیوست دل میں نوک مژگاں دیکھکر
خون بھی لیتے ہیں وہ جس رگ جاں دیکھکر
وہ چھڑکتے جاتے ہیں چٹکی سے لیکر نمک
مسکراتے جاتے ہیں زخموں کو گریاں دیکھکر
عندلیب خوش نوا ہوں بوستان عشق کا
دم بخود زہرہ بھی ہے مجھ کو غزلخواں دیکھکر
بلبل دل کی ہمارے آنوا سنجی تو بس
کیا چہکتا ہے بہار روئے جاناں دیکھ کر
باندھ دو زنار گردن میں کہ راہ عشق ہے
وہ بت کافر خفا ہو مسلماں دیکھکر

دوسرا رنگ

کس طرح موسیٰ نہ گرتے نور یزداں دیکھ کر
غش پہ غش کھاتا ہوں جب تصویر جاناں دیکھکر
ذات اقدس آپ کی ہے مظہر ذات خدا
پھر کہے شان خدا کیوں کر نہ انساں دیکھ کر
دیکھنے والے جو ہیں ہر وقت طیبہ کی بہار
خاک دل بہلے گا ان کا باغ رضواں دیکھ کر
وہ فراغت ہے کہاں حاصل جو پہلے تھی مجھے
بوریا یاد آ گیا تخت سلیماں دیکھ کر

شاہین بدر ——— ایک تعارف

مرتضیٰ گوہر

جو لوگ پابندی سے الحجاز، دانش، سیارہ ڈائجسٹ، زاویے، بادبان، منشور، ارژنگ، شمع لاہور، تہذیب، خرام، کرنافلی، بیسویں صدی اور جوئبار جیسے ادبی پرچوں کا مطالعہ کرتے رہے ہیں ان کی ملاقات شاہین بدر سے ضرور ہوئی ہوگی۔ اتفاق سے میری ملاقات اس شخص سے ہے جس نے بہت ہی کم عرصے میں وہ مقام حاصل کر لیا جہاں بہتر سے بہتر کہنہ مشق بھی نہیں پہونچ سکے۔ ۱۹۳۷ء کی غالباً ساتویں جولائی کو نٹ بن۔ نے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی اور بڑے خوشگوار ماحول میں پرورش پائی۔ والدین کا نام زین العابدین ہے جو اپنے گاؤں کے بہت بڑے رئیس ہیں اور خاندان کے تمام افراد کے ساتھ بھاگلپور کے محلہ حبیب پور میں گذشتہ بیس پچیس سال سے مقیم ہیں۔ زمینداری کے ٹوٹ جانے پر بھی سیکڑوں بیگھے کی کاشتکاری موجود ہے لیکن خود یہ شخص اپنی دنیا الگ بسائے ہوئے ہے۔ تین بچیاں ایک بچہ اور ایک حسین وفادار بیوی یہی کل اس کی کائنات ہے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ایک مقامی ہائی اسکول میں مدرس ہے۔ شاعری محبوب ترین مشغلہ ہے۔

شکل و صورت وضع قطع اور چہرے مہرے سے یہ ایک خوش باش نوجوان معلوم ہوتا ہے لیکن جب کسی مشاعرے میں اپنی غزل پڑھتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کوئی اور شخص ہے جس کا لباس تار تار ہے اور بدن زخموں سے چور۔

ہیں میرے چاروں طرف بدر درد کے کانٹے
مرا نصیب بھی شاخ گلاب جیسا ہے

چلے تھے فصلِ بہاراں کا لطف اٹھانے ہم
مگر نصیب میں سوکھے شجر نکل آئے

موسم مسرت میں سب ہی ساتھ رہتے تھے
جب خزاں کا دور آیا رہ گیا شجر تنہا

یہ بھی اک تماشہ تھا زندہ دل نگاہوں میں
پتھروں کے میلے میں تھا جو میرا سر تنہا

لیکن یہ ہمت بھی نہیں ہارتا۔ کہتا ہے ؎

سینہ سپر ہیں چین کی دیوار کی طرح
ہمت بھی سر بلند ہے مینار کی طرح

لہراتے مسکراتے ہوئے ہم گزر گئے
آئے جو مرحلے رسن و دار کی طرح

آخر شب آلام سے گھبراتے ہیں کیوں لوگ
سورج کے نکلنے میں ذرا دیر تو ہوگی

میرا وجود کشمکش روزگار میں
تالاب میں کنول کی طرح سربلند ہے

ہم بھی سقراط ہیں کہ لے آئیں
زہر کا جام ہار کر لب تک

سحر ہے دور تو کیا غم ہے بدر عزم اپنے
اندھیری رات میں جلتے ہیں مشعلوں کی طرح

قدم لرز نہ سکے موجۂ حوادث سے
تھپیڑے لاکھ سہے ہم نے ساحلوں کی طرح

شاہین بدر حسن و عشق کا بھی قائل ہے خود اس نے اپنی پسند کی شادی کی اور کامیاب زندگی گذار رہا ہے لیکن اس کا ماضی بہت دردناک ہے جس کی یاد اب بھی اس کی روح کو لرزا دیتی ہے۔ اکثر وبیشتر یہ روتے روتے ہنسنے لگتا ہے۔ ایک بار میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "تقسیم وطن نے جتنے زخم دئے ہیں ان کو تو بھلایا جاسکتا ہے لیکن میں ان گلیوں کو کیسے فراموش کروں جہاں میرا بچپنا گذرا ہے۔" یہ شخص جہاں والدین کے پیار کا بھوکا ہے وہاں دوستوں سے بھی ماضی میں کافی رنج اٹھا چکا ہے۔

شاہین بدر کا استاد اس کا وسیع مطالعہ ہے مشرقی پاکستان کے شمالی اضلاع کا غالباً یہ واحد شاعر ہے جس کے نام ہر ماہ کم و بیش آٹھ دس پرچے اعزازی طور پر آتے ہیں اور جن کا گہرا مطالعہ اس کی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔

شاہین بدر کا اپنا لب و لہجہ ہے اپنی علامتیں ہیں اپنے استعارے ہیں۔ یہ ایک ایسا ابھرتا ہوا شاعر ہے جس سے اردو شاعری بہت کچھ امیدیں وابستہ کر سکتی ہے۔ ان دنوں اس کا مجموعہ کلام "آواز کا صحرا" زیر ترتیب ہے جس کا بیشتر جرائد میں اشتہار بھی آچکا ہے۔

علم و ادب کی آغوش میں اس نے آنکھ کھولی ہے۔ بچپن سے شعر کہتا ہے۔ شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ اس نے اپنی پہلی غزل ۱۹۵۲ء میں پبلک لائبریری حبیب پور کے تاریخی مشاعرے میں پڑھی اس وقت یہ بدر بھاگلپوری تھا۔ ۱۹۵۹ء-۶۰ء میں جمالستان دہلی میں اس کی چند تخلیقات شائع ہوئیں ۱۹۶۱ء سے برابر اس کی تخلیقات مختلف ادبی جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔ پاربتی پور میں ادبی فضا اور ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں اس نے نمایاں حصہ لیا بزم ادب کے تحت جو اہم ادبی اجتماعات ہوئے ان کا سہرا شاہین بدر کے سر ہے۔ پاربتی پور میں بزم ادب اور انجمن ترقی اردو کی شاخ کا یہ معتمد اعلیٰ ہے۔ ادب میں سستی شہرت کا قائل نہیں۔

عبدالمجید عادل غازیپوری

از ——— محمد اکرام انجم

یہ سنہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے جب مشفقی و محبی جناب عبدالغنی کاموش صاحب سہسرام سے بھاگلپور آئے۔ جب سے شعر و شاعری کا سلسلہ جاری ہے ایک مدت سے پرورش لوح و قلم کرتے آ رہے ہیں۔ جناب سالک غازیپوری سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ سبکدوش ہونے کے بعد تعلقات کی بنا پر یہ مجھ سے تین سال سینیر ہوئے اور واقع ہوئے ہیں۔ ملازمت سے ۱۹۵۶ء سے بھاگلپور میں ہیں۔ اور ریلوے سے منسلک ہیں۔ ریلوے جیسے کاروباری ماحول میں سانس لیتے ہوئے بھی ان کا ہنگامہ خیز ادبی ماحول سے اتنی ہی دور نظر آتے ہیں جتنا کہ آسمان سے یا مشرق مغرب سے۔

میری پوزیشن چونکہ اس وقت ایک نوجوان لڑکے کی تھی اس لئے رسمی تعارف کا موقع نہ ملا اتنا سنجیدہ نوعیت کا نہیں سمجھا جانا چاہئے تھا۔ پھر بھی انہیں پہچاننے میں دقت بالکل نہیں ہوئی بلکہ ہونے کے بعد دیگرے ملاقات کا ایک تانتا بندھ گیا اور میرے ذہن میں جو تمام تصویریں جو ایک نامکمل لمحاتی و تاثراتی تجزیہ کی مرہون منت تھیں۔ حرف غلط کی طرح مٹ گئیں اور ان کی اصلی شخصیت کے بیشتر خد و خال نمایاں ہو گئے جن کی بدولت مجھے موصوف کے جوہر کردار و گفتار کو پرکھنے اور ایک واضح رائے قائم کرنے میں کافی سے زیادہ مدد ملی۔

راقم الحروف سے متعارف ہونے سے قبل عادل صاحب حلقۂ احباب میں بڑی حد تک گھل مل گئے تھے۔ خاص طور پر جناب غنی ہدیہ غنی صاحب سے جن کے بے پایاں جذبۂ خلوص و محبت نے انہیں بامقصد سرگرمیوں کی طرف متوجہ کرانے میں اس وقت بھی رہبری کی اور آج تک اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔

متناسب قد و قامت، گٹھا ہوا اکہرا جسم، سنجیدہ اور متین چہرہ، آنکھوں میں بیک وقت شعر و نغمہ کو سمو لینے والی طبیعت۔ سادگی و خلوص کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ——— یہ ہیں وہ خطوط جن پر کوئی بھی انہیں بغیر کسی تکلف کے بخوبی پہچان سکتا ہے۔ اور ہم یہ علیک سلیک (Exchange) کر سکتا ہے۔

پورا نام عبدالمجید، عادل تخلص۔ یہ سنہ ۱۹۲۲ء میں موضع نصیر الدین پور ضلع غازی پور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے انقلاب آفریں دور میں جب کہ دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی اور ملک کے گوشے گوشے میں ہندوستانی عوام نے اپنی سرزمین وطن کی آزادی کے سلسلے میں انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا، انہوں نے فرسٹ ڈویژن سے مڈل پاس کیا اور ملٹری سروس میں آ گئے۔ اس سلسلے میں موصوف کو سنگاپور، برما، ملتان وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا نیز متعدد مقامات کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ مسلسل تگ و دو نے انہیں مختلف النوع تجربات سے دوچار کرایا۔ سفر بذات خود ایک دعوت مطالعہ ہے

ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی قابل رشک ہے۔

حیات و کائنات کے متعلق ان کے سوچنے کا انداز منفی نہیں بلکہ مثبت اقدار پر مبنی ہے۔ قول و فعل میں تضاد کے سخت مخالف ہیں۔ خاموش رہتے ہیں تو چہرے کا نفسیاتی اور جذباتی اتار چڑھاؤ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ عسکریانہ آب و ہوا میں ایک مدت تک رہنے سہنے سے چال ڈھال میں ایک پیشاوری کے انداز و آہنگ کی ہلکی جھلکیاں بغور دیکھنے سے مترشح نظر آئیں گی۔ اپنی ازدواجی زندگی کی کامیابیوں پر مطمئن ہیں۔ خیر سے آدھ درجن بچوں پر پدرانہ شفقت کی کرنیں بکھیرتے ہیں۔ زندگی کی ہر راہ میں اعتدال و توازن کو ہاتھ سے جانے دینا کفر سمجھتے ہیں۔ اس اصول پر سختی سے عمل پیرا بھی ہیں۔ حالات کی تلخی کو مسکراتے ہوئے گھول کر پی جانے کا گر کوئی ان سے سیکھے۔

کلاسیکی شعراء میں میرؔ اور غالبؔ سے پہلے بہت متاثر تھے۔ بعد میں حالیؔ اور اقبالؔ کا بھی اثر قبول کیا۔ کسی کے سوز و گداز نے " شام طرب افزائے خیال " کی لذت بخشی کسی کے " تہذیب جنوں " اور " تخلیق ہنر " کے موسم نے انہیں اپنے دامانِ فکر و نگاہ میں نزہت و نکہت اور نغمہ و رنگ و بو کی ایک دنیا سمیٹ لینے کی تلقین کی۔ کسی نے " کچھ انداز حدیث دیگراں " کہنے کا گر سکھایا تو کسی نے " معجزہ فن کی نمود " کے لئے " خون جگر " کی آمیزش کو شرط اولیں ٹھہرا کر ان کے ذہن بالیدہ و افکار ژولیدہ کے لئے شاعری کی نئی راہیں کھول دیں۔ آج عادلؔ صاحب ادب کی ان جاودان قدروں سے صحیح طور سے واقف ہو چکے ہیں اور اس کا بین ثبوت وہ اپنی مترنم غزلوں میں اکثر و بیشتر دیتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عادلؔ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مشاعروں میں طرحی غزلوں کے سلسلے سے کیا۔ اور خصوصی نشستوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت سے ابتک جاری ہے۔ اس ضمن میں ایک خصوصی فی البدیہہ شعری نشست کا ذکر کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ یہ نشست جناب ثروتی پانی پتی کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی۔

مجھے یقین ہے کہ دیگر احباب نے بھی اس زمین میں اچھے اشعار کہے ہوں گے۔ عادلؔ نے بھی اپنی موزونیت طبع کا واضح ثبوت یہ شعر کہہ کر دیا : ۔

نہ کوئی کام کیا کام کا زمانے میں
ہنسی مذاق تو لوگوں سے بے حساب کیا

بات میں بات نکل آئی ہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ " دیکھئے یہ آپ ہیں، یہ آپ کی تصویر ہے " کے مصداق عادلؔ صاحب کو ان کے کلام کے آئینہ میں دیکھیں تاکہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کے وہ گوشے جو مندرجہ بالا سطور میں تشنہ اظہار رہ گئے ہیں، مجسم شعر کی صورت میں سامنے آ جائیں۔

رسوا نہ کر خدا کے لئے چھوڑ دے مجھے
ایسی خطا نہیں ہے کہ بیجا کہیں جسے

مت چھیڑ ذرا ٹھہر ابھی گردش دوراں
گزرے ہوئے لمحوں کی جھلک دیکھ رہا ہوں

اظہارِ خیالات کا وقت آنے دے عادلؔ
دنیا کو بتا دوں گا کہ میں کون ہوں کیا ہوں

موج نسیم صبح بہاراں ذرا بتا

اور جب سینے میں ایک حساس دل بھی ہو تو اس کی اہمیت اضافہ دیتی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کش مکش حیات نے ان کے افکار و خیالات پر بھرپور یلغار کی اور ان کا درد مند دل تڑپ اٹھا۔ جنگ اپنی تمام تر ہولناکیوں اور تلخیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھی پھر عادل جیسا حساس انسان ذہنی ردعمل کی ان جملہ کیفیات سے بے نیاز کیسے رہ سکتا تھا جن کا اثر زندگی کی محرکات و حسیات پر پڑنا ایک ناگزیر امر تھا اور جس نے آگے چل کر ہر شعبۂ حیات پر ایک بھرپور اور گہرا اثر ڈالا۔

وقت کی مصلحت بینی بھی بڑی چیز ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ عادل صاحب نے اس سے کس حد تک فائدہ اٹھایا مگر اتنا کہنے میں مجھے باک نہیں ہے کہ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات سے گریز پائی اختیار کرنا خلاف شان سمجھا اور فراق کی طرح کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں کو اپنا شعار بنا لیا۔

وقت بہت بڑا معلم ہے۔ یہ ایک پرانا مقولہ ہے عادل صاحب کی مشق سخن کم و بیش پندرہ برسوں کے طویل عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ مسکیدہ کی روزانہ کی نشست اور احباب کے پرخلوص مشوروں نے ان کی فکر و نظر کو حد درجہ جلا بخشی۔ آئے دن کے مشاعروں اور خصوصی نشستوں میں یہ ایک مدت سے شریک ہوتے رہے ہیں۔ مشاعروں میں غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں اور محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں [illegible] کے ساتھ ایک شان بے نیازی سے سناتے جاتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز دیدنی ہوتا ہے بس جی چاہتا ہے کہ یہ پڑھتے رہیں اور کان شیرینیٔ گفتار و بیان کا مزہ اٹھاتے رہیں۔ آواز بڑی میٹھی پائی ہے جو خصوصاً غزل کے انتخاب کے لئے حد درجہ موزوں اور مناسب ہے۔ شعر پڑھنے کے روایتی تکلفات سے زیادہ کا بھی واسطہ نہیں رکھتے ہیں۔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار اپنی زبان میں موثر طور پر کرتے ہیں۔

عادل جہاں خوب کہتے ہیں وہیں ایک باوقار اور سلیقہ مند انسان ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران "حدیث لب و رخسار" کے ساتھ ساتھ "خونچکاں" اور "سلاسل و زنداں" جیسے آتشیں موضوعات پر بھی تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کی سماجی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا ایک نفسیاتی جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہونچا کہ ظاہر و باطن کی اس حیرت انگیز طور پر یکسانیت اور ہم آہنگی ان کے لئے قدرت کا ایک بہترین عطیہ ہے۔ میں اس نہج پر پہونچنے پر مجبور تھا کیونکہ میرے سامنے حقیقت اظہر من الشمس تھی عادل صاحب اس معاملے میں واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔

مزاج کے اعتبار سے یہ انتہائی نیک واقع ہوئے ہیں۔ طبیعت میں رومانیت کا عنصر مدھم مگر تیکھا ہے۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملنا ان کی فطرت کا ایک نمایاں وصف ہے بزم یاراں میں ان کے بیٹھنے کا انداز نرالا ہوتا ہے۔ یو پی کے ہو کر بھی پنجاب کے سرداروں سے پیچھے نظر نہیں آتے احباب پر انہیں مکمل اعتماد ہے۔ کسی ادبی مجلس میں چپقلش نہیں ہوتی۔ مگر مسکیدہ کے آداب و رسوم ہی کچھ اور ہیں۔ عادل صاحب ہنستے بھی ہیں اور ہنساتے بھی ہیں۔ چونکہ یہ ایک سلجھے ہوئے اور تجربہ کار انسان ہیں۔ اس لئے تلخ سے تلخ تر حقیقتوں کے نشتر کو مرہم زخم جگر سمجھ کر اپنے سینے میں جگہ دے دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑوں کے حوصلے گریز پائی پر آمادہ نظر آنے لگتے ہیں مگر عادل صاحب بخوف کسے یہ کہتے ہوئے نکل جاتے ہیں کہ :-

درد ہی درد رگوں میں جسم ہے سارا چھلنی
درد بیچارہ پریشاں ہے کہاں سے اٹھے

باقی صفحہ ۳۸۹ پر

عادل غازیپوری

ایک رجائی شاعر

از :- سید قسیم الحق گیاوی

جدید شاعری میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہیں یہ بھی بہت بڑی "خوبی" ہے کہ وہ یاسیت کی علمبردار ہے۔ غزل گوئی اور رجائیت دونوں سے دامن بچانا جدید شعراء اپنا فرض اولیں سمجھتے ہیں غزل گویوں میں فانی جیسے شعراء گذرے ہیں مگر عام طور پر غزل گو شعراء نے غم اور نشاط غم کو موضوع بنایا اور غم کو زندگی کا جزو لاینفک سمجھ کر غم عالم کو بھی یاس و ناامیدی کا سرچشمہ بننے نہیں دیا۔

مگر آج کا جدید شاعر خود کو زندہ لاش سمجھتا ہے مایوس کن تنہائی محسوس کرتا ہے۔ ماحول سے بیزار نظر آتا ہے اور دنیا کی ہر چیز سے رشتہ امید منقطع کر کے دنیا کو ماتم خانہ بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ رفتار زمانہ دن بدن پُرخطر، اور انسان کی زندگی روز بروز دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔ مگر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جدید شعراء یاسیت کے مبلغ بن کر آخر کون سا فرض انجام دینا چاہتے ہیں کیا یاس و ناامیدی انسان کی زندگی کو اور زیادہ بے کیف نہ بنا دے گی کیا یہ احساس تنہائی بھری محفلوں کو اجاڑ نہ دے گی؟

ہمیں خوشی ہے کہ محترم عادل غازیپوری یاس و ناامیدی کے مبلغ نہیں ہیں۔ جدید شعراء سے ان کا دامن الگ ہے وہ روایات اور فن کا احترام ضروری سمجھتے ہیں اور ان کی شاعری ملی جلی ... اور رجائیت کی علمبردار ہے ؎

امید کی پھوٹے گی کرن ہوگا سویرا
تا دیر یہ رنگ شب ہجراں نہ رہے گا

حقائق سے آنکھیں بند کر لینا بھی خود فریبی ہے مگر مشکلات سے ڈر کر یاس و ناامیدی کے غاروں میں کود جانا کہاں کی عقل مندی ہے؟ ؎

یہ دیوانے کسی مشکل کو کب مشکل سمجھتے ہیں
ہر اک مشکل کو اپنی زیست کا حاصل سمجھتے ہیں

ہر رات صبح کا پیغام لاتی ہے اور ہر اندھیرا اجالے کا پیش خیمہ ہوتا ہے عادل صاحب اس حقیقت کے قائل ہیں اور دیکھئے وہ اس کا اظہار کیسے حسین انداز میں کرتے ہیں ؎

ہر خواب شب غم کی تعبیر یہی ہوگی
چمکے گا نیا سورج اک صبح نئی ہوگی

عادل صاحب بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی شاعری ... پہلی خوشگوار کرن کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور صبح بھی ایسی کہ کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے بھی نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی رجائیت ... سے امید رکھنا چاہئے کہ ہم

کوششوں سے ان کی شاعری ایک نہ ایک دن چمکے گی۔ وصوف ضرور بنے گی جو زبان و بیان کی ادبی محفلوں میں لوگوں کیلئے باعث چیدنی ہے گی۔ ذرا عادل صاحب کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے

اشک آنکھوں سے جب کبھی چھلکا
بارِ غم ہوگیا ہے کچھ ہلکا

عادل نگاہ لطف نے سب کچھ بھلادیا
کیا کیا تھے عزم ورنہ دل بے قرار کے
آئے بھی اور چلے بھی گئے دن بہار کے
ارماں نکل سکے نہ دل بے قرار کے
دل بھی چاک ہے چاک جگر بھی ہے چاک چاک
کیا کہنے آپ خنجر ابروئے یار کے

مت چھیڑ ابھی ٹھہر ذرا گردش دوراں
گزرے ہوئے لمحوں کی جھلک دیکھ رہا ہوں

عشق کا آغاز اچھا ہے حسیں بھی ہے مگر
ہوگا کیا انجام اے دل یہ کبھی سوچا بھی ہے

گل کے لب پہ تبسم ہے پھول ہنستے ہیں
بہار اپنے چمن میں ہنسی خوشی آئی

ان اشعار کو سامنے رکھ کر عادل صاحب کے روشن مستقبل کی باآسانی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ عزم جوان کے ساتھ جادۂ منزل پر رواں دواں رہے اور راہبر کی منزل کی ہر ہر ادا کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔

بقیہ عادل غازی پوری

کیا بات ہے گلوں کے لبوں پر ہنسی نہیں

میرے صبر و ضبط پر الزام کیوں دیتے ہیں آپ
اشک آنکھوں میں مری کیئے کبھی دیکھا بھی ہے

اس تعارفی خاکہ میں مزید طوالت کی گنجائش نہیں اور پھر عادل صاحب کے کلام پر تنقید و تبصرہ میرا موضوع نہیں غالب کی طرح ان کے لئے بھی شاعری "کچھ ذریعۂ عزت" نہیں۔ بلکہ یہ ان کے جمالیاتی ذوق اور وجدانی احساسات کی تسکین و اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر یہی انہماک کے ساتھ شانۂ فکر و نظر سے گیسوئے شعر و سخن سنوارتے رہے تو مستقبل قریب میں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

شعور کی شاعری

از:- سید قسیم الحق گیاوی

جناب مولوی سید اسحاق نبی شعور بھاگلپوری کے دو مجموعے میری نظر سے گذرے ایک مجموعہ "کلام شعور" کے نام سے اردو رسم الخط میں ہے اور ایک مجموعہ "یہ کیا ہو رہا ہے" کے عنوان سے ہندی رسم الخط میں چھاپا گیا ہے۔ دونوں مجموعے ان کے عقیدت مند دوستوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ سفید کاغذ پر شائع کئے ہیں۔ ان مجموعوں کو دیکھکر سب سے پہلا تاثر شعور کی شخصیت کے سلسلہ میں ابھرتا ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ شعور صاحب اپنے حلقہ میں بہت ہی باثر اور مقبول و محبوب ہیں اور کسی بھی شاعر کے لئے یہ چیز بہرحال باعث فخر ہوتی ہے۔

شعور صاحب کی دینی و مذہبی شاعری ایک مستقل موضوع بحث ہے اور اس پہلو کو سامنے رکھکر ہم انہیں "شاعر اسلام" کہہ سکتے ہیں۔

شعور صاحب نے نعتیں بھی خوب کہی ہیں اور نذر عقیدت۔ "وصف علی"، "مسجد کی پکار"، "انداز بندگی"، "شان اسلام" اور "گل جنان" جیسی نظمیں بھی ان کے دینی شعور و مذہبی تڑپ کو عیاں کرتی ہے۔ نعتوں کے چند اشعار رسول سے عقیدت میں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی اشعار حاصل کلام شعور ہیں ؎

میں رب کا پجاری ہوں شیدا ہوں محمدؐ کا
اسلام پہ مرنا ہے اسلام پہ جینا ہے

ظلمت نہ کبھی غالب آئی ہے نہ آئے گی
جب نور محمدؐ سے روشن مرا سینہ ہے

اے خدا کے چہیتے رسول زمن کیوں نہ دنیا مری اب سنور جائے گی
دل ہے عاشق بریں تم ہو جلوہ فگن بزم سے شمع آخر کدھر جائیگی

خدا کے محبوب کملی والے کوئی بھی تم سا ہوا نہیں ہے
زمیں کے تاروں میں چاند ہو تم کسی میں ایسی ضیا نہیں ہے

شعور صاحب بنیادی طور پر شاعر اسلام ضرور ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے دوسرے موضوعات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شعور صاحب نے مختلف عنوانات پر متعدد نظمیں بھی کہی ہیں اور ان نظموں سے ان کا خاص انداز بیان واضح ہوتا ہے" اردو ہندی سنگم"، "آہ اقبال"، "ٹوٹا ستارہ"، "اہل چمن سے خطاب"، "کل اور آج"، "آج اور کل"، "نہیں معلوم"، "ساقی"، "بہاروں سے پوچھو"، "نوجوانوں سے خطاب"، "کمیونسٹ سے خطاب"، "ستارہ نو"، "دیوالی"، "یہ کیا ہو رہا ہے"، "جواہر لال نہرو" وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو پڑھکر ہی شعور صاحب کے فکر و فن کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شعور صاحب بڑے ہی صاف دل اور صاف گو شاعر ہیں وہ اپنی شاعری میں تکلف اور رکھ رکھاؤ کے قائل نظر نہیں آتے۔ بلکہ اپنے مشاہدات و تاثرات اور محسوسات کو نہایت بے تکلفی، سادگی، صفائی اور معصومیت کے ساتھ ظاہر کرتے

میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ قدیم روایات کے بزرگ یا اشارات وکنایات کے دلدادہ اہل فن شعرا ان کی شاعری سے مطمئن نہ ہوسکیں مگر جہاں تک مشاہدات کے بیان میں صفائی اور زبان و بیان کی بے تکلفی کا تعلق ہے شعور صاحب اپنا ایک خاص رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ اور اسی خصوصیت نے انہیں اردو ہندی کے ایک خاص الخاص حلقہ میں مقبول و محبوب بنا رکھا ہے۔

شعور صاحب غزل گو بھی ہیں اور ان کی غزلوں کی تعداد نظموں سے کم نہیں مگر غزلوں میں بھی وہ جہاں گل و بلبل اور محض ظاہری حسن و عشق سے بیزار نظر آتے ہیں وہیں اشارات وکنایات اور تکلف و تصنع کو بھی جگہ دینے کے روادار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کا شمار جدید غزل گو شعراء میں بھی بآسانی کرسکتے ہیں۔ وہ غزل میں محض قدامت، تقلید اور روایت کے قائل نہیں بلکہ انہوں نے غزل کے دائرہ کو وسیع تر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ہم ان کی اس کوشش کو جرأت رندانہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

شعور صاحب کے خیالات بڑے پختہ ہیں وہ وطن میں اپنی حیثیت و ضرورت اور وطن کی محبت کے سلسلہ میں صحیح احساس و شعور رکھتے ہیں، وہ جہاں خود کو سکون چمن و قرار چمن بجا طور پر سمجھتے ہیں وہیں سخت سے سخت حالت میں بھی فراق وطن کا خیال بھی دل میں لانا نہیں چاہتے بلکہ جینا چاہتے ہیں تو وطن میں اور مرنا بھی چاہتے ہیں تو وطن ہی کی آغوش میں ؎

ہم سکون چمن ہم قرار چمن ہم سے آئی چمن میں بہار چمن
ہم مریں یا جئیں اس کی آغوش میں اب سے چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے

شعور صاحب حالات زمانہ کے تغیر و تبدیلی سے نہیں گھبراتے۔ وہ مایوسی اور ناامیدی کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے وہ بڑے ہی جانی واقع ہوئے ہیں، اور ہمیشہ ان کے دل میں شمع امید روشن رہتی ہے۔ ؎

کس کی حالت زمانہ میں یکساں رہی، دن گیا اور چپکے سے رات آگئی
آج کانٹے ہیں دامان امید میں دیکھنا کل وہ پھولوں سے بھر جائیں گے

زندگی تو ہر شخص کو ملتی ہے۔ مگر زندگی مزے لے لے کر گذارنا کوئی شعور سے سیکھے۔ شعور صاحب تماشائے حیات سے بڑے مطمئن نظر آتے ہیں اور اپنی زندگی پر نازاں بھی ہیں ؎

لے اجل دیکھ ذرا آکے تماشائے حیات
کس قدر مجھ سے یہ مانوس ہے گرویدہ ہے

آج کی دنیا جس انتشار و اضطراب میں مبتلا ہے زندگی کے اطوار جس طرح بدل رہے ہیں اور اہل ہوس جس طرح دنیا کو درہم و برہم کرتے چلے جا رہے ہیں اس کا احساس بھی شعور صاحب شدت سے رکھتے ہیں ؎

دست گلچیں نے تو کانٹوں میں بھی رہنے نہ دیا
آج بلبل ہے کہیں پھول کہیں باغ کہیں

آج غفلت و جمود کی جو فضا ہے اس کی تصویر کشی شعور صاحب نے بڑے اچھے انداز میں کی ہے ؎

غفلت کی نیند میں تھے جو جاگے تو ہم نے دیکھا
در پر کھڑی قضا ہے لے کر پیام ہستی

شعور صاحب کی زبان سے حسن و عشق کا دلچسپ مکالمہ بھی سنئے!

حسن کہتا ہے کہ اے عشق میں تابندہ ہوں
عشق کہتا ہے کہ اے حسن میں پائندہ ہوں
حسن کہتا ہے کہ ہیں دونوں جہاں میرے لئے
عشق کہتا ہے کہ میں تیرے لئے زندہ ہوں

حقیقت یہ ہے کہ ان چند اشعار سے شعور صاحب کی شاعری کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ نظر حضرات کو بصد خلوص دعوت دیتا ہوں کہ ... شعور صاحب کے مجموعوں کا

باقی صفحہ ۳۹۴ پر

شعور بھاگلپوری کی شخصیت

ڈاکٹر غیاث اثر

میانہ قد، مناسب اعضاء، نہ زیادہ وجیہ و شکیم اور نہ ایسے کہ کوئی دبلا پتلا کہے۔ چہرے پر خشخشی داڑھی بشرے سے رعب و دبدبہ کی جلوہ گری یہ ہیں جناب شعور بھاگلپوری۔ دیدہ وروں کا طبقہ انہیں شاعر اسلام کہتا ہے اور غلام سرور شاعر انقلاب کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ شعور صاحب کا نام سید اسحٰق نبی ہے۔ آپ کے جد امجد جناب علی نقی مرحوم سہسرام ضلع شاہ آباد سے بھاگلپور تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کا شجرہ یوں اور نسب یہ ہے۔ سید اسحٰق نبی شعور بن حضرت سید اعجاز نبی بن سید شاہ علی نقی بن سید شاہ حکیم تفضل حسین بن سید وارث علی دیوان بن حضرت سید شاہ بڈھن دیوان رحمۃ اللہ علیہ

شعور صاحب سے میری ملاقات جہاں تک مجھے یاد ہے ۵۳ء میں ہوئی اس وقت جناب حکیم سید نقی حیدر صاحب کا بھی مطب تاتار پور مارکیٹ میں تھا جو آج کل شاید مشرقی پاکستان میں کہیں ہیں۔ شعور صاحب کی باوضع شخصیت سے ملتے ہی بہت متاثر ہوا اور جب یہ معلوم ہوا کہ آپ شاعر بھی ہیں تو اور خوشی ہوئی کلام سنکر حیرت استعجاب اور ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا کرشمہ کس کس رنگ میں جلوہ گر ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے

شعور صاحب فطری شاعر ہیں اور ایک ایسا چمن جس کو قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے۔ گو شاعری مدت دراز سے کرتے ہیں مگر ان کی شاعری کا رنگ اس وقت نکھرا جب موصوف کی دوسری اہلیہ جن کو یہ بہت زیادہ چاہتے تھے داغ مفارقت دے گئیں۔ اہلیہ کے انتقال کا صدمہ ایسا گہرا ہوا کہ شعور کے درد مند دل کا سوز و ساز شنیدنی ہو گیا۔ سوز و گداز کی جو لہر ان کی شاعری میں ہے اسی انقلابات زمانہ اور غم جاناں دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔

غلام سرور کے فکر کا جو معیار ہے اس پر شعور کی شاعری واقعی پوری اترتی ہے کہ سرور نے انہیں شاعر انقلاب کا لقب دیدیا جس کے بجا طور پر یہ مستحق ہیں۔ شعور غریبوں مزدوروں اور بے نواؤں کی پاسداری بھی کرتے ہیں اور پرانے جاگیردارانہ نظام کی گرتی ہوئی دیواروں کا ماتم بھی کرتے ہیں خصوصاً ان کی نظم "ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے" کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے۔ انہیں جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

وطن دوستی اور ملت نوازی دونوں قسم کے جذبات سے بھرپور شاعری شعور کا خاصہ ہے۔ حمد و نعت بھی ایسی کہتے ہیں کہ عوام کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی بھیڑ جھوم جھوم جاتی ہے اسی لئے دینداری کے خاص گروہ نے انہیں شاعر اسلام کا خطاب دیا ہے۔ شعور صاحب صرف اردو داں حلقے ہی میں مشہور نہیں ہیں بلکہ ہندی داں طبقہ بھی دل و جان سے آپکو چاہتا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر بچن تو آپ کے عاشق زار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو داں عوام نے جہاں ان کے اردو مجموعہ کلام "کلام شعور" کو ہاتھوں ہاتھو لیا وہیں ہندی والوں نے شعور کی ہندی کتاب "یہ کیا ہو رہا ہے" کو اتنا پسند کیا کہ ساری جلدیں چند دنوں میں فروخت ہو گئیں۔ عوام میں شعور جس قدر مشہور ہیں شاید کوئی دوسرا شاعر اس شہر کا شعور صاحب کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ مخصوص علمی نشستوں میں اپنا رنگ جما لیں مگر عوامی مقبولیت وہ نعمت ہے جو صرف شعور صاحب کے حصہ میں آئی ہے۔ عوام سے جو خراج تحسین یہ وصول کرتے ہیں اس پر نہ جانے کتنے شاعر حسد کی آگ میں جل جاتے ہوں گے۔ بھاگلپور اور اس کے مضافات کے علاوہ شعور صوبہ بہار کے تقریباً ہر بڑے شہر کے مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ آپ کو آل انڈیا ریڈیو سے بھی پروگرام ملا ہے۔ اس قدر مختلف النوع موضوعات پر یہ بے دھڑک نظمیں کہتے ہیں کہ یہ متعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ شعور صاحب کا خاص رجحان کیا ہے مگر یہ صاف ہے کہ عوامی سطح پر یہ شاعر اسلام اور شاعر انقلاب دونوں القاب کے مستحق ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی اس قدر دل ربا یانہ ہے کہ عوام مسحور ہو جاتے ہیں۔ شعور بھاگلپوری کی یہ ایک ایسی جیتی جاگتی ہستی کا نام ہے جو ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی۔ آپ کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے جو آپ سے اکتساب فن کرتے رہتے ہیں۔ شعور صاحب سچ مچ اس معاملہ میں قابل تحسین ہیں کہ آپ ہمہ دم بزم عیز میں شمع اردو کی لو تیز تر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

بقیہ شعور بھاگلپوری

مطالعو فرمائیں ان کے مجموعے ہی ان کی شاعری کا صحیح مقام متعین کرتے ہیں۔

ہاں معمولی طور پر ہم شعور صاحب کو ایک ہمہ گیر قسم کا شاعر تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور ہماری نظر میں ان کی زبان و بیان سے زیادہ ان کے خیالات اور ان کی صفائی سادگی اور بے تکلفی قابل داد ہے۔

خامیوں سے انسان کب خالی ہے کسی میں خامیاں زیادہ ہوتی ہیں خوبیاں کم اور کسی میں خامیوں سے بہت زیادہ خوبیاں ہوتی ہیں ہم تو شعور صاحب کی خوبیوں کے مداح ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ان کے کلام، ان کی زبان، ان کی فنی گرفت اور ان کے بیان کی خوبیاں بڑھتی رہیں گی۔ اور متمنی ہیں کہ وہ دن بھی آئے کہ ان کے کلام میں خوبیاں غالب تر ہو جائیں۔ آمین!

سید محمد یونس احمر

تصدیق اشہر

سید محمد یونس کا سلسلۂ نسب حضرت سید شاہ اولیا اللہ سے ملتا ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ایک فوجی کمانڈر تھے۔ شہنشاہ کے ہمراہ جب ایک مرتبہ بہار کے دورہ پر آئے تو موضع صندل پور ضلع مونگیر میں شہنشاہ کا قیام ہوا۔ اس قیام کے دوران ایک طوفانی رات میں حضرت سید شاہ اولیا اللہ کے کرامات کا ظہور ہوا جس سے شہنشاہ بہت متاثر ہوئے اور عقیدت مند بن گئے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے اچھا نہ سمجھا کہ ایک ولی کامل کو اپنی ملازمت میں رکھے اس لئے ایک جاگیر عنایت کرکے ملازمت سے حضرت شاہ اولیا رح کو علٰحدہ کر دیا۔ یہ بزرگ اپنے عہد کے ولی کامل تھے آپ کا مزار آج بھی صندل پور میں مرجع خاص وعام ہے۔

شاہی جاگیر آج تک یونس صاحب کے خاندان میں بدستور قائم ہے۔

خاندان کی وسعت کے بعد سید محمد یونس کے آباؤ اجداد صندل پور سے ضلع بھاگلپور کے ایک گاؤں میں منتقل ہو گئے جس کا نام سید پور بخش رکھا اور کافی جائداد وغیرہ حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد نزدیک کے ایک دوسرے گاؤں کلاکند ٹھانہ گوماپور میں وہ لوگ سکونت پذیر ہو گئے مگر دریائے گنگ کے سیلاب کی تباہ کاری کی وجہ سے آپ کے والد میر علاء الدین صاحب محلہ برہ پورہ بھاگلپور میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل آکر سکونت اختیار کر لی۔

اسی محلہ برہ پورہ میں یونس احمر کی ۱۹۳۱ء میں پیدائش ہوئی۔ احمر نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ برہ پورہ میں حاصل کرنے کے بعد بھاگلپور ضلع اسکول میں داخلہ لیا جہاں سے مسلم ہائی اسکول بھاگلپور میں چلے گئے اور اسی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ٹی این بی کالج بھاگلپور سے ۱۹۵۱ء میں بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایم اے ایل ایل بی کرنے کی غرض سے داخلہ لیا مگر وہاں کی آب و ہوا راس نہ آسکی۔ بہت جلد وطن واپس آگئے اور بہار یونیورسٹی سے بی ایل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں بھاگلپور میں وکالت کرنے لگے۔ وکالت کا پیشہ اور شاعری دو متضاد سمتیں ہیں جن کا سرا ایک دوسرے سے نہیں ملتا مگر ادبی دنیا میں لیاقت آدمی مقام حاصل کر سکا تو وکالت میں ناکام ثابت ہو

اور اگر وکالت میں کامیاب رہا تو پھر وہ ایک ایسا گورکھ دھندا ہے کہ جس میں پھنس کر انسان کسی دوسری دنیا میں جا نکلنے کی ہزار خواہش کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یونس احمر کی شخصیت اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ آپ ایک کامیاب ایڈوکیٹ بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی۔ شاعری سے آپ کا لگاؤ طالب علمی کے زمانہ سے ہے۔ پورنیہ کے کہنہ مشق شعراء ڈاکٹر عبدالحی عارف مرحوم اور ابوالقاسم شیدا مرحوم وغیرہ کی صحبت کے فیض نے آپ کے فن کو مجلی کر دیا۔ اقبال کا رنگ بہت کچھ احمر کے فن میں غالب ہے۔ کالج کی زندگی میں بزم اردو کے یہ سکریٹری بھی رہ چکے ہیں اور شاعری کی حیثیت سے پیش پیش بھی رہتے تھے۔ ان کے زمانے کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد صاحب انہیں بڑی محبت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ بزم ادب پورنیہ کے مدت تک سکریٹری رہے ہیں اور آج بھی اس کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ آپ نہایت متین سنجیدہ وکیل ہوتے ہوئے بھی کم سخن انسان ہیں۔ یہ ممکن ہے ناواقف انسان انہیں مغرور سمجھنے لگیں مگر حقیقت یہ ہے کہ صرف دو جگہ گل افشانی کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں یا کسی بزم ادب کے جلسہ میں یا کسی حاکم کے اجلاس میں۔

بقیہ یونس احمر

کسے معلوم یہ زمانہ تو بس اسی کا ہے جو خود آگے بڑھ کر یہ کہے کہ مجھے تسلیم کرو۔

مجھے احمر کے روپ میں ایک ایسا شاعر نظر آیا جو اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ایک پیکر جمیل ہے۔ احمر کے مندرجہ ذیل اشعار مجھے بہت پسند آئے۔ امید کرتا ہوں قارئین بھی ضرور داد دیں گے ؎

اتنی مہلت مجھے خدا کیلئے لب کھلے عرض مدعا کے لئے

ہر لمحہ یہ ہراس کہ نبض جہاں چھٹی یہ روح علم و فن ہے ہلاکت لئے ہوئے

اے اہل خرد چھیڑ نہ تو اہل جنوں کو ان صحرا نشینوں کے ہی قدموں میں چمن ہے

کس کا جذبۂ ایثار شاد کام نہیں ترے جہاں میں وفاؤں کا احترام نہیں

محفل زیست ہے خود ستی نغمۂ درد بھی خموش دہر میں کوئی سر فروش مجھ سا تو اب کہیں نہیں

باغ ہستی کا ہر اک پھول لبھا لیتا ہے اپنی مرضی سے یہاں آکے سفر کون کرے

وقت کے چھوٹے آئینے میں دہر کو شاداں دیکھ رہے ہیں۔

یونس احمر

شمیم اختر

شراب اعلیٰ بھی ہوتی ہے اور ادنیٰ بھی۔ نہ ملے یہ اور بات ہے ورنہ ہر بادہ کش اعلیٰ شراب کا طالب رہتا ہے بہترین شراب چلو سے بھی پی جا سکتی ہے اور اوک سے بھی مگر جام بلوریں کی بات کچھ اور ہے اچھے قسم کی شراب حسین و جمیل جام میں انڈیل کر ساقی جب رندوں کو پیش کرتا ہے تو زاہد خشک بھی اگر اس منظر کو دیکھ سکے تو بے ساختہ رندوں کی صف میں آ بیٹھے۔ یہی حال شاعری کا ہے۔ معمولی سے معمولی بات کو حسین انداز بیان میں ادا کر دینے کا نام شاعری ہے مگر معمولی بات اور حسین انداز بیان معمولی شراب در جام بلوریں والی بات ہوگی۔ اسی طرح حسین سے حسین تخلیق کو بھونڈے انداز میں ادا کرنا ویسا ہی ہوگا جیسے کہ بہترین شراب کو جام سفال میں انڈیلا جائے۔

نظم ہو یا نثر جب فن کی بات آتی ہے تو ہیئت و معنی کی بحث چھیڑنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح میکشی کا ذکر آتے ہی مے و جام کا تصور۔ کسی فن پارہ کو تنقیدی شعور کے معیار پر جانچنے کا مقصد کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اس فن پارہ میں جس تخیل کو پیش کیا گیا ہے وہ کیسی ہے اور کس انداز میں پیش کی گئی ہے لفظوں کا انتخاب ربط تسلسل موقع کے اعتبار سے برمحل لفظوں کا استعمال یہ سب چیزیں ہیں جن کو پرکھا جاتا ہے۔ الفاظ ترسیل و تفہیم کا ذریعہ ہیں فنکار کے ذہن میں جو خیال ابھرتا ہے اسے لفظوں کے سہارے دوسروں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ ہر لفظ کا اپنا ایک وجود ہے۔ لفظوں کی دنیا میں بھی حیات موت کا عمل جاری ہے ان کی بھی اپنی ذات برادری ہے کچھ کھوٹے سکے ہیں اور کچھ رائج الوقت۔ اب ذہین فنکار کا حسن انتخاب ہے کہ وہ کھوٹے سکوں کو اٹھائے یا چلتے ہوؤں کو۔ تند و جاوید لفظوں کے رنگ و روغن سے اپنے کینوس میں رنگ بھرے یا سرد خانہ میں پڑے ہوئے لفظوں کو ہی نئی حیات عطا کرنے میں اپنی زندگی گذار دے۔ اسی طرح پیالے میں جو ہوگا وہی ٹپکے گا۔ یعنی فنکار کی ذہنی تربیت جس ماحول اور حالات و ظروف میں ہوگی اس کے خیالات اور احساسات میں اس کی جلوہ گری لازمی ہے۔ میرو سودا، غالب، مومن، داغ، اقبال، اصغر، فانی، حسرت، جگر، فراق، جمیل، فیض، سردار کا فن اس لئے اعلیٰ اور ارفع تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہیئت و معنی کی کسوٹی پر یہ فنکار کھرے اترتے ہیں اور اپنے اپنے عہد کے نمائندہ ہیں نئے نئے گوشے نکال کر یہ فنکار اپنے وجود کا ثبوت بہم

کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا آیا ہے جس میں طبائع کا
اختلاف بھی معاون ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر فنکار
کا لب و لہجہ الگ الگ ہے۔ الگ لب و لہجہ کے
باوجود کے کوئی آواز ایسی بھی ہوتی ہے جس کی دلکشی و رعنائی
سے پوری نسل متاثر ہو جاتی ہے اور یہ جادو سب
کے سر پر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ اقبال کا نغمہ حیات
آفریں وہ فسوں ساز نغمہ ہے جس سے اس عہد کا کوئی
فنکار آسانی سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔

یونس احمر کی ذہنی تربیت عہد اقبال کی فضا
میں ہوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اقبال سے
متاثر ہو گئے۔ اگر احمر کے اشعار میں اقبال کا جادو
بولتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو حیرت کی بات نہیں۔ یہ
کوئی عیب بھی نہیں۔ اصلاح کی سمت پرواز کرنے والی
طبیعتیں صالح تخیل کا اثر لیں گی ہی۔ خوبی کی بات یہ ہے
کہ اقبال کے فکر سے متاثر ہونے کے باوجود احمر کا لب و
لہجہ اپنا ہے۔ شراب شاعری میں سرگرداں رہنا اس
امر کا ثبوت ہے کہ فنکار کی تشنگی عروج پر ہے۔ احمر کا
مختصر نمونہ کلام دیکھ کر خود میری تشنگی بڑھ گئی۔ داد تحسین
کا اگر کوئی مفید پہلو ہوتا تو میں صرف واہ واہ کر کے
الگ ہو جاتا۔ فنکار کے فن کو حقیقت کی عینک سے
دیکھنا اور اس کی خوبیوں کو اس طرح اجاگر کرنا کہ اس
کا حق ادا ہو جائے انصاف کی بات ہو گی۔

فلسفۂ خودی کی شراب تند نے احمر کے دل و دماغ
پر جو دائمی اثر مرتب کیا ہے اس سے شاعر شاد کام ہے
حقیقت یہ ہے کہ خودی کی رمز تک پہنچ جانے والے
کا دل مومن کا دل ہوتا ہے۔ اس دولت بے بہا کو
پا لینے سے احمر خوش ہیں اور خدا کا شکر بھی ادا
کرتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے احمر کلام میں تیرے
نکھر رہا ہے ابھی تک خودی کا رنگ

حسن ازل کی تلاش میں نہ جانے کتنے شعرا سرگرداں ہو
ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسی خیال کو بار بار لائے ہیں
مگر احمر کا اچھوتا انداز اپنے اندر سب سے اچھوتا اور
جداگانہ لطافت رکھتا ہے

نہ دیر میں نہ حرم میں نہ میکدے میں ملا
تمام ڈھونڈھ رہا ہوں میں دلبری کا مزاج

دل جلوہ گہہ یار ہے یہ ایک اجڑا ہوا دیار ہے۔ یہ محزون
کا ایک شہر ہے۔ یہ حرماں نصیبوں کی دنیا ہے وغیرہ
قسم کی تخیل ہر شاعر نے باندھی ہے۔ یونس احمر خانۂ دل
کی حقیقت بس اتنی بیان کرتے ہیں کہ اس گھر پر غم کی
حکمرانی ہے یہ ایک ایسی تخیل ہے جس کی داد نہ دینا ظلم
ہو گا۔ غم اپنے وسیع معنوں میں راز حیات و کائنات
ہے سے

خانۂ دل کی حقیقت کچھ نہ پوچھ
غم کی ہر سو کار فرمائی ہوئی

خزاں ایک مصیبت ہے اس میں پھول افسردہ ہو
جاتے ہیں۔ بلبل خستہ دل ہو جاتی ہے رنگینی و رعنائی
کا کچھ پتہ نہیں رہتا۔ چمن اجاڑ سا ہو جاتا ہے مگر بہار
کی رعنائی مصیبت ہے اس خیال کو احمر ہی ادا کر سکتے تھے
اس لئے کہ جس دور یونس احمر گذرے ہیں وہ ایسا ہی کچھ
ہے۔ آزادی بھی بہار ہے جس کے آتے ہی مصیبتوں کا
جو پہاڑ ٹوٹا اور لوٹ رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات

نہیں ہے

ہاں چمن سے رخصت نے نفس بہار
اک معیبت تری رعنائی ہوئی

خود غرضی ایک لعنت ہے مگر تکلیف دہ بات یہ ہے
کہ جو انسان بے غرض ہو کر ملک و ملت اور انسانیت
کی خدمت میں ہمہ دم مشغول رہتا ہے اس کے حصہ
میں بطور انعام رسوائی آتی ہے اس کا شکوہ احمر
کو بھی ہے ؂

بے غرض ہو کر گزاری زندگی
پھر بھی احمر اپنی رسوائی ہوئی

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں احمر کا لہجہ جدا
گانہ ہے اور یہی بات ان کی شاعرانہ عظمت کے لئے
کافی ہے۔ دیکھئے باتیں ایسی ہیں جن کو ہر شاعر نے
اپنے طور پر کہی ہے مگر احمر کا رنگ ہی کچھ اور ہے

تم کو مجھ پر ہی بھروسہ نہ رہا ورنہ
زندگی میری محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس طرح کی بھی ہوئی ہے بے چارگی
زندگی اپنی گویا بلا ہو گئی

زندگی سے بھی آساں نہیں ہے نجات
آج شاید فنا خود فنا ہو گئی

سوختہ خاکستر جگر میں ہیں
اب بھی پنہاں شرر نہیں معلوم

شاعر دلنواز کی بات میں احمر عزیز کیف نہیں

سکون نہیں درد کی چاشنی تو تھی۔ احمر کو درد و غم کا عرفان
اور تجربہ کس قدر ہے اور اس کی گہرائی و گیرائی تک
ان کے ذہن کی رسائی کتنی ہے اس کا اندازہ وہی لگا
سکتا ہے جسے احمر کے پورے فن کو دیکھنا نصیب ہو
یوں تو پرکھنے لئے ایک چاول سے بھی پرکھ لیتے ہیں
درد و غم سے احمر گھبراتے نہیں اور نہ قسمت کے گلہ مند
ہیں بلکہ اس کی پے بہ پے یورش سے ان کے عزم
و عمل کو مزید توانائی مل گئی ہے۔

ہم نشیں درد مسلسل کے طفیل
کاروانِ شوق ہے پھر تیز گام

مندرجہ بالا شعر کو سیاست کی عینک سے اگر
دیکھا جائے تو ملت کی بائیس برسوں کی تاریخ نگاہوں
کے سامنے آجاتی ہے جس میں اگر کوئی بات نمایاں ہے
تو بس یہی کہ ہزار نامساعد حالات میں بھی قدم آگے کی طرف
بڑھ رہے ہیں۔ غم و آلام کے بادل منڈلا منڈلا کر پاؤں
کو روکنا چاہتے ہیں مگر کارواں ہے کہ آگے بڑھتا
جارہا ہے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ احمر کیا اس عہد کا
کوئی خوش فکر اقبال سے دامن نہیں بچا سکتا۔ دیکھئے
احمر کے اس قطعہ میں بھرپور ثبوت موجود ہے

یہ زمیں تیرے لئے یہ آسماں تیرے لئے
گلستاں کیا چیز ہے سارا جہاں تیرے لئے
تو ہی ناداں وقت کی رفتار سے واقف نہیں
منتظر ہے ورنہ یہ دورِ زماں تیرے لئے

یونس احمر کی غزلیں نظمیں اور قطعات کو دیکھ کر میں بہت
متاثر ہوا۔ کیسے کیسے لوگ کہاں کہاں گوشہ گیر ہیں یہ

باقی صفحہ ۳۹۶ پر

پالنے کی چھُٹی

رامو تین برس کا ہے اور اُس کا پالنا....
اُس سے بس ایک دِن چھوٹا ہے۔
دونوں کا ساتھ رات دِن کا تھا۔ وہ ایک پل
کو ایک دوسرے سے الگ نہ ہوتے تھے۔
پھر دھیرے دھیرے رامو کو محسوس ہونے لگا: وہ
بڑا ہوگیا ہے.... یا اتنا بڑا کہ اب سونے کے لئے اسے
جھلائے جانے کی ضرورت نہیں۔
اُس نے پالنا چھوڑ دیا۔
— اور پالنے کو چھٹی مِل گئی۔
— لیکن — آخر ساتھی ہی تو تھا رامو نے پالنے سے اور ہی
کام لینا شروع کر دیا۔ پالنے میں وہ اپنی رنگ برنگ تصویروں
والی کتابیں، بلّے، گڑیاں وغیرہ رکھنے لگا۔

رامو کی ماں بولی: "دیکھو ہمارے لاڈلے کے
پاس کتنی ساری چیزیں ہیں اور یہ کتنا خوش خوش ہے"۔
رامو کے والد بولے: "ہو بھی کیوں نا۔ پالنے کو خوب لمبی چھٹی
جو دی ہے۔ ہم نے ٹھیک کیا نا؟"
جی ہاں۔ انہوں نے ٹھیک ہی کیا — !
— سمجھدار ماں باپ ہمیشہ فیملی پلاننگ کرتے ہیں۔
فیملی پلاننگ کے معنی یہی نہیں کہ بچے کم ہوں بلکہ یہ بھی ہیں
کہ بچے تبھی ہوں جب ماں باپ اُن کی ضرورت محسوس کریں
اور یہ کہ اُن کی پرورش کے لئے ہر طرح سے تیار بھی ہوں۔
بچے کا جنم اب اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار
میں ہے۔ ایسا فیملی پلاننگ کی بدولت ہوا ہے۔
مفت مشورے کے لئے قریبی فیملی پلاننگ سینٹر میں تشریف لائیں۔

davp 68/441

Sohail Gaya. December 68

مولانا صاحب

عبدالجبار نسیم آروی بی۔اے

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائشِ دل و نظر کی وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے (فیض)

اختر ناصح نصیب علیگ کے ذکرِ خیر کے ساتھ (جنھیں میں مولانا ناصح یا صرف مولانا صاحب کہا کرتا ہوں) یادوں کے کارواں ان راہ گذاروں پر گامزن ہو جاتے ہیں جن کا سلسلہ کبھی خود میری زندگی اور کبھی مولانا کی زندگی سے جا ملتا ہے فلم کی تصویروں کی طرح کم و بیش دس برسوں کا زمانہ اور تمام حالات و واقعات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں ——— میری نگاہیں دیکھنے لگتی ہیں کہ میں دربھنگہ لو ٹ (تاتارپور بھاگلپور) میں قیام پذیر ہوں۔ اس شہر میں محمد ادریس دربھنگوی اور محمد اقبال بھاگلپوری کے علاوہ کسی سے بالمشافہ تعارف نہیں ہے۔

——— محمد ادریس رحمان نو اس نزد جہازی کوٹھی قدم کنواں پٹنہ میں میرے ساتھ ٹھہرے تھے۔ جہاں رہ کر میں بہار پبلک سروس کمیشن کے امتحانات کی تیاری کر رہا تھا اور آڈیٹری سے مستعفی ہو چکا تھا۔ پٹنہ میں مقیم میرے خصوصی دوستوں عزیز زبیر احمد محمد حسین (جو لائف انسورنس اور سکریٹیریٹ کے ملازمین ہیں) سے یارانہ رکھتے تھے اور ان دونوں وہیں قیام پذیر تھے۔

اسی وقت ان سے تعارف ہوا تھا کہ یہ بھاگلپور کے محکمۂ برقیات میں عہدہ دار ہیں اور دربھنگہ لوج تاتارپور میں رہا کرتے ہیں ———

اور محمد اقبال۔ جناب کریم اسدی کے بھتیجے سنٹرل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ رانچی میں میرے ساتھ ہی اوڈیٹری کی ٹریننگ پا رہے تھے اور ہوسٹل میں ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔

اس لئے جب میری تقرری سرکل انسپکٹر کی حیثیت سے ہوئی تو فطری طور پر میں انہیں دو آشنا صورتوں کا پتہ پوچھتا ہوا اس شہر میں داخل ہوا۔

اسٹیشن سے قریب تر ہونے کے سبب دربھنگہ لوج پہلے پہونچا اور وہیں قیام پذیر ہو گیا۔

اپنی اس تقرری سے نالاں اور ڈگریوں کی کم وقعتی پر پشیماں پچھلا تحریری مضامین میں پچپن فی صد نمبر لانے کے باوجود پرسنلٹی ٹیسٹ میں صرف اٹھارہ فیصد نمبر دیکر نئی گزشتہ عہدے پر بھیج دیا گیا تھا۔

اگر یہی کرنا تھا تو آڈیٹری کو ئی برائی تھی جس سے میں مستعفی ہو کر آیا تھا ——— یہ خیالات اور ہم خیال نفوس کی نایابی کا غم ذہن و دماغ کو

کاٹ کھائے جا رہے تھے کہ میرا تعارف ایک وجیہہ اور بلند قامت شخص سے کرایا گیا جس کے پروقار سنجیدہ اور متین چہرے پر اضمحلال کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ اختر ناصح نقیب علیگ ہیں۔ سرکاری ٹور سے ابھی ابھی واپس آئے ہیں اور ایک بڑا سانحہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہے۔ آپ کا تین برس کا ہنستا کھیلتا بچہ عارف اختر گھر سے ملحق تالاب میں ڈوب کر لقمۂ اجل بن گیا ہے اور شدتِ غم کا نقطۂ عروج یہ کہ اس کی ماں نے پانی میں کود کر بچے کی لاش کو باہر نکالا اور بے ہوش ہو گئی ۔

مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا نظر آیا بمشکل تمام ضبطِ غم کر کے میں نے دو چار اَٹ پٹانگ کلمات تعزیت کہے وقعتاً مجھے اپنے سب سے بڑے بچے خورشید جمال کی موت یاد آگئی جب اسے اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا تھا تو سیلابِ درد و غم امڈ آئے تھے ۔

میں نے اپنے نو متعارف دوست کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ تنہا نہیں ہیں، یہ غریب بھی آپ کے غم میں برابر کا شریک کار ہے ۔ اور اپنے دوشِ ناتواں پر تمام بارِ غم والم اٹھائے ہوئے ہے ۔ ؎

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
(فیض)

رشتۂ اشتراکِ غم شاید تمام رشتہائے انسانی میں قوی ترین رشتہ ہے ۔ اس قدر مشترک نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر رکھا اور رجحانات طبع و میلاناتِ فکر و احساس کی ہم آہنگی نے اس مشہور رشتہ کو اور بھی قوی تر کر دیا ۔

انہیں کے ساتھ میں مئے کدہ تک پہونچا جہاں دیگر فنکاروں سے متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا ۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ مئے کدہ میں سرخ چائے پی جاتی ہے جسے اس وقت یتیم خانہ کی چائے کے نام سے احباب کے یاد کرتے ہیں کچھ دنوں کے بعد میں نے زور دیکر اسے میکدہ کی چائے کہنے پر اصرار کیا تھا ۔ اور مولانا ناصح نے اسکی بڑی پر زور تائید کی تھی ۔ انہوں نے وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ کم سے کم میں (ناصح) تو یتیم نہیں ہوں اس حقارت آمیز نام سے احتراز کیا جانا چاہئے ۔

لہٰذا بالآخر سرخ چائے کا نام مئے کدہ کی چائے اور اُسی مناسبت سے غنی صاحب کے اس ہوٹل کا نام میکدہؔ مشہور ہو گیا ۔ جس کی تفصیل اسی شمارہ کے اوراق پر پروفیسر امان اللہ خازنی کے مضمون اور اکرام انجم کی نظم میں دیکھی جا سکتی ہے اب بلا تامل سارے لوگ اسے مئے کدہ ہی کہتے ہیں شہر کے اندر اور باہر اسے اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں راحتِ جاں ٹھہری ہے
(فیض)

مولانا ناصح جن کا گھریلو نام اختر ہے اور پورا نام اختر ناصح (جس سے تاریخ پیدائش ۱۳۲۵ھ نکلتی ہے) دربھنگہ ضلع کے مشہور قصبہ نظرہ میں تیس نومبر ۱۹۰۷ء کو پیدا صرف پانچ سال کی عمر رہی ہو گی کہ والد محترم کے ساتھ بھوپال جانا پڑا جہاں وہ (انکے والد محترم) میڈیکل آفیسر کے عہدہ پر فائز تھے ۔ دورانِ تعلیم بہار میں برائے

نام ہی رہنے کا اتفاق ہوا ۔ پرائمری کی تعلیم گھر پر ہوئی اور ضلع اسکول دربھنگہ میں ساتویں آٹھویں اور نویں درجوں میں رہے ۔ پھر حمیدیہ ہائی اسکول بھوپال میں تعلیم پائی بعدہٗ علی گڑھ یونیورسیٹی سے ۔ بی ۔ ایس ۔ سی ۔ ممتاز نمبروں سے پاس کیا ۔ تقریباً ایک سال تک ہائی اسکول میں معلم رہے اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں سبور اگریکلچر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ ریسرچ میں آگئے اور یہیں سے بھاگلپور کی زندگی شروع ہو جاتی ہے ـــــ ـــــ ـــــ لیکن بھاگلپور کی زندگی تو ان کی ادبی زندگی کی ابتدا نہیں یہ تو اس کا شباب ہے ۔

انکی ادبی زندگی کی داغ بیل تو بھوپال کی رومان پرور سرزمین میں ہی پڑ چکی تھی کوہستان وندھیا چل کے سطح مرتفع پر واقع تقریباً پچاس مربع میل میں پھیلا ہوا یہ شہر اور اس کی شفاف اور حسین جھیلیں (دو بڑے بڑے تالاب جو چار چار میل لانبے چوڑے ہیں) جھیلوں میں تیرتی ہوئی کشتیوں پر حسن و جمال اور رنگ و نور کی بے پناہ دلپذیریاں ـــــــــ

جھیل کے دامن کو چھوتی ہوئی اسکول کی سیڑھیاں اور ان پر آشنا صورتوں کا خرام ناز ! ـــــــــ

خطۂ کشمیر پر چشمک زن یہ سارے فطری مناظر، نواب بھوپال کا ادب نواز دار الخلافہ اور بے نظیر پارک، اور بے نظیر تالاب کے کنارے صبح و شام سیر و تفریح اور گل گشت کے مزے ، وہ ادبی موشگافیاں، اور گہوارۂ ادب (اسکول میگزین) سے ارتباطِ خاص دل کی دبی ہوئی ادبی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے کیا کم تھے ـــــــــ

چنانچہ شعر کہتے رہے سنتے رہے اور اپنی مقبولیت کے سبب اسی میگزین کے ادارتی بورڈ میں چن لئے گئے ـــــ اس وقت اپنے کلام پر والد محترم ہی سے اصلاح لئے تھے ۔ اسی وقت سے نعیب تخلص مشہور خاص و عام ہے ۔ ہائی اسکول کی جغرافیائی سوسائٹی کے بھی سکریٹری رہے ۔

حمیدیہ ہائی اسکول کی دوسری جانب ـــــ بے نظیر تالاب کے اس پار سلطانیہ گرلس ہائی اسکول کی سیڑھیاں جھکتی تھیں ۔ دلوں کے درمیان صرف سطح آب کی چادر سیمیں کا فاصلہ تھا ـــــ دل نے یہیں محبت کی اولیں دھڑکنیں محسوس کی تھیں ذہن و روح نے یہیں نغمۂ سرمدی چھیڑا تھا ۔ ع

اس جگہ میرے خوابوں کو آنکھیں ملیں
(سردار جعفری)

پھر علی گڑھ کا تعلیمی دور اپنی تمام روایتی توانائیوں اور دل پذیریوں کے ساتھ ذہن و دل پر رنگا رنگ نقش و نگار بناتا رہا ـــــ ممتاز ہوٹل اور ماریسن ہوسٹل کی زندگی ، اور شفقت زیدی ، برق کاکوروی ، افتخار اعظمی انور علی خاں سوز ، محمد سعید ، نجات اللہ صدیقی ، صفدر علی ، محمد عرفان ، سید انور علی ، خلیل الرحمن اعظمی ، معزز علی بیگ ، اور منیب الرحمن وغیرہ جیسے رفقائے کار اور یاران غمگسار کی صحبتیں پروفیسر محمد حسن عسکری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی ، آل احمد سرور ، جیسے اکابر اساتذہ کا فیض تربیت ہمہ دم صیقلِ فکر و نظر کرتا رہا ۔ تعمیر پسند اساتذہ اور طلبا کی انجمن سجی رہی جس کے روح رواں یہ خود تھے اور دوسری طرف ترقی پسندوں

کی بزم ارائیاں ہوتی رہیں ——— تعمیری اور صحت مند مقابلے ہوتے ہے تھکیں چلتی رہیں مگران کا فطری رنگ وآہنگ پختہ تر ہوتا گیا ——— کرکٹ اور ہاکی کے یونیورسٹی اسٹینڈرڈ کے پلیئر رہے ۔ والی بال کے آفتاب حال ٹیم کے کیپٹن رہے ان ۔سی ۔سی ۔کے قدراول کے کیڈٹ رہے اور پورے آفتاب ہال کے (جیسیں چار ہوسٹلس تھے) برسوں سینیر پر پرمانیٹر رہے ——— زندگی توس قزح کی طرح رنگارنگ کیفیات سے ہمکنار رہی۔ بزم میں ، بزم میں ، جہاں بھی رہے چھکتے رہے اور یہ کیفیتیں ہنوز قائم ہے ہے

فسردہ کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار بن کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
(داغ دہلوی)

اور پھر بھاگلپور کی زندگی جسے سطور ماقبل میں ادبی زندگی کا شباب کہا گیا ہے شروع ہوتی ہے ۔ ارباب قدیم بزم سخن سے نئے کدہ میں تعارف ہوتا ہے۔ ادبی نشستوں شاعروں اور مذاکروں کوان کی گل افشانیاں گلستاں بکنار کردیتی ہے بھاگلپور کے ادبی ماحول اور بزم سخن کی کارگذاریوں سے یہ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ ۱۹۶۲ء میں تذکرہ شعراء بھاگلپور موسوم بہ "نظارۂ وخیال" کو ترتیب دیکر اور اس شہر کے معروف شعراء پر فرداً فرداً مختصر مگر جامع مضامین لکھ کر منظر عام پر لاتے ہیں ،اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس تذکرہ کی پہلی اشاعت اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کرنے پر غور کررہی ہے ——— پھر یہ کہ ۱۹۶۳ء کے آخر سے اب تک کئی شہروں مثلاً آرہ ، گیا مونگیر وغیرہ میں اسی ڈھرے (PALTERN) پر تذکرے شائع ہوگئے ۔ مگر اہل نظر نے دیکھا کہ " نظارۂ وخیال " جیسے بحیثیت تاریخ اشاعت یعنی .CHRONOLOGICALY اولیت حاصل تھی ۔ دیگر اعتبار سے بھی اسی منزل میں رہا ۔ سارے تذکرے نقد و نظر کے معیار اور خلوص و رواداری کی وسعت کے اعتبار سے اس سے بہت دور چھوٹ گئے " نظارہ وخیال " پر منفرد مضمون اسی شمارہ کے اوراق پر دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہوں گا ۔

بھاگلپور کے اس طویل دوران قیام میں سرکاری ملازمت اور ادبی مشغولیات سے قطع نظر اور بھی کچھ کام کئے گئے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا واقعات سے روگردانی اور اہم حالات زندگی سے گریز کے مترادف ہوگا ۔ کشمکش حیات کی وہ منزلیں ہیں جنکی ترجمانی شاید کسی قدر یہ شعر کرسکے ہے کہ

اف جو کرتا ہوں تو توہین ہے ضبط غم کی
اور نہ کرتا ہوں تو صیاد کی رسوائی ہے

لہٰذا میں عرض کردوں کہ ۱۹۶۲ء کے روائل میں جب اپنے ایک خصوصی ملاقاتی نوازش حسین (جوان دونوں لا کالج کے طالب علم تھے) نے فخریہ انداز میں یہ بات بتائی کہ لا کالج کی فضا رومانیت کے نقطۂ عروج پر پہونچی ہوئی ہے وہاں کے طلباء اور طالبات جن میں شہر کے تمام ترحسن وجمال یکجا ہوگیا ہے آئے دن لا کالج کے کلچرل سوسائٹیوں کو اپنے نغمۂ موسیقی سے " جنت نگاہ " اور فردوس گوش " بنا دیتے ہیں ۔ اس سے پہلے اتنے اچھے لوگوں نے کبھی داخلہ نہیں لیا تھا اور ایسی گل فرنگیاں کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں ——— تو ہم لوگوں نے لا پڑھنے کا فیصلہ کیا پرنسپل صاحب سے اجازت لیکر دوسری بی ۔آئی سے کلاس کرنا شروع کردیا اور اس عمر میں جبکہ ہم لوگوں کے سر کے بال اکے دکے سفید ہو رہے ہیں طالب علم بن بیٹھے

بھاگلپور یونیورسٹی میں لاء کے شبینہ کلاسز ہوا کرتے ہیں۔
نوجوانوں نے بڑے انہماک سے بلاناغہ کلاسوں میں حاضری
دی۔ پرنسپل صاحب سے دو ایک روز کے وقفہ کے بعد
برابر پڑھائی بند رکھنے کی فرمائش کرتے رہے۔
پرنسپل صاحب بڑے شوشل اور صاحب ل... تھے انہوں
نے تقریباً ہمیشہ اس عرض کو قبول فرمایا و ... کا
کا حکم دیا کہ جو چیزیں گائی جائیں انہیں ... سمجھا جائے
——— تو نوجوانوں کی باچھیں کھل اٹھیں ...
... انتظام ہوگیا۔ اور کلاس روم سے نغمہ و نور کی کرنیں
پھوٹنے لگیں ——— اور یہ سلسلہ دو روز کے بعد دہرایا
جاتا رہا۔ سارے ناموں میں صرف ایک نام کو سننے کی بار بار فرمائش
کی جاتی رہی جیسے مدھر ی پورنما کا چندا کہ۔ اس مدھم
گیتوں کی جھنکاریں جانیں کتنی راتوں کی نیندیں حرام کرتی رہی ہیں
آج وہ سارے لوگ ایڈووکیٹ ہو چکے ہیں ان میں سے کچھ تو اسی
شہر میں اور کچھ دیگر شہروں میں پریکٹس کر رہے ہیں کچھ لوگوں
نے بھی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ لیکن امتحان دینے کی قطعی ضرورت
نہیں سمجھی ——— اسی شدت احساس تحال او ... پسند نے
کچھ دنوں قبل انہیں ایک جگہ خانگی درس و تدریس کے لیے معلم
بننے پر رضامند کرلیا ——— ہائی اسکول کی پرانی معلمی کے تجربے
سے کام لیکر اس سے پہلے انھوں نے غلام حسین راہی کو پڑھایا
تھا اور اس کے اچھے نتیجے سے کافی ساکھ جمی تھی۔ یہاں بھی
بڑی لگن اور انہماک سے انہوں نے کام کیا اور کیوں نہ ہو

؎

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں؟
(حالی)

دوران قیام بھاگلپور ان سے قریب ترین ہونے
کے سبب ان تمام کاموں میں، میں شاید برابر کا شریک جرم
رہا ہوں (اگر اسے جرم کہا جائے) اسی لئے میں نے قبل
عرض کیا تھا کہ ؎

ہم پیشتر کہہ ہیں احسان تمہاری الفت کے
... احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

مولانا صاحب بلند قامت، بھرے ہوئے جسم اور
وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں۔ زلف قدرے دراز پر خم و پیچ سے
علیگیر ... ہوتی ... کتابی پر کمال سلیقہ
سے چھوٹی چھوٹی ... تھنوں کا ترشہ ہوا حاشیہ
سر اور جسم تمکنت اور جاہ و جلال کا حامل، مزاج سے کبھی
کبھی ... آشکارا سنجیدگی اور بذلہ سنجی کے حسین
امتزاج، حد درجہ نفیس و نفاست پسند، سادہ و پرخلوص
ذہن و دل اور عادات و اطوار کے مالک ——— ہر بزم
کی جان اور ہر رزم کی شان۔ رفتار گفتار اور نشست و بر
خاست میں ایک پر وقار رکھ رکھاؤ۔ بہ یک نظر سراپا علی
گڑھ ہیں۔ علیگیر پاجامہ اور شیروانی ان کی محبوب و مرغوب
پوشاک ہے لیکن بھاگلپور میں پاجامہ تو نہ ہونے کے
سبب ... بہت کم دیکھے جاتے ہیں یہاں عام طور
سے پتلون شرٹ یا کرتا پاجامہ پہنتے ہیں۔ ہر پوشاک قدر
موزوں پر ... ہے۔ اس وجاہت اور سج دھج کے
لوگ اس شہر میں شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ اس کی تائید
یوں ہوئی کہ جب مولانا صاحب مجھ سے ملنے کے لئے بیرونی
... میں گئے تھے (میں وہیں ٹرانسفر ہوکر گیا تھا) تو تمام
جانیوالی گاڑی میں بے انتہا بھیڑ تھی۔ اور ملٹری سے بھرے
ہوئے بہت سے ڈبے ریزرو تھے۔ لیکن ایک ملٹری

ڈبے میں جب یہ داخل ہوئے تو سارے سپاہیوں نے بندوقیں سنبھال لیں اور تن کر کھڑے ہوگئے۔ پورے ڈبے کو چھوڑ دیا اور دوسری طرف بیٹھ گئے۔ اور زیادہ چوکسی سے پہرہ دینے لگے اس وقت سردیوں کا زمانہ تھا اور یہ سبزی مائل سرج کے کوٹ پینٹ میں ملبوس تھے۔ چہرہ سے علم و فراست کی بے پناہ تابانیاں جلوہ گر تھیں۔ ناخواندہ سپاہی اس جاہ و جلال کی تاب کیا لاتے انہوں نے یقینی انہیں ملٹری کا بڑا افسر تصور کیا ہوگا کیونکہ پورے ڈبے میں اس وجاہت کا کوئی سپاہی نظر نہیں آتا تھا۔

ان کی خانگی زندگی اور گھریلو ماحول خالص ہندوستانی رنگ کا ہے اس مشترکہ خاندان کے سربراہ انکے والد محترم ہیں جو تقریباً ۱۹۵۰ء میں ریاست بھوپال سے ریٹائر ہو کر تشریف لائے تھے گھر ہی پر ڈسپنسری رکھتے ہیں اور آج بھی خاصی پریکٹس چلتی ہے والدہ بھی بقید حیات ہیں۔ برادر خورد عمر مختار سلمۂ مدھوبنی کالج میں پروفیسر ہیں ہمشیرہ مع بھانجیوں کے خوش و خرم ہیں۔ بڑا لڑکا آصف اختر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم ہے اور بچی ناہید اختر ہائی سکول کی طالبہ ہے! چھوٹا بچہ اور سلمان اختر پرائمری درجوں میں ہیں گویا پورا خاندان ایک چمن سرسبز و شاداب ہے جہاں شب و روز علم و ادب اور نقد و نظر کے پھول کھلتے ہیں مگر کبھی کبھی انھیں ناآسودگی جذبۂ جمالیت کا نشہ بھی احساس کھٹک جاتا ہے۔ لیکن یہ تو عوامی مسئلہ ہے۔ ؎

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

(غالب)

انہوں نے اپنی اور عمر سلمۂ کی انتھک کوششوں سے اپنی قصبہ نظرہ میں "جنتا لائبریری" کے نام سے ایک کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کیا اور جس کی آبیاری برسوں اپنی خون جگر سے کرتے رہے۔ دو برسوں تک ماہانہ نشستیں بھی باقاعدگی سے ہوئیں اور شاندار سالانہ جلسہ مشاعرہ بھی۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ یہ قابل قدر کتب خانہ اہل قصبہ کی عدم توجہی کا شکار رہا اور نہایت افراط و تفریط سے دوچار ہے۔

ان کی دوستی اور دوست نوازی سارے احباب کیلئے نعمت بے بدل اور دولت بے پایاں ہے یہ اپنے آپ میں ایک انجمن اور اپنی ذات میں ایک دنیا ہیں اس تصور سے دل کانپ جاتا ہے جب اس انجمن سے بچھڑنا ہوگا۔ گرچہ دور رہکر بھی ارتباط روح و دل بدستور قائم رہیگا ؎

لیکن اس خواب کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

مجروح عظیم آبادی کا فن

حسن عسکری

کسی شعری دنیا یا ادبی تخلیق پر اظہار خیال سے پہلے آج کے ماحول کا ایک سرسری جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کا آدمی نیا ہے۔ اس کے طور طریقے، اس کی تعلیم و تربیت، اس کی تہذیب و ثقافت کی شاہراہ جدا ہے۔ آج کا انسان سوچ رہا ہے کہ یہ جیتی جاگتی دنیا اس کا شاہراہ ہے۔ محدود اس کی اپنی ذات کے معنی کچھ نہیں ہیں۔ ماحول کی پراگندگی، خوف، ہراس اور گھریلو زندگی کی زہرناکی نے عام آدمی کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس تکدر کا اثر آج کے شاعر پر بھی پڑا ہے۔ یہ اثر مبارک ہے یا نامبارک اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ بہر حال صرف اردو سماج اور اس کے ماحول کا نہیں ہے۔ بلکہ ساری دنیا کی فضا اس سے متاثر ہے۔ نا خدا تہذیب کا جو شجر مغربی دانشمندوں نے لگایا تھا۔ آج بار آور ہو کر اپنے کڑوے کسیلے پھل کا دنیا کو مزہ چکھا رہا ہے۔

اردو کا اپنا ماحول، اپنا جینے کا سلیقہ، اپنی تہذیب و ثقافت اپنی تاریخ اور اپنے رکھ رکھاؤ کا انداز ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے میل ملاپ سے جب یہ زبان وجود میں آئی تو ان زبانوں کی رنگینی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ جن تہذیبوں کی وہ پروردہ تھیں۔ ان کے اثرات بھی اردو کو ورثہ میں ملے۔ انگریزوں کے ساتھ انگریزی اور انگریزیت کا سبز قدم جب یہاں آیا تو ناممکن تھا کہ اس کی آلودگیوں سے جیسی زندہ زبان محفوظ رہتی۔ مگر آج ماحول کی الجھنوں نے ... اردو کو بھی ... دیا ہے۔ یا الجھا دینے کے درپے ہیں۔

اس تیرہ و تار ماحول میں ایک ایسے فن کار کی مشکلات کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ جو میر سے شاد تک کے رنگ سخن کو زندہ اور پائندہ رکھنا چاہتا ہے۔ مجروح عظیم آبادی کا پیش نظر نمونہ کلام اس بات کا غماز ہے کہ مجروح ان سخن سنجوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ان ناساعد حالات میں بھی آلودگیوں سے اپنا دامن بچائے رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ترقی پسندی کے طوفان نے بھی اسی طرح کبھی آگھیرا تھا لیکن جب اس طوفان کا زور تھما تو دیکھا گیا کہ اس کارواں میں سے وہی منزل تک آسکے جو اردو کے روایتی ہم آہنگ تھے۔ اس گروہ کو یقین ہے کہ اس نئی آندھی کا بھی انجام کچھ یہی ہونے والا ہے۔ زندہ اور پائندہ رہنے والی مستقل قدروں کو یہ لوگ اپنائے ہوئے ہیں۔ اور ایک باخبر راہی کی طرح جرأت مندانہ انداز میں منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

مجروح عظیم آبادی پرگو، خوش فکر اور زندہ دل شاعر ہیں۔ اپنے گرد و پیش سے باخبر بھی ہیں۔ زندگی جس پیچ و خم سے دو چار ہے۔ اور آج کا انسان جو کچھ محسوس کر رہا ہے۔ اس کی تصویر اس شعر میں مجروح نے ہو بہو کھینچ دی ہے

ے زہر غم حیات سے چھلنی جگر ہے آج
بیزار اپنی زیست سے ہر اک بشر ہے آج

سب سے بڑی حسرت ناک بات یہ ہے کہ با خدا تہذیب کا علم بردار بھی آج بے خدا تہذیب کا میلہ زبوں ہے۔ اس المناک حقیقت کو مجروح نے نہایت سادگی کے ساتھ شعر کا یوں جامہ پہنایا ہے۔

کل تک تھی جس کے ہاتھ میں دنیا کی رہبری
محتاج رہبری کا وہی راہرو ہے آج

ہرن جب آفت میں پھنس جاتا ہے۔ اور زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔ تو ایسے میں جو اس کے گلے سے چیخ نکلتی ہے۔ وہ اپنی کربناکی کے باوجود ترنم آفرینی کا جوہر بھی رکھتی ہے۔ اس چیخ کو غزل کہتے ہیں۔ اب غزل کے معنی یہ لے لیجئے یا عورت سے باتیں کرنی دونوں حالات میں ذرا مجروح کے اس شعر کو پڑھئے اور آج کے شب و روز کی طرف نظر کیجئے۔

اجڑے ہوئے گھروں کو بسانے کی بات کر
جو رو رہے ہیں اُن کو ہنسانے کی بات کر

حساس دل غلامی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر آزاد فضا میں سانس لینا کے مژدہ کے فوراً بعد اگر کچھ اس طرح حالات پلٹ جائیں کہ رسی اور بھی جکڑ دی جائے۔ تو مرغ اسیر کے تڑپنے اور کراہنے کی دردناکی ایسی نہیں ہوتی جس کی تصویر کشی آسانی سے کی جا سکے۔ اگر مجروح کو ایسے میں رونا آیا تو کیا تعجب ہے۔

پر ابھی تولی رہے تھے کہ ہوئے حیف اسیر
اپنی اس حسرت پرواز پہ رونا آیا

مجروح کی سپردگی، اور وفاشعاری، کا جذبہ روایتی شاعری سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ جس میں وفاشعار اور معشوق پیکر جفا ہونا ایک تسلیم شدہ بات ہے۔

تری بے رخی کے نثار میں تیری کج روی پہ فدا ہوں میں
تو کئے جا دل پہ مرے ستم، مجھے آرزوئے کرم نہیں

عشق کا روگ کیسا ہے۔ اس کو وہی بتا سکتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سمجھ بھی سکتا ہے۔ جو اس آگ میں تپا ہو، عشق کسی گوشت پوست کے پیکر سے ہو یا اپنے رب سے، مگر یہ آتش نمرود میں کود جانے والا۔ اس کے بغیر عشق و ہوس میں تمیز ناممکن ہے۔ عشق کا آزار کیسا ہے۔ دیکھئے مجروح کس سادگی سے اس شعر میں کہہ گئے ہیں۔

جب سے کی تجھ سے دوستی اے دوست
غم سے فرصت نہیں ملی اے دوست

معشوق سے ملنے کی تمنا ہو یا کسی بھی مقصد کے حصول کی دھن جب انسان اس طرف یکسوئی سے رجوع ہو جاتا ہے۔ تو پھر اوروں کی کیا خبر نہیں رہتی۔ یہ دھن جب اپنی حد کو عبور کر جاتی ہے تو انسان دوسروں کی نظر میں نیم مجنوں لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے مطلب میں بڑا سیانا ہوتا ہے۔ آوازہ کسنے والوں کی باتیں ان سنی کرتے ہوئے زیر لب مسکراتا ہے۔ اس کی نگاہ میں ایسے لوگ بے مقصد زندگی گذارنے والوں میں سے ہوتے ہیں۔ مجروح نے ایسے انسان کے جذبہ کی جلوہ گری اس شعر میں کیا خوب کی ہے۔

کہہ دیا جب کسی نے دیوانہ
آ گئی جانے کیوں ہنسی اے دوست

عشق میں ایک ایسا بھی مقام آتا ہے۔ جب عاشق آزمائشوں کی بھٹی میں بار بار تپایا جاتا ہے۔ اور بار بار کندن بن کر نکلتا ہے۔ حسن اپنی جفاؤں کے حربے سے عشق کو آزماتا ہے۔ اور عشق اپنی وفاؤں کی ڈھال دیتا ہے۔ ایک اسی قسم کی کشاکش کا ذکر مجروح بھی کرتے ہیں۔

عجب طرفہ کشاکش ہے کہ جذب شوق الفت میں
وہ ہم کو آزماتے ہیں، ہم ان کو آزماتے ہیں

خطا، خط کا جواب، اور فاصلہ، اردو شاعری کے روایتی علائم ہیں۔ ان تین لفظوں سے شعراء نے خوب خوب مضامین نکالے ہیں۔

و شاعری کا ذکر کرنے بیٹھے تو ہزاروں کی تعداد میں صرف ان
غم پر مشتمل اشعار مل جائیں گے مجروح کا شعری لطف سے
لی نہیں ہے۔ ؎

نفس مضموں کو بھانپ کر بولے
یلغو عبارت پڑھی نہیں جاتی

پ ندا ہی ب ہے نہ اخلاق کی جو عمارت تعمیر کی ہے۔ اس کا تقاضہ ہے
انسان خود دیگر ۔۔۔ اور خود دوست بن جائے تو ظاہر و
باطن کی یکسانیت خود ہو انسان دوستی کا مفہوم اپنی ذات سے
محدود ہے۔ نتیجہ ہے کہ آج کوئی کسی کا ہمدرد نظر نہیں آتا۔
مجروح نے اس روگ کو بھانپ کر کیا خوب شعر کیا ہے۔

ساری دنیا ہے اپنے مطلب کی
کس کا کس کا گلہ کرے کوئی

چمن، باغباں، گل، بلبل، صیاد، آشیاں، بجلی اور فلک جیسے
علائم سے ہر عہد کے شعراء نے اپنی شعری کاوش میں کام لیا ہے۔
آزادی کے بعد ان علائم کا مفہوم بدل گیا ہے۔ مفہوم بدل جانے کی
بات چونکا دینے والی نہیں ہے۔ الفاظ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے
اہل علم واقف ہیں کہ لفظوں کی دنیا میں موت، حیات، اونچ نیچ،
چھوٹ، اچھوت، کفر، فرک، وین واسی، ماحول کے اعتبار سے
بدل لینا، صورتوں کا مسخ ہوجانا یا نکھر جانا سب کچھ ہوتا ہے۔
انقلابات زمانہ کے اثر سے الفاظ محفوظ نہیں ہیں۔ ہاں تو میں
عرض کر رہا تھا کہ آزادی کے بعد مندرجہ بالا الفاظ کے مفہوم بدل
گئے ہیں۔ حالات کا کچھ اقتضا ہی ایسا ہے۔ اس بدلے ہوئے
مفہوم میں مجروح کا یہ شعر عزم و ارادہ کی پختگی کا مظہر ہے۔

؎ بلا سے لوٹے فلک اس پہ یا گرے بجلی
اسی چمن میں بنانا ہے آشیاں مجھ کو

سردار جعفری کا قول ہے کہ ماضی کی کوکھ سے حال
جنم لیتا ہے۔ جس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حال کی کوکھ میں
مستقبل پوشیدہ ہوتا ہے۔
مجروح عظیم آبادی جیسے شعراء اس دور میں غنیمت
ہیں۔ ورنہ شاہراہ ادب پر اگر ماضی سے غیر متعلق اور حال سے
بیزار افراد کا قافلہ تنہا رہ جائے۔ تو نہ معلوم کس کھڈ میں
یہ جا گرے۔

بقیہ بشمبر داس ہمیسری

ہمیشہ اور ہر موقع پر برابر اس کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ دوسروں
کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھ کر سینے سے لگاتے ہی نہیں ان
کا مداوا بھی پیش کرتے ہیں۔ انسان دوستی کو تمام کشاکش کا
واحد حل گردانتے ہیں سماج اور اسکی جملہ خرابیوں نیز باہمی منا
فشات کا علاج محبت سے ہی ممکن ہے اور یہ بات انکے دل
میں نقش ہوگئی ہے۔ معقولیت پسندی، وفا شعاری، منکسر المزاجی
اور سلیم الطبعی آپ کی شخصیات کی نمایاں خصوصیات ہیں لہری صاحب
جگر مراد آبادی کے اس شعر کی تفسیر ہیں ؎

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

ایک تعارف

سید علی حیدر نیّر

راہی بھاگلپوری ۲؍فروری ۱۹۴۸ء کو بھاگلپور میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ نسیم آروی سے جب ربط پیدا ہوا تو آپ کا جذبۂ شاعری پروان چڑھنے لگا۔ راہی نے اپنے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں نسیم آروی کی طرف رجوع کیا۔ طبیعت میں شوخی اور رومان ہے۔ خوش فکر بھی ہیں خوش گو بھی۔ نیز سیاست سے کافی شغف ہے جس سے خیالات میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ آپ کو قومی خدمت کا بھی شوق ہے مختلف قومی اداروں سے آپ کی وابستگی ہے۔ شاعری میں کسی مکتبۂ فکر کی اتباع نہیں کرتے۔ آزاد فکر ہیں۔ غزل اور نظم دونوں کی طرف رجحان ہے۔ "باپو کی زمین" "ملاقات" "کشمیر سے واپسی" "کل اور آج" وغیرہ نظمیں آپ کی یادگار ہیں۔ طبیعت کی شوخی کلام سے نمایاں ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں

تجھ سے ہے مجھ کو شکوہ تو مجھ سے تجھے گلہ
جو میری داستاں تھی تری داستاں ہے اب

~~~~~~

خشک ہے ہر غنچہ ہر گل سینہ چاک
اب وہ رنگ و نکہتِ گلشن کہاں

~~~~~~

وارداتِ دل ہے راہی کا کلام
اہلِ دانش اس میں فکر و فن کہاں

~~~~~~

تو اپنے رند کو کچھ یوں پلا دے مئے ساقی
غم و نشاط جہاں میں نہ امتیاز کرے

~~~~~~

وہ کہہ رہے ہیں ستم ہائے بیشمار کے بعد
مجھے تو تیری محبت کو آزمانا ہے

~~~~~~

تمہیں تو ایک تھے واقف مری حقیقت سے
تمہیں تو حال پہ میرے نہ مسکرانا تھا
وہیں وہیں پہ گری برق ناگہاں راہی
جہاں جہاں پہ عنادل کا آشیانہ تھا

~~~~~~

نہ پوچھو آج گلوں کی شگفتگی کا مزاج
بڑھا دیا ہے صبا نے کلی کلی کا مزاج
جلا دو خونِ جگر سے چراغ محفل میں
بدل سکو تو بدل ڈالو تیرگی کا مزاج

~~~~~~
~~~~~~

مطلعِ ادب کا نو درخشندہ ستارہ

ٹی۔ ان۔ بی کالج کی گداز میگزین جب مجھے پیش کی گئی تو اس کے سادہ مگر حسین اور پرکشش گیٹ اپ نے اپنی طرف فوراً میری توجہ مبذول کر لی۔ میں سرسری طور سے پہلے ہندی اور پھر انگریزی اور بنگالی کے حصوں سے گذر کر اردو کے حصہ میں داخل ہوا جو قاعدے کے مطابق سب سے اخیر میں ہوا کرتا ہے لیکن اسی کو اگر اردو رسم الخط کے مطابق ترتیب دیا ہوا سمجھا جائے تو یہی میگزین کا اولین حصہ بھی سمجھا جائے گا

یہی کنارِ فلک کا سیہ ترین گوشہ
یہی ہے "مطلعِ ماہِ تمام" ــــ کہتے ہیں

یہ ۱۹۶۶ء کے اوائل کی بات ہے جب میں اس شہر میں دوسری بار قانون گو کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا اور کالج میگزین کا جو شمارہ مجھے بھیجا گیا تھا وہ ۱۹۶۵ء کا تھا اور ابھی تازہ تازہ پریس سے آیا تھا۔ میں حسب عادت سب سے پہلے حصۂ نظم و غزل کو دیکھنے لگا۔ پہلی غزل پہ نظر پڑی اور مطلع پڑھا کہ ؎

ظالموں نے سب آزادیاں چھین لیں ہو گیا ہوں میں برباد تیری قسم
کوئی شناسا نہیں ہے مری ایک بھی اک مرا جان ہے اور لاکھوں ستم

تو شاعر کا نام دیکھا لکھا ہوا تھا غلام حسین راہی بھاگلپوری۔ پھر دوسری غزل پڑھی کہ ؎

گراں ہے رات تو نازک ہے چاندنی کا مزاج
کسی طرح نہ کسی سے ملا کسی کا مزاج

تو یہاں بھی شاعر کا نام غلام حسین راہی بھاگلپوری ہی لکھا ہوا پایا۔ پھر تیسری غزل شروع کی کہ ؎

گھائل تو کر چکے مجھے تیر نظر سے آپ
پھر بھی ہیں میرے حال سے کیوں بے خبر سے آپ

شاعر کا نام دیکھا تو تعجب ہوا کہ یہاں بھی وہی نام لکھا ہوا تھا۔ پھر آگے کے صفحات الٹے۔ چوتھی غزل دیکھی کہ ؎

تو جس کی سمت بھی چشم فسوں طراز کرے
وہ خوش نصیب مقدر پہ اپنے ناز کرے

اور شاعر کا نام دیکھا تو حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہاں بھی غلام حسین راہی بھاگلپوری ہی لکھا ہوا تھا اور میگزین ختم ہو چکی تھی۔

میں سوچ میں گم تھا کہ اس کالج کے کثیر التعداد طلبہ میں یہی ایک طالب علم ہے جس کی غزلیں میگزین میں چھپی ہیں اور دیگر طلبہ شعر و سخن سے قطعی نا

آشنا ہیں یا بے تعلق۔ ایسا کیوں ہے؟ میں نے اس قسم کا سوال اپنے دوست سے کیا جنہوں نے میگزین پیش کیا تھا۔ انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات بتائی کہ سارے طلبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی تین یا چار تخلیقات میگزین کے لئے داخل کریں جن سے انتخاب کرکے ایک یا دو چیزیں شائع کی جائیں گی — زیادہ تر لوگ تو شعر و ادب سے قطعی بے تعلق ہیں ہی لیکن چند لوگوں نے اپنی تخلیقات پیش کی تھیں وہ اس قابل بھی نہیں تھیں کہ رد و کد اور تصحیح کے بعد بھی اشاعت میں شامل کی جاسکیں اس لئے تنہا غلام حسین راہی کی چار دو چیزیں شامل کرلی گئیں اور باقی ساری چیزیں چھانٹ دی گئیں ہیں۔ انہوں نے اردو پڑھنے والے طلباء کی اردو ادب سے بے تعلقی کا بڑے غمناک انداز میں شکوہ کیا پھر اس نوجوان کی تعریف کی کہ اس مسموم ماحول میں ایک فرد واحد ہی سہی مستثنیٰ تو ہے جو یاس کے اندھیرے میں امید کی روشنی کے مناسے کی طرح سربلند ہے۔

پھر مجھے یاد آیا کہ مسلم ہائی اسکول کا ایک طالب علم جو اس وقت میٹرک کے امتحان کی تیاریاں کررہا تھا میرے پاس اکثر و بیشتر کسی سبجکٹ میں کچھ دریافت کرنے آتا تھا اور یہاں اساتذہ کے رکھے ہوئے دواوین اور شعراء کے مجموعہ ہائے کلام سے کچھ پڑھتا اور کچھ نوٹ کرتا رہتا تھا۔ اس نے میری بیاض سے بھی کچھ نوٹ کیا ہوگا۔ کیونکہ ایک دو بار اس نے مجھے دکھایا تھا کہ مختلف عنوانات پر چیدہ چیدہ اور پسندیدہ اشعار کی نو ۔۔۔ت میں یہ سے بھی کچھ اشعار بالوں میں چھپے تھے اور پسند کرنے والے میں اس نے اپنی چھوٹی بہن کا نام دیا تھا۔

اسی دوران اس نے مجھے اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں دکھلائی تھیں جنہیں میں نے درست کردیا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ ابھی مطالعہ کی طرف توجہ دو شعر کہنے کے لئے ابھی ایک عمر پڑی ہے — یہ تقریباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے اور اب ۱۹۶۶ء میں جب میں جیب میں کالج میگزین دیکھ رہا تھا اور ایک ذمہ دار شخص کی زبان سے اپنے ہاتھوں سے سینچے ہوئے اس درخت کی گھنی چھاؤں کی تعریف سن رہا تھا تو خوشی ہوئی تھی کہ

میں نے جس پھول کو سینچا وہ گلستاں نکلا

جس نوجوان کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے وہ آزاد ہندوستان میں ۲۴ فروری ۱۹۴۸ء کو شہر بھاگلپور کے محلہ مجاہد پور میں پیدا ہوا تھا۔ یہ متوسط طبقہ کے ایک معروف خاندان کا چشم و چراغ اپنے سات بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور صرف ایک ہی سب سے چھوٹی بہن ہے جسے سارے بھائی اور والدین اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ بہت لاڈ پیار سے پالا ہوا یہ نوجوان اپنے بھائیوں اور محلہ کے سارے نوجوانوں کی ٹیم کی کپتانی بڑی چابکدستی سے کرتا رہا ہے مسلم اسکول کی طالبعلمی کے زمانہ سے لے کر اب تک جبکہ وہ بی۔اے فائنل کا طالب علم ہے۔ مختلف کھیلوں اور ورزشوں لے سی سی اور ان سی سی کے مختلف رینکوں کے متعدد تمغے اور سرٹیفکٹس اس کی سجی سجائی ہوئی نئی رہائش گاہ میں بڑی خوبصورتی سے آویزاں

نظر آ رہی ہیں گے۔ اس کمرہ میں بزم کی دو نشستیں، ایک تو گذشتہ سال موسم باراں میں زیر صدارت جناب نند کشور نندن ڈاکٹر الکٹری سیٹی بورڈ بہار پٹنہ اور دوسری گذشتہ سال موسم سرما میں زیر صدارت جناب مسرور آروی صاحب منعقد ہو چکی ہیں اور احباب میکدہ اس نوجوان کی خدمت و ضیافت سے متاثر ہوئے ہیں۔

۱۹۶۳ء کی گرمیوں میں جبکہ میرے تبادلہ کی خبر گرم تھی کہ ایک صبح یہ بات سنی گئی کہ غلام حسین اپنے دو دوستوں شمس الضحیٰ اور انوار عالم کے ساتھ سیر جنت دیکھنے کے لئے نکلا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں گیا ہے تقریباً ایک ماہ کے بعد سری نگر سے خط آیا کہ وہاں یہ لوگ ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور سیر و تفریح فرما رہے ہیں۔ روپئے گھٹ چکے ہیں اس لئے پانچ سو روپئے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ خیر روپیہ بھیجا گیا۔

اسی دوران میں بدل کر بروٹی ضلع مونگیر چلا گیا اور تھوڑے دنوں کے بعد میرے پاس ایک لفافہ پہنچا جس میں دیگر چیزوں کے ساتھ کشمیر والی نظم بھی تھی جسے میں نے معمولی ترمیم و تنسیخ کے بعد واپس بھیجدیا تھا جو کلکتہ کی فلم ویکلی "میں" کشمیر سے واپسی کے عنوان سے چھپا تھا۔ اسی رسالہ کے کسی دوسرے شمارہ میں راہی کی ایک اور نظم "سہارا" دیدے بھی چھپی تھی اور ان نظموں کو کافی پسند بھی کیا گیا تھا۔

جب ۱۹۶۴ء میں مجھ سے ملنے کے لئے یہ بروٹی آیا تو کشمیر کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ بنارس لکھنؤ دہلی، آگرہ اور پٹھان کوٹ وغیرہ شہروں میں دو دو تین تین دن ٹھہر کر کیسے ان لوگوں نے سیر کی تھی۔ پھر جموں اور سری نگر کے قیام کے دوران کیسے جھیلم کے کنارے ہاؤس بوٹ میں راتیں گذاری تھیں۔ جبکہ قمقموں کی روشنی سطح آب پر کہکشاں بن کے جگمگا اٹھتی تھی اور سارا شہر روشنیوں کا شہر نظر آتا تھا۔ پھر کشمیر کے بے پناہ حسن و جمال کا تذکرہ آیا جس کے بارے میں بجا طور پر امیر خسرو نے فرمایا ہے کہ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

پھر نشاط باغ، شالیمار، اور نہرو پارک کا ذکر آیا گل مرگ، کھلن مرگ اور سونا مرگ کے مرغزاروں کے چرچے ہوئے۔ ڈل جھیل اور چشمہ شاہی کی گفتگو ہوئی پھر ان برفستانوں کی بات چلی جو سورج کی کرنوں سے قوس قزح بن جاتے ہیں اور جو شومئی قسمت سے ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک کی جنگ کی آماجگاہ بنے ——— پھر شعر و سخن کے چرچے ہوئے اور یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس سفر نے ذہن شاعر پر بہت سے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں جو شعر کے قالب میں ڈھلنے کے لیے بے قرار ہیں۔

تھوڑے دنوں کے بعد ۱۹۶۵ء میں ایک صبح اور زرنگار لفافہ موصول ہوا۔ راہی کے والد محترم نے اپنے ہوشیار فرزند دلبند کی شادی میں شرکت کی دعوت کے ساتھ سہرا لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ تقاضہ اتنا سخت و شدید تھا: اور تعلقات اتنے گہرے اور استوار تھے کہ اسے بآسانی ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ چار و ناچار میں نے وقت مقررہ پر سہرا لکھ کر بھیجدیا جس کی کئی سو

کاپیاں پھولدار حاشیہ سے مزین رنگین کاغذوں پر
چھاپ کر برات میں تقسیم کی گئیں اور شہر در شہر بھیجی
گئیں ——— میں فرمائشی چیزیں لکھنے کا مطلق علوی
نہیں رہا ہوں۔ اگر کبھی ایسا موقع آ ہی گیا تو تقریب کے
اختتام پر ایسی تقریبی چیزوں کو سپرد آب کر دینے کا طرز
اختیار کیا جاتا رہا ہے مگر آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ
میرے مجموعہ کلام "آتشیں" کے صفحہ ۹۸ پر فلسفۂ شادی کے
عنوان سے ایک نظم درج ہے اور یہ تو سبین میں درج
ہے کہ "یہ تقریب شادی عزیزم غلام حسین راہی بھاگلپوری
——— اور اگر آپ یہ سوال کریں گے کہ اس مجموعہ
میں سہرے کو شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی تو میں
اب بھی وہی جواب دوں گا جو اسے ترتیب دیتے
وقت میں نے سنہ ۶۶ء میں دیا تھا

کہ ع اس آئینے میں خود کو جواں دیکھتا ہوں میں

جب سے میں دوسری بار بھاگلپور آیا ہوں
راہی اور بھی قریب تر آ گیا ہے۔ میرے سارے بچوں
کے لئے یہ غلام حسین بھیا ہے اور محلہ کے سارے لوگوں
کے لئے یہ پنچایت کا سکریٹری ہے اور آزاد ہیلتھ
ایسوسی ایشن کا جوائنٹ سکریٹری ہے اور ایک قابل
اعتماد اور منصف مزاج ثالث ——— عام حالات
میں بظاہر یہ سہل پسند سا نوجوان محلہ کا پہرہ دیتے ہوئے
مریضوں کی تیمارداری کرنے اور غریبوں کو انجکشن دیتے
ہوئے ادھر ادھر چلتا پھرتا ہوا نظر آئے گا لیکن ہنگامی
حالات میں اس کی جوانمردی، تندہی اور تنظیمی صلاحیت
نصف النہار پر نظر آئے گی۔ اس وقت این سی سی کی
باقاعدہ امتیازی ٹریننگ ہر قدم پر اسے سپاہیانہ توانائی
عطا کرتی ہے۔ مشکل سے مشکل حالات میں تنہا رہنے
پر بھی اسے کبھی ہراساں نہیں دیکھا گیا۔ چوتھے عام چناؤ
میں یہ اسحاق چک میں ایک پولنگ بوتھ پر پولنگ
ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ شام ہونے
سے کچھ پہلے یہ ایک دوسرے پولنگ ایجنٹ کو
چارج دے کر ووٹروں کو لانے جا رہا تھا کہ شدید
خشت باری شروع ہوئی۔ یہ اس سے بچ کر تیز تیز نکل
رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے سر پر لاٹھی ماری جو گردن پر
لگی اور یہ جھک گیا مگر پلٹ کر پیچھے دیکھا اور للکارا تو
مارنے والا مارے خوف کے لاٹھی چھوڑ کر بھاگ چکا
تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور پینترا بدلتے
ہوئے بے خوف بھیڑ سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی
کو سامنے سے حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن ایک
بڑا پتھر چہرے پر لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ ایک طرف
کا دانت اور منہ ٹوٹ چکا ہے اور خون کے فوارے
چھوٹنے لگے۔ لیکن اس عالم میں بھی یہ اپنی لاٹھی سے
کام لیتے ہوئے اور صرف سر بچاتے ہوئے خشت باری
کے طوفان میں تقریباً دو فرلانگ چل کر تنہا اپنے محلے
میں داخل ہوا تو سارے محلے کے لوگ امنڈ آئے۔ ساری
عورتیں اور مرد یوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے جیسے
ان کا اپنا بیٹا زخمی ہوا ہو۔ اگر چہ اس وقت بھی یہ دلاسا
دیتا جاتا تھا کہ کچھ زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے حالانکہ
جسم سے بہت خون نکل چکا تھا اس سے سب میں
بڑا عزم و حوصلہ آیا۔ لوگوں نے دفاعی تدابیر کیں اور
ٹھوس اتحاد کی راہ ہموار ہوئی۔

اس سے پہلے چینی جارحیت کے وقت بھی

اس نے بہت سی خدمتیں کمہر رائی ہیں اور رفاعی تدابیر کی مشقیں کرائی تھیں (ہند و پاک جنگ کے دوران میں بردی میں تھا) اس وقت یہ اپنے وارڈ کا وارڈن تھا۔ اسی طرح ہیضہ اور چیچک وغیرہ وبائی امراض کے زمانہ میں بھی یہ ہر گھر میں سب کو دلاسا دینے سب کی دوا خرید کر لانے اور خود تیمارداری کرنے سے لے کر کفنیا دفن تجہیز کرنے تک اور اگر کسی نے گھر میں کچھ نہیں ہے تو پیسہ چندہ مانگ کر علاج کرانے ورات دن کام کرنے کے لئے خود کو وقف کر دیتا تھا محلہ کا ہر شخص مرد عورت بوڑھا بچہ اسے اپنے گھر کا فرد اور اپنا راز دار سمجھتا ہے۔ اور آج تک اس نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔

بھاگلپور کے ادبی ماحول میں اس درخشندہ ستارے کا ورود یقینی ایک فال نیک ہے کلکتہ سے سری نگر اور راپچی سے بمبئی تک سینکڑوں شہروں اور دیہی علاقوں کی سیاحت نے موضوع سخن میں وسعت اور خیالات میں ندرت و رنگینی پیدا کی ہے۔ طبیعت نوخیز اور رومانی پائی ہے۔ ناکامیٔ محبت نے دل کو سوز و گداز اور لذت درد و غم سے آشنا کر دیا ہے اس سے تخیل کو قوت پرواز ملی ہے۔ لکھنے کا ڈھنگ بھی اچھا ہے اور پڑھنے کا انداز بھی موثر ــــــ قلم سے زیادہ وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ عمر کا تقاضہ ہو یا ماحول کا اثر ــــــ اس خوش طبع و خوش وضع، خوش اخلاق، خوش پوش، خوش فکر و خوش گو اور خوش کلام نوجوان کی انفرادیت کسی بھی مجمع میں پہچانی جا سکتی ہے یہ صرف گل تماشئے فردا ہی نہیں ثمر عہد حاضر بھی ہے۔ اس کی ہمعصر نوجوان اور آئندہ کی نسلیں اس کے طرز عمل اور حسن اخلاق سے عزم و حوصلہ حاصل کرتی رہیں گی۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اور عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔

بقیہ لہیری

ہونی چاہئے اور اتنے بڑے ملک میں ایسے روادار اشخاص کی کمی نہیں ہے جو علاقائی اور لسانی تعصب سے بالاتر ہوں۔ یہ نظریہ اردو زبان کی بقائے دوام کا ضامن بھی ہے اور معاون و مددگار بھی۔ ہری جی نے شعور بھاگلپوری سے فیض حاصل کیا ہے اور انہیں اپنا کلام دکھلاتے رہے ہیں لیکن رنگ آہنگ جداگانہ ہے۔ جناب شعور بھاگلپوری اس لحاظ سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہری جی جیسے جوہر قابل کو پرکھا اور گنجینۂ اردو کے لئے ایک در بے بہا فراہم کیا۔ اور ہری جی تو مبارک باد کے مستحق ہیں ہی انہیں کی طرح کے لوگوں سے تو شہر بھاگلپور اردو ہندی، گنگا جمنا کا پوتر سنگم پریاگ بنا ہوا ہے۔ میں ہری جی کے ایک مقطع پر اس مختصر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

انسان بن کے آیا ہے انسان بن کے رہ
تجھ کو ہری فریب میں پھنسنا نہ چاہئے

ذکی انجم

فن کے آئینے میں

از ـــــــ نصیب صدیقی (علیگ)

ادب ہماری تہذیبی زندگی کا ترجمان ہی نہیں آئینہ دار بھی ہے۔ اس سے نہ صرف فکر و نظر کی بے شمار راہیں کہکشاں کی مانند جگمگاتی رہتی ہیں۔ بلکہ ذوق و شعور میں نکھار اور تابناکی بھی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی فطرت حسن فطرت کی رنگا رنگ ساحرانہ ضیا باریوں سے حیات و کائنات کے خوابوں کی مختلف مگر حوصلہ افزا تعبیریں ڈھونڈنے کی سعی بلیغ کرتی ہے۔ اور اس طرح تصور زائیت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جسے ہم شعری عظمت اور فکری بلندی کے لئے شرط اول قرار دے سکتے ہیں۔

اردو شاعری میں غزل ایک بڑی دھان پان صنف سخن ہے۔ غزل کا ایک شعر بجائے خود ایک بحر بیکراں ہے۔ جس کی موجوں میں زندگی اپنی تمام تر توانائیوں متحرک اقدار، کیفیات و احساسات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے غزل کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فراق گورکھپوری نے کہا تھا " غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے یعنی حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ متاثرات کی ان ہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات یا محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کا صورت پکڑ لینا اسی کا نام غزل ہے " میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک اچھی غزل کے سننے کے بعد غیر شعوری طور پر منہ سے بیساختہ آہ یا واہ نکل جاتی ہے۔ اور اس طرح دو مصرعوں میں چھپا ہوا نشتر قاری کے دل میں ٹھیک اسی طرح اتر جاتا ہے جس طرح رات کے سینے میں شہاب ثاقب۔

ذکی انجم کی ذہنی اور فکری نشو و نما غزل کے ہی ماحول میں ہوئی ہے۔ اس لئے ان کے لہجے میں درد اور سوز و گداز کی نشتریت بھرپور ہے۔ ان کی نگاہیں دور افق کے پار تو سیر نہیں کر سکی ہیں۔ مگر اس کے بے کراں وسعتوں کے راز جاننے کی کوشش میں تندہی سے سرگرم عمل ہیں تخیل کی حسین وادی میں اترنے کے بعد بھی "گم کردہ راہ" نہیں ہیں۔ بلکہ واقعیت اور با مقصد جذباتیت کا دامن ہاتھ سے تھامے رہتے ہیں۔

ذکی انجم کا معشوق بھی مجاز کا معشوق ہے اور اسی دھرتی کا باسی ہے۔ اور اس کا خمیر بھی اسی آب و گل سے بنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند ستاروں کی تمنا کرنے کے باوجود ان کے قدم زمین پر ہی رہتے ہیں۔ دیکھئے کس قدر بولتا ہوا یہ شعر ہے۔

آنکھوں میں سمٹ آئی ہے اک حسن کی دنیا
دیوانہ لئے پھرتا ہے تنویر کسی کی

دولت دیوانگی سے بہرہ ور ہونا بڑی خوش نصیبی ہے

یہی ذوق دیوانگی شاعر کے دل کے اندر سیمابی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اسے اس تخلیقی عمل پر مجبور کرتا ہے۔ جو فکر و فن اسلوب و تخیل کے سانچے میں ڈھل کر شہ پارہ کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ یہیں سے اس کی انفرادیت کی کرنیں بکھرتی ہیں اور اسی مرکز سے آفاق الفاق اور جذبۂ عالمگیریت سے روشناس ہوتا ہے۔ مشاہدہ جتنا عمیق ہوگا، انداز بیان یا طرز اظہار اتنا ہی بلند اور شستگی کا حامل ہوگا۔

مومن نے تو دل کو زنجیر پہ ٹھہرانے کی بات کی ہے اور ذکی انجم نے بھی زلف گرہ گیر سے کھیلنے کی جرأت کی ہے انہی اس شعر میں دیکھئے ؎

دیوانۂ الفت تری اب خیر نہیں ہے
زنجیر میں ہے زلف گرہ گیر کسی کی

غم کی آنچ میں تپ کر ایک شاعر صحیح معنوں میں شاعر بن جاتا ہے اور حیات و کائنات کا ادراک و عرفان حاصل کرتا ہے۔ یہ غم جتنا ہی ارفع و اعلیٰ ہوگا شاعری بھی اپنے معیار فن کے اعتبار سے اتنی ہی بلند و عظیم ہوگی۔ اس کی دھیمی دھیمی آنچ قلب و نظر میں بے پایاں طمانیت آگیں اضطراب، سکون آشنا، کیفیت درد اور کیف آگیں تشنگی کا باعث ہوگی۔ کاروانِ شعور و احساس، کامرانی و ظفر مندی کی راہ پر گامزن ہوتا نظر آنے گا اور پھر ایک ایسی منزل ایک ایسی مرکزیت و اشاریت تک پہونچنے کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی۔ جسے ہم شاعرانہ گفتگو میں لطافت فن کہہ سکتے ہیں۔ غم کے اظہار میں متانت و وقار، سنجیدگی و صحت مند انفرادیت کا خیال ایک شاعر کو ضرور کرنا چاہیے کیونکہ داخلی تندی کرب احساس اپنی انتہا میں دلدوز بنت کی شکل بن جاتا ہے اور پھر شاعر اپنے ترسیل غم میں آفاقی نہیں ہو جاتا۔

وجدان کی انتہائی سادگی و نرمی سے غزل تخلیق کی منزلوں سے گزرتی ہے۔ کہیں جذبہ، کسک بن کر ایک ارتعاش خفی کی صورت میں منعکس ہوتا ہے تو کہیں احساس جمال اپنے نقطۂ عروج پر آکر دلکش اسلوب موزوں اور مترنم الفاظ کے جامہ میں اپنی سج دھج دکھاتا ہے۔ اور پھر شاعر جب اپنے خون جگر کے صرفہ سے رنگ و روغن عطا کرتا ہے تو شعریت و معنویت کے سانچے میں ڈھلتی ہوئی نظر آئیگی مختصر الفاظ کے در و بست میں گہرے تجربات و مشاہدات قوس قزح کی دھاریاں لے کر نمودار ہو جاتے ہیں زندگی حقیقی معنوں میں حقیقی بن جاتی ہے۔ دور رس نگاہیں محدود کو لامحدود کر دیتی ہیں اور ایک ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جو نہ صرف خالص درکی ہوتی ہے۔ بلکہ تمام داخلی حسیات و نفسیات کی مظہر اور محرک بھی۔ اس وقت کائنات کی وسعت ایک اکائی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور شاعر شیلے کے اس قول کا ہمنوا بن جاتا ہے کہ "شاعری بیک وقت تمام علوم کا مرکز و محیط ہے"۔ میں اس خیال کی ترجمانی جگر کے اس شعر سے کرنا چاہوں گا ؎

شاعر فطرت ہوں جب دم فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرہ ذرہ میں سما جاتا ہوں میں

شاعر جب قوت فطرت کے سربستہ راز کا اپنی باریک اور دوررس نگاہوں سے گہرا مطالعہ کرتا ہے تو اس کی بہت سی گرہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔ جو اسے بے پناہ سکون عشق بھی اور حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔ اس کا باریک بینی سے دنیا کو کوزے میں سمیٹ جاتا ہے۔ غزل کی

سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ اور اس نقطہ پر آکر غزل دوسری تمام صنف سخن سے خود کو نمایاں کرلیتی ہے۔ اپنے مزاج کا صحیح رخ متعین پاکر غم جاناں اور غم دوراں کو گلے لگاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

ذکی انجم رنگ و نور کی باتیں کرتے ہیں دیکھئے اس شعر میں نغمے کی دھیمی لے کا شعور اور ایک طرح کی دل کو تڑپا دینے والی خودگرفتگی کا عالم پنہاں ہے۔

شام سے ارمستار ہا تا صبح میخانے کا رنگ
چشم ساقی میں سمٹ آیا ہے پیمانے کا رنگ

ذکی انجم کے کلام میں روایتی شاعری کی چھاپ نمایاں ہے۔ اور وہی چند جانے پہچانے الفاظ سامنے آتے ہیں جو کوئی بلیغ مفہوم یا ندرت خیال کی نشاندہی نہیں کرتے ہیں کہیں کہیں فکری اور فنی خامیاں بے حد کھٹکتی ہیں ہوسکتا ہے انجم صاحب ریاضت فن کے معاملہ میں کسر نفسی سے کام لیتے ہوں۔ حالانکہ فن کا تقاضا ہے کہ فراخدلی کے ساتھ خون جگر صرف کیا جائے۔

ذکی انجم کے فکر و فن کا مستقبل تابناک ہے اور میں انہیں مستقبل قریب کی ضمانت سمجھتا ہوں۔

بقیہ حسن علی

حال میں مولانا نے ایک ناول "لیلیٰ" لکھا ہے ناول کی ہیروئن لیلیٰ نے مسلسل جدوجہد سے اپنے کالج میں حیرت انگیز اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کردیا۔ اس نے اس نے ایسی تحریک چلائی کہ اہم سماجی مسائل بھی آسانی سے حل ہونے لگے ناول کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔

"نسیم سحر" بھی اخلاقی ناول ہے ایک مخلص دوست کی درد انگیز کہانی ہے۔ ناول کے ہیرو اور ہیروئن کا معیار اخلاق بہت بلند ہے۔ غرض کہ مولانا کے سبھی ناول اخلاقی، تبلیغی، اصلاحی، اور مذہبی ہیں کیونکہ مذہب سے انکا گہرا تعلق تھا انہوں نے "تفسیر القرآن" نام کی ایک کتاب بھی لکھی ہے انکے مذہبی نظریے کا اثر انکے ناولوں پر نمایاں ہے۔

مولانا کی کردارنگاری اوسط درجہ کی ہے کوئی کردار زیادہ نمایاں اور انفرادی نہ بن سکا، "بڑی آپا" کا سریندر ہمارے ذہن پر اپنا نقش ضرور قائم کرتا ہے لیکن یہ مولانا کا تخلیقی کردار نہیں، دوسرے ناولوں کا بھی یہی حال ہے واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی انکے ناول بلند نہیں ان میں نہ جدت ہے اور نہ ندرت، قصہ کے اندر واقعات کا ارتقا تدریجی اور فطری نہیں اکثر حصے بڑے میکانکی ہیں اس لئے پلاٹ میں گٹھن پیدا نہ ہوسکی۔

مختصر یہ کہ مولانا کی ناول نگاری معیاری نہیں اکثر ناول دوسرے ناولوں سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہیں لیکن ہم انکے ناولوں کو نظرانداز نہیں کرسکتے کیونکہ یہ اس دور میں لکھے گئے جب سیاسی اور سماجی بے اطمنانی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور مولانا سیاسی تحریک میں سرگرم تھے

از :- نصیب صدیقی (علیگ)

ذکی انجم

شہر بھاگلپور کی ادبی تاریخ میں جہاں ماضی اپنے تمام فکری و فنی جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے وہیں حال بھی ایک تابناک مستقبل کی نمائندگی کرتا ہے اور اسی حال کے افق پر کچھ ستارے آفتاب بننے کی تمنا میں نہ صرف سرگرم عمل ہیں بلکہ اس کے لئے نئے آسمان و زمین کی تخلیق کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اس شہر کا ماحول قوس و قزح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں مختلف محلے ہیں جو انفرادی رنگ و آہنگ رکھنے کے باوجود ایک بے نام قدر مشترک سے منسلک و مربوط ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ روایت کے جانے پہچانے اٹوٹ سلسلہ کی کڑی کا بھی درجہ رکھتے ہیں۔ محلہ کبیر پور اپنے سینہ میں سوز و گداز کی وہ تمام کیفیات رکھتا ہے جس کا سہرا ایک مرد متقی و مجاہد ملت نام نامی جناب شاہ کبیر صاحب کے سر ہے جنہوں نے اسے اپنے ہی اسم گرامی پر منسوب کیا اور آج بھی آپ کا مزار اقدس محلہ کے مشرقی جانب ملحق جامع مسجد مرجع خاص و عام ہے۔

درج بالا محلہ کا ذکر خصوصاً اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں کے ایک نوجوان اور ابھرتے ہوئے فنکار سے آپ کو متعارف کرایا جائے۔ قد متناسب، چہرے پر ہر وقت پھول کی سی شگفتگی برقرار رکھنے کی عادت سی، پان سے بے انتہا شوق اور دانتوں پر جمی ہوئی رنگینی اس کا غماز ذکی ہونے کا اعتراف، سر کے بال الجھے ہوئے اور سینہ کی سطح کی طرح سپاٹ۔ دبلا پتلا جسم بھلا ہونے کا واضح ثبوت۔

میرا خیال ہے کہ اوپر کے چند جملوں سے جو تصویر بنی ہے آپ یقیناً اس میں ذکی انجم کی شخصیت کے بیشتر خد و خال نمایاں پائیں گے۔ جس میں ظاہرداری اور روایتی تکلفات کے بجائے خلوص اور نیک نیتی کو دخل ہوگا کسی بھی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کے لئے جہاں بہت سے فطری عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہیں فرد کی ذات اور ماحول کا رنگ و مزاج بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ذہنی نشو و نما کا واضح رخ متعین ہوتا ہے بلکہ وہ تمام شعوری اتار چڑھاؤ جو ایک صحیح مقصدیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں از خود "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کا مصداق ٹھہرتے ہیں۔

ذکی انجم کی پیدائش مورخہ ۲۸ر جون ۱۹۳۱ء یوم شنبہ کو ایک متوسط خاندان میں ہوئی بچپن میں آپ کے دل و دماغ پر بھوت پریت، جنوں، پریوں کے افسانوں کا گہرا اثر رہا جس کی وجہ سے انتہائی خوف زدہ رہا کرتے تھے پختگی سن و شعور کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں بھی واہمہ کی دلفریبیاں قرار پائیں۔ آپ کے والد بزرگوار جناب محمد یعقوب صاحب مرحوم نے مکتب کی راہ دکھائی اور آپ کو مولوی حبیب صاحب مرحوم کے حوالے کر دیا گیا۔ تاکہ وہ مناسب تربیت دیں۔ ۱۹۴۲ء کے ہنگامہ خیز دور میں آپ نے محلہ کے ایک اپر پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی تعلیم کا کچھ وقت مقامی ہائی

اسکول میں گزارا۔ اسپورٹس سے گہری دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ خاص طور سے فٹ بال اور بیڈ منٹن سے تو عشق ہی تھا۔ اسی دوران آپ کی شادی بھی ہوگئی جس کا ناخوشگوار نتیجہ نکلا کہ میٹرک کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بعد میں سخت محنت و ریاضت کے بعد ۱۹۵۱ء میں کامیاب ہوگئے۔ مگر تمام پرچوں میں امتیازی نمبر نہ لانے کی وجہ سے کالج کے سائنس کے شعبہ میں داخلہ نہ مل سکا اور پھر ناساعد حالات نے تلاش معاش کے سلسلہ میں تلخ تجربوں سے دو چار کیا۔ ملازمت کے سلسلہ میں کئی جگہوں کو دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اور آج آپ ایک ڈرافٹسمین کی حیثیت سے مقامی ضلع بورڈ آفس بھاگلپور میں اپنے فرائض بڑی تندہی سے انجام دے رہے ہیں۔

ذکی انجم شعر و شاعری کا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ آپ کے عموں جناب ریاضت حسین ریاض مرحوم خود بھی شاعر تھے اور قصیدہ گوئی میں خاصا شغف تھا۔ انھیں کے فیض تربیت نے ذکی انجم کے فکر و فن کو جلا بخشی ساتھ ہی ساتھ جناب ناصر علی صاحب ناصر انھیں فکری و فنی رموز و ایما سے آگاہ کیا جناب قمر الہدیٰ صاحب مفتاحی، جناب قمر الزماں صاحب اختر، جناب عاشق حسین صاحب عاشق نے بھی ان کے فن کو سنوارنے میں کافی سے زیادہ حصہ لیا اس طرح مسلسل نگہداشت و پرداخت نے ذکی انجم کے مزاج میں ایک ایسا رکھ رکھاؤ اور سوجھ بوجھ پیدا کر دی جس کی روشنی میں وہ منزل تک پہونچنے کی حد درجہ سعی کر رہے ہیں۔ دیا اور بات ہے کہ منزل تک پہونچنے میں کبھی کبھی فریب منزل بھی کھانا پڑتا ہے۔ لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ میر کارروان پر سے اعتماد اٹھ گیا ہو اور غبار کارروان کو نقش منزل متصور کر لیا جائے۔

ذکی انجم ایک زندہ دل انسان ہیں اور اس کا واضح ثبوت وہ خصوصی نشستوں میں برابر دیتے رہتے ہیں۔ غزلیں ترنم سے پڑھتے ہیں۔ اچھے شعر پر خوب خوب داد و خراج وصول کر لیتے ہیں۔ روزمرہ کے تجربات کو غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ کم گو ضرور ہیں مگر موقع و محل دیکھ کر ایک آدھ چبھتا ہوا جملہ رکھ ہی دیتے ہیں۔ دوست ہوں یا دشمن سب سے کھلے دل سے ملنا آپ کی شخصیت کا امتیازی وصف ہے۔ طبیعت میں انکساری، خلوص اور محبت کا عنصر بدرجۂ اتم ہے۔ جب کبھی اور جہاں بھی ملتے ہیں ہنستے ہوئے ملتے ہیں۔ ذکی اسم بامسمیٰ ہیں۔ اظہار خیال میں خوش سلیقگی نمایاں ہوتی ہے۔ بناوٹ اور تکلف سے انتہائی گریزاں رہتے ہیں۔ دل دریا رکھتے ہیں اگرچہ غم روزگار سد راہ ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں خودداری، عزت نفس، انسانیت دوستی، منکسر المزاجی اور وفا پرستی، جاں دادہ و دل دادہ ــــ اقبال کے اس شعر کا عملی نمونہ ہیں۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ذکی انجم انفرادی اور سماجی زندگی میں امتزاج کے قائل ہیں۔ ذہن و دل میں قدرت نے جو یکسانیت رکھ دی ہے وہ انھیں بھٹکنے نہیں دیتی یہی وجہ ہے کہ ان کی عملی زندگی کے آدرش، آدرش ہوتے ہیں۔ جن پر انھیں یقین بھی ہے اور ایمان بھی۔ آج کا نوجوان خود کو اس موڑ پر پاتا ہے جہاں فرسٹریشن، بیزاری، بے اطمینانی، بے چینی، الحاد، لامرکزیت، انتشار اور پراگندگی کا شکار ہے۔ مگر یہ شکر کا مقام ہے کہ ذکی انجم کا مزاج ان عصری بے راہ رویوں سے پاک ہے۔ زمانہ کی تلخیوں نے جہاں آپ کو خود بین و سنجیدہ بنا دیا ہے۔ وہیں وہ تمام ارفع انسانی خصوصیات عطا کی ہیں۔ جس کا ذکر اوپر کے سطور میں آچکا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تلاش معاش کا چکر اور پھر ایک طویل کشاکش زمانے کے سرد و گرم آنچ لئے ہوئے۔ مگر ذکی انجم نے متحمل

دو ادبی شخصیتیں!

حسن علی اور شائق احمد عثمانی

ڈاکٹر آصفہ واسع

بھاگلپور کے ادبی ماحول اور شخصیتوں کو اجاگر کرنے کی سعی قابل تحسین و ستائش ہے۔ بہت سی ادبی شخصیتیں جو ماضی کی اندھیری قبروں میں پڑی سو رہی ہیں منظر عام پر آسکیں گی۔ عام طور پر اردو داں طبقے کی نگاہ بہار پر نہیں پڑی ہے اور اگر کہیں نگاہ پڑی بھی تو عظیم آباد اور اس کے قرب و جوار پر۔ گرچہ اردو ادب عظیم آباد، آرہ اور گیا کے تہذیبی مثلث کے باہر بھی پرورش پاتا رہا اور دوسرے خطوں نے بھی اردو ادب کی ترقی اور تہذیب میں ہاتھ بٹایا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ فنکار حرص و ہوس کی دنیا سے بیگانہ تھے اور اپنے کو منظر عام پر لانے کی تمنا نہ رکھتے تھے۔

ہم یہاں بھاگلپور کی دو ایسی ہی ہستیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو شہرت کی دنیا سے دور رہیں، منشی حسن علی کو زمانہ بھول چکا ہے اور مولانا شائق احمد عثمانی ہم سے جدا ہو کر کراچی میں جا بسے ہیں۔ انہیں ناول نگار کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں گرچہ اس صدی کے اوائل میں انکے چار ناول شائع ہو چکے تھے۔

منشی حسن علی شہر بھاگلپور کے رہنے والے تھے، شاد عظیم آبادی نے انہیں "مسلم مشنری" لکھا ہے کیونکہ تبلیغ اسلام کے لئے وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا کرتے تھے، خصوصاً مشرقی خطہ میں عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے ان کے مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے۔ احمدیہ تحریک کو انہوں نے وسعت بخشی اور بھاگلپور میں انہیں کی کوششوں سے سلسلہ احمدیت کو فروغ ہوا۔ یہ اہل قلم تھے ان کی ایک مذہبی تصنیف "تائید حق" بھاگلپور احمدیہ مسجد لائبریری میں موجود ہے، انہوں نے ہی سنہ ۱۸۹۰ء میں جون فورسٹر کی کتاب "ڈسیشن آف کریکٹر" کا ترجمہ "نوٹ فیصلہ" کے نام سے کیا تھا۔ یہ گورنمنٹ ایڈ دہائر کلاس انگلش اسکول شہر پٹنہ میں معلم تھے۔ یہ وہ دور تھا جب عظیم آباد میں شاد عظیم آبادی کی دھوم تھی اور پورا شہر ادبی دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولوی حسن علی بھی ادبی ذوق رکھتے تھے، لہٰذا شاد عظیم آبادی اور محمد اعظم سے ان کے تعلقات قائم ہوئے اور شاد کو ناول "ولایتی کی آپ بیتی" اور "صورۃ الخیال" لکھنے کی ترغیب حسن علی نے دی۔ شاد عظیم آبادی "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" صفحہ ۱۵۳ پر لکھتے ہیں۔

...... حسن علی مرحوم .... کے ترغیب دینے اور اسلوب بتانے پر اندر انام بنگلہ کے ناول سنانے پر سید صاحب نے بھی سنہ ۱۸۷۶ء میں ایک ناول لکھا۔

منشی حسن علی بنگلہ زبان و ادب سے آشنا تھے۔ اس زبان میں فن ناول نگاری کافی ترقی کر چکا تھا۔ اور مشرقی خطہ میں خصوصی طور پر بنگلہ ناولوں کی دھوم تھی،

سید علی محمد شاد کا ناول "صورۃ الخیال" بنکم چندر چٹرجی کے ناول

''اندرا'' کا کافی اثر ہے اور دونوں میں بہت سی مشابہتیں اور مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

محمد اعظم کو بھی حسن علی نے ہی ناول نگاری کی طرف رغبت دلائی محمد اعظم لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی کے باشندہ تھے اور انکا دعویٰ تھا کہ ''صورۃ الخیال'' انہوں نے ہی لکھا تھا اور شاد کو اصلاح کیلئے دیا جسے شاد نے اپنے نام سے شایع کرا دیا، بہرکیف، یہ بحث ہمارے اس مضمون کے دائرے سے باہر ہے'' ناول ''نقش طاؤس'' محمد اعظم اور منشی حسن علی کی مشترکہ تصنیف ہے اور یہ بھی بنگلہ ناول کا چربہ کہا جاتا ہے کیونکہ ''نقش طاؤس'' جو ۱۸۸۱ء میں شایع ہوا اسکے سرورق پر نام کے بعد یہ عبارت درج ہے۔

'' جگلا نگری بنگلہ زبان کا ناول اس نئے اور خوب صورت لباس میں منشی حسن علی صاحب اور منشی محمد اعظم صاحب کی کوشش سے ناظرین کی خدمت میں ہدیہ ہے''

بنگلہ ناول ''جگلا نگری'' مجھے نہ مل سکا۔ بنگلہ زبان و ادب سے واقفیت رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جگلا لفظ بنگلہ زبان سے مناسبت نہیں رکھتا، اور بنگلہ میں لفظ نگری نہیں بلکہ نگر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرا ناول ''سجاد سنبل'' بھی ان دونوں بزرگوں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ لیکن پروفیسر سید حسن صاحب اپنے مضمون ''بہار کا ایک گمنام مصنف ــــــ مولوی حسن علی'' میں جو ۱۹۶۲ء کے ''اشارہ'' پٹنہ میں شایع ہوا تھا لکھتے ہیں کہ ''سجاد سنبل ایک ڈرامہ ہے جو پنڈت کیشو رام بھٹ کے نام سے ۱۸۷۷ء ہوا .... رسم خط بنگلہ ہے .... یہ کتاب اردو رسم خط میں نہیں چھپی''

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کیشو رام بھٹ کی صحبت میں حسن علی نے برسوں گذارا تھا لہٰذا سجاد سنبل ڈرامہ ہو، یا ناول، خواہ کسی کا لکھا ہو، بہت ممکن ہے منشی حسن علی نے ہی اسکا پلاٹ بنایا ہو، یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ گرچہ ''صورۃ الخیال''، ''نقش طاؤس'' اور ''سجاد سنبل'' مختلف مصنفوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں لیکن ان میں کچھ نام مشترک ہیں مثلاً کواکھوہ کا ذکر ''صورۃ الخیال'' میں بھی اور ''نقش طاؤس'' میں بھی۔ نام محمود ''نقش طاؤس'' اور ''سجاد سنبل'' دونوں میں ہے راج محل کا تذکرہ ''سجاد سنبل'' اور ''صورۃ الخیال'' میں ہے۔

مختصر یہ کہ ان شہادتوں کی بنا پر ہم حسن علی کو ان کتابوں کا مصنف تو تسلیم نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان تینوں کتابوں کے پس پردہ حسن علی کا ہاتھ ضرور تھا اور انہوں نے ہی ان مصنفوں کو بنگلہ ناولوں کی طرف متوجہ کیا اور پلاٹ سنا سنا کر ناول لکھنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے خود آزادانہ طور پر کوئی ناول نہ لکھا پلاٹ بنانا الگ ہے اور تصنیف کا کام اس سے مختلف پھر بھی حسن علی کے اہل قلم ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، وہ اس لحاظ سے بھی قابل ستائش ہیں کہ اردو میں ناول نگاری کی طرف انہوں نے اس وقت اہل قلم کی توجہ مبذول کرائی جب کہ اردو میں اس فن کی ابتدا ہوئی تھی۔ شاد عظیم آبادی کے ''صورۃ الخیال'' سے قبل اردو میں چند ہی ناول شایع ہوئے تھے، مولوی نذیر احمد کا پہلا ناول ''مرآۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں شایع ہوا تھا اور اب تک اسے اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے، اگرچہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کا کہنا ہے کہ ''خط تقدیر'' مصنفہ مولوی کریم بخش جو ۱۸۶۲ء میں شایع ہوا، اردو کا پہلا ناول ہے، خط تقدیر'' کو فنی نقطۂ نظر سے ناول کہنا بحث کا موضوع ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔

بھاگلپور کے ایک دوسرے فنکار مولانا شائق احمد عثمانی ہیں، اردو دنیا انہیں ایک صحافی کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ناول نگار بھی ہیں اور شاعر

بھی، چونکہ وہ شہرت کی دنیا سے الگ رہے اس لئے ہم انکی تمام حیثیتوں سے واقف نہ ہو سکے۔ شایق احمد صاحب کی پیدایش ۱۹۰۴ء میں قصبہ پوریني ضلع بھاگلپور میں ہوئی تھی۔ ان کا آبائی وطن محلہ مشائخ چک بھاگلپور شہر میں ہے لیکن پوریني میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انکے والد کا نام مولوی رافق علی اور دادا کا نام مولوی کاظم علی تھا۔

انکی شادی سگے ماموں مولوی منت حسین صاحب کی صاحبزادی بی بی وصیف فاطمہ سے ہوئی تھی جن سے چار اولادیں ہیں سب سے بڑی ایک لڑکی رضیہ سلطانہ اور تین لڑکے محمود شوکت عثمانی، مسعود احمد عثمانی، مسعود یوسف ہیں۔

ابتدائی تعلیم پوریني میں ہی مولوی اعزاز علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے پائی۔ پندرہ سال کی عمر میں دیوبند چلے گئے جہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ۱۹۱۳ء میں واپس آئے اور ایک مولانا عبیداللہ سندھی کے پاس دہلی میں رہے۔ دو سال علی گڑھ میں رہے اور ۱۹۱۸ء میں مونگیر سے ایک ہفتہ وار اخبار "سبیل الارشاد" نکالنا شروع کیا، لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور اسی سال کلکتہ چلے گئے جہاں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے سبب گرفتار ہو کر تین ماہ جیل میں رہے، کلکتہ سے اردو کا مشہور اخبار "عصر جدید" جاری کیا ۱۹۴۸ء تک کلکتہ میں رہے اور بعدہٗ کراچی چلے گئے، ۱۹۵۱ء میں "عصر جدید" کو دوبارہ زندہ کیا جو ۱۹۵۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ اب بھی صحت کی خرابی کے باوجود تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہیں اور حال میں کئی ناول بھی لکھے ہیں۔

اوئل بیسویں صدی کے لکھے ہوئے مولانا کے چار ناول "چاند تارا" "بشریٰ آپا" "دوست کی بیوی" اور "بزم آرا" مجھے ملے یہ چاروں کتابیں عصر جدید پریس کلکتہ سے شائع ہوئی ہیں لیکن ان پر نہ سنہ اشاعت درج ہے نہ مصنف کا نام، پبلشر کا نام، ایس، اے عثمانی ہے۔ بھاگلپور کے مقامی لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ناول مولانا نے ہی لکھا ہے۔ مولانا شائق احمد اور علامہ جمیل مظہری کے روابط کا علم مجھے ہو چکا تھا کیونکہ جمیل صاحب بہت دنوں تک عصر جدید سے منسلک رہے تھے اس لئے ان ناولوں کے متعلق میں نے جمیل صاحب سے دریافت کیا۔ انہوں نے بھی تصدیق کی اور بتایا کہ یہ ناول میرے سامنے ہی مولانا نے لکھا تھا۔

اسی دوران مولانا کا موجودہ پتہ مجھے معلوم ہوا۔ لہٰذا میں نے براہ راست ان سے حقیقت پوچھی میرے خط کے جواب میں لکھا کہ یہ ناول انہوں نے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء کے درمیان یکے بعد دیگرے لکھے تھے جو پہلے عصر جدید میں قسط وار شایع ہوئے۔ بعد میں احباب کے اصرار پر انہیں کتابی صورت بخشی گئی، اپنا نام ان کتابوں پر اس لئے درج نہ کیا کہ وہ جس جماعت سے تعلق رکھتے تھے اس کے ایک فرد ہونے کے وجہ سے ناول کے ساتھ اپنا نام دینا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ یہ ناول اخبار میں لکھے گئے تھے، زبان و ادب کی طرف توجہ نہ دی گئی اس لئے تحریری معیار زیادہ بلند نہیں، انکا مشغلہ تو اخباری اور عملی سیاست تھا، ادب و زبان کی باریکیوں پر غور کرنے کی فرصت نہ تھی، اس لئے ان میں جا بجا خامیاں ملتی ہیں۔

ان چار ناولوں کے علاوہ بھی اس اخبار میں مولانا کے کچھ ناول شایع ہوئے جن میں ایک کا نام "موہنی" تھا۔ یہ ناول "عصر جدید" کے اوراق کے ساتھ ماضی میں دفن ہو گئے۔ کراچی جانے کے بعد دو ناول "نسیم السحر" اور "لیلیٰ" کے نام سے لکھے

گئے۔ ناول نگاری کے ساتھ ہی وہ شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے گرچہ اصطلاحی معنوں میں وہ شاعر نہیں، چونکہ سیاست سے انکا گہرا تعلق تھا اور قوم کی محبت سے دل لبریز تھا اس لئے بہتری قومی نظمیں لکھیں جو کراچی کے اخبارات میں شائع ہوا کرتی تھیں، چند غزلیں بھی کہی ہیں چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

گل تو چاک داماں ہے نالہ ہائے بلبل سے
کاش تم بھی سن لیتے آہ شب کبھی میری
انکے آتے ہی آنے بند ہوگئیں آنکھیں
جانے کیا تمنا تھی ہائے آخری میری
کون سی یہ منزل ہے یہ خبر نہیں مجھکو
اب خوشی ہے غم میرا یا ہے غم خوشی میری
سن کے داستاں میری آج رو دئے وہ بھی
ایک آرزو پوری آج ہو گئی میری

شائق احمد عثمانی سرت چندر کے ہم عصر ہیں۔ سرت چندر کی زندگی کا ابتدائی حصہ اپنے ماموں کے گھر محلہ مشائخ چک بھاگلپور میں گذرا ہے۔ مولانا بھی یہیں کے رہنے والے تھے اس لئے ان کے ناولوں پر سرت چندر کا بہت زیادہ اثر پایا جاتا ہے ہمارا خیال ہے کہ سرت چندر کی صحبت سے ہی مولانا کو ناول لکھنے کا خیال آیا اور انہوں نے بنگلہ ناول کے طرز پر ناول لکھنا شروع کیا۔

"بڑی آپا" سرت چندر کے ناول "بڑی دیدی" اور رابندر ناتھ ٹیگور کے "نوکا ڈوبی" کا گویا آمیزہ ہے قصہ کی ابتدا "بڑی دیدی" کے رنگ پر ہوئی ہے اور وسط تک اسکا پلاٹ "بڑی دیدی" سے بہت مشابہت رکھتا ہے لیکن مصنف نے محض اسی پر اکتفا نہ کیا۔ وسط کے بعد اسے نیا موڑ دیکر "نوکا ڈوبی" کے طرز پر آگے بڑھایا اور خاتمہ "نوکا ڈوبی" کی طرح ہوتا ہے۔ مصنف نے دونوں کتابوں کو ہم آہنگ کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن کچھ انمل بے جوڑ باتیں پیدا ہوگئی ہیں کرداروں کے ارتقا میں خامیاں نظر آتی ہیں کیونکہ مذکورہ دونوں ناولوں کی کردار نگاری مختلف ہے۔

"چاند تارا" ایک تبلیغی ناول ہے جس میں اسلام کی خوبیوں اور عظمت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک مقصدی اور اصلاحی قصہ ہے اسکا ہیرو چاند ایک مسلمان کا لڑکا ہے اور تارا اسکے ہندو مالک کی لڑکی جو غیر شعوری طور پر چاند سے محبت کرنے لگتی ہے۔ کافی پیچ و خم کے بعد تارا نے اسلام قبول کر لیا اور چاند سے شادی ہو گئی۔

"دوست کی بیوی" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی کسی بنگلہ زبان کی بنیاد پر لکھا گیا ہے اس میں بنگالی تہذیب کی تصویر کشی ہے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "بندھو ر بو" (دوست کی بیوی) نام کا ایک غیر معروف ناول بنگلہ زبان میں ہے لیکن بہت تلاش کے بعد بھی ہمیں یہ کتاب نہ ملی، اس لئے کوئی فیصلہ قطعیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں قیاس یہ ضرور کہتا ہے کہ اس کے پس منظر میں بنگلہ کا کوئی ناول ضرور ہے یہ بھی ایک مقصدی ناول ہے مصنف ہم پر واضح کرنا چاہتے ہیں کہ سنی سنائی باتوں پر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے

"بزم آرا" کا ماحول ان تینوں کتابوں سے قدرے مختلف ہے گرچہ یہ بھی مقصدی اور اصلاحی رنگ لئے ہوئے ہے اصلاحی پہلو یہ ہے کہ بری صحبت سے دامن بچانا چاہیے برے وقت میں دوست احباب کام نہیں دیتے اچھے وقت کے سب ساتھی ہوتے ہیں ناول کا ہیرو ڈاکٹر یوسف کے جیل جانے پر نہ تو کوئی ان کی خبر لیتا ہے اور نہ گھر والوں کی۔

باقی صفحہ ۸

اخلاق حسین غالب پورہ آگرہ

بشمبر داس لہیری کا فن

شاعر پیدا ہوتا ہے۔ بنتا یا بنایا نہیں جاتا سچ پوچھئے تو شاعروں کا اس وقت بھی وجود تھا جب انسان کو بولنا نہیں آتا تھا۔ جیسے جیسے الفاظ بنتے گئے اور انسان اپنے خیالات و محسوسات کو اپنے جیسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی صلاحیت حاصل کرتا گیا ویسے ویسے شاعری بھی آگے بڑھتی گئی۔ آج بھی سینکڑوں بولیاں ایسی ہیں جنہیں زبان کا درجہ ہنوز نہیں ملا ہے۔ یعنی ان بولیوں کا نہ تو جانا دادب وجود میں آیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی رسم الخط ہے پھر بھی ان بولیوں میں شعر کہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس حقیقت سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے نہ کہ بنتا یا بنایا جاتا ہے اب کسی شاعر کی قدر و منزلت کا درجہ متعین کرنا ہو تو ضروری ہوتا ہے کہ جس زبان میں وہ شاعری کر رہا ہے دیکھنا یہ ہوگا کہ معیاری طور پر اس کو جانتا ہے یا ابھی اس کا ذہن یا صلاحیت خام ہے شعر گوئی میں عروج حاصل کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ شاعر کا دل کسی حادثہ سے مجروح ہو جائے وہ حادثہ عشق کا ہو یا کسی قسم کا۔ دکھی دل کی آواز سننے والوں کے لئے دلکش اور دلربا ہوتی ہے۔ اسی لئے فارسی اور اردو کے شعراء نے اصناف سخن میں اس صنف کا نام غزل رکھدیا ہے جس میں محبت اور اس کے رد عمل میں درد، دکھ، تکلیف، رنج، کرب، بے چینی کا بیان ہوتا ہے جب کوئی ہرن شکاری کو دیکھ کر بھاگتا ہے اور کسی جھاڑی یا کسی شکنجے میں پھنس جاتا ہے جہاں سے ہزار کوشش کے باوجود وہ نکل نہیں سکتا تو انتہائے کرب میں چیختا ہے اس کی چیخ سننے والوں کیلئے سحر کن ہوتی ہے اس چیخ کا نام غزل ہے لہٰذا غزل جیسی صنف سخن کا نام بھی اسی اعتبار سے متعین کیا گیا ہے۔

شری بشمبر دیال لہیری نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۴۷ء کے فسادات کو نہ صرف دیکھا ہے بلکہ اس آگ کی دھاں لہیری صاحب کے دامن سکون تک پہنچی ہے جس سے مجبور ہو کر وہ وطن سے بے وطن ہوئے ہیں کسی پودے کو ایک جگہ سے اکھاڑ کے جب دوسری جگہ نصب کیا جاتا ہے تو اس عمل کا شدید رد عمل اس پودے پر پڑتا ہے۔ ایک ایک پتہ گل گل کر گر جاتا ہے اور کافی دنوں کے بعد اس سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس طرح آپ اگر اسی چمن میں ایک پودا کو اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ لگا دیں اور اسی قسم کے ایک دوسرے پودا کو اپنی جگہ پر رہنے دیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ دونوں کے نشو و نما میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دوبارہ نصب کیا ہوا پودا بجائے اس پودے سے کمتر ہوگا جس کو اکھاڑا نہیں گیا تھا۔ بشمبر دیال لہیری گلشن انسانیت کا وہ پودا ہیں جس کو بے رحم ہاتھوں نے ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ نصب کر دیا ہے۔ یہ حادثہ ایسا عظیم ہے کہ جس کا اثر لہیری کے دل پر ہونا لازمی تھا یہی وجہ ہے کہ لہیری کی فطری شاعری کے آہنگ میں سوز ہی سوز ملتا ہے۔ اس حادثہ نے اس وقت لہیری کو

پنے لپیٹ میں لیا جب وہ باشعور ہو چکے تھے۔ اس لئے غم و غصہ کا عنصر غالب نہ آسکا۔ اس کی جگہ پر دلسوزی، دلگدازی، دردمندی، انسان دوستی، محبت، اخوت، بھائی چارگی کے جذبات نے لہیری کو ایک سنجیدہ اور حق گو انسان اور شاعر بنا دیا۔ ان کی نظموں اور غزلوں کو پڑھئے میل ملاپ، محبت بھائی چارگی کا درس قدم قدم پر آپ کو ملے گا۔ فرقہ پروری، ذات پات اونچ نیچ، مذہب بیزاری ان تمام بیماریوں سے لہیری کا ذہن اور فن دونوں پاک ہیں۔ پنجاب کی سرزمین نے جہاں اس خطے کے رہنے والوں میں جوانمردی بلند حوصلگی، خودداری، خود اعتمادی کا جذبہ عطا کیا ہے، وہیں شعر و ادب کے پودے کی آبیاری کا سلیقہ بھی قدرت کی طرف سے ان کے حصہ میں آیا ہے۔ ... سرزمین اقبال، ہیر رانجھا اور وارث علی شاہ کی سرزمین کا رہنے والا کتنا بلند مرتبہ ہوگا اس کا اندازہ ہر سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان خود کر سکتا ہے۔ لہیری میں یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ لہیری کے خیالات کی بلندی اور پاکیزگی پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ فن جس کا معیار ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور جس کی قدروں میں انقلابات آتے رہتے ہیں ہر جدید تھوڑے عرصہ میں قدامت کے غار میں چلا جاتا ہے اور قدیم پھر نئے سرے سے جدید بن کر جلوہ گر ہوتا ہے اس کو اگر کسوٹی بنا کر کسی کے فن کو پرکھا جائے تو پرکھنے والے کی زیادتی ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک فطری شاعر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کیسے ہیں اگر انسانیت کے لئے مفید ہیں تو شاعر کا مرتبہ بھی یقیناً بلند ہے اور اگر انسانی برادری کے لئے اس کی فکر ضرر رساں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو فنکار تسلیم کریں۔ مٹی کے پیالے میں اگر امرت ملے تو لاکھوں درجہ بہتر ہے اس جام جم سے جس میں کوئی زہر بھر کر دے۔ لہیری شراب محبت سے خود سرشار رہے اور وہ بلاتخصیص مذہب و ملت رنگ و نسل سب کو محبت کی شراب اپنے جام میں پیش کرتے ہیں حقیقت میں نگاہوں کے لئے شراب محبت ہی قابل قدر شئے ہے نہ کہ جام جس میں انڈیل کر یہ بادۂ گلنار پیش کیا جا رہا ہے۔ لہیری صاحب کی شاعری کو مستحسن نظر سے نہ دیکھنا بے انصافی ہوگی۔ مالک حقیقی کے وجود اور اس کی قدرت کاملہ پر لہیری صاحب کو کتنا یقین ہے۔ وہ اس شعر سے خود عیاں ہوتا ہے۔

جلوہ ہے اس کا ہر جا ظاہر ہے کل جہاں سے
قدرت کے بھید کوئی پائے بھلا کہاں سے

لہیری صاحب پر آزمائش کے جو پہاڑ ٹوٹے ہیں اس کا تقاضا تھا کہ ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا اور یہ بہکی بہکی باتیں کرتے لیکن دیکھئے کس سنجیدگی سے شکایت زمانہ کر رہے ہیں۔

مالی تیرے چمن میں کب آئیں گی بہاریں
تنگ آگئی ہے بلبل اس دور میں خزاں سے

اردو ادب میں ہندوستانی فضا اب کوئی عنقا سی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ دیومالائی تلمیحات کا بھرپور استعمال فراق سے بڑھ کر کسی اور نے نہیں کیا ہے مگر ذرا بشمبر دیال لہیری کے اس شعر کو دیکھئے اور ان کے حسن عقیدت کی داد دیجئے۔

کیا تھی مجال راون لے جاتا جو اٹھا کر
رکھتی قدم نہ باہر سیتا اگر نشاں سے

لہیری صاحب کو خدا پر بہت بھروسہ ہے اور وہ دنیا کی ساری برائی کو دور کرنے کا طریقہ یہی سمجھتے ہیں کہ لوگ خدا کے وجود پر ایمان لے آئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہبی عقائد پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ گیتا میں کرشن جی کی زبان سے خدا کہلوا رہا ہے کہ جب جب دھرم کی ہانی ہوتی ہے میں خود اس کو دور کرنے کے لئے آتا ہوں اس اشلوک کو مدنظر رکھتے ہوئے لہیری صاحب کا یہ شعر پڑھئے۔

دنیا سے دور اس دن ہو جائیگا ہیلر
چمکیگا نور حق کا جب پردۂ نہاں سے

دیکھئے کس حسین انداز میں بغیر کسی کی طرف روئے سخن کئے ہوئے لہیری صاحب اہل ستم کا شکوہ بھی کر رہے ہیں

اور انجام کیا ہونے والا ہے اس کی خبر بھی دے رہے ہیں۔

تجھے جو کچھ بھی کرنا ہے وہ کر لے دار فانی میں
کہ تیری زندگی صبح و مسا کم ہوتی جاتی ہے

۱۹۶۷ء کے مصائب میں گھر کر جو منظر لہیری نے دیکھا تھا اس کی جھلک اس شعر میں نظر آئیگی۔

نمونہ ادنیٰ ساحشر کا اک نمایاں آنکھوں کے سامنے ہے
نہ میں کسی کا، نہ کوئی مرا، یہ آج عالم ہے بےکسی کا

لہیری صاحب جب وطن میں تھے تو اہل وطن نے انھیں چین سے رہنے نہ دیا اور جب وہ بے وطن ہو گئے تو وطن کی یاد انھیں بے چین و بیقرار کئے ہوئے ہے۔

کہاں وطن ہے کہاں ہیں اب ہم نہ جانے گردش رہیگی کب تک
ملا دے بچھڑے ہوؤں سے یارب کہ دیکھ لیں پھر سے دن خوشی کا

مندرجہ بالا شعر پڑھ کر بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے آمین، ثم آمین نکل آئیگا یہ دردمند دل کی آواز ہے اس لئے دل سے نکلتی ہے اور دل میں گھر کر جاتی ہے۔

انتہائے غم میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں، زبان گنگ ہو جاتی ہے، ذہن میں صرف ایک بات رہتی ہے اور وہ بات لہیری کے اس شعر میں ہے

کہانی کیا کریں غم کی سنا کے
نہ آیا ہاتھ کچھ آنسو بہا کے

لہیری کی طرح ہندوستان کے بہت سارے دوسرے لوگ بھی بے وطن ہو کر انھیں کی طرح دیار غیر میں تڑپ رہے ہیں شاید ایسے کسی شخص سے لہیری کی ملاقات نہ ہوئی ہو لیکن جہاں نہ پہنچے روی، وہاں پہنچے کوی، کی مثال لہیری کے اس خیال پر صادق آتی ہے جب وہ کہتے ہیں۔

جو مشکل میں بھی کام آئے تو دونوں
اتر کر زیر دام آئے تو دونوں
وطن کو یاد کرتے ہیں تو دونوں
اگر فریاد کرتے ہیں تو دونوں

دیکھئے یہ شاعر کا دل ہے جو نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان، وہ اپنی بے وطنی سے بے چین ہو کر مسلمانوں کی بے وطنی پر بھی ماتم کرتا ہے۔ یہ ہے لہیری کے خیالات کی معراج۔

لہیری صاحب کی شاعری کا رنگ و آہنگ قارئین پر اب واضح ہو گیا ہوگا لہذا چند اشعار کے بعد رخصت چاہوں گا۔

مغفرت کیواسطے روتا جو ہے بندہ ترا
سچ جو پوچھو بس وہی اک رحم کے قابل بھی ہے
اب کہاں وہ رنج و غم، جور و ستم اے مہرباں
بادۂ جمہور سے ہیں مست اہل گلستاں
آج باپو بھی اگر ہوتے تو خوش آتے نظر
بس انہی کی ہے کمی اے مادر ہندوستاں
کشتئ ملت مری ساحل پہ آخر آ گئی
گو ڈبانے کیلئے اٹھی تھیں گہری آندھیاں

لہیری صاحب نے اصلاحی نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ مزاحیہ نظم بھی کہی ہیں جن میں "کون سا زمانہ آیا" کے عنوان سے جو نظم ہے اسے عوام نے بیحد پسند کیا ہے اور ہمیشہ مشاعروں میں اس نظم کو لوگ سنانے کی لہیری صاحب سے فرمائش کرتے رہتے ہیں۔ لہیری صاحب کے جیسا شاعر ایسے دور میں غنیمت اور قابل قدر ہے۔

بشمبر داس لہری شخصیت کے آئینے میں

ڈاکٹر ایم اے انجم

ملک کی تقسیم تاریخ کے اوراق کا ایک المناک باب ہے۔ اس کا خیال آتے ہی تو تباہی اور انسانیت سوز واقعات کا ایک طویل سلسلہ نگاہوں کے سامنے بکھر جاتا ہے اور پھر ان دلوں پر کیا کچھ گذری ہوگی جو براہ راست اسکا شکار ہوئے زمین ہند کے بٹنے کے ساتھ ساتھ سماجی، تمدنی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اسکے مضر اثرات آج بھی ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی نہ مجھے ضرورت ہے اور نہ ماضی کی تلخ تر حقیقتوں کو اجاگر کرنے سے کسی کو فائدہ۔

بشمبر داس لہری صاحب سے میری پہلی ملاقات ایک خصوصی شعری نشست میں ہوئی جو چھ سال پہلے جسونت سنگھ جانی صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوئی تھی۔ لہری صاحب نے انتہائی محبت سے مصافحہ کیا اور پھر مجلسی انداز میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ جس چیز نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان کا چھلکتا ہوا جام خلوص تھا۔ میں نے اسی وقت یہ رائے قائم کی کہ یہ شخص ضرور انتہائی وضعدار اور حلیم ہے پھر بعد کی ملاقاتوں میں میری اس رائے کو تقویت ملی اور مجھے اپنے صحیح الرائے ہونے پر رشک آنے لگا۔

پورا نام بشمبر داس لہری تخلص کرتے ہیں۔ والد محترم کا نام گوشاہ ہے لہری صاحب ۱۹۱۵ء میں قصبہ کلاس والا ضلع سیالکوٹ مغربی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ تعلیم میٹرک تک ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں ہندوستان آئے اور امرتسر ہوتے ہوتے بھاگلپور شہر میں آئے اور یہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ اس شہر میں آپ کا تجارتی سلسلہ ہے اور کپڑے کی ایک دکان کچہری میں ہے۔ لوک گیتوں کا آغاز آپ نے اپنی مادری زبان پنجابی میں کیا کیونکہ ذہنی رجحان بچپن سے ہی شعر و شاعری کی طرف تھا۔ اس لئے آپ نے اس طرف خصوصی توجہ دی پنجابی زبان میں آپکے کئی کتابچے شایع ہو چکے ہیں۔ جو عوامی گیتوں پر مشتمل ہیں۔ ان کتابچوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ سارے کے سارے فوراً فروخت ہو جاتے تھے یہ اچھوت کے موضوع پر آپکی نظم بے حد مقبول ہوئی جسے عوام کے اصرار پر دوبارہ شایع کرنا پڑا استادی اور شاگردی کے چکر سے آپ شروع سے ہی محفوظ رہے ۱۹۴۷ء کے بعد آپ نے اردو زبان میں اشعار کہنے شروع کئے اور اکثر و بیشتر خصوصی نشستوں میں شریک ہوتے رہے بھاگلپور میں سکونت پذیر ہونے کے بعد لہری صاحب جلد ہی اپنے فن شاعری پر خصوصی مہارت حاصل کرلی۔ پھر بھی آپکا کلام ایک کہنہ مشق استاد کا محتاج تھا۔ لہذا آپکی نظر انتخاب حضرت شور بھاگلپوری پر پڑی کلام بغرض اصلاح انکی خدمت میں پیش کرنے لگے۔ شفیق و مہربان استاد نے ہونہار شاگرد پاکر

تھا اس طرح اپنی توجہ خاص کا مرکز بنا یا کہ چند غزل کی اصلاح
کے بعد آپ بے نیاز ہوگئے۔ پنجابی زبان کے علاوہ ہندی
بھاشا میں بھی آپ خوب کہتے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے
تجارتی کاموں سے فراغت پانے کے بعد جو وقت مل جاتا ہے
اسے اپنے شعری ذوق کی تسکین کے لئے وقف کر دیتے ہیں،
آپ کی ذات بہر حال غنیمت ہے۔ دو بچوں کے باپ ہیں ایک
تو سروس میں ہے اور دوسرا زیر تعلیم ہے۔

لہری صاحب صحیح معنوں میں انسانیت نواز صلح و
آشتی کا پیکر اور خلوص و محبت کا ایک زندہ نمونہ ہیں۔ آپ کی
گفتگو میں نرمی اور شیرینی ہوتی ہے اور یہ آدمیت اور انسان
دوستی کا درجۂ کمال ہے آپ کی نظمیں اور غزلیں عمیق تجربات
و مشاہدات کی عکاس ہیں روزمرہ کے واقعات و تجربات
کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سننے والا آہ اور واہ کی
کیفیتوں سے گذرے بغیر نہیں رہ سکتا

آپ کے موضوعات بھی زندگی کے عام موضوعات
ہوتے ہیں جیسے سیدھے، صاف، اور سلیس پیرایہ بیان
دیکر آپ موثر بیان دیتے ہیں۔

آپ کے پڑھنے کا انداز بھی منفرد ہے جس میں پنجابی
آب و تاب صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ رک رک کر موثر
طریقے پر پڑھتے ہیں، آپ محفل کی جان ہیں، جس محفل میں شریک
ہوتے ہیں اسے زعفران زار بنا دیتے ہیں، خوب خوب داد و
تحسین وصولتے ہیں، فراخ دلی کے ساتھ جھک کر آداب بھی کرتے
جاتے ہیں ہر شخص مست و بے خود بنا آپ کو سننے کے لئے بیتاب
رہتا ہے۔ آپ کے مزاج میں رندی و سرمستی کی تمام کیفیتیں
ہیں اور انکا اظہار اشعار میں بڑی نفاست سے کرتے
ہیں حالانکہ کبھی جام و مینا سے شغل نہیں رہا ہے۔ طبیعت
میں چونکہ حد درجہ گداز ہے اور خونی ڈرامہ کو اپنی آنکھوں
سے دیکھا ہے اس لئے آپ کی بیشتر نظموں کی بنیاد اتحاد و اتفاق
ہے۔ پریم کے پجاری ہیں۔ اور اسی لئے وہ خصوصی مجلس ہو
یا عوامی ہر جگہ پیغام محبت دیتے رہتے ہیں، حیات اور ماحول
کا گہرا تجربہ رکھتے ہیں، ذوق کافی نکھرا ہوا پایا ہے، امن اور
شانتی کو سماج کی اعلیٰ قدروں کا محافظ سمجھتے ہیں زمانے کے نشیب
و فراز سے خوب خوب گزرے ہیں اور ہر تیور پہچانتے ہیں۔

آپ کی زندگی بے حد سادہ اور تکلف سے پاک ہے،
ذہن و دماغ بھی ستھرا اور صاف پایا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ
کے کلام میں خصوصاً ان تمام نظموں میں جو میل ملاپ، اخوت،
بھائی چارگی، اور وفا پرستی پر مبنی ہیں کافی سے زیادہ واقعیت
اور گہری سوجھ بوجھ کا عکس جھلکتا ہے اگرچہ آپکی مادری زبان
پنجابی ہے لیکن شاعری میں سلاست اور روانی بدرجۂ اتم
ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ آپ کا اردو کلام بہت
سادہ اور روزمرہ کی زبان میں ہے جو پنجابی لب و لہجہ یا آہنگ
سے بوجھل نہیں ہے یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

لہری صاحب کی شخصیت ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح
ہے جو ہر کس و ناکس کے لئے دعوت فکر و نظر کی سی حیثیت
رکھتی ہے تصنع یا مجہولیت کا کہیں دور دور تک شائبہ نہیں
آپ گاہے بگاہے گیا بھی موقع نکال کر جاتے ہیں تو بڑی
جان آجاتی ہے۔ آپ بیک وقت شاعر، دوست، اور بزرگ
بھی ہیں، کھلے ہوئے دل سے ملنا انسانیت کی معراج ہے۔
آپ میں وہ تمام صفتیں موجود ہیں جو ایک صحیح دل و دماغ رکھنے
والے آدمی کے اندر ہونی چاہئیں۔ لہری صاحب سے جو
بھی ایک بار ملا وہ انکا گرویدہ ہوگیا۔

لہری صاحب قومی یکجہتی کے مبلغ ہیں اور عملی زندگی میں

باقی صفحہ ۴۰۹ پر

ہری نندن پرشاد ہری بھاگلپوری

فن اور شخصیت

از :۔ نسیم آروی

سرزمین ہند میں گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح اردو اور ہندی کے دھارے ایک ساتھ مل کر بہتے رہتے ہیں کبھی کبھی ان میں کچھ بعد مکانی بھی رہا ہوگا لیکن پریاگ کے سنگم پر تو دونوں نے ایک ہو کر ایک دوسرے میں اپنے وجود کو تحلیل کرکے ایک نئی زندگی جاوداں حاصل کی ہے۔ کچھ ایسے بھی ادیب و شاعر ہوئے جنہوں نے اردو رسم الخط نہ جاننے کے باوجود اردو زبان میں اپنے خون جگر سے لالۂ و گل کھلائے۔ زیادہ تر عوام جو اس رسم الخط سے نابلد ہیں وہ بھی کما حقہٗ اسی زبان کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جناب ہری نندن پرشاد ہری جو اردو میں اتنی صاف غزلیں اور نظمیں کہتے ہیں اردو رسم الخط سے قطعی نابلد ہیں یہ ایسی بات ہے کہ قارئین کو حیرت و استعجاب میں ڈال دے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا صاف شعر کہنے والا شاعر کہ

> ہم اس دل میں لگاتے نہ انہیں رحم آیا
> قبر پر آئے ہیں اب پھول چڑھانے کے لئے

اردو رسم الخط کا ابجد بھی نہ جانے !! لیکن یہ حیرت کی بات نہیں کیونکہ ایسے سینکڑوں ہزاروں صاحبان ذوق موجود ہیں جو اس زبان کے سحر حلال صید خوش بخت رہے ہیں۔ یہی تو اس کی خوبی ہے کہ عوام الناس اسے اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں اور سیاست کے سارے بکھیڑے اور سیاست والوں کی ساری بازی گری نقش بر آب بن کے رہ جاتی ہے تو آئیے میں اس شہر بھاگلپور کے ایک ایسے شاعر سے آپ کو روشناس کراؤں جو اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

جناب ہری نندن پرشاد ہری (جن کی تاریخ پیدائش ۱۰ جنوری [illegible] ہے) نے اس شہر میں اس وقت آنکھ کھولی جب تقسیم بنگال کی تحریک بام عروج پر پہونچ چکی تھی۔ انہوں نے نہایت عسرت، مفلسی اور پریشانی کی زندگی گذارتے ہوئے ٹیوشن کرکے اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھا اور ۱۹۳۱ء میں جب ٹی این جے کالج سے بی اے کی ڈگری لی تو کانگریس نے صوبائی وزارتی انتخاب کے سلسلے میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس چل رہے تھے اور ایک مدت افراتفری کا عالم تھا۔ ناچار مقامی سول کورٹ میں ملازمت اختیار کر لی اور ہیڈ ناظر کے عہدے پر رہے اور ریٹائر کیا۔ ان کی آنکھوں نے تقسیم ہند کے واقعات دیکھے۔

پارٹیوں کے عروج و زوال کو دیکھا وزارتوں کو بدلتے اور حکومتوں کو ٹوٹتے دیکھا اور ان ساری چیزوں نے ذہن شاعر کو نئے نئے مواقع فراہم کئے

ادب کا شوق بچپن ہی سے رہا۔ ہری جی ہندی کے طالب علم رہے۔ مگر ناگری رسم الخط ہی کے ذریعہ اردو کے فنکاروں سے روشناس ہوئے۔ مطالعہ کے ذوق نے اردو تصنیفات کی طرف راغب کیا۔ ہندی رسم الخط میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے زیادہ تر ان کے مطالعہ میں رہیں۔ شہر بھاگلپور کے شعراء ادباء سے بھی بہت قریب رہے۔ نشستوں اور مشاعروں میں پیش پیش رہے۔ اسی طرح مشاعروں میں سنتے سناتے پڑھتے پڑھاتے اب ان کا شعور فن اس منزل میں ہے جہاں یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ یہ شخص علم عروض سے نابلد ہے۔ چہ جائیکہ رسم الخط سے ناآشنا ہونے کا دھوکہ ہو۔ اردو ادب کے ساتھ ہی ساتھ ہری جی انگریزی زبان کے بھی شاعر ہیں اور خصوصی نشستوں میں جب یہ انگریزی کی چیزیں سناتے ہیں تو انگریزی جاننے والے اس کی داد دئے بغیر نہیں رہتے۔ انہوں نے بنگلہ زبان بھی سیکھی ہے اور مشاہیر فنکاروں کے تصانیف کا مطالعہ کیا ہے

اردو زبان میں ان کی شاعری زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل جو اپنی عنائیت اپنے نوح اور نکھار کے سبب سننے والوں کا دل ہمیشہ جیتتی رہی ہے اس سے متاثر ہونا اور پھر اس پر طبع آزمائی کرنا فطری بات معلوم ہوتی ہے۔ غزل میں ان کا رنگ خالص غزل کہنے والوں اور بے باکی اور صفائی سے کہنے والوں سے زیادہ قریب ہے۔ فرماتے ہیں۔

عشق دنیا کو نہیں صرف دکھانے کے لئے
ہم تو بیٹھے ہیں انہیں اپنا بنانے کے لئے
ساقیا جام کی محفل میں ضرورت کیا ہے
صرف آنکھیں تری کافی ہیں پلانے کے لئے
اب تو پردے سے نکل جلوۂ پر نور دکھا
کب سے بیٹھے ہیں نگاہوں میں بسانے کیلئے
توڑنا آئینۂ دل کا ہے آساں لیکن
جوڑنا ہے بڑا دشوار زمانے کے لئے

دوسری غزل میں زبان کی سلاست ملاحظہ فرمائیے

نہ دولت کی نہ جنت کی نہ تخت و تاج کی خواہش
ہمیں تیری تمنا ہے پئے دیدار بیٹھے ہیں
ادھر عشاق بھی تیار ہیں گردن کٹانے کو
ادھر وہ حسن کی لے کر کھلی تلوار بیٹھے ہیں
تری محفل میں آئے ہیں تو پھر کچھ لے کے اٹھینگے
زمانہ یہ نہ سمجھے ہم یہاں بیکار بیٹھے ہیں
نظر میں زہر بھی امرت بھی ہے شعلہ بھی شبنم بھی
چلاؤ تیر ہم ہر حال میں تیار بیٹھے ہیں
ہمیں معلوم ہے تھا واسطہ ان کو بہاروں سے
جبھی تو اپنے دامن میں لئے ہم خار بیٹھے ہیں
ہری آنا ہی تم کہہ دو تقاضے ناگہانی سے
کہ بچ کر وہ نگاہوں سے پس دیوار بیٹھے ہیں

سرزمین ہند پر چین و پاک جارحیت کے دوران کوا سا قلم تھا جو تلوار نہیں بن گیا تھا۔ ہری جی کی روادا اس وقت بھی پاکستان کو چھوٹا بھائی سمجھتی ہے ایسے مسموم ماحول میں جب کہ نفرت وحقارت کا سلا

ن انسانی کی بھائی چارگی اور خلوص و محبت کو اپنی موجو
اڈبو رہا ہو۔ اس قسم کی نظم کہنا اور اتنے صوت
بغضب العین کا اظہار کرنا جو نفرت و حقارت
بگل میں انسان دوستی، خیر سگالی، اور امن و آشتی کے
دل کھلا دے کچھ انہیں کا کام تھا۔ اور لطف یہ
اس نظم میں انہوں نے قومی وقار کو ذرہ برابر بھی
روح نہ ہونے دیا بلکہ پڑوسی حملہ آور کو چھوٹے
ائی کا لقب دیکر اس ملک کی تاریخی رواداری اور
می عظمت میں چار چاند لگا دئے۔ یہ چھوٹی سی نظم
حظہ فرمائیے جس کا عنوان ہے "چھوٹے بھائی
نصیحت"۔

نظم

سن تو بھیا پاکستانی
کیوں کرتا ہے یہ نادانی
جاگ اٹھے ہیں ہندوستانی
ہوگی اب تو منہ کی کھانی

ہم دونوں اک ماں کے بیٹے
ساتھ ہیں کھیلے ساتھ ہیں لیٹے
دونوں سے کتنے ایک ہی لتھے
کرتے تھے آداب سمتے

بھول گیا سب بات پرانی
سن تو بھیا پاکستانی

سمجھا تھا تو دغا نہ دے گا
بھائی سا برتاؤ کرے گا
خون پسینہ سب کچھ دے گا
ساتھ جئے گا ساتھ مرے گا
پر تو نے تلوار ہے تانی
سن تو بھیا پاکستانی

یہ تیرا کیسا ہے دھندا
آنکھیں رہتے بنا ہے اندھا
چلتا گر تو ملا کے کندھا
پڑتا تیرے گلے نہ پھندا
ہوتی کبھی نہیں حیرانی
سن تو بھیا پاکستانی

دیکھ مرے نادان برادر
چل تو اپنی حد کے اندر
ٹوٹ پڑے گی دنیا تجھ پر
موت کھڑی ہے تیرے سر پر
ہوگی مشکل جان بچانی
سن تو بھیا پاکستانی

چین نہ ہرگز وفا کرے گا
بھائی بن کر دغا کریگا
دغا کیا ہے اور کرے گا
تو ناحق بے موت مرے گا
کام نہ دیں گے یہ ایرانی
سن تو بھیا پاکستانی

اس جاندار اور صحت مند نظریۂ حیات کی ترویج و اشاعت

باقی صفحہ ۴۱۵ پہ

میرا دوسرا بچّہ کب ہونا چاہیئے؟

ڈاکٹروں کا کہنا ہے، بچے کی نشو و نما میں پہلے چار پانچ برس کا عرصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ ماں کی بہتر صحت کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوسرا بچہ تین چار برس بعد ہو۔

آج کل آپ برتھ کنٹرول کے مُتعدد محفوظ، مؤثر اور سادہ طریقوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اب بچے کا جنم اتفاق کی بات نہیں ـــــ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔

مُفت مشورے اور خدمات کے لئے قریبی فیملی پلاننگ سینٹر میں آج ہی تشریف لائیں۔

اور یاد رکھیں ....

بچے دو ہی کافی ہیں

Sohail Gaya. December. 68

davp 68/209

چندر جی ——— ایک مزاح نگار

ابوظریف

مزاح نگاری کا فن سنجیدہ گوئی کے مقابلہ میں بہت مشکل ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ طبیعت میں قدرت کی طرف سے مزاح کا رنگ زیادہ عطا کیا گیا ہو۔ ادب برائے ادب کی طرح مزاح برائے مزاح بھی ہوتا ہے لیکن ادب برائے زندگی کے اگر آپ قائل ہیں تو مزاح کے ساتھ طنز کی آمیزش کر دیجئے لطف آجائے گا عام طور سے سطحی دماغ سمجھتا ہے کہ الٹ پھیر کر ہنسا دینے والی بات کر دی جائے تو ادب کا تقاضہ پورا ہو جاتا ہے لیکن ادب ادب ہے۔ معمولی سی بات ادبی قیود و ضوابط کے دائرہ میں کوئی کہے تو وہ ادب پارہ تسلیم کیا جائے گا ورنہ اعلیٰ سے اعلیٰ کوئی بات کیوں نہ ہو بے ہنری برتی جائے گی تو فن پارہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے تو سرکس میں بھی جوکر ہوتے ہیں۔ طنز و مزاح کا کمال یہ ہے کہ سننے والا سنتے ہی بے ساختہ ہنس پڑے لیکن جیسے ہی اس کی ہنسی اسے تھکا دے وہ اس فکر میں الجھ جائے کہ کہنے والے نے کیا گہرا طنز کیا ہے اور اس کے زخم سے نیم بسمل بن جائے۔ فنکار نے اس طور پر اگر لوگوں کو متاثر کیا تو بلاشبہہ اس کی عظمت کا قائل ہونا پڑے گا۔ تاریخ ادب اردو کا ہمالیائی شان رکھنے والا طنز و مزاح کے میدان کا ہیرو اکبر الہ آبادی ہے۔ گو اس کی ابتدا سودا کی ہجویات سے ہوتی ہے مگر سودا کی ہجو گوئی نے سماج کو متاثر کر کے کوئی تعمیری رخ کی طرف نہیں موڑا تا اس لئے ادبی لحاظ سے اس کی جو بھی قدر و قیمت ہو۔ اکبر الہ آبادی کے فن کی گہرائی اور گیرائی اور تعمیری ردعمل کی افسوں گری کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اکبر الہ آبادی کے بعد طنز و مزاح کی طرف مائل شعراء کا گروہ ہے جس میں مقامی طور پر کسی نے جو بھی اپنی عظمت منوائی ہو لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جن پر ادب اردو کو ناز ہو سکتا ہے۔ مثلاً انجم مانپوری، فرقت کاکوروی، احمق پھپھوندوی، حاجی لق لق، ظریف لکھنوی، عبدالمجید سالک، راجہ مہدی علی خاں، احمد جمال پاشا، تلخ زمانی، آفت گیاوی، رضا نقوی واہی وغیرہ ہمارے عظیم سنجیدہ گو شعراء میں بھی کچھ ایسے ہیں جنہوں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے طنز و مزاح میں بھی فکر کی ہے۔ مثلاً ظفر علی خاں، اقبال، جوش، بسمل سنہاروی اور جمیل مظہری وغیرہ۔

مشاعروں میں سنجیدہ کلام سنتے سنتے جب سامعین اکتا جاتے ہیں تو محفل میں از سر نو جان لانے کے لئے

مزاحیہ کلام پڑھنے والوں کی طرف شمع بڑھا دی جاتی ہے جو نہ صرف مشاعروں کو پربہار کر دیتے ہیں بلکہ میٹھے نشتر سے دلوں کا آپریشن کر کے لوگوں کو صحیح سمت دکھا ہیں تاکہ منزل سے کوئی بھٹک نہ جائے۔ بھاگلپور کے منشی رام چندر پرشاد ایک مزاح گو شاعر ہیں اور مشاعروں میں خوب کامیاب رہتے ہیں۔ عوام انہیں سننے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ کچھ ایسے ستم ظریف بھی ہیں جو صرف چندر جی کی ظرافت سے حظ اٹھانے کے لئے ہی مشاعروں میں آتے ہیں۔ چندر جی کی زبان ستھری تلفظ کھانٹی دیسی اور مزاح کا رنگ کچھ ایسا ہے جس میں ہنسنے ہنسانے والی باتوں کے ساتھ ساتھ گرانی چور بازاری رشوت خوری اور دوسری سماجی برائیوں پر بھرپور وار ہوتا ہے۔ چونکہ سماج کا ہر فرد آج ان برائیوں کا شکار ہے اس لئے چندر جی کی باتیں پر تاثیر ہو جاتی ہیں۔ چندر جی موضع بشن پور ڈاکخانہ بہادر پور رتھانہ سیور ضلع بھاگلپور کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد شری گھولٹن پرشاد اچھے لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ چندر جی بھاگلپور شہر کے مشہور وکیل مولوی عبدالمجید صاحب کے کلرک ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو زبان سے انہیں دلچسپی ہو گئی۔ ورنہ وہ ہندی زبان کے شاعر تھے۔ اب وہ دونوں زبانوں میں شاعری کر کے ہر سماج اور ہر سوسائٹی میں اپنا پیغام پہنچاتے رہتے ہیں۔ چندر جی جیسے شاعر کی ہندوستانی سماج کو بہت زیادہ ضرورت ہے۔ آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ میل محبت کی باتوں کے ساتھ ساتھ جو دوسری برائیاں سماج میں داخل ہو گئی ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے شاعر کا کام اصلاح کا پیغام دینا ہے اور یہ کام چندر جی اپنی صلاحیت کے سہارے کر رہے ہیں۔ اردو شاعری میں چندر جی نے شور بھاگلپوری سے ابتداءً اصلاح کے لئے رجوع کیا تھا لیکن اب وہ فرماتے ہیں کہ اصلاح کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب تو چندر جی کا نعرہ ہے" مستند ہے میرا فرمایا ہوا "۔

منشی رام چندر پرشاد چندر بڑے ہنس مکھ ملنسار اور محبت کرنے والے انسانوں میں سے ہیں۔ ان میں ذات پات فرقہ بندی جیسی بری عادتوں کا روگ نہیں لگا ہے۔ سب سے ہنس کر ملتے ہیں اور عوامی سطح پر یہ بہت محبوب بھی ہیں۔ اب تو کچھ منچلے ایسے بھی ہیں جو چندر جی کی صورت دیکھ کر ہنسنے لگتے ہیں اور ایسے ہنسنے والوں کو دیکھ کر چندر جی اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ یہ ان کی مزاح نگاری میں کامیابی کی سند ہے۔ دراصل بات ہے بھی یہی خدا کرے چندر جی سماج کو سدھارنے کے لئے طنز و مزاح میں جو باتیں کرتے ہیں اس کا مفید اثر یہ ہو کہ ہندوستانی سماج کا معیار تعمیر ی بن جائے اور یہی چندر جی کا مقصد بھی ہے اب چندر جی کے چند مزاحیہ کلام سے قارئین بھی حظ اٹھائیں اور فیصلہ کر لیں کہ وہ کہاں تک کامیاب ہیں۔

بر طرف ہر ایک پر پڑتی ہے للچائی ہوئی
کیا کہوں اپنی نظر کو کیسی ہرجائی ہوئی
جا چکی اس دور میں انسان سے انسانیت
ہر طرف وحشت ہی وحشت آج ہے چھائی ہوئی

مٹ گیا اک بن گیا بوتل میں جب اور کہہ گیا
یا ابھی ہند میں یہ کیسی مہنگائی ہوئی
داد پر ہے داد چندہ بھرے اپنی جھولیاں
آج یہ محفل یہ ہے چھائی ہوئی

کچھ ادھر دیکھا کئے اور نہ ادھر دیکھا کئے
ہم تو بس اپنا شکم شام و سحر دیکھا کئے

اس قدر مہنگائی ہے کہ زندگی سے تنگ ہیں
یہ حقیقت لا کے خود ہم اپنے سر دیکھا کئے
بھائی کی گردن پہ اک بھائی کی چلتی ہے چھری
ایسے بھی انسان کا ہم جانور دیکھا کئے
کل چھڑی سے کانپتے بچے تھے ہر اسکول کے
ماسٹر کو کانپتے اب سر بسر دیکھا کئے

بقیہ مقـــــالتوحید

یہ تاثرات جذبات کی فن، خون جگر کی صدرت چاہتا ہے اور خون جگر کی گرمی جذبات اور احساس سے ملتی ہے دراصل فن کی وہ اولین منزل جو انسان کے ذہنی نہاں خانے میں پرورش پاتی ہے۔ تخلیق عمل سے پہلے خواہش تخلیق کا جذبہ جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے دراصل خود اس کا وہ ذوق جمال ہے جو خارجیت میں حسن داخلی کی تعمیر اور تخلیق کرتا ہے یعنی حسن کاری کرتا ہے وہ اپنے جذبے اور تخیل کا حسن فن میں شامل کر لیتا ہے

واقعات سے زیادہ کردار کی اہمیت ہے اور کردار سے زیادہ انداز بیان کی اور انداز بیان میں زندگی جب پیدا ہوتی ہے جب فنکار کا دل آرزوں کی تپش سے سلگانے والا ہو۔

جمالیات کے دونوں حسن مفروض اور حسن موضوع کے مشترکہ تاریخ کی روشنی میں فن جذب و انجذاب کی منزلوں سے گذر کر اظہار کی منزل میں آتا ہے۔
فطرت کی حسن کو دیکھنے کا جذبہ جو فنکار کے دل میں پوشیدہ ہوتا ہے وہ فطرت کے حسن میں اپنا ذوق جمالیات سے اضافہ کر دیتا ہے اس کے بعد تخلیق کی منزل آتی ہے

فنکار عام زندگی سے اپنا موضوع چنتا ہے یا یوں کہئے کہ حقائق کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے ایسے کرداروں کو پیش کرتا ہے جو سماج کے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ فنکار قدرت کے ستم کا مشکور نہیں بلکہ اس کے یہاں ایک باغیانہ جذبہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے لہجے کا لطیف طنز اس باغیانہ جذبے کی ترجمانی کرتا ہے

افسانے کی تکنک اسقدر متنوع رہی کہ کسی بندھے ٹکے اصولوں کو اپنایا نہیں جا سکتا۔ یہ افسانہ نگاروں کی جدت طبع ہے کہ روز نت نئے بیانیہ انداز تراشتے ہیں موجودہ دور کے افسانوں میں غزل کی طرح رمز و ایمائیت کا انداز پیدا ہو چکا ہے جو وحدت تاثر کو قائم رکھنے کے ساتھ خارجیت و داخلیت میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرنے میں معاون ہے۔

صمد حمیدی ایک ابھرتا ہوا افسانہ نگار

ظفر ادیب

آج ادب کی کوئی صنف نہیں جو تخئیل پرستی کے
م میں گرفتار ہو ——— کہیں زندگی کے بطن سے
یا ہوئی حقیقت کا عمل دخل ہے ——— اگر کسی ادیب یا
اعر کے یہاں زندگی نہیں ——— یہاں زندگی سے
اد صرف کھا لینا۔ پہن لینا اور صبح و شام کا چولا بدلنا
نہیں ہے بلکہ وہ زندگی ہے جس میں واردات ہوں،
نشیب و فراز ہوں اور امید و بیم کے طوفان ہوں ———
برایقین ہے کہ اس کے یہاں ادب نہیں، وہ ادب جو
ندہ رہتا ہے اور مرور زمانہ سے بھی ماند نہیں پڑتا
تخئیل پرست تو آج بھی موجود ہیں اور ہر زمانے
یں موجود رہیں گے لیکن ان کا تخئیلی ادب ان کے بعد
کیا رہے گا ان کی عمر بھی نہیں پائے گا۔ یہ ضرور ہے
ہ ان کی چمک دمک چند دنوں کے لئے کچھ لوگوں کو سجھاتی
رہے گی اور بے فکروں اور خوش باشوں کی محفلوں میں قہقہو
ں روشنی پھیلاتی رہے گی لیکن یہ آیا ہوا ادب دلوں میں
نہیں اتر سکے گا۔ اور خیالوں میں نہیں گونجتا رہیگا۔
صمد حمیدی زندگی کا افسانہ نگار ہے۔ اسے
تخئیل سے کوئی سروکار نہیں۔ اس نے زندگی کے سرد

گرم برداشت کئے ہیں، ایسے واقعات نے گھیرے رکھا
ہے، وہ ایسے دن بھی دیکھ چکا ہے جب ع
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
کی کیفیت رہتی ہے۔ اسے شاید ہی ایسے دن نصیب
ہوئے ہوں چاہے ایسے دنوں کی اسے تمنا رہی ہو
جب ——— ع
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
کی فرصت نصیب ہو۔ میں کہوں گا چونکہ اسے حقیقت
میں اسے ایک افسانہ نگار ہونا تھا اسی لئے اسے ان
کوالف سے دوچار ہونا پڑا اگر اسے کھرا سونا نہ ہونا
ہوتا تو وہ بھی بھٹی میں اس قدر تپایا نہ جاتا۔ یہ قدرت
کی طرف سے اس پر ایک بہت بڑی عنایت تھی ورنہ اس
کی زندگی میں کھوٹ رچا بسا رہتا اور اس کا ادب بھی اس
کھوٹ سے نیلا پیلا رہتا۔ شفاف اور روشن نہ ہوتا۔
وہ سب ہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے صمد حمیدی
کو اس کے دلی میں قیام کے دوران دیکھا کہ وہ کس قدر
کھرا رہا ہے اور اس نے کتنا خلوص برتا ہے: زندگی اور
ادب اور ان کے مقاصد سے ——— وہ واقعی زندگی

اور ادب کے مندر میں اس بھگت کی حیثیت رکھتا ہے جو سچے دل اور پوری لگن کے ساتھ اپنے دیوتا کا ہو جاتا ہے اور جسے کوئی بڑی سے بڑی چمک بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی اسی لئے وہ کبھی کافر زندگی اور کافر ادب نہیں ہوا۔ ہمیشہ ہی زندگی کی سچی اقدار برتتا رہا اور ہمیشہ ہی ادب کے حقیقی اور بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھا۔ میں نے ہمیشہ ہی دیکھا کہ اس نے ہر جگہ میں اپنے حصول کے دامن کو پھیلائے رکھا اور ہر وہ چیز دل و [illegible] اتار لی جو زندگی بخش کہی جا سکتی تھی اگرچہ دیکھنے والا شاید ——— شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً یہی سمجھتا رہا کہ وہ یقیناً سب ہی کو اپنے دامن میں سمیٹے جا رہا ہے لیکن ایسا حقیقت میں نہیں تھا۔ وہ قابل قبول چیزوں کو اختیار کرتا تھا اور ناقابل قبول چیزوں کو فضا میں بکھر جانے دیتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اس کا شعور خدوخال حاصل کر رہا تھا اور اس زمانے سے اس کے ادبی ذوق نے وہ طرح دار تیور اختیار کئے جو بعد میں اس کے افسانوں میں رونما ہوئے

اس کی زندگی، پہلے بھی اور اس وقت کی بھی اس کے چہرے سے پڑھی جا سکتی تھی۔ یقیناً آج بھی اس کے ظاہر و باطن کے خلوص میں فرق نہیں آیا ہوگا۔ اور آج بھی اس کا چہرہ اس کے دل کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوتا ہوگا۔ اگر ایسا ہو گیا ہے تو یہ اس کی بڑی بدقسمتی ہے کیونکہ اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسے زندگی نے تپانا بند کر دیا ہے یا کم کر دیا ہے۔ میرے خیال میں ادیب کے لئے شاید ہی اس سے بڑی بدقسمتی ہو کہ اسے زندگی تپانا بند کر دے اس کے لئے تو یہ ایک بڑی لعنت ہے اور ایک بڑا ادیب زندگی کے آخری لمحے تک زندگی کی بھٹی میں پڑا رہتا ہے ورنہ وہ ادب میں زندگی نہ دے سکے اور خود بھی زندہ رہتے ہوئے مر جائے ادب چونکہ زندگی کا کھیل ہے اس لئے جب تک اس کے ساتھ زندگی رہتی ہے اس وقت تک یہ سانس لیتا رہتا ہے ورنہ محض الفاظ کا ڈھیر ہوتا ہے

صلاحیتیں بروئے کار آنے کے حالات صمد حمیدی نے کو شروع زندگی سے حاصل رہے ہیں۔ یعنی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی امتحان کے مرحلے پیش آئے۔ انہی مرحلوں سے گذر کر اسے عزم کا استقلال ملا اور اس نے جدوجہد کے لئے حوصلہ پایا اگر وہ اس سب کچھ کو ادب میں پیش کر دینے میں کامیاب ہو جاتے جو اسے زندگی میں بھگتنا پڑا تو وہ بڑا کام کر جاتے کیونکہ اس کے سے حالات کے لوگ ملک میں لاتعداد ہیں۔ انہیں اس کے ادب سے زندگی کو زندگی بنانے کا راستہ ملے گا اور وہ اس کی طرح زندگی کو خود ڈھال دینے میں کسی حد تک کامیاب ہونے کے مواقع فراہم کر سکیں گے۔ اس نے جن حالات میں زندگی کے تپنے کا سامان کیا وہ حالات بڑے صبر آزما ہیں اور انسانی کس بل کو للکارتے ہیں۔ اگر اس نے استقلال کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو یا وہ معمولی دل و جگر کا آدمی ہوتا تو زندگی بھر سر نہ اٹھا سکتا اور ملک کے لاکھوں انسانوں کی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے زندگی گذار دیتا لیکن بے دلی کے شب و روز سے یہی سیکھا اس لئے وہ

اپنی زندگی میں بھی ایک حد تک کامیاب ہوا اور اپنے ادب میں بھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنی شخصیت اور اپنے فن پر مارکسی اور فرائیڈی تصوریوں کا اثر لیا۔ میرا خیال پہلے حصے سے اتفاق کرتا ہے اور فرائیڈی اثر کے امکان کی گنجائش اس کے یہاں یا اس کے سے حالات میں نہیں پاتا۔ ایسے میں تو کسی طرح بھی منٹو کا پیروکار ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کیونکہ اس میں اس روش کو اختیار کرنے کی صلاحیت کا امکان ہی نہیں۔ میں اسے طبعًا پریم چند سے زیادہ قریب پاتا ہوں اور موپیاں سے بہت کم قریب ——— وہ پریم چند، سرت چندر، اسور، بنکم چند کے خاندان کا فرد ہے۔ ایسے منٹو، کرشن چندر، عصمت کی روش کے افسانہ نگاروں سے کوئی خاص شغف نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیدی کی جانب رجوع کر سکتا ہے اور یہی اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔

صمد جمیدی نے کہانیوں کے علاوہ مضامین اور خاکے بھی لکھے ہیں لیکن وہ کہانیوں ہی کا فنکار ہے اور اسے صرف کہانیاں ہی لکھنی چاہئیں۔ وہ ہمہ جہت فنکار نہیں ہو سکتا۔ اسے زمانے نے اتنا زیادہ کچلا ہے کہ وہ صرف ایک ہی صنف ادب میں موزوں رہ سکتا ہے اگر وہ ہر طرف دوڑتا پھرتا رہے گا تو کسی طرف کا بھی نہ ہو سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ تنقیدی شعور کو بڑھاوا نہ دے۔ اسے اپنے تنقیدی رجحان کو مضامین میں صرف کرنے کی بجائے افسانوں کے تعمیری پہلوؤں پر صرف کرنا چاہئے۔

"کشمکش" ایک بہک جانے والی لڑکی کی داستان ہے جو پہلی ٹھوکر کے بعد پھر جذبات کی رَو میں بہہ جاتی ہے اور کہتی ہے "لیکن خدا امی کی عمر دراز کرے جو سب بدنامیوں کو گھول کر پی گئیں" اگرچہ وہ اس بار پہلے کی طرح ناکام نہیں رہتی لیکن اس کی کامیابی دوسرے کی ناکامی بن جاتی ہے اور وہ اور اس کا شوہر کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کے مقصد کو اپنے سامنے جان دیتا ہوا دیکھتا رہتا ہے۔ یہ افسانہ ماضی کی یادوں اور حال کی کیفیتوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہوا بڑھتا رہتا ہے لیکن اس کی رفتار انجام کی جانب بہت تیز بلکہ بالکل یکایک ہو جاتی ہے جس سے اس کے تاثر پر کسی قدر اثر پڑتا ہے۔

"سرد راکھ" یہ صمد جمیدی کی ابتدائی کاوش ہے اس لئے اس میں کئی الجھنیں بھی راہ پا گئی ہیں۔ اگرچہ کہانی کی روداد خوب ہے اس سے اگر اسے ذرا کچھ اور سلجھے ہوئے انداز میں کہا جاتا تو یہ اپنی قسم کی ایک ہی کہانی ہوتی اس وقت بھی اپنی روداد اور بعض تاثرات کے سبب سے خاصے کی چیز ہوگئی ہے۔ کچھ باتیں [illegible] کی کسوٹی پہ کھری [illegible] سب کچھ کی توقع نہ کی جا سکتی [illegible] کچھ کی امید بھی نہیں کی جا سکتی جس کا ہونا [illegible] فطری ہو

غالبًا اس کہانی میں صمد صاحب نے ایک ناول کے مواد کو سمیٹ [illegible] کی کوشش کی ہے ورنہ ایک کہانی میں اتنے ڈھیر سارے کردار نہیں ہوتے۔ اس کہانی کے کرداروں کی حد [illegible] کسی اچھے ناول کے کرداروں کی تعداد سے کم نہیں ہے۔

"جب بندھن ٹوٹے" اس کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت بغیر مرد کے زندگی کی خوشی حاصل نہیں کرسکتی ہے اور [illegible] بھی کہا جاسکتا ہے [illegible] عورت کا [illegible] ہے کہ جہاں وہ بیوی کو سلیقہ سلگتے برداشت کرتی ہے وہاں بیوی سے [illegible] ہو کر ایک دوسرے مرد کو اپنا لیتی ہے اور اس [illegible] باقی ہے [illegible] عورت کا تنہا رہنا فطری ہے [illegible] مرد کو ساتھی بنا کر زندگی کی خوشی [illegible] خواہ اس مرد سے اس کا آئینی رشتہ بھی [illegible] یہ بات لمحہ فکریہ کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ مثالیں دونوں صورتوں کی پائی جاتی ہیں اور دونوں میں سے کسی ایک پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

صمد صاحب اس کہانی [illegible] واقعات کی فضا پر پورا قابو نہیں رکھ سکے۔ کہانی اپنے طور پر خوب ہی اور قابل [illegible] ہے [illegible] مقصدیت اور افادیت بھی یہاں نظر آتی ہے۔

"شعلہ و شبنم" ایک اور اچھا افسانہ ہے کردار نگاری کے ساتھ ساتھ نفسیات کے پہلو بھی خوب ابھرے ہیں، بیان بھی صاف ستھرا ہے لیکن رفتار کے توازن کی [illegible] یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ کرداروں کی تراجی کیفیت بہت اچھی طرح پیش کیا گیا۔ تعلیم کے تاریک اور روشن پہلو بھی ابھارے گئے ہیں اور والدین کے فرائض کے حسن انجام دہی کو بھی نہایت موثر انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ صمد صاحب نے افسانے کے اہم رجحانات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اپنا رجحان ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ابھی تک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اپنا رجحان (Melting Pot) تشکیلی حالت میں ہے۔ یقیناً اگر انہوں نے ذرا اور توجہ دی تو وہ اپنے رجحان کو ایک نمائندہ رجحان بنا سکیں گے اور صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سب کچھ کے لئے انہیں بہت کچھ سوچنا سمجھنا پڑے گا کیونکہ اتنے سارے رجحانات میں سے کوئی ایک رجحان اپنا اور خاص اپنا پیش کرنا کافی دشوار مسئلہ ہے لیکن صمد صاحب کی کاوشوں سے یہ امید کی جاسکتی ہے۔

بقیہ زندگی کی رہگذر پر

بابا [illegible] با" اس نے زوردار قہقہہ لگایا

میں ہوں حسن بے خزاں، حسن بے پناہ، محبت بے کراں، ہڈیوں کا ڈھانچہ حسن [illegible] مجھے کچھ نہیں ـــ کچھ نہیں ہوا؟ وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔ خون کی پیک اس کے منہ میں آرہی اور وہ اسکی قے کرتے ہوئے بولی

آپ اچھے تو ہیں ماسٹر صاحب ـــ خدا بال بچے اچھے رکھے، رہیں، میں بھی اچھی ہوں ـــ ابا نے دوسری شادی کر لی ـــ نئی اماں مجھے کم نہیں مانتیں ـــ"!!

اور وہ اس کے بازوؤں میں جھول کر رہ گئی

شاہدی نے دوسری بس پکڑ کر کمارڈوبی کی راہ لی۔ بھائی سے ملاقات کرکے جلد ہی لوٹ گیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپکو ڈھاکے میں پایا

صمد حمیدی

ایک مطالعہ

لطف الرحمٰن

بھاگل پور کے ادبی حلقے میں ایک منحنی قسم کے صاحب ہیں جو جوانی و پیری کی سرحد پر کھڑے ہیں، کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلسلۂ روز و شب کا کوئی بھی اثر ان کی ذات اور شخصیت پر نہیں ہوا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنی زندگی میں ہزاروں مرتبہ صلیب و دار کے مرحلے سے گذرا ہے یعنی کبھی ان کی گفتگو میں گوناگوں تجربات و مشاہدات کی جھلکیاں ملتی ہیں اور کبھی اتنی سادگی ـــــــــ اتنی سادگی جو اکثر طفلکِ سیماب پا میں پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں اس شخص کی معصومیت اور پاکیزگیٔ طبع ملنے والوں پر بڑے گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے پینٹ قمیص میں ملبوس کبھی حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ اور کبھی کلین شیو چہرے پر جس کے رنگ کو نہ سانولا کہہ سکتے ہیں نہ گندمی بلکہ دونوں کے مابین ایک دلکش رنگ ہے جو ان کے خد و خال سے جھلکتا ہے تو اس کے رنگ کے چھوٹے سے چہرے کے اوپر بڑا سا سر جس کے اوپر گھنی جھاڑیوں کی طرح الجھے ہوئے بڑے بڑے بال اور ان کے بالوں کے سائے میں عینک کی چلمن لگائے ہوئے ہونٹوں میں سگریٹ دابے ہوئے یا دہن کے کسی گوشے میں پان کی دو چار گلوریاں اکٹھا کئے ہوئے بڑے خلوص کے ساتھ جو شخص آپ کی طرف التفات و محبت کے ساتھ بڑھے اور کسی بھی اجنبی کو پانچ دس منٹ کی گفتگو میں موہ لے یا بور کر دے اس شخص کو ہم لوگ صمد حمیدی کے نام سے جانتے ہیں جو ایسٹرن ریلوے بھاگلپور کے مال گودام میں اپنے اوقات کا بیشتر حصہ صرف کرتے ہیں۔ نہ جانے کلکتہ کوچ، بہار، دلی، مشرقی پاکستان وغیرہ کتنے جہانوں کی سیر کر چکے ہیں جن دنوں ان کا قیام دلی میں ہوا کرتا تھا سنا ہے کہ اس زمانے میں مخمور سعیدی، ہنس راج رہبر، مخمور جالندھری، غلام ربانی تاباں، ظفر ادیب، پرکاش پنڈت، حسن نعیم، گوپال متل، شاہد علی، مخمور دہلوی مرحوم، نریش کمار شاد، استاد رفیق رسا، دھرم پال گپتا وفا، دیپک قیروز پوری، مہیش چندر نقش، دت بھارتی صدیقہ بیگم سیوہاروی، محمد اسمعیل آرٹسٹ، حسن رضا خوش نویس، جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، وامق جونپوری، سرور تونسوی، بسمل سعیدی، نظا انصاری، دیویندر اسر، گوہر دہلوی، کمل جین، اوم پرکاش نامی، شہزادہ تبسم، زبیر رضوی، قمر امروہوی، روشن لال، بھیم سین، طاہر صدیقی، بسنت کمار چٹرجی، عثمان علی شاہ جی، سحر عشق آبادی، گلزار دہلوی، انور عظیم، عشرت کرتپوری، اظہار اثر، کشمیری لال ذاکر، مولانا یحییٰ اللہ، بدر الحسن مرحوم، محمد یوسف مرحوم، بدیو متر بجلی، ساحر ہوشیارپوری، شہاب جعفری، شاہدہ باقی نکہت تاجور سامری، عبداللہ فاروقی، وشوا ناتھ درد، سلام مچھلی شہری، علامہ انور صابری، بلونت گارگی، فکر تونسوی، دیوان سنگھ مفتوں، جوش ملیح آبادی، حمیدہ سلطان صاحبہ، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، مضطر گونڈوی، خواجہ احمد فاروقی، افضل پشاوری، باقر مہدی، دتاتریہ کیفی مرحوم، ماسٹر گوبند سہائے، احسان دانش، سری نواس لاہوٹی، عبدالحمید عدم، سردار جعفری، کرشن چندر، راجب کبھی یہ

لوگ تشریف لائے، وغیرہ ہم کے ساتھ نٹ پیلیس، نرولا، گے لارڈ، موتی محل، شاہدرہ، دریا گنج، باڑہ ہندو راؤ، جامو نگر، چاندنی چوک، مینا محل، پہاڑ گنج، قرول باغ، بلی ماران، احاطہ کالے صاحب، سوئیوالان، گلی قاسم جان، لال کنواں، قاضی حوض، دریبہ کلاں، کوچہ قابل عطار، کوچہ پنڈت، لاجپت مارکیٹ، ایڈورڈ پارک اردو بازار اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کے ارد گرد دشت نوردی، اور ملنے ملانے میں مصروف رہتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر ادبی بحث مباحثوں میں پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ یا فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم سے حظ اٹھاتے تھے۔ پاکستان کو چھوڑ کر یہ ہندوستان کے کم ہی ادیب و شاعر ایسے ہوں گے جن سے نہ ملے ہوں۔

یہ احباب کے درمیان آج بھی بہت مقبول ہیں اور ان دوستوں کا خلوص و محبت ان کو حاصل تھا۔ اس لئے مذکورہ بالا ادیبوں اور شاعروں کے تمام پہلو ان کے سامنے روشن ہیں۔ اگر یہ آئینہ داری کا کام کریں تو ہم لوگ مکمل طور پر ان تمام ادیبوں، اور شاعروں کے تمام گفتنی اور ناگفتنی حالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر صمد حمیدی صاحب صاف و شفاف آئینہ ہوتے ہوئے بھی اس نازک موڑ پر آکر پتھر کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ پتھر سے شیشہ سازی تو بہت سے لوگوں نے کی ہے۔ لیکن شیشے کو پتھر میں تبدیل ہوتے ہوئے میں نے صرف صمد صاحب کو دیکھا ہے۔ اور اس جہت سے میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ویسے اگر فن کا جلال ان کے جمال پر حاوی ہو جائے تو یہ پتھر شیش محل بھی بن جاتا ہے اور اس کے ہر گوشے اور ہر زاویے میں مختلف ارباب فن کی عجیب عجیب شکلیں نظر آنے لگتی ہیں۔

جلال کی بات آگئی ہے تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ حمیدی صاحب کی شخصیت میں جلال کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ وہ کسی غلط بات یا غلط رائے کو برداشت نہیں کرتے۔ اور ہمیشہ دو ٹوک بات کہنے کے عادی رہے ہیں۔ اگر یہ جھک میں آجائیں تو کسی بھی دوست یا کسی بھی شاعر و ادیب کو ان کے منہ پر ایسی کھری کھری سنائیں کہ بس ان کے ہوش ہی اڑ جائیں۔ اس سے ان کی نازکیٔ طبع کا اندازہ کر سکتے ہیں نازکیٔ طبع کے سلسلے میں ایک دو مثالیں آپ کے سامنے رکھتا چلوں۔

بھاگلپور کے ادبی ماحول کے سلسلے میں انہوں نے اپنے قدیم دوستوں کو تعاون کے لئے خطوط لکھے جنہوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ لیکن عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کی فطرت میں جو تساہلی پائی جاتی ہے وہ ان کے وعدوں کی راہ میں حائل ہو گئی۔ احباب کو تقاضے کے دو چار خطوط لکھنے کے بعد انہوں نے ڈانٹ پھٹکار کی ایک نئی ڈکشنری مرتب کی اور پھر اس میں سے مہذب و متمدن لفظوں کو چن چن کر لکھنا شروع کر دیا۔ مگر ان کے اس عمل میں بھی ان کا خلوص کارفرما رہا چنانچہ ان کے دوستوں نے ان کے خلوص سے مجبور ہو کر اپنے وعدوں کی تکمیل میں جلد بازی کی۔ اور اس طرح انہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ملی۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ صمد حمیدی صاحب کام نکالنے کے طریقوں سے واقف ہیں اور ادیبوں و شاعروں سے نپٹنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ اور صرف اس حد تک یہ ایک بے حد عملی آدمی ہیں۔ صرف اس حد تک کی شرط کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور نجی زندگی کے مسئلے میں یہ دوسرے جمیل مظہری ہیں۔

جمیل مظہری صاحب اس قدر کھوئے کھوئے رہتے ہیں کہ انہیں اپنی اور کائنات کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ بس ہر وقت اپنے آپ میں گم اور جذب و کیف کا شکار، صمد صاحب کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے اور اس طرح ان کی دیوانگی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ مگر ان کی دیوانگی بھی باہوش رہتی ہے اقبالؒ کے لفظوں میں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں ؎

باچنیں زورِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

دوسرے لفظوں میں یوں تاویل کر سکتے ہیں ؎

نسیاں تو نہ تھا مرحلۂ ہوش و محبت
دیوانہ سمجھ بوجھ کے دیوانہ ہوا ہے

بہرکیف ان کی دیوانگی بڑی پیاری، دلکش، متین، باہوش اور سلجھی ہوئی ہے۔ ان کی شخصیت کی اس افتاد کا اثر ان کے ہر عمل سے نمایاں ہے۔ افسانہ نگاری ہو یا اردو ادبی زندگی کی داستان طرازی یہ ہر جگہ ہر روپ میں یکساں نظر آتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ مومن کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو صمد حمیدی کے مومن ہونے سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے وہ تو شکر ہے کہ اقبال کی نگاہ ان پر نہ پڑی ورنہ عجب نہ تھا کہ وہ مرد مومن کی تعبیر کے لئے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ انہیں کا انتخاب کرتے۔

ظاہر و باطن کی اسی یکسانیت نے ان کو اخلاقی جرأت عطا کی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی رائے کا بلا تامل اظہار کر سکتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی برائی پیٹھ پیچھے نہیں کرتے بلکہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں جب کسی شخص کی شکایت اس شخص کے سامنے کر سکیں۔ شاغل قادری کا مسئلہ ہو یا محی الدین غنی اور لطف الرحمٰن کا ——— وہ شکوہ کرنے یا جھگڑنے کے لئے رونمائی کے قائل ہیں۔ ان کی اس ادا میں بھی ایک ترکانہ روش کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے کئی مواقع پر ہوا۔ مثلاً ایک بار دوران گفتگو میں واہی کا ذکر آ گیا۔ صمد صاحب واہی اور میرے گہرے مراسم سے واقف تھے اس کے باوجود انہوں نے واہی کے متعلق اپنی رائے کو کسی مصلحت کے پیش نظر نہیں رکھا اور صاف گوئی کے ساتھ یہ کہا کہ واہی اس عہد کا سب سے بڑا فراڈ ہے۔ میں نے ان کی اس بات کی تردید کرنی چاہی۔ لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے اور بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ صمد حمیدی کا مشاہدہ و تجربہ بڑا حقیقت پسند تھا۔ وہ اس خیال سے اتفاق رکھتے ہیں کہ واہی نے پرانے موضوعات، مشہور حکایات، اور لطائف و ظرائف کو نظم کر دیا ہے۔ ان کے یہاں تخلیقی صلاحیت کی بے حد کمی ہے وہ صرف قافیہ پیمائی کرتے ہیں۔ اور اردو ادب کے اندھے ناقدوں کو پتہ نہیں کن جہات سے اکبرالہ آبادی کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ واہی سے زیادہ سچا، مخلص، کامیاب، ایماندار اور باریک بیں طنز و مزاح نگار شاعر تو "تلخ زمانی" ہے اب میں معاملہ اردو کے ناقدوں پر چھوڑتا ہوں۔

میں نے صمد حمیدی صاحب کی نازکی طبع کی بات بھی کی ہے اس لئے کہ ان کی سیرت میں یہ عنصر پوری طرح موجود ہے، ایک صاحب سے وہ اس لئے خفا ہوئے کہ ایک بار جب وہ ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے تو وہ اپنی موٹر میں بیٹھ کر کہیں جانے کو تیار تھے چونکہ اُن سے ان کے بہت دیرینہ مراسم رہ چکے تھے مگر اس بندۂ خدا نے گاڑی سے اترنے کی بھی زحمت نہ کی اور ایک دو بات کر کے چلتا بنا۔ صمد حمیدی صاحب کو ان صاحب نے جس طرح نظر انداز کیا تھا وہ حقیقتاً ایک غیر شریفانہ فعل تھا اور کوئی بھی حساس و شریف آدمی اس پر برہم ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صمد حمیدی صاحب بیحد برافروختہ ہوئے اور آج تک کبیدہ خاطر ہیں ان کا کہنا ہے کہ "ادیب کو پہلے ادب و اخلاق کا درس لینا چاہئے بعدہٗ تخلیقی اور ادبی کاوش سے جو ادیب و شاعر اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو گا۔ آخر اس کے ادب میں پایا بھی کیا جائے گا؟"

میں نے صمد حمیدی صاحب کو بھاگلپور کی ادبی مجلسوں "میکدہ" کی نشستوں اور اکثر و بیشتر راہ چلتے دوستوں کے درمیان دیکھا تھا اور ان کی شخصیت کے نشیب و فراز اور نفسیاتی رجحان و میلان کو سمجھنے کی کوشش کی تھی، میں اپنی ان کوششوں میں جس حد تک کامیاب ہوا اس کا اظہار درج بالا سطور میں کر چکا ہوں، مگر میرا یقین ہے کہ صمد حمیدی کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے نجی ملاقاتیں بھی ضروری ہیں کیونکہ ایسی ہی ملاقاتوں کے بعد ان کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردے

نکلا ہوں سے اٹھے، غالباً کوئی تہوار کا دن تھا جب انہوں نے ہم لوگوں کو اپنے دولت کدہ پر کھانے کی دعوت دی۔ مجھے اس کے قبل یہ علم نہیں تھا کہ حضرت کوہ قاف پر رہتے ہیں۔ اور وہ کوہ قاف بھی ایسا ہے کہ جہاں کوئی سرخ پوشے اور سبز پوشے ہر وقت ان کے انتظار کی راہ میں آنکھیں بچھائے رہتی ہیں۔ جب ہم لوگ محمد صاحب کے ساتھ ان کے گھر کی طرف بڑھے تو انہوں نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور باہر کے بڑے دروازے میں پڑے ہوئے تالے کی جبر توڑ دی۔ میں نے سمجھا کہ محمد صاحب ان دنوں تنہا رہتے ہیں اس لئے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر دوسری منزل پر پہونچنے سے قبل آپ نے میری رفتار سے زیادہ تیز آواز میں مجھے روکنا شروع کیا اور تب جاکر یہ راز کھلا کہ حضرت تنہا نہیں تھے بلکہ وہاں ان کی نصف بہتر بھی موجود تھیں کوئی دوسرا ہوتا تو پتہ نہیں اس واقعے کو کس زاویئے سے دیکھتا اور عین ممکن ہے معاملہ محمد صاحب کی خود اعتمادی کے خلاف جا پڑتا یا تان کسی تخن گسترانہ بات پر ٹوٹتی۔ مگر اس واقعہ کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ کہ حضرت رات گئے تک دوستوں کی محفل میں چہکتے ہیں جس کے نتیجے میں ہر رات (اگمان یہی گذرتا ہے) ان کو اپنے گھر میں ایک مہا بھارت کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہوگا۔ اس ہر شب کی مہا بھارت سے بچنے کے لئے آپ نے یہ تدبیر نکالی کہ گھر سے باہر جاتے ہوئے دروازے کو مقفل کر گئے۔ اور جب رات گئے واپس ہونے تو دبے پاؤں بلی کی چال سے چلتے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوئے اور وہاں جو کچھ بچا کچھا ملا۔ اس کو اپنے بھاگ کا لکھا کر چٹ کر گئے۔

یہ ساری باتیں ایجاد بندہ کے طور پر زیب داستاں بنا لائی ہیں ورنہ حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ گھر کے لوگوں کی نیند میں مخل ہونا پسند نہیں کرتے۔ یہ ان کی انسانیت، شفقت اور دوسروں کے دکھ درد کا احساس رکھنے پر دلالت کرتی ہے۔ اور سارے لوگوں کے لئے درس عبرت ہے۔ بہرکیف جب ہم لوگ دستر خوان پر بیٹھے تو ان کی مہمانداری کے جذب و شوق سے بجد متاثر ہوئے، انہوں نے جس اپنائیت اور محبت کے ساتھ لجنذ ہو ہو کر ضیافت فرمائی وہ اس پر تکلف اور پر تصنع دور میں ایک نادر مثال معلوم ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پھر اس کے بعد سے کوئی ایسا سنہری موقع ہوز نہیں آیا ہے۔ لیکن مایوسی مذہب اسلام میں حرام قرار دی گئی ہے۔ اس لئے اب بھی ہم لوگ ان کی عنایات بے پایاں کے شدت سے منتظر رہتے ہیں خصوصاً شاغل قادری صاحب اپنے مخصوص انداز میں اس کی تجدید کا تقاضہ کرتے ہیں۔

محمد صاحب جاہ و منصب، مال و منال اور شان و شوکت کے اعتبار سے کوئی بڑے آدمی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک بے حد چھوٹے آدمی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ یہ کبھی بڑا بننے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کو انسان ہونا چاہئے۔ بڑا بننے کی خواہش ——— آدمی انسانیت کے مرتبے گرادیتی ہے۔ ان کے اس انداز فکر میں ان کی شخصیت اور سیرت کی ساری عظمت، سارا حسن، سارا اجمال، اور ساری شرافت پنہاں ہے میں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات کی ہے اور میرا تجربہ ہے کہ ہر شاعر اور ہر ادیب خودستائی اور تعلی کی شدید خواہش اپنے سینے میں چھپائے رکھتا ہے۔ تمیدی واحد شخص ہے جس میں یہ عیب نہیں نہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے نہ ممتاز افسانہ نگار، حالانکہ وہ ایک عظیم انسان اور ایک ممتاز ادیب ہے۔ مگر ان کی مسکینیت اور ان کی خاموشی آسانی سے اس کا احساس ہونے نہیں دیتی یوں تو ہر آدمی کسی نہ کسی اعتبار سے کسی نہ کسی حد تک خطرناک ضرور ہوتا ہے۔ موصوف بھی کچھ کم خطرناک نہیں، بقول شاغل قادری ان کو دل کی

باتیں نہیں بتانی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ گربہ مسکین بن کر آپکی ساری باتیں آپ کے سینے سے نکال کر اپنے ذہن میں منتقل کر لیں گے اور پھر ان باتوں کی بنیاد پر کسی نہ کسی کہانی کا پلاٹ مرتب کر لیں گے اور اس طرح وہ بات جو از درون خانہ کے مصداق تھی، طشت از بام ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاغل صاحب کے اس بیان پر ایمان لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ موصوف کچھ اسی طرح کے بزرگ واقع ہوئے ہیں۔

صمد صاحب کی سب سے پسندیدہ ہابی آٹوگراف لینا اور کتب و رسائل کا جمع کرنا ہے۔ وہ اس کے لئے تمام ممکنہ اور غیر ممکنہ صورتیں اپناتے ہیں یہ بات ان کے مخلص ترین دوستوں نے بتلائی ہے۔ دروغ برگردن راوی۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی ذاتی لائبریری میں اردو کے اکثر و بیشتر رسائل و جرائد اور اچھی بری کتابیں مل جا سکتی ہیں۔ اپنے اس ذوق کی تکمیل کے لئے وہ بے انتہا پیسے خرچ کرتے ہیں اور بے اندازہ زحمتیں اٹھاتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا کتب خانہ بخیلوں کے خزانے کی طرح نہیں ہے یہ دوسرے کو اس سے استفادہ کرنے کی ساری سہولتیں بہم پہونچاتے ہیں جن لوگوں کو فن تحقیق سے دلچسپی ہے وہ صمد صاحب سے رجوع کر سکتے ہیں۔

بھاگلپور کے اساتذہ محترم اور کچھ معزز فنکار بھی آپ کو "استاد" کے لقب سے یاد کرتے ہیں میں نہیں کہہ سکتا اس حادثہ کے پس پردہ سنجیدگی اور متانت کا کتنا عنصر ہے۔ اور طنز و مزاح کا دخل کس حد تک ہے۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جب یہ اس نام سے یاد کئے جاتے ہیں تو اس کی حقیقتوں کو سمجھتے ہوئے بھی خوش ہوتے ہیں اور کبھو کبھو اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیا۔

یہ ایک طرفہ تماشا ہے کہ ان کے دوستوں کی غالب اکثریت شاعروں کی ہے۔ مگر آج تک کوئی مصرع موزوں کرنا تو در کنار کبھی کسی شاعر کا مکمل شعر بھی نہیں سناتے۔ یہی نہیں شاعروں پر طنز کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ کبھی کبھی تو بڑے جارحانہ انداز میں شعر و سخن کے ساتھ شاعروں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر یہاں پر ان کی ساری حرکات و سکنات محض ظاہری ہوتی ہیں۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ وہ صد درجہ شاعرانہ ذہن و مزاج رکھتے ہیں۔ اور سخن فہمی کی صفتوں سے کماحقہٗ متصف ہیں اور اچھے اشعار کی داد دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔

میں نے ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کی آئینہ داری کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے اس کا احساس ہے کہ میں خاکہ نگاری کا حق ادا نہیں کر سکا۔ ان کی شخصیت جتنی متنوع ——— ہمہ گیر اور وسیع و عریض ہے ان سب کی عکاسی کے لئے دفتر چاہیئے اور پڑھنے کے لئے فرصت کے طویل اوقات جو نہ مجھے میسر ہیں نہ آپ کو اس لئے آپ سے اس گذارش کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ اگر آپ ان کو مزید پڑھنے اور سمجھنے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں تو کوہ قاف کی سیر کیجئے۔ یا شاغل صاحب کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ان کو ——— ان کے افسانوں میں تلاش کیجئے۔

زندگی کی رہگذر پر

از ــــ صمد حمیدی

شاعری اور یہ شہر ؟ اس لئے بڑی اجنبیت محسوس کی جہانگیر شوروا والے کی تقریروں نے اس کا مزاج کھٹا کر کے رکھدیا

"دو قومی نظریہ بھی کوئی نظریہ ہے ؟" اس نے سوچا "آخر لوگ کیوں نہیں اس پہ سنجیدگی سے غور کرتے ، کیوں وہ اس بہاؤ میں بہے چلے جاتے ہیں ۔ ورنہ بھی تو لیڈر ہیں لیکن قائد اعظم کی منطق نرالی ہے ۔ جداگانہ قومیت ، مذہب ، کلچر ، زبان اور رسم و رواج خوب ستدلال ہے بھئی ؟"

"پیارے سلام تم نے آج جہانگیر شوروا والے کی تقریر سنی ۔ دل تو چاہتا تھا کہ پکڑ کر منہہ نوچ لوں ظالم کے ، کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا ؟"

"چھوڑو یار ، تم کس کی باتیں کرنے لگے ۔ ہمیں اس سے کیا کام ـــــ ؟" پڑھائی سے مطلب رکھنا چاہیئے ، سیاست کی بازی گری ہمیں ابھی راس نہیں آسکتی ـــــ ؟ ہوسٹل کے کمرے میں یہ آواز گونج کر رہ گئی ۔ اسکول کے ہوسٹل میں وہ دونوں رہتے اور سیاست حاضرہ پر اکثر تبصرہ کیا کرتے ، شاعری پڑھ پڑھ کر حصہ لیتا ۔

"نہیں پیارے ! ایسا سوچنا بھی کفر ہوگا ۔ آج ہم سیاست سے اپنی زندگی کو الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے ۔ اس کی لہریں آج ہر ایک در و بام سے ٹکرا رہی ہیں تو آج ہم کیوں محروم رہیں ۔ وقت کی آواز پہچاننا ہی آج ہر ہندوستانی کا فرض ہے ۔ ہم اپنے مادر وطن سے غداری نہیں کر سکتے ، چوڑیاں پہن کر گھروں میں نہیں بیٹھ سکتے ۔ ہم وطن فروش اور بزدل نہیں ؟" جوش سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا

اس نے اپنے ساتھی کو کلے کی کانوں اور چمنیوں سے اٹھتی ہوئی لکیروں پر نظر کی ، کالے بھجنگ مرد ، عورتیں ، بوڑھے بچے ـــــــــ سب اس کی نظر میں کھپ کے رہ گئے کسی کی اصل شکل پہچاننی مشکل ہو گئی ۔ رہنے کیلئے ان کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ، غربت اور افلاس میں پلے ان کے جسم تھے ، بیماری ، وبا ، روگ در قسم تھے ۔ گھڑ گھڑ کرتی کرینیں (crane) تھیں دور تک سٹرٹ کرتے ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے تھے ۔ ان کے انجن فضاؤں میں نغمیں بکھیرتے رہتے معلوم سا ہوتا جیسے دور کوئی بانسری کی لے بہہ لہریا ۔ پپیہا اور بھٹیالی گا رہا ہو ۔ بھونپو کی آواز کے ساتھ مزدوروں کی کھیپ کی کھیپ امڈ پڑتی جیسے برساتی ندی نالے ، لہلہاتے پودے خود رو گھاسیں ۔ ان میں رینگتے ہوئے طرح طرح کے کیڑے مکوڑے اور ٹڈیاں ـــــ ٹڈیوں کے دل بادل پورے شہر کو اپنے احاطے میں کر لیتے ۔ ہماہمی اور گہماگہمی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ـــ چائے خانے زندہ ہو اٹھتے ۔ سینما گھر نئی دلہنوں کی طرح سج اٹھتے ۔ قہقہے ، نغمے ، خوشیاں ـــ آہیں ، کراہیں

بکھر کر رہ جاتیں۔ لوگ مین روڈ سے چوتھائی گلی — چوتھائی گلی سے سنیما گھر اور مین روڈ کا چکر کاٹتے رہتے، کچھ منچلے ایسے بھی ہوتے جو بیٹھنوں میں ٹھرّے کے مزے اُڑاتے اور پکی کلالی کا طواف کرتے۔ سودے ہوتے اور نرم گرم اور کھلائی جوانیاں بکتی رہتی۔ خوشیاں خریدی جاتیں۔ اور سکّے کی جھنکار پر مجروح جوانیاں اپنے آپ کو لٹانے کیلئے بیتاب رہتی — لیل ونہار بدلتے رہتے — رات کے بعد دن ہوتا — شام ہوتی اور پھر صبح میں بدل جاتی — شاہد نے یہ سب کچھ دیکھا تو سوچنے لگا

"کیا یہی وہ دنیا ہے — اس کی نیرنگیاں اور بوقلمونیاں ہیں جن کے خواب میں اکثر دیکھا کرتا تھا — کیا میں نے کتابوں میں یہی سب کچھ پڑھا ہے، نہیں — نہیں ایسا نہیں ہو سکتا —؟" مین روڈ کے دلکش ہوٹل میں اس نے اپنے خوابِ محل کو سجانے کی کوشش کی۔ اُسے دلکش پھولوں اور تبسموں سے لاد دیا۔ ایک آدرش شہر اس کے ذہن میں رینگ کر رہ گیا، خوبصورت اور حسین لوگ اس میں آکر بسنے لگے۔ نت نئی پوشاکیں پہنے گلکاریاں کرتے نظر آئے لیکن یہ کیسا شہر ہے، کیسے لوگ تھے کہ باوجود کوشش کے نہ سمجھ پایا — یہاں تو بدشکل چہرے، کمھلائی جوانیاں اور غریبی اور مفلسی میں ڈوبی مسرتیں تھیں۔

"آخر یہ کیوں تھا — کیوں؟" اس نے ہوسٹل کے کمرے میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ خلافت، موومنٹ اور سودیشی تحریکات نے اس کی آنکھیں کھول ڈالی تھیں۔ ۳۵ کے نیا قانون نے اسے یک گونہ خوشی و مسرت بخشی تھی۔ بالغ نظر ور کم عمر سیاستدانوں، کھدر کی قمیص، پائجامہ، جیکٹ اور ٹوپی میں تو بالکل دولہا نظر آتا۔ عمر تو اس کی کوئی خاص نہ تھی لیکن مطالعہ مشاہدہ اور تعلیم کیساتھ تھا ملک میں اٹھتی جذباتی لہروں نے اسے قبل از وقت سنجیدہ اور فہمیدہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر چیز کا سیاق و سباق میں جائزہ لیتا۔ تجزیہ اور تحلیل نفسی کرتا اور جب تک پوری تسلی اور تشفی نہیں کر لیتا اپنے خیال و نظریے پر ڈٹا رہتا۔ رہنماؤں کی زندگی سے کسب نور کرتا۔ ناخنِ تدبیر سے اپنی سمجھ کیمطابق سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا اکثر اپنے اسکول کے اور ہوسٹل کے ساتھی سلام ندوی سے الجھتا رہتا۔

— ایک دن وہ "ٹپ ٹاپ ریسٹورنٹ" میں شغل چائے نوشی کر رہا تھا کہ جہانگیر شوروالے نے آکر اس کے طلسم خیالات کو توڑ دیا — ڈائنامیٹ لگا کر اس کے پرخچے اڑانے اور دھمکانے لگا "عزیزمن اپنے سودیسی خیالات و نظریوں سے باز آجاؤ۔ مجھے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے —؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں جناب کو اس میں کیا خوبی نظر آتی ہے؟ جبکہ ..... اُس نے بات کو کاٹ کر کہا

قبلہ گاہی، غصّہ سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا

"خوبی اور خرابی کی بات جانے دیجئے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ کل لوگوں کے خیالات یکساں ہوں، مختلف طبائع و رجحانات کے لوگ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ تو پھر اس طرح کا احتساب کیوں ہو —؟"

"خیر میاں! نیک و بد سمجھا کے دیتا ہوں، یہاں پر میرا حکم چلتا ہے۔ ایک میاں میں دو تلوار نہیں سما سکتی —؟

آپ کی گرانقدر نصیحتوں کا شکریہ۔ چنیر اُن پر عمل کرنے کی کوشش کریگا اور کوئی حکم جناب والا؟"

حکم نہیں بلکہ ایک آرزو۔ جہانگیر شوروالے نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنا کچھ وقت رخشندہ کیلئے دینا ہوگا۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے اور آٹھویں جماعت کی طالبہ ہے۔ میں معقول رقم

ہر ماہ دینے کو تیار ہوں ؟"

"تو گویا آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں، نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج بھی دیدیں تو میں ایسا نہیں کر سکتا، انسانیت وشرافت کی بات دوسری ہے۔ آپ کو بہت سے ماسٹر مل جائیں گے۔ کیا کمی ہے آپ کو خدا نے ہر چیز دے رکھی ہے ——— روپیہ پیسہ ——— عزت شہرت :

"خیر یوں ہی سہی، جہانگیر شورا والے نے اس کی پیٹھ کو تھپکی دی۔

"بات ایک ہی ہے صرف سمجھ کا پھیر ہے۔ دیکھئے کل سے جہانگیر منزل تشریف لے آئیگا۔ رخشندہ سے کہدوں گا ——— وہ آپ کا انتظار کرے گی ———

رخشندہ ——— بھری پری نک سک سے درست ایک ناکتخدا لڑکی تھی ——— جوانی اپنا ڈورا ڈالے اسکو اپنی آغوش میں لینے کیلئے تیار تھی۔ پڑھتے وقت اکثر شوخی اور چنچلتا کا مظاہرہ کرتی رہتی طرح طرح کے سوالات سے شاہدی گھبرا جاتا۔

"رخشندہ! بھئی پڑھنا ہے تو پڑھو ورنہ میں تو چلا ——— میں آپ کے سیدھے سوالات سننے کیلئے یہاں نہیں آیا "

"ماسٹر صاحب پلیز! آپ تو خفا ہو گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں میرا کوئی نہیں ——— اماں نہیں ——— بہن بھائی نہیں تو پھر لاڈ پیار کروں کس سے ؟

"اس کے معنی یہ نہیں کہ تم میرا دماغ چاٹو۔ کام کی بات کرو کام کی ؛" اس نے اسے زور سے جھڑک دیا

"ابا! اس نے جہانگیر شورا والے سے شکایت کی

"یہ شاہدی صاحب بڑے وہ ہیں، میں نے ذرا سنیما چلنے کی بات کی تو مولانا مجھے لکچر پلانے لگے :

"اچھا بھئی اچھا میں کہدونگا؛ تم اطمینان رکھو ؟"

"بھئی شاہدی صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں، رخشندہ ذرا تفریح کے لئے کہہ رہی تھی۔ آپ کیوں نہیں گئے۔ بن ماں کی بچی ہے خیال کرنا ہی چاہیئے ۔"

"جی شریعت کے خلاف میں کوئی کام نہیں کر سکتا ؛"

"ارے تم سے بڑے ہو ؟ ثواب گناہ کیا ہے۔ میں سمجھائے دیتا ہوں ——— جو کر نہیں سکتے وہ ثواب اور جو کر ڈالو وہ گناہ ہرگز نہیں ہوتا :

شاہدی نے لکچر میں کوئی خاص لطف نہیں لیا۔ اس پر گناہ و عذاب کا غلبہ طاری رہا۔ رخشندہ جب کسی رومانی مناظر پر شاہدی کے کندھے سے جا لگتی تو وہ بڑی الجھن اور کوفت محسوس کرتا۔

"اللہ ——— اللہ توبہ ——— کیا کرتی ہو رخشندہ۔ ٹھیک سے بیٹھو بھئی :"

رخشندہ چونک پڑتی اور آنکھوں میں لال لال ڈورے کھنچ گئے۔

"ماسٹر صاحب، ماسٹر صاحب! آج کا اخبار دیکھا آپ نے یہ دیکھئے جناح صاحب کی صاحبزادی نے ایک پارسی سے شادی کر لی ؟

"بھئی مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ اپنے ابا میاں کو سمجھاؤ بڑے بنتے ہیں وہ ان کے ——— ہر وقت مسلم لیگ اور قائد اعظم کے جھنڈے گاڑتے رہتے ہیں ——— ؛"

"شاہدی میاں حد ہے بھی آخر اسمیں حرج ہی کیا اگر میری بیٹی آپ سے شادی کیلئے تیار ہو جائے تو اس میں خرابی کیا ہے۔

اور میں کون ہوتا ہوں روک یا مدد کرنے والا۔ یہ تو خوشی کا مقام ہے ——— اتنی تو آزادی ملنی ہی چاہیئے غریب کو ——— یہی اسلام کی تعلیم ہے۔" حدیث شریف ہے۔

شاہدی کے دماغ چٹ کھل کر رہ گئے!

اس نے ابھی امتحان سے فرصت کی تھی کہ سیاسی فضا میں بھونچال آنے شروع ہو گئے۔ مسلم لیگ اور کانگریس اپنی اپنی کامیابی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگی۔ شاہدی کے لیے چپ بیٹھنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے ۴۲ء کی تحریک میں نمایاں حصّہ لیا اور ہزاری باغ جیل میں ڈال دیا گیا۔ تین مہینے بعد جب رہا ہو کر آیا تو اس کے ہاتھ میں یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ ساتھ آزادی کا خوش آئند تصور بھی تھا۔ اس نے مارڈلی انجینئرنگ ورکشاپ میں سروس کرلی۔ رانا صاحب مستر ورکشاپ آفیسر اُسے بہت مانتے اور اکثر جہانگیر شور والے اور رخشندہ کے بابت باتیں بتلاتے رہتے ——— کبھی شاہدی:" ایک دن مستر صاحب نے مشورہ دیا "رخشندہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے، جب کبھی ان کے یہاں جاتا ہوں تمہارا ذکر رہتا ہے۔ کیوں نہیں جاکے مل آتے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے وہ۔"

"چھوڑیئے بھی مستر صاحب ——— کہاں کا آنا ——— کہاں کا جانا ——— یہیں ٹھیک ہوں ——— چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

مارڈلی ورکشاپ دن رات چلتا رہتا۔ دوسری جنگ عظیم کے سامان فراہم کرتے رہتا۔ شاہدی کو اب سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ اکثر وہ آزادی کی نظمیں گنگنایا کرتا۔ پھر کیا دل میں سمایا کہ ورکشاپ کی اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر کستور کولری ——— چلا گیا اور اپنے بھائی کے پاس رہنے لگا۔ بھائی نے سمجھانا شروع کیا:" میاں دنیا میں اگر کچھ کرنا ہے تو تعلیم حاصل کرو۔ بڑی بڑی ڈگریاں لو۔ ابھی تمہارے پڑھنے کے دن ہیں۔ کچھ دنوں میں تمہیں پٹنہ بھیج دوں؟

شاہدی نے پٹنہ جنکشن پر اتر کر قلی کو آواز دی، سامان اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر آنے لگا تھا کہ ایک نسوانی آواز نے اُسے چونکا دیا" ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب!!"

اس نے مڑ کر دیکھا سامنے ویٹنگ روم کے دروازے پر کھڑی رخشندہ آواز دے رہی تھی۔

"رخشندہ تم یہاں کہاں ——— تمہارے ابا نظر نہیں آتے"

"جی وہ یہیں کہیں ہونگے" میں میٹرک کا امتحان دینے یہاں آئی تھی۔

"اچھا بڑی خوشی کی بات ہے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے!"

چلوں بھی دیر ہو رہی ہے ——— بہت سارے کام کرنے باقی ہیں۔"

"کام ——— کام ——— کام، رخشندہ کو غصّہ آ گیا

یہ شاہدی صاحب بھی خوب آدمی ہیں، پتھر کے بنے ہیں شاید۔ ذرا بھی مروّت نہیں آنکھوں میں ——— بس ہر وقت ——— کام ——— کام ——— کام ——— کام کرنے کیلئے زندگی پڑی ہے کرتے رہیں نا ——— کون منع کرنیوالا ہے ———؟!"

شاہدی نے دل میں سوچا

"میری جان اتنی بھی بے چینی! ابھی نہیں۔ ابھی گیسو سے محبت نہیں گیسوئے انقلاب کو سنوارنے کی ضرورت ہے ——— یہی وقت کی پکار ہے۔ وطن کی للکار ہے"

قحط بنگال اور دوسری جنگ عظیم کے نقشے نے اسکی آنکھیں کھول ڈالیں۔ اب جنگ دو ملکوں کے درمیان نہیں —— فاشیت اور انسانیت کے درمیان ہو رہی ہے۔ آئے دن جنگی نقشوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ "آزاد ہند فوج" کے قیام نے اس کے دل کو مہمیز کیا۔ تصورات کے پروں پر سوار وہ آئی۔ این۔ اے میں شامل ہو جاتا —— انگریزوں سے دست بدست لڑائی کر کے بڑی فرحت محسوس کرتا۔ جنگ نے اتحادیوں کے حق میں فتح و کامرانی بخش دی تھی۔ ہر جگہ فاشسٹ وں کو بری طرح شکست ہو رہی تھی بالآخر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے پہلے تجربے نے فاشسٹوں کے بالکل کس بل نکال دیئے اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ ایٹم بم کی تباہ کاریوں نے دو بڑے شہروں کو خاک و خون میں لت پت کر کے رکھ دیا۔ ملبے کے ڈھیر نے صفحۂ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ ہر طرف خاک و خون —— گوشت اور لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ بعض وقت اسے اپنے رہنماؤں پر بڑا غصہ آتا

"آخر وہ کیا سمجھ کر دشمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کیوں نہیں ہمارے بھائی بندوں کو محاذ جنگ پر جانے سے روکتے۔ کیوں نہیں وہ اپنے دشمن کو بھی —— جس نے جلیان والا باغ میں ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ہمارے ہیروؤں کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر خوشی کے شادیانے بجائے تھے —— شاہدی سوچتا اور سوچتا ہی رہ جاتا

اس درمیان اس نے انٹرمیڈیٹ کر لیا تھا۔ بی۔ اے وہ نہیں کر سکا تھا۔ سیاسی اندولن نے اس کو کب چین سے بیٹھنے دیا کبھی قحط بنگال میں مرتے کراہتے کی خبر لیتا تو کبھی سارن، چمپارن اور گیا کے کسانوں کے شانہ بشانہ کام کرنے پہنچ جاتا۔ کبھی جھریا۔ کترآس گڈھ اور کمار ڈبی کے مزدوروں کو انقلاب اور آزادی کا سبق پڑھانے نکل جاتا

رخشندہ اس درمیان پھول بن کر سرگوشی کی لبھانے لگی تھی۔ اس کے لوگ بھی دور دور سے آکر اس کے گرد چکر کاٹتے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ وعید کرتے لیکن اس کی نظر میں بس شاہدی ہر وقت سمایا اشارے کنائے کئے کرتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شاہدی شاہانہ جوڑے میں ملبوس شو نے چاندی کے رتھ میں سوار اپنے شکنتلا کو لینے کے لئے بڑھا چلا آرہا ہے۔ وہ اس کی طرف لپکتی چلی جاتی کہ ایک زوردار قہقہہ پڑتا۔

"پگلی! پنچھی اور پردیسی بھی کسی کے میت ہوئے ہیں۔ تم نے اس کے لئے اپنی زندگی برباد کی۔ گھر پر آئی برات کو لوٹا دی —— شرم —— شرم —— شرم ——"

"نہیں —— نہیں چپ رہو" وہ چیختی چلاتی "وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ مجھے لینے کیلئے آئیگا۔ خوبصورت گھوڑے اسکے ہوں گے۔ بگھی اور پالکی اس کی ہو گی اور میں اس میں سوار دور بہت دور چلی جاؤنگی —— تم لوگوں سے دور —— جہاں پھر تمہارے قہقہے سنائی نہیں دیں گے —— منحوس صورتیں دکھائی نہیں پڑیں گی ——"

جنگ کے خاتمے کے ساتھ آزادی کی تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ خودمختاری اور آزادی حاصل کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی جے کار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

گورے آقا جنگ آزادی کا مطالبہ کرنے ہندستان میں

تشریف لے آئے۔ شملہ کانفرنس نے کانگریس اور مسلم لیگ میں
ایک گرہ اور ڈال دی۔ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے مسلک
پر ڈٹی رہیں۔ ان کے لیڈروں کے مابین کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا
یوم دستور العمل اور یوم احتجاج کلکتہ نے وہ غنڈہ گردی دکھلائی
کہ توبہ ہی بھلی —— اس کے چھینٹے نواکھالی میں پہنچ کر ہندو
قومیت کا ناس کرنے لگے۔ لیڈروں کی بن آئی، ہر خاص و عام
میں انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر بہار —— صوبہ متحدہ آگرہ و
اودھ میں وہ اکھیڑ پچھاڑ مچی کہ اللہ دے اور بندہ لے شاہدی کا
تصورِ آزادی کھنگ ہونے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا
کہ اس کے سنہرے سپنے کی اتنی گندی اور گھناونی تعبیر دیکھنے میں
آئے گی۔ برابر کڑھتا اور رنجیدہ خاطر رہتا۔ کبھی کلکتہ کے بےکسوں
اور مجبوروں کی مرہم پٹی کرنے پہنچ جاتا تو کبھی نواکھالی کے خانماں
برباد شرنارتھیوں کی دیکھ بھال کیلئے رضاکاروں کے ساتھ مل
کر کام کرتا —— پٹنہ —— گیا —— نوادہ —— اسلام پور
—— عظیم سرائے —— تارا پور —— لکھن پور اور مڑرو کھگیا
کے مہاجروں کے چشم دید حالات نے اس کے رونگٹے کھڑے
کر دیئے۔ نیزوں پر چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو اچھالنا ——
پیٹ چاک کر کے حمل ضائع کر دینا —— کیلیں ٹھونک کر ——
باپ، بھائی اور شوہر کے سامنے ان کی بیٹیوں، بہنوں ——
بیویوں اور ماؤں کو ذبح اور آبرو ریزی کرنی اور اٹھا کر لے
جانا، گھروں کو نذرِ آتش کرنا —— اسے ابھی بھولا نہیں تھا۔ اسے
حیرت ہوتی کہ آخر ہمارے نیتا کے کھیوٹیا کیوں نہیں اس شیطنت
کو ختم کرانے کیلئے مؤثر قدم اٹھاتے —— کیوں نہیں وہ حکومت
وقت پر دباؤ ڈال کر بہیمیت کا ناس کرتے۔

بات چیت لندن کی گفت و شنید بھی آزادی کا عقدہ
حل نہیں کیا —— بات چیت ناکام ہو گئی۔ اور نتیجے میں دی

یو۔ پی۔ پنجاب۔ بمبئی اور راجپوتانہ میں خون سے ہولیاں کھیلی
جانے لگیں۔ چیخ و پکار —— آہوں کراہوں اور نالہ و شیون
سے انسانیت دم توڑ چکی۔ بہیمیت کا ہر طرف راج ہو گیا۔ صدیوں کے
مان مریادا کو آن واحد میں ختم کر کے رکھ دیا گیا۔ لارڈ ویول کی جگہ
لارڈ ماؤنٹ بیٹن —— گورنر جنرل بنا کر بھیجے گئے۔ عارضی جمہوری
حکومت نے گفت و شنید کر کے ۳ر جون کے اعلانیہ پر دستخط
کر دیا۔ اور عوام کو اپنے نشریہ کے ذریعہ پیغام آزادی سنایا ——
ہندستان تقسیم کر دیا گیا۔ اور ایک نئی اسلامی ریاست وجود میں
لائی گئی۔ شاہدی نے سنا تو بھک ہو گیا۔ وہ کڑھنے لگا۔

"ہمارے لیڈروں نے ایسی سودے بازی کیوں کی ——؟
کیوں وہ لنگڑا لولا ہندستان لینے پر تیار ہوئے۔ تکونا دیش
آخر کس کام کا ——؟"

غلامی کی زنجیروں نے اس کے پاؤں بوجھل کر دیئے۔ وہ
بلبلا کر رہ گیا۔

"نہیں —— نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا؟" اس
نے چوتھائی گلی کے بس ڈپو پر موٹر سے اترتے سوچا، پو پھٹ
رہی تھی اور نئے آدم کو سلام کرنے کیلئے سورج طلوع ہو رہا تھا
جن گن من —— سے فضا گونج رہی تھی۔ سنہری دھوپ اپنی زریں
کرنوں سے کائنات کے شے شے کو اپنی آغوش میں لے کر بھینچ رہی
تھی۔ ہر کہہ و مہہ کا چہرہ لال گلال ہو رہا تھا۔ آزادی کا نور ہر کے
چہرے سے ہویدا تھا۔ ایک افسردہ جوانی نے اس کا رستہ
روک لیا۔ نظریں اٹھا کر دیکھیں تو اس کے حیرت کی انتہا نہ
رہی۔ وہ پھٹا پرانا کپڑا —— میلی کچیلی ساڑی —— سفید چیتھڑا
بلوز۔ کیا یہی بھارت کا نیا نقشہ ہے۔؟"

آپ آ گئے —— آپ آ گئے۔ میں نہ کہتی تھی آپ ضرور
آئیں گے۔

باقی صفحہ ۴۴۳ پر

شائق احمد عثمانی

٥٦ شرف آباد، کراچی ۵

۱۴ فروری ۱۹۶۳ء

برادرم عزیز ابراہیم ہوش !

آج، برسوں، مدتوں بعد پٹنہ کے شیخ نو سے آپکا ادھورا سا پتہ معلوم ہوا ہے اور آج ہی آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر نہ گنجائش ہے نہ زبان کو یارائے سخن۔

کہئے، آپ تو اچھے ہیں اور کون سے احباب کلکتہ میں ہیں کاغذ والے اسماعیل صاحب کہاں ہیں۔ میرے ایوب کہاں ہیں ان سب کا پتہ اور حالات ضرور بتائیے، اپنے بچوں کا حال لکھئے یہ خط لکھ رہا ہوں اور ایسا لگ رہا ہے جیسے میز کے دونوں طرف میں اور آپ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کا متبسم چہرہ ہمیشہ نظر ہے۔ اللہ کرے اب بھی ہر حیثیت سے ہمیشہ متبسم ہی رہتے ہوں۔

پتہ نہیں، ادھورے پتہ پر یہ کارڈ آپ تک پہونچ سکے گا بھی یا نہیں، اللہ کرے پہونچ جائے۔ بہرحال مجھے بہت انتظار رہے گا۔ بھارت اور پاکستان میں معمولی کارڈ اور رسالے برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ صرف روزانہ اخبار ہی نکال رہے ہیں یا ہفتہ وار وغیرہ بھی

دعاگو شائق احمد عثمانی

———

ابراہیم ہوش

شرف آباد کراچی ۵

۲۰ مئی ۱۹۶۳ء

برادر عزیز !

آپ تو ہم سب کو بھول گئے، مگر ہم سب اور بالخصوص میں آپ کو نہیں بھولا، نہ بھول سکا ہوں، نہ بھول سکتا ہوں۔ آپ کی سنہری عینک، آپ کا متبسم چہرہ، اور آپ کی دلکش گفتگو یہی یادوں کے خزانے میں محفوظ ہیں۔ اور کبھی کبھی جب کوئی شعلہ کوئی یاد، کوئی تصور، دل کے اضطراب کو سکون نہیں دیتا، اس وقت عصر جدید کا دفتر، ہماری مشترک میز، آپ کی قلم کاریاں، اور گفتگوئیں، آپ کی عدیم النظیر نظمیں، اور نظم کے فن میں بلکہ کمال آپ کی خداداد مہارت کی یاد، گھنٹوں دل بہلایا کرتی ہے بھلا میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ، بہترین مشغلہ، اور بہترین رفقائے کار کو کیسے بھول سکتا ہوں !

کہئے "آبشار" کے علاوہ اور کیا کیا کر رہے ہیں ادبی پرچہ بھی کوئی نکالا یا نہیں۔ کلکتہ میں آپ کے احباب کے حلقوں میں کوئی ادبی رسالہ نکلتا ہے ؟

"آبشار" تک تو میں پہونچ نہیں سکتا، ظاہر ہے کیا کوئی ایسا مافوق الفطرت آپ کے پاس نہیں کہ "آبشار" ہی کو میرے پاس پہونچا دیں میری پیاس آخر کیسے بجھے گی۔

میں نے آپ کو ساگر دت لین کے پتہ سے خط بھیجا تھا یقیناً آپ کو نہیں ملا ہوگا۔ پھر ایک عزیز سے آپ کا پتہ پوچھا یہ

معلوم کر کے کہ آپ بھی چھا نہ باڑی میں ہیں، دل یادوں میں گم ہو گیا۔
اف میرے اللہ، وہی بھٹے چونا گلی، جس نے ہمیں کلکتہ میں برسوں
پناہ دی ہے۔ جس نے "عصر جدید" کے عروج کا شاندار دور دیکھا
ہے۔ جہاں بیٹھ کر میں نے مشین کی گھڑ گھڑ میں، سینکڑوں ہزار دل
ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ چونا گلی زندہ باد، چھانہ باڑی زندہ باد
ابراہیم ہوٹل زندہ باد، آب شار زندہ باد۔ خوش رہو میرے
عزیز سے بھائی خوش رہو، کلکتہ میں ایوب کہاں ہیں،
رسائی کہاں ہیں، حکیم نثار صاحب کہاں ہیں۔ سب کا پتہ
اور سب کا حال لکھئے، شدید انتظار رہے گا۔ کیسے خط لکھ
رہے ہیں نا۔ میرے جاننے والے سے ملاقات ہو تو تمنائے
دید عرض کر دیجئے!

دعا گو   شائق احمد عثمانی

شائق احمد عثمانی سے ملئے

وقت کا پہیہ بڑی تیزی کے ساتھ پیچھے گھوم رہا ہے
ہر چیز پیچھے پلٹ رہی ہے۔ ان لوگوں کے چہرے سامنے آرہے ہیں
جن کے درمیان میری زندگی گذری تھی۔ اسی ہجوم میں میں اس شخص
کو دیکھ رہا ہوں جس کا قد میانہ، رنگ گورا، خدوخال دلکش،
خشخشی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں اور کھنکتی ہوئی آواز تھی
جو عصر جدید میں ہوتا تو بنیان اور لنگی میں دیکھا جاتا۔ باہر جاتا
تو کرتا پاجامہ میں ملبوس ہوتا۔
یہ شخص تھا، مولانا شائق احمد عثمانی۔

میں "عصر جدید" سے باضابطہ طور پر ۱۹۴۵ء
میں منسلک ہوا۔ لیکن اخبار سے میری جزوی وابستگی ۱۹۳۵ء
ہی سے تھی۔ میں نے کلکتہ میں شائق احمد عثمانی کا نام بہت ہی کم عمری
میں سنا تھا اس وقت میں کاشی پور میں رہتا تھا۔ میرے والد صاحب
کو جلسوں میں جانے اور لیڈروں کی تقریریں سننے کا بہت شوق
تھا۔ وہ جب بھی کاشی پور سے شہر آتے تو کوئی نہ کوئی اردو کا
اخبار ضرور خرید کر لے جاتے۔ کبھی "زمیندار" لاہور۔ کبھی "انقلاب"
لاہور۔ کبھی "دور جدید" کلکتہ۔ کبھی "زمانہ" کلکتہ۔
"زمانہ" کے ایڈیٹر مولانا اکرم خاں مرحوم ہوا کرتے تھے۔
بعد میں انہوں نے اردو اخبار بند کر دیا۔ اور "آزاد" کے نام سے
بنگلہ اخبار نکالا۔ جسے وہ تقسیم ملک کے بعد ڈھاکہ لے گئے۔
"دور جدید" کے ایڈیٹر مولانا شائق احمد عثمانی تھے۔ اپنے
والد صاحب ہی کی زبانی میں نے یہ بھی سنا کہ مولانا شائق احمد عثمانی
ایک زبردست خطیب اور شعلہ بیان مقرر ہیں۔ اس وقت نہیں
معلوم کیا ایسی بات ہو رہی تھی کہ کلکتہ کے محلوں میں روز ہی شائق احمد
کی تقریریں ہو رہی تھیں اور گلی گلی میں ان کا چرچا تھا۔
کچھ دنوں کے بعد والد صاحب "دور جدید" کے بجائے
"عصر جدید" لانے لگے اور مجھے بتایا کہ مولانا شائق احمد عثمانی
نے "دور جدید" بند کر کے اب "عصر جدید" نکالا ہے۔
مولانا شائق احمد عثمانی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۰ء
میں علامہ رضا علی وحشت کے دانش کدہ واقع ویلیسلی سکنڈ لین
میں ہوئی۔ مولانا شائق احمد بہت برسوں سے بوجہ علالت
اپنے وطن مالوف بھاگلپور ہی میں رہ رہے تھے۔ اور اخبار کی
ادارت اور انتظام مولانا عبدالجبار وحیدی مرحوم ایوب اور ان کے
بڑے بھائی نسیم مرحوم کے سپرد کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عصر جدید
سے میری جزوی وابستگی کے باوجود نہ میں انہیں دیکھ سکا تھا
نہ وہ مجھے۔ ان کا دوبارہ کلکتہ آنے کا سبب یہ تھا کہ بنگال
اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں کلکتہ مسلم لیگ مسٹر حسین شہید سہروردی

(مرحوم) کو ان کے اپنے حلقۂ انتخاب کے بجائے، جہاں سے وہ برابر منتخب ہوتے تھے۔ کسی دوسرے حلقۂ انتخاب سے کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اپنا حلقہ بدلنے کے لئے تیار نہیں تھے اور چونکہ عصر جدید ایک زمانے سے شہید سہروردی کی حمایت اپنا جزو ایمان بنا چکا تھا۔ اس لئے وہ شہید صاحب کی طرف سے لڑنے میں پیش پیش تھا۔ جب یہ کشمکش شدت اختیار کر گئی تو شہید صاحب کی طرف سے لڑنے کے لئے شائق احمد عثمانی بنفس نفیس کلکتہ پہونچ گئے۔ وہ اس مقصد کے لئے انہوں نے شہر ہی کے ممتاز اور سرکردہ مسلمانوں سے ملنا اور شہید سہروردی کی حمایت میں آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں وہ علامہ وحشت سے بھی ملنے آئے اس موقع پر وحشتؔ کے دانش کدہ پر پروفیسر عباس علی خاں بیخود، علامہ جمیلؔ مظہری، پروفیسر قمرؔ صدیقی، احسن احمد اشکؔ اور میں بھی موجود تھا۔ ادھر ادھر کی گفتگو ہو رہی تھی اسی بات چیت کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ میں بھی شاعری کرتا ہوں تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنا کلام عصر جدید میں بھجوایئے میں انہیں شائع کر دوں گا۔ ہاں شاعری ویسی ہونی چاہئے جیسی مولانا ابراہیم ہوشؔ کی ہوتی ہے۔

حضرت وحشتؔ نے یہ سنا تو زیر لب مسکرائے، دوسرے لوگ بھی مسکرائے۔ اور میں ذرا خفیف سا نظر آنے لگا حضرت وحشتؔ نے مسکراتے ہوئے شائقؔ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ سے ملئے آپ ہی مولانا ابراہیم ہوشؔ ہیں۔

مولانا شائق احمد عثمانی نے یہ سنا تو حیرت سے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہوں۔ پھر کہنے لگے تو آپ ہی ابراہیم ہوشؔ ہیں۔ واللہ میں نے تو اپنے تصور میں آپ کا کچھ اور ہی حلیہ باندھ رکھا تھا۔ بڑی سی پگڑی اور داڑھی......... یہ کہہ کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے پھر اٹھ کر مجھ سے بڑے تپاک اور گرم جوشی سے ملے۔

یہ تو مولانا شائق احمد عثمانی سے میری یہ پہلی روبرو ملاقات تھی۔ لیکن میری ہنگامہ خیز ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۳ء ہی سے جب کہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں دسویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ ہو گیا تھا۔ ہنگامہ خیز اس لئے کہ میں دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی طرح اپنے آپ کو محض ادبی محفلوں تک محدود نہیں کر رکھا تھا بلکہ میں نے اسے عوامی شکل دے دی تھی میں بڑے بڑے سیاسی جلسوں میں نظمیں پڑھتا۔ مجھ سے پہلے کم از کم کلکتہ میں اس " بدعت " کا ارتکاب کسی اور نے نہیں کیا تھا۔ یہی نہیں۔ میں نے " خادم " ہفتہ وار کلکتہ میں ملا رموزی کی گلابی اردو اور عبد المغنی بی اے کی نرالی اردو کی طرح کلکتیہ اردو کی تخلیق کر کے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ نیز میں محمڈن اسپورٹنگ کے کھیلوں پر روزانہ نظمیں لکھتا تھا۔ جو مولانا عبد الجبار وحیدی کی ادارت میں عصر جدید میں بڑے آب و تاب سے شائع ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا شائق احمد عثمانی نے حضرت وحشتؔ کے دانش کدہ پر مجھ سے جو کہا تھا کہ، لیکن شاعری مولانا ابراہیم ہوشؔ کی طرح ہونا چاہئے تو وہ محمڈن اسپورٹنگ والی نظموں ہی کی بنا پر کہا تھا۔

مولانا شائق احمد عثمانی جس مقصد کے لئے کلکتہ آئے تھے۔ بالآخر وہ پورا ہو گیا۔ اور شہید سہروردی کو اپنے پرانے حلقۂ انتخاب کی سیٹ مل گئی۔ اس کے بعد مولانا شائق احمد عثمانی پھر بھاگلپور چلے گئے۔ لیکن چند مہینوں کے بعد پھر آئے اور کلکتہ میں بال بچوں کے ساتھ مستقل سکونت اختیار کر لی۔

مولانا شائق احمد عثمانی کٹر مسلمان تھے اور کانگریس سے سخت متنفر، انہیں قوم پرستی سے چڑ تھی۔ ان کا اخبار

• عصر جدید۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کا سب سے بڑا ترجمان تھا کلکتہ آنے کے بعد انہوں نے عصر جدید کی ادارت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جسمانی طور پر وہ کچھ معذور سے تھے۔ اس لئے وہ کبھی کبھار ہی کچھ لکھا کرتے تھے۔ ورنہ اخبار کا سارا کام عبدالجبار وحیدی مرحوم اور ارشد عظیم آبادی مرحوم مکمل کرلیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالجبار وحیدی مرحوم کلکتہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سکریٹری بھی تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ عصر جدید نے اس دور میں کیا کردار ادا کیا ہوگا وہ بہت ہی کثیر الاشاعت تھا۔ اور جنگ کے زمانہ میں تو اس کی مالی حالت بدرجہا بہتر تھی۔ چونکہ اس زمانے میں میں بڑا قوم پرست واقع ہوا تھا اس لئے عصر جدید کی پالیسی سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں جب میں نے باضابطہ صحافتی زندگی کا آغاز کیا تو بجائے عصر جدید میں کام کرنے کے میں نے روزانہ ہند میں کام کرنے کو ترجیح دی۔ جس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اور بڑے قوم پرست اور سوشلزم کے پرستار تھے۔

لیکن عصر جدید کی پالیسی سے اختلاف کے باوجود میں اپنی غزلیں اور نظمیں عصر جدید ہی کو دیتا رہا۔ مولانا شائق احمد عثمانی میری شاعری سے اتنے متاثر تھے کہ وہ چند اشعار کی غزل کو بھی اخبار کا پورا اولین صفحہ دیا کرتے۔

۱۹۴۳ء میں میں نے روزانہ ہند کی ملازمت ترک کردی۔ اور اپنے استاذ شعر حضرت آرزو لکھنوی کی طلبی پر بمبئی چلا گیا جہاں مجھے ہفتہ وار نظام۔ بمبئی کی ادارت سپرد کی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے روزانہ "اقبال" بمبئی کی ادارت بھی سپرد کی گئی۔ اور میں دونوں اخباروں میں مارچ ۱۹۴۵ء تک کام کرتا رہا۔ بمبئی جانے پر میرے سیاسی خیالات میں انقلاب آ گیا اور میں کانگریسی سے مسلم لیگی بن گیا۔ شائق احمد عثمانی کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے بمبئی خط لکھا کہ بیکار ایک غیر شہر میں غریب الوطنی کی زندگی گذار رہے ہو کلکتہ واپس آؤ اور عصر جدید سے منسلک ہو جاؤ۔

میں نے یہ خط پاتے ہی دونوں اخباروں سے چھٹکارا حاصل کیا کلکتہ واپس آگیا۔ اور عصر جدید سے وابستہ ہوگیا۔ جس کا ذکر مولانا شائق نے اپنے دونوں خطوں میں کیا ہے۔ میں نے مولانا شائق احمد عثمانی کو صرف ایک بار تقریر کرتے سنا تھا یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے اس زمانہ میں مجھے روزانہ ہند میں کام کرتے دو سال ہوگئے تھے ہم لوگوں نے زیجو لال روڈ پر واقع سیٹھ یوسف کے باغ میں جس کا نام ہم لوگوں نے نشاط باغ رکھ دیا تھا۔ بزم ابوالکلام کے نام سے ایک بزم قائم کی تھی۔ اس بزم میں مولانا آزاد بھی گاہے گاہے آتے تھے۔ اور بے حد دلچسپ اور علمی و ادبی گفتگو کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جب کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو ہم لوگوں نے مولانا آزاد کے توسل سے گاندھی جی، پنڈت نہرو، راجندر پرشاد اور دوسرے بڑے کانگریسی لیڈروں کو بزم ابوالکلام میں تشریف لانے کی دعوت دی اور انہوں نے منظور بھی کرلی۔ مگر بدقسمتی سے اس روز گاندھی جی کی طبیعت بری طرح بگڑ گئی۔ اور بہت تاخیر سے صرف پنڈت نہرو، اور مولانا آزاد اور بعض دوسرے لیڈران بزم ابوالکلام میں پہونچے۔ مختصر سی تقریریں کیں ناشتہ وغیرہ کیا اور واپس چلے گئے۔

تانتی باغ کے مسلمانوں کی اکثریت نے جو مسلم لیگی تھی اس جلسہ کا بڑا اثر لیا اور نہلے پر دہلا مارنے کی فکر میں سرگرداں ہوگئے۔ اتفاق کی بات کہ اس کے چند مہینے بعد قائداعظم مسٹر جناح کلکتہ آئے تو تانتی باغ کے مسلمانوں نے

ان کی صدارت میں ایک جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور مسٹر جناح نے بھی اسے منظور کر لیا۔

جلسہ کی رات مولانا شائق احمد عثمانی بھی مسٹر جناح کو سننے کے لئے پہونچے چونکہ جناح صاحب کے پاس وقت بہت کم تھا اس لئے صرف انہیں کو بولنا تھا مگر جب شائق احمد عثمانی کو لوگوں نے دیکھا تو انہوں نے قائد اعظم سے اصرار کیا کہ وہ مولانا شائق احمد کو بھی کچھ بولنے کا موقعہ دیں جناح صاحب نے ان کی بات مان لی لیکن کہا کہ میں صرف پانچ منٹ تک انہیں بولنے کا وقت دوں گا۔ مولانا شائق احمد تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور بولنا شروع کیا تو سامعین مسحور ہو کر رہ گئے۔ آدھ گھنٹہ تک بولنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ قائد اعظم نے جو وقت دیا تھا اس سے بہت زیادہ انہوں نے لے لیا۔ تو وہ قائد اعظم سے مخاطب ہو کر بولے کہ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں لیکن قائد اعظم خود ان کی تقریر سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ انہوں نے کہا آپ جتنی دیر بھی بولنا چاہیں بولیں، میں بیٹھا رہوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کے بعد خطابت میں شائق احمد عثمانی کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور وہیں اب تک مقیم اور خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں۔ عصر جدید اب خان بہادر شیخ محمد جان کی ملکیت ہے۔

مولانا شائق احمد عثمانی کو تحریر و تقریر پر یکساں ملکہ حاصل تھا۔ کلکتہ کے علمی و ادبی حلقوں میں انہیں انتہائی ادب و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے اخبار عصر جدید میں نامور ادبی حیثیتوں نے کام کیا تھا مثلاً مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری، علامہ جمیل مظہری، سلیم اللہ فہمی وغیرہ۔ علامہ جمیل مظہری عصر جدید میں کوچہ گرد کے نام سے فکاہات لکھا کرتے تھے۔

شائق احمد عثمانی اخبار کا مالک ہونے کے باوجود اپنے تمام ورکروں کے ساتھ نہ صرف مساویانہ بلکہ برادرانہ حیثیت سے پیش آتے تھے۔ حضرت وحشت اور ابو العلا ناطق لکھنوی مرحوم سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ مسلم لیگ کا کوئی بھی لیڈر کلکتہ آتا تو سب سے پہلے مولانا شائق احمد عثمانی سے ملتا پھر کسی اور سے۔ کلکتہ کی صحافتی زندگی میں انہوں نے ایک ایسا معیار قائم کیا تھا جو ہر طرح سے لاہور کے اخبار "انقلاب" اور "زمیندار" کے مساوی تھا۔

پاکستان کی تحریک کو کلکتہ میں مقبول بنانے میں جتنا بڑا کردار عصر جدید نے ادا کیا تھا وہ تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ملک تقسیم ہوتے ہی شائق احمد عثمانی نے انڈیا میں رہنا مصلحت کے خلاف سمجھا اور چند مہینوں کے بعد پاکستان سدھار گئے۔ عصر جدید کا انتظام انہوں نے اپنے داماد شمس الحق کے سپرد کر دیا۔ لیکن شمس الحق بھی سنہ ۵۰ء کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد اتنے خائف ہوئے کہ انہوں نے خان بہادر محمد جان کے ہاتھ اخبار اونے پونے بیچ دیا اور خود بھی پاکستان چلے گئے۔

قمر التوحید کے فن کا جائزہ

عصمت آرا

صنف افسانہ نے جس برق رفتاری کے ساتھ بدلتے ہوئے سماجی شعور تغیر پذیر معاشرے اور بدلتے ہوئے ذہنی رجحانات کا ساتھ دیا ہے کہ دوسرے صناف اس سے ممکن نہیں، زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں ارتقائے انسانی کی کشا کش اور سیاسی بحران کے اس سمندر میں انسان کا تیرتا ابھرتا ذہن فکر کے کس ساحل کی تلاش میں رواں دواں ہے۔ منفی اعتبار سے افسانہ زمانے کے موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ افسانے نے حیات انسانی کے اتنے گوشوں کی ترجمانی کی ہے کہ اب وہ رمز و کنایات کی منزل میں داخل ہو کر تعفیس حیات کی گیرائی و گہرائی پر بھی اپنی گرفت مضبوط کر چکا ہے۔ اب افسانہ نہ واقعات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کرنے کا فن ہے اور نہ حقائق کی دنیا سے روشناس کرانے کا ذریعہ۔ بلکہ اس کی باریک بیں اور دوربیں نظریں فکر انسانی کے اس افق کی طرف دیکھ رہی ہیں جہاں سے حیات کا نیا سورج طلوع ہونے والا ہے

دنیا کے دوسرے نظام معاشرہ سے اس کی ذہنی آسودگی نہیں وہ تجریدی آرٹ کا قائل ہوتا جا رہا ہے بت شکست و ریخت فطرت انسانی بن چکی ہے اور بت شکنی اس کی عادت ثانیہ —— شعور میں وہ گرمی اور تندی پیدا ہو چکی ہے کہ آبگینہ خیال کے ہر لحظہ پگھلنے کا خطرہ ہے۔ دور حاضر کی دین ذہنی ناآسودگی اور تشنگی ہیں۔ انسان اتنا سادہ لوح نہیں رہا کہ قدرت کے ستم کو بھی کرم سمجھ کر خاموش رہ جائے۔ کسی ناول میں کسی عجیب و غریب کردار نے اپنے آقا سے کہا "کیا آپ جانتے ہیں انسان کی پیدائش کیسے ہوئی؟" آقا نے جواب دیا "نہیں، کیا تم بتا سکتے ہو" کہا "ہاں" اس آدمی نے کہنا شروع کیا "ایک دن خدا بیٹھے بیٹھے اکتا گیا اور اس نے سوچا میرے پاس ایسے آدمی نہیں ہیں جو میری خاطر نوبان جلا ئیں۔ میری قسم کھا کر زندگی گذاریں" اس نے اپنی ہتھیلی پر تھوک دیا آستین چڑھائی آنکھوں پر عینک لگائی، پھر تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور اس پر تھوک کر کیچڑ کا ایک تودا بنایا اور اسے خوب گوندھا۔ چھوٹا سا انسان بنایا اور اسے سورج میں پھینک دیا۔ سات دن کے بعد نکالا تو تودا پک چکا تھا خدا کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ بولا، سچ پر شیطان کی مار یہ تو پچھلی ٹانگوں پر سور ہے۔ خدا نے اس کی پچھلی ٹانگ پر لات ماری اور کہا بھاگ جاؤ ——

سر پر فیلٹ ہیٹ، پتلون، سلیپر یہی انسان تھا
جو لفٹ رائٹ کرتے آگے بڑھا۔ خدا نے اپنا ہاتھ آگے
بڑھایا تا کہ انسان اس کے ہاتھوں پر بوسہ دے سکے
مگر جانتے ہیں انسان نے کیا کیا؟ انسان نے کہا لفٹ
رائٹ۔ بڑے میاں راستے سے ہٹ جاؤ"

دور حاضر کا انسان سوچتا ہے وہ قدرت کے
قدرتِ ستم کی ایجاد ہے۔ قمر التوحید کے افسانے ان کی تشنہ
ذہن اور ناآسودگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے
سماج کے ان رستے ناسور کی جگر کاری کرتے ہیں جو ذاتی
مفاد، خود غرضی، نفس پرستی اور انسانیت کے سینے کا
ایک بوجھ ہیں۔ ایسی تخلیق جن پر خود ان کا خالق بھی
شرمندہ ہو۔ اب شاید فرشتوں کے اعتراض پر غور و فکر
کرتا ہو۔ افسانہ نگار کی نگاہیں دوررس اور دوربیں
ہیں۔ ان کے یہاں شعور کا تیکھا پن اور طنز کی لطیف
چبھن ہے جو لذت آگیں درد کا حامل ہے۔ سوچئے فن
جو خون جگر سے نمو پاتا ہے۔ افسانہ "لالو" میں بچے کی
سسکیوں کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے اس کے شعور
میں بیٹھا ہوا ہو اور بچے کے ذہنی دریچوں سے جھانک
کر اس مقتل کو دیکھتا ہے جہاں انسانیت ذبح ہو
رہی ہو اور وفا کا جنازہ اٹھتا ہے۔ کہیں کہیں افسانہ
نگار فن کی بلندیوں کے قریب جا پہونچتے ہیں جہاں
وہ حقیقت میں تخیل کا رنگ ایسا بھرتا ہے اور تخیل میں
حقیقت کا تو فنکار کے خون جگر کی آمیزش فن کو ایک
روپ عطا کرتی ہے۔ فنکار کی نگاہیں زندگی کی وسعتوں
پر پھیلی ہیں۔ وہ سماج کے ان رستے ہوئے ناسور کی
نقاب کشائی کرتا ہے جہاں انسانیت گھناؤنی سڑتی
ہوئی لاش کی مانند ہے۔ اور جو ظلم و ستم جبر و تشدد
کا علامتی کردار ہے آج بھی اپنے شیطانی اعمال و افعال
کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے۔

گاؤں کا دہقان جو قدرت کے ستم کو بھی کرم
سمجھ کر جبر و قہر کا شکریہ ادا کرتا ہے انسان جو مذہب
کی پناہ گاہ میں اپنی تمام ناآسودگیوں کا جواز تلاش کرتا
ہے، آسودگی ڈھونڈتا ہے اور من کی شانتی کے لئے
دعاؤں کا سہارا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ آسمان کی طرف
تکتی ہوئی نگاہیں ابر باراں دیکھنے کی خواہش میں پتھرا
جاتی ہیں اور ان کی تلاش جبل دکوہ کی کسی قوزاک
میں ملتی ہے۔

افسانہ نگار کے دوسرے درجے کا لطیف
طنز ہر جگہ نمایاں ہے۔ انسان کی قسمت کا شاکی
اور خدا کا منکر ہوا جاتا ہے۔ جب وہ بارانِ رحمت
سے ناامید ہو جاتا ہے تو اس کا ایمان دنیا کی ہر چیز
سے اٹھ جاتا ہے۔

امید ہے رفتہ رفتہ فن کی پختگی اور رچا ہوا
شعور وقت گزران کے ساتھ بڑھتا جائے گا فن
کے دھندلے نقوش مستقبل کے اجالے میں اور تیکھے بن
جائیں گے۔ تخیل کی جولانی اور تحریر کی روانی وحدتِ
تاثر کو قائم رکھنے میں معاون ہے۔ افسانے کے تارو
پود کردار و واقعات سے زیادہ افسانہ نگار کے ذہنی
تاثرات سے بنتے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں افسانے
کے دوسرے لازمی پہلو آپ کو چھوڑ کر صرف ذاتی تاثرات
بیانی سے کام لیتا ہے جس سے فن کی حسن کاری
میں کمی اور عدم توازن کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اگر

باقی صفحہ ۴۳۰ پر

علی حسن شاہدی

اور اُنکے فن کا جائزہ

ـــــــ خترناصح نصیب (علیگ)

سنہ پیدائش ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ ہے
یہ اعظم نگر (پورنیہ) کے ایک متوسط الحال کسان گھرانے میں پیدا ہوئے
ابتدائی تعلیم وہیں کے مقامی مڈل اسکول میں پائی۔ ۱۹۴۴ء میں ملا بر
ہائی اسکول کیہار میں داخل ہو کر ۱۹۴۷ء میں میٹرک پاس کیا پھر
علی گڑھ یونیورسٹی سے آئی۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد جونہی گھر پہونچے
تو شدید علالت میں مبتلا ہو گئے۔ بغرض علاج رانچی پہونچے اور سوا
تین سال تک وہیں قیام پذیر رہے۔ شفایاب ہونے کے بعد ؟)
اسلامیہ ہائی اسکول کٹیہار میں ایک سال تک ملازمت کی پھر
بھاگلپور تشریف لائے اور بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ نصاب
ختم کرنے کے بعد بے نیل ومرام گھر واپس لوٹے پھر نا مساعد حالات
نے اس بات کی اجازت ہی نہیں دی کہ حصول تعلیم کی راہ میں آگے
بڑھا جائے۔ مجبوراً درس وتدریس کے شعبہ میں سدھانی ہائی
اسکول سدھانی (پورنیہ) میں ملازمت اختیار کر لی۔ تب سے وہیں
قیام پذیر ہیں۔

شاہدی کی کردار سازی اور ذہنی بلوغیت کی آبیاری
میں ان کے والد محترم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ دینیات کی طرف ان کا
جو جھکاؤ میلان ہے درحقیقت انہیں منکسر المزاج اور صوفی منش شخصیت
کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ شاہدی بلا کے ذہین طبع ہیں۔ علالت سے
پہلے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ریاضی کی موٹی کتاب جیسی دقیق کو بھی حفظ
کر لیا تھا۔ لیکن علالت کے بعد حافظہ پر برا اثر پڑا۔ ہائی اسکول کے
زمانہ تعلیم ہی میں ادبیات سے فطری شغف تھا۔ ایم۔ اسلم۔ کی
کتابیں ان کے لئے محبوب ترین غذا تھیں۔ دسویں جماعت میں
لکھنے کی طرف طبیعت راغب ہوئی اور "شہناز کی سرگذشت"
کے عنوان سے ایک ناول کے ڈھائی سو صفحے سیاہ کر ڈالے جس
کا آخری باب ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں سائنس کی دنیا میں کھوئے
رہے اور ادب نوازی اور ادب پروری کا فطری ذوق گہری نیند
سوتا رہا۔ اس دور کی پیداوار میں صرف ایک ہی کہانی قابل ذکر
ہے "خاموش اشارے"۔ لاشعوری طور پر انہیں علی گڑھ سے جو
کچھ ملا اس کا اظہار تحریری شکل میں رانچی کے اس پر آشوب دور میں
واضح ہوا جب وہ حیات وموت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ یہیں پر
انہوں نے درجنوں کہانیاں لکھ ڈالیں۔ پروفیسر اختر اورینوی سے
بذریعہ خط وکتابت بہت بہت سارے فنی نکات سے استفادہ
کیا۔ ان میں سے کچھ ہی کہانیاں مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آئیں

جن کے نام یہ ہیں ۔ " رات یہ ڈھل جائے گی "، ست قلندر ۱۹۵۲ء دہلی ۔ " مشیت کا پیار " معیار میرٹھ ۱۹۵۲ء " قطبین " معیار میرٹھ ۱۹۵۳ء ان کے علاوہ " روپ رانی " " جیون ایک سپنا " " چٹانوں کے سائے تلے " " چند دریچہ " " موڑ پر " وغیرہ وہ کہانیاں ہیں جو نہ چھپنے پر بھی بھلائی نہیں جا سکتیں ۔

اس دور کے افسانوں کا ترتیبی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ادیب کا ذہن کچی رومانیت کے لچکدار جذبات سے گذر کر زندگی کے ٹھوس حقائق سے آنکھیں ملانے کی تیاری کر رہا ہے ۔ لیکن شعور کی پختگی کی منزل ہنوز بہت دور ہے زندگی کا قریب ترین مطالعہ کرنے کے باوجود وہ ان حقائق سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ جو ایک جواں سال ، جواں فکر ادیب کے سرمایۂ حیات ہوتے ہیں ۔

رانچی کے زمانۂ قیام میں وہاں کی ادب نواز انجمنوں سے شاہدی کا تعلق برائے نام ہی رہا ۔ دو ایک بار پریم چند سوسائٹی میں شریک ہوئے ۔ اس کے علاوہ جب کسی نشست میں شرکت کا موقعہ ملا تو لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ ضرور کیا ۔ تخلیقی سرگرمی میں اچانک کمی آ جانے کا سبب ان کا وہ فکری انقلاب ہے ۔ جو اسلامیات سے گہرا لگاؤ اور اس کے مطالعے سے پیدا ہوا ان کا نقطۂ نظر ایک ادیب کے متعلق یہی ہے کہ اسے سماج کا ایک ذمہ دار فرد اور سماج کی تشکیل کا معمار بننا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ان کا فن افادی خصوصیات کا حامل بن کر کسی نہ کسی مقصد کی نشاندہی کرنے لگا ۔ وہ ہر تخلیقی فن پارے کو افادیت کی میزان پر تولنے کے بعد ہی منظر عام پر لانے کے قائل بن گئے ۔ بعد کے سارے افسانے اسی مخصوص مطمع نظر کے حامل ہیں جن کا مشترک محور شاید خدا پرستی ہے ۔ لیکن افادیت کے پرزور موئید ہونے کے باوجود انہوں نے فنی تقاضے کو کبھی نظر انداز نہیں کیا ۔

کیٹہار کے زمانۂ قیام میں تخلیق کا میدان بدل گیا ۔ اب مقالہ نویسی ان کا محبوب مشغلہ بن گیا ۔ انہوں نے جو بھی مقالے لکھے وہ ان کے براست مطالعہ کے تاثرات ظاہر کرتے ہیں ۔ مذاق ناقدانہ پایا ہے ۔ ان میں سے صرف دو تین مقالے ہی منظر عام پر آئے ۔ " ندیم کا شعور جلال و جمال کے آئینہ میں " " آجکل " دہلی ۱۹۵۴ء " اقبال کا ذہنی ارتقار " " غالب وایمانیت " وغیرہ ۔

افسانے کے دو مجموعے اور مقالہ کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں لکھنے کے بعد یاران طریقت کے حوالے کر دئے ۔ خبر نہیں اب وہ کہاں ہیں ۔ کیٹہار کے زمانۂ قیام میں انہوں نے چند کہانیاں بھی لکھیں جن میں سے " لاجو " " سر ابھی لگا ہے " وغیرہ بہار کے مقامی پرچوں میں شائع ہو چکی ہیں ۔

حصول تعلیم کی غرض سے جب بھاگلپور آنا ہوا تو یہاں کے علمی ماحول نے انہیں زبردستی ادبی انجمنوں میں شرکت کی دعوت دی ۔ مگر فرینڈس ایسوسی ایشن کے علاوہ کسی دوسری انجمن میں انہیں شرکت کا موقع نہیں ملا ۔ اس انجمن میں انہوں نے اپنی بہت سی تخلیقات پڑھ کر سنائیں ، جو نئی بھی تھیں اور پرانی بھی ۔ محمود واجد کے عہدہ صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد نقد و نظر کا بدنام فریضہ حسن شاہدی کے حصہ میں آیا ۔ چنانچہ انجمن کی ہفتہ وار نشست میں آئے ہوئے سارے مواد پر بڑے فاضلانہ انداز میں تبصرہ کیا کرتے تھے ۔ یہ دیرینہ مرض کے ہمعصروں میں ہمیشہ چشمک رہا کرتی ہے ۔ اس کا کلی علاج کچھ اس ڈھنگ سے انہوں نے کیا کہ شرکا کے اندر ادب پروری اور ادب نوازی کا نیا مذاق پیدا کر دیا اور سب اپنے آپ کو منتری کی حیثیت سے دیکھنے کے خوگر ہو گئے ۔ بھاگلپور کی ادبی فضا میں یہ صحت مند انقلاب

میں ادب کی آبیاری کے لئے ایک نیک فال تھا۔ جو شاید بہت
دنوں تک کام کرتا رہا۔ سچ پوچھئے تو شاہدی کی ذات سے لایا ہوا
یہ انقلاب ان کی کوشش کا ایک مثبتی حاصل ہے جس پر انہیں ناز ہے

یہاں کی فضا میں رہ کر انہوں نے جو کہانیاں بھی لکھیں
وہ یا دو ... دوستوں نے اصرار کا نتیجہ تھیں ... چھپیں
... افو آیا ... جیسی تخلیقات میں سے صرف "الو آیا" ہی منظر عام
پر آئی جو ... الشمس ... رام پور میں شائع ہوئی۔

راقم کا غائبانہ تعارف شاہدی سے علیگڑھ کے تعلیمی
ماحول کی چہار دیواری ہی میں ہو چکا تھا۔ جب میں سلسلۂ ملازمت
بھاگل پور پہنچا تو اچانک ... ان سے ملاقات ہو گئی کہ میں
جو نامعلوم منزل کی تلاش میں ایک مدت تک سرگرداں تھیں انہیں
گویا جنت قرار مل گئی۔ ملاقات کی پہلی ساعت میں مجھے جو خوشی
ہوئی اس کا اظہار میں اس طرح کروں گا ؎

تم آ گئے نصیبے قسمت تمہاری عمر دراز !

تمہارا نام سبا وفا ابھی ابھی میں نے

ان سے میری رفاقت محض ایک سال تک رہی۔ میں
نے ان ایام میں انہیں خاموش آتش فشاں کی شکل میں دیکھا۔
جب کبھی ان کی انا کو ٹھیس پہونچائی گئی تو انہوں نے کسی نہ کسی تخلیق کے
ذریعہ اپنی ... کا ثبوت ضرور دیا۔ "الو آیا" اور "شکست"
انہیں حسین تصادم ... کار کہانیاں ہیں۔

اب عرصہ نو سال سے وہ سرسعانی ہائی اسکول
سرسعانی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ادبی دنیا سے بہت دور
جا چکے ہیں۔ محض معاشی مسائل کو حل کرنے کی خاطر ہی وہ پرائیویٹ
آنرز اردو میں بھاگل پور یونیورسٹی سنہ ۶۵ء کے امتحان میں شریک
ہوئے اور اول آئے۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں پا بہ زنجیر ہوئے۔ اب تک چار بچے پیدا
ہو چکے ہیں۔ بڑا لڑکا مظاہر حسن علوی درجہ دوئم کا نصاب
پڑھ رہا ہے۔ اور براہ راست والد ہی سے تعلیم و تربیت پا رہا
ہے۔ تین بچیاں یکے بعد دیگرے کہانیوں کی مانند مختلف سنہ
میں منظر عام پر آئی ہیں۔

شاہدی کی شخصیت کے ادبی پہلوؤں کا جو تابناک
منظر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نامساعد حالات کے تحت آتے
آتے رہ گیا۔ اس کی تشکیل کیٹھار کے غیر ادبی ماحول سے شروع
ہوئی تھی۔ جب وہ بلوغیت کے اولیں مرحلے سے گذر رہے تھے
اپنی خداداد ذہانت، ذکاوت، حسن اور ذوق جمال کا مظاہرہ
انہوں نے ہائی اسکول کے ہی زمانہ میں دکھانا شروع کیا تھا
چونکہ انہیں ہم شناسوں کی حوصلہ افزائی نصیب نہ تھی۔
اس لئے فن ادب کی طرف ان کی یہ سنجیدہ کوشش کچھ زیادہ
نتیجہ خیز نہیں رہی۔ قدرت کی فیاضی کے ہاتھوں ان پر کیا
کچھ ظلم نہ ہوا۔ ایک مدت تک انہیں اس چیز کا اندازہ ہی نہ
ہوا کہ انہیں کس شعبۂ علم سے خصوصی شغف ہے اگر ایک
طرف وہ زبان و ادب کی چاشنی اور لطافت سے مسحور ہو رہے
تھے۔ تو دوسری طرف ریاضی، فلسفہ، دینیات، تاریخ اور
جغرافیہ کے عجائب خانوں کی سیر میں بھی لطف اٹھا رہے تھے
بہرکیف ان کی فطرت کی پکار ہمیشہ یہی رہی کہ وہ عروس
ادب کی مشاطگی کا فریضہ ادا کرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

شہپارے ... تمام کی تحریروں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی
جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب اور ان کے صوتی ترنم کے پیچھے
اپنے افکار کو کوئی وقعت نہیں دیتے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کے
افکار تجربات کی سنگ باریوں سے اسی وقت مجروح ہونے شروع
ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جن احساسات کی ترجمانی کی
ہے ان میں بھی رومانیت کے ساتھ ساتھ المیہ اور حزنیہ کیفیتوں

کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات میں اس وقت کسی واضح شعور کا پتہ نہیں ملتا۔ ایسا جان پڑتا ہے کہ اُن کی نگاہ کے سامنے کہر میں لپٹی ہوئی ایک دنیا ہے۔ جن کی ساری چیزیں ان کے ذوق جمال ہی کی تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ بہرکیف جب وہ ان چیزوں کو اپنے فن میں برتتے ہیں تو ان کی انفرادیت کا خاصہ خیال رکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر ہی سہی، ان کے نفسیاتی تقاضوں کو کما حقہٗ پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کی وہ چلتی پھرتی تصویریں ہمارے ارمانوں کی روح بن جاتی ہیں۔ اور ہم انہیں جذبات کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں تو وہ ہمارے اردگرد چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

[illegible] دنیا کو اس کے محکم مگر بظاہر بدلتی ہوئی قدروں کے آئینہ میں دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا وہ تو اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں کچھ اس طرح پروان چڑھ رہے تھے کہ گردشِ روزگار کا خفیف سا جھٹکا بھی انہیں لگنے نہ پائے۔ ان کی دلچسپی کی دنیا خود ان کی اپنی ذہنی دنیا تھی۔ اپنے نرم نرم الفاظ اور نرم بندشوں کی وجہ سے وہ اسی دنیا کی عکاسی کرتے چلے جاتے تھے علم دوست باپ نے ان سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اور اسی لئے میٹرک میں امتیازی شان سے پاس کرنے کے بعد انہیں حصول تعلیم کے خیال سے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ غریب شاہدی کے لئے وہاں کا تعلیمی ماحول راس نہ آیا۔ دو سال تک مادیات کی خاک چھاننے کے بعد ہی انہیں علالت کے سبب مراجعتِ وطن کرنا پڑی۔ لیکن وہاں کے ماحول سے غیر شعوری طور پر انہوں نے شعر و ادب کے لازوال حسن کو چرا کر اپنے دامنِ تخیل میں جگہ دے ہی دی جس کا اظہار رانچی کی سنگلاخ چٹانوں کے سایہ میں چھوٹے بڑے افسانوں کے روپ میں خوب خوب کیا گیا۔ سچ پوچھئے تو ان کی ادبی زندگی کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ یہیں انھیں زندگی کو قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع بھی ملا۔ موت و حیات کے دوراہے پر شاہدی کی نگاہیں ایک طرف دنیا کا لودامی رنگ بوں سے دیکھ رہی تھیں تو دوسری طرف فکر عقبیٰ کا تصور ذہن پر چھایا جا رہا تھا۔ شاہدی اب عمر کی اس منزل پر پہونچ چکے تھے۔ جب جوانی کی ولولہ خیزیاں شریانوں کے بہتے ہوئے سرخ سرخ خون میں موجوں کی زنجیریں بنایا کرتی ہیں۔ شاہدی کا جمالیاتی ذوق، گہرے مطالعے اور درد مند دل نے انہیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا تو "مشیت کا پیار"، "قبطین، سڑک سے محل تک"، "رات یہ ڈھل جائے گی" اور نہ جانے کتنی کہانیاں منظرِ عام پر آئیں۔ ان افسانوں میں کرداروں کے خارجی خد و خال کی بجائے ان کا ذہن زیادہ تر ان کی داخلی شخصیتوں کی تصویر کشی کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کردار سوسائٹی کے ہر طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جدید تہذیب و تمدن کی تلون مزاجی اور نفسیاتی الجھنوں کو پیش کرتے ہیں۔ اپنے شرمندہ تکمیل جذبات و کیفیات اور احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کرداروں کو پیش کرنے کا ٹکنیکی انداز شاہدی کی جدت طرازی پر شاہد ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں لاشعوری طور پر فضا آفرینی کا سماں باندھ دیتے ہیں اور ایک چابک دست مصور کی طرح رنگوں کے حسین امتزاج سے بوقلمونی چمن کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور کمال تو یہ ہے اس میں تصنع کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ان کے افسانے کی عقبی زمین میں نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ پر یہ زمین محدود ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری کا فقدان ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ اس ٹکنک کو برتتے بھی ہیں تو بڑے ہی اختصار سے کام لیتے ہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں دیکھ کر لکھتے ہیں۔ جذبات کی آنچ سے جب ان کے افکار پگھل جاتے ہیں تب ہی وہ انہیں اپنے فنی سانچے میں ڈھالتے ہیں اس لئے ان کے فن میں صداقت ہی صداقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کے ذہن میں اس کا اثر دیر تک رہتا ہے اور تازگی کبھی معدوم

نہیں ہو پاتی ۔ کوئی کہانی نہیں جس میں اختصار کے الزام سے بچنے کے لئے انہوں نے ایمائیت سے کام نہ لیا ہو۔ شاہدی کی اپنی طرز ادا ہوتی ہے ۔ اپنا اسلوب بیان ہوتا ہے ۔ اگر ان کے افسانے کے پلاٹ میں ابھار رہتا تو بلاشبہ ان کے معتد بہ افسانے کی تازگی کو حیات جاوداں مل جاتی ۔ شاہدی شروع ہی سے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ کہانی کی محرک ، مظاہرات فطرت کی معمولی سے معمولی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں ۔ خزاں رسیدہ چمن کے ننگ دھڑنگ درخت کا ایک زرد پتہ ، رات کی تنہائی میں سڑک پر ایک روشن قمقمہ ، کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو کسی دیوار کے سائے میں پڑا ہو ۔ نالیوں میں کلبلاتے کیڑے لال اور کالی چیونٹی کی جنگ آزمائی کا ایک حقیر سا منظر ایک حساس افسانہ نگار کے ذہن کو جھنجھوڑ سکتا ہے ۔ اور لازوال کہانیاں تخلیق پاسکتی ہیں فن سے متعلق شاہدی کے اس انداز فکر نے پلاٹ کی اہمیت ان کی نگاہ میں یکسر گھٹا دی ہے ۔ ان کی کہانیاں وحدت واقعہ اور وحدت تاثر کے جاندار مرقع ہیں ۔ ان کے تمام ذیلی افکار کسی مرکزی فکر کے جزو بن کر ہی ان کی کہانیوں میں آتے ہیں ۔ بلاشبہ وہ نادر تشبیہات اور تخیلات سے کام لیتے ہیں ۔ لیکن اس سے ان کا مقصد اپنے فکر کے گوناگوں پہلوؤں کو دکھانا ہوتا ہے ۔ کہانیوں کے اختتام میں ان کی اختصار پسندی بڑی ہی تکلیف دہ ہوتی ہے ۔ ان کی اس تازہ ترین تخلیق ہی کو لیجئے جو راقم کے حالیہ عمل جراحی کے نتیجہ میں ان کے ذہن سے نکلی ہے ، وہ لکھتے ہیں ۔

" میں نے آنکھیں کھول دیں ——— ہنوز پو پھٹی نہ تھی ، لیکن رات کی افسردگی اپنا دم توڑ چکی تھی ۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں پر اس کی دونوں ہتھیلیاں لے لیں ——— دو دلوں کی سونی وادیوں سے ایک ساتھ یہ آواز آئی ۔

" پیارے میں تم سے خفا کب ہوں ؟ "

ان کی زبان کی چاشنی ، انداز بیان کی دلکشی ، فقروں کی صوتی بندش اور روانی میں جو کیف ہے ، جو حلاوت ہے ، ابھی ان سے سیری بھی نہیں ہو پاتی کہ کہانی ختم ہو جاتی ہے ۔ لیکن الفاظ کی سحر کاریاں قاری کے ذہن کو مسلوب نہیں کرتیں ۔ اس لئے ان کا ہر جملہ افکار کے کتنے ہی دریچے کھول دیتا ہے ۔ اس لئے قاری فوراً ہی چونک پڑتا ہے ۔ اور اپنی ذہنی افتاد طبیعت ، حوصلۂ نظر اور علمی استعداد کے مطابق کہانی کے المیہ یا نشاطیہ نتائج کو کھوجنے میں لگ جاتا ہے ۔ شاہدی ہمارے دل میں ایک درد ایک کسک اور ایک آرزو پیدا کرتے ہیں ۔ ہمیں تجسس کے ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں سے کتنی ہی پگڈنڈیاں سانپ کی طرح لہرا لہرا کر دور افق کے پار چلی جاتی ہیں ۔ اس وقت ان کی کہانیوں میں ہم اپنے ہی پیش آمدہ تلخ اور سنگین حقائق کو تلاش کرنے لگتے ہیں ۔

شاہدی نے گوناگوں مزاج پایا ہے ۔ کسی موضوع پر بھی کوئی کتاب ان کی نگاہ کے سامنے ہو ، وہ چھوئیں گے ضرور ، اس لئے ان کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور عمیق بھی ۔ اگر آپ انہیں مجلسی زندگی میں دیکھیں تو وہ موضوع بحث پر کسی نہ کسی عنوان اپنی تجی تلی رائے کا اظہار ضرور کریں گے ۔ طبیعت میں بلا کی خنکی اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ۔ بات بات میں طنز و مزاح کا پہلو نکال لینا ان کا ادنیٰ کرشمہ ہے ۔ طرز استدلال بہت سلجھی ہوئی ہوتی ہے اور یہ شاید ان کے حصہ میں سائنس و ریاضی کے باضابطہ طالب علم ہونے کی وجہ سے آئی ہے ۔ دینیات میں وہ مذہب کے استخوانی ڈھانچے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ۔ خدا ان کی نگاہ میں محض عقیدہ کی ایک چیز نہیں ہے ۔ اُن کے یہاں خدا ، کائنات اور نفس ذات میں ایک گہرا ربط ہے ۔ اس ضمن میں وہ قرآنی تصور کے بہت بڑے حامی ہیں ۔ ان کی نگاہ میں

بڑا ان کوئی قابلِ فخر ہستی نہیں۔ ہاں وہ مکمل انسان کے قائل ہیں ان کے خیال میں وہی انسان مکمل ہے جو حقوق اللہ، حقوق النفس، اور حقوق العباد میں کامل توافق اور توازن کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی گذارے۔ جس انسان کی زندگی میں وہ ان حقوق کے اندر غیر متوازن کیفیت پاتے ہیں، اس سے انہیں بڑی ہمدردی ہوتی ہے وہ اگر وسیع المشرب اور وسیع النظر ہیں تو صرف اسی نقطۂ نظر سے اور یہی نقطۂ نظر لے کر انہوں نے ادب کے دوسرے میدان میں بھی قدم اٹھایا ہے جسے مقالہ نگاری کہتے ہیں۔ وہ تنقید کے مروجہ اصولوں کو اندھا دھند برتنے کے قائل نہیں۔ ان کا قلم ایک تیکھا وار کرتا ہے۔ جو غلط افکار کی پیپ بہانے سے نہیں تھکتا۔ انہیں احترام آدمی تو آتا ہے پر اندھی عقیدت نہیں آتی۔ چنانچہ جب انہوں نے کسی کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے تو ایک طرف حق کی حمایت کی ہے اور دوسری طرف چوٹ کا مرہم بھی عطا کیا ہے۔ یہی تو سبب ہے کہ ان کے مقالوں پر بڑی لے دے ہوئی ہے۔ مقالہ کی زبان ان کی افسانوی زبان سے میل نہیں کھاتی۔ لفظوں کا موزوں انتخاب تو وہ دونوں ہی میدان میں کرتے ہیں۔ مگر مقالوں میں کسی لفظ کے ہیر پھیر کو شاید وہ روا نہیں سمجھیں گے۔ وہ اپنے دعوے کو عقل کی میزان پر رکھ کر ہی پیش کرتے ہیں۔ جن کا صحیح تول اپنے سلجھے ہوئے استدلال سے لیا کرتے ہیں۔ ان کے طریقۂ استدلال کی خوبی یہ ہے کہ ہر پچھلی دلیل پہلی سے زیادہ جاندار، وزنی، اور قرینِ عقل ہوتی ہے۔

شاہدی کے ذہن پر اب جمود ہے، تعطل ہے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے قلم میں زنگ لگ چکا ہے۔ وہ خود بھی کہتے ہیں " میں ادبی دنیا سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ مجھے نہ چھیڑو۔ میرے سامنے زندگی کے بہت سے تقاضے ہیں میں انہیں پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ نہ سوچو کہ مجھے مطالعہ سے شغف نہیں ہے۔ میرے سامنے اب بھی مطالعہ کی ایک وسیع دنیا ہے۔ مرئی، جاندار، ہر آن بدلنے والی دنیا۔ میں پھر واپس لوٹوں گا، تجربات کے لازوال خزانے لے کر۔ زندگی کی پُر اسرار حقیقتیں لے کر، ارمانوں کے گرم گرم تقاضے لے کر، جذبات کی نئی کڑیاں لے کر۔ مشاہدات کے سینکڑوں ملکوتی مرقعے لے کر۔ اور الفاظ کے کتنے ہی سیل رواں لے کر ــــ لیکن خدارا ابھی تو مجھے چھوڑ دو کہ

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

مجھے شاہدی کی صداقت پر ایمان ہے وہ اب بھی قنوطی نہیں ہے۔ خلا میں تاکنے والا، وقت سے پہلے بوڑھا ہونے والا فنکار، شاہدی کے قالب میں اب بھی زندہ ہے۔ وہ نئی توانائیوں کے ساتھ منظرِ عام پر آئیگا۔ اور اپنے کلام کے بھولپن، رعنائی، بیباکی، سرمستی اور جولانی کے کرشمے دکھلائے گا۔

ہم اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب شاہدی پھر دنیائے شعر و ادب میں رطب اللسان ہوں گے ہمیں انہیں پانے کے لئے انتظار کی گھڑیوں سے گذرنا ہی پڑے گا۔ ہماری یہ تمنا اس وقت تک یہ رٹ لگاتی ہی رہے گی جب تک شام کا بھولا صبح کو گھر نہ لوٹے ؎

شاید کہ باز بینم آں روئے آشنا را

روشن آرا نیرّ

تلخ زمانی

اے تو مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم۔

اردو ادب کا دامن خاتون فنکاروں سے کبھی خالی نہیں رہا ہے۔ شاعرات کا عظیم کارواں عہد بہ عہد اس شاہراہِ ادب سے گذرا ہے۔ تاریخ ادب اردو ان کے فن پاروں سے مالا مال ہے۔ افسانہ نویسی کا اردو ادب میں رجحان جب عام ہوا تو عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، قرۃالعین حیدر، سلمیٰ صدیقی، ہاجرہ نازلی، جمیلہ ہاشمی، شکیلہ اختر، ثریا محمود، ندرت، نیلوفر ناہید وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

روشن آرا نیرّ بھی ایک افسانہ نگار ہیں۔ آبِ سون کی تاثیر پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس فنکار نے سون کا پانی پیا وہ زمانۂ ادب میں آفتاب و ماہتاب بنکر چمکا لیکن بھاگلپور کو خدا جانے کیوں لوگوں نے قابل ذکر نہیں سمجھا۔ یہاں کی آب و ہوا میں شرت چندر چٹرجی سے لیکر بلائی مکھرجی (بنو پھول)، بیرسٹر ابوالحسن اور کریم اسدی تک بے شمار قابل لحاظ شاعر و ادیب پروان چڑھے ہیں۔ اور یہ شہر دریائے گنگا کے ساحل پر واقع ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گنگا آبِ سون سے تاثیر میں کسی طرح کم نہیں ہے۔

روشن آرا نیرّ کو میں ۱۹۶۱ء سے جانتا ہوں۔ خوبصورت پیشانی کی خوبصورت شکنیں، سیاہ آنکھوں سے نکلنے والے شعلے روشن آرا نیرّ کی روشنی طبع کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ نہایت ذہین، فطین، ذکی، دوربین، دوررس، اور باوضع ہیں۔ اردو ادب کا گہرا مطالعہ خصوصاً افسانوی ادب سے دلچسپی اور تخلیقی رجحان روشن آرا نیرّ کا اس قدر درخشاں اور تابندہ ہے کہ یہ امید کرنا خلاف توقع نہ ہوگا کہ یہ ایک نہ ایک دن آسمان ادب کا نیرِ تاباں بنکر جلوہ گر ہونگی۔ ان کے متعدد افسانوں کو دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔

شاید ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء کی بات ہے جب جناب شمس مظفرپوری یہاں تشریف لائے اور یہاں کے ادبی حلقے کو موصوف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد روشن آرا نیرّ کا شکایت نامہ آیا کہ شمس مظفرپوری کو مجھ سے نہیں ملایا گیا۔

مذہبیت اپنی تمام افسوں گری کے باوجود ابھی اپنا سایہ اتنا نہیں ڈال سکی ہے کہ ہر گھرانے کی لڑکیاں بے جھجک ہر ایک کے سامنے آنے کی جرأت کرسکیں۔ اور روشن آرا نیرّ اس معاملہ میں بے حد سخت ہیں۔

وہ کسی سے بے محابا ملنا ملانا پسند نہیں کرتی ہیں۔ شمس صاحب شہر کے مختلف حلقوں سے ملتے رہے یہاں کے ادبی ماحول کا جائزہ لیا لیکن انہیں کیا پتہ کہ یہاں کوئی روشن آرا نیر بھی ہے! اور میری توجہ بھی ان کی طرف اسطرح منعطف نہ ہوئی کہ شمس صاحب کو روشن آرا نیر سے ملانا ضروری سمجھتا۔ شمس صاحب جا چکے تھے! کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ استوار ہو۔ مختصر یہ کہ دونوں میں خط و کتابت ہونے لگی۔ روشن آرا نیر نے کبھی کبھی اپنے نئے افسانے مجھے دکھائے۔ لیکن میرا افسانہ نویسی سے تعلق ہی کیا جو میں انہیں مشورہ دیتا۔ کبھی کی بات ہے! جب افسانہ نویسی کی طرف میں بھی رجوع ہوا تھا۔ اور پانچ چھ افسانے چھپے تھے۔ مگر وہ سب کے سب یوں ہی سے تھے اس لئے میں نے روشن آرا نیر کو یہ مشورہ دیا کہ اپنی جولانی طبع پر بھروسا کرنا سیکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک فطری افسانہ نگار ہیں۔ اور اب تک انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ خود اپنی صلاحیت اور مطالعہ کے بھروسہ پر۔

معیاری پرچوں میں کسی کا چھپ جانا اگر اس بات کی ضمانت ہے کہ لکھنے والا ماہر فن ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انکے افسانے یقیناً معیاری ہیں ورنہ اور مدیران جرائد کی بات چھوڑئے۔ ماہنامہ ”شاعر“ بمبئی کا مدیر اتنا گھٹیا قسم کا صحافی نہیں ہے کہ صرف ہمت افزائی کے لئے روشن آرا نیر کے افسانے چھاپتا۔ اسی طرح ”شب رنگ“ میں بھی نیر کا افسانہ چھپا ہے جو ایک معیاری پرچہ ہے۔ موجودہ طرز تعلیم اور اس سے ابھرنے والا معاشرہ کچھ ایسا ہے کہ مردوں کی طبیعت پر نسائیت کو غلبہ ہوتا جا رہا ہے، گفتار، کردار، چال ڈھال اور لباس میں عورتوں کی پیروی کرنا ایک فخر کی بات سمجھی جانے لگی ہے۔ اور کچھ لوگ تو پردہ چاک تحریک کی موجودگی کے باوجود عورتوں کا برقع تنگ اوڑھنے لگے ہیں اسی طرح تعلیم یافتہ عورتوں میں مردانہ پن کی جلوہ گری کوئی تعجب کی بات نہیں رہ گئی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ روشن آرا نیر اس کلیہ سے مستثنیٰ ہوں۔ ویسے روشن آرا نیر نہایت سنجیدہ، سمجھدار، نشیب و فراز سے واقف اور ناتجربہ کاری کے باوصف کسی تجربہ کار سے کم نہیں ہیں۔ انکے افسانے میرے اس دعوی کی دلیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس نمبر کا دامن اتنا وسیع نہیں ہے۔ صرف موصوفہ کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ انکے فن پر جو مضامین ہوں گے اس سے قارئین خود اندازہ لگائیں گے۔ کہ میری بات کہاں تک درست ہے۔ مجھ سے بھی اکثر ملا کرتی ہیں اور مجھے جو کچھ اندازہ مل سکا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ نیر بڑی شوخ و شنگ، زندہ دل، بذلہ سنج، اور ملنسار ہیں۔ سینما بینی، کتب بینی، اور افسانہ نویسی کے علاوہ دوسرے نسوانی ہنر سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں، لادینی تعلیم کے باوجود روشن آرا نیر خدا ترس اور دیندار ہیں۔

دلی سے نکلنے والے ماہنامہ سرج ۱۹۶۴ء جنوری کے شمارے میں سیفی پریمی نے روشن آرا نیر کا ایک قلمی خاکہ کھینچا ہے جو میرے خیال میں نیر کے خطوط اور افسانوں کو مدنظر رکھکر لکھا گیا ہوگا بہت ساری باتیں اس میں ایسی ہیں جو واقعی روشن آرا نیر کے کردار کو روشن کرتی ہیں۔ لیکن کچھ خیالی تصویریں ایسی بھی کھینچی گئی ہیں جو نیر کے سراپا کو مجروح کرتی ہیں۔ جب تصور کی نگاہوں سے جب کوئی کسی کو دیکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے افکار اور خیالات کی روشنی ہی میں اسکا خاکہ اتاریگا میں نے جو کچھ عرض کیا وہ آنکھوں دیکھا حال ہے بیسویں صدی کے [illegible]ء میں مرحوم راجہ مہدی علی خاں نے اپنے خاص رنگ میں

باقی صفحہ ۴۸۱ پر

ایم۔ اے۔ حسن رہبر

روشن آرا نیر کی افسانہ نگاری

اُردو کا افسانوی ادب کلاسکی قدر و قیمت حاصل کر چکا ہے۔ مختصر عرصوں میں اردو افسانے کئی دور سے گذرے ہیں۔ رومانی، ترقی پسندی حقیقت نگاری وغیرہ کی بنیاد پر مختلف افسانہ نگاروں نے ہمارے سماج، ماحول اور زندگی تعبیر و تفسیر میں عظیم فنی اور جمالیاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔ اب اردو افسانہ دنیا میں کسی بھی زبان کے افسانوی ادب کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

تمام نثری اصناف میں افسانہ نسبتاً سب سے زیادہ مقبول صنف ہے۔ اس لئے اس کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آج بھی بیشمار لوگ افسانے لکھ رہے ہیں۔ کوئی ترقی پسند ہے، کوئی غیبت پرست ہے، کوئی رومانیت کا شکار ہے اور کوئی جدید۔ اپنے اپنے رجحان و میلان کے حدود میں ہر افسانہ نگار اپنے نقش قدم کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کوشش میں کچھ لوگ کامیابی کی منزلوں سے قریب آ رہے ہیں اور کچھ اپنے توہمات ... رہے ہیں۔ مجموعی طور پر نئی نسل افسانہ نگاری میں متنوع اور گوناگوں تجربات حاصل کر رہی ہیں جن فنکاروں نے مختصر عرصے میں ادبی دنیا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی ہے ان میں روشن آرا نیر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

روشن آرا نیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو افکار و نظریات کے اعتبار سے محدود نہیں کیا ہے اور نہ خاص طرح سا لیبل وہ اپنے نظریئے کی پیشانی پر چپکانا چاہتی ہیں، مفہوم یہ ہے کہ وہ نہ قدامت پرست ہیں نہ ترقی پسند نہ جدید اور نہ اور کچھ لیکن غور سے دیکھئے، تو سب کچھ ہیں۔ غالباً وہ بھی اقبال کی طرح۔ دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم، کی تصور پر ایمان رکھتی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بڑا فنکار قید زمان و مکان سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک عہد و ایک سماج، ایک نسل ایک ملک ایک قوم یا ایک تہذیب کا نمائندہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ہر عہد ہر نسل، ہر قوم اور ہر سماج و ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی وہ غیر فانی وابدی قدروں کا آئینہ دار و ترجمان ہوتا ہے، اور جب اپنے فن کی معراج سے واصل ہوتی ہے تو وہ ہر دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔

شکسپیر، سعدی، کالی داس، وغیرہ اب کسی ایک ملک قوم یا عہد کے فنکار نہیں رہے، وہ ساری دنیا کے ہر زمانے کے آدمی کے لئے وہی درجہ رکھتے ہیں جو کسی زمانے میں اپنے عہد میں رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو محدود کر لینا کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ ادیب کے ذہن، دل اور فہم و ادراک میں اتنی وسعت ہونی چاہیئے جتنی وسعت اس کائنات میں ہے۔ آفاقی اور عالمگیر شہرت و مقبولیت کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کی ذات میں آفاق گم ہو کر رہ جائے، جو ادیب اس حقیقت کا عرفان حاصل کرے گا وہ کسی بھی طرح کی تنگ نظری اور تعصب سے دور رہے گا، اور کسی خاص نظریہ و افکار کا اپنے آپ کو پابند نہیں کرے گا مجھے یقین ہے کہ روشن آرا نیر نے ادب و فن کی اس حقیقت کا عرفان حاصل کر لیا ہے، اس لئے کہ

اپنے آپ کو محدود نظریات و افکار کا حامل نہیں بناتیں۔ ان کے یہاں بڑی
عت و عظمت و ہمہ گیری ہے۔ وہ زندگی اور انسانیت کی آفاقی قدروں
سامنے رکھتی ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں ایک باشعور حساس اور
و مند دل جھلکتا ہے، یہ انداز فکر و نظر مستقبل میں آپ کی عظیم ترین
میابیوں کی ضمانت دیتا ہے۔

روشن آرا نیر کی ادبی عمر بہت مختصر ہے انھوں نے یہی کوئی
بچ چھ سال سے کہانیاں لکھنی شروع کی ہیں۔ چوں کہ خاتون ہونے کی
پر مختلف قسموں کی ذمہ داریاں اور پابندیاں ان کی تقدیر بن گئی ہیں اس
ے وہ افسانہ طرازی کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ یہ
ا اپنا خیال ہے ممکن ہے کہ ایسی بات نہ ہو لیکن اس چھ سال کے عرصے
ان کے افسانوں کی رفتار سست رہی ہے۔ یعنی ان کے کم ہی افسانے
ائل میں آسکے ہیں۔ اور اسی بنا پر میں نے یہ نظریہ قائم کیا ہے ممکن
ہے کہ کچھ لوگ اس کو موصوفہ کی فنی کمی کا نام دیں، لیکن میری نگاہوں
ان کی یہ رفتار بڑی قابل ستائش ہے روز ایک افسانہ لکھ لینا اور
ز ناموں، ہفتہ وار یا ماہنامے میں شائع کرا لینا عظمت کی بات نہیں،
لیق وہی عظیم اور لافانی ہوتی ہے جو سوچ سمجھ کر ایمانداری خلوص
ے ساتھ پیش کی جائے۔ ایسی تخلیق فنکار کو بڑے امتحان میں رکھتی ہے
تخلیق کی منزلوں میں ہر فنکار ایک ایک قطرے کا حساب دیتا ہے اور
ایک لمحے میں نہ جانے کتنی بار مرتا ہے اور زندہ ہوتا ہے۔ ابراہیم
طرح آگ میں کود جانا یا عیسیٰ کی طرح صلیب کو اٹھائے پھرنا بڑا
کل کام ہے لیکن فنکاری اس سے بھی مشکل ترین عمل ہے اس لئے وہ فنکار
تخلیقی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اس کی رفتار یقیناً کچھ نہ کچھ سست
تی ہے، مشاہدے، تجربے، یا مطالعے کو تخلیقی تجزیہ بنانے تک کی
رآگ کی دریا سے گذرنے کا کام ہے، اس منزل تک پہنچنے کے دقفے
فنکار کبھی سمندر کی طرح خاموش ہو جاتا ہے اور کبھی بیقرار
ڈل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے اضطراب میں بھی ایک طمانیت ہوتی
ہے اور طمانیت میں بھی ایک التہاب ہوتا ہے مگر دونوں صورتوں
میں وہ سمندر ہی کی طرح عظیم و جلیل ہوتا ہے وہ کبھی برساتی
نالہ نہیں بنتا ہے اور جو فنکار اپنے آپ کو سمندر بنانے کی
کوشش کرے گا وہ یقیناً اوروں کی بہ نسبت کم سخن ہوگا۔
اس لئے زیادہ لکھنا یا کہنا فنکارانہ عظمت کی دلیل نہیں اگر
ساری زندگی میں کوئی فنکار ایک کہانی ایسی لکھ سکا جو اسے
امر بنا سکا تو یہ کافی ہے۔

روشن آرا نیر کے یہاں فنکارانہ عظمت کو پانے
کی مختلف سعی، جستجو و تلاش ملتی ہے ان کے تجربے اور مشاہدے
میں بڑی سچائی، گہرائی، دوربینی، اور نزاکت و نفاست ہوتی
ہے وہ اپنے موضوع کے مختلف انداز اور پہلوؤں سے
دیکھتی ہیں اور اس کی ساری تفصیلات و جزئیات کا باشعور
تجزیہ کرتی ہیں۔ بعد ازاں اس موضوع کو احساس،
فکری اور جذباتی تجزیہ بناتی ہیں اور جب ان کے تجربے احساس
ادراک فکر اور جذبے میں ہم آہنگی اور توازن آجاتا ہے تو
وہ اپنے موضوع کو پلاٹ کی خوبصورت تعمیر عطا کرتی ہیں۔ یہ سارا
عمل ان کے ذہن میں ترتیب پاتا ہے اور اس طرح کہانی
ان کے ذہن ہی میں تکمیل کے سب مراحل طے کر لیتی ہے۔ مگر
اس کے بعد الفاظ و حروف کے جامے میں اس تکمیل شدہ
کہانی کو پیش کرنے کا ایک کٹھن مرحلہ رہ جاتا ہے جس کے
لئے روشن آرا نیر عام بول چال کی زبان استعمال کرتی ہیں،
مگر اس میں بھی الفاظ کے انتخاب، جملوں کی نشست و
برخواست، مکالموں کی برجستگی اور بے ساختگی اور منظر
نگاری کی ڈرامیت کے تقاضوں کو کبھی فراموش نہیں کرتیں
الائم و رموز بھی ان کے یہاں نت نئے اور خوبصورت دلکش اور
دلنشیں نظر آتے ہیں، تصویر و استعارے کے استعمال میں بھی

وہ جذبات و انفرادیت کے قائل ہیں، نتیجتاً ان کا اسلوب بیان بیحد اثر آفریں، سلیس، اور مترنم ہے، خصوصاً ان کے اسلوب میں عورتیت یا عورتوں کی گفتگو کا مخصوص انداز اتنے موقع و محل سے سامنے آتا ہے کہ اسلوب کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، اس خصوصیت میں بھی ان کے اسلوب کو بھی زیادہ جاندار اور دلپذیر بنا دیتا ہے، ایسے تو یہ خصوصیت اردو کی دوسری خواتین افسانہ نگار کے یہاں ملتی ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے ... وہ الھڑپن، معصومیت یا بے ساختگی نہیں ہے جو روشن آرا نیر کے یہاں نظر آتی ہے۔ دراصل وہ لوگ دانستہ بیگماتی لب و ... تی ہیں، اس لئے قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ فنکار اپنے عورت ... نے کو ظاہر کرنا چاہتا ہے، اور یہیں سے اس کا فطری پن ختم ہو جاتا ہے۔ روشن آرا نیر کے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں، ان کا اسلوب شروع ہی سے اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ فنکار صنف لطیف سے تعلق رکھتا ہے، اور یہی خصوصیت ان کے اسلوب کو دوسروں سے ممتاز و منفرد بناتی ہے۔

روشن آرا نیر کے یہاں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ایک خاص سلیقہ اور حسن پایا جاتا ہے، وہ پلاٹ کو کہانی کے مزاج کے مطابق مرتب کرتی ہیں اور خواہ مخواہ اس میں پیچیدگی، جدت، یا انوکھاپن پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتیں، اس لئے ان کی کہانی کا ہر پلاٹ اپنے موضوع اور اسلوب سے مکمل طور پر ہم آہنگ اور مربوط نظر آتا ہے، پڑھنے والے کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ پلاٹ میں تکلف، تصنع، اور کسی قسم کی کمی ہے، بلکہ اس کے ربط و تنظیم سے کہانی کا مجموعی تاثر و حسن نکھر جاتا ہے۔

کردار نگاری میں بھی یہ انسان سیرت شخصیت کے فطری تقاضوں کے سامنے رکھتی ہیں، اور واقعہ طرازی اس طور پر کرتی ہیں کہ کرداروں کی نفسیاتی الجھن و پیچیدگیاں حقیقی اور اصلی روپ میں آ سکیں، تاکہ کردار غیر فانی اور سرمدی اہمیت حاصل کر سکے، ان کا کوئی کردار بیجان، غیر متحرک بے عمل، اور بے روح نہیں ہوتا، ہیرو اور ولین دونوں کی کردار نگاری میں روشن آرا نیر بڑے متوازن شعور سے کام لیتی ہیں، اور وہ اس طرح دونوں کے پیکر تراشی کرتی ہیں کہ ولین کا کردار اپنی تمام توانائی اور بھرپور اثرات کے باعث ہیرو کے کردار کو مزید مرکزیت دیتا ہے جس سے ہیرو کا کردار زیادہ منور روشن اور اجاگر ہو جاتا ہے، اور کہانی میں تصادم اور الجھن کا پہلو بیحد دلچسپی کا حامل ہو جاتا ہے، اور اس طرح کہانی فطری انداز میں اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہے، اور ایک خوبصورت انجام کے ساتھ مکمل ہو جاتی ہے، ان کے یہاں چھوٹے چھوٹے کردار بھی خاصی فنی مقصدیت رکھتے ہیں اور اس لئے آتے ہیں کہ وہ واقعہ طرازی میں معاون ہو سکیں، اور مرکزی کردار کو تقویت دے سکے۔

فضا بندی، اور منظر نگاری، میں بھی ان کے یہاں ایک خاص انداز بیان ملتا ہے، کسی بھی منظر کی تصویر کشی کرتے وقت یہ اس کے حقیقی خدوخال کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں، تاکہ متعلقہ منظر اور فضا اپنے تمام جلال و جمال کے ساتھ پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے متشکل ہو جائے اس طرح ان کے یہاں فضا بندی اور منظر نگاری میں وہی حسن ملتا ہے جو ڈرامہ نگار کے یہاں اسٹیج سازی میں یعنی یہ منظر نگاری کے لئے ڈرامائی انداز تحریر سے کام لیتی ہیں۔

روشن آرا نیر نے فن افسانہ تک چند اہم خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے، میری نگاہوں سے ان کے کئی افسانے گذرے ہیں جن میں عورت، ادب، اور دیوتا، مطبوعہ سب رنگ الہ آباد، عورت عورت ہے مطبوعہ "صنم" پٹنہ،

ری اور خلش' مطبوعہ "شاعر" بمبئی' روٹی" مطبوعہ منتو کراچی شور' مطبوعہ ڈائرکٹر لاہور' نہیں نہیں" مطبوعہ گل رخ کراچی' کی بیٹی مطبوعہ سوز کلکتہ' بدصورت مطبوعہ شمع ادب' سلطان پور' وطن سپاہی' مطبوعہ فانوس کٹیہار' شبنم' سمندر' اور ساحل' مطبوعہ گہی دھلی' پتھر سایہ اور انسان' مطبوعہ سردوغ دھلی' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں' آپ کو ان افسانوں میں وہ ساری باتیں نظر آئیں گی جن کا ذکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ موصوفہ اپنی فنی ذوق و شوق کی آبیاری اس خلوص اور سچائی کے ساتھ کرتی رہینگی ... اگر یہ ... طرح برقرار رہا تو انکا ادبی مستقبل بہت جلد ادبی معراج حاصل کر لے گا۔

روشن آرا نیر

"محبوب مشغلے" کے عنوان سے روشن آرا نیر کا تذکرہ کیا ہے اس مضمون سے موصوفہ کی شوخ و شنگ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر اسی طرح مطالعہ جاری رہا اور موصوفہ افسانے لکھتی رہیں تو ایک دن آئے گا جب یہ دنیائے ادب کی عظیم افسانہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کی جائیں گی۔ مجھے امید ہے کہ جہاں انہیں ادب سے دلچسپی ہے وہاں وہ اپنی خاندانی شرافت نجابت اور دینی ماحول کا اثر بھی قائم رکھیں گی۔ اور اپنے فن کو آہستہ آہستہ ایک ایسے سانچے میں ڈھالیں گی جس سے معاشرہ کی تعمیر ہو سکے۔

۳ ستمبر ۱۹۷۸ء

رہبر کے چند افسانوں کا جائزہ! پروفیسر حامد چھپروی

بہار میں اردو افسانہ نگاری میں دو تین سال میں جن لوگوں نے شہرت حاصل کی ہے ان میں ۔ ایم ۔ اے حسن رہبر کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے ۔ رہبر بہار کے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان افسانہ نگار ہیں ۔ ان کے افسانے ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں ۔ یوں تو انکے افسانے بھی بار بار میری نظر سے گذرتے رہے ۔ مگر جب برادرم لطف الرحمن صاحب نے " بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر " کیلئے انکی افسانہ نگاری پر ایک مضمون کی فرمائش کی تو میں نے انکے افسانوں کو تلاش کیا لیکن بدقسمتی سے کچھ ہی افسانے مل سکے ۔ اس کے علاوہ چونکہ رہبر کی افسانہ نگاری ابھی ارتقائی سفر میں ہے اسلئے مجھے بھی مناسب معلوم ہوا کہ انکی افسانہ نگاری کے متعلق تفصیلی گفتگو کرنے کے بجائے ان کے چند افسانوں کا جائزہ پیش کر دوں ۔ اس جائزہ سے انکے فکر و فن کے مختلف پہلو سامنے آجائیں گے ۔

" شکست کی چیخ " رہبر کا ایک نہایت کامیاب المیہ افسانہ ہے ۔ افسانہ نگار نے اس میں مرکزی کردار رگھو کے المیہ کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے ۔ اس افسانہ میں رگھو، شیام اور بدھو نچلے طبقے کے نمائندہ بنکر آتے ہیں اور اپنے طبقہ کی نفسیات اور الجھنوں کو پیش کرتے ہیں ۔ افسانہ کا پلاٹ سادہ ہے اور خط مستقیم کی طرح آگے بڑھتا ہے ۔ کہیں کوئی پیچیدگی یا الجھاؤ نہیں ہے ۔ افسانہ کا آغاز رگھو اور شیام کی تاڑی نوشی سے ہوتا ہے ۔ رگھو اور شیام دوست ہیں اور مل میں کام کرتے ہیں ۔ مل سے فرصت پاتے ہی سارے دن کی تکان دور کرنے بسنتی کے تاڑی خانے میں جا پہونچتے ہیں اور رتنا (تاڑی پلانے والی لڑکی) کے حسن اور تاڑی کے نشہ سے اپنی تھکاوٹ دور کرتے ہیں ۔ بعد میں بدھو بھی رگھو اور شیام کا دوست بن جاتا ہے ۔ دسہرے کے زمانے میں رگھو اپنی مریض بہن موہنی کو بھگوان کے مندر کی پوجا کیلئے لیے آتا ہے ۔ کیونکہ اس بھگوان کی درشن میں بڑی شفا تھی ۔ کتنے ہی مریض آتے اور اچھے ہو کر چلے جاتے ۔ اسی درمیان رتنا بسنتی کا تاڑی خانہ چھوڑ کر چلی جاتی ہے ۔ رگھو شیام اور بدھو حسب معمول شام کو تاڑی پینے جاتے ہیں لیکن تاڑی پیتے وقت انہیں رتنا کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ تاڑی پی کر ذہن میں ہوس کی آگ اور جنس کا ہیجان لے کر جب یہ لوگ گھر لوٹتے ہیں تو مندر کے پاس ایک لڑکی دکھائی دیتی ہے ۔ شیام اور بدھو مندر میں پہونچتے ہیں اور اس لڑکی کو مجبور و بے بس کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں ۔ پھر رگھو پہونچتا ہے ۔ رگھو کو وہ لڑکی رتنا معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن جب وہ اس لڑکی کا چہرہ دیکھتا ہے تو اسے اپنی بہن دکھائی دیتی ہے ! اپنی بہن کا مسلا ہوا خاموش جسم دیکھ کر اس کی چیخ نکل جاتی ہے اس طرح یہ افسانہ ایک نہایت اہم نقطہ پر آکر ختم ہو جاتا ہے جیسا

پہلے کہا گیا ہے کہانی سیدھے طریقے سے رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہے یہاں تک کہ اختتام ایک بہت بڑے المیے کے سامنے آجاتا ہے۔ یہاں کلائمکس بڑی فنکاری کے ساتھ برتا گیا ہے۔ افسانے میں کلائمکس وہاں آتا ہے جہاں رگھو اپنی بہن کو پہچان لیتا ہے۔ چونکہ کلائمکس کا یہ نقطہ ہی حاصل افسانہ اور پورے افسانے کی بنیاد ہے اس لئے کلائمکس بڑا شدید ہے۔ یہاں پڑھنے والے کو شدید ذہنی جھٹکا لگتا ہے۔ اور اسکے بعد افسانہ فوراً ختم ہوجاتا ہے۔ کلائمکس کی اس شدت کے وجہ سے تاثر بڑا گہرا ہوگیا ہے۔ رگھو کا یہ المیہ گرچہ افسانوی ادب میں کوئی نیا المیہ نہیں ہے۔ لیکن اس کو جس فنکاری سے سامنے لایا گیا ہے اس سے اسمیں بلا کی اثر خیزی پیدا ہوگئی ہے رگھو کے چیخ سے انسانی وجود کانپ اٹھتا ہے اور تمام پڑھنے والے اس المیہ کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔

اس افسانہ میں دراصل نچلے طبقہ کے المیہ کو دکھایا گیا ہے یہ نچلے طبقہ کے افراد دن بھر محنت کرتے ہیں اور جو کچھ کماتے ہیں اس کا بڑا حصہ شام کو تاڑی پینے پر صرف کردیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ماحول اور اپنے طبقے کی تلخیوں کو بھولنا چاہتے ہیں۔ پریم چند کی کہانی "کفن" میں رگھو اور مادھو کفن کے پانچ روپیوں کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور اسکی شراب پی کر ایک ہی رات میں سارے روپے خرچ کردیتے ہیں۔ اسی طرح رگھو اور شیام بھی پیسہ ہوتے ہی تاڑی خانہ پہونچ جاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف یہ سارے کردار اپنے طبقے کے المیہ کو پیش کرتے اور دوسری طرف اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتے ہیں کہ نچلے طبقہ کے افراد کا المیہ خود انکا اپنے افعال و اعمال سے ابھرتا ہے۔

اس افسانہ میں رگھو مرکزی کردار ہے۔ اسکے علاوہ رتنا، موہنی، بدھو اور شیام بھی سامنے آتے ہیں۔ بدھو اور شیام کے کردار اپنے طبقے کی مخصوص نفسیات، جذبات، اور ہیجانات کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگار نے ان لوگوں کے کردار پر توجہ نہیں دی ہے۔ اس لیے یہ دونوں کردار ابھر نہ سکے، رگھو طبقاتی زندگی کا نمائندہ کردار ہے۔ آخر میں جو المیہ رونما ہوتا ہے اس سے یہ کردار بہت اہم ہوجاتا ہے۔ رگھو کے کردار کا المیہ اس لئے شدید ہوجاتا ہے کہ المیہ کے تار و پود خود اس کے ہی افعال و حرکات سے بنتے ہیں۔ رتنا ایک غریب لڑکی ہے جو زندگی گذارنے کے لئے تاڑی خانے میں نوکری کرتی ہے۔ اس کی جوانی کی امنگیں غربت و افلاس کے نیچے سسکتی رہتی ہیں۔ رتنا کا کردار بہت تھوڑی دیر کے لئے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن یہ ایک بے حد کامیاب کردار ہے۔ اسکے جذبات و احساسات غربت اور سماجی نظام سے تصادم پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی ایک جوان لڑکی کی طرح امنگیں اور آرزوئیں موجزن ہوتی ہیں۔ لیکن دولت کی غیر مساوی تقسیم تمام آرزوؤں کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔

رتنا نے زندگی کی خاموش لمحوں میں آس اور امیدوں کے کتنے ہی دئے جلائے تھے۔ لیکن غربت نے اسکی جوانی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ بچپن سے بسنتی کے یہاں ہی تھی۔ اسی کے رحم و کرم پر جی رہی تھی۔ ورنہ اس کی بھی تو یہی خواہش تھی کہ اس کا بھی کوئی چاہنے والا ہوتا۔ یوں تو اسکے چاہنے والے بہت تھے لیکن سبھی مطلب کے یار۔ اسکا قدرداں کوئی نہ تھا۔ اس کی روح پیاسی تھی۔

یہی المیہ احساس رتنا کے کردار سے ہمیشہ چمٹا رہتا ہے وہ گاہکوں کے دل جوئی کے لئے ہنستی بھی ہے، ناز و ادا بھی دکھاتی ہے لیکن اس کی روح ہمیشہ تڑپتی رہتی ہے۔ اور اس کی شخصیت میں داخلی طور پر تصادم ہوتا رہتا ہے، رتنا کا کردار دراصل اس سماج کے خلاف ایک خاش احتجاج ہے

"پتھر اور دیوتا" میں دو طبقوں کے تضاد کو دکھلایا گیا ہے
سادھنا متوسط طبقہ کی ایک فرد ہے۔ وہ دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔
شراب اور تفریح کے ذریعہ اپنی زندگی خوب صورت بناتی ہے۔
متوسط طبقہ کے عام افراد کی طرح سادھنا بھی اعلیٰ طبقہ میں جگہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ خواہش گرچہ کہیں کھل کر سامنے نہیں آتی لیکن اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں یہ تمنا انگڑائیاں لیتی ہے۔ اپنی اس خواہش کی وجہ سے کبھی وہ ہیڈ کلرک سے عشق کرتی اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے لیکن جب نیا مینجر اس میں دلچسپی لیتا ہے اور اس کی کار اسکے دروازے پر آنے لگتی ہے تو وہ ہیڈ کلرک کو فراموش کر دیتی ہے اس سے بے اعتنائی برتتی ہے سادھنا کا عشق پائدار نہیں۔ وہ اپنے طبقہ سے اوپر اٹھنے کے لئے سہارا ڈھونڈتی ہے۔ اس لئے کبھی وہ ہیڈ کلرک کے ساتھ ہوتی ہے لیکن جیسے ہی نئے منیجر کا سہارا ملتا ہے وہ ہیڈ کلرک کو فراموش کر دیتی ہے۔ اس طرح سادھنا کے کردار سے متوسط طبقے کا المیہ سامنے آتا ہے۔ دراصل متوسط طبقہ ہمیشہ ایک المیہ سے دوچار رہتا ہے۔ کیونکہ اسکی آرزوئیں، امنگیں اور تمنائیں اعلیٰ طبقہ کی طرف لے جانا چاہتی ہیں۔ اس عمل میں اسکی وفا۔ اس کا خلوص، اسکی محبت اور اسکی ہمدردیاں ساری چیزیں کھوکھلی اور ناپائدار بنکر رہ جاتی ہیں۔ سادھنا کے برخلاف دوسری طرف بالکل نچلے طبقے کا فرد مادھوری ہے۔ جو ہے تو بھکارن لیکن اس کی ہمدردی اس کا خلوص اور اسکی محبت میں پائداری اور استحکام ہے۔ سادھنا متوسط طبقہ کے المیہ اور اسکی خامیوں کو پیش کرتی ہے۔ تو مادھوری نچلے طبقہ کے دکھ، درد، اور اسکی اخلاقی بلندی کو نمایاں کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے دو طبقوں کے اس تضاد کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

سادھنا مادھوری کے کردار اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کردار اپنی تمام طبقاتی خوبیوں اور خامیوں کو لے کر آتے ہیں اور اپنے طبقوں کی علامت بن گئے ہیں سادھنا اور مادھوری دونوں کی کردار میں ارتقا ہے۔ دونوں کردار ایک نقطہ پر پہونچ کر ایک بہت بڑا ٹرن (TURN) لیتے ہیں۔ سادھنا بے وفائی کرتی ہے، اور مادھوری خلوص محبت مادھوری کا کردار بہت کامیاب ہے۔ اسکی شخصیت کی مختلف جذباتی اور نفسیاتی سطحیں سامنے آتی ہیں۔ اتنے مختصر کردار میں، اسکے جذبات، نفسیات، اور ہیجانات کے اتنے رنگ پیش کرنا آسان نہیں۔ مادھوری اردو افسانہ کا ایک پیچیدہ لیکن انتہائی کامیاب اور زندگی بداماں کردار ہے۔

"بھکارن" ایک فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والی بھکارن گوری کی کہانی ہے۔ گوری بچپن ہی سے فٹ پاتھ پر اپنی زندگی گذارتی چلی آرہی تھی۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ہر روز اسٹیشن، بس اسٹینڈ، اور سینما گھروں کے چکر لگاتی اور جو کچھ ملتا اسے رات کو کھا کر سو جاتی۔ اس کی زندگی کا یہی معمول تھا۔ لیکن جیسے جیسے اس کی عمر بچپن کی سرحد سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہونے لگی اس کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ جب اس کے ہاتھ پر دو کے بجائے چار پیسے ملتے تو وہ اس اضافہ پر سوچنے لگتی۔ گوری کی دوستی ایک دن فٹ پاتھ پر سونے والے دوسرے بھکاری "کالے" سے ہو جاتی ہے۔ بعد میں یہ دوستی محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لئے جب گوری منی لال کے نوکر کی شکایت کرتی ہے تو کالے اسے مارتا ہے اور پولس اسے پکڑ کر لے جاتی ہے۔ گوری کالے کے پکڑے جانے سے پریشان ہوتی ہے۔ لوگ اسے داروغہ جی کو خوش کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے رامو کاکا کے یہاں مدد کیلئے جاتی ہے۔ رامو کاکا مدد دینے کے بجائے اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ دراصل کیرکٹر اسٹوری ہے۔ پورا افسانہ گوری کے گرد چکر لگاتا ہے۔ رہبر کا مشاہدہ وسیع اور گہرا ہے

انہوں نے فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس افسانہ میں فٹ پاتھ کی زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ملتی ہے۔

رہبر کے یہاں طبقاتی شعور، مشاہدہ کی وسعت اور انسانی نفسیات سے گہری واقفیت ملتی ہے۔ گوری کے کردار کی تعمیر میں بہت غور و فکر سے کام لیا گیا ہے۔ ایک طرف گوری غریب اور افلاس زدہ طبقے کی نمائندگی کرتی ہے تو دوسری طرف جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے والی لڑکی کے اندر پیدا ہونے والے جنسی شعور اور جذبات و ہیجانات پیش کرتی ہے۔ رہبر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں اعمال و اقوال سے ایک ایسا ہلکا سا اشارہ کر دیتے ہیں جس سے اس کردار کی شخصیت کا ایک پورا پہلو سامنے آجاتا ہے گوری فٹ پاتھ پر زندگی گذارنے والے طبقہ میں پیدا ہوئی اور اسی ماحول میں بڑی ہوئی۔ لیکن وہ اس نظام کے خلاف جس میں کوئی مخلوق میں رہے۔ اور کوئی فٹ پاتھ پر زندگی گذار دے، ایک خاموش بغاوت کرتی ہے۔ رہبر نے بہت ہلکے اشارے سے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوری کالے سے کہتی ہے:-

"آخر کب تک ہم لوگ فٹ پاتھ پر سوئیں گے؟"

اپنی موجودہ حالت کو بدلنے کے لئے گوری کے اندر جو تڑپ، اضطراب اور بے چینی ہے اس کی طرف کتنا بلیغ اشارہ ہے۔ اسی طرح گوری کے اندر پیدا ہونے والے جنسی شعور کی طرف کتنی فنکاری سے اشارے کئے گئے ہیں۔

"جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے چہرے کی دلکشی اور آنکھوں کی کشش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی چالوں میں ایک نیا انداز پیدا ہونے لگا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ کمانے لگی۔ لیکن جب اسکی ہتھیلی پر دو کے جگہ دس پیسے پڑنے لگے تب وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ کیا دھندا ہے! اور تب سے وہ سویرے گھر آنے لگی"

پہلی مثال میں صرف ایک جملہ میں گوری کے آرزوؤں اور اسکے جذبات کی تمام گہرائیوں کو سمو دیا گیا ہے۔ دوسری مثال میں صرف چند اشارے ہیں۔ لیکن ان اشاروں میں جو نفسیاتی ابلاغ اور تنوع ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جوان ہوتی ہوئی بھکارن کو جب دو پیسے کی جگہ دس پیسے ملتے ہیں تو وہ اس کی وجہ سوچتی ہے۔ اور سویرے گھر واپس ہونے لگتی ہے اس ہلکے اشارے میں کتنی گہری نفسیاتی صداقت پیش کی گئی ہے۔ دراصل مختصر افسانہ کا فن اسی ایجاز و اختصار کا فن ہے اس میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ ہر بات وضاحت کے ساتھ پیش کی جائے۔ دراصل وضاحت اور تفصیل سے افسانے کا فن مجروح ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں ایمائی اشاروں کی اہمیت زیادہ ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دینا ہی افسانہ نگار کا کمال ہے۔ رہبر نے فن کے اس پہلو کو اچھی طرح سمجھا ہے اسی لئے وہ اس کو برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہلکے اشاروں اور مختصر جملوں میں گہری حقیقتوں کو پیش کر دیتے ہیں یہ خوبی بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔

مختصر افسانہ کے فن میں اختتام کی بڑی اہمیت ہے۔ افسانہ نگار جو تاثر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا انحصار دراصل اختتام پر ہی ہوتا ہے۔ رہبر کے افسانوں میں خاتمہ بڑے ہی فنکارانہ انداز میں سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا اختتام دراصل ایک نقطۂ عروج پر ہوتا ہے جہاں پہونچکر افسانہ کے شدت تاثر میں ایک نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بیشتر افسانوں کے خاتمہ کی نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہوتی ہے۔ منٹو اور او ہنری (O. HENRY) کی طرح رہبر بھی اپنے افسانوں کے اختتام کو تحیر خیز اور غیر متوقع بنا کر پڑھنے والوں کو ایک

شدید جھٹکا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے بیشتر افسانوں کا خاتمہ اسی طرح کیا ہے

"رگھو جب مندر کے عقب میں پہونچا تو اس نے چاندنی کی روشنی میں ایک نڈھال جسم کو فرش پر پایا۔ ننگا جسم عریاں حسن اس نے پاؤں سے ایک ٹھوکر مار دی .. .. . . رتنا۔

لیکن نڈھال جسم خاموش رہا آج تمہیں کیا ہو گیا ہو گیا ہے رتنا۔ تم کہا کرتی تھیں کہ میں درجنوں سے نمٹ سکتی ہوں.......... وہ اس کی طرف جھکا اور غیر شعوری طور پر اس کے جسم پر اس کا آنچل پھیلا دیا۔ اور جیسے ہی اس کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ رگھو کے سامنے اس کی بہن کا مسلا ہوا جسم پڑا تھا۔ اس کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی ـ .... موہنی .... (شکست کی چیخ)

"لیکن کاکا مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"

"تو فکر مت کر گوری میرے رہتے ہوئے کالے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے کاکا۔ میں کل پھر آؤنگی۔"

اس وقت تو کہاں جائیگی۔؟

"فٹ پاتھ پر سونے کے لئے۔"

کالا نے اسکی باتوں کو ان سنی کر دی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ بند کر دیا کمرے میں ہلکی تاریکی پھیل گئی۔

وہ گوری کو عجیب و غریب نظروں سے گھورنے لگا۔

پھر گوری سے بولا۔

"کیا تجھ پر اکوئی حق نہیں گوری ——— ؟" اس کی سرخ آنکھیں چمکنے لگیں۔

جیسے ان میں جوانی کی چمک آگئی ہو۔

رہبر کے بیشتر افسانوں کا اختتام چونکا دینے والا ہے اس سے پڑھنے والوں پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ رہبر کے چند افسانوں کے جائزہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مختصر افسانہ کے فن کو انہوں نے اچھی طرح سمجھا ہے اور اپنے افسانوں میں اسے برتنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ یہ جدید افسانہ نگار ہیں لیکن ان لوگوں میں نہیں جو پلاٹ کی ترتیب و تنظیم اور وحدت و تاثر کو افسانہ کے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ رہبر نے صرف "جدت" کے نام پر افسانہ کی بنیادی خصوصیات کو خیرباد نہیں کہا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانہ میں جو شاہ راہ بنائی تھی۔ رہبر بھی اسی شاہ راہ پر چلتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں تھے تکنیک کے شعور اور ترتیب و تنظیم کے سلیقہ کی کمی نظر آتی ہے۔ انکی تکنیک عام طور پر ترسیل کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی۔ رہبر میں تکنیک کا گہرا شعور بھی ہے۔ اور ترتیب و تنظیم کا سلیقہ بھی۔ وہ اپنے افسانوں میں افسانہ کی بنیادی خصوصیتوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ انکی تکنیک میں کہیں بھی پیچیدگی یا الجھاؤ نہیں وہ تکنیک کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتے بلکہ تکنیک ان کے یہاں خیالات و افکار کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ انکے افسانوں کی تکنیک عام طور پر اس میں کامیاب ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ رہبر میں اچھے افسانہ نگار ہونے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر وہ مستقبل مزاجی کے ساتھ لکھتے رہے تو ہوسکتا ہے کہ اردو کو ایک بڑا افسانہ نگار مل جائے۔

شکست کی چیخ

ایم۔ اے حسن رہبر

رگھو اور شیام ایک ہی مل میں کام کرتے تھے۔ دونوں کی دوستی بھی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ رگھو کو مل میں ایک مستری کی حیثیت سے آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہوئے تھے۔ اور شیام اسکے ایک سال بعد آیا تھا۔ لیکن دونوں کے فکر و خیال میں جو یکسانیت تھی اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔

رگھو کو پینے کی لت تھی۔ اور شیام بھی نشے کا عادی تھا دن بھر کی تھکن کو دور کرنے کے لئے کبھی کبھی وہ دارو بھی چڑھالیا کرتا تھا۔ جب رگھو سے اسکی دوستی بڑھی تو دونوں ایک ساتھ ہی بسنتی کے یہاں پہنچنے لگے۔

بسنتی موٹی سی، گوری سی ادھیڑ عمر کی دراز قد عورت تھی۔ جب شام کو دونوں ایک ساتھ مل سے لوٹتے تو غیر ارادی طور پر ان کے قدم بسنتی کے گھر کے سمت اُٹھ جاتے۔ دس پندرہ گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی جس میں زیادہ تر گھر پھوس اور مٹی کے تھے ان میں صرف بسنتی کا ہی گھر ایسا تھا جس کی دیواریں اینٹ کی تھیں اور چھت پر پھوس کی جگہ کھپریل تھی۔ بسنتی بڑی طرحدار عورت تھی۔ اس کا دھندا خوب چل رہا تھا۔ یوں تو اس کے یہاں بہت سارے لوگ آتے تھے لیکن وہ گاہک کے مزاج کو پہچان کر ہی اس سے پوچھتی تھی۔

"صرف تاڑی یا پلانے والی چھوکری بھی چاہیئے ـــ؟"

"کیا لوگی ـــــ؟"

"پانچ دے دینا۔"

"بہت زیادہ ہے۔!"

"اس سے اور کم میں کیا چاہتے ہو ـــ؟" بسنتی کے لہجے میں ہلکا سا طنز ہوتا۔ گاہک کو ہار ماننی پڑتی اور یہی حادثہ تو رگھو کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ ایکدن جب ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آکاش سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا سورج ڈوبتے ہی وہ بسنتی کے یہاں آیا۔ بسنتی نے تاڑی کی ایک لبنی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا

"پلانے والی چھوکری نہیں چاہیئے؟"

اور اس نے ہاں کہدی

رتنا کے ہاتھوں سے اسے پیتے ہوئے بڑا سرور مل رہا تھا۔ جب پی کر بہکنے لگا تو اس نے رتنا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح مسکراتی ہوئی اس کی گود میں آگری۔

اب تو شیام بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب دونوں چند لمحے کے لئے بسنتی کے یہاں رکتے تو یہ نشیلی فضا انکے ذہن کو سکون اور دماغ کو تازگی بخشتی اور چند چرّے چڑھانے کے بعد دن بھر کی تھکاوٹ بھول سے جاتے۔ ان کی چالوں میں مستی آجاتی۔ آنکھوں میں ہلکا سا خمار ہوتا اور دونوں گھر کی طرف چل پڑتے۔ ہفتہ میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب وہ بسنتی کے گھر کا رُخ نہ کرتے۔

جب دن پینے کی پہلے سے تیاری ہوتی اس روز رتنا ہی ساقی کا کام انجام دیتی۔ پلاتے ہوئے وہ خود بھی کبھی کبھی پی لیتی۔ پھر تو پینے پلانے میں لطف آجاتا

آجاتا زمانہ بھر کی خوشیاں بسنتی کے ایک چھوٹے سے گھر میں سمٹ آتیں اور جب سبھی نشہ میں دھت ہوجاتے تو اُن کے سامنے دنیا بڑی رنگین ہوجاتی جوانیاں مچل اٹھتیں۔ حسن یادو جگاتا وجود میں خپر کاریاں سی سنسنے لگتیں۔ لیکن رتنا تو اتنی عادی ہوچکی تھی کہ اس کے ماتھے پر بل تک نہ آتا۔ رتنا جوان تھی۔ شوخ الہڑ چلبلی۔ اس کے چہرے پر حسن و شباب کی سُرخی دمک رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹوں کے آگے قوس قزح کا رنگ بھی پھیکا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی تازگی اور چہرے کا بانکپن بہاروں کی دلکشی تھی مئے کا نشہ تھا۔

رتنا نے زندگی کے خاموش لمحوں میں آس اور امیدوں کے کتنے دیئے جلائے تھے لیکن غربت نے اس کی جوانی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ بچپن سے بسنتی کے یہاں پلی تھی اس کے رحم و کرم پر جی رہی تھی ورنہ اس کی بھی تو ایک خواہش تھی کہ اس کا بھی کوئی چاہنے والا ہوتا۔ یوں تو اس کے چاہنے والے بہت تھے لیکن سبھی مطلب کے یار۔ اس کا قدرداں کوئی نہ تھا۔ اس کی روح پیاسی تھی۔ بسنتی کی آنکھوں کا اشارہ اس کے لئے حکم تھا۔ ورنہ وہ اپنی نسوانی حیا کو ہرگز نہ مجروح کرتی۔ آنکھوں کی دوشیزگی اور ہونٹوں کی پاکیزگی کا سودا نہ کرتی کوئی رات ایسی نہ ہوتی جب وہ اپنے بستر پر اکیلے سوتی۔

گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ دسہرے کی چھٹی کے دن بیت رہے تھے لیکن رگھو چند روز سے بیحد پریشان تھا۔ اس کی بہن جس سے اسے والہانہ پیار تھا۔ دو ہفتے سے اپنے سسرال میں بیمار تھی۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بستی میں بھگوان کا ایک مندر تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بھگوان کے درشن میں بڑی شفا تھی۔ سینکڑوں لوگ وہاں اپنی مرادیں پاگئیں تھیں پھر کیوں نہیں وہ بھی اپنی موہنی کی صحتیابی کے لئے اسے بھگوان کے چرنوں میں پھول چڑھانے اپنی بستی لے آتا موہنی آئی اس نے بھگوان کے چرنوں میں پھول چڑھا کر منتیں مانگیں۔ اُسے امید تھی۔ اس کا بھگوان اس پر دیا کریگا اس کی کھوئی ہوئی صحت اسے مل جائے گی۔

رگھو بھی مطمئن تھا۔

چھٹی کے آخری دن تھے۔ شیام رگھو سے ملا۔ رگھو سویرے ہی سے پینے کے موڈ میں تھا۔ جب آکاش پر بادل چھاتے ہیں بہاروں کی دلکشی انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ نشیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ تو فطری طور پر پینے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد بدھو بھی ان میں آملا اور تینوں اس پگڈنڈی پر اتر گئے جو بسنتی کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اور جب بسنتی کے گھر میں داخل ہوگئے تو سورج ڈوب چکا تھا۔ دھند پھیلی رہی تھی خنکی میں ڈوبی ہوئی شام کتنی سہانی تھی۔ ماحول بڑا رومان انگیز تھا۔ بسنتی ایک پیڑھے پر بیٹھی گاہکوں میں مصروف تھی۔ اس کے سامنے تاڑی کے دو بڑے بڑے مٹکے رکھے تھے۔ رگھو اس کے قریب ہی ایک چٹائی پر بیٹھ گیا باقی ساتھی کھولی کے اندر چلے گئے۔ جہاں وہ ہر روز بیٹھا کرتے تھے۔ بسنتی نے جب گاہکوں سے فرصت پائی تو رگھو کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے آنکھوں میں ایک سوال لے کر رگھو کی طرف دیکھا۔

"دو روز سے کہاں تھے رگھو؟ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں کئی ایک سے پوچھا بھی لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔!"

"مل میں چھٹی تھی ــــ باہر گیا ہوا تھا۔ آج ہی لوٹا ہوں۔"
رگھو نے مسکرا کر بسنتی کی طرف دیکھا پھر ایک بیڑی سلگا لی اور ایک کش لے کر بسنتی سے پوچھا

"سماچار تو سب اچھا ہے نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے" بسنتی بولی، پھر اچانک اس کے چہرے پر اُداسی چھا گئی اور اس نے افسردہ لہجے میں رگھو کو مخاطب کیا۔
"رگھو! تم اس کلموہی جھنبا کو جانتے ہی ہونا۔ نگوڑی مرجو کے

ساتھ بھاگ گئی۔ اگر اسے بھاگنا ہی تھا تو کسی اچھے مردوے کے ساتھ بھاگتی ۔۔!" بولتے بولتے وہ چند لمحوں کے لئے رُکی۔ اس کے چہرے پر انگنت سلوٹیں اُبھر آئیں جیسے وہ کسی سخت اذیت میں مبتلا ہو۔ پھر رگھو کی طرف دیکھا اور بولی " ارے ہاں رگھو! میں نے تو تمہیں اس حرم جادی رتنا کے بارے میں بتایا ہی نہیں۔ کل اس کا باپ آیا تھا لڑجھگڑ کر اسے لے گیا۔ کہتا تھا۔ میرا حساب صاف کر دے۔ میں اپنی بیٹی کو نوٹنکی میں بھرتی کروں گا۔ میں نے حساب کے نام پھوٹی کوڑی بھی نہ دی۔ لیکن باپ کے ساتھ کر دیا۔ کہیں حرم جادی جمنا ہی کی طرح بھاگ جاتی تو میں اس کا کیا بگاڑ لیتی ۔۔؟"

"اچھا ہی کیا۔ اُن حرام جادیوں کا کیا ٹھکانہ ۔۔!" رگھو نے کہا۔ تب بسنتی بولی۔ "لیکن تم کہو تو میں کوئی اور انتجام کر دوں؟" رتنا کی بات اور ہے بسنتی۔ اس کے سامنے تو یہاں کی ہر شے پھیکی ہے ۔۔!"

اس نے پہلو بدل کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"تم تو آج بالکل کاروباری انداز اپنا رہے ہو رگھو۔ بولو تو ایک سے ایک بڑھ کر تمہیں دکھاؤں۔ ایک ہی ادا پر دل مچل نہ اٹھے تو میرا بسنتی نام نہیں ـــــ ہاں ـــ!"

"اچھا پہلے تاڑی بھیجو۔ پھر باتیں ہونگی ـــ!"

وہ بسنتی سے مل کر کھولی میں آگیا۔ جہاں اس کے باقی ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

چند لمحے بعد بسنتی کا چھوکرا تاڑی سے بھری ایک لبنی لیے اندر آیا اور درمیان میں رکھ کر چلا گیا۔ رگھو نے لبنی کے نصف منہ پر باریک کپڑے کا ایک چھنّا باندھا۔ پھر درمیان میں مسالے دار آلو اور تلے ہوئے چنے کی گزک رکھی گئی۔ پھر خالی گلاس بھرا گیا۔ ساری فضا تاڑی کی بھبک میں ڈوب گئی۔ بھرا ہوا گلاس شیام کی طرف بڑھا دیا گیا۔ شیام نے گلاس منہ سے لگایا۔ پھر دوسرے گلاس میں تاڑی انڈیلی گئی۔ گلاس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش کرتا رہا۔ اور لوگوں کے ہاتھ گزک کی طرف بڑھتے رہے۔ آج پینے میں بڑا لطف آرہا تھا۔ چند منٹ بعد تاڑی کا دوسرا دور چلا۔ گلاس بھرتے رہتے اور خالی ہوتے رہے۔ اور کئی مٹکے صاف ہو گئے۔ تو سبھوں پر نشے کا بھوت سوار ہو گیا۔ اُن کی نظروں میں شرافت اور حیا اب کوئی چیز نہ تھی تب بدھن نے جھومتے ہوئے کہا

"آج رتنا نظر نہیں آتی رگھو ـــ؟"

"اس کے بغیر تو سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا ہے" شیام نے ہاں میں ہاں ملائی۔ تب رگھو بولا۔

"اب تم رتنا کو یہاں کبھی نہ دیکھ پاؤگے!"

"کیوں؟"

"وہ اس ماحول سے دور جا چکی ہے۔"

یک لخت سب کی نگاہیں اٹھیں۔ اور رگھو کے چہرے پر جم گئیں۔

رگھو چند لمحے خاموش رہا۔ پھر دھیرے دھیرے کوئی گیت گنگنانے لگا۔ چند ہی لمحے بعد اس کی آواز پھیلنے لگی۔ اور وہ بے ہنگم سُروں میں گیت الاپنے لگا۔ اور جب گیت ختم ہو گیا تو کھولی میں بیٹھے دوسرے پینے والوں نے بھی تحسین بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ شیام اور بدھن نے بھی اس کی تعریف کی۔ پھر بدھن کی باری آئی۔ جب اس نے گیت شروع کیا تو سبھی جھوم اٹھے۔ کئی کئی مرتبہ گیت کے ایک ہی بول کو دہراتا رہا۔ پھر اس نے گیت بدلے۔ اور تازہ گلاس کے ساتھ ایک نئے گانے کی آواز اُبھرنے لگی۔

پھر جب رات کا اندھیرا فضا کو اپنی آغوش میں لے چکا تو سبھی بسنتی کی کھولی سے باہر آگئے۔ اُن کے قدم ڈگمگا رہے تھے منھ سے تاڑی کی بھبک پھوٹ رہی تھی۔ جھومتے ہوئے سبھی بستی کی طرف چل پڑے۔ اُن کے دلوں میں ایک نئی ہوس سُلگ رہی

تھی۔ آنکھوں میں شیطان ناچ رہا تھا۔ شوخ جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ جب بستی کی سرحد میں داخل ہوئے تو چاروں طرف خاموشی چھائی تھی۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ سناٹا تھا۔ اسی لمحے رگھو کی آنکھیں جو اداس تھیں، فتح کی خوشی سے چمک اٹھیں۔ بستی کے نکڑ پر پیپل کے درخت کے پاس ایک مندر تھا رگھو نے دیکھا ایک لڑکی مندر کی سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔ شیام اور بدھن نے بھی مندر میں داخل ہوتے ہوئے لڑکی کو دیکھا اور انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے رتنا پکار رہی ہو آجاؤ! تمہیں میری ضرورت تھی نا۔ تمہارے واسطے میرا دروازہ ہر وقت کھلا ہے چلے آؤ۔ میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گی جو تم چاہتے ہو۔

کسی غیر مرئی طاقت نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔

اور تینوں کے قدم مندر کے سمت بڑھ گئے۔ رگھو نہ جانے کیا سوچ کر مندر کے باہر ہی رک گیا۔ شیام اور بدھن لڑکھڑاتے ہوئے تیز قدموں سے مندر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی بھگوان کے سامنے کھڑی تھی بھگوان کے چرنوں میں پھول تھے اور وہ مجسم نیاز تھی۔

"رتنا" شیام نے اسے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پکارا۔ اس کے جذبات کی رعنائیاں مچلنے لگی تھیں۔

"کون ہو تم؟" لڑکی سہم گئی۔

"رتنا۔ تم مجھے اتنا جلد ہی بھول گئیں۔ آجاؤ رتنا۔ اتنی بے رخی بھی اچھی نہیں!" اس کے جذبات برانگیختہ ہوگئے۔ ہر لمحہ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی اس کا دل بے قابو ہوگیا اور اس کے قبل کہ وہ چیختی۔

شیام کا ہاتھ اس کے منہ پر پہنچ چکا تھا۔ اور پھر تیزی سے اس کے منہ پر اس کا آنچل لپیٹ دیا گیا۔ وہ تڑپی چلائی۔ لیکن سب بے سود۔ دونوں اسے ساتھ لے کر مندر کے عقب حصہ میں چلے آئے اور دوسرے ہی لمحہ وہ شیام کی آغوش میں تھی۔ اس نے لاکھ کوشش کی مگر مرد کا بازو۔ کمزور جسم کے گرد لپٹا رہا۔ پھر مرد کے بازو بدلے بدھن کی باری آئی۔ گرفت مضبوط ہوگئی اس نے بے بس ہو کر مضبوطی سے اپنے دانت بھینچ لئے۔ وہ شدت تکلیف سے کراہ اٹھی اور اس کا جسم نڈھال ہوگیا۔

اور جب رگھو مندر کے عقب میں آیا۔ تو اس نے چاند کی ہلکی روشنی میں نڈھال جسم کو فرش پر پایا۔ ننگا جسم۔ عریاں حسن۔ اس نے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری

"رتنا۔!"

لیکن نڈھال جسم خاموش رہا۔

"آج تمہیں کیا ہوگیا رتنا ——— تم تو کہا کرتی تھی کہ میں درجنوں سے نمٹ سکتی ہوں؟" وہ اس کی طرف جھکا۔ اور غیر ارادی طور پر اس کے جسم پر اس کا آنچل پھیلا دیا۔ اور جیسے ہی اس کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی، اس کا نشہ ہرن ہوگیا۔ رگھو کے سامنے اس کی بہن کا مسلا ہوا جسم پڑا تھا۔ اس کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی

"موہنی!!"

نعیم الدین

فکر وفن کے آئینے میں

از:- آذر ابراہیم

پریم چند سے کرشن چندر تک کے افسانوی سفر کا جائزہ لینے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہمارا افسانوی ادب اتنا بالیدہ، اور افسانوی شعور اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ کسی بھی نئے فنکار کے لئے جگہ بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایک طرف تو پیرے کی پرکھ کا شعور ہے تو دوسری طرف حیات و کائنات کے سربستہ رازوں کے انکشافات اور ان سے متعلق سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی الجھنیں پیچیدگیاں اور مسائل۔ یعنی ہمارے سامنے ایسے مسائل اور ایسی حقیقتیں ہیں جن کے ادراک کے بغیر طلب طلائی اور خواب آسودہ کا تصور ممکن ہی نہیں۔

مگر نعیم الدین ایسے فنکار ہیں جنہیں حیات و کائنات کا مشاہدہ بھی ہے اور جنہوں نے زندگی کو کلی اعتبار سے بلندی و پستی وسعت و تنگی، آلودگی و پاکیزگی کے ساتھ قبول کر لیا ہے اس لئے ان کے ادب میں انسانی منافرت، سماجی بدحالی اور سیاسی تنگ نظری کا تجزیہ بھی ہے اور انسان دوستی اور انسانیت نوازی کا سلیقہ بھی۔ سستی روٹی کی دوکان پر کھڑا ہونے والا درما ہو یا بھوک سے بلکتا ہوا سریش، محاذ جنگ پر دشمنوں سے لڑنے والا اور قومی غیرت و وقار کو بچانے والا راجن ہو یا ہجر و فراق کی چتا پر جل جانے والی رانی، صحرا صحرا، مارا مارا پھرنے والا نیکش ہو یا اداس شام کی دلدادہ سمترا ——— سب کے لئے ان کا دل روتا ہے اور سب کی جگہ ان کے فن میں ہے اور یہ ان کے فطرت کی دردمندی ہے

آج ویدانتک فلسفہ کے ماننے والے اور خدا کے وجود کو نہیں تسلیم کرنے والے بھی اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے کہ خدا اب تک ہمارے پیٹ تک نہیں پہونچ پایا ہے اور ہماری بھوک نہیں مٹا پایا ہے۔ آخر نابھی اور پیٹ میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ گویا بھوک ہمارے لئے ایک حقیقت ہے امٹ حقیقت۔ اسی لئے میں افسانہ "بھوک" کو زندگی کی بھوک سمجھتا ہوں جو پیٹ میں گھستی ہے ورما اور سریش بن جاتی ہے اور جب پیٹ باہر آتی ہے تو جسم پر پھسلتی جنس سے کھیلتی ہے اور تا نام رکھ لیتی ہے، وہ تنا جسے نوکری اور غلامی میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محض تنا کے ساتھ سینما نہ دیکھنے اور تفریح کا سامان مہیا نہ کرنے کی وجہ سے ورما کو نوکری سے جواب مل جاتا ہے پھر ——— پھر وہی بھوک وہی خشک سالی، وہی خزاں زدگی، جو بے طاقت اور بے بس عوام کا مقدر ہے۔

یہ بھی اس دور کا المیہ ہے کہ ہماری محبتوں کو آج سنگھار کے پھول، چنار کے پتے اور صنوبر کے سائے نصیب نہیں۔ گر نصیب ہیں تو زندگی کی حسرت ناکیاں، جنگ کی ہولناکیاں اور موت کی پرچھائیاں ——— افسانہ" دھواں اٹھ رہا تھا" اسی حقیقت کی طرف ایک اشارہ ہے۔ راجن کو سرسوں کے پھول عزیز ہیں۔ دھان کی کچی

بالیاں پیاری ہیں اور گاؤں کی رانی ——— وہ تو بہت ہی پیاری ہے۔ مگر اس کی زندگی ایک مرکز، ذریعۂ معاش پر آکر رک جاتی ہے اور وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر فوج کی نوکری کر لیتا ہے تا کہ رانی کو وہ اپنا سکے اور زندگی کے بوجھ کو ہلکا کر سکے۔ مگر سرحد پر جنگ شروع ہو جاتی ہے اور جنگ سے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ سیندور اور سہاگ بھی نہیں، راجن کو بھی رانی کی چتا سے دھواں کے سوا کچھ نہیں ملتا اور دھواں دل میں رہ نہیں سکتا، مٹھی میں بند نہیں ہو سکتا ——— کاش کوئی اخوت کے لئے جنگ کرتا۔ محبت کے لئے لڑتا! یہ افسانہ اسی لئے ہمارے دل کو ٹٹولتا اور ذہن کو جھنجھوڑتا ہے ——— اور یہی فن کی خوبصورتی ہے ———

اور یہی خوبصورتی و خوش سلیقگی سمترا میں بھی ہے۔ ایک طرف تو وہ سمترا ہے جسے "اداس شام" پسند ہے اور دوسری طرف "اداس شام" کا خالق زمیندار ہے جو سمترا کو "سمترا" ہی بننے دینا چاہتا ہے۔ اس کی شاندار روایتوں اور خوبصورت ماضی کے ساتھ ——— مگر سمترا کے مستقبل کو بچانے کے لئے سمترا کا باپ زمیندار کی "سمترا" کو خرید لینا چاہتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے ——— اور دوسرے ہی لمحے اس کے پرنچے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔

کتنی دلکشی اور کتنی حسرتناکی ہے۔ کتنا شدید احساس ہوتا ہے کرب کا اور گمشدگی کا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کہانی زندگی کے غم اور امنگوں کی کہانی ہے۔ اور کردار و واقعات کی آراستگی کے اعتبار سے تو یہ افسانہ ہمارے افسانوی ادب میں ایک اضافہ ہے۔

ایک بات اور ذہن نشین کر لیجئے کہ نعیم الدین کا فن متنوع ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں زندگی کے نشیب و فراز، رنگا رنگی، اور تنوع ملتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان کی ہمدردیاں بہت وسیع ہیں۔ انہیں سماجی نابرابری کا احساس ہے۔ امن و آشتی سے محبت اور جنگ و جدل سے نفرت ہے۔ زندگی کے چھوٹنے اور ٹوٹنے کا غم ہے۔ اور ان سب کے انعکاس و ارتکاز کے سبب ان کے فن میں خلوص ہے ابدیت ہے ——— اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

بقیہ سمترا ———

"میرا خیال ہے آپ اسے ضائع کر دیں ———!"

"یہ ناممکن ہے ———!"

"تو پھر آپ اس کی قیمت لے سکتے ہیں ———!" میں خاموشی سے اس کا منہہ تکنے لگا میرے دل میں ایک قسم کی اداسی چھا گئی ———۔

"ہزار، دو ہزار جو بھی آپ کی مانگ پوری کر دی جائے گی ———!"

میں خاموش رہا۔ حیرت زدہ نگاہوں سے اسکی طرف دیکھنے لگا وہ چند لمحہ رک کر پھر بولا۔

"سمترا ——— میری واحد اولاد ہے اس کے مستقبل کو بچانے کیلئے میں آپ کو پچاس ہزار تک دے سکتا ہوں ———!!

اچانک میرا ہاتھ ٹیبل پر رکھے ہوئے مسودے کی طرف بڑھا اور دوسرے ہی لمحہ اسکے پرنچے ہواؤں میں اڑ رہے تھے ———!

سمترا

از ـــ نعیم الدین

میں ریلوے بک اسٹال پر کھڑا کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان لڑکی میرے قریب سے گذر کر کاؤنٹر کے پاس آئی۔ لگا جیسے خوشبو کا ایک تیز جھونکا آکر فضا کو مہکا گیا ہو ـــــ خود بخود میری نگاہیں لڑکی کی طرف اٹھ گئیں ـــــ

وہ سنہری رنگ کی ساری میں ملبوس تھی۔ متناسب قد چمکدار نیلگوں آنکھیں۔ سُرخ وسفید کتابی چہرہ۔ لمبے لمبے بال اور ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ۔ اس کے گلے میں طلائی لاکٹ جھول رہا تھا۔ لڑکی بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑے تمام لوگوں نے اسے ایک نظر دیکھا۔ چند لمحے وہ کاؤنٹر پر بکھری کتابوں کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس نے دکان دار سے کہا۔

"مجھے اداس شام چاہیئے"

"جی ـــــ نہیں ہے ـــــ!" اس نے رک کر جواب دیا۔

تب لڑکی نے ایک انگریزی اخبار خریدا اور ویٹنگ روم کی طرف چلی گئی اور میں حیرت زدہ نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔ اس کی پرکشش نگاہیں میرے سارے وجود کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

اسے میری اداس شام پسند ہے تب ہی تو وہ اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اسے میری شاعری پسند ہے مجھے اپنے اشعار کا مجموعہ اسے دے دینا چاہیئے لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ اور تب میں نے سگریٹ سلگا کر ایک رسالہ خریدا اور اس کی طرف دیکھنے لگا جدھر سے گاڑی آرہی تھی۔ گاڑی کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی رکلب جیسے پورا پلیٹ فارم حرکت میں آگیا ہو۔ چند لمحے بعد گاڑی رکی۔ کچھ مسافر اترے کچھ نئے چڑھے۔ اتنے میں وہ پیکرِ حسن بھی ویٹنگ روم سے نکلی اس کے ساتھ پانچ چھ سال کا ایک بچہ بھی تھا وہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھی اور جب قلی اس کا سامان رکھ چکا تو میرے قدم بھی غیر ارادی طور پر اسی کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے اس کے سامنے والی برتھ پر ہی اپنے لئے جگہ بنالی اور میگزین دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب گاڑی حرکت میں آئی تو میں نے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ وہ سامنے سیٹ کے درمیانی دیوار سے لگ کر بیٹھی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ اور اس کے بعد ایک سیٹھ جو اپنے نکلے ہوئے توند کو بڑی مشکل سے سنبھالے بیٹھا تھا۔ اگلی پچھلی نشست پر بھی کئی عمر دراز لوگ بیٹھے تھے۔ اور جس برتھ پر میں تھا اس پر میرے علاوہ ایک بوڑھا بھی تھا۔ نہایت معمولی سا کپڑا پہنے جلدی میں چلتی گاڑی پر چڑھ آیا تھا۔ اور اب چڑھ کر ڈر رہا تھا۔ اسی لئے وہ بہت تھوڑی سی جگہ میں دبکا بیٹھا ہوا تھا۔

جب گاڑی کی رفتار تیز ہوئی تب میں نے اپنا بیگ کھولا اور بیگ میں سے "اداس شام" کی ایک جلد نکال کر برتھ پر رکھا ـــــ پھر ایک سگریٹ سلگا کر میگزین دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اس لئے کہ اس کا میری طرف دیکھنا لازمی تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف

ادیکھا پاکر اپنی تطرپ بھکا میں لیکن اس کے چہرے پر جو جذبات تھے وہ بہت شدید، گہرے اور دیرپا تھے۔ میں کھڑکی کے باہر خلاؤں میں دیکھنے لگا جہاں دور بہت دور ہرے بھرے کھیت، کھیتوں میں لہلہاتی بالیاں ...... ہواؤں کے نرم نرم جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنی جگہ پر بیٹھا ہوں اور ساری کائنات پیچھے کی طرف بھاگ رہی ہے۔ میں نے دوبارہ کن آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھا دیکھنے کو تو وہ اخبار پڑھ رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں برتھ پر رکھی "اداس شام" پر جمی تھیں۔ میں اسکی طرف دیکھتا رہا گاڑی اپنی پوری رفتار کے ساتھ بھاگتی رہی ـــــــ

اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو نوجوان لڑکی کے ساتھ جو بچہ بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ میں نے اسے بازوؤں کے سہارے اٹھا کر کھڑکی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے بڑی دلچسپی سے باہر کے نظاروں کو دیکھنے لگا۔ اچانک وہ مڑا اور دوسرے لمحے اس نے جھک کر برتھ پر رکھی کتاب کو اٹھا لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پہلے ہی صفحہ پر وہ ایک تصویر دیکھکر چہک اٹھا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا:

دیدی ـــ دیدی دیکھو یہ فوٹو ـــ!

لیکن اس کی دیدی نے اس کی باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے اس سے کتاب لے لی اور برتھ پر میرے قریب پھینککر بچہ سے بولی ـــــــ

"چپ بیٹھنا نہیں آتا کیا؟" تب بچہ ضد کرتا ہوا کتاب کی طرف بڑھا۔ جب وہ کتاب لے چکا تب میں نے اسے اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے ـــ؟

"سریندر ـــ"

"کہاں جا رہے ہو ـــ؟"

"گھر ـــ!"

"تمہاری دیدی تو بہت سخت معلوم ہوتی ہیں۔" میں نے کہا اور لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی خاموشی کے ساتھ اخبار دیکھنے میں منہمک رہی اور تب مجھے اپنی شکست کا احساس ہوا اور کوئی شاعر اپنی یہ تہک برداشت نہیں کر سکتا اسی لئے میں نے لڑکی سے کہا ـــــ

"کیا آپ مجھے اخبار کا ایک صفحہ دے سکتی ہیں ـــ؟"

اس نے پورا اخبار میری طرف بڑھا دیا اور پھر اوپر کی جانب چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ تب میں "اداس شام" کو اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: "آپ "اداس شام" ڈھونڈھ رہی تھیں دیکھئے ـــ!" اس نے کتاب اٹھا کر دیکھا۔ پھر ورق الٹنے لگی ـــ پہلے ہی صفحہ پر میری تصویر دیکھ کر وہ حیرت میں ڈوب گئی بار اس نے تصویر کو دیکھ کر میری طرف دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ تصویر میری ہے۔ تب اسکے چہرے پر مسرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ اور اس نے مسکراہٹوں کے درمیان پوچھا ـــــ

"آپ نریندر کمار ہیں ـــ؟"

"جی ـــ! اداس شام میری ہی بیمار ذہنیت کی اپج ہے!"

"لیکن مجھے بہت دنوں سے اس کتاب کی تلاش تھی ـــ!"

"مجھے خوشی ہے کہ میرے ہمسفر کو میری تخلیق پسند ہے ـــ!"

"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں آپ کی نظمیں بڑی شوق سے پڑھتی ہوں۔"

"یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ـــ!"

"آپ کہاں تک ساتھ دیں گے ـــ؟" اچانک لڑکی نے پوچھا ـــ

"پٹنہ جا رہا ہوں وہیں ایک اخبار کے ادارہ سے منسلک ہو گیا ہوں ـــ!"

میں نے پھر پوچھا آپ کہاں جائیں گی ـــ؟"

"میں بھی پٹنہ جا رہی ہوں۔ ڈاک بنگلہ کے قریب رہتی
رل ——!"

"پھر تو ملاقات ہوگی ——؟" میں نے کہا اور لڑکی کی
ف دیکھا جو بڑی پرشوق نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی
ب میں نے کہا —— "کتاب پر میرا پتہ درج ہے۔ آپ اسی پتے
مجھ سے مل سکتی ہیں ——!"

گاڑی جب پوری رفتار کے ساتھ راستہ طے کرتی ہوئی
منزل پر پہنچی تو ہم دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہو چکے
ے شعر و شاعری سے لیکر بات بھی زندگی تک اتر آئی تھی۔ اور
یرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال ابھر رہا تھا مجھے یوں لگ رہا
، جیسے لمحہ بھر کیلئے وقت کی رفتار رک گئی ہو اور شمترا کا حسن
—— اس کے حسن کی رعنائیاں مجھے اپنی باہوں میں اٹھا کر
ئے جا رہے ہوں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ہم دونوں ایک دوسرے
ے جدا ہو گئے۔ ایک حسین ہمسفر بچھڑ گیا۔

پھر وقت نے مجھے اپنی الجھنوں میں ڈال کر سب کچھ بھلا دیا۔
ف "سمترا" کی یاد باقی رہ گئی تھی جو اکثر ذہن کے پردوں پر
بر کر میرے خیالوں میں آجاتی —— ایک حسین ہمسفر کا خوبصورت
خیال —— کتنا دل نشیں تھا۔ آنکھوں میں اتر جانیوالی خوبصورتی
اس کے جسم کے ہر حصے سے نمایاں تھی لیکن ایک شام وہ مجھے اتفاقیہ
در پر گاندھی میدان میں مل گئی۔ وہ شام بڑی سانولی تھی۔
ی کے کھمبوں میں بلب بڑی خاموشی سے جل رہے تھے۔ جیسے زندگی
، کوئی ہلچل نہ ہو —— حرکت نہ ہو —— بالکل خاموش
افسردہ۔ میں گاندھی میدان کے ایک گوشہ میں ایک پختہ بینچ
بیٹھ گیا خیالوں کی رعنائیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ خوشبو کا ایک جھونکا
یرے قریب سے گذرا جس نے ذہن میں بہت ساری یادوں کو

جگا دیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا شمترا اپنی تمام تر خوبصورتی
کے ساتھ میرے قریب سے گزر رہی تھی۔ جیسے کوئی حسین سی تتلی
ہو۔ جو ہواؤں کے دوش پر اڑی جا رہی ہو۔ میں نے مسرت بھری
آواز میں اسے پکارا ——

"شمترا ——!"

اس نے آواز پہچان کر میری طرف دیکھا پھر اس کے
چہرے پر خوشی و شادمانی کی لہریں جاگ اٹھیں۔

"اوہ —— آپ ——؟" اس کے منہہ سے نکلا۔
پھر بولی بور ہو رہی تھی اس لئے چہل قدمی کیلئے چلی آئی ——!
"اچھا ہوا آپ آگئیں —— وقت گذارنے کے لئے مجھے
ساتھی مل گیا —— میں نے آپ کی نظموں کا مجموعہ پڑھا ——
بہت خوبصورت ہے" پھر دونوں بہت دیر تک باتوں میں کھوئے
رہے —— ڈوبے رہے۔ جیسے جیسے تکلفات کی
دوری ختم ہو رہی تھی وقت کی رفتار کا احساس جا رہا تھا۔ اور
پھر چاند اوپر کی جانب اٹھنے لگا۔ تب دونوں ایک دوسرے
سے جدا ہو گئے۔

پھر اکثر دونوں ملتے رہے وہ آتی ریک سے ان
رسالوں کو اٹھا کر لے جاتی جن میں میری نظمیں چھپی ہوتی تھیں
—— اور جلدی ہی وہ اسے پڑھ کر لوٹا دیا کرتی۔ کتاب
کی واپسی کے ساتھ اپنی پسند کا ذکر ضرور کرتی۔ پھر ایک دن اس
نے بڑے اچھوتے انداز میں میرے سامنے اپنی خواہش کا
اظہار کر دیا جیسے وہ بالکل اپنوں سے باتیں کر رہی ہو ——!
"نریندر میرا ماضی بڑا شاندار گذرا ہے چاہتی ہوں
کہ تم اسے ایک طویل نظم میں بدل دو تاکہ اسے اپنے پاس
محفوظ رکھ سکوں ——!" پھر اس نے اپنا ماضی دہرانے

ہوئے کہا میرے والد کو شعر و ادب سے دلچسپی ہے۔ وہ بہت
ں کر خوشی محسوس کریں گے۔ ان دنوں دہلی میں ایک پریس
کھول رکھا ہے۔ زیادہ تر وقت ان کا وہیں گذرتا ہے۔ میں نے
اس کے ماضی کو دیکھا جو بے حد شاندار اور پر لطف تھا۔ ماضی کے
تمام ورق کو اس نے میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

لیکن وقت تو اپنے بے شمار ان مٹ نشانات چھوڑتا
[illegible] مہینوں لگ گئے تو کہیں جاکر نظم مکمل ہوئی ایک
[illegible] نظم جو سمترا کے ماضی کی تصویر تھی۔ ایک خوبصورت سی
[illegible] نظم .... ایک شاہکار جسے دیکھ کر ان کی زندگی
گنگنا اٹھتی ——— جھوم اٹھتے ——— میں اسے لیکر سمترا کے دروازے
پر پہنچا لیکن مجھے بے حد مایوسی ہوئی وہ کالج کے ایک اکسکرسن
(EXCURSION) میں دو ہفتے کیلئے باہر جا چکی تھی۔ یہ سب
کچھ فوری طور پر ہوا تھا اسی لئے وہ مجھے اطلاع تک نہ دے سکی۔
میں اداس واپس لوٹ آیا۔ دوسرے ہی دن مجھے کاروباری
سلسلے میں چند دنوں کے لئے دہلی جانا پڑا۔ میں نے نظم بھی
ساتھ رکھ لی کہ اگر موقع ملا تو اسکی اشاعت کے متعلق دریافت
کروں گا۔ تاکہ جب سمترا واپس آئے تو میں اسے پیش کروں۔
وہ اسے کتابی صورت میں دیکھ کر کتنا خوش ہوگی۔ اور ایک دن
یہ سنہرا موقع مجھے مل ہی گیا۔

کام سے فرصت مل چکی تھی۔ میں مسودہ لیکر باہر نکلا
سانولی شام رات کی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ میں ایک پبلشیر
سے ملا اس نے میری باتوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا لیکن
جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے میری بڑی آؤ بھگت
کی۔ وہ میری شہرت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس لئے
باتوں کے درمیان اس نے میری نظم کو دیکھے بغیر کہا۔ آج

پہلی بار مجھے آپکی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں آپکی تخلیق کا
معقول معاوضہ دوں گا ——— !

"میں معاوضہ نہیں چاہتا ——— ! یہی تو میری زندگی کا
ایک سرمایہ ہے جسے میں نے بڑی محنت سے پورا کیا ہے۔ اس کی کتابت
و طباعت خوبصورت ہونی چاہیئے ...... !

"آپ اطمینان رکھیں ہماری خدمات آپ کو پوری طرح مطمئن
کردیں گی۔ اس نے مسودہ لیکر میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر مسودہ لے کر
زیرلب بولا "سمترا" نام تو بڑا خوبصورت رکھا ہے۔

"جی ایک ہفتہ تک اسکی اشاعت ہونی چاہیئے۔ معلوم
نہیں کس روز مجھے لوٹنا پڑے ——— !"

"کتاب آپ کو وقت پر مل جائے گی۔ لیکن کل رات آپ
کو کھانے پر آنا ہوگا دعوت رہی ——— !"

"شکریہ ——— ! آجاؤں گا ——— !"

دوسرے دن رات کے وقت جب میں اس کے دفتر
پہنچا تو وہ آفس ہی میں تھا۔ اس نے بیٹھنے کے لئے مجھ سے
کہا اور اپنے قریب ہی جگہ دی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ مجھے
دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر پسینے کے بے شمار قطرے ابھر آئے
تھے۔ جسے اس نے رومال میں جذب کرتے ہوئے مجھے خوش آمدید
کہا تھا لیکن اس کے چہرے پر اذیت و کرب کے جو نشانات تھے
وہ اسے چھپا نہ سکا۔

تب میں نے اس سے پوچھا۔
"آج آپ بے حد پریشان نظر آتے ہیں ——— ؟"
"میں نے آپ کی طویل نظم دیکھی۔ مجھے توقع کے خلاف
بڑی خوشی ہوئی ——— !"
"کوئی بات نہیں ادھر بھی ادارے ہیں ——— !"

باقی صفحہ ۱۰۳

ایم۔ اے۔ حسن رہبر

یٰسین یاس میرے تاثرات

اُس دور میں جب دہلی سے اجڑ کر لکھنؤ میں پناہ گزیں ہوئی۔ اور لکھنؤ کو اردو کی مرکزیت حاصل ہوئی تو اس نے بہار کے ماحول کو بھی متاثر کیا۔ اور آہستہ آہستہ بہار پر اپنا اثر دبستان جمانے لگی۔ اس عہد میں بھاگلپور کے شعراء بھی شعوری تحت سے متاثر ہوئے اور انھوں نے اردو ادب کی پرورش اور پرداخت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن تنگ نظری اور علاقائی تعصب کی بنا پر دہلی اور لکھنؤ والوں نے کبھی انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا اور نہ دوسرے مقامات کی نظروں میں ہی اسے قابل توجہ سمجھا گیا اسی لئے اہل بہار خصوصاً بھاگلپور وہ مقام حاصل نہ کرسکے جس کے یہ مستحق تھے۔ حالاں کہ یہاں بے شمار صاحب علم و فن اور قابل لحاظ شاعر و ادیب پیدا ہوئے لیکن ان کا کوئی تذکرہ ایسا نہیں ملتا جو تاریخی اور ادبی و فنکارانہ حیثیت سے ان کی شخصیت اور طرز تحریر پر روشنی ڈال سکے۔

لیکن ادھر چند برسوں میں بھاگلپور کے ادباء و شعراء نے زندگی کی پر پیچ راہوں کو خود سے ہموار کرتے ہوئے دنیائے ادب و شعر میں اپنی جو حیثیت منوالی ہے اسے کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی ادبی قدر و قیمت زمانے کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ان قلمکاروں میں تحقیقی اور تنقیدی طور پر دیکھا جائے تو یٰسین یاس کی شخصیت کم اہمیت نہیں رکھتی۔ آپ خداداد ذہانت لیکر پیدا ہوئے آپ کے خیالات میں وسعت جذبات میں پاکیزگی اور شعور میں گہرائی ہے۔

موصوف کے ساتھ ناگا اگر یوتھ اردو "ایسوسی ایشن" کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ بے انصافی ہوگی۔ یہاں کے ادبی ماحول کو سازگار بنانے اور سنوارنے میں اس ایسوسی ایشن کا کردار رہا ہے اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ یہ تقریباً ۱۹۶۷ء کی بات ہے جب یوتھ اردو ایسوسی ایشن اپنے پورے شباب پر تھا اور ادبی بزم آرائی بڑی پابندی کے ساتھ ہوا کرتی تھی یہ بھاگلپور شہر کے نوجوانوں کا واحد ادبی ادارہ تھا جو بڑی خوبصورتی اور نہایت خاموشی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں مصروف تھا۔ شمس الزماں اور شاہین غازی پوری اس کے روح رواں تھے۔

جہاں ایسے ڈاکٹر سید احمد حسن قمر النو حید، اور محمود واجد کی سرپرستی حاصل تھی وہیں ایسے یٰسین یاس، حسن مقصود، تسنیم کوثر، اختر بلگرامی، محمد علی زکریا، صمد حمیدی جمال پھلواروی وغیرہم کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا۔

فرنڈ لائبریری کے وسیع ہال میں اس کی ایک ادبی نشست ہو رہی تھی جس میں شاہین غازی پوری شمس الزماں، صمد حمیدی، جمال پھلواروی، حمید بلراج وغیرہ شریک تھے میں بھی اس نشست میں اپنے ایک افسانہ کے ساتھ حاضر ہوا تھا میری کرسی کے سامنے میز کی دوسری طرف سفید قمیض اور پتلون میں ملبوس

خاموشی کے ساتھ ایک صاحب جلوہ افروز تھے ان کے چہرے سے سنجیدگی اور بردباری ظاہر ہو رہی تھی۔

سنولا رنگ، درمیانہ قد، کسرتی بدن، گول چہرے پر لمبی ناک گہری آنکھوں پر سیاہ فریم کی عینک اور چہرے پر چیچک کے ہلکے نشان۔ —— یہ تھے ہمارے ایک نوجوان فنکار لیسین یاس صاحب جن سے میری پہلی ملاقات اسی نشست میں ہوئی۔

نشست کی کارروائی شروع ہوئی اور جب میں اپنا افسانہ پڑھ کر بیٹھ چکا تو تنقید و تبصرہ کی باری آئی۔ میں نے دیکھا کہ لیسین صاحب بڑی آہستگی سے اٹھے اور اپنی جگہ ذرا سنبھل کر انھوں نے پہلے عینک کے زاویے کو درست کیا پھر افسانے پر اپنے مخصوص ڈھنگ میں روشنی ڈالی، تنقیدی پہلو سے اس کا جائزہ لیا اور مفید مشورے دیئے۔

افسانے پر ان کی بے لاگ تنقید نے مجھے بیحد متاثر کیا پھر موصوف سے میرے تعلقات استوار ہوتے گئے یہاں تک کہ ایسوسی ایشن کی تقریباً تمام نشستوں میں ان سے ملاقاتیں رہتیں۔ وہ اس ادارہ کے ایک سرگرم رکن تھے اور اپنے اندر بے لوث ادبی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ موصوف ایسوسی ایشن کے قیام سے لیکر اس کے آخری دنوں تک اس سے گہری دلچسپی لیتے رہے۔ ان کے عزم راسخ نے علم و ادب کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔ آپ نے اپنی ناولٹ بعنوان "سریتا" کی بارہ قسطیں اس کی مختلف نشستوں میں سنائیں اور کبھی اس پہ ہونے والی تنقید و تبصرہ کا برا نہیں مانا اور نہ اپنے حوصلوں کو پست ہونے دیا۔ بلکہ اس کی روشنی میں اپنے فن کو جلا بخشتے رہے۔

یاس صاحب ۱۹۳۸ء میں اپنی نانہال بھاگلپور کے ایک مشہور محلہ مجاہد پور میں پیدا ہوئے آپ کے والد ماجد جناب مقبول حسین صاحب کا شمار محلہ بھیکن پور کے باوقار لوگوں میں ہوتا ہے محلہ کے مکتب سے آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور ۱۹۴۹ء میں شیام سندر رہائی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا۔ لیکن درجۂ دہم کے بعد آپ ضلع اسکول میں چلے آئے اور وہیں سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کے بعد آپ نے مارواڑی کالج سے آئی اے، پھر ٹی، ان، بی، کالج سے بی، اے، اور بھاگلپور یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں ایم، اے کیا، پھر قانون پڑھنے کے خیال سے آپ لا کالج بھاگلپور میں داخل ہوئے لیکن قانون کی نامکمل تعلیم کے بعد ہی آپ بزنس کی طرف راغب ہو گئے۔

شروع ہی سے آپ کا رجحان ادب کی طرف تھا اسکول کے زمانہ سے ہی آپ نے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں، خصوصاً بچوں کا ادب آپ نے زیادہ لکھا۔ اردو میں بچوں کا ادب ابھی تک بے توجہی کا شکار ہے نہ ادبا و شعرا اس کی طرف کوئی خاص توجہ دیتے ہیں اور نہ کوئی اہم اور گرانقدر رسالہ اس موضوع پر شائع ہوتا ہے۔ الا۔ ایک دو کے۔ اس ناقدری اور بے توجہی کے باوجود لیسین یاس صاحب نے بچوں کے ادب کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کو گرانقدر بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کی پہلی کہانی بعنوان "بیوقوفی" ماہنامہ پھلواری، دہلی میں شائع ہوئی جو کہ بچوں کا مخصوص رسالہ تھا۔ اس کے بعد آپ مستقل طور پر اس میں لکھتے رہے۔ آپ نے بچوں کیلئے ایک ناولٹ بھی لکھا جو "مغرور جادوگر" کے نام سے شائع ہو کر کافی مقبول ہوا ان کے علاوہ ابھی کتنی ہی کہانیاں اور ناولٹ ایسے ہیں جو زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکے۔ آپ نے افسانے بھی لکھے ۱۹۶۰ء کے پیام مشرق میں آپ کا پہلا افسانہ "دو آنسو" کے عنوان سے شائع ہوا اس کے بعد "پگڈنڈی" باغ و بہار" شعلہ و شبنم، وغیرہ میں ان کی کہانیاں آتی ہیں۔

شروع میں آپ کو شاعری سے بھی تھوڑی

باقی صفحہ ۴۹۲ پر

تکون

لیسین یاس۔ایم۔اے

اسے ایک بھی حسین مکھڑا دکھائی نہ دیا اور وہ جھنجھلا سا گیا۔ سگریٹ کا بقیہ حصہ سڑک پر پھینکتا ہوا وہ اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ چوک پر خاصی چہل پہل تھی۔ نیا سگریٹ سلگاتے ہی وہ تیزی سے شمال کی جانب بڑھ گیا۔ اب وہ ایک لڑکی کے تعاقب میں تھا۔ اسکی پتلی سی کمر تھی۔ اس کا قد میانہ سا تھا۔ اس کی ادا دلفریب سی تھی اور چال بھی غضب کی تھی۔ وہ دیپ نارائن پتھ پر آگیا تھا۔ سڑک پر کئی اور لڑکیاں رنگین جامہ زیب تن کئے تھیں۔ لیکن جس قدر جامع رکھ رکھاؤ اور سلیقہ مندی اس لڑکی کے تن سے سمٹی ہوئی ساڑی میں تھی وہ "اسمارٹنیس" ان لڑکیوں میں نہیں تھا۔ سنبل کو اس کا انداز بے حد بھا گیا۔ قیاس کے مطابق وہ لڑکی مقامی باشندہ نہ تھی، پر آنکھوں پر عینک لگائے ہوگی۔ لڑکی کو دیکھنے کا سنبل نے عہد کرلیا۔ اسے یقین تھا۔ دیپ نارائن پتھ پر ہی لڑکی کو وہ پالے گا۔ لیکن یہ اسکا وہم تھا۔ اب لڑکی لمبے لمبے ڈگ قدم بھرتی راجندر بابو روڈ پر تیزی سے جارہی تھی۔ وہ پہلے سے بھی تیز قدم بڑھارہی تھی۔ سنبل کو محسوس ہوا لڑکی نے شاید اس کے دل کی چوری پکڑلی تھی۔ اس لئے اب وہ کافی بے زیادہ محتاط ہوکر تعاقب کرنے لگا۔ ٹاور ہاؤس کراس کرتی ہوئی لڑکی نے آدم پور کی ڈھلوان والی سڑک کا رخ کیا۔ شام کا دھندلکا اچھی طرح چھا چکا تھا۔ سنبل کے قدم بھی اب تیز ہوگئے تھے۔ لڑکیوں کے پیچھے دور دور تک چلے جانا، اس کو بھرپور نظر سے دیکھنا سنبل کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ گرچہ سنبل کی بیوی "پشپا" خود کم حسین نہ تھی۔ پچھلے دیوالی کے موقع پر اس کی شادی ہوئی تھی۔ "پشپا" سنبل پر جان چھڑکتی تھی۔ اکثر رات گئے تک گھر لوٹنے پر سنبل کو منع بھی کرتی تھی۔ لیکن سنبل نے پشپا کی بے لوث خدمت کا کبھی خیال نہ کیا تھا۔ اسنے تو پرائی عورتوں کے پیچھے دیر تک راتوں کو پھرنا اپنا شعار بنالیا تھا۔ دوستوں کے سمجھانے پر بھی سنبل کے معمول میں مطلق فرق نہ آیا تھا۔ اور وہ غیر شعوری طور پر کبھی اسٹیشن کبھی پارک تک پہونچ ہی جاتا۔ پھر کسی نہ کسی لڑکی کو نگاہ کا مرکز بناکر شہر کی گلیوں کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ آج نہ جانے کیوں اس لڑکی کو دیکھ کر یکا یک پشپا یاد آگئی۔ اس کے ضمیر نے کافی ملامت کی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے سب کچھ بھول گیا۔ پھر وہ اپنی بیوی کے متعلق سوچنے لگا۔ اور وہ اسی جگہ سے گھر لوٹ جانا جانا چاہا۔ لیکن فوراً ہی اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ لڑکی نے داہنی بازو کی گلی کا رخ کرلیا تھا۔ سنبل گھبرا گیا کیونکہ اس کا عزیز ترین دوست "دیپ" اسی گلی میں رہتا تھا۔ دوستوں میں سب سے عزیز دوست اس کا دیپ ہی تھا۔ اکثر دیپ گھر پر گھنٹوں سنبل کی بے ہودہ حرکت پر لعنت ملامت کرتا رہتا تھا۔ اس وقت ایک انجان سی لڑکی کا تعاقب کرتے دیکھ کر بھلا دیپ چپ کیسے رہ سکتا تھا۔ یہی خیال

کرتے ہی سنیل نے اندھیرے کی آڑ لے کر لڑکی کے تعاقب کو برقرار رکھا۔ لڑکی اپنے مخصوص انداز میں چلتی ہی گئی۔ چند لمحہ بعد وہ دیپ کے دروازہ تک پہونچ گئی۔ سنیل متحیر ہوگیا اسے اچھی طرح علم تھا۔ دیپ کی شادی ابھی نہ ہوئی تھی۔ اور اس کی بہن بھی نہ تھی پھر یہ لڑکی .... یہ لڑکی کون تھی؟

یکایک دروازہ کھلا۔ دیپ مسکرا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی نے اپنی باہیں دیپ کی گردن میں ڈال دیں ـــــ دروازہ بند ہوگیا۔ سنیل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا وہ ایک ٹک دروازہ کی طرف دیکھتا رہا جہاں چند لمحہ قبل لیمپ کی زرد روشنی میں اسنے دیپ کی باہوں میں اپنی پُشپا کو سمٹے ہوئے دیکھا تھا۔

بقیہ یٰسین یاس

بہت دلچسپی رہی اور کچھ دنوں تک شعر کہتے رہے چند نظمیں، بچپن کی شرارت' سویرا' وغیرہ ماہنامہ 'پھول' دہلی میں شائع ہوئیں۔

آپ کو دوسری زبانوں کے ترجمہ سے بھی دلچسپی ہے۔ اور طلبہ کی دقتوں اور مجبوریوں کے پیش نظر آپ نے نصاب کی کچھ کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ان میں جہندر پرشاد جی کی ہندی کتاب' سماج ادھین کی روپ ریکھا' کا اردو ترجمہ بھی شامل ہیں جسے پستک بھنڈار لہریا سرائے نے "مطالعۂ سماج کی تشکیل" کے عنوان سے شائع کیا۔ جو ۱۹۶۰ء سے میٹرک کے نصاب میں شامل ہے یہ آپ کی زندگی کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے آپ نے جس خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ کیا اور وقتاً فوقتاً اس میں ترمیم و اضافے کئے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ پڑھتے ہوئے کبھی ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا جن کے مطالعے سے ان کی صلاحیتوں کا قائل ہونا پڑتا۔

آپ کی نظر میں ادب اور زندگی کا چولی' دامن کا ساتھ ہے' ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے وہ اپنے سماج اور ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اور زندگی کو سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے اسی لئے آپ کو زندگی کا جو تجربہ حاصل ہوا ہے اس کی گہرائی میں اتر کر اپنے اپنے فن کی تخلیق کی ہے۔ ان کے فن میں کہیں جھلاہٹ یا اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ ان کے خیالات نئے ڈھنگ سے سامنے آتے ہیں۔ جس سے ان کے شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے آپ نے روزمرہ کی عام زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس کے سماجی مسائل کو پوری ذہانت اور فنی دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے ڈھالے ہوئے تمام کردار فطری معلوم ہوتے ہیں ان کی طرز تحریر نہایت دلکش اور بیحد شگفتہ ہے ان کے افسانوں میں سادگی اور روانی ہوتی ہے جس سے افسانوں میں اثر انگیزی اور گداز کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے آپ کے پہلو میں ایک حساس دل ہے۔ اور دل میں انسانی ہمدردی کا ایک بے پناہ جذبہ۔ جس سے خلوص کی گرمی ٹپکتی ہے اور لوگ بہت جلد ان کے فن کے شیدائی ہوجاتے ہیں۔

ان کو کھیلوں سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ یہ فٹبال کے اچھے کھلاڑی ہیں ساتھ ہی کیرم بھی خوب کھیل لیتے ہیں ان کو کتب بینی کے ساتھ سینما دیکھنے کا بھی بیحد شوق ہے۔ یہی نہیں آثار قدیمہ سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں تجارت کے سلسلہ میں اکثر ان کو باہر جانا پڑتا ہے یہ جب کسی تاریخی مقام پہنچتے ہیں تو اس کے مطالعہ میں اس طرح منہمک ہوجاتے ہیں جیسے وہ خاص اسی مقصد کے لئے آئے ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر انھوں نے اسی انداز کے ساتھ ادبی اور تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں تو ایک دن یا پتا امتیازی اور انفرادی لب و لہجہ حاصل کریں گے اور اردو ادب کی تاریخ میں اپنے لئے ایک ناقابل فراموش جگہ بنالیں گے۔

حسن جبین شکیل کی کہانیاں

ایک تجزیہ

"معین شاھد"

اردو میں افسانہ نگاری کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں۔

سترھویں صدی میں اردو ادب و زبان کی تاریخ میں ایسی مثنویاں ملتی ہیں جن میں زیادہ فرضی قصہ کہانیاں ہیں ان مثنویوں میں زیادہ تر عشق ومحبت کی ایسی داستانیں ملتی ہیں جو آج فرسودہ اور مہمل داستانوں کی فہرست میں شامل ہو چکی ہیں۔ اور آج کی مصروف زندگی اور مشینی دور میں ان داستانوں کو کوئی نہیں پڑھتا۔ غواصی کی مثنوی طبعی کی بہرام دگل اندام اور دولت کی مثنوی شاہ بہرام و بانوئے حسن قابل ذکر ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں وجدی کی مثنوی خسرو نامہ اور میر حسن کی مثنویاں لکھی گئی ہیں انیسویں صدی میں منشی شمس الدین احمد نے فارسی سے اور منشی عبدالکریم نے انگریزی سے الف لیلیٰ کا ترجمہ کیا۔ اسی صدی میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، کہانیاں لکھی گئیں ان کہانیوں نے دراصل پڑھے لکھے لوگوں کو قصہ کہانی پڑھنے کا چسکا دلایا

انیسویں صدی کے آخر میں اور بیسویں صدی کے ابتدا میں ملک کے حالات نے دراصل اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا اور مختصر کہانی نے وقت کی کوکھ سے جنم لیا۔ ملک میں سیاسی اور قومی تحریکیں بیدار ہو چکی تھیں اور اسی دور میں اردو زبان و ادب کو منشی پریم چند جیسا مختصر افسانہ نگار ملا۔ یوں تو انیسویں صدی کے آخر میں ہی زندگی سے قریب تر طویل ناول اور کہانیاں لکھی جانے لگی تھیں۔ رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" ایک خاص ماحول کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ رتن سرشار کا افسانہ آزاد اس وقت کے لکھنوی تمدن اور انحطاط پذیر تہذیب کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ شرر، نذیر احمد، اور محمد علی نے بھی اپنے ناولوں کی بنیادی حقیقت نگاری پر رکھی اور گویا اسی وقت سے ایسے افسانے اور ناول لکھے جانے کا سلسلہ شروع ہوا جن میں زندگی اور وقت کی پرچھائیاں صاف نظر آنے لگیں۔

منشی پریم چند اردو میں "مختصر افسانہ" کے باوا آدم کہے جاتے ہیں۔ لوگوں کے ذہن میں مثنوی اور قصے فرضی قصے کہانیوں کا جو تصور بیٹھ گیا تھا کہ یہ فرضی داستانیں ہیں اور وقت کو گذارنے کے لئے اور اپنے کو ایک خوشرنگ اور سراب آگیں ماحول میں چند لمحوں کے لئے گم کر دینے کے لئے، یہ کتابیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس تصور کو منشی پریم چند نے ایسے مختصر افسانے لکھ کر زائل کر دیا جن میں اس وقت کے حالات کی صحیح عکاسی ہوتی تھی۔

منشی پریم چند نے خلوص ومحبت، اخوت، بھائی چارگی، وطن پرستی، اور قربانی و ایثار کا جذبہ اپنے افسانوں کے ذریعہ پیدا کیا۔ اور رفتہ رفتہ افسانہ فرسودہ لبادوں کو اتار کر آزاد ہو گیا۔ اور ایسے دور میں پہنچ گیا جہاں انسان کھڑا ہو کر ایک نئی دنیا میں سانس لے رہا ہے۔ نیا افسانہ اب کھیتوں میں کسانوں کی درانتی اور ہنسوے کے ساتھ جنم لے رہا ہے۔ اور نیا افسانہ پگڈنڈی پہ

چلنے والی اس چنچل گوری کی آنکھوں کی چمک میں جھانک رہا ہے جو اپنے نوجوان شوہر کے لئے تھال میں ساگ، اچار، اور ستو لے جا رہی ہے نیا افسانہ آج کے نئے دور کا نقاب اٹھا رہا ہے۔

بیسویں صدی کی اڑسٹھویں سال میں اردو افسانہ اور ناول کافی ترقی کر چکا ہے۔ فن، ہیئت اور اسلوب کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں ـــــ اور ایسی کہانیاں بسا اوقات پڑھنے میں آتی ہیں کہ ذہن چونک جاتا ہے۔ آج کل اچھی اور ناقابل فراموش کہانیوں کی فہرست کافی طویل ہو چکی ہے۔

مرد افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی فن افسانہ نگاری میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اور ابتداءً اچھی کہانیاں عورت افسانہ نگار ہی کی پڑھنے میں آتی ہیں۔ آج کی عورتیں افسانہ نگاری میں مردوں کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔

ڈاکٹر رشید جہاں (مرحومہ) عصمت چغتائی۔ ہاجرہ سرور، خدیجہ مستور، شکیلہ اختر، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسم، آمنہ ابو الحسن، صالحہ عابد حسین، وغیرہم ایسی افسانہ نگار خاتون ہیں جنکی کہانیاں کسی بھی معیاری افسانہ کے مقابلہ میں رکھی جا سکتی ہیں

عورتوں کے لئے افسانہ لکھنا مردوں کے مقابلہ میں آسان سا معلوم ہوتا ہے۔ "عورت اور محبت" کے ارد گرد ہی زیادہ تر افسانے لکھے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر ایک عورت کا قلم زیادہ لکھ سکتا ہے۔ عورت کی نفسیات سے زیادہ ایک عورت ہی واقف ہو سکتی ہے۔ اور محبت جو شاید عورت کے ساتھ ہی جنم ہوئی اس موضوع پر عورت زیادہ کامیابی کے ساتھ لکھ سکتی ہے۔

پھر گھر کے ماحول کی عکاسی، شادی بیاہ، گیت اور ڈھولک اور ابٹن، اور پھر کنواری لڑکیوں کی چھیڑ خوانی۔ ان تمام موضوع پر ایک عورت جو لکھ سکتی ہے میرا خیال ہے ایک مرد نہیں لکھ سکتا۔

اور محبت میں جنسی گھٹن پر جو کہانیاں عصمت چغتائی۔ واجدہ تبسم، جیلانی بانو، اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے لکھی ہیں اس پلہ کی بہت ہی کم مردوں نے لکھی ہیں۔

حسن جبین کی کہانیوں کا ہم تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی کہانیوں میں محبت کی ناکامی، وہ ایک خلش ناتمام جو کنواری لڑکیوں کا سپنا بن گئی ہے۔ شادی بیاہ، لین دین، خلوص و پیار عورت کا انتقامی جذبہ، سب ہی کچھ ملتا ہے۔

انکی کہانی "فرار" میں ذہنی اور داخلی کرب کو اتنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ ہم اسے بخوبی محسوس کر سکتے ہیں "فرار" ایک ایسی کہانی ہے جس میں بیانیہ Narration سے کام لیا گیا ہے۔ اس کہانی میں مصنفہ خود ہی صیغہ متکلم میں بیان کرتی ہے۔ اس میں بولنے والی بھی موجود ہے اور ایک گھر کا اس زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں ایک مرد سے بیک وقت دو لڑکیاں محبت کرتی ہیں۔ چھوٹی لڑکی اپنی بڑی بہن کے مقابلہ میں اپنے اس ذہنی کرب مسلسل کا اظہار نہیں کر پاتی جو شاید برسوں سے وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے رکھتی ہے۔ وہ ایک عجب نفسیاتی گھٹن میں مبتلا ہے۔ یہ پورا افسانہ زندگی کی ناکامیوں پر گویا مسلسل تبصرہ Running Commentory ہے۔

وہ اس ماحول سے فرار چاہتی ہے جہاں بہت جلد اسکی بہن کی شادی جاوید سے ہونے والی ہے۔ افسانہ میں کسی لفظ سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ جاوید کو چاہتی ہے مگر ماحول کا جو تاثر ہے اس سے اس کی دلی کیفیات کا صحیح اندازہ مل جاتا ہے۔ ماحول اور احساسات کی ہم آہنگی ایک عجب تاثر چھوڑتی ہے

اس کے ذہن کے کرب اور اس کے دل کی خلش ناتمام کی واضح تصویر ملاحظہ کیجئے۔ ایک ہفتہ گذر گیا اور میں نے اس ایک ہفتہ تک

اپنے کو کتابوں میں گم رکھا۔ لیکن قسم لے لیجئے جو کچھ پڑھا ہو۔ کم بخت ذہن کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ زنگ آلود ذہن میں جھنجھلا گئی۔

"پھوپھی بی بی۔ اس مہینے میں بڑی پھوپھی کی شادی ہے" پھوا اچھلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔" جاؤ میاں! مجھے پڑھنا ہے۔ میں نے اسے جھڑک دیا۔ یہ بچے مجھے پڑھنے بھی نہیں دیتے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیا ہوا؟ باجی میرے کمرے میں چلی آئیں۔

دیکھو نا باجی! یہ لوگ مجھے پڑھنے بھی نہیں دیتے میرا امتحان سر پر آ گیا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو اس میں رونے کی کون سی بات ہے۔ واہ کیا خوب آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہنس رہی ہیں۔ باجی نے میرا مضحکہ اڑایا۔ اور پھوا کے کان پکڑ کر باہر لے گئیں۔ پھوا بے چاری جو سہم کر کھڑی ہو گئی تھی جب چاپ باہر نکل گئی۔ وہ حیران تھی مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ میں نے کبھی اسے یوں جھڑکا ہو۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا۔ باجی بھی میرا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔ کیا کروں۔ امتحان کی کوئی تیاری نہیں کی ہے۔ اسی لئے مجھ پر ایسی جھلاہٹ ہے۔ غصے نے جھنجھلاہٹ کی شکل اختیار کر لی۔ اور میں نے کتابوں کو پٹخ پٹخ کر ایک طرف کر دیا۔ اور خود بستر پر گر گئی گرم گرم آنسوؤں سے تکیہ بھیگنے لگا" اوں "یہ جھنجھلاہٹ کیسی؟ یہ آنسو کیسے؟ ....

حسن جبیں کی یہ کہانی فطری محبت اور عورت کی نفسیات کی بلندیوں حدود کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کہانی "انکار" میں عورت کے انتقامی جذبے کی ترجمانی کی گئی ہے "انکار" آج کے موجودہ معاشرے کے چہرے پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ اور آج کے گلے سڑے نظام کے لئے ایک چیلنج بھی۔

مرد طرح طرح کی برائیاں کریں۔ ان میں ہزاروں عیب ہوں مگر انہیں کوئی ٹوکنے والا بھی نہیں نئی نویلی دلہن پر یہ مرد یہ الزام لگا دیں تو بے چاری کی زندگی ایک عذاب بن جائے۔ بڑی بوڑھیاں تھو تھو کرنے لگتی ہیں۔ اور چہار طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ ہائے دیا۔ ایسی بات کا ہے کو اپنی زندگی میں دیکھی ہو یا نہیں ہو ـــــــ دنیا کا اندھیر ہو گیا ہے یہاں۔

شادی کی رات رسم ختم ہونے کے بعد دولہا کو دلہن کی آنچل پکڑ کر کمرے میں لایا جاتا ہے۔ اور کمرہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب دولہا کمرے سے نکلتا ہے تو وہ نئی نویلی دلہن پر تہمت لگاتا ہے دلہن آوارہ ہے۔ اور بیک وقت کئی مردوں سے تعلق پیدا کر چکی ہے۔

اور جب لیڈی ڈاکٹر آکر اس کی بے گناہی اور کنوارے پن اور اس کی پاک دامنی کی گواہی دیتی ہے تو اس وقت ایک عورت کا انتقامی جذبہ ابھر آتا ہے اور وہ اس مرد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسکے اس لہجہ میں "کہ اب میں انکے ساتھ نہیں جاؤں گی" بڑا ہی تیکھا پن ہے یہ ایک عورت افسانہ نگار کا ہی حصہ ہے۔ gnamey

حسن جبیں کے فن کی گرفت عورتوں کی گھریلو زندگی، ان کے رہن سہن، شادی بیاہ، اور پورے معاشرے پر بڑی مضبوط ہے۔

اردو کے بعض افسانوں کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ مواد، موضوع ماحول اور کردار کے اعتبار سے جو تاثر عورت کی زبان سے پیدا ہو سکتا ہے وہ مرد کی زبان سے نہیں۔ اس لئے ماحول کردار مواد اور موضوع کے لحاظ سے بھی گھریلو زندگی، شادی بیاہ، اور عورتوں کے روزانہ کے معاملات کا جہاں نقشہ پیش کرتا ہے وہاں ایک عورت کی زبان ہی استعمال کرنی چاہئے۔

حسن جبیں نے جہاں گھریلو موضوع کو لیا ہے وہاں انہوں نے "بھابی جان، منجھلی بہو" یا منجھلی بیگم، پٹھان دایا۔ بوا جیسے کردار کو پیش کیا ہے۔ جس سے ایک خاص اتحاد اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

"بندے" میں انہوں نے بھابی جان، اور منجھلی بیگم کی نفسیات

کا جائزہ لیا ہے کہ میکے سے آنے والی دایہ "پیٹھانی بوا" بھابی کو کسقدر عزیز ہیں، اور چونکہ پیٹھان بوا، بھابی کے میکے سے آئی ہیں۔ اس لئے ان سے منجھلی بیگم نفرت کرنے لگتی ہیں اور انکے دل میں گھر کی دایہ "بوا" اسوقت منظور نظر ہو جاتی ہیں "پیٹھانی بوا" جب بھابی کے میکے سے انکی خیر خبر لینے کے لئے آتی ہیں تو اسکی خاطر تواضع میں بھابی ایسا جٹیں کہ کیا کوئی اپنے ماں جائے کی خاطر کریگا۔ پراٹھے تل تل کے دئے جاتے۔ گرم گرم پکوڑیاں ملتیں اور پیٹھانی بوا مزے کرتیں۔

اس وقت دونوں دایا کی جنگ دیکھنے کے لائق ہے جب بڑی اماں کے کان کے بندے گھر سے غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ "پیٹھانی بوا" پر شک کرتے ہیں اور کچھ بوا پر، اور پیٹھانی بوا کی حمایت بھابی جان کرتی نظر آتی ہیں اور "بوا" کی منجھلی بیگم۔

"پیٹھانی بوا کا نام آیا کہ بھابی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ بھلا انکے میکے والوں پر الزام آئے۔ اور وہ خاموش رہیں۔ اس میں انہیں ساری سازش منجھلی بیگم کی نظر آتی اور انہوں نے دھڑ سے الزام بوا پر رکھ دیا۔ پھر تو دیکھنے کے قابل تھی یہ جنگ۔

غضب خدا کا میں پھوٹی آنکھوں بھی بندے دیکھے ہوں تو میری آنکھیں بیٹھ جائیں۔

بڑی بیگم تو ہر گھڑی سر ڈھانکے رہتی ہیں۔ بھلا یہ ننھے ننھے بندے کیا خاک نظر آئیں گے مجھے۔ جو یہاں رہتے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا۔ پیٹھانی بوا بول رہی تھیں۔

" اپنے ہوش میں رہو پیٹھانی بوا۔ ! یہاں کے رہنے والے چور اچکے نہیں ہیں۔ دنیا جانتی ہے انہیں۔ ساری عمر کٹ گئی اس ڈیوڑھی پر میری۔ خدا گواہ ہے جو کسی چیز کو الٹ کے دیکھا ہو کبھی۔ توبہ توبہ آنگ کر کھالیں سو بہتر۔ ایسی عادت نہیں ہماری۔ بوا نے منجھلی بیگم کی طرف دیکھا جنھوں نے اشارے اشاروں میں تائید کر دی۔

اس کہانی میں حسن جبیں نے ٹھیک وہی عورتوں کی لڑائی اور نوک جھونک والی زبان استعمال کی ہے جس کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس میں شریک تھیں۔ پڑھنے والے بھی اس ماحول میں کھو جاتے ہیں۔ یہ فن کا کمال ہے۔ کہ قاری بھی ٹھیک وہی محسوس کرنے لگے جو لکھتے وقت لکھنے والا یا لکھنے والی محسوس کرتی ہے۔

افسانے کی تکنیک افسانے کے آغاز اور انجام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پرانے افسانوں میں سب سے پہلے افسانے کے اختتام پر غور کیا جاتا تھا اور تب افسانہ لکھنا شروع کیا جاتا تھا یعنی پہلے انجام اور تب آغاز۔ اور اب افسانے کا انجام نہیں سوچا جاتا۔ کیونکہ زندگی کا آغاز تو ہے انجام معلوم نہیں۔ زندگی آئے دن نئے حادثات اور واقعات سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس میں غم بھی ہے۔ خوشی۔ آنسو بھی ہیں قہقہے بھی۔ کہیں سے بھی زندگی زندگی کا افسانہ شروع کیا جاسکتا ہے۔

پرانے افسانوں میں ایک طویل منظر بیان کیا جاتا تھا اور تمہید باندھی جاتی تھی۔ اب افسانہ کے آغاز ہی میں موضوع کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اور جو بات کہنی ہوتی ہے فوراً کہدی جاتی ہے۔ آج کے افسانہ نگار کو اطمنان نہیں فرصت نہیں۔

وہ اپنی بات کہنے کو بے چین رہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو منظر ہمنے دیکھے ہیں وہی منظر اوروں کو بھی دکھلائیں۔ اسے اس بات کی جلدی ہوتی ہے اور اسکا دل مضطرب ہوتا ہے۔

آج افسانے اس طرح شروع ہوتے ہیں کہ ایک دو جملوں کے بعد ہی قاری کی توجہ بڑی حد تک کھنچ جاتی ہے اور موضوع کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً افسانہ "لڑکی بازار"۔ واجدہ تبسم اس طرح آغاز کرتی ہیں۔

حیدرآباد دکن کی ایک جگمگاتی صبح تھی۔ آفتاب ابھی پلکہ جھلکا تھا۔ کچھ چھپا تھا۔ اسی دم باغ شاہی سے ایک ڈھنڈورچی سفید کھڑک پاجامہ، سفید ململ کا کرتہ پہنے۔ ترچھی ٹوپی لگائے سلیم شا

جوتیاں پہنے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلا۔
سب لڑکیوں والی ماؤں سے استدعا ہے کہ کل بروز جمعہ بعد نماز عصر،
حسب سال سابق، اپنی اپنی بیٹیوں کو بہ حد امکان خصوصی لباس اور
پرتکلف آرائش و زیبائش کے ساتھ باغ شاہی میں منعقد ہونے والے
مینا بازار میں لے کر موجود ہو جائیں۔ باغ شاہی میں داخلے کی کوئی
رقم نہیں ہے۔ پکھیاں، شکوتی، ہاتھ رکشا، جو جو بھی بیٹیوں کو لائیں گے
کرایہ باغ شاہی سے ہی وصول پائیں گے اس طرح ماؤں کو یہ اطلاع دی
جاتی ہے کہ کل کی شاہی سیر انہیں بالکل مفت پڑے گی ———

اب اس افسانہ کا آغاز ہی دراصل اس کا انجام ہے۔
اور اس افسانے کا دوسرا جملہ ہی قاری کے ذہن میں انجام کا ایک
خاکہ پیش کر دیتا ہے
،،جدھر جدھر سے ڈھنڈورچی ڈھنڈورا پیٹتا ہوا گذرا ماؤں کے کلیجے
دہلنے لگے،،

تو اب افسانے کی تکنیک بڑی حد تک بدل گئی ہے۔
افسانہ کا قدیم نظریہ یہ ہے کہ اس کے آخر میں کچھ ہونا چاہئے۔
کلائمکس کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ افسانہ کے آخر میں اچانک
کوئی غیر متوقع حادثہ کوئی انہونی سی بات،،
حسن جبیں نے اپنی کہانی ،،دل،، میں اسی نظریہ کی تقلید کی ہے۔
پروین کی شادی کا رشتہ ارشد سے لگ چکا ہے وہ دونوں ایک
ہی گھر میں رہتے ہیں اور بہت ہی زیادہ قریب ہیں۔ اس گھر میں
ارشد کا ایک بھائی انور بھی ہے۔ جسے شادی سے نفرت ہے وہ
شادی کے نام سے چڑھتا ہے۔ اچانک ارشد کی طبیعت خراب
ہوتی ہے اور اسے دل کا عارضہ ہو جاتا ہے۔ انور کا ایکسیڈنٹ
ہو جاتا ہے ڈاکٹروں کا مشورہ ہوتا ہے کہ ارشد کا دل کے عوض انور کا
دل لگا دیا جائے تو ارشد کی زندگی بچ سکتی ہے۔ لہٰذا ارشد کا دل
نکال کر اسکے عوض انور کا دل لگا دیا جاتا ہے۔ اور جب انور کا دل
لگ جاتا ہے تو پھر وہ دل پروین سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے
اور پروین کی آرزوں اور امنگوں پر پانی پھر جاتا ہے۔
حسن جبیں شکیل بھاگلپوری میں ایک اچھے افسانہ نگار بننے کی ساری
صلاحیتیں موجود ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ افسانہ لکھنے کے لئے جو سب سے بڑی
چیز ہے وہ اپنا ایک مزاج اور ماحول ہے۔ جسے ہم افسانوی مزاج اور
ماحول کہہ سکتے ہیں۔ اسی افسانوی مزاج اور ماحول ہی کی وجہ کر کوئی
اچھی کہانی تخلیق ہوتی ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی تعریف یہ کی
جا سکتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو افسانوی زاویہ نظر سے دیکھنے کا
عادی ہو جاتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے موٹے حادثات، واقعات
کی کڑیوں کو جوڑ کر وہ ایک افسانہ تخلیق کرتا ہے۔
حسن جبیں شکیل کا اگر افسانوی مزاج بن گیا اور
انہیں ایک مناسب ماحول اور فضا میسر آگئی
جب وہ اپنے خیالات اور احساسات کے
تانے بانے جوڑ سکیں تو وہ اردو ادب کو اچھی کہانیاں
دے سکتی ہیں۔

مولانا شمس الضحیٰ میری نظر میں

ایم۔ اے حسن رہبر

مولانا عظیم بخش مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے جید عالم فاضل اور مقرر تھے آپ کے مزاج میں بڑی نرمی اور ملائمیت تھی۔ آپ نہایت پاکباز اور صوفی تھے۔ آپ کا انداز بیان اتنا دلکش اور روح پرور تھا کہ بہت جلد لوگ آپ کے مداح بن جاتے تھے۔ آپ مخلص اور نڈر تھے۔ حق بات کہتے ہوئے کبھی گریز نہیں کرتے۔ آپ کے ماتھے پر چمکتی ہوئی ایمان کی جو روشنی تھی بہتوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔

مولانا شمس الضحیٰ صاحب کے اندر بھی اپنے والد کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ کا آبائی وطن بھاگلپور شہر کا ایک چھوٹا سا محلہ شکر اللہ چک ہے پچھڑا ہوا علاقہ ہونے کے باوجود بھی یہاں کے لوگ بڑے مہذب اور اخلاق مند ہیں اور اپنی مشکلات پر قابو پانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

آپ کی عمر اس وقت پچپن سال کے قریب ہے آپ کی تعلیم و تربیت والدین کی سرپرستی میں ہوئی اسی لئے آپ کی زندگی پر والدین کی تربیت کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔

آپ اردو فارسی اور عربی کے ماہر ہیں آپ نے دینی درسگاہ مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ موصوف کے اساتذوں میں نامی گرامی صاحب علم و فن اصحاب تھے۔ مثلاً حضرت مولانا حاجی فرخند علی صاحب بانی مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام، نیز حضرت مولانا محمد صدیق صاحب اور حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب مدظلہ العالی۔

آپ کا شمار شہر کے مشہور و معروف ممتاز مقررو‌ں میں ہوتا ہے۔ آپ اردو کے دلدادہ بھی ہیں اور اردو کے شاعر بھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری ہر شاعر کے اپنے جذبات و خیالات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ آپ کے کلام میں آپ کے فطری رجحان، عالمانہ ڈھنگ اور انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے کلام میں گل و بلبل کی حکایت عشق و محبت کے افسانے اور فرضی داستانیں ملتے بلکہ آپ کے اشعار میں جو صوفیانہ انداز ہے وہ پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ زبان کی فصاحت معنی کی بلاغت اور شاعرانہ خوبی ہی آپ کے کلام کی جان سمجھی جاتی ہے

لیکن ان چند سطروں میں نہ تو مجھے ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا ہے اور نہ ان کی فنی خوبیوں کو دہرانا ہے بلکہ میں

ہ انہیں جیسا دیکھا ہے ان کی شخصیت کا ویسا ہی ہلکا ایک عکس پیش کرنا ہے۔ اسی لئے سوچتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں ایسی عظیم شخصیت کے متعلق صرف چند باتیں کہہ کر میں اپنی ذمہ داریوں سے نہیں بچ سکتا جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی درس و تدریس، تبلیغ دین اور اردو ادب کی خدمت رہی ہو۔ طالب علمی کی زمانے ہی میں آپ کا جھکاؤ شعر و ادب کی طرف ہو گیا تھا اور آپ شعر کہنے لگے تھے اور شمس تخلص کرتے تھے۔

یہ بات دوسری ہے کہ وقت نے آپکو مہلت ہی نہ دی کہ آپ جم کر شاعری کرتے۔ آپ کی بہت کم چیزیں عام نگاہوں تک آسکیں۔ آپ نے کبھی اردو شاعری کو اپنی شہرت کا ذریعہ نہیں سمجھا۔ آپ نام و نمود اور شہرت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے بلکہ گوشہ گمنامی میں پڑا رہنے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کی تشہیر کی طرف راغب نہیں ہوئے۔ حالانکہ آپ کا کلام اردو ادب میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ حمد و ثنا باری تعالیٰ اور نعت رسول کا ایک عظیم ذخیرہ آپ کے قلم کا مرہون منت ہے۔

آپکو بھاگلپور کی کئی ادبی انجمنوں کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے۔ بے انتہا مصروفیت کے باوجود آپ اپنے ذوق کی آسودگی کے لئے ادبی محفلوں میں بھی شریک ہوتے ہیں جہاں آپ ایک اچھے شاعر اور مقرر رہتے وہیں آپ کو فن طب پر بھی مہارت حاصل ہے اور لوگوں میں بے حد مقبول ہیں۔ مطب میں صبح و شام مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے اور ایک طبیب کی حیثیت سے آپ کامیاب و معروف زندگی گذار رہے ہیں۔ اس عمر میں بھی آپکو مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔

آپ بے حد پرخلوص، مہمان نواز اور نیک سیرت انسان ہیں۔ آپ اپنے معترضین کی تنقیص سے گھبراتے نہیں بلکہ بڑی خندہ پیشانی اور ضبط و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کرتے ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ قومی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کو اپنے مخالفوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اختلاف یا تو مخالف کے بیمار ذہن کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے یا ان کے انداز فکر میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن اس اختلاف میں جس کے اندر تخریب کا پہلو نہیں ہوتا وہ اختلاف تعمیری ہے لیکن جس اختلاف کے اندر خود غرضی اور نفس پرستی ہوتی ہے وہ اختلاف انسان کو برائی کی جانب لے جاتی ہے۔

آپ تعصب اور تنگ نظری سے بہت دور ہیں گورا رنگ چھریرا بدن خوبصورت چمکدار آنکھیں چہرے پر خوشنما داڑھی، سجے سجائے دراز گیسو، گول ڈنڈی کے فریم کی عینک علی گڈھ پاجامہ گھٹنوں تک لمبا کرتا پہنتے ہیں۔ گیروے رنگ کی باسکٹ، اور دوپلی ٹوپی استعمال کرتے ہیں آپ کی سنجیدگی، متانت، اور مدارات سے سب آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ پرانی تہذیب اور روشنی کے زندہ پیکر ہیں۔

~~~~~~
~~~~~~

تذکرۂ شمس

قسیم الحق گیاوی

انسان کے اندر اتنی مختلف النوع صفات اکثر جمع ہو جاتی ہیں کہ ہر پہلو اپنے اندر نئی کشش اور نئی جاذبیت رکھنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی اجتماع ضدین کا مظہر بھی بن جاتا ہے۔ خدا نے انسان کو عجیب عجیب غریب قوتوں کا مالک بنایا ہے۔ خصوصاً اس کا ادراک اس کا نطق یہ دو چیزیں خاص طور پر انسان کو دوسری مخلوقات سے ممیز کر کے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشتی ہیں

شاعری ایک عجیب سی چیز ہے۔ ایک علمی و ادبی مشغلہ، یا پھر ذہنی عیاشی، یا سستی شہرت کا ذریعہ۔ احساس کمتری دور کرنے کا نسخہ، یا افیون کی طرح تکبر و غرور کا ایک ایسا نشہ جس کے بارے میں کہنا پڑے ؎

چھٹتا نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگا ہوا

بڑے بڑے اہل علم تجار صنعت کار سے لے کر کمترین اور جاہل ترین شخص بھی شاعری کر سکتا ہے اور شاعری میں اس کا رتبہ اس کے علم اور اس کی دولت کا محتاج نہیں ہوتا۔ شاعر فطرتاً آزاد واقع ہوا ہے اور جب اس آزادی میں مذہب مخل ہوتا ہے کچھ قدرتی پابندیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے، تو اکثر و بیشتر شاعر وقتی طور پر ہی سہی تمام پابندیوں سے آزاد رہنے کے جذبہ سے سرشار ہو کر دین اور اہل دین کا مذاق اڑانے اور ان کو نشانۂ طنز و تعریض بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری جو ایسے دور میں اپنے شباب پر پہنچی جب اہل دین علماء اور ناصحین کا اقبال بھی پورے طور پر زوال پذیر نہیں ہوا تھا تو قدرتی طور پر اس میں شیخ، واعظ، ناصح کے لئے طنزیہ اشعار کا انبار لگ گیا اور پھر یہ مضامین بھی خاص طور پر صنف غزل کے لئے روایتاً ایک مستقل موضوع بن گئے ــــــ

لطف اس وقت آتا ہے جب حضرت واعظ خود نشۂ شاعری سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ شاعر ظاہری و باطنی طور پر کبھی یکساں شعور فکر نہیں رکھ سکتے مگر یہ دونوں متضاد صفات جب ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو سوائے اس کے کوئی شکل نظر نہیں آتی کہ حضرت واعظ منظوم وعظ کہنے لگیں، یا پھر حمد و نعت کے متبرک سلسلہ سے منسلک ہو جائیں اور واقعتاً یہی راستہ ہے جس کے ذریعہ ایک انسان دو متضاد صفات

کا مجموعہ بنارہ سکتا ہے۔

حضرت مولانا شمس الضحیٰ صاحب شمس نہایت ہی متقی پرہیزگار بزرگ ہیں۔ دعا و تعویذ کے فن میں اپنے حلقہ میں یکتائے روزگار شمار کئے جاتے ہیں۔ سن رسیدہ و تجربہ کار، خلیق و ملنسار اور مشرب صلح کل کے دلدادہ ہیں ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ نعت و غزل دونوں سے شغف رکھتے ہیں اور ان کی نعت میں غزل کا لطف ہے تو غزل میں بھی نعتیہ مضامین کی شیرینی ہے۔

ایک دیندار عالم اور شاعر کے لئے جو آسان راستہ ہے آپ اس کے نہایت ہی کامیاب جادہ پیما ہیں۔ انداز بیان، صاف سادہ، شیریں ہے روانی و برجستگی کلام کا خاص وصف ہے اور یہی اوصاف ہیں ان کی شاعری کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

حضرت شمس کی شاعری یقیناً بھاگلپور کے علمی و ادبی ماحول میں اپنی نمایاں خصوصیت کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی شخصیت اور آپ کی شاعری ہر خاص و عام کے لئے قابلِ احترام ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ــــ

تابانیٔ جمال رسالت نظر میں ہے
جس سمت دیکھتا ہوں سحر ہی سحر ہے آج
دامن نبی کا تھام لو بس بیڑا پار ہے
پرواہ نہیں زمانہ مخالف اگر ہے آج

ــــــــــــ

ساری اشیا ہیں ترے حکم کے تابع مسلم
شرط اول ہے مگر صاحبِ ایماں ہونا

آرزو کب مری بر آئے گی میرے آقا
کب میسر مجھے ہوگا ترا مہماں ہونا

ــــــــــــ

اگر قسمت سے ہاتھ آجائے کملی والے کا دامن
تو خلقت بھی ہماری ہے وہ خالق بھی ہمارا ہے
ہمیشہ شمس نے غفلت میں اپنی زندگی کاٹی
بروز حشر آقا آپ ہی کا اب سہارا ہے

ــــــــــــ

بشر سے تو ممکن نہیں مدح ان کی
ثنا جس کی خود ہی خدا کر رہا ہے
نکل جائے دم ان کے قدموں پہ میرا
یہی التجا شمس کی اے خدا ہے

ــــــــــــ

زخم دل پھول بنے ہیں غم فرقت میں ہنوز
دیکھئے آکے ذرا اس کا گلستاں ہونا

ــــــــــــ

ہاں پھر بکھیر دیجئے تبسم کی روشنی
تاریک زندگی کی ہر اک رہگذر ہے آج

محمد اسحٰق حیات

شخصیت اور فن

از:۔ حکیم عبدالباقی

نام ...... محمد اسحٰق

تخلص .... حیات

ولدیت ..... جناب شیخ عبدالرزاق صاحب

تاریخ پیدائش ...... یکم جنوری ۱۹۳۹ء

تعلیم ...... میٹریکولیٹ

گھر کا پتہ ...... مقام وڈاکخانہ کھٹنی۔ ضلع دمکا۔

اسحٰق حیات صاحب افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی ۔ میکدہ میں گاہے گاہے ان کی حاضری ہو جاتی ہے اور پورنی جب آتے ہیں تو ناچیز کے غریب خانہ پر موصوف کا قیام رہتا ہے زمانہ طالب علمی سے مطالعہ کا اور لکھنے کا ذوق ہے۔ ہم جماعتوں کو یہ اپنے افسانے لکھ لکھ کر سنایا کرتے تھے۔ آج بھی شعر کہنے اور افسانہ لکھنے کا ذوق جنوں کی حد سے بھی دو چار ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے۔ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ سوچتے اور لکھتے ہی رہتے ہیں۔ افسانہ نویسی کا ذوق اس قدر ابھرا کہ آستانہ آسی رام نگری تک اسحٰق حیات جبیں سائی کے لئے پہونچے۔ ۱۹۶۱ء سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور چھپ رہے ہیں یہ رخش ادب پر یوں سوار ہیں کہ پاؤں رکاب میں ہے اور نہ ہاتھ باگ پر۔ انجام کیا ہوگا کس منزل پر جاکر کاروانِ حیات رکے گا اس کا پتہ انہیں خود نہیں ہے۔

غم واندوہ، درد و کرب سے مغلوب ہو کر یہ گنگناتے گنگناتے شاعری تک پہونچے۔ بچپن ہی سے لحن داؤدی سے مسحور ہو جانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ اور خود بھی ایسا گاتے تھے کہ کئی مرتبہ اسکول میں اساتذہ نے انہیں انعام بھی دیا۔ انکی فطرت میں قید و بند کی زندگی کا کوئی دخل نہیں۔ اپنے والدین کے یہ اکلوتے ہیں۔ لاڈ اور پیار ناز و نعم سے ان کی پرورش ہوئی ہے اس لئے آزاد خیالی اور آزاد روی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے بخل نے ان کو چھو تک نہیں پایا ہے۔ ان کی شاہ خرچی کو اگر حاتم طائی دیکھ لیتا تو پانی پانی ہو جاتا۔ ہاں تو بات شاعری کی کر رہا تھا اس صنف ادب کا آغاز بھی اسحٰق حیات نے ۱۹۶۱ء سے شروع کیا۔ ان کی تخلیقات ملک کے مختلف پرچوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً "دین دنیا، دہلی۔" "پرواز، لدھیانہ" "سہیل" گیا۔ "مست،" پٹنہ۔ اور "حسن و صحت"، کلکتہ وغیرہ۔ ایک سرکاری اسکول میں مدرس ہیں۔ وقت ملتا ہے تو تبلیغ کا کچھ کام کر لیتے ہیں۔ دینداری ان کی فطرت میں داخل ہے، صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مذہب نہیں تو زندگی نہیں۔

اسحٰق حیات نے بے شمار افسانے لکھے ہیں۔ جن میں "شعلہ و شبنم" "زندگی کی بازی" "اپنی دنیا آپ پیدا کر" "ناکام سازش" "کاغذی رشتہ" "کچھ اپنی کچھ پرائی" "اندھی محبت" اور "مسٹر" آپ کے نہایت کامیاب افسانے ہیں آپ بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھتے ہیں جس کا بہترین نمونہ "اندھی محبت" اور "مسٹر" جیسی کہانیاں ہیں۔

افسانہ کا جہاں تک تعلق ہے اسحٰق حیات کی زبان و بیان کا انداز نہایت سادہ شستہ اور پاکیزہ ہے اور یہی صفت اچھے افسانہ کے لئے ضروری ہے۔ اسحٰق حیات افسانے کا آغاز ارتقا، عروج، اور اختتام ہر مرحلہ پر چابک دستی دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پلاٹ اور خیالات میں اسحٰق حیات کی فکری افتادِ طبع، یعنی سادگی و پرکاری کی جھلک ملتی ہے

شاعری کا جہاں تک تعلق ہے! اسحٰق حیات نظمیں زیادہ اور غزلیں بہت کم کہتے ہیں۔ ان کی نمائندہ نظمیں مسلم سے خطاب، وقت انقلاب ہے۔ بڑھے چلو بڑھے چلو، ملک کے نوجوانوں سے خطاب مسلم اور قومی یک جہتی، ایک نخل، وغیرہ ہیں۔ غزل کے چند اشعار نمونتاً دئے جاتے ہیں جن سے اسحٰق حیات کے فکر و فن پر روشنی پڑیگی۔

لہو کی جس کے رنگینی بہاراں بن کے نکھری ہے
عدو نے جان و دل اس کا چمن میں باغباں تک ہے

یہ مانا کہ دلکش ہے حسن کلام
مگر لطف ان کے اشاروں میں ہے

چمن کی نہیں خیر ہے باغباں
عجب برق کی رو شراروں میں ہے

مری تشنہ کامی کا واحد علاج
حیات حزیں اب سرابوں میں ہے

کہوں کیسے شب بھر بسر ہو گئی   وہ آئے تو دیکھا سحر ہو گئی

محدود زندگی کا تصور نہیں ہے عشق
اس بحر کا کنارہ ملا بھی کسی کو ہے

گل الفت کے جو اوراق نظر آتے ہیں
درس عبرت کے یہ اسباق نظر آتے ہیں
آج اسرار محبت جو ہوئے ہیں سب فاش
کیسے دیوانے سے عشاق نظر آتے ہیں
تو نے جن لوگوں پہ کل ظلم و ستم توڑا تھا
دیکھ وہ آج بھی مشتاق نظر آتے ہیں

جفاؤں کا گلہ کرنے سے بہتر ہے کہ ہم سیکھیں
وفا کی راہ پر چلنے کو کیا کیا کام کرنا ہے

زمانے کا زمانہ آج ہے بدلا ہوا لیکن
حیات حق شناس و حق نوا ہرگز نہیں بدلے

ایم اے باری رضا
کا فن اور ان کی شخصیت

حکیم محمد عبدالباقی حکیم

دنیا میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ید قدرت نے خاص توجہ سے انہیں بنایا ہے۔ پھر جس کے نام میں لفظ "باری" شامل ہو اس کی توصیف کوئی انسان کیا کر سکتا ہے۔ لیکن ایم اے باری رضا سچ مچ تعریف کے قابل ہیں۔ یہ شاعر ہیں اور خود شاعری کرتے ہیں۔ سچا شاعر وہ ہے جو اپنے کلام پر خود جھومے اور اس صداقت کو مجسم دیکھنا ہو تو باری رضا صاحب سے ملئے جن کا وزن سوا من، لمبائی سوا پانچ فٹ اور رنگ سانولا ہے۔ آپ طالب علم ہیں۔ کاروبار بھی کرتے ہیں ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں، سماجی خدمات میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں مضمون نگاری، شاعری ہر میدان میں آپ باری رضا کو پائیں گے۔ انہوں نے عبدالمجید اردو لائبریری اور شبینہ مدرسہ قائم کر رکھا ہے۔

باری رضا نوجوان ہیں۔ ظاہر ہے نوجوان کا فن نوجوان ہوگا اور نوجوان کی لغزشیں جہاں قدم قدم پر زندگی کی شاہراہ میں ہوں گی وہیں ادب و شعر میں بھی ان کی جلوہ گری نظر آئے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ سمجھا جائے پھر وہ انسان کیا ہے جس میں انسانیت کے تمام اوصاف موجود نہ ہوں۔ اس لحاظ سے باری رضا کی شخصیت اور ان کا فن قابل رشک ہے۔ آپ نے افسانے ڈرامے مقالے غزلیں نظمیں یعنی ہر صنف سخن میں خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کی نظمیں "ذرا جاگ" اردو کی فریاد سن، نوید عالم وقت کی آواز، بڑی کامیاب ہیں۔ اسی طرح افسانوں میں مجھے الزام نہ دینا ایک کامیاب کوشش ہے۔ آپ کا مقالہ بعنوان "دانشوروں کی نظر میں" قابل ستائش ہے اور اس بات کا غماز کہ مستقبل قریب میں باری رضا صاحب دنیائے ادب میں اپنا سکہ جما کر رہیں گے۔ آپ کا ایک ڈرامہ "ماہنامہ بچوں کا چمن" ڈھاکہ میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے

علم کی تشنگی کبھی دور نہیں ہوتی۔ یہ شراب ایسی ہے کہ جتنی پیجئے پیاس بڑھتی ہی جائے گی۔ باری رضا صاحب مطالعہ خوب کرتے ہیں میرا مشورہ ہے کہ خوب کے ساتھ سنجیدگی کا جوہر بھی موصوف پیدا کرنے کی سعی کریں۔ ان کے وجود میں شعر و ادب کی جو چنگاریاں دبی ہوئی ہیں وہ انشاءاللہ شعلہ بن کر آتش گل کی بہار کو دوبالا کر دینگی۔ ان کی نظم اور نثر دونوں ہی نے مجھے متاثر کیا اور میں امید کرتا ہوں کہ ان کے فن کو پرکھنے والا ہر پرخلوص انسان داد دئے بغیر نہیں رہے گا۔

....

ادب نواز شخصیتیں

شاغل قادری

الحاج سید شاہ امین العالم صاحب

ولدیت .... حضرت مولانا سید شاہ عالم شہبازی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش ... . ۱۴ / جون ۱۹۱۴ء

وطن ..... محلہ مولانا چک ــ بھاگل پور

حضرت الحاج خیرالدین رحمۃ اللہ علیہ اپنے صاحبزادہ شاہ عبدالخطاب مرحوم کے ہمراہ بخارا سے ہندوستان تشریف لے آئے اور گیا ضلع کے قصبہ اساس دیوڑ میں قیام پذیر ہوئے۔ شاہ خطاب مرحوم کو اللہ تعالےٰ ایک اولاد نرینہ عطا کیا جن کا نام نامی شہباز پڑا جو اپنے وقت کے قطب الاقطاب اور صاحب ولایت بزرگ نیز متبحر عالم دین تھے، آپ کا ذکر خیر ہندوستان کے اولیاء اللہ کے تذکروں میں ہر جگہ ملتا ہے۔ ولایت ملنے کے بعد بھاگلپور آپ کی تشریف آوری ہوئی آپ کے پہلے حضرت شاہ مخدوم نیڈوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھاگل پور کی ولایت ملی تھی مگر پیرن شاہ بندگی رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ قدیم تھا اس لئے آپ کو نیڈوا تشریف جانے کا حکم ہوا اور بعد میں حضرت شہباز رحمۃ اللہ علیہ کو بھاگل پور کی ولایت عطا کی گئی۔ آج بھی مولانا شہبازؒ کا آستانۂ مبارک مرجع خاص وعام ہے۔ الحاج سید شاہ امین العالم صاحب مدظلہ کا تعلق حضرت شہبازؒ کے خاندان سے ہے۔ اور آپ آٹھویں پشت میں ہیں آپ کے بیان کے مطابق سجادہ نشینی کے جائز مستحق آپ ہی تھے لیکن آپ نے رضاکارانہ طور پر فتنہ کے سدباب کے پیش نظر ۱۹۴۲ء میں دست برداری کا اعلان کردیا۔

تعلیم وتدریس کا مشغلہ اور کتب بینی کا ذوق آپ کی زندگی کا سہارا ہے۔ نجی لائبریری گرانقدر عربی، فارسی، اردو کی کتابوں کے خزانے سے معمور ہے جن کی تعداد تین سو جلدوں سے بھی کچھ زیادہ ہوگی۔ بیشتر قلمی نسخے بھی ہیں جن کی قدر وقیمت کا اندازہ کوئی صاحب علم ہی کرسکتا ہے۔

امین عالم صاحب کا سراپا اپنے اندر ایک ایسی کشش رکھتا ہے جس کو اگر لفظوں میں بیان کیا جائے تو مقناطیسی کہا جاسکتا ہے۔ چہرہ بشرہ، انداز گفتار اور رکھ رکھاؤ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ میں اپنے خاندان کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں، آپ کے معتقدین کی خاصی تعداد ہے جو آپ سے جس قدر نزدیک ہے اسی قدر آپ کا معتقد ہے۔ یہ خلاف معمول کیفیت کسی بزرگ میں ہی پائی جاسکتی ہے۔

سید ابصار الحق

ولدیت .... سید محمد یوسف

تاریخ پیدائش......... ۴ / جولائی ۱۹۲۴ء

وطن .... محلہ بربورہ ــ بھاگل پور

سید ابصار الحق نہایت ذہین اور انتھک سماجی کارکن اپنے محلہ بربورہ میں خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ بزم ادب بربورہ کے سکریٹری ہیں اور میونسپل بورڈ کے وارڈ کمشنر اور بھاگل پور

فٹ بال اینڈ ایتھلیٹک ایسوسی ایشن کے اور ونڈ سکریٹری ہیں۔

سید ابوالحق صاحب نے ان معاملات میں بڑے جوش و ولولہ سے کام لیا ہے اور نہایت خلوص کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی یہ زبان و ادب کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ خدا کرے برہ پورہ میں اردو ہائی اسکول کا قیام الجبار صاحب کے جدوجہد سے ہو جائے۔

محمد احسان الحق

ولدیت .... جناب نذیر احمد مرحوم

عمر . . . . اسّی سال

وطن . . . . . . محلہ نرغہ۔ ڈاکخانہ چمپانگر۔ بھاگل پور

الحاج محمد احسان الحق صاحب کے دولت کدہ پر پہنچئے البتہ یہ چاہیئے کہ سلام کرنے میں آپ پہل کریں یہ بات ناممکن ہے آپ پہنچے ہیں کہ حاجی صاحب موصوف فوراً سلام کے لئے ہاتھ اُٹھا دیں گے۔ آپ خدا ترس انسان ہیں۔ شہرت سے نفور ہیں۔ آپ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ کسی طور پر اور کسی عنوان سے کوئی آپ کا تذکرہ کسی کتاب یا رسالہ میں لکھے۔ آپ کے اللہ کے فضل و کرم سے پانچ فرزند ہیں جناب عبدالقادر، صادر الحق، عبدالرزاق، عبدالجبار، اور عبدالستار۔

موصوف دینی اور ملّی اداروں کی دامے، درمے برابر خدمت کرتے رہتے ہیں۔

اقبال حسین

ولدیت .... مولوی شہباز حسین مرحوم

تاریخ پیدائش ...... سنہ ۱۹۱۲ء

وطن .... محلہ پاربتی ـ بھاگل پور

قدیم بزم سخن کے خصوصی سرپرستوں کی فہرست اگرچہ بہت طویل ہے لیکن جو نام سرفہرست ملیں گے وہ ہیں سید مقبول احمد سابق وزیر ریاست بہار، بشارت حسین صاحب ایڈوکیٹ اور اقبال حسین مختار صاحب۔ اس تثلیث نے جو تقویت قدیم بزم سخن کو سنہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک عطا کی تھی اس کا اقتضا ہے کہ ان میں سے ہر شخص کو بہ نظر استحسان دیکھا جائے، قدیم بزم سخن جیسے علمی اور ادبی ادرہ کی سرپرستی بذات خود ایک اعزاز ہے نیز سرپرستوں کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کا ثبوت بھی۔

قانونی گتھیوں کو سلجھانے اور الجھانے والے قبیلہ کے افراد شعر و سخن سے عام طور پر دلچسپی نہیں رکھتے۔ ستم تو یہ ہے کہ ذہین اور زکی طبیعتیں بھی گورکھ دھندے میں پھنس کر کند ہو جاتی ہیں۔ اقبال حسین صاحب قابل داد ہیں کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوصف کم از کم اتنا وقت تو ضرور نکال لیتے ہیں کہ وہ شہر کی ادبی تحریک کی گاہے گاہے سرپرستی کر سکیں۔

جناب مولوی سیّد ابوالبقا محمد صاحب

ولدیت . . . . مولوی سیّد احمد حسین صاحب مرحوم

تاریخ پیدائش .... ۲۰ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۰۳ھ

وطن. محلہ قاضی دائرہ ڈاکخانہ و مقام پورینی ضلع بھاگلپور (بہار)

پورینی میں ایک ایسا گھرانہ جسکی نشست و برخاست کا انداز ملنے ملانے کا طرز، زندگی گذارنے کا طریقہ سب کے سب دینی سانچے میں ڈھلا ہوا ہو، اگر کہیں ملے گا تو وہ جناب بقا صاحب کے گھر کا ہوگا، عنفوان شباب ہی سے بقا صاحب نے دینی، ادبی اور سماجی خدمتوں سے دلچسپیاں لینا شروع کر دی تھیں، وہ تحریک مدرسہ انجمن غرباء ہو یا قیام مدرسہ نعمانیہ سب میں آپ پیش پیش رہے ہیں، خلافت تحریک جب عروج پر آئی تو بےخطر اس آگ میں آپ بھی کود پڑے اور اپنے ایثار کا زندہ ثبوت پیش کیا

سنہ ۱۹۴۶ء کے فساد میں آپ کے صاحبزادہ مولوی

سید نجم الحسن مرحوم بھاگلپور میں شہید ہو گئے۔ پورا علاقہ تلملا اٹھا مگر سید ابو البقا محمد کی زبان پر کلمۂ شکر اور ذکر اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ بے تابانہ گھر سے نکلے پورینی بازار تک تشریف لائے اور لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا، لوگو! میرا بچہ شہید ہوا ہے یقیناً شہید کرنے والے ظالم ہیں۔ مگر یہاں کے رہنے والے لوگ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بلا قصور ہیں ان پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ موصوف کی اس تاریخی تقریر کو پورینی کا ہر ہندو باشندہ جو اقلیت میں ہے ہمیشہ دہراتا ہے۔

محمد بشیر احمد ـ وحید احمد

ولدیت........ غلام عبد القادر صاحب

تاریخ پیدائش........ ۱۴ جنوری ۱۹۲۶ء

وطن...... محلہ سرائے ـ بھاگلپور

جناب محمد بشیر احمد صاحب کے جد امجد جناب غلام رسول صاحب مرحوم سری نگر سے بھاگلپور کاروبار کے سلسلہ میں تشریف لائے اور یہیں کے ہو رہے، مرحوم جواہرات اور شال دوشالہ کا کاروبار کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ریلوے لائن کے نہ ہونے سے سفر نہایت دشوار تھا دریائے گنگ سے بذریعہ کشتی آمد و رفت ہوتی تھی۔ اس لئے محلہ سرائے شہر بھاگلپور کا اس زمانے میں مرکزی بازار تھا یہی وجہ تھی کہ جناب غلام رسول مرحوم نے اس محلہ میں بود و باش اختیار کر لی یہ واقعہ ایک صدی پہلے کا ہے۔

جناب محمد بشیر احمد صاحب اور ان کے بھائی جناب وحید احمد صاحب نہایت خلیق، ملنسار، سنجیدہ، اور خوش مزاج ہیں، آپ اس شہر کے نامور تاجروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نفیس کل واچ کمپنی کا نام نہ صرف بھاگلپور کمشنری بلکہ پوری ریاست بہار میں پھیلا ہوا ہے۔ دونوں بھائیوں کی خوش اخلاقی کا جادو کچھ ایسا ہے کہ جو کوئی بھی ان سے ملتا ہے ان کا ہو کر رہتا ہے۔ وہ کوئی بڑا سے بڑا افسر ہو یا معمولی سے معمولی انسان، بشیر احمد صاحب ڈسٹرکٹ حج کمیٹی کے سکریٹری اور شہر کے مختلف اداروں سے متعلق ہیں۔

محمد ہاشم

ولدیت........ صفدر علی

سن پیدائش........ ۱۹۱۸ء

وطن.......... محلہ حسین آباد ـ بھاگلپور

ہاشم صاحب ایک سنجیدہ انسان ہیں۔ نہایت زندہ دل، کامیابی میں تو ہر شخص ہشاش بشاش رہتا ہے۔ لیکن ہاشم صاحب وہ ہیں جو ناکامیوں کے طوفان میں گھرے رہنے کے باوجود مسکراتے رہتے ہیں۔ آپ ایک تجربہ کار تاجر ہیں اور شہر کی ہر اعلیٰ سوسائٹی میں آپ کی رسائی ہے۔ دینی اور ادبی کاموں سے آپ کو دلچسپی ہے۔

ہدایت علی خاں

ولدیت........ محمد مرتضےٰ خاں صاحب

تاریخ پیدائش........ ۱۹۰۳ء

وطن........ شیخپورہ ضلع مونگیر

مکمل پتہ........ اساتذ پور بھاگلپور سٹی

جناب ہدایت علی خاں صاحب شہر بھاگلپور کے نہایت تجربہ کار اور معروف ترین وکلا میں سے ہیں۔ سادہ دل، منکسر المزاج، سیکرا اخلاق، ملنسار اور فطری طور پر گوشہ نشین قسم کے انسان ہیں لیکن وکالت ایک ایسا پیشہ ہے جس میں گوشہ نشینی قائم نہیں رہ سکتی ہاں یہ اور بات ہے کہ موکلوں کے دلبرہ سے باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہ رہے مگر ہدایت علی خاں صاحب کے چاہنے کے باوجود ایسا ہو نہیں سکتا لوگ آپ کی دلنوازی اور فسوں سازی سے متاثر ہو کر رزم و بزم میں کھینچ ہی لاتے ہیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں گو خود کچھ نہیں لکھتے۔

شہرت سے آپ کو تنفر ہے۔ ابھرتی ہوئی پود کی آبیاری اور بچوں سے پیار آپ کا مشغلہ ہے۔ بھاگلپور میں سنہ ۱۹۰۶ء سے تعلیم شروع کی سنہ ۱۹۲۶ء میں ٹی۔ ان۔ بی کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا۔ قانون کی ڈگری پٹنہ سے حاصل کی اور سنہ ۱۹۲۸ء سے بھاگل پور میں وکالت کر رہے ہیں۔ آپ کا مستقل قیام محلہ اسانند پور میں ہے۔ آپ شہر کی مختلف سوسائٹی اور اداروں سے منسلک ہیں۔

ولایت حسین

ولدیت .... جناب محمد متین صاحب

تاریخ پیدائش .... سنہ ۱۹۰۲ء

وطن . .... محلہ حسین پور ـ بھاگل پور

ولایت حسین صاحب پہلے سیور کے قرب و جوار میں موضع کریٹ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد تاجر تھے، ولایت حسین صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر اسکول میں موصوف نے ہندی تعلیم حاصل کی اور ہندوؤں کے دیومالائی ادب کا مطالعہ اس طرح آپ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب سے دلچسپی لینے لگے زمانۂ طالبعلمی میں آپ نے وید اور رامائن پر مضامین لکھکر گرانقدر انعامات بھی حاصل کئے تھے، سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ نے تعلیم ترک کی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں والدہ کے ہمراہ بھاگل پور آگئے۔

ولایت حسین صاحب قریشی شہر کے کامیاب تاجر ہیں۔ معروفیت انہیں موقع نہیں دیتی لیکن چند لمحات بھی کبھی میسر آگئے تو شعراء کی محفل میں آبیٹھتے ہیں، اپنے پسندیدہ اشعار سناتے ہیں اور دوسروں کا کلام مزے لے لے کر سنتے ہیں۔

عبدالحمید رسمی

ولدیت .... مولوی خدابخش صاحب مرحوم

تاریخ پیدائش ...... سنہ ۱۹۰۶ء

وطن . ..... محلہ حیدر چک ـ بھاگل پور

انقلابات زمانہ کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہندستان کی تاریخ کے اوراق سے ایسی تمام شخصیتوں کے نام کھرچ کھرچ کر کے مٹائے جا رہے ہیں جنہوں نے آزادیٔ وطن کے لئے جاں نثاری اور جاں سپاری سے کبھی جی نہ چرایا بلکہ دوسروں کے مقابلہ میں ہمیشہ قائدانہ کردار کا حق ادا کیا۔ بھاگل پور میں ایک عظیم نیشنلسٹ رہ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک کانگریس میں تھے۔ ڈسٹرکٹ مسلم ماس کنٹیکٹ کے سکریٹری تھے لیکن ذہن پر حالات کا کچھ ایسا جھٹکا لگا کہ سنہ ۱۹۳۸ء کے بعد یہ مسلم لیگ میں شریک ہوگئے اور اب ایس۔ پی۔ کے سرگرم کارکن ہیں۔ رسمی صاحب نے ڈاکٹر غیاث اثر اور دوسرے رفقاء کے تعاون سے سنہ ۱۹۵۰ء میں انجمن فلاح المسلمین قائم کی تھی۔ جس کے ذیلی ادارہ شعبۂ ادب نے زبان و ادب کی اپنے طور پر نمایاں خدمت کی۔ اس کے زیر اہتمام تاریخی مشاعرے منعقد ہوئے اور یوم غالب، یوم شاد اور یوم سلامتی ابوالحسن (بیرسٹر ابوالحسن مرحوم) بڑے آب و تاب کے ساتھ منائے گئے۔ جس کی یاد آج بھی لوگوں کے دل و دماغ میں تر و تازہ ہے۔

حمید رسمی ایک معمر شخصیت کا نام ہے جن سے ملنے کے بعد ماضی کے بہت سارے دریچے کھلتے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم انسٹی ٹیوٹ، اور دارالمطالعہ جو کھلا تھا اس کے بانی کون تھے اگر یہ سوال آپ رسمی صاحب سے کیجئے تو جواب دیں گے، میں سکریٹری تھا، ناصر خاں صاحب، جج کے چچا حاجی عبدالوحید خاں صاحب مرحوم صدر تھے، کچھ دنوں تک یہ انسٹی ٹیوٹ اور لائبریری کامیابی کے ساتھ چلی اور جب اس کا زوال ہوا تو لائبریری کا سارا اثاثہ مولوی سکوف صاحب مکیل کے حوالے کر دیا گیا جو آج بھی ان کی نجی لائبریری (فرینڈس لائبریری) کی زینت ہے۔ قاضی ولی چک کے یتیم خانہ کے سلسلہ میں دریافت کیجئے تو رسمی صاحب فرمائیں گے۔ یہ یتیم خانہ سنہ ۱۹۳۲ء میں قائم ہوا اس کے بانیوں میں مولانا عتیق احمد

حاجی عبدالوحید خاں اور خود حمید رہتی تھے

محمد طیب

ولدیت .... جناب محمد ہارون صاحب مرحوم
سنہ پیدائش ۱۹۰۷ء
وطن .... چمپانگر۔ بھاگلپور

الحاج محمد طیب صاحب چمپانگر کے ایک پرخلوص، دین دار اور سنجیدہ انسان ہیں۔ دینی مدارس۔ یتیم خانہ اور زبان و ادب کی خدمت خاموش طریقے سے کرتے رہتے ہیں۔ نام و نمود سے بیزار ہیں۔ جہاں موصوف ایک کامیاب تاجر ہیں، وہیں آخرت کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بھی اُن کی محبت قابلِ تقلید ہے۔ موصوف ۱۹۵۳ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ طیب صاحب خلیق، اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ چمپانگر میں ہر شخص آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد یونس

ولدیت .... جناب سید محمد یوسف
تاریخ پیدائش .... ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۰ء
وطن .... محلہ رام سر احمدیہ بلڈنگ۔ بھاگل پور

وابستہ مند دنیائے اردو کے مشہور ادیب جناب حسن علی مرحوم کے نبیرہ محمد یونس بھاگل پور کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ تاتار پور سے جب آپ قاضی ولی چک کی طرف جائیں گے تو قادیانی مسجد کے نزدیک جدید ساز و سامان سے آراستہ آپ کو ایک ایسی ڈسپنسری ملے گی جہاں مریضوں کا مجمع لگا رہتا ہے مریضوں کے اس بھیڑ میں ڈاکٹر سید محمد یونس کو آپ ہمیشہ ہشاش بشاش اور تروتازہ پائیں گے۔ ڈاکٹر یونس نے آئی۔ ایس۔ سی تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم پائی اور پٹنہ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ اردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر ظفر حمیدی ان کے ہم جماعت تھے اور مشہور ادیب ڈاکٹر نذر امام سینیر ہونے کے باوجود ان کے دل کے بہت قریب رہے ہیں۔ ڈاکٹر اختر اورینوی سے آپ کے گہرے مراسم ہیں۔ اور رشتہ داری بھی ہے۔ مطالعہ کا ذوق کافی ہے۔ میڈیکل لٹریچر سے اگر فرصت ملی ہے تو دینی کتابیں اور کچھ ادبی شہ پارے سے اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ آپ کے محبوب ادیب و شاعر کرشن چندر، فراق، جوش ملیح آبادی، شاد۔ اختر اورینوی اور شکیلہ اختر ہیں۔ دوسری صف کے شعرا میں شاہین غازی پوری، آپ کو بہت پسند ہیں۔ علیگڑھ کی زندگی میں آپ جن اساتذہ سے متاثر ہوئے ان میں معین احسن جذبی اور سید احمد صدیقی کے نام سرفہرست ہے۔

سید مقبول احمد

ولدیت .... جناب سید فدا احمد مرحوم
آبائی وطن .... بہڑیا ضلع مونگیر
موجودہ سکونت .... ایسٹ کوتوالی بھاگلپور
سنہ پیدائش ... ۱۹۰۶ء
مقام پیدائش ..... موضع ملاداں، تھانہ استھاواں ضلع پٹنہ

سید مقبول احمد کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ بھاگلپور میں موصوف نے سنہ ۱۹۳۰ء سے وکالت شروع کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ ملکی۔ ملی اور قومی خدمت کو بھی شعار بنا لیا تھا۔ سیاسی مسلک بنیادی طور پر ہمیشہ آپ کا .. رہا جو نیشنلسٹ مسلمانوں کا ہے۔ ابتداءً کانگریس میں شریک ہوئے اور آزادی وطن کی جدوجہد اپنے ہمعصروں کے ساتھ کرتے رہے۔ آپ کی زندگی کا ایک ایسا بھی موڑ آیا جب فسادات میں بے گناہوں کی تباہی و بربادی سے عارضی طور پر متاثر ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ میں شرکت کے باوجود سوچنے کا جو آپ کا سانچہ تھا وہ نہیں بدلا اس لئے آزادیٔ وطن کی جدوجہد کرنے والوں اور متحدہ قومیت کے علمبرداروں سے مخلصانہ تعلقات کبھی منقطع نہیں ہوئے۔ قومی خدمت میں

فرقہ پروری کا عنصر اپنے وجود پر مقبول احمد صاحب نے کبھی طاری نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان کی بسنے والی ہر انسانی ٹولی سے آپ ہمیشہ محبت کرتے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں پھر آپ کانگریس میں واپس ہو گئے اور آجتک اسی سیاسی جماعت میں ہیں۔

آپ ۱۹۴۶ء میں پہلے پہل ایم۔ ایل۔ اے ہوئے اور اس کے بعد ہر انتخاب میں کامیاب ہوتے رہے۔ گذشتہ انتخاب میں جب مرگ وانبوہ کا سماں چاروں طرف تھا تو اس جشن میں آپ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ کانگریس کابینہ میں بحیثیت وزیر ایل۔ ایس۔ جی۔ پی۔ ڈبلیو ڈی۔ ولی۔ ایچ ڈی، اور ہاؤسنگ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۱ء تک رہے۔ آپ کی کتاب زندگی کا ایک ورق جو قابل رشک ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص آپ کے قتل کے ارادے سے آیا لیکن غلطی سے موصوف کے ملازم کو نشانہ بنا کر بھاگ گیا۔ جس ریوالور سے اس نے شہید کیا تھا وہ اکلیشوری بابو بھاگلپور کے مشہور رئیس کا تھا جن کی ضمانت لینے کو کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔ سید مقبول احمد صاحب خود آگے بڑھے اور انکے ضمانت دار بن گئے۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے صدائے عام کے مدیر نے لکھا سید مقبول احمد نے سلف صالحین کی سیرت پر عمل کر کے اسلام کی ایسی نمایاں خدمت کی ہے جس کی مثال دوسروں کے یہاں ملنی ناممکن ہے

مقبول صاحب نے بھاگلپور کی خدمت اس قدر کی ہے کہ جس کو لکھا جائے تو خود ایک کتاب بن جائے گی۔ اور تمام خدمات کو بھلا بھی دیا جائے تو بھاگلپور یونیورسٹی کا قیام اور اس کا نام بھاگلپور یونیورسٹی کا رکھنا نیز انجینیرنگ کالج بھاگلپور میں قائم کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے اس کمشنری کی تاریخ میں آب زر سے لکھنا چاہئے۔ مقبول صاحب کو زمانۂ طالب علمی سے ہی ادب سے لگاؤ رہا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہمہ جہتی مصروفیت نے انہیں زندگی کی رعنائی ورنگینی سے لطف اندوز ہونے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ موصوف "قدیم بزم سخن" بھاگلپور کے ۱۹۵۱ء میں صدر منتخب ہوئے تھے۔ اور ہنوز اس عہدہ پر فائز ہیں۔

محمد منصور خاں صاحب

ولدیت .... محمد جمال الدین خاں صاحب مرحوم

وطن .... محلہ امام نگر، ڈاکخانہ جبیب پور ضلع بھاگلپور۔

تاریخ پیدائش ۱۹۱۲ء

جناب محمد منصور خاں صاحب یوسف زئی پٹھان ہیں۔ آپ کے آباء و اجداد غزنی کے تھے۔ جناب محمد دیوان فتح خاں صاحب دلی سے یہاں آکر آباد ہوئے جن کی چھٹی پشت میں منصور خاں صاحب ہیں آپ کی تعلیم سینٹ زیویرس اسکول میں ہوئی۔ آپ نے تعلیم کی تکمیل ۱۹۳۶ء میں کی اور ۱۹۴۰ء میں بی۔ ایل کا پہلا حصہ کلکتہ سے کیا اور دوسرا حصہ ۱۹۶۳ء میں بھاگلپور سے کیا۔ آج کل آپ ایک کامیاب وکیلوں میں سے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار نے ملی، سماجی اور سیاسی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ٹاؤن مسلم لیگ پھر ضلع کے صدر ہوئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیرمین اور لوکل بورڈ کے چیرمین بھی تھے۔ ابتدائی سیاسی زندگی کانگریس میں بھی گذری تھی۔ تحریک عدم تعاون میں بھی حصہ لیا تھا۔ بابو تیج نارائن سنگھ کے صاحبزدہ بابو دیپ نارائن سنگھ کے ہمراہ بمبئی کانگریس کی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے اور خلافت تحریک کے بھی مقامی طور پر اہم کارکن تھے۔ منصور خاں صاحب مسلم ہائی اسکول کے تین سال تک سکریٹری رہ چکے ہیں، کانگریس کے ۱۵ سال تک فعال ممبر رہے ہیں اور اب بھارتیہ کرانتی دل میں ہیں۔

محی الدین صدیقی

ولدیت..... حکیم مولوی نجم الدین مرحوم سابق مدرس اعلیٰ مدرسہ حمائنیا ہ کبیریہ سہسرام

تاریخ پیدائش........ ۸ر اپریل ۱۹۳۳ء

وطن..... موضع بانک، ڈاکخانہ بیا پور۔ تھانہ منیر شریف ضلع پٹنہ

موجودہ پتہ .... محلہ خنجر پور۔ بھاگلپور

بردبار۔ نیک سیرت۔ نیک طبیعت اور مخیر انسان
ہیں۔ سرکاری ملازم ہیں اپنے دفتری کاموں سے جب فرصت ملتی
ہے تو اخبار و کتب و رسائل کے مطالعہ میں وقت گذارتے ہیں، پٹنہ
یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ آپ نے سنجیدگی کے ساتھ مختلف علوم کا
مطالعہ کیا ہے لیکن جس سے آپ کو فطری دلچسپی ہے وہ ہے تاریخ ادب'
ویسے تو معین الدین صدیقی نے عالمی تاریخ کا اچھا مطالعہ کیا ہے مگر
اسلامی تاریخ پر جو آپ کو دسترس حاصل ہے وہ اسی قسم کی دلچسپی رکھنے
والوں کے لئے قابل رشک ہے

محمد عبدالمجیب

ولدیت .... مولوی عبدالغفار مرحوم
تاریخ پیدائش ۱۹۱۶ء
وطن .... محلہ برہ پورہ تھانہ کوتوالی، ڈاکخانہ و ضلع بھاگلپور

عبدالمجیب صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل ہیں اور اس شہر
کے نہایت کامیاب وکیل ہیں۔ آپ کی پیدائش اس صدی کی اوّل
دہائی میں بمقام برہ پورہ ضلع بھاگلپور میں ہوئی، ان دنوں یہ محلہ
دینی اور دنیاوی تعلیم کا گہوارہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی فضا مجیب
صاحب کی تعلیم کے لئے نہایت سازگار ثابت ہوئی، اپنے نانا محترم کی
سرپرستی میں اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ٹی۔ این
بی کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ لا کالج پٹنہ سے بی ایل کیا
۳۰ر جنوری ۱۹۴۳ء سے بھاگلپور بار میں شریک ہو گئے اور ایک
نہایت کامیاب وکیل ثابت ہوئے۔ مجیب صاحب آل پارٹیز پیس
و یجیلنس کمیٹی کے صدر ہیں، شہری امن و سلامتی کی سرکاری و نیم سرکاری
متعدد کمیٹی کے سرگرم کارکن ہیں، سلامتی و امن کمیٹی کے شاخ کے ممبر ہیں۔
اور وارڈ نمبر ۲ کے سلامتی کمیٹی کے کنوینر، موصوف بار ایسوسی ایشن
کے جوائنٹ سکریٹری ہیں اور یوتھ ایسوسی ایشن ضلع بھاگلپور کے
صدر ہیں۔ بھاگلپور شہر کے متعدد ہائی اسکولوں کی مجلس انتظامیہ کے رکن
اور بھاگلپور میونسپلٹی کے وارڈ کمشنر ہیں۔

محمد میاں جان علی

ولدیت .... محمد عید و میاں صاحب
تاریخ پیدائش ..... ۱۴ر اکتوبر ۱۹۰۸ء
وطن .... ناتھ نگر بھاگلپور

میاں جان علی صاحب کی زندگی کا ایک پہلو ایسا ہے جس کی
وجہ سے آپ کا تذکرہ کرنا ضروری ہو گیا۔ یہ درخشاں پہلو ہے آپ
کا خلافت تحریک میں عملی حصہ لینا اور اس تحریک کے وابستگان کے ساتھ
دامے، درمے، قدمے، سخنے، اپنی بساط بھر تعاون کرنا۔ ۱۹۴۲ء
کی تحریک میں بھی آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے بیٹھے نہ رہے بلکہ اس
تحریک کو تقویت پہنچانے کی سعی کی اگر آپ سر انقلاب نہ ٹھہرے
تو پس انقلاب ضرور تھے۔ اس وقت کی حکومت کے باغی لیڈر
سیارام سنگھ صاحب اور ان کے ساتھیوں کو آپ نے اس وقت
پناہ دی اور ہر طرح کی امداد دی جب حکومت نے اعلان کیا تھا
کہ سیارام سنگھ کو زندہ یا مردہ لانے والے کو گرانقدر انعامات
دیئے جائیں گے۔ آج بھی میاں جان علی صاحب سیاسی، سماجی، علمی،
ادبی اور دینی اداروں کے ساتھ حسب مقدور تعاون کرنے میں
پیش پیش رہتے ہیں، خصوصاً اقتصادی تعاون فراخدلی کے
ساتھ کرتے ہیں اور جوش و خروش کے ساتھ عملی حصہ بھی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد منصور

ولدیت .... محمد محبوب علی مرحوم
تاریخ پیدائش ۱۹۱۳ء
وطن محلہ خنجر پور بھاگلپور

ڈاکٹر محمد منصور علی صاحب شہر کے ایک کامیاب تاجروں میں
سے ہیں آپ کی زندگی نہایت معروف ہے۔ شہری سیاست سے بھی
کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آج کل میونسپلٹی کے وائس چیرمین کے عہدہ

پر فائز ہیں۔ عنفوان شباب میں آپ کو فٹ بال کا بہت شوق تھا۔ آج کل سیاسی کھیل اور کاروبار کی مشغولیت سے تھوڑی دیر کے لئے اگر مہلت ملتی ہے تو آپ خانہ باغ میں باغبانی سے دل بہلاتے ہیں، آپ کا خانہ باغ سجا سجایا اور قابل دید ہے۔ یہاں پہنچ کر غیر شاعر بھی شاعری کی طرف خود بخود مائل ہو جاتا ہے۔ سیاسی مصالح نے آپ کو سنجیدہ خلیق اور ملنسار بنا دیا ہے زبان و ادب کے خادموں سے اکثر و بیشتر اپنی بساط بھر تعاون کرتے رہتے ہیں۔ آپ شہر کے ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

جناب محمد معین الدین خاں صاحب

ولدیت ..... مولوی عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم

وطن .... معظم چک۔ ڈاکخانہ حبیب پور۔ بھاگلپور

معین خاں صاحب غزنی کے قبیلہ یوسف زئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد غزنی سے الہ آباد آئے، الہ آباد سے مونگیر کے علاقے میں آکر آباد ہو گئے جہاں سے بھاگلپور کے محلہ براری میں منتقل ہو گئے اور براری سے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے موقع پر حبیب پور آ گئے ۱۹۵۷ء کی جنگ میں اس خاندان کے بزرگ مولوی ذکی الدین صاحب نے حصہ لیا تھا۔ معین الدین خاں صاحب کے والد ایک کامیاب وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ میونسپلٹی کے چیرمین اور ایم۔ ایل۔ سی بھی تھے۔

معین خاں صاحب نے تعلیم کا آغاز کالجیٹ ہائی اسکول سے کیا جہاں سے میٹرک کے بعد ٹی۔ ان۔ بی کالج آئے بی۔ اے۔ کیا اور پٹنہ یونیورسیٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں لا کیا اور ۱۹۲۷ء سے پریکٹش شروع کر دیا۔ جناب معین خاں صاحب نے مسلم ہائی اسکول کی ترقی و بہبودی کے لئے ابتدا ہی سے اپنی زندگی صرف کر دی تھی۔ آپ کے بیان کے مطابق مسلم ہائی اسکول کو ۱۹۳۹ء میں قاضی ابوظفر مرحوم نے قائم کیا تھا۔ اس وقت کے مجلس انتظامیہ میں خاں صاحب موصوف بھی تھے ۱۹۲۳ء میں ظفر مرحوم بیمار ہو گئے اور مظفر پور چلے گئے تو ظفر صاحب کا یہ پرو پرائٹری اسکول پبلک اسکول بن گیا۔ اس وقت اسکول کی مالی حالت خراب تھی۔ طلبا بھی کم تھے۔ پبلک نے اسکول پر قبضہ کرنے کے بعد جو مجلس انتظامیہ بنائی اس کے صدر ڈاکٹر عبدالرحیم مرحوم ہوئے، اور سکریٹری جناب معین خاں صاحب ہوئے۔ اس وقت داس ورما صاحب D.P.I. تھے اور ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیمات، داس ورما صاحب نے اسکول کی منظوری دے دی۔ یتیم خانہ قاضی ولی چک کے چھ سال تک معین صاحب صدر تھے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک آپ آنریری مجسٹریٹ بھی رہے۔ ۱۹۳۰ء میں جو مسلم انسٹی ٹیوٹ نامی ادارہ قائم ہوا تھا آپ کچھ دنوں تک اس کے صدر بھی تھے۔ معین خاں صاحب کی ذات بہت غنیمت ہے اور ایسے لوگوں کی آج بھی ملت کو اشد ضرورت ہے۔

نثار احمد

ولدیت .... حافظ ستار بخش

سن پیدائش ۱۹۰۵ء

آبائی وطن .... بیراگل ضلع بستی (یو۔ پی)

موجودہ سکونت ...... محلہ سرائے۔ بھاگلپور

جناب نثار احمد صاحب ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ اپنے کاروبار سے جب فرصت ملتی ہے تو کچھ دینی خدمت انجام دیتے ہیں۔ جہاں تک دینی اداروں کا تعلق ہے مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ نثار صاحب ان اداروں کی اپنی صلاحیت سے کچھ زیادہ ہی مالی امداد کرتے ہیں۔ شعر و سخن سے موصوف کو چنداں دلچسپی نہیں لیکن اردو کی ترقی اور بقا کی آرزو رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موصوف قدیم بزم سخن اور اسی قسم کی دوسری انجمنوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔

....

سیّد محمد سعید عالم

ولدیت........ سیّد محمد شمس التوحید مرحوم
وطن.......... موضع نور پور نورالدین عرف سالا ڈاکخانہ کن کن ضلع پٹنہ
موجودہ پتہ...... بھارت ویلڈنگ اینڈ آئرن ورکس تاتار پور بھاگلپور
تاریخ پیدائش......۱۱ر جنوری ۱۹۲۹ء

سعید عالم صاحب نے پٹنہ یونیورسیٹی سے لیبر اور سوشل ویلفیر میں ۱۹۶۱ء میں ایم۔ اے کیا ہے اور زمینداری کے خاتمے کے بعد اقتصادی مسئلہ کو حل کرنے کے پیش نظر آپ کے والد نے یہی مشورہ دیا۔ کہ اب تجارت کا مشغلہ اپنانا چاہیئے اس لئے تعلیم کے بعد سعید عالم صاحب نے تاتار پور میں لوہے کا کارخانہ کھولدیا۔ اس شہر سے آپ کا تعلق ۱۹۴۸ء سے ہے۔ سعید عالم کو کتب بینی کا بہت شوق ہے اور شعر و سخن سے بھی دلچپی ہے گو خود شعر نہیں کہتے۔

الحاج عبدالسّلام

ولدیت.......... محمد نوازش مرحوم
وطن.......... محلہ ناتھ نگر۔ بھاگل پور
مکمل پتہ......... ڈاکخانہ ناتھ نگر۔ بھاگل پور

الحاج عبدالسلام نہایت دیندار اور مخلص انسان ہیں، شہر کی ادبی، سماجی اور دینی خدمت سے کبھی جی نہیں چراتے آپ کی بہترین یادگار ناتھ نگر چوک کا مسافر خانہ اور مسجد ہے، آپ نے مدنی مسافر خانہ تاتار پور اور ناتھ نگر گرلز ہائی اسکول نیز یتیم خانہ اسلامیہ بھاگلپور کی تعمیر میں دل کھول کر حصہ لیا ہے۔ اور گرانقدر رقمیں اپنے اداروں کو عطا کی ہیں۔ جمیعتہ العلمار کو آپ مسلمانان ہند کی نجات دہندہ تسلیم کرتے ہیں اور آپ کا ایقان ہے کہ یہی وہ جماعت ہے جو ملک کے طول و عرض میں دینی تعلیمات کا جال بچھا رہی ہے اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا دلسوزی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ آپ ہر دینی ادارہ کی مالی امداد نہایت مسرت اور فراخدلی کے ساتھ کرتے ہیں خصوصاً دارالیتامیٰ چمپانگر، مدرسہ احیاءالعلوم ناتھ نگر وغیرہ پر آپ کی نگاہ کرم ہے۔ آپ جامع مسجد ناتھ نگر کمیٹی کے صدر ہیں مسلم ہائی اسکول بھاگلپور اور ایس۔ آر۔ ایچ اسکول ناتھ نگر کی مجلس منتظمہ کے رکن ہیں، جمیعتہ العلمار بھاگلپور شہر کے عہدہ دار ہیں۔ اور تبلیغی کاموں سے بھی اپنی مصروفیت کے باوصف دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ نعتیہ مشاعرہ سے بھی آپ ذوق رکھتے ہیں۔ آپ کی ذات گرامی مومنانہ اقدار کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والوں کیلئے قابل صد احترام ہے۔

سراج الحسن نقوی

ولدیت.......... مولانا سید محمد حسن صاحب تاثیر لکھنوی
تاریخ پیدائش........ ۱۹۳۲ء
وطن.......... لکھنؤ
موجودہ پتہ...... ..... پیش امام گولہ گھاٹ شیعہ مسجد سخی خید گھاٹ روڈ ـ بھاگل پور

حضرت مولانا سراج الحسن نقوی شیعہ مسجد گولہ گھاٹ کے امام ہیں۔ آپ کے نانا اپنے وقت کے جید عالم تھے جن کو نجم العلماً کا خطاب دربار شاہی لکھنؤ سے عطا کیا گیا تھا۔ ان کا اسم مبارک مولانا سیّد ہدایت حسین تھا۔

مولانا سراج الحسن صاحب کا تعلق خاندان اجتہاد سے ہے۔ عربی و فارسی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کے امتحانات میں بھی امتیاز کے ساتھ آپ نے کامیابی حاصل کی ہے نام و نمود کی خواہش شمہ برابر نہیں ہے۔ لکھنو کے عزیزوں اور دوستوں نے آپ کی شخصیت کے ڈھکے چھپے گوشے اجاگر کرنے چاہے لیکن مولانا کی طبیعت میں استغنا کا پہلو اس درجہ جاگزیں ہے کہ آجتک موصوف نے ان باتوں کو قابل توجہ نہ گردانا۔ یہ تذکرہ دوستوں اور قریبی حلقوں کی معلومات سے مرتب کر کے لکھا جا رہا ہے۔ عام طور پر علمار اپنی دنیا الگ تھلگ بنا کر مگن رہتے ہیں۔ لیکن مولانا موصوف عجیب باغ و بہار مزاج کے مالک ہیں۔ بھاگلپور

تشریف لانے پر آپ نے یہاں کی تمام سوسائٹی سے تعلقات استوار کئے۔ ہر چھوٹی بڑی شخصیتوں سے ملے۔ مختصر سی مدت سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر ایک کی آنکھوں کے تارا ہو گئے۔ لکھنؤ کی خاک سے ہیں۔ جسے آج بھی لوگ اردو کا مرکز تسلیم کرتے ہیں، پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسی مرنجاں مرنج طبیعت رکھنے والی شخصیت بزم سخن یا حلقہ ادب سے دور دور رہتی۔ مولانا کی حیثیت مجالس شعر و سخن میں اسی طرح درخشاں و تابندہ رہتی ہے جس طرح دینی مجلس میں۔ شعرائے بھاگلپور سے وہ اس طرح گھل مل گئے ہیں جیسے یہ خود بھی انہیں سے ایک ہوں۔ شعر فہمی کا کیا کہنا ہے لیکن شعر گوئی سے مجتنب رہتے ہیں۔ شاید یہ مجتہدانہ طرز زندگی کا اثر ہوا۔

آپ کی ذات بھاگلپور کے ادبی ماحول میں ایک شگفتہ گلاب کی سی ہے۔

نواب ارشاد حسین زیدی

نواب ارشاد حسین زیدی عرف "رجن" صاحب کی ذات گرامی بھاگلپور کے ادبی حلقہ کے لئے غنیمت ہے۔ آپ شاعر نہیں ہیں لیکن شعر فہمی میں یکتائے روزگار ہیں۔ نہایت خوش مزاج، نرم دل، خوش وضع اپنے شاندار ماضی کے امین اور مستقبل کے معمار ہیں۔ آپ کا دولت کدہ شاعر و ادیب کی جائے اماں ہے۔ یہ وہ مرکز علم و ادب ہے۔ جہاں ہر عہد میں شعر و سخن کی شمعیں روشن رہی ہیں۔ قدیم بزم سخن اور حلقہ ادب کی نشستیں یہیں ہوتی ہیں۔ شہر میں ایک مکان ایوان ادب کے نام سے معروف ہے۔ ارشاد صاحب کا تعاون اہل ادب کیلئے ایک نعمت ہے۔

علی عمر خاں

ولدیت ۔۔۔ عبدالعظیم خاں

تاریخ پیدائش ۔۔۔۔ ۲۳ مارچ ۱۹۲۳ء

غزنی ایک مشہور اور معزز قبیلہ ترین کے بزرگ جناب خوب داد خاں مرحوم شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں بھاگلپور تشریف لائے۔ اور یہیں آباد ہو گئے۔ شہنشاہ نے ایک فرمان کے ذریعہ آپ کو ایک عظیم جاگیر عطا کی جو پٹھان پورہ سے کہلگاؤں تک پھیلی ہوئی تھی، موجودہ محلہ بھیکن پور خوب داد خاں مرحوم آگرہ آباد ہوئے تھے۔ نام مسکن بھیکن پور پڑا۔ حضرت نیک نام شاہ بندگیؒ اسی مسکن بھیکن پور میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اور یہیں آپ کا مزار اقدس ہنوز مرجع خاص و عام ہے۔ مرحوم خوب داد خاں صاحب کے صاحبزادہ جناب منصور خاں مرحوم حضرت نیک نام شاہ بندگیؒ کے خادم تھے۔ اور آج تک اسی خاندان کے افراد کو یہ شرف حاصل ہے۔

شہر کے مشہور و معروف قانون داں جناب علی عمر خاں صاحب کا خاندانی سلسلہ جناب خوب داد خاں مرحوم سے ملتا ہے۔ ترین قبیلہ چونکہ نہایت معزز اور محترم تھا۔ اس لئے جناب علی عمر خاں صاحب کے دادا جناب عبدالحفیظ خاں صاحب عرف نیکی شاہ قطابی تک شادی بیاہ کا سلسلہ غزنی سے ہی استوار رہا۔ بعد میں یہ سلسلہ رفتہ رفتہ منقطع ہوتا چلا گیا۔ اور اب یہاں کے دوسرے پٹھان خاندان میں بھی شادی ہونے لگی۔

جناب علی عمر خاں صاحب کی دادی بی بی تسلیم خانم غزنی کی تھیں جن کا ذکر اس نمبر میں موجود ہے۔

بھیکن پورہ مسجد کے قریب جنوب کی جانب جب آپ ایک خوبصورت سی متوسط انداز کی عمارت میں داخل ہوں گے تو موکلوں کے جھرمٹ میں فائلوں میں الجھے ہوئے ایک گورے چٹے، وجیہہ شخص کو دیکھیں گے، آنکھیں چار ہوتی ہی مصروفیت کے باوجود پرکشش انداز میں مسکراتے ہوئے جب وہ شخص آپ سے متوجہ ہوگا تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے ہجوم کار کا اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ ہنس مکھ، خوش اخلاق، علم و ادب کا قدرداں شخص علی عمر خاں ہے، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور ترین قبیلہ کی توانائی کے آثار آج بھی ان کے چہرے سے نمایاں ہے۔ ملنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی عظیم شخصیت سے مل رہے ہیں جو ہمارے دلوں کے بہت قریب ہے، وکالت میں آپ کا تجربہ کیسا ہے اس کا ثبوت تو موکلوں کے ہجوم سے مل جاتا ہے، لیکن آپ کے علمی و ادبی شغف کا پتہ وہی شخص لگا سکتا ہے جو مدت تک آپ سے ملتا رہا ہو۔ عمر صاحب سے میرا تعلق سنہ ۱۹۵۰ء سے ہے اور یہ تعلق بھی صرف بزم سخن کے صدقے میں

استوار رہا۔ اسی سلسلہ میں آج تک لکھتا آیا ہوں اور میں نے یہ اندازہ کیا ہے
کہ فائلوں کے بوجھ تلے دبا ہوا یہ انسان بے انتہا ادبی ذوق رکھتا ہے۔
جناب علی عمر خاں صاحب جہاں شہر کی مختلف ادبی مجالس میں
وقت نکال کر وقت نکال کر وقتاً فوقتاً شریک ہوتے رہے ہیں وہیں
اپنے دولت کدہ پر ادبی مجلسیں بھی ذوق و شوق سے سجاتے رہے ہیں۔
اسی طرح دینی، سماجی، ملی اور ملکی خدمات میں موقع بہ موقع آپ حصہ لیتے
ہیں اور نہایت دلچسپی سے قومی خدمت کرتے ہیں۔

محمد قاسم حسین (تاریخی نام محمد اظہار حسین)

ولدیت .... جناب مولوی علی حسین مرحوم
وطن .... مغل پورہ ـ بھاگلپور
تاریخ پیدائش ..... ۲۹ر جون ۱۸۹۹ء

محمد قاسم حسین ایک باغ و بہار شخصیت کا نام ہے۔ جس سے
مل کر دل و دماغ کو تازگی ملتی ہے۔ بہ یک نظر دیکھنے سے کوئی جاذبیت
یا کشش محسوس نہ ہوگی لیکن دو چار جملے سننے کے بعد جی چاہے گا کہ ساری
زندگی اسی قاسم آگہی کی صحبت میں گذار لو۔ اپنے مختلف مذاہب کا تقابلی
اور صحتمند مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک ماہر وکیل ہیں اس لئے اس معاملہ میں
بھی نہایت مہارت کے ساتھ اپنا کیس پیش کرتے ہیں۔ قاسم صاحب کی ابتدائی تعلیم
سینٹ زیویرس اسکول کلکتہ میں ہوئی۔ ٹی۔ ان۔ بی کالج بھاگلپور سے
بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۷ء میں پٹنہ سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔
آپ کے والد مرحوم کہلگاؤں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جنہیں سنسکرت
زبان و ادب پر کافی عبور حاصل تھا۔ اس کا اثر قاسم صاحب کی شخصیت
پر بھی پڑا۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی ایک صوفی منش انسان ہیں، اور ہندی
و سنسکرت کا اچھا درک رکھتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں ورزش اور کشتی
لڑنے کا بھی ذوق تھا۔ آپ کو خدمت خلق سے خاصی دلچسپی ہے، جس نے
آپ کو ابتداءً کانگریس میں کھینچ لیا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے
۱۹۵۵ء تک ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے۔ شہر کے میونسپلٹی
کے چیرمین اور وائس چیرمین بھی رہ چکے ہیں۔

سیّد محمد عبدالرحمٰن قدوائی

ولدیت .... سید محمد واحد حسین قدوائی مرحوم
آبائی وطن ...... کرسی خانقاہ نجاشہ نہال
موجودہ پتہ ..... محلہ قاضی ولی چک۔ بھاگلپور

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب قدوائی کی تعلیم دارالعلوم
دیوبند اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوئی ہے۔ آپ کا ظاہر جامع ملیہ
کا سراپا ہے اور باطن دارالعلوم دیوبند کی روحانیت سے معمور ہے۔
دنیا میں خلیق انسانوں کی کمی نہیں ہے لیکن مولانا موصوف کے اخلاق کا
معیار ہی کچھ اور ہے۔ ملنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی سے
مل رہے ہیں جس سے روحانی رشتہ ہے لیکن جس کا نام و نشان نہیں تھا قرب
کی لو سے مشام روح معطر ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۱۹۳۳ء سے
بھاگلپور میں ہیں۔ آپ کی شادی بھی بہار کے ہی ایک مشہور قصبہ بہٹرپا پر
ہوئی ہے۔ اس طرح آپ بھاگلپور کے بزرگ ترین لوگ ڈاکٹر محی الدین
صاحب مدظلہ اور سابق وزیر ریاست بہار سید مقبول احمد صاحب
کے قریبی رشتہ دار ہیں۔
یتیم خانہ قاضی چک ولی کی ترقی و فلاح کے لئے مولانا
اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوصف ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ آپ کے
بے مثال اخلاق نے بھاگلپور اور اس کے نواح میں اپنے مداحوں کا
ایک عظیم گروہ پیدا کر لیا ہے۔ تاجر کی حیثیت سے بھی آپ صرف اپنے
اخلاق حمیدہ کی وجہ سے ہندو مسلم سکھ عیسائی بنگالی، بہاری
مارواڑی ہر سماج میں ہر دل عزیز ہیں۔
محترم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب مدظلہ کے در دولت پر ہر
شام جو مجلس گرم ہوتی ہے حضرت مولانا اس کے ایک مستقل ممبر ہیں۔ آپ
عربی۔ فارسی اور اردو ادب سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ علم عروض کے
ماہر ہیں لیکن اس فن میں کمال رکھنے کے باوجود شعر کہہ نہیں سکتے۔ یہ
امر اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ ویسے
شعر و سخن سے آپ کو دلچسپی ضرور ہے اور قدیم بزم سخن کے ہمدرد اور معاون ہیں

محمد ریاست علی خاں

ولدیت ... جناب مولوی فراست علی خاں صاحب مرحوم

پتہ ... محلہ بھیکن پور - بھاگل پور ۱

تاریخ پیدائش ... ۴ اپریل ۱۹۲۸ء

ابتدائی تعلیم ضلع اسکول بھاگل پور میں ہوئی جہاں سے ۱۹۴۳ء میں جناب ریاست علی خاں صاحب نے میٹرک کے بعد بھاگل پور کلکٹریٹ میں آپ نے ملازمت کر لی۔ ملازمت کرتے ہوئے مارواڑی کالج میں ۱۹۵۱ء میں آپ نے بی۔ کام کیا۔ اور ۱۹۵۳ء میں پٹنہ لا کالج سے بی۔ ایل کی ڈگری حاصل کی جس کے بعد ۱۹۵۳ء سے بھاگلپور کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی تھوڑے ہی دنوں میں آپ نے کامیابی حاصل کی اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے مشہور ہو گئے ۱۹۵۷ء میں آپ ایڈوکیٹ ہوئے اور ۱۹۵۸ء سے لا کالج بھاگل پور میں لکچرر بحال ہوئے۔ جہاں آپ کامیاب وکیل ہیں وہیں ایک تجربہ کار قانون کے استاد سے بھی مشہور ہیں

ریاست خاں صاحب نہایت زندہ دل انسان ہیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو کی ترقی و بقا کیلئے ہمیشہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(ڈاکٹر) ضیار بن رضا

ولدیت ... جناب رضا حسن صاحب

تاریخ پیدائش ... ۵ جنوری ۱۹۳۴ء

وطن ... قصبہ مہاراج گنج، تھانہ چپارن ضلع سرایا باغ

پتہ ... محلہ جبار چک - بھاگل پور ۲

ڈاکٹر ضیا ابن رضا صدر ہاسپٹل بھاگل پور میں میڈیکل آفیسر ہیں اور ایک کامیاب معالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ ایس۔ سی فرسٹ کلاس سکنڈ کرنے کے بعد آپ نے دربھنگہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا جہاں سے تعلیم کی تکمیل کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی گئے اور وہاں ۱۹۶۳ء M.R.C.P کے بعد ۱۹۶۴ء میں کیا جس کے بعد D.T.M.H میں اور H. C. D ۱۹۶۴ء میں لندن میں کیا جس کے بعد میڈیکل سروس سے منسلک ہو کر بھاگل پور تشریف لائے۔ آپ کے والد بزرگوار ضلع اسکول کے استاد تھے آج کل ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تربیت میں موصوف کے والد بزرگوار کا کافی حصہ ہے ویسے ننھیال بھی ہمیشہ اہل علم کا رہا۔ طبی ذہن ہونے کے باوجود آپ کو ادب سے بھی کافی دلچسپی ہے جس کا سلسلہ آج کل صرف مطالعہ کے ذریعہ استوار ہے ورنہ ایک معالج کی مصروفیت اس کی اجازت کہاں دیتی ہے کہ بزرگوار زندگی کی رنگینی و رعنائی سے حظ اٹھا سکے۔ پھر بھی ڈاکٹر ضیار بن رضا کا یہ کمال ہے کہ یا یوں کہئے کہ ان کے والد کی تربیت کا فیض ہے کہ وہ شاعر و ادیب سے محبت رکھتے ہیں اور ان کے قدرداں ہیں۔ کالج میگزین میں ڈاکٹر صاحب کے سائنٹفک مضامین بھی اکثر چھپتے رہے ہیں ۱ وغیرہ میں آپ نے مقابلے کے مضامین میں حصہ لیا اور اوّل آئے۔ زولوجیکل سوسائٹی اور کلینیکل سوسائٹی ۱

غلام قادر

ولدیت ... جناب معشوق علی صاحب مرحوم

وطن ... نرغہ - ڈاکخانہ چمپا نگر۔ بھاگل پور

ابتدائی تعلیم بھاگل پور سے حاصل کرنے کے بعد پٹنہ پرنس آف ویلیز میڈیکل کالج سے ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر غلام قادر نے ایم، بی اس کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۱ء سے ناتھ نگر میں آپ پریکٹس کرتے ہیں۔ شجاع گنج کا مشہور سلک اسٹور جو ۱۹۵۷ء کے دسمبر میں لٹ گیا تھا۔ آپ کا ہی تھا۔ آپ کے ساتھیوں میں ڈاکٹر سعادالله، ظفر حمید فی ایک اچھے شاعر ہیں۔ آپ کو کتب بینی سے شوق ہے۔ اور زمانہ طالب علمی میں اسپورٹس سے بھی دلچسپی تھی۔

محمد عبدالسلیم

پتہ ... مغربی مجاہد پور - بھاگل پور ۲

جناب محمد عبدالسلیم بھاگل پور کے اچھے وکیلوں میں سے

ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۰ جون ۱۹۲۰ء کی ہے۔ آپ نے ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۴۴ء میں بی۔ ایل۔ ہوش سنبھالتے ہی آپ نے آزادی کی جنگ میں حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کانگریس سے علیحدہ ہوئے اور رفتہ رفتہ سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں جب "بزم سخن" قائم کی گئی تو آپ اس کے اولین صدر منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر ۱۹۵۳ء تک رہے، آپ کو اللہ تعالےٰ نے صالح طبیعت عطا کی ہے۔ اپنے حسن اخلاق سے لوگوں کے دلوں کو بہت جلد جیت لیتے ہیں۔ آپ شہر کے مشہور شاعر جناب کریم اسدی کے چھوٹے بھائی ہیں

مولانا عبدالواسع صدیقی

ولدیت .... مولوی محی الدین عبدالمنعم صدیقی مرحوم

پتہ .... قاضی دائرہ ــ پورینی ضلع بھاگلپور

عمر .... ۷۰ سال

مولانا عبدالواسع صدیقی ایک شعلہ بیان مقرر اور معجز رقم ادیب ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے کچھ شائع ہو چکی ہیں اور کچھ قلمی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں میں نعرۂ تکبیر۔ ندائے مسلم۔ بزرگان ہی اردو۔ فلسفۂ اساس اسلام اور مناقب شعبہ ہیں اور مکارب اخلاق نیز وظائف فردوسیہ زیر طبع ہیں۔ آپ نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں مثلاً "عربی سوار" جو تین مرتبہ شائع ہوا۔ ایک فلمی ڈرامہ بھی آپ نے لکھا ہے جو ۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں فلمایا گیا۔ ڈرامہ "مزدور" ریڈیو کلکتہ سے نشر ہوا۔

آپ کا ایک خاص انداز فکر اور مکتب خیال ہے جس سے ممکن ہے کچھ لوگ مطمئن نہ ہوں مگر مولانا کے خلوص کا اعتراف نہ کرنا گناہ عظیم ہوگا۔

محمد حبیب

ولدیت ...... حاجی محمد صدیق مرحوم

سال پیدائش ۱۹۲۹ء

پتہ .... حسین پور ــــ بھاگلپور ۲

حبیب صاحب نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار کی طرف رجوع کیا اور آج کل آپ اللہ کے فضل سے ایک اچھے تاجر ہیں۔ مذہبی اور سماجی امور میں نہایت خلوص کے ساتھ حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اپنے محلہ کے پنچایت کے سردار بھی ہیں۔

جناب حبیب صاحب سے ملنے کے بعد کوئی بھی شخص موصوف سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہت کم لوگ آپ جیسے خلیق ہوں گے، ملت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے موصوف کا دل بیتاب رہتا ہے اور ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد حسین

ولدیت ...... مولوی محمد صبیر بخش مرحوم

پتہ .... ایسٹ کوتوالی ــــ بھاگلپور ۲

تاریخ پیدائش .... ۲۸ فروری ۱۹۰۸ء

ڈاکٹر احمد حسین صاحب شہر کے ایک مشہور و معروف معالج ہیں۔ آپ نے ۱۹۳۳ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا اور دلی یونیورسٹی سے ۱۹۵۱ء میں پوسٹ گریجویٹ اور ڈی۔ ٹی۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء سے بھاگلپور میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ صدر ہسپتال بھاگلپور میں ٹی۔ بی کلینک کے اعزازی میڈیکل افسر عرصہ تک رہے ہیں۔ ٹی۔ بی کے اسپیشلسٹ ہیں۔ آپ سے فرصت کے اوقات میں ملنے اور گفتگو کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کے یہ ستم ظریفی ہے جو ڈاکٹر صاحب موصوف ادب سے دور ہوتے گئے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فطری رجحان ادب کی طرف ایسا ہے کہ اگر میڈیکل سائنس کی طرف آپ کا ایسا رجوع کرنا نہ ہوتا تو اردو زبان کو ایک اچھا ادیب مل جاتا۔ آج بھی موقع ملتا ہے تو ادبی محفلوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ قدیم بزم سخن کے آپ روز اول ہی سے معاون ہیں۔

محمد سعید انصاری

ولدیت .... حاجی بیزو مرحوم

وطن .... قاضی ولی چک ــ بھاگلپور

تاریخ پیدائش ۱۹۲۰ء

سعید صاحب خوش مزاج اور ہمیشہ مسکراتے رہنے والے انسان ہیں آپ کی تعلیم دینی درسگاہ میں ہوئی ہے جس کے اثر کی جلوہ گری نمایاں ہے آپ کے والد بزرگوار حاجی ننو مرحوم اچھے تاجر تھے ناتھ نگر سلک اسٹور کے نام سے بھاگلپوری سلک کے کپڑوں کی دکان شجاع گنج میں آپ کی تھی اور ایک جوتے کی بھی۔ یہ دونوں دکانیں سنہ ۱۹۴۶ء تک فروغ پر تھیں لیکن سنہ ۱۹۴۶ء کے ہنگامہ نے دوکان کے کل اثاثہ کو برباد کر دیا سنہ ۱۹۵۳ء میں حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ سعید صاحب نے کاروباری ذہن وراثتاً پایا تھا، آپ نے تاتار پور مارکٹ میں اپنا کاروبار شروع کیا اور آپ آج ایک کامیاب تاجر ہیں۔ تجارت کے سلسلہ میں ہندستان کے مختلف شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اس لئے تجربہ اور مشاہدہ نے آپ کو سنجیدہ بنا دیا ہے۔

سعید صاحب کے حسن اخلاق اور برتاؤ سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی شخصیت میں جاذبیت اور گفتگو میں نرمی ہے، آپ ثقافتی اور ادبی تحریکوں سے آپ برابر وابستہ رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ایک شاندار مشاعرہ بزم سخن بھاگلپور کے تعاون سے آپ کے دولت کدہ پر ہی منعقد ہوا تھا جس کی یاد ان لوگوں کے ذہن و دل کو آج بھی تر و تازہ کئے ہوئے ہیں جو اس مشاعرہ میں شریک تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنا اور ادبی اداروں سے تعاون کرنا آپ کا شیوہ تھا۔

محمد مشیر احمد

ولدیت ...... جناب محمد حسین مرحوم

سن پیدائش ... ۱۹۵۹ء بمقام رسولی ضلع بارہ بنکی ریو۔ پی ا

موجودہ پتہ ...... دہلی ٹائرس، لوبسی روڈ ـــ بھاگل پور نمبر ۲

مرحوم رفیع احمد قدوائی سابق وزیر خوراک حکومت ہند کے ہم وطن محمد مشیر احمد صاحب ایک نیک دل اور شریف النفس انسان ہیں۔ ایام طفلی ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانی مرحومہ نے پرورش پرداخت، تعلیم اور تربیت نہایت دل سوزی اور جانفشانی سے کی۔ موصوفہ زمیندار خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لئے مشیر صاحب کی پرورش اچھے ڈھنگ سے ہوتی رہی۔ مشیر صاحب نے ہوش سنبھالتے ہی پہلی اور

دوسری جنگ عظیم کی ہلاکت آفرینی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ملکی تحریکات آزادی کی ابھرتی ہوئی جد وجہد سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ "کاکوری ڈکیتی کیس" اور مولانا اشفاق اللہ شہید رحمتہ اللہ علیہ کی تحریکات سے آپ کے ذہن اور دل پر کافی اثر پڑا۔ خلافت تحریک اور کانگریس سے دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ تشریف لے گئے جہاں سنہ ۱۹۴۰ء تک قائم رہے۔ علامہ اثر لکھنوی، ڈاکٹر حرم حمید صدیقی مرحوم، سلطان المدارس مولانا عارف لکھنوی سے آپ کی راہ و رسم تھی۔ بارہ بنکی میں تاباں بارہ بنکوی۔ عزیز بارہ بنکوی۔ ڈاکٹر مقصود بارہ بنکوی اور خمار بارہ بنکوی سے آپ کی ملاقاتیں اور روزانہ کا ملنا جلنا تھا۔ کچھ دن بھوپال میں بھی آپ کا قیام رہا ہے جہاں عرشی بھوپالی، فرشی بھوپالی شفا گوالیاری مرحوم جیسے شعراء سے آپ کے تعلقات تھے۔

محمد حمید انجم

ولدیت ...... محمد رحیم بخش صاحب مرحوم

تاریخ پیدائش ... ۱۸ر اگست سنہ ۱۹۳۵ء

وطن ... محلہ سرائے بھاگلپور

پتہ .... بہار نیٹس اینڈ کلر کمپنی، تاتار پور۔ بھاگل پور

سنہ ۱۹۵۳ء کے بعد ابھرنے والے نوجوانوں کا بھاگل پور میں ایک فعال کارواں جو تیار ہوا تھا اس نے اپنے چاروں طرف انواع واقسام کے ملی مسائل کو کسی کے الجھے ہوئے گیسو کی طرح دیکھ کر اپنے تجربات اور مشاہدات کا ہاتھوں میں شانہ لئے آگے بڑھا اور تاریخ ساز ادارے کی تشکیل کی جس کا نام یوتھ ایسوسی ایشن تھا، اس ایسوسی ایشن کا رہنما شمس الزماں جیسی شخصیت تھی جو ایک سرگرم نوجوان ہیں اور آج بھی اپنے اس جولانی طبع کا جوہر عروس البلاد کلکتہ میں دکھلا رہے ہیں ان کے دست و بازو جہاں محمود واحد اور شاہین غازی پوری جیسے اچھے شاعر و ادیب تھے وہاں اس کارواں کے اہم رکن جناب حمید انجم بھی تھے۔ یوتھ ایسوسی ایشن نے جہاں مادری زبان حفاظتی تحریک میں اپنی جد وجہد سے جان ڈالی اور ہمیشہ انجمن ترقی شاخ بھاگلپور کے ساتھ

تعاون کیا وہیں ادبی محاذ پر نوجوان کے اس ادارہ نے قدیم بزم سخن سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس ایسوسی ایشن کی اپنی خصوصی ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں جس میں شاعر و ادیب حصہ لیتے تھے اور اہل علم تنقید اور تبصرہ سے فنکاروں کے فن کو جلا بخشتے تھے جمیدا نجم کی تعمیری تنقید سے نومشقوں نے کافی استفادہ کیا تھا۔ اس وقت بھی یہ لکھنے پر آمادہ نہ تھے اور آج بھی وہی کیفیت ہے قدرت نے حمید صاحب کو شاید تنقیدی ذہن عطا کیا ہے، تخلیقی نہیں ہے۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ ۱۹۵۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۲ء تک ختم ہوا جس کے بعد راج ٹرانسپورٹ کے ٹیکنیکل صیغے میں ملازم ہو گئے۔

محمد احمد حسن

ولدیت............جناب حاجی لعل محمد صاحب مرحوم

وطن.........قلب گنج۔ نزد مرجان ہاٹ۔ بھاگلپور

عمر.........پچاس سال

ماسٹر محمد احمد حسن صاحب ۱۹۴۶ء کے بعد محلہ نیا ٹولہ اساتذپور بھاگلپور میں آباد ہیں، نہایت مخیر اور خلیق انسان ہیں۔ غرباء کی امداد اس طرح کرتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہ ہو۔ آپکے دولت کدہ اساتذ پور میں بزم سخن کے زیر اہتمام مشاعرے ہوئے ہیں جس میں ماسٹر صاحب نے دامے درمے اور قدمے لیکن سخنے نہیں حصہ لیا ہے۔ اب ایسے اچھے لوگ ہمارے سماج سے مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالاحد صاحب

تاریخ پیدائش..... ۱۹۰۲ء

وطن.........قصبہ دیاواں ضلع پٹنہ

موجودہ پتہ.......لاجپک ۔ بھاگلپور

پٹنہ ضلع کا قصبہ دیاواں ایک ایسا مرکز علم و فضل رہا ہے۔ جہاں کے علماء، صلحاء، مفسرین اور محدثین دنیائے اسلام میں معروف ہیں وہیں کہ حضرت مولانا شمس الحق ؒ نے شرح ابی داؤد لکھی تھی۔ دنیا کے اسلام کے علماء اس قصبہ میں کھنچے کھنچے کر آیا کرتے تھے۔ یہاں کے علماء کو شاہ سعود والی حجاز نے بھی اپنی عنائیتوں سے نوازا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی یہاں کثیر تھا جس کا ملک کے دانشوروں میں شمار ہوتا تھا اسی قصبہ میں پروفیسر عبدالاحد صاحب ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے آپ نے ۱۹۲۸ء میں فارسی میں اور ۱۹۲۹ء میں اردو میں ایم۔ اے کیا اور پہلے آر۔ ڈی۔ ڈی جے کالج مونگیر میں لکچرر ہوئے پھر ۱۹۳۷ء میں ٹی۔ این۔ بی کالج میں آئے۔ پہلے صدر شعبۂ فارسی تھے موجودہ صدر شعبۂ فارسی پروفیسر صدرالدین آپ کے اسسٹنٹ تھے جب اردو شعبہ کھلا تو احد صاحب صدر شعبۂ اردو ہو گئے۔ شری ہنسیوری پرشاد کے بعد آپ کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آج کل آپ منڈار دو دیا پیٹھ میں پرنسپل ہیں۔ پروفیسر صاحب نے جو اردو کی خدمت کی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

محمد ابوسعید خان

جناب محمد ابوسعید خان صاحب شہر کے نہایت تجربہ کار وکیل ہیں اور سماجی نیز ملی خدمت میں ایام شباب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ابھی تک وہی حال ہے۔ آپ کا ادبی ذوق نہایت ستھرا ہے۔ وکالت کی مصروفیت کے باوجود ۱۹۵۵ء تک موصوف اپنے دولت کدہ پر شعر و سخن کی مجلسیں ذوق و شوق کیسا تھ آراستہ کرنے میں دلچسپی لیتے تھے۔ ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ خود بھی ادبی ذہن رکھتے ہیں۔ آپ کی بحث کو سن کر اور مسودات کو دیکھ کر اکثر کچہری کے حکام یہ کہتے ہیں کہ وکیل صاحب آپ کو تو ادب کی دنیا میں اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ بڑے خوش مزاج انسان ہیں باتیں کرتے ہیں تو فطری طور پر ایک خاص ادا سے آپ مسکراتے رہتے ہیں۔ جس سے مخاطب بہت متاثر ہوتا ہے۔ شاید یہی راز ہے وکالت میں آپ کی کامیابی کا ــــ

محمد نعمان خان

دوسرے بھائی جناب نعمان خاں صاحب کا مطالعہ نہایت

وسیع ہے۔ تجربہ ایسا ہے کہ ان کے رفقار کار ان سے بہت فیض یاب ہوتے رہتے ہیں گفتگو کا انداز دل موہ لینے والا ہے۔ اپنے احباب کے حلقہ میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ریلوے کے ایک تجربہ کار پختہ ذہن کارکن ہیں۔ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت موصوف نے نہایت شغف سے کیا ہے بات بات پر ایسے نادر اشعار سناتے ہیں کہ بس لطف آجاتا ہے۔ آپ اپنے خسر جناب عبدالمجید مرحوم سے بہت متاثر ہیں جو اپنے وقت کے بڑے ذکی علم صاحب فہم، خوش طبع اور وضعدار انسان تھے۔ مرحوم کو مطالعہ کا بے انتہا ذوق تھا۔ آج بھی ان کے نجی لائبریری میں نادر کتابیں اور ماضی کے اخبارات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ خصوصاً " البلاغ " اور " الہلال " کا پورا سیٹ قابل ذکر ہے۔ نعمان صاحب کے خسر جناب عبدالمجید مرحوم ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ آپ کا تذکرہ انگریزی کی ایک کتاب میں بنام " مشلہ میر شہد " میں موجود ہے۔

محمد اسرائیل احمد

ولدیت ...... جناب شیخ علی احمد مرحوم
وطن .... بجلی چک (تاتارپور) بھاگلپور
تاریخ پیدائش ... ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء

جناب اسرائیل احمد کا خانوادہ سوداگر برادران سے مشہور تھا۔ پہلے شجاع گنج میں موصوف کے خاندان کی خاصی تعداد تھی۔ آپ کے ماموں جناب شیخ اسداللہ سوداگر اور شیخ مسیح اللہ سوداگر بڑے اچھے تاجر تھے۔

محمد اسرائیل احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت موصوف کے دادا مرحوم نے کی پھر آپ نے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی اور اپنے والد مرحوم کے کاروبار کو سنبھالنے کیلئے مجبور ہو گئے اور اعلیٰ تعلیم کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ آج آپ ایک تجربہ کار تاجر ہیں اور اس ضمن میں شہر کے معاشرے میں ایک بلند مقام کے مالک اور آپ ہیں۔ موصوف پابند صوم و صلوٰۃ اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ بغیر ضرورت تعلقات

نہیں بڑھاتے۔ آپ کے تین صاحبزادے، محمد جلیل احمد، محمد خلیل احمد، اور محمد شکیل احمد۔ نہایت لائق و فائق ہیں۔ آپ کی بچی کی شادی جناب عزیز الرحمان صاحب سے ہوئی جو باٹا کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔

حضرت مولانا محمد رشید صاحب مدظلہ

ولدیت ... جناب منشی محمد وحید مرحوم

فاضل دیوبند حضرت شیخ الہند مولانا محمد الحییٰ کے شاگرد اور مرید ہیں۔ گورنمنٹ ہائی اسکول امراوتی (برار) موجودہ مہاراشٹر میں عربک ٹیچر تھے جہاں سے ہنوز پنشن مل رہی ہے۔ آج کل مدرسہ محمودیہ جھریا میں مدرس ہیں۔ آپ نے برما اور ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی ہے۔ علم و دانش میں قصبہ پوینی میں آپ کی مثال اب کوئی نہیں ہے۔

مولانا محمد احمد صاحب

حضرت مولانا محمد سہول کے خلف ارشد ہیں۔ آپ بھی فاضل دیوبند ہیں نہایت پاک باز پاک طینت متقی پرہیزگار انسان ہیں

جناب محمد مسرور احمد عثمانی

آپ مولانا محمد احمد صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ سیرت و کردار میں اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ علم و ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود احمد

آپ حضرت مولانا رشید احمد کے صاحبزادہ ہیں، آپ کا مطلب اس قصبہ کیلئے پیام صحت ہے۔ اخبار و رسائل اور کتب بینی سے ڈاکٹر صاحب کو بہت دلچسپی ہے۔ آپ کی لائبریری سے گاؤں کا ہر شخص استفادہ کرتا ہے۔

حضرت مولانا تفضل حسین

نہایت دیندار متقی پرہیزگار عالم باعمل ہیں اور علم کی اشاعت میں ہمہ دم مصروف رہتے ہیں

حضرت حافظ محمد اسرائیل

بھاگلپور کمشنری کے بہترین حافظوں میں سے ہیں۔ شریف دل اور سنجیدہ انسانوں میں ہیں۔ آپ مومن ٹولہ کی مسجد میں خطیب ہیں اور بچوں کو قرآن حکیم پڑھاتے ہیں۔

جناب نثار احمد

پورینی مڈل اسکول کی مجلس انتظامیہ کے سکریٹری ہیں۔ آپ نے اسکول کی عمارت کو تکمیل کی منزل تک پہنچانے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے۔

شرف الدین خاں

ولدیت .... جناب صدیق حسن خاں مرحوم
تاریخ پیدائش .... یکم فروری ۱۹۲۲ء
آبائی وطن ...... قصبہ باڑھ ضلع پٹنہ
موجودہ پتہ .... جنوبی ریلوے کالونی ۔ بھاگلپور

جناب شرف الدین خاں صاحب کے جد امجد جناب مولوی حکیم ولایت حسین خاں صاحب محلہ نواب گنج بارہ بنکی (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ حکیم صاحب موصوف نے لکھنؤ میں تعلیم پائی اور عظیم آباد ہوتے ہوئے قصبہ باڑھ ضلع پٹنہ طبابت شروع کی اور یہیں بود و باش اختیار کرلی۔ آپ اپنے وقت کے نامی گرامی حکیم حاذق تھے قصبہ باڑھ کا تعلق بھاگلپور سے دیرینہ ہے۔ شاہ صاحبان کا ایک خاندان یہاں آباد ہے۔ یہ وہ خاندان ہے جس کا تعلق آلِ حضرت پیر دمڑیا شاہ سے ہے۔ اسی خانوادہ کے ایک رئیس نواب سید شاہ واجد حسین صاحب (نواب خسرو پور) تھے۔ قصبہ باڑھ کو یوں بھی ایک خصوصیت حاصل ہے کہ اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب امین الدین یہیں کے باشندہ تھے۔ موصوف نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بہت سارے شرفائے عظیم آباد کو اپنے اثر و رسوخ سے پھانسی کے تختہ سے بچا لیا تھا۔

جناب شرف الدین خاں صاحب نے باڑھ اور پٹنہ میں تعلیم مکمل کی جس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ایسٹرن ریلوے کی ملازمت بھی اختیار کرلی۔ بڑے ادب دوست شاعر نواز اور اردو کے خادموں میں سے ہیں۔ قدیم بزم سخن سے آپ کا دیرینہ تعلق ہے۔

بابو پنجاب رائے سنگھ

ولدیت .... شری جوالا سنگھ
تاریخ پیدائش ۱۸۹۹ء
وطن .... ٹانڈا ضلع ہشیارپور
موجودہ پتہ .... محلہ تلکا مانجھی بھاگلپور
مستقل پتہ .... فتحپور ڈاکخانہ عمرپور ضلع بھاگلپور

درس گاہوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ ہزاروں برس کے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ کمسن طلبا ان کتابوں کو پڑھ تو لیتے ہیں لیکن ان نکات کو ایک عمر گذر جانے کے بعد سمجھ پاتے ہیں اگر یہ حقیقت ہے تو ایک سن رسیدہ انسان کی زندگی بھی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ آسمان اور زمین کے درمیان جو چیزیں موجود ہیں اس کا مشاہدہ اور تجربہ مدت دراز تک کرتے رہنے کے بعد عقل پختہ اور سمجھ ٹھوس ہو جاتی ہے آج بابو پنجاب رائے سنگھ عمر کی جس منزل میں ہیں بلاشبہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ موصوف ایک پختہ کار زیرک اور ذی فہم انسان ہیں۔

بابو پنجاب رائے صاحب سے شعرائے بھاگلپور ۱۹۶۵ء کے ایک مشاعرے میں متعارف ہوئے جو موصوف کے مکان واقع فتحپور عمرپور پر واقع ہوا تھا۔ اس باغ و بہار انسان سے ملتے ہی ہر شاعر محظوظ ہوا آپ کی گفتار، کردار، نشست و برخاست اور بزرگانہ شفقت ایسے اوصاف ہیں جس سے متاثر ہونا ہی پڑتا ہے۔

پنجاب کے کھاتے پیتے متوسط طبقہ کے لوگ میں بابو پنجاب رائے ایک فرد تھے۔ آپ کا خاندان ذی علم اور صاحب جائیداد تھا۔ گاؤں کے اسکول میں آپ زیر تعلیم تھے اسی دوران غدر پارٹی کی تحریک پنجاب میں چلی جس میں آپ نے بھی حصہ لیا۔ بچے تھے ظاہر ہے کچھ اور نہیں کر سکتے تھے صرف انقلابیوں کے خطوط ادھر سے ادھر پہنچایا کرتے تھے۔ یہ راز جب کھلا تو اسکول سے الگ کر دیئے گئے۔ وہ دور انگریز کے تسلط کا دور تھا اس وقت کوئی شخص حکومت کے خلاف سانس تک نہیں لے سکتا تھا خود اپنے ملک کے کچھ لوگ ایسے تھے جو حکومت وقت کے ایجنٹ تھے ایک مرتبہ کچھ یوں ہی سی بات بابو پنجاب رائے نے حکومت کے خلاف کی جس کی خبر پولیس تک پہنچ گئی۔ آپ گرفتار ہوئے تین دن تک پولیس نے مار پیٹ کی، گاؤں کے ذیل دار جناب عطا محمد خاں نے پولیس سے سفارش کی مگر دارو غہ رہا کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ ذیل دار صاحب کو تاؤ آیا اور آخر کار لاہور تک کوشش کرنے کے بعد بابو پنجاب رائے کو انہوں نے رہا کرا ہی لیا۔

بابو پنجاب رائے کو آزادی کی تحریک سے دلچسپی تھی لیکن گھر کے حالات نے آپ کو روزی کی تلاش پر مجبور کیا اس سلسلہ میں تین سال کا معاہدہ کر کے آپ عراق ریلوے میں ڈرائیور بحال ہو کر گئے۔ جب آپ عراق میں تھے پنجاب میں پہلے جالیان والا باغ کا دلدوز واقعہ ظہور میں آیا جس کے فوراً بعد ننکانا صاحب کا خونریز واقعہ ہوا ان خبروں کو سن بابو پنجاب رائے عراق میں پیچ و تاب کھانے لگے اور صرف ڈیڑھ سال ہی ملازمت کرنے کے بعد کسی صورت سے پنجاب آئے جہاں آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی، آپ پھر ایک مرتبہ کچھ دنوں کے لئے گرفتار ہو گئے رہا ہونے کے بعد بہار کے صحت افزا شہر رانچی میں آکر موصوف نے کاروبار شروع کیا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا مجبوراً ملازمت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے عمر پور کے ایک مارواڑی تاجر کا مل سنبھالنے کیلئے بھاگلپور آئے اور پھر مارواڑی کے اصرار پر کچھ دن اس کے یہاں ملازمت کر لی پھر اپنا آزادانہ کاروبار موصوف نے شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے تجارت اور زراعت دونوں میں فائدہ ہونے

لگا۔ عمر پور میں بابو پنجاب رائے سنگھ کی آمد اس قصبہ اور اس کے قرب و جوار کے لئے بھی نعمت ثابت ہوئی۔ آپ کی آمد سے پہلے یہاں کے لوگ کاشتکاری کا ترقی یافتہ ہنر نہیں جانتے تھے اور محنت و مشقت سے گریزاں رہتے تھے زیادہ تر زمین غیر آباد چھوڑ دیتے تھے لیکن بابو پنجاب رائے نے یہاں کے کاشتکاروں کو اپنے عمل سے ایسا درس دیا کہ آج عمر پور کے چپہ چپہ کی زمین آباد ہے اور یہ علاقہ اسوقت بھی قحط کا شکار نہ ہوا جب سارا بہار اس کی زد میں تھا۔ یہ ایک ایسا عملی کارنامہ ہے جسے آب زر سے لکھنا چاہیئے۔

آزادی کی تمنا اور اس کے حصول کے لئے بیچینی بابو پنجاب رائے سنگھ کے رگ رگ پے میں ایام طفلی سے سرایت کر گئی تھی۔ اس لئے ۱۹۴۲ء کی جب تحریک شروع ہوئی اور انگریزوں سے انتقامی جذبہ جب کارفرما ہوا تو پنجاب رائے جیسا کانگریسی اس کی زد سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ موصوف کو انگریزوں نے گرفتار کر کے بانکا بھیج دیا جہاں سے وہ بھاگلپور سنٹرل جیل لے جائے گئے۔ انگریزی فوج نے مکانات کو جلانا اور سامان کو لوٹنا شروع کیا آپ کے بھی گھر کا سارا سامان لوٹ لیا گیا، گھر کو انگریزی فوج جلانے ہی والے تھے کہ بانکا سب ڈویژن کے ایس۔ ڈی۔ او کی حکمت عملی سے ایسا نہ ہوا۔ ایس۔ ڈی۔ او صاحب سے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے ورنہ ان کا گھر بھی جلا دیا جاتا۔ دو ماہ تک موصوف جیل میں رہے اور ان رشتہ داروں کی جد و جہد سے رہا ہوئے جو ملیٹری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ آپ کے ایک جگری دوست جو عمر پور کے قرب و جوار کے رہنے والے تھے اور راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے یہ بھی اپنے سارے کنبہ کے گرفتار ہوئے تھے ان پر بائیس ۲۲ مقدمات تھے جنہیں ہزاروں روپے خرچ کر کے بابو پنجاب رائے سنگھ نے لڑا اور کامیاب ہوئے۔ آپ کے دوست کا نام آنجہانی شری گر نارائن سنگھ تھا۔

بابو پنجاب رائے سنگھ کی پوری زندگی مسلسل جد و جہد کی درخشاں تاریخ ہے زندگی کے نشیب و فراز اور سرد و گرم سے

آپ نے کافی سبق حاصل کیا ہے مسلک صلح کل رکھتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے دل اچاٹ سا ہے ویسے وہ ہر مذہب کا احترام کرتے ہیں۔ ہندو مسلم سکھ، عیسائی کی تفریق کو وہ پسند نہیں کرتے سب کو انسانی برادری کا رکن سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے سیرت و کردار سے بہت متاثر معلوم پڑتے ہیں۔

آپ کے تین صاحبزادے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ شری سریندر سنگھ مل کا نظم سنبھالے ہوئے ہیں۔ شری دیویندر کاروبار سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور سب سے چھوٹے کنٹریکٹر ہیں۔ آپ کی دو صاحبزادیاں ہیں ایک ڈاکٹر ہیں پٹنہ میں پریکٹس کرتی ہیں موصوفہ کا نام ڈاکٹر دیونتلا سنگھ ہے۔ آپ کی شادی شری رنجیت سنگھ سے ہوئی ہے جو کلیان پور لائم اینڈ سمینٹ ورکس میں پروڈکشن منیجر ہیں۔ دوسری صاحبزادی شریمتی شکنتلا سنگھ ہے جن کا تعارف اس نمبر کے کسی صفحہ پر آپ کو ملے گا۔

بابو پنجاب رائے سنگھ نے آج جو قابل رشک مقام حاصل کیا ہے اس میں ان کی اخلاقی جرأت کا بہت بڑا دخل ہے۔ آپ نو عمری ہی سے بڑے اولو العزم اور نڈر رہے تھے۔ نوجوانی میں اپنے ایک برہمن رفیق کار کے ساتھ آدھی رات گئے کہیں جا رہے تھے راستے میں ایک مردہ گھٹی ملی جہاں کوئی لاش جل رہی تھی اور ایک عورت سراپا برہنہ آگ کے گرد چکر کاٹ رہی تھی موصوف کا رفیق کار چڑیل سمجھ کر ڈر گیا اس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے لیکن خود پنجاب رائے صاحب بے خطر وہاں تک پہنچ گئے اس عورت نے ان کا گلا پکڑ کر دبانا چاہا مگر یہ ان کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گئے بعد کو معلوم ہوا کہ یہ عورت جوگ کرنے کیلئے ایسا کر رہی تھی۔ اس کا رکھوالا کہیں دور کسی جھاڑی میں چھپا ہوا تھا اس نے پنجاب رائے صاحب سے معافی مانگی آپ کا برہمن رفیق بھی منہ چھپائے آگیا۔

اسی طرح سمندری جہاز سے جب آپ عراق جا رہے تھے تو سمندر میں جہاز بری طرح ہلکورے کھانے لگا۔ کپتان نے ہر مسافر کو ہشیار کیا اور ہر مسافر کو حفاظتی فیتہ دیا اور ہدایت کی کہ تیسری سیٹی بجتے ہی سب لوگ سمندر میں کود جائیں۔ موت کا نقشہ ہر مسافر کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہر شخص خوف سے کانپ رہا تھا ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ تو بری طرح پریشان تھے مگر ایسے وقت بھی پنجاب رائے سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی وہ ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے رہے۔ ان کا بیان ہے کہ پہلے کچھ عجیب سی کیفیت دل کی ہوئی مگر فوراً میں نے خود پر قابو پالیا۔ آپ کے ہنسی مذاق سے ادھیڑ عمر کے بزرگ نے خفگی کا اظہار کیا لوگوں نے کپتان سے بھی شکایت کی جس نے بےساختہ کہا زندگی میں دو لمحات بھی مل جائیں تو ہم انہیں ہنس کر گذارنا چاہیئے آہ و زاری کا حاصل کچھ نہیں ہے موت اپنے وقت پر آئے گی یہ لڑکا زندگی سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے۔ آپ لوگ اتنے خفا کیوں ہیں، خطرہ تو ٹل گیا لیکن ایسے وقت میں بابو پنجاب سنگھ کا جرأت آفریں کردار جو رونما ہوا ہے وہ موصوف کی گوناگوں کامیابیوں کے لئے سنگ میل ثابت ہوا۔

سردار دلوارا سنگھ

ولدیت .... جیون سنگھ آنجہانی

عمر .... ۴۹ برس

آبائی وطن ...... موضع رشیانہ تحصیل جگراؤں تھانہ رائکوٹ لدھیانہ

موجودہ پتہ ...... مجاہد پور — بھاگلپور ۲

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایک ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں ہمہ وقت مصروف رہتا ہے اس کی توجہ بزم شعر و سخن کی طرف بھی وقتاً فوقتاً منعطف ہو جائے۔ زندگی کی رنگینی و رعنائی صرف مال و دولت سے عبارت نہیں ہے۔ کوئی ہزار سونے کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا کیوں نہ ہو مگر اسے سکون اسی وقت حاصل ہوگا جب وہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کی سعی کریگا اور زندگی کی جلوہ گری جتنی ادبی ماحول میں پائی جاتی ہے وہ اور کہیں نصیب نہیں ویسے تو مشغل جام و مینا سے بھی کچھ دیر کے لئے سکون مل سکتا ہے مگر اس کا ردعمل جتنا تباہ کن ہوتا ہے وہ تو اظہر من الشمس ہے۔

سردار دلوارا سنگھ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس کی تمام وقت کی معروفیت پر رحم آتا ہے لیکن سردار صاحب تھوڑا سا وقت سکون سے گذارنے کے لئے نکال لیتے ہیں۔ یہ شاید ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب شعرا بھاگل پور سردار موصوف سے متعارف ہوئے۔ رئیس فتحپور عمرپور بابو بنجاب رائے سنگھ کے دولتکدہ پر ایک عظیم الشان مشاعرے کا تظم تھا۔ شعرا بھاگل پور مدعو تھے۔ سردار دلوارا سنگھ نے شعرا کو عمرپور تک پہنچانے اور واپس لے آنے کیلئے نہ صرف اپنی بس وقف کردی بلکہ خود بھی شعر و سخن سے حظ اٹھانے کیلئے شعرا کے ساتھ عمرپور تشریف لے گئے۔

سردار دلوارا سنگھ کا تعلق بھاگلپور سے کاروبار کے سلسلے میں ہے۔ آپ کی ہر دلعزیزی کا ثبوت یہ ہے کہ موصوف بھاگلپور گردوارہ پربندھک کمیٹی کے کئی برسوں سے صدر ہیں اور شہر کی مختلف سوسائٹی سے آپ کا تعلق ہے۔ قدیم بزم سخن سے بھی آپ تعاون کرتے ہیں۔

آپ کی زندگی کا آغاز کلکتہ سے ہوا جہاں بچپنے میں اپنے وطن سے سردار صاحب اپنے چچا چنن سنگھ کے پاس آئے آپ کے بڑے بھائی سردار سرون سنگھ پہلے ہی سے کلکتہ میں موجود تھے۔ سردار صاحب نے کلکتہ نیشنل اسکول ۱۰۱ ہریش مکرجی روڈ میں تعلیم پائی ہے۔ آپ کے استاد سردار گروپ سنگھ اردو کے اس اسکول میں استاد تھے جنہوں نے بڑی لگن کے ساتھ سردار صاحب کی تعلیم میں دلچسپی لی تعلیم کے بعد سردار صاحب نے بڑی دلچسپی کے ساتھ ٹرانسپورٹ کا کاروبار پندرہ سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک کلکتہ میں کیا تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ آئے جہاں اپنا ہی کاروبار شروع کی سنہ ۱۹۵۸ء کے مارچ میں بھاگلپور آکر ٹرانسپورٹ ہی کا کام کرنے لگے اس طرح آپ کا کاروبار کلکتہ۔ دمکا۔ پٹنہ۔ پورنیہ تک پھیلا ہے۔

آزادی وطن کی تحریک جب چل رہی تھی تو مادر وطن کا سپوت کوئی ایسا نہ تھا جو اس سے دلچسپی نہ رکھتا ہو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سردار دلوارا سنگھ جیسا باعزم انسان الگ تھلگ رہتا آپ نے اس سلسلہ میں مقدور بھر حصہ لیا کلکتہ کے مشہور سیاسی رہنما شری نہارن دت موزدم دار اور بنیا جسی سوباس چندر بوس کی رہنمائی میں جو کچھ ہو سکتا تھا آپ نے کیا۔

سردار دلوارا سنگھ کا بیان ہے کہ بچپن میں انہوں نے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد کا جو خوشگوار منظر دیکھا تھا ایک بار پھر اس کے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فرقہ واریت کا زہر جو کہ آزادی سے پہلے انگریزوں کے اشارے پر پھیلایا گیا تھا فضا اس سے مسموم ہے گرچہ حالات روز بروز بدلتے جا رہے ہیں اور سردار صاحب کا خیال ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب یہ زہر ہندستان جنت نشان سے ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیگا دراصل وہی دن ہماری مسرتوں کا ہوگا اس کے بغیر وطن کی عزت و عظمت اور استحکام ناممکن ہے۔

سردار مہندر سنگھ گاندھی

ولدیت۔۔۔ سردار بدھ سنگھ گاندھی آنجہانی

سال پیدائش۔۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء بمقام تھالی ضلع راولپنڈی

پتہ۔۔۔۔ گرونانک آٹو موبائلس سجاع گنج۔ بھاگلپور ۲

داستانوں میں "آگ کا دریا" پار کرنے کا ذکر بار بار آیا ہے۔

لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے برصغیر ہند میں داستان کے اس جملے کو حقیقت کا لباس پہنا دیا بیشمار لوگ آگ کا دریا پار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ ادھر سے ادھر — ادھر سے ادھر کاروان در کاروان انسانوں کی ٹولی اپنا سب کچھ لٹا کر آگئی، اس عظیم حادثے کا شکار سردار مہندر سنگھ اور ان کے چھوٹے بھائی سردار امریک سنگھ بھی ہوئے۔ ان دونوں کے نام کا آخری حصہ گاندھی ہے اور سچ مچ اس نام کی لاج یہ دونوں بھائی رکھے ہوئے ہیں۔ ہنس مکھ چہرہ، خوش خلق اور ہر ملنے والے سے محبت کا برتاؤ کرنے والے یہ رام اور لکشمن ہیں۔ آج مصیبتوں کے دن گذارنے کے بعد آرام و آسائش سے ہمکنار ہیں۔ آپ کے والد جی باخالصہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز فسادات میں والدین، تین بھائی اور دو بہنیں ظلم کی تلوار کے شکار ہو گئے۔ یہ ایسا عظیم حادثہ تھا جس کی تاب بہت کم لوگ لا سکے ہیں۔ اور ان چند لوگوں میں یہ دونوں بھائی ہیں۔

آپ کے بڑے بھائی سردار بھلیل سنگھ جی سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے مقبوضہ کشمیر میں جنگلات کے ٹھیکیدار تھے۔ یہ جو ترک وطن کرنے پر حالات کے تقاضے کے تحت مجبور ہو گئے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ سردار بھلیل سنگھ جی نے امرتسر میں ان دونوں بھائیوں کو اپنے گلے سے لگایا اور بڑے بھائی کے طور پر ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ ان دونوں بھائیوں نے امرتسر خالصہ اسکول و کالج میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس وقت تک سردار بھلیل سنگھ جی رانچی میں اپنا ہی کاروبار شروع کر چکے تھے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ تجار کے حلقے میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں یہ دونوں بھائی رانچی اپنے بہنوئی سردار بھلیل سنگھ کے یہاں آئے پھر اسی سال بھاگلپور آکر اپنا کاروبار شروع کیا تو خدا نے بھی ان کی مدد کی آج ان کا کاروبار بھاگلپور کے علاوہ پٹنہ میں بھی ہے۔

اردو زبان کو سنہ ۱۹۴۷ء کے حادثے سے جو نقصان پہنچا ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا لیکن ساتھ ہی ساتھ مغربی پاکستان سے آنے والے لوگوں نے اردو کو وہ سہارا دیا جو بے مثال ہے، اور اس بات کی ضمانت ہے کہ اردو اپنی جائے پیدائش سے نکالی نہیں جا سکتی ہے۔ ایسی ہی باہمت اور باحوصلہ لوگوں میں سردار مہندر سنگھ گاندھی اور ان کے چھوٹے بھائی سردار امریک سنگھ گاندھی ہیں۔ جہاں یہ دونوں بھائی انگریزی، گورمکھی اور ہندی جانتے ہیں وہیں اردو زبان و ادب سے بھی واقف ہیں۔ اور خوب دلچسپی لیتے ہیں۔

سردار سنتوکھ سنگھ مرواہ

ولدیت .... آنجہانی سردار التیسر سنگھ

تاریخ پیدائش ..... ۱۹۱۶ء بمقام بسالی ضلع راولپنڈی

پتہ ... . للتا دیوی لین، خنجرپور، بھاگلپور

سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے راولپنڈی ہندوستان کا ایک مشہور جگہ تھا۔ آج بھی یہ شہر کی حیثیت سے مشہور ہے لیکن ہمارے ملک کا حصہ نہیں ہے۔ بہت سی خاندانوں کی طرح سردار سنتوکھ سنگھ مرواہ صاحب کا خاندان بھی ترک وطن کر کے ہندوستان چلا آیا۔ جناب مرواہ صاحب آج کل بھاگلپور میں مقیم ہیں جہاں آپ کے جوان بخت صاحبزادہ اور اردو کے خوش گلو شاعر سردار کلونت سنگھ جاگی موٹر پارٹس کا کام کرتے ہیں۔

سردار سنتوکھ سنگھ کی زندگی ایک ایسی داستان ہے جس میں جدوجہد محنت و مشقت اور جرأت کے نقوش قدم قدم پر ملتے ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم کے بعد سنہ ۱۹۳۰ء میں ملیٹری کی ملازمت اختیار کی۔ اس زمانے میں صرف انگریزوں کو اعلیٰ عہدے دیئے جاتے تھے لیکن آزادی وطن کی تحریک نے خیالات اور احساسات میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس کے زیر اثر ہندوستانی فوجی بھی اعلیٰ عہدوں کے مدعی ہونے لگے تھے اس خیال کے ہی پیش نظر اعلیٰ تعلیم کے لئے ملیٹری میں اسپیشل تعلیم دی جاتی تھی جو ایم۔ اے کی ڈگری کے برابر ہوتی تھی سنہ ۱۹۳۹ء میں سردار موصوف وارنٹ افسر کے عہدے پر مامور ہو گئے سنہ ۱۹۴۱ء برما کے محاذ پر تعینات کئے گئے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں بغداد فرنٹ پر گئے جہاں عراق میں تعینات ہندی نوجوں کو ٹریننگ دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں عراق سے راولپنڈی آئے جہاں ٹرانسپورٹ کا کاروبار شروع کیا۔ راولپنڈی سے بہار کے شہر دھنباد آئے جھریا کول فیلڈ کے نیشنل انڈسٹریز کول ٹرانسپورٹ راجہ گرام جریہ میں کام کرتے رہے۔ بوکارو کول فیلڈ میں آپ ٹرانسپورٹ سپروائزر ہوئے۔ پھر سندری فرٹیلائیزر فیکٹری میں ٹرانسپورٹ سپروائزر اور کنسٹرکشن انجینیر ہوئے۔ یہیں سے بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ وہیکل انسپکٹر کے عہدے پر بحال ہو کر دربھنگہ۔ بھاگلپور، مونگیر، مظفرپور، سارن، چمپارن وغیرہ میں کام کرتے رہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں اس ملازمت کو بھی خیرباد کر کے سنہ ۱۹۵۸ء تک پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے رہے پھر سنہ ۱۹۵۹ء میں آپ نے مرکزی حکومت کی ملازمت اختیار کر لی اس محکمے کا نام نیشنل پراجکٹس کارپوریشن تھا۔ سنہ ۱۹۶۵ء تک اسی کارپوریشن سے وابستہ رہے اور کوسی نیز ترسولی ہائیڈل پروجکٹس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء

سے مستقل طور پر بھاگلپور میں قیام پذیر ہیں۔

آپ اردو، فارسی زبانوں سے واقف ہیں اور ان کے ادب سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ کتب بینی کا بے حد شوق ہے۔

سردار بلونت سنگھ اہلووالیہ

ولدیت۔۔ سردار کرم سنگھ اہلووالیہ متوفی ریٹائرڈ ڈی۔ ایس۔ پی۔ ضلع بیگو (برما)۔

سال پیدائش۔ ۱۹۰۸ء

آبائی وطن۔ سیالکوٹ (پنجاب)

موجودہ پتہ۔۔۔ محلہ مہدی چک۔ بھاگلپور ۱

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے ہم وطن سردار بلونت سنگھ اہلووالیہ سادہ دل خوش مزاج اور ایک ایسے انسان ہیں جسکو کسی سے بیر نہیں محبت ان کا شیوہ اور اخلاق ان کی فطرت ہے اردو زبان سے ان کو والہانہ لگاؤ ہے شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں زندگی کی مصروفیات سے اگر کچھ وقت نکل جاتا ہے تو ادب کی بہار آفریں فضا میں سیر کرنے آجاتے ہیں۔ آپ کی جنم برما میں ہوئی تھی جہاں آپ کے والد ماجد آنجہانی سردار کرم سنگھ اہلووالیہ ڈی۔ ایس۔ پی تھے۔ اور آپ کا شمار برما میں ایک بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ اچھی خاصی جائداد سرکار کی طرف سے ملی تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ اہلووالیہ خاندان برما ہی میں تھا اور جنگ کے دوران گوناگوں مصائب سے دوچار ہوا تھا جس کا بیان نقطوں میں ناممکن ہے سنہ ۱۹۴۷ء میں برما کی حکومت نے ساری جائداد قومیالی جس کے بعد اہلووالیہ خاندان سنہ ۱۹۴۸ء میں بھاگلپور آیا جہاں از سر نو زندگی شروع کی۔ سردار بلونت سنگھ جی کی تعلیم میٹرک تک ہے آج کل آپ ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔ اور خوشحال زندگی کے زیر سایہ ہیں۔

زندگی کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار زیادہ تر مستقبل کی نسل کو بنانے اور سنوارنے میں ہے۔ اس لحاظ سے سردار بلونت سنگھ کی زندگی نہایت کامیاب ہے۔ آپ کے دو صاحبزادے۔ سردار پریتم سنگھ اور سردار سرن سنگھ جی بڑے لائق و فائق حلیم اور بردبار ہیں جن میں سردار سرن جیت سنگھ جی نے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان سی سی بہار کے افسر رہ چکے ہیں سنہ ۱۹۵۸ء میں ۲۶ جنوری کی پریڈ میں سرن جیت سنگھ جی نے بہار کی نمائندگی کی تھی۔ زمانہ طالب علمی کی زندگی بھی موصوف کی بڑی شاندار رہی ہے۔ آپ ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگلپور اکنامکس سوسائٹی کے سکریٹری، کومن روم جنرل کمیٹی کے صلاح کار اور لا کالج کے ڈرامہ اور فائن آرٹس سوسائٹی کے جنرل سکریٹری رہ چکے ہیں اس طرح سردار بلونت سنگھ اہلووالیہ کی کامیاب زندگی کا ثبوت ملتا ہے اور مستقبل کے نسل کے لئے ایک درس ملتا ہے گوناگوں مصائب کا سامنا مردانہ وار کرتے ہوئے بنتے اور بگڑتے ہوئے اس دنیا کی تھوڑی زندگی میں بے مثال کامیابی کی منزل تک پہنچنا یقیناً کارنمایاں ہے۔

مل سنگھ منگٹ جوگی

ولدیت۔ سردار صوبہ دار نرنجن سنگھ

تاریخ پیدائش۔۔۔ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء بمقام رامپور ضلع لدھیانہ

سردار مل سنگھ منگٹ جوگی آج کل ایسے محکمہ سے متعلق ہیں جس میں بد اخلاقوں کا گذر نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ جوگی جی نہایت شریف دل اور اخلاق مند انسان ہیں۔ چند لمحوں میں غیر کو اپنا بنانے کا ہنر آپ کو معلوم ہے۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں یہ تبسم مخاطب کے دل پر محبت کی بجلی بن کر گرتی ہے اور وہ جوگی صاحب کے دام اشتیاق میں بھنس [illegible] آجاتا ہے۔ جوگی صاحب کی ابتدائی تعلیم آر۔ ایس۔ [illegible] ہائی اسکول ضلع لدھیانہ میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا سنہ ۱۹۴۸ء میں آپ نے ملٹری کی ملازمت اختیار کرلی۔ طبیعت کی جولانی اور لاابالی پن نے آپ کو پانچ سال کے بعد ہی فوج سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کیا جس کے بعد کلکتہ میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرنے لگے۔ وہاں سے کچھ جلد ہی طبیعت اکتا گیا آخر میں نیو انڈیا انشورنس کمپنی میں آپ انسپکٹر مقرر ہوئے پھر کومن ویلتھ انشورنس کمپنی کے برانچ سکریٹری

مقرر ہوئے آج کل لائف انشورنس کارپوریشن انڈیا میں ڈیولپمنٹ افسر ہیں۔ آپ کی مادری زبان گورمکھی یعنی پنجابی ہے۔ اور اردو آپ کی محبوب زبان بچپن سے ہی آپ کا مزاج عاشقانہ ہے اس لئے اردو کی عاشقانہ غزلیں آپ کو بہت پسند ہیں

سردار ل سنگھ جوگی جہاں انشورنس کے معاملات میں مہارت رکھتے ہیں وہیں شعر و سخن کے بھی رسیا ہیں۔ فلم اسٹار دھرمیندر آپ کے بچپن کے ساتھی ہیں ہنوز ان سے گہرے مراسم ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر کلونت سنگھ جالی آپ کے دوست ہیں۔ جوگی صاحب نے کئی ڈرامے زمانہ طالب علمی میں لکھے تھے جو ماہنامہ "عارض" اور ماہنامہ "کھیل" میں اور اس کے علاوہ دوسرے جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے جوگی صاحب نے خود کو نہیں لایا لیکن نجی صحبتوں میں مزاحیہ کلام سناتے ہیں۔ مصروفیت کے باوصف پابندی سے کتب بینی کی طرف مائل ہیں۔

شریمتی شکنتلا سنگھ

ولدیت...... بابو پنجاب رائے سنگھ

تاریخ پیدائش... ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء

آبائی وطن..... ضلع ہوشیار پور۔ موضع تگڑ (پنجاب)

موجودہ پتہ...... بھیکن پور۔ بھاگل پور ۱

شریمتی شکنتلا سنگھ بابو پنجاب رائے سنگھ کی صاحبزادی ہیں آپ کی شادی شری دلجیت سنگھ سے ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ دلجیت سنگھ صاحب آج کل سبور اگریکلچرل کالج میں گورنمنٹ گارڈنس سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ شریمتی شکنتلا سنگھ کی تعلیم نیا سمی تک جو پوری ہوئی جس کے بعد موصوفہ نے ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اور اپنے عہد کے بہت سارے لوگوں کی طرح تحریک میں حصہ لینے کے سبب .... کا شکار ہوئیں۔ موصوفہ ۱۹۵۴ء سے بھاگلپور ضلع کانگریس کمیٹی کے فعال ممبر ہیں۔ آپ کانگریس گانڈ کی ڈسٹرکٹ کمشنر بھی رہ چکی ہیں۔ پھر بھاگلپور لیڈیز کلب کی سکریٹری ہیں ۱۹۶۲ء سے وارڈ نمبر ۲ کی میونسپل کمشنر اس کے علاوہ بہت ساری سوشل جماعت کی رکن ہیں۔

قدیم بزم سخن سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں اور اردو کی فلاح و بہبود کی آرزومند ہیں۔ آپ کے خسر و شری پرتاب سنگھ جی پنجاب میں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اب ریٹائرڈ ہیں۔ شری پرتاب سنگھ جی کو اردو زبان اور اس کے ادب سے گہری دلچسپی ہے اور انہیں یقین ہے کہ اردو کسی حال میں اپنے وطن سے بے وطن نہیں ہو سکتی۔

سردار گرمکھ سنگھ عرف بدھ سنگھ کھنوجہ

ولدیت...... سنت سنگھ متوفی

تاریخ پیدائش... مارچ ۱۹۲۰ء

وطن...... ساکن مسکین، تحصیل فالیدہ ضلع گجرات (پنجاب)

موجودہ پتہ.. خلیفہ باغ۔ بھاگلپور

سردار گرمکھ سنگھ بھاگلپور کے ایک کامیاب تاجر ہیں۔ اپنے وطن سے ۱۹۴۴ء میں بہار آئے اور مالسی ضلع مونگیر میں کاروبار کا آغاز کیا۔ جہاں سے ۱۹۳۶ء میں دانا پور ضلع پٹنہ منتقل ہوگئے۔ دانا پور سے ۱۹۳۸ء میں بھاگلپور تشریف لائے۔ یہاں کی آب و ہوا ایسی راس آئی کہ آپ یہیں کے ہو رہے۔

سردار گرمکھ سنگھ اردو سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس کے ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ کاروباری مصروفیت سے موقع ملتا ہے تو پھر شعر و سخن کی محفل میں بھی اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کرنے کے لئے آجاتے ہیں۔ سولہ سال سے قدیم بزم سخن سے آپ کا تعلق ہے کتب بینی کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ ادب سے زیادہ آپ کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف ہے زیادہ تر اپنے مقدس گروؤں کی تعلیم کی طرف راغب ہیں۔ آپ نے بھاگلپور آتے ہی ایک گردوارے کی ضرورت کا احساس کیا۔ سب سے پہلے آپ نے پرتاب سنگھ ریلوے ملازم کے ساتھ چھوٹی بڑی سنگت کے مہنتوں سے ملاقات کی اور ان سے گذارش کی کہ سکھ بزرگوں کے (۱) تاریخی مقامات کو ان کے شایان شان بنانے کا موقع دیا جائے مگر جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو خاموش ہو گئے اور ایک الگ سکھوں کی عبادت گاہ بنانے کی فکر میں لگے رہے جب سردار سردالا سنگھ

بیدی اور سردار سنتوک سنگھ نے گرودوارہ کی تحریک چلائی تو آپ نے اپنی زمین اس کے لئے دیدی ۱۹۵۲ء میں گرودوارہ کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ شری بکرت چودھری ریلوے انسپکٹر کے سرگرم تعاون سے آپ نے گرودوارہ میں گرونانک جی کے یوم پیدائش کے موقع پر گرودوارہ میں عظیم الشان مشاعرہ کا انتظام کیا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سردار کلدیپ سنگھ چھابڑہ جوشی

ولدیت ... ... سردار تیجا سنگھ چھابڑہ
تاریخ پیدائش ..... جون ۱۹۴۴ء
وطن .... میکن ضلع گجرات (پنجاب)

۱۹۴۷ء سے ہی آپ کا قیام بھاگلپور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے ٹرانسپورٹ کا بزنس شروع کیا اور آج کل آپ ایک کامیاب تاجر ہیں۔ سیور رود روڈ پر آپ کا ایک پٹرول پمپ اور سروس اسٹیشن بھی ہے آپ کا شمار ایک ذہین تاجروں میں ہوتا ہے۔ بچپن خوشحالی اور آسودگی میں گذرا۔ اس لئے آپ زندگی کے کسی گوشے میں آپ فکر و مصائب سے دوچار نہیں ہوئے۔ آپ کی شادی اوائل عمر ہی میں ہوگئی تھی۔ آج آپ تین بچوں کے باپ ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی آپ نے خود کو بھاگلپور میں پایا اس لئے وطن چھوٹنے کا مطلق احساس نہیں ہے۔ آپ کے والد سردار تیجا سنگھ چھابڑہ اپنے اصولوں اور مذہبی تعلیمات پر سختی سے عمل کرنے والے انسان ہیں جن کا اثر شری جوشی صاحب پر بھی پڑا ہے کسی قسم کی بے اعتدالی اور غلطی کی طرف آپ کی اپنی طبیعت مائل نہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی ہے۔ میٹرک تک آپ نے ہندی زبان میں تعلیم حاصل کی۔ ہندی ادب کا ستھرا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی طبیعت نہایت باغ و بہار ہے۔ آپ کا چہرہ و شکیل سراپا ملنے والوں کے لئے کشش کا باعث ہوتا ہے۔

اردو شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں مشاعروں سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مصروفیات زمانہ سے فرصت ملتی ہے تو شعر و ادب کی محفلوں میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ بھاگلپور کے بزم سخن قدیم سے بھی آپ کو ذوق ہے اور اسکے انعقاد پر شرکت کرتے ہیں۔

جوگندر سنگھ پاہوہ

ولدیت ..... شری سردار گوبند سنگھ پاہوہ
تاریخ پیدائش ... ۶ جون ۱۹۳۱ء
وطن .... مانجھی ضلع گجرات (مغربی پاکستان)

سردار جوگندر سنگھ کی ابتدائی تعلیم مانجھی میں ہوئی اس کے بعد منڈی بہاء الدین گجرات مغربی پاکستان میں تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۶ء کی شکست و ریخت میں پاکستانی علاقہ سے ہجرت کرکے ضلع لدھیانہ چلے آئے۔ اس وقت آپ کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال کی ہوگی ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں آپ کے والدین بھی آبائی وطن ترک کرکے آپ سے آملے۔ چند ماہ بعد کاروبار کے لحاظ سے آپ میرٹھ گئے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ دیال باغ ٹیکنیکل کالج میں ٹریننگ کیلئے داخلہ لیا اور موٹر میکینک کی سند حاصل کی ۱۹۵۰ء میں سردار موصوف ۵۱۰ آرمی ورکس شوپ میں درجہ اوّل کے میکینک بحال ہوئے جہاں سات سال تک اپنے ہنر کا جوہر دکھاتے رہے آگرہ میں آپ کا قیام تھا تو وہاں کے مقامی دھارمک سوسائٹی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۱۹۵۵ء میں سردار صاحب نے سکھ ینگ اسٹوڈینٹس فیڈریشن قائم کیا جس کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان سماجی جلسہ اور کوی دربار (مشاعرہ) منعقد کیا گیا جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اس جلسہ کی کارگذاری میں سب سے بڑا حصہ آپ ہی کا تھا۔ ویسے آپ کی زندگی بہت سارے واقعات سے بھری ہے۔ موصوف نے برابر اور آج بھی ایسے تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بچپن سے ہی آپ بڑے ذہین اور فطین تھے ان کی اس ذہانت کا جوہر اسوقت دیدنی اور شنیدنی ہوتا ہے جب آپ ان سے سیاست حاضرہ پر گفتگو کریں۔ ان کی نپی تلی رائے سن کر آپ کو ایسا لگے گا جیسے ذہن کے کچھ بند دریچے یک جنبش کھل گئے۔ آپ غیر متعصب، فراخدل اور سنجیدہ انسان ہیں، ادبی دلچسپی طالب علمی کے زمانے سے ہے، پنجابی زبان میں آپ نے بہت ساری نظمیں لکھی ہیں، مانجھی، گجرات، میرٹھ جگہ گاؤں، دلّی اور آگرہ میں اکثر کوی درباروں میں شرکت کرتے منظوم کہانی ہے

رہے ہیں۔ اردو، پنجابی اور انگریزی ادب کا مطالعہ برابر کرتے رہتے ہیں

آتما رام شرما

ولدیت...... شری فقیر چند شرما آنجہانی
سن پیدائش.... ۱۹۱۰ء
وطن........ جیال پور ضلع لدھیانہ (پنجاب)
موجودہ پتہ...... آتما نواس۔ تلکا مانجھی۔ بھاگلپور

شری آتما رام شرما ہنس مکھ اور ہشاش بشاش رہنے والے انسان ہیں ان سے ملنے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف نے زندگی کے ناہموار راستے کو طے کرنے کے بعد آج اس منزل پر پہنچے ہیں جہاں مسرتیں، بہار کی رنگینیاں اور زندگی کی کامرانیاں آپ کو نصیب ہیں۔

شرما صاحب کی ابتدائی تعلیم پنجاب میں ہوئی جس کے بعد جبل پور اور مانڈلہ میں بھی آپ زیر تعلیم رہے۔ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں سے آپ کو اچھی طرح واقفیت ہے۔ والد کے انتقال کے بعد آپ کے اوپر سارے خاندان کی ذمہ داری کا بار آگیا۔ مزید دکھ کی بات یہ ہوئی کہ چھوٹا بھائی بھی داغ مفارقت دے گیا۔ حالات سے مجبور ہوکر آپ نے ریلوے لوکو شیڈ میں ملازمت اختیار کرلی جہاں سے ایک جگہ بتانے کے بعد ۱۹۳۱ء افریقہ کے جنجا اور کمپالا مقامات کو چلے گئے ڈیڑھ سال رہنے کے باوجود جب کوئی معقول روزگار نہ ملا تو وہاں سے واپس آکر لائلپور میں ایک پرائیوٹ ملازمت اختیار کرلی۔ لائلپور ہی میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے موصوف کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ ۱۹۴۰ء میں ڈالمیا نگر (بہار) چلے آئے جہاں پلائی وڈ فیکٹری میں فورمین کی حیثیت سے بحال ہوئے یہاں رہ کر انجینیرنگ کے امتحان کی تیاری شروع کی۔ اور ۱۹۴۲ء لاہور سے انجینیرنگ کا ڈپلوما حاصل کیا ۱۹۴۳ء میں ملازمت سے مستعفی ہوکر پٹنہ چلے آئے۔ تین سال تک پٹنہ میں پرائیوٹ فرموں کے انجینیر رہے۔ پھر آسام کے شہر نوگاؤں میں ملازمت کرلی۔ جہاں سے صحت کی خرابی کے بنا پر ملازمت ترک کرکے جہان آباد (گیا) چلے آئے۔ یہاں بھی پرائیوٹ فرموں میں مکینکل انجینیر کے عہدہ پر ۱۹۴۹ء تک رہے اسی سال بھاگلپور میں پہلی مرتبہ تشریف لائے، یہ شہر ایسا پسند ہوا کہ یہیں کے ہو رہے۔ پہلے دو سال تک ملازمت کی پھر ۱۹۵۱ء سے اپنا کاروبار شروع کیا۔ آج کل شرما صاحب شہر کے ایک کامیاب بزنس مین شمار کیے جاتے ہیں۔ عزم و ہمت، انتھک محنت اور خداداد صلاحیت کے سہارے زندگی کے نشیب و فراز سے مردانہ وار گذرتے ہوئے، آج شرما صاحب اس منزل پر ہیں جہاں پہنچ کر انسان کی تمناؤں کا حاصل ہوتا ہے۔ شعر و ادب سے والہانہ ذوق رکھتے ہیں۔

آنند موہن سہائے

ولدیت...... شری لال موہن سہائے
سن پیدائش.... ۱۸۹۸ء

شری آنند موہن سہائے ایک آزمودہ کار سیاسی رہنما ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور گاندھی جی سے متاثر ہوئے ۱۹۲۳ء میں جاپان گئے جہاں تحریک آزادی وطن کو تیز تر کرنے کے لئے محترمہ زینت فتح علی کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس کی ایک شاخ قائم کی پھر عالمگیر جنگ کے شروع ہوتے ہی آزاد ہند فوج میں شریک ہو گئے۔ نیتا جی نے جو آزاد ہند حکومت بنائی تھی اس کابینہ میں آپ بھی تھے۔ آزادی کے بعد ویسٹ انڈیز اور دوسرے جزائر کے کمشنر، پھر تھائی لینڈ کے سفیر مقرر ہوئے۔ آج کل ریٹائر ہوکر زندگی گذار رہے ہیں۔

کتب بینی کا ذوق بہت زیادہ انگریزی اور ہندی کتابوں کے علاوہ اردو، فارسی کی کتابیں بھی آپ کی نجی لائبریری میں ہے۔

شری کملیشری سہائے

ولدیت..... رائے بہادر شری شیو شنکر سہائے سی۔ آئی۔ ئی
تاریخ پیدائش... ۲۷ ستمبر ۱۸۹۲ء
پتہ...... شیو بھون، بھاگلپور ۲

رائے بہادر کملیشری سہائے کے آبا و اجداد موضع نادر گنج ضلع گیا سے بھاگلپور آئے تھے۔ آپ کے والد شری شیو شنکر سہائے سی۔ آئی۔ ای کی پیدائش ۲۵ فروری ۱۸۶۲ء میں بھاگلپور میں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں رائے بہادر ہوئے ۱۹۱۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کا خطاب ملا۔ بنگال کونسل کے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک رکن تھے پھر بہار کونسل کے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۴ء تک ممبر رہے۔ راج بنیلی کے نائب تھے ڈاکٹر سچیدہ نند سہا نے اپنی کتاب بہار کے سرشار ہیرو میں لکھا ہے کہ راج بنیلی کی تاریخ رائے بہادر شیو شنکر کی تاریخ ہے۔

اپنے والد کی طرح شری کملیشری سہائے بھی بہار کونسل کے ممبر، ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین، ٹی۔ این۔ بی کالج کی گورننگ باڈی کے رکن رہ چکے ہیں۔ یہ خاندان بھاگلپور کا قدیم رئیس خاندان ہے۔ ٹی۔ این۔ بی کالج کے قیام میں اس خاندان کا حصہ بہت زیادہ رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی ان دونوں کی یکساں طور پر اس خاندان نے مالی معاونت کی ہے۔ مہاتما گاندھی علی برادران اور ڈاکٹر راجندر پرشاد شیو بھون میں ٹھہر چکے ہیں۔ خصوصاً راجندر بابو تو ۱۹۴۶ء تک آتے رہے ہیں۔

شری کملیشری سہائے کی ابتدائی تعلیم گھر پر ایک مولوی صاحب کے ذریعہ ہوئی تھی۔ پھر ٹی۔ این۔ بی کالج میں آپ کو مولوی عبدالماجد اور مولوی کریم الدین صاحبان جیسے اساتذہ ملے۔ آپ نے ۱۹۴۷ء میں خان بہادر شمس الدین صاحب کے ساتھ اپنا خطاب واپس کر دیا تھا۔ آج کل دھیان گیان میں زندگی گذارتے ہیں۔ آپ غیر متعصب اور خلیق انسان ہیں۔

شری آر۔ کے سنہا

ولدیت...... رمنی موہن سنہا
وطن...... باڑہ ضلع بھاگلپور
تاریخ پیدائش... ۱۹۳۴ء

شری آر۔ کے سنہا ریلوے مزدور کے معروف لیڈر ہیں۔ اردو نہیں جانتے مگر اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ اس لئے اردو داں ریلوے اسٹاف میں آپ ہر دل عزیز ہیں ــ

جامع مسجد مجاہد پور

نسیم آروی بی۔اے، آنرس۔ قانون گو بھاگلپور

علوم دینی و دنیوی کے بنیادی مراکز کی حیثیت سے خانقاہوں، دینی مدارس اور مساجد کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ علم دین کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ قومی تنظیم اور ملی اجتماعیت کا سبق بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ قوم کی اجتماعی زندگی کا سنگ بنیاد بھی یہیں رکھا جاتا ہے اور اس کے بلند ترین گنبد کے کلس کا نقطۂ اختتام بھی " دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور جماعت قائم کرو " کا مقصد بھی قومی اجتماعیت کا فروغ و ارتقاء ہی ہے۔

اس سلسلہ میں بھاگل پور کی خانقاہوں کی خدمات کا تفصیلی جائزہ اس شمارہ میں لیا جا چکا ہے۔ اور مدارس کا ذکر خیر بھی ہو چکا ہے۔ لیکن مساجد کی خاموش عظمت اور بلیغ خدمات جلیلہ کا اعتراف کے بغیر شاید اس شہر کا ماحول تشنہ و نامکمل رہے گا۔

جن تاریخی و اہم مساجد کی تصاویر اس شمارہ میں شامل کی جا رہی ہیں ان میں مسجد خانقاہ ملا چک، مسجد خلیفہ باغ، شاہی مسجد مشائخ چک، مسجد ناتھ نگر، شاہی مسجد قاضی چک، شاہی مسجد شکر اللہ چک، مسجد عید گاہ شاہجنگی اور جامع مسجد مجاہد پور خاص ہیں۔ معروف چک کی مسجد بھی قابل ذکر ہے۔ جس کی تعمیر [illegible] میں ہوئی تھی۔ اور جس میں بی بی مریم زوجہ رحمت علی خاں نے کافی جائداد اور زمین واقع موضع [illegible] چک وقف کر دی تھی۔ زمینداری ختم ہونے کے بعد محض مختصر سی رقم ایڈ انٹرم پیمنٹ کے طور پر گورنمنٹ سے ملتی ہے جس سے بمشکل چراغ بتی کا کام چلتا ہے یہ مسجد تقریباً ویران ہے۔ کیونکہ اس محلہ میں مسلمانوں کی آبادی برائے نام ہی ہے۔ رحمت علی خاں کے خاندان والے اندنوں پٹنہ میں قیام پذیر ہیں۔

ان مساجد میں جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا جامع مسجد مجاہد پور کو کئی نہج سے نمایاں حیثیت حاصل ہے اس کا نظم و ضبط اس کی صفائی، بلندی، جائے وقوع، ساخت نیز دیگر کئی اعتبار سے یہ منفرد خصوصیات کی حامل ہے ———

مسجد کی قدیم عمارت صدیوں پرانی ہے جو قدیم ساخت کے تین گنبدوں اور کشادہ سائبان پر مشتمل تھی۔ محلہ مجاہد پور کے نمازیوں کی کثیر تعداد کے لئے (جو اب چار محلوں کی کثیر التعداد مسلم آبادی پر مشتمل ہے) جب یہ مسجد تنگ ہونے لگی تو اسے دو منزلہ کئے جانے کا منصوبہ منتظمین نے تیار کیا اور سنہ ۱۹۴۴ء میں اس پر عمل در آمد کیا گیا۔ بعد میں تینوں گنبدوں کا بالائی حصہ شہید کر کے اسے مزید بلند کیا گیا۔ اور مسجد کو دو منزلہ کر دیا گیا۔ نمازیوں کی فوری دشواری اور تنگی دور ہو گئی۔ اس دن سے مسجد کی یہ دونوں منزلیں جلیل القدر نمازیوں کی جبینوں سے آباد ہیں۔

شروع میں جو کچھ بھی رقم بذریعہ چندہ اس مسجد کو حاصل ہوتی رہی اس سے مسجد کے اخراجات چلائے جاتے رہے پھر مولوی رحیم بخش مختار مرحوم نے خاص اپنے روپے سے (مبلغ اکیس روپے میں) ایک قطعہ اراضی رقبہ پانچ کٹھ جو مسجد کے پورب جانب یونسی روڈ اور دیا چک لین کے اس پار ہے شیخ کلاں فقرا دلال کے نام سے خرید کر مسجد کو وقف کر دیا۔ جس پر بعد میں گوشت

بازار (بیف مارکیٹ) کی تعمیر کی گئی۔ جس سے مسجد کی اقتصادی بنیاد مستحکم ہوئی۔ اسی درمیان ۱۹۲۰ء میں پاور ہاؤس کیلئے گورنمنٹ نے مسجد کے سامنے پورب طرف واقع بیف مارکیٹ کی زمین مذکورہ بالا پاور ہاؤس بنانے کے لئے اکوائر کرنے کے سلسلہ میں مسجد کے انتظامیہ سے گفت و شنید کی۔ بعد میں بجلی کمپنی سے ۲۱ فروری ۱۹۲۷ء کو ایگریمنٹ (AGREEMENT) ہوا جس کی رو سے بجلی کمپنی نے مارکیٹ مذکور کے لئے زمین خرید کر اور بیف مارکیٹ بنوا کر مسجد کو دے دیا۔ جو اندنوں بجلی کمپنی کے اتر جانب واقع اور قائم ہے اور مارکیٹ کے خاص راستہ کے لئے بنا چک لین کو بھاگل پور میونسپلٹی سے اکوائر کر کے مسجد کو دے دیا۔ جس پر مسجد کے انتظامیہ نے مارکیٹ مذکور میں جانے کے لئے کچھ راستہ چھوڑ کر دو کان کی تعمیر کرائی۔ اس طرح مسجد کو پاور ہاؤس کی زمین کے بدلے موجودہ بیف مارکیٹ اور دیگر مکان اور دوکان کی زمین جو مارکیٹ مذکور سے لے کر پاور ہاؤس کے کونے تک سڑک کی پورب جانب پھیلی ہوئی ہے حاصل ہوئی۔

اور اب شاہراہ عام جسے بولستی روڈ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی دونوں جانب چھوٹی چھوٹی دوکانوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جس کی مجموعی ہیئت خوبصورت بھی ہے باسلیقہ بھی اور ضرورت کی اشیاء کی فراہمی کے لئے تقریباً خود کفیل بھی۔ اس سے اس محلہ کی معیشت کو فروغ ہوا ہے اور کرائے کی رقم سے مسجد کی بھی توسیع و ترقی ہوئی ہے۔

مسجد کی مجلس انتظامیہ جس کا پورا نام "بورڈ آف ٹرسٹ مسجد مجاہد پور" ہے۔ ہر چیز کا باقاعدہ حساب اور نظم و ضبط کا کام انجام دیتی ہے۔ انتظامیہ کی موجودہ صورت کم و بیش ابتدا ہی سے چلی آرہی ہے۔ شروع میں جناب رحیم بخش مختار مرحوم کی تحریک پر مولوی نیظر احمد خاں صاحب مرحوم نے شیخ مولا بخش مرحوم و قاضی امام الدین مرحوم نے محلہ کے دیگر سربرآوردہ لوگوں کے تعاون سے مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۸ء میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں گیارہ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا نام "ٹرسٹ کمیٹی مسجد مجاہد پور" رکھا گیا لیکن اس کا باضابطہ دستور العمل رجسٹرڈ وقف نامہ نمبر ۲۸۶۰ مرقومہ ۱۳ مارچ ۱۹۳۹ء کی رو سے ظہور میں آیا۔ مختصراً دستور مذکور نے چاروں محلوں کے مصلیان کا یہ اختیار تسلیم کیا کہ وہ رائے عامہ کے ذریعہ اپنے اپنے محلوں سے کل ملا کر تیرہ اراکین منتخب کر کے مسجد کے انتظامیہ میں بھیجیں گے جس کا نام "بورڈ آف ٹرسٹ مسجد مجاہد پور" ہوگا۔ بالترتیب مجاہد پور پچھم ٹولہ سے پانچ، مجاہد پور پورب ٹولہ سے چار، حسین پور سے دو، اور محلہ گول ہٹہ سے دو اراکین کو بھیجنے کا اختیار دیا گیا یہ تیرہ اراکین اپنے میں سے ایک صدر ایک سکریٹری، ایک نائب سکریٹری اور ایک خزانچی منتخب کریں گے۔ باقی آٹھ افراد اراکین کی حیثیت سے مجلس انتظامیہ میں شریک ہوں گے۔ ہر معاملہ کثرت آراء سے فیصلہ پائے گا۔ انتظامیہ کی میعاد پانچ سال کی ہوگی۔ اور ایک عہدہ دار کو ایک سے زائد بار بھی محلوں کے مصلیان اگر چاہیں تو منتخب کرسکیں گے۔

مندرجہ بالا دستور کے تحت جو پہلی انتظامیہ تشکیل کی گئی اس میں قاضی امام الدین (سکریٹری) واجد علی قمر، حافظ محمد کفیل، حافظ عبدالغفور، عبدالسبوح صاحبان وغیرہ خاص ہیں۔ ان کی کوششوں سے مسجد کو اقتصادی استحکام حاصل ہوا۔ اور اس میں توسیع ہوتی گئی۔ اس کی آمدنی کے ذرائع مکانات، دوکانیں، اور مارکیٹ کے کرایہ کی آمدنی ہے جمعہ کے دن نمازیوں سے جمعہ فنڈ میں بھی کچھ پیسے مل جاتے ہیں یہ مسجد کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا چناؤ بورڈ خود کرتی ہے جو لاوارث اور غریب میتوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتا آرہا ہے خدا کا شکر ہے کہ جب سے یہ ادارہ قائم ہے تب سے کسی مسلمان کی لاش بے گور و کفن رہ کر اس شہر میں بے حرمت نہیں ہوئی۔

خرچ کی مد میں میونسپلٹی کو مکان کا ٹیکس پانی، بجلی

وغیرہ کا ٹیکس وقف بورڈ کو سیس محصل، چارج کش، امام مؤذن اور بہتر وغیرہ کی تنخواہیں شامل ہیں۔ پس انداز رقم سے مسجد کی چونا گردانی، مرمت اور توسیع کا کام وقتاً فوقتاً چلتا رہتا ہے رمضان میں کسی مستند حافظ کو بلانا اور تراویح کا باقاعدہ انتظام کرنا نیز تمام اخراجات کی کفالت کرنا مسجد کے ذمہ رہا کرتا ہے۔

اس مسجد کے فنڈ سے مسجد حسین آباد اور مسجد شاہ جنگی کی مرمت و چونا گردانی وغیرہ میں مدد دی جاتی ہے۔ اور دیگر مسجدوں میں بھی جہاں کہ لوگ معاشی بدحالی کے سبب خود اس قابل نہیں ہیں کہ سارے اخراجات کی کفالت خود کر سکیں۔

حساب کتاب کی جانچ پہلے مجلس انتظامیہ خود کر لیتی ہے ہر ماہ کے آخری ہفتہ میں انتظامیہ کی باقاعدہ نشست ہوتی ہے جس کا ایجنڈا ہر ممبر کے پاس تقریباً ایک ہفتہ قبل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس میں مہینہ بھر کی آمد و خرچ نیز دیگر امور پر بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے کوئی فیصلہ عمل میں آتا ہے بغیر انتظامیہ کی توثیق کے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ سالانہ رپورٹ اور ریٹرن سنی وقف بورڈ پٹنہ کو بھیجا جاتا ہے اور وقت مقررہ پر سنی بورڈ کے آڈیٹر (صوبائی سنی مجلس اوقاف بہار پٹنہ) بھی آڈٹ کیا کرتے ہیں۔ ہر پنج سالہ انتخاب سے قبل مجلس انتظامیہ خود اپنا آڈیٹر بحال کر کے آڈٹ بھی کراتی ہے تاکہ ایک پیسہ کا بھی فرق نہ پڑے۔ اس طرح محلہ کے سارے مصلیان کا اعتماد ہر قدم پر انتظامیہ کو حاصل رہتا ہے۔

اگر دیگر مساجد میں بھی یہ سلسلہ قائم ہو جائے تو بڑی مستحسن بات ہوگی۔ موجودہ انتظامیہ جس کا انتخاب دستور بالا کے تحت ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا۔ تیرہ افراد پر مشتمل ہے جس کے صدر محمد یعقوب خاں صاحب، نائب صدر محمد نعیم الدین خاں صاحب، سکریٹری حافظ محمد کبیر الدین صاحب، نائب سکریٹری محمد علی صاحب، خزانچی محمد مقیم الدین صاحب اور آٹھ اراکین جناب عبدالکریم صاحب عرف بیو، شمس الضحیٰ صاحب، واجد علی قمر صاحب، محمد محسن صاحب، غلام رسول صاحب، حاجی عبدالقدوس صاحب، کبیر الدین انصاری صاحب اور جناب حاجی ساجد علی صاحب ہیں جن کے باقاعدہ اور قابل تحسین انتظام میں مسجد کی ہمہ جہتی ترقی ہو رہی ہے۔

اس مسجد کی دو منزلہ موجودہ عمارت جس میں تین بلند بام گنبد ہیں جو سطح زمین سے تقریباً ۶۰،۵۰ فٹ بلند ہیں اور جو تھا گنبد جہاں مؤذن لاؤڈ اسپیکر سے اذان دیتے ہیں، نیز اٹھائیس بلند میناروں، وسیع و عریض صحن بخت کنواں، کشادہ سائبان اور طویل و عریض چھت پر مشتمل ہے جس کے سامنے کے حصہ میں سڑک کی جانب قدیم کتبہ نصب ہے جس کے بارے میں یہ روایت چلی آتی ہے کہ کسی شاہی مسجد میں نصب تھا جو حادثات زمانہ سے منہدم ہو گئی اور یہ پتھر کسی دھوبی کے ہاتھ لگا شاید گنگا کی موجوں کے تھپیڑوں میں بہتے بہتے یہ پتھر آیا ہو جو خنجر پور محلہ میں پایا گیا۔ اور مفید علی ٹھیکیدار مرحوم (جو بورڈ مذکور کے خزانچی تھے) نے لاکر اسے اس مسجد میں نصب کرایا اور اس پتھر کو اس مقام ارفع پر پہونچایا جس کا یہ بجا طور پر مستحق تھا۔

مسجد کے صحن میں تین کشادہ کمروں اور بڑے سائبان کی تعمیر ۱۹۵۳ء میں کی گئی اور اوپر کی منزل میں مسجد کی توسیع کی گئی جس سے جمعہ اور عیدین میں نمازیوں کی خاصی تعداد کو مسجد میں نماز پڑھنے کا موقع بہم پہونچایا۔ ہر طرف نیچے اور اوپر کی منزل میں بجلی کے پنکھے اور قمقمے لگے ہوئے ہیں جس سے نمازیوں کو بڑی عافیت ہو رہی ہے۔

نیچے کے کمروں میں سے ایک امام صاحب کی رہائش کے کام آتا ہے۔ اور باقی دو کرایہ پر لگے ہیں۔ جس کی آمدنی مسجد کی توسیع و مرمت کے کام آتی ہے۔ آج بھی درس و تدریس کا سلسلہ اس مسجد میں جاری و ساری ہے بچے آج بھی پڑھتے ہیں۔ حافظ آج بھی حفظ کرتے ہیں۔ اور صبح و شام قرأت کی [illegible] رہتی ہے۔

گرودوارہ شری گرو سنگھ سبھا

شاغل قادری

عام طور سے لوگ یہی جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد جب پنجاب سے سکھ بھاگلپور میں قسمت آزمائی کے لئے آئے اور بہت جلد کامیاب زندگی گذارنے لگے تو انہوں نے گرودوارہ کی تعمیر کی۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے۔ یہاں دو گرودوارے زمانۂ قدیم سے موجود ہیں۔ گو ان کی موجودہ شکل وہ نہیں ہے جو ہونی چاہیئے۔ یہ دونوں گرودوارے گنگا کے عین کنارے پر بوڑھا ناتھ مندر کے پچھم اور پورب میں واقع ہیں آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے گرونانک دیوجی ڈھاکہ جاتے ہوئے پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور، کہلگاؤں، اچھی پور وغیرہ ہوتے ہوئے بنگال میں داخل ہوئے تھے۔ گرونانک دیوجی اسی سفر کے دوران بھاگلپور میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ جہاں پر آپ ٹھہرے تھے اس کا پرانا نام جوگ الیشور تھا جہاں جوگی لوگ آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ اب اس کا نام جوکسر ہے۔ جس مقام پر گرونانک ٹھہرے تھے اس کا نام چھوٹی سنگت ہے۔ اسی طرح سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر جی کاروپ جواتے ہوئے بھاگلپور میں ٹھہرے تھے جہاں پر آپ کا قیام ہوا تھا اس کا نام بڑی سنگت ہے۔ بڑی سنگت اور چھوٹی سنگت مہنتوں کے قبضہ میں ہے ان دونوں سنگتوں میں کافی جائداد تھی اب چھوٹی سنگت کے مہنت کے پاس تین۳ بیگہ کھیت اور شہر میں کچھ زمین رہ گئی ہے۔ بڑی سنگت کی جائداد تقریباً ختم ہے۔ ابتدا میں کچھ لوگوں نے کوشش کی تھی کہ یہیں گرودوارہ باضابطہ بنے۔ لیکن مہنتوں کی ناراضگی کے سبب یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

ہر سکھ اپنے گھر میں گرو گرنتھ صاحب کا پرکاش کیا کرتا تھا۔ ایک دن سردار کلونت سنگھ جاتی کے والد بزرگوار سردار سنتوک سنگھ جی کے مکان پر گرو گرنتھ صاحب کا اکھنڈ پاٹھ ہو رہا تھا اس میں باوا سردار سنگھ بیدی بھی شریک تھے بیدی صاحب نے فرمایا سکھوں کی یہاں خاصی تعداد ہے آج یہ عظیم اجتماع جو سردار سنتوک سنگھ کے مکان پر ہوا ہے اگر کوئی گرودوارہ ہوتا تو اسی قدر لوگ جمع ہوتے یہ سنتے ہی سردار سنتوک سنگھ نے فرمایا آپ گرودوارہ بنانے کی تحریک چلائیں۔ میں پہلے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ دے دوں گا۔ پھر جو بھی کوشش اس سلسلہ میں ہو گی کروں گا۔ اس کام کے لئے سردار سنتوک سنگھ جی ذرکا تشریف لے گئے جہاں سے صرف ایک دن میں گیارہ ہزار روپے چندہ کر کے لائے۔ اسی روپے سے گرودوارہ کی زمین خریدی گئی۔ تحریک تیز تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۵۲ء میں وہ دن آیا جب اس زمانے کے کمشنر شری سی رمن آئی، سی ایس کے ہاتھوں گرودوارے کی بنیاد رکھ دی گئی۔

پہلی گرودوارہ پربندھک کمیٹی کی تشکیل حسب ذیل ہوئی تھی۔

صدر :۔ باوا سردار سنگھ بیدی۔
نائب صدر :۔ سردار پرتاپ سنگھ ڈی، ٹی، آئی۔
سکریٹری :۔ سردار گرمکھ سنگھ کھنوجہ۔
نائب سکریٹری :۔ سردار ویر سنگھ۔

باقی صفحہ ۱۹۶ پر

تاتارپور مارکیٹ
(کا)
ماضی و حال

تقی شاعر باقری

انقلابات سے آبادیاں بنتی بگڑتی رہتی ہیں

یہ مقولہ سولہ صدی تاتارپور مارکیٹ پر صادق آتا ہے۔ بحمداللہ حالیہ انقلابات کا معکوس اثر اس بازار پر نہیں پڑا ہے بلکہ جوں جوں تبدیلیاں آتی گئیں، تجارت کے اہم مراکز، عظیم شخصیتیں، اور خواندہ طبقہ سمٹ سمٹا کر اس علاقہ کو گنجان سے گنجان تر کرتا گیا اور اب تو تل دھرنے کی جگہ بھی نظر نہیں آتی۔ پہلے ہی سے جب اس بازار کی آبادی خال خال تھی بشعراء، علماء، ادباء، اطباء اور وکلاء کی ممتاز شخصیتیں اس چھوٹے سے محلے کی اہمیت بڑھا رہی تھیں

یہی وہ مقام ہے جہاں جناب بلند اختر صاحب کی وہ بلند عمارت ہے جس میں دھوم دھام سے علم و ادب کی مسندیں برابر بچھتی رہی ہیں۔

بھاگلپور میں یاس مرحوم کی جواں مرگی کا کسے صدمہ نہ تھا۔ " خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں "

اسی تاتارپور میں مرحوم نے اپنی معرکتہ الآرا غزلیں اپنے مخصوص ترنم سے بارہا پڑھی ہیں۔ سڑک کے کنارے ہی یاس مرحوم نواب تقی زیدی (عرف لڈن) صاحب مرحوم اور ڈاکٹر ناصر صاحب کی کرسیاں بچھ جاتی تھیں۔ شام کی چائے کے ساتھ ہی ادبی مباحثے اور مذاکرے کا آغاز ہوتا تھا۔ علم دوست افراد سمٹ سمٹ کر اس پاس آ بیٹھتے تھے۔ اسی بازار کی کسی خلوت میں احباب کی مخصوص مجلسیں بھی ہوا کرتی تھیں جس میں یاس مرحوم اپنی موسیقی اور ساز نوازی سے خاص الخاص احباب کو مسحور کیا کرتے تھے

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ یاس مرحوم ایک عظیم شاعر ہوتے ہوئے ایک بلند مرتبہ موسیقار بھی تھے۔ اس مقام کی یہی اہمیت کم نہیں کہ یاس مرحوم تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر بھی اس وقت تک یہاں آتے رہے جب تک بالکل صاحب فراش نہ ہو گئے

" خوشا دمید دلے شعلۂ مستعجل بود "

وہ بزم اجڑ گئی مگر ڈاکٹر ناصر صاحب کی مٹی مٹائی شخصیت اب بھی آثار قدیم کی یادگار ہے اور

" آثار پدیدا است سنا دید عجم را "

یہی وہ بازار ہے جہاں جناب قربان علی قوس مرحوم نے اپنے مخصوص انداز تغزل کی کہنہ مشقی کا ثبوت دیا ان کے پہلو میں آپ کو عبدالحمید شوکت، معین الدین ماہر مرحوم عین عاشق حسین ہر مز اور عاشق حسین عاشق زالوئے ادب تہ کئے ہوئے دکھائی دیں گے۔

۱۹۵۳ء میں مختلف وجوہ کے زیر اثر ایک نامانوس سی ویرانی ہو چلی تھی۔ مگر خیریت تھی کہ پہلے سی ہی ڈاکٹر غیاث احمد

صاحب اثرؔ کا شفاخانہ تبدریج ادبی مرکز بنتا چلا آرہا تھا۔

یہاں شریک سخن رہنے والوں میں ڈاکٹر سید احمد حسن صاحب حسنؔ صدر شعبۂ اردو ٹی، این، بی کالج، ترقی پانی پتی ڈاکٹر ناصر، عبدالمجید پوسٹ ماسٹر، نواب ناصر رضا صاحب رضا (لکھنوی) کبھی کبھی شاغل قادری، سرور ۔دی اور گاہے گاہے ناچیز (کلتی شاعر) کے نام لئے جا سکتے ہیں:۔

وہ شہسوار سخن تھے تو ہم پیادہ سہی

ڈاکٹر غیاث احمد صاحب کی یہ ادبی مخصوص مگر پرخلوص بزم آج بھی آراستہ ہے اور بحمداللہ ایک دوسرے مرکز کا اضافہ بھی مدنی مسافرخانہ سے متصل حکیم عبدالباقی صاحب کے مطب کی صورت ہمارے حوصلے بڑھا رہا ہے۔

موصوف کا مطب بیک وقت دارالشفا بھی اور مجلس اشاعت کا دفتر بھی۔ تاتارپور بازار کی روز افزوں ترقی اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے تجارتی مراکز بھی ہٹ ہٹا کر یہاں سمٹ آئے ہیں۔

۱۹۴۸ء میں تجار نے یہاں مارکیٹ ایسوسی ایشن قائم کیا جس کے اولین عہدہ داروں کی فہرست یوں ہے۔

(۱) صدر:۔ جناب ماسٹر محمد یحییٰ صاحب۔
(۲) سکریٹری:۔ محمد کبیرالدین صاحب
(۳) خازن:۔ حکیم فدا حسین صاحب۔

سالانہ انتخابات ہوتے رہتے ہیں خصوصیت اور خوبی کی بات یہ ہے کہ جناب محمد لیسیح صاحب وکیل اور ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب اس درمیانی مدت میں صرف دو بار صدر رہے ہیں۔ باقی اس طویل عرصہ میں آج تک اس کی صدارت کا سہرا بلا اختلاف رائے ایک ایسے شخص کے سر ہے جو بیک وقت ایک بڑا ڈاکٹر بھی ہے اور بڑا شاعر بھی۔ وہ ہیں ہمارے ڈاکٹر غیاث احمد صاحب اثرؔ

ؔ میری امید کا تو ہی ہے ستارہ اے دوست!

ایسوسی ایشن بازار کے معاشی معاملات سے پوری دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو سیرت پاک کا جلسہ پوری دھوم دھام سے کرتا ہے اور اس چاندنی رات میں تاتارپور بازار کی زلف کا ہر تار موتیوں میں گندھا معلوم ہوتا ہے۔ اس مبارک موقع پر روشنی سے جگمگاتے ہوئے بازار کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے گذشتہ سال نکلا تھا ؎

وہ شام بھی سحر ہے جو گذرے ترے قریب
بن تیرے صبح عید بھی ہے شام کی طرح

مارکیٹ ایسوسی ایشن کے موجودہ عہدہ دار حسب ذیل ہیں۔

صدر:۔ جناب ڈاکٹر غیاث احمد صاحب اثرؔ۔
سکریٹری:۔ جناب محمد نعیم صاحب۔
نائب سکریٹری:۔ عبدالسلام صاحب۔
خازن:۔ جناب محمد ولی صاحب۔

"عمر شما دراز، کنوں صبح نو دمید"

اشارے

(الف) کتب خانوں اور لائبریریوں کی فہرست

نام	مقام
نمبر ۱ کتب خانہ پیر دمڑیا بابا	خلیفہ باغ بھاگل پور ۱
نمبر ۲ شہبازیہ لائبریری	ملاچک بھاگل پور ۲
نمبر ۳ شہبازیہ اردو لائبریری	جبارچک بھاگل پور ۲
نمبر ۴ مقبول لائبریری	حبیب پور بھاگل پور ۱
نمبر ۵ فرینڈس لائبریری	تاتار پور بھاگل پور ۲
نمبر ۶ جدید لائبریری	حسین آباد بھاگل پور ۵
نمبر ۷ مومن لائبریری	ناتھ نگر بھاگل پور ۷
نمبر ۸ مومن اردو لائبریری	چمپانگر بھاگل پور ۷
نمبر ۹ نیشنل لائبریری	جبارچک بھاگل پور ۲
نمبر ۱۰ انصار لائبریری	چمپانگر بھاگل پور
نمبر ۱۱ نشاط لائبریری	تاتار پور بھاگل پور ۲
نمبر ۱۲ پیپلس لائبریری	لوہنی۔ بھاگل پور
نمبر ۱۳ انصار اورینٹل لائبریری	مجاہد پور بھاگل پور ۲
نمبر ۱۴ ماڈرن ایجوکیشنل لائبریری	مجاہد پور بھاگل پور ۲
نمبر ۱۵ اورینٹل لائبریری	مجاہد پور بھاگل پور ۲
نمبر ۱۶ مقبول لائبریری	غنی چک، بھاگل پور ۲
نمبر ۱۷ لائبریری مخزن ادب	مغربی مجاہد پور بھاگلپور ۲
نمبر ۱۸ مایاگنج اردو لائبریری	مایاگنج بھاگل پور ۱
نمبر ۱۹ محمد اکرام صاحب لائبریری	ملاچک بھاگل پور ۲
نمبر ۲۰ شاہ امین عالم صاحب لائبریری	ملاچک بھاگل پور ۲
نمبر ۲۱ فروغ ادب لائبریری	ملاچک بھاگل پور ۲
نمبر ۲۲ لائبریری مقصود الحسن صاحب (سابق فرینڈس لائبریری)	تاتار پور بھاگل پور ۲
نمبر ۲۳ لائبریری عصمت اللہ انصاری	بھیکن پور بھاگلپور
نمبر ۲۴ بزم ادب لائبریری برہ پورہ	برہ پورہ بھاگل پور
نمبر ۲۵ مقبول لائبریری	صدر الدین چک بھاگلپور
نمبر ۲۶ کبیر پور لائبریری	کبیر پور بھاگل پور
نمبر ۲۷ مرکزی اردو لائبریری	نزد دولتکدہ ڈاکٹر یونس حسین ضا کوتوالی بھاگلپور
نمبر ۲۸ کتب خانہ زین العابدین	حبیب پور بھاگلپور ۵
نمبر ۲۹ ائے کے آزاد اردو لائبریری	سرائے بھاگل پور
نمبر ۳۰ موڈرن لائبریری	قاضی ولی چک بھاگل پور
نمبر ۳۱ عبدالقیوم نجمی لائبریری	فتح پور بھاگل پور۔
نمبر ۳۲ ایوان ادب نجمی لائبریری محی الدین غنی	اسانند پور بھاگل پور
نمبر ۳۳ ابوالبقا محمد لائبریری	قاضی دائرہ لوہنی بھاگلپور

(ب) تصانیف

تصنیف	نوعیت	مصنف
نمبر ۱ نظارۂ وخیال	تذکرۂ شعرائے بھاگل پور	مرتبہ اختر ناصح نصیب علیگ
نمبر ۲ متاع شوق	مجموعۂ کلام منظوم	مصنف شاغل قادری

۳	آتشیں	مجموعۂ کلام منظوم	عبدالجبار نسیم آروی
۴	نگارِ فکر	〃	کریم اسدی
۵	کلامِ شور	〃	شور بھاگلپوری
۶	گلزارِ حقیقت	گلدستۂ سلام	مرتبہ شفق بھاگلپوری
۷	شمع کے آنسو	نوحے	شمع بھاگلپوری
۸	اردو غزل تنقید پر ایک نظر	مقالہ	مولانا قاسم زرقی پانی پتی
۹	تلخ حقیقت (کتابچہ)	ایک طویل نظم	〃
۱۰	میلاد تسلیمی (قلمی)	نظم	بی بی مغفورہ
۱۱	اشتیاقِ نعت	〃	شاہ عالم شہبازی
۱۲	گلدستۂ نعتِ رسول	مرثیہ	〃
۱۳	چمن زارِ عقیدت	〃	مرتبہ خورشید احمد فائقی
۱۴	غریب ہندوستان	مقالہ	(کامریڈ) ولی حسن مرحوم
۱۵	نذرِ عقیدت	منظوم	محمد سمیع اللہ قیصر
۱۶	گلدستۂ فضلِ رحمانی	منظوم	مرتبہ سید شاہ عبدالسبحان
۱۷	حیاتِ آدم علیہ السلام	نثر	شاہ شرف عالم زیدی
۱۸	سازِ ہستی	منظوم	محزوں چکلکوی
۱۹	گلزارِ حقیقت	گلدستہ سلام و نعت	مرتبہ سید حبیب اختر
۲۰	گلدستۂ قصائد بزمِ حسینی		〃
۲۱	بہارِ عقیدت		مرتبہ شفق بھاگلپوری
۲۲	عنبرین (زیرِ طبع)	مجموعۂ کلام	محی الدین غنی
۲۳	مناقبِ شعیبؒ	تذکرہ	مولانا عبدالواسع صاحب پورینوی
۲۴	بزم آرا	ناول	مولانا شائق احمد عثمانی
۲۵	بڑی آپا	ناول	مولانا شائق احمد عثمانی
۲۶	دوست کی بیوی	ناول	مولانا شائق احمد عثمانی
۲۷	چاند تارا	ناول	مولانا شائق احمد عثمانی
۲۸	چار تاریخی ناول شائع ہوئے ہیں۔		منظر بھاگلپوری
۲۹	مدھوکری (چار زبانوں میں شاعری)		محمد ارادت علی سلیم پور بھاگلپور
۳۰	کرتی اور کال (ہندی شاعری)		بیریکا نند

نوٹ: ۔ مندرجہ بالا فہرست نامکمل ہے مختلف خانوادوں میں مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی موجودگی کا پتہ چلا لیکن وارثان کی ناتوجہی اور عدم تعاون کے سبب مقصد حاصل نہ ہو سکا۔

فنکاروں کے نام اور پتے

تخلص	نام	مستقل پتہ	حال پتہ	
افضل	سید فضل علی خاں	اسانند پور	اسانند پور بھاگلپور ۲	شاعر
آدمی		مغل پورہ	مغل پورہ بھاگلپور	شاعر
اثر	ڈاکٹر غیاث احمد	تاتار پور	تاتار پور بھاگلپور ۲	شاعر
اثر	محمد عیسیٰ	برہ پورہ	برہ پورہ بھاگلپور ۱	شاعر
اثر	سید محمد اقبال	ملاچک	ملاچک بھاگلپور ۲	شاعر
امین		بھاگلپور	مقام جھریا دھنباد	شاعر
ابشم	تصدیق احمد خاں	برہ پورہ	برہ پورہ بھاگلپور ۱	شاعر
انجم	محمد اکرام	برہج بازار ضلع دیوریا (یوپی)	گڈس آفس این ای ریلوے بھاگلپور	شاعر
اختر	پروفیسر اختر بلگرامی	مغلپورہ بھاگلپور	صاحب گنج کالج صاحب گنج سنتھال پرگنہ	شاعر
انجم	ذکی ریاض	کبیر پور	کبیر پور بھاگلپور ۲	شاعر
اسلم	حافظ محمد اسلم	سرائے	سرائے بھاگلپور ۲	شاعر
اعجاز	محمد ابراہیم	حسین پور	حسین پور بھاگلپور ۲	ادیب افسانہ نگار
احقر	پروفیسر محمد مجتبیٰ انصاری		شعبۂ فارسی ٹی این بی کالج بھاگلپور ۷	شاعر
امام	پروفیسر مظفر امام	محلہ سرائے	محلہ سرائے بھاگلپور ۲	شاعر و افسانہ نگار
احقر	بدیع الزماں	مقام بنی ٹیکر بھاگلپور	بھاگل پور	شاعر
احد	پروفیسر عبدالاحد	ملاچک بھاگلپور	پرنسپل دودھیا پیٹھ کالج منڈار ہل بھاگلپور	شاعر
آصف	ڈاکٹر آصف واسع	بھاگلپور	پروفیسر مہیلا کالج بھاگلپور	مضمون نگار
آزاد	وسیع احمد	جبار چک	بھاگلپور	شاعر
برق	محمد شاہ جہاں	تاتار پور		شاعر
بیدل	ہری پرشاد	شجاع گنج	شجاع گنج بھاگلپور ۲	شاعر

تخلص	نام	مستقل پتہ	حال پتہ	
جمال	سید جمال احمد	نجیب منزل پھلواری شریف پٹنہ	گڈس آفس ایسٹرن ریلوے بھاگلپور	شاعر
جانی	سردار کلونت سنگھ	سنگھ موٹرس پونسی روڈ بھاگلپور	بھاگلپور	شاعر
جان	مسٹر جان	منڈی چک	بھاگلپور	شاعر
ہمسر	ابو سعید (مختار)	مل چک	بھاگلپور	شاعر
ہرمز	عاشق حسین	محی الدین پور	بھاگلپور	شاعر
ہری	ہری نندن پرشاد		ریٹائرڈ ہیڈ کلرک بھاگلپور	شاعر
واسع صدیقی	مولانا عبدالواسع صدیقی	ہاٹ پوربنی بھاگلپور	بھاگلپور	شاعر و ادیب مقرر
واسع	پروفیسر محمد واسع	اسانند پور بھاگلپور	بھاگلپور	
ذرقی	سید شاہ محمد قاسم پانی پتی	حسین پور بھاگلپور	بھاگلپور	
حشر	مولانا ساجد اللہ	مقام وڈاک گھر سبور بھاگلپور	بھاگلپور	
حسن	پروفیسر ڈاکٹر سید احمد حسن	چیارمن صدر شعبۂ اردو ٹی، این بی کالج بھاگلپور		شاعر
حکیم	حکیم عبدالباقی	مقام ہاٹ پوربنی بھاگلپور	شفاخانۂ پیام حیات تاتارپور بھاگلپور	شاعر
حسن رہبر	ابرارالحسن	حسین آباد	بھاگلپور	افسانہ نگار
حسن مقصود		تاتارپور	بھاگلپور	مضمون نگار
حیات	محمد اسحٰق		ہیڈ ماسٹر ایم، ای، اسکول دودھانی بانکا بھاگلپور	شاعر
حسن جبیں	حسن جبیں شکیل	تاتارپور بھاگلپور معرفت الحاج محمد شکیل احمد خاں ایڈوکیٹ	بھاگلپور	افسانہ نگار
حسینہ نشاط	حسینہ نشاط	قاضی ولی چک بھاگلپور معرفت مہدی شاعر	بھاگلپور	افسانہ نگار
حافظ	محمد اسرائیل	موضع بھرلو ضلع بھاگلپور معرفت ولی دواخانہ تاتارپور	بھاگلپور	شاعر
یامن	یٰسین یامن	بھیکن پور	بھاگلپور ۲	افسانہ نگار
کریم	عبدالکریم اسدی	مجاہد پور ولیٹ	بھاگلپور ۲	شاعر
کامل	محمد کمال الدین	حسین پور	بھاگلپور ۲	شاعر
کمال	محمد کمال		رجسٹری آفس بھاگلپور	شاعر
گوہر	شری گوہر		لائبریرین بھاگلپور یونیورسٹی بھاگلپور ۷	شاعر
لعل	ششی کمار	موضع کھرائٹی ڈاکخانہ اوبرا ضلع گیا	شیو بھون بھیکن پور بھاگلپور	شاعر
مشائق	مولانا شائق احمد عثمانی	کراچی		صحافی
لہری	بشمبر داس	منڈی چک	منڈی چک بھاگلپور	شاعر

تخلص	نام	مستقل پتہ	حال پتہ	
لطف	پروفیسر لطف الرحمٰن	مقام ریوڑھا ضلع دربھنگہ	شعبۂ اردو ٹی، این، بی کالج بھاگلپور ۷	شاعر
مہکاری	پروفیسر محمد مہدی	اسانند بھاگلپور	آرڈی اینڈ ڈی جے کالج مونگیر	شاعر
مجروح	امیرالدین خاں	برہ پورہ بھاگلپور	کریم گنج - گیا	شاعر
محمود واحد		حسین پور، بھاگلپور	موضع پیر بیگہ ڈاکخانہ چاکند گیا	شاعر و افسانہ نگار
مظفر	پروفیسر مظفر اقبال	اورنگ آباد ضلع گیا	شعبۂ اردو ٹی، این، بی کالج بھاگلپور ۷	ادیب و شاعر
مسرور	محمد خداداد	ملکی محلہ آرہ	ریلوے کالونی بھاگلپور	شاعر
منظر	محمد اختر رضا	مقام وڈاکخانہ پورینی بھاگلپور	کلکتہ	افسانہ نگار
محمد علی زکریا		حسین پور بھاگلپور	بھاگلپور ۲	افسانہ نگار
مختار	مولوی مختار احمد جعفری	حسین پور بھاگلپور	ہیڈ مولوی سبور ہائی اسکول سبور بھاگلپور	شاعر
منظر		بھیکن پور	بھاگلپور	شاعر
منظر	سید شاہ منظر عالم دمڑیائی	خلیفہ باغ	شاہ مارکیٹ بھاگلپور	ادیب
میکش	عبدالکریم	مجاہد پور ویسٹ	بھاگلپور ۲	شاعر
مصطفٰی	مرزا مصطفٰی خاں صاحب	اسانند پور	بھاگلپور	شاعر
نائب	سید جعفر علی		بتوسط شور بھاگلپوری بڑے چک بھاگلپور	شاعر
نسیم آروی	عبدالجبار	مقام دیوسٹ ہاٹا ضلع شاہ آباد	قانون گو چک بندی آفس بھاگلپور	شاعر
نیّر	روشن آرا	حبیب پور	بھاگلپور	افسانہ نگار
نظر	عبدالرحیم	مجاہد پور ویسٹ	بھاگلپور ۲	شاعر
نعیم الدین	محمد نعیم الدین	حسین آباد	بھاگلپور ۵	افسانہ نگار
ناصح	ڈاکٹر محمد ناصر علی	صدرالدین چک	بھاگلپور	شاعر
نصیب صدیقی	اختر ناصح (علیگ)	مقام نظرہ ڈاکخانہ کمتول ضلع دربھنگہ	زرعی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھاگلپور	ادیب مضمون نگار
نور	ماسٹر نورالدین	قاضی ولی چک	بھاگلپور	شاعر
نثار احمد خاں			بلند اختر منزل تاتارپور بھاگلپور	مضمون نگار
نیّر مجید			ٹپ ٹاپ سنڈیکیٹ تاتارپور بھاگلپور	مضمون نگار
سراج	محمد سراج	بھیکن پور	بھاگلپور	شاعر
سلیمان خاں		محلہ سرائے	بھاگلپور	افسانہ نگار
ساقی	محمد ابوسعید	چمپانگر	بھاگلپور	شاعر

تخلص	نام	مستقل پتہ	حال پتہ	
سیفی	محمد یوسف	اسانند پور	بھاگل پور	شاعر
عادل	عبدالمجید	نصیر الدین پور غازی پور (یوپی)	ایسٹرن ریلوے لوکو شیڈ بھاگلپور	شاعر
عادل	ڈاکٹر محمد عادل	برہ پورہ	بھاگل پور	شاعر
عاشق	عاشق حسین	اسانند پور	بھاگل پور	شاعر
عاجز	عبدالوحید	اسانند پور	بھاگل پور	شاعر
عزیز	عزیز الرحمٰن	برہ پورہ	بھاگل پور	شاعر
عالم	محمد عالم	برہ پورہ	بھاگل پور	شاعر
فخر	مولانا سید شاہ فخر عالم	خلیفہ باغ	بھاگل پور	شاعر
فضل رب	سید فضل رب	تاتار پور	بھاگل پور	افسانہ نگار
فیض	ابوالوفا	ناتھ نگر	بھاگل پور	شاعر
فرحت	محمد جلیل احمد	مجاہد پور پچھم	بھاگل پور	افسانہ نگار
فرحت	زبیدہ فرحت	شکر اللہ چک	بھاگل پور	شاعر و افسانہ نگار
صفی	مولانا سید صفی العالم سجادہ نشین خانقاہ نیا بازار ملا چک		بھاگل پور	شاعر
صمد حمیدی	احسان الحق	ایسٹرن ریلوے گڈز آفس	بھاگل پور ۲	افسانہ نگار
صدر	پروفیسر صدر الدین احمد	وائس پرنسپل ٹی، این، بی کالج	بھاگل پور	شاعر
صمید بلگراج			بھاگل پور	افسانہ نگار
قادری	سید محمد شاغل (تلخ زمانی)	دارالادب ہاٹ پورینی بھاگل پور وطن موضع سنہیہ ڈاکخانہ کارا ضلع گیا	بھاگل پور	شاعر
قمر التوحید		پروفیسر ٹی، این، بی کالج	بھاگل پور	افسانہ نگار
قمر	واجد علی	مجاہد پور پچھم	بھاگل پور ۲	شاعر
قمر	مولانا قمر الہدیٰ مفتاحی	مدرسہ ناتھ نگر	بھاگل پور ۲	"
قمر سوز	محمد قمر الدین	حسین پور	بھاگل پور	شاعر
رضا	نواب ناصر رضا لکھنوی	ریلوے ہائی اسکول	چکر دھر پور	شاعر
راہی	محمد غلام حسین	مجاہد پور پورب ٹولہ	بھاگل پور	شاعر
رفیق	رفیق الزماں	تاتار پور	بھاگل پور	شاعر
رمل	محمد اسحٰق	چمپا نگر	بھاگل پور	شاعر

تخلص	نام	مستقل پتہ	حال پتہ	
رنجور	محمد خالد	برہ پورہ	بھاگل پور	شاعر
رضا	محمد عبدالباری	باری لین قلعہ گھاٹ	بھاگل پور	افسانہ نگار
شاکر	شاکر بھاگلپوری		حال مقام کلنہ ضلع بردوان	شاعر
شفق	خورشید حسن	مغل پورہ	بھاگل پور	شاعر
شرف	شرف الدین وکیل	محبوب علی چک	بھاگل پور	شاعر
شمس	مولانا شمس الضحیٰ	شکر اللہ چک	بھاگل پور	شاعر
شاہین	سید ولی العالم	آدم جی جوٹ مل	ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان	شاعر
شاہد	شاہد علی ایڈوکیٹ	پاکوڑ	سنتھال پ گ	شاعر
شمس	شمس الزماں	تاتار پور بھاگل پور	حال مقام نمبر ۶ رائنڈ اسٹریٹ کلکتہ	شاعر
شور	سید اسحٰق نبی	برے چک	بھاگل پور	شاعر
شمشاد	محمد کریم	کھنجر پور	بھاگل پور	شاعر
شاعر مہدی	مہدی شاعر	قاضی ولی چک	بھاگل پور	افسانہ نگار
شاعر	شاہ محمد تقی باقری	ولی حسین آباد مونگیر	ٹیچرس ٹریننگ اسکول کھلودیا بھاگل پور	شاعر
شاداں	حیدر عمر	کھنجر پور	بھاگل پور	شاعر
شموئل	محمد شموئل احمد	کھنجر پور	بھاگل پور	افسانہ نگار
شاہدی	علی حسن	اعظم نگر	پورنیہ	افسانہ نگار
شاہین بہار			حال مقام بزم ادب پادتی پور ضلع رنگ پور مشرقی پاکستان	شاعر
شمع بھاگلپوری	کنیز فاطمہ	مغل پورہ	بھاگل پور ۵	شاعر
شبنم	عبدالرزاق		درس گاہ جامعہ اسلامی تاتار پور بھاگل پور	شاعر
تبسم	تسنیم کوثر	تاتار پور	بھاگل پور ۲	مضمون نگار
تبسم پانی پتی	شمیم احمد	مجاہد پور	بھاگل پور ۲	شاعر
خبر	ابوالخیر	ناتھ نگر	بھاگل پور	شاعر
خلش	محمد السمیع ایڈوکیٹ		اسٹنڈرڈ پریس تاتار پور بھاگل پور	شاعر
ظفر	علی حسن	اسانند پور	بھاگل پور	افسانہ نگار
ظہیر	ظہیر الدین خان	مجاہد پور	بھاگل پور	شاعر
غنی	محی الدین	ایوانِ ادب۔ اسانند پور	بھاگل پور	شاعر

ماضی قریب کے معروف فنکار جو اس دنیائے آب و گل میں اب نہیں ہیں۔

تخلص	نام	پتہ	
اولاد	اولاد حسین	اسانند پور بھاگل پور ع۲	شاعر
احسن	سیّد رضا کاظمی	خلیفہ باغ بھاگل پور ع۲	شاعر
آزاد	عبدالستار	بھیکن پور بھاگل پور	شاعر
پاگل	سیّد تجمل حسین	برہ پورہ بھاگل پور	شاعر
وصی	وصی احمد	گولہ گھاٹ بھاگل پور	افسانہ نگار
طیب	مولوی علاءالدین	موضع بدلو چک پوسٹ پورینی بھاگل پور	شاعر
یاد	سید مجید العالم	مُلاّ چک بھاگل پور	شاعر
ماہر	معین الدین	مُلاّ چک بھاگل پور	شاعر
مخلص	محمد حسین خاں	مُلاّ چک بھاگل پور	شاعر
ناشاد	خلیل الرحمٰن	شاہ جنگی چک بھاگل پور	شاعر
نشتر	نواب تقی زیدی	خلیفہ باغ بھاگل پور	شاعر
قوس	قربانی علی	تاتار پور بھاگل پور	شاعر
شوکت	عبدالحمید	اسانند پور بھاگل پور	شاعر
شہرت	محمود الحسن	قاضی ولی چک بھاگل پور	شاعر
شیدا	محمد قاسم	برہ پورہ بھاگل پور	شاعر
ترنم	محمد سراج	پورینی بھاگل پور	شاعر